اسلام اور جدید افکار

I۔ اسلام اور جدید معاشی افکار

II۔ اسلام اور جدید سیاسی نظریات

III۔ اسلام اور جدید معاشرتی نظریات وتحریکات

ڈاکٹر سید تنویر بخاری
پروفیسر حمید اللہ جمیل

E.N.B.P

اسلام اور جدید افکار

I۔ اسلام اور جدید معاشی افکار

II۔ اسلام اور جدید سیاسی نظریات

III۔ اسلام اور جدید معاشرتی نظریات وتحریکات

ڈاکٹر سید تنویر بخاری

پروفیسر حمید اللہ جمیل

ایورنیو بک پیلس اردو بازار لاہور

کتاب .... اسلام اور جدید افکار

پرنٹرز .... ایم عارف یونس پرنٹرز لاہور

قیمت /360 روپے

الیورنیو بک پیلس اُردو بازار لاہور

فہرست

اسلام اور جدید معاشی افکار

اسلام اور جدید سیاسی نظریات

اسلام اور جدید نظریات اور تحریکات

اسلام اور جدید
معاشی افکار

علم معاشیات

سوال 1: مغربی مفکرین اور مسلم مفکرین کے حوالہ سے "معاشیات" کی تعریف درج کیجیے!
سوال 2: معاشیات کے لادینی اور اسلامی تصور کا موازنہ کیجیے!

معاشیات/اقتصادیات (Economics):

"معاشیات" کا دوسرا عربی مترادف لفظ "اقتصادیات" ہے۔

لفظی بحث:

"معاشیات" کی اصطلاح عربی زبان کے لفظ "عاش" سے ماخوذ ہے، جس کا مصدر "العیش" ہے، جو زندگی، روٹی اور کھانا کے مفہوم میں مستعمل ہے۔

مندرجہ ذیل الفاظ زندہ رہنے کا مفہوم دیتے ہیں۔

1- عَاشَ
2- يَعِيْشُ
3- عِيْشَةً
4- مَعَاشاً
5- مَعِيْشاً
6- مَعِيشَةً
7- عَيْشُوْشَةً

"اَلْمَعَاشُ" اور "اَلْمَعِيشَةُ" کے معنی ہیں:

1- کھانے پینے کی جس چیز سے گزران ہو سکے، وہ شے جس سے بسر اوقات کی جائے۔
2- ذریعہ زندگی، رزق، روزی، خوراک

لفظ "معیشت" بھی "عاش" سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں:

1- زندگی، زندگانی، زیست، حیات
2- روزگار، روزی، رزق

چنانچہ "معاشیات" وہ علم ہے جو زندہ رہنے کے ذرائع، مثلاً روزی، رزق، دولت، پیدائش دولت

اور تقسیم دولت وغیرہ سے بحث کرتا ہے۔

''معاشیات'' کے مفہوم میں ''اقتصادیات'' کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے، جو ''قَصَدَ'' سے ماخوذ ہے۔ ''قَصَدَ'' یا ''قَصدًا'' کے معنی ہیں: کسی معاملہ میں اعتدال اور میانہ روی اختیار کرنا۔ ''القَصَدُ'' کے معنی ہیں:

1- راستہ کی استقامت

2- اعتدال، میانہ روی

چنانچہ رزق و روزی سے متعلقہ وہ علم ''اقتصادیات'' کہلاتا ہے، جس میں دولت کے ضمن میں اعتدال اور میانہ روی پائی جائے۔ عرف عام میں ''معاشیات'' اور ''اقتصادیات'' کو ہم معنی تصور کیا جاتا ہے اور دونوں کو انگریزی لفظ "Economics" کا مترادف قرار دیا جاتا ہے۔

معاشیات/اقتصادیات کی تعریف:

انگریزی میں معاشیات اور اقتصادیات کو "Economics" کہتے ہیں، جو لاطینی لفظ "Oiko Nomos" سے ماخوذ ہے۔ فرانسیسی میں اس کا مترادف "Economic Politique" اور جرمن زبان میں "Politisehe oekomie" ہے۔

ذیل میں مغربی اور غیر مسلم مفکرین کے حوالہ سے معاشیات (Economics) کی تعریف درج کی جارہی ہے:

1- بقول ایڈم سمتھ (Adam Smith):

''معاشیات دولت کا علم ہے۔''

2- ڈاکٹر الفریڈ مارشل ''معاشیات'' کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معاشیات میں انسان کی ان سرگرمیوں کا مطالعہ کیا جاتا ہے، جن کا تعلق زندگی کے روزمرہ معاملات سے ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کس طرح دولت کماتا ہے اور اُسے کس طرح خرچ کرتا ہے۔ یہ علم انسان کی انفرادی اور اجتماعی کوششوں کے اس حصہ کا جائزہ لیتا ہے جس کا اس بات سے گہرا تعلق ہے کہ خوشحالی زندگی کے ضامن مادی لوازمات کس طرح حاصل کیے جاتے ہیں اور کس طرح استعمال کیے جاتے ہیں۔ پس معاشیات ایک طرف تو دولت کا علم ہے اور دوسری طرف خود انسانی زندگی کے ایک پہلو کا۔''

3- پروفیسر رابنز (Pro. Robbins) کے نزدیک:

''معاشیات ایک ایسا علم ہے جس میں انسان کے اس طرز عمل کا مطالعہ کیا جاتا ہے جسے وہ

خواہشات کے لامحدود ہونے مگر ان کے پورا کرنے کے لیے محدود ذرائع کی موجودگی کی وجہ سے اختیار کرتا ہے جبکہ ان ذرائع کو کئی طرح سے استعمال میں لایا جاسکتا ہو۔"

4- پروفیسر کینز (Pro.Keyness) کے نزدیک:

"معاشیات ایک ایسا علم ہے، جس میں اس نظام کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کے تحت ایک معاشرہ کے افراد اپنے محدود مادی اور انسانی وسائل کے توسط سے خوشحال زندگی بسر کرنے اور تسکین حاجات کا بلند تر معیار حاصل کرنے کے لیے انفرادی مساعی اور اجتماعی کوشش، خصوصاً ایک منصوبے کے تحت عمل میں لاتے ہیں۔"

5- پروفیسر نیون (Pro.Nevin) کا خیال ہے کہ:

"معاشیات مبادلہ کے ان پہلوؤں کا مطالعہ ہے جو ان کوششوں کے باعث آئے ہیں، اشیاء وخدمات کی اس قلت پر قابو پایا جائے جو نوع انسانی اپنی طلب کے مقابلہ میں ہمیشہ محسوس کرتی رہے گی۔"

6- پروفیسر فرگوسن کا کہنا ہے کہ:

"معاشیات کمیاب مادی اور انسانی ذرائع کے باہمی متقابل مقاصد کے درمیان ایک باکفایت تخصیص کے مطالعہ کا نام ہے۔"

7- سموئیل سن (Samuelson) کے نزدیک:

"معاشیات میں مطالعہ کیا جاتا ہے کہ افراد و معاشرہ بااستعمال یا بلا استعمال زر کمیاب اور متبادل استعمال رکھنے والے پیدا آور وسائل کو مختلف اشیاء کی پیدائش کو بروئے کار لانے اور ان اشیاء کو معاشرہ کے مختلف لوگوں اور گروہوں کے درمیان حال اور مستقبل میں صرف کے لیے تقسیم کرنے کا کون سا طریقہ منتخب کرتے ہیں۔ معاشیات وسائل کے بہتر استعمال اور ان کے مصارف اور فوائد کا تجزیہ کرتی ہے۔"

8- "New Student's Dictionary" میں مذکور ہے:

"Economic mean concerned with the organization of money, industry and trade of a Country, region or society."

9- بقول اسٹگلر:

"معاشیات ان اصولوں کے مطالعہ کا نام ہے جو مسابقتی احتیاجات کے لیے کمیاب وسائل کی تقرری کی رہنمائی کرتے ہیں تاکہ زیادہ سے زیادہ احتیاجات کی تشفی ممکن ہو سکے۔"

10- وک اسٹیڈ کے نزدیک:

"معاشیات سے مراد ان اصولوں کا مطالعہ ہے جن کی بنیاد پر ایک معاشرے کے وسائل کو اس طرح ترتیب دیا جائے کہ وسائل کے ضیاع کے بغیر معاشرتی احتیاجات کی زیادہ سے زیادہ تشفی کی ضمانت دی جا سکے۔"

معاشیات مسلم مفکرین کی نظر میں:

قدیم اسلامی لٹریچر میں "معاشیات" کی اصطلاح موجود نہیں ہے۔ یہ اصطلاح دور جدید میں وضع کی گئی۔ تاہم معاشیات کے مفہوم میں مندرجہ ذیل اصطلاحات مروج رہی ہیں۔

1- تدبیر منزل

2- سیاست مدن

3- المعاش

تدبیر منزل:

بقول شاہ ولی اللہؒ:

"تدبیر منزل حکمت کا وہ حصہ ہے، جس میں ان روابط اور تعلقات کے محفوظ رکھنے کی کیفیت بیان کی جاتی ہے جو تدابیر کے دوسری حد کے موافق ایک مکان کے رہنے والوں میں ہوا کرتے ہیں۔ اس حکمت کے چار حصے ہیں۔ (1) ازدواج (2) ولادت (3) مالک ہونا (4) باہمی صحبت۔"

شاہ ولی اللہ کے نزدیک تدبیر منزل (خانگی تدابیر) کے مہتم بالشان مسائل یہ ہیں:

1- ان اسباب کا دریافت کرنا، جو ازدواج یا ترکیب ازواج کے باعث ہوتے ہیں۔

2- خاوند کے فرائض کہ جن سے معاشرت قائم رہے اور فواحش و ننگ و عار سے اہلیہ کا ناموس محفوظ رہے۔

3- اہلیہ کے فرائض پارسائی خاوند کی اطاعت خانہ داری کی مصلحتوں میں پوری طاقت صرف کرنا۔

4- جب باہم دونوں میں نفرت ہو جائے تو مصالحت کیسے کروائی جائے۔

5- طلاق کا طریقہ

6- خاوند کی وفات کے بعد ماتمی حالت میں بسر کرنا

7- تربیت اولاد

8- والدین کی خدمت

9- غلاموں کے انتظام، نیز احسانات

10- غلاموں کی اپنے آقاؤں کی خدمت گزاری

11- آزادی کا طریقہ
12- رشتہ داروں اور ہمسایوں سے رحم کرنا
13- شہر کے حاجتمندوں کے ساتھ ہمدردی اور جو مصائب ان پر طاری ہوں ان کی مدافعت کی کوشش
14- خاندان کے نقیب کا ادب اور عزت
15- نقیب کا حالات خاندانی پر نظر رکھنا
16- ورثہ میں ترکے کی تقسیم
17- نسبی اور حسبی امور کی پاسداری

سیاست مدن:

بقول شاہ ولی اللہؒ:

"سیاست مدن حکمت کے اس حصہ کا نام ہے جس میں ان تعلقات کے حفظان کی کیفیت بیان کی جاتی ہے، جو باہم اہالیانِ شہر کے مابین ہوا کرتے ہیں۔"

المعاش:

1- مشہور مسلم مفکر ابن خلدون نے "مقدمہ ابن خلدون" میں "المعاش" کی اصطلاح استعمال کرتے ہوئے اس کی تعریف یوں کی ہے:

"معاش رزق ڈھونڈنے کا اور اسے حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کا نام ہے۔"

2- الحریری نے "معاش" کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

"معاش سے مراد یہ ہے کہ انسان تجارت، زراعت اور صنعت کے ذریعے اپنی زندگی کی ضروریات پوری کرے۔"

تبصرہ:

متذکرۃ الصدر اصطلاحات (تدبیر منزل، سیاست مدن اور المعاش) جدید "اصطلاح" (معاشیات) کے موضوع اور وسعت پر پوری نہیں اُترتیں۔ چنانچہ ہم اسلامی ادب کے دورِ جدید میں رواج پانے والی اصطلاح "معاشیات" ہی کو استعمال کریں گے اور اسے غیر مسلموں کے نظریات پر مشتمل معاشیات (Economics) سے الگ کرنے کے لیے "اسلامی معاشیات" کا نام دیں گے۔

اسلامی معاشیات کی تعریف:

1- اسلامی معاشیات قرآن وسنت پر مبنی معاشی امور اور وسائل اور احکام کے مطالعہ کا نام ہے۔ اس میں وسائل پیداوار، تقسیم دولت اور گردشِ زر کے علاوہ ان تمام امور کا مطالعہ کیا جاتا ہے، جو کسی نہ کسی حوالہ

سے زندگی کے معاشی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔

2- مولانا حفظ الرحمٰن نے جو "معاشیات" کو "علم الاقتصاد" کا نام دیتے ہیں، ان کی تعریف یوں کی ہے:
"لُغت کی زبان میں قصد و اقتصاد میانہ روی اور اچھے چلن کا نام ہے مگر عملی اور علمی اصطلاح میں ایسے وسائل کی دریافت کو کہتے ہیں جو دولت و ثروت پیدا کرنے کے مناسب طریقے اس کے خرچ کے صحیح استعمال اور اس کی ہلاکت و بربادی کے حقیقی اسباب بتا سکیں۔ اس لحاظ سے علم الاقتصاد اس علم کا نام جو ان ذرائع سے بحث کرتا ہے اور ان کے صحیح و غلط ہونے پر مطلع کرتا ہے۔"

3- حسن الزمان کے نزدیک:
"اسلامی معاشیات وہ علم ہے جس میں اسلامی اصولوں کا اطلاق ہوتا ہے جو ناانصافی کے ذریعے مادی وسائل کے حصول کو ناجائز قرار دیتا ہے اور مادی وسائل کے استعمال کو اس انداز میں منضبط کرتے ہیں کہ انسان اپنی ضروریات کی تسکین کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ اور معاشرہ کی طرف سے عائد کردہ فرائض کی ادائیگی کر سکے۔"

4- بقول محمد بن حسن طوسی:
"معاشیات وہ علم ہے، جس میں عوامی بہبود کے قوانین کا مطالعہ کیا جاتا ہے جس کا مقصد اس تعاون کو فروغ دیتا ہے جس کے نتیجے میں حقیقی ترقی کو فروغ حاصل ہو۔"

5- بقول محمد اکرم:
"اسلامی معاشیات کا مقصد انسانی فلاح کا مطالعہ کرنا ہے جو زمینی وسائل کو منظم کرنے، حصہ لینے اور باہمی تعاون سے حاصل ہوتی ہے۔"

6- بعضوں کے نزدیک:

(i) "اسلامی معاشیات ایک ایسا سماجی علم ہے، جو لوگوں کے معاشی مسائل کا اسلامی اقدار کی روشنی میں مطالعہ کرتا ہے۔"

(ii) "اسلامی معاشیات" قرآن و سنت کے احکام کے تحت دولت کے دخل و صرف کے مطالعہ کا نام ہے۔

معاشیات کے لادینی اور اسلامی تصور کا موازنہ:

معاشیات کے لادینی نظریات اور اسلامی تصور کا موازنہ کریں تو ان دونوں میں کافی فرق اور تضاد نظر آتا ہے۔ ذیل میں ہم ان دونوں میں پائے جانے والے فرق کا جائزہ لینے جا رہے ہیں۔

الہامی اور غیر الہامی ہونے کے لحاظ سے فرق:

لادینی معاشیات کے اصول وقواعد ،نظریات انسانوں کے وضع کردہ ہیں جن میں دین ومذہب کو ملحوظ نہیں رکھا گیا، یہ غیر الہامی ہیں۔اس کے برعکس اسلامی معاشیات کے اصول وقواعد اور احکام الہامی ہیں جو بذریعہ وحی نبی آخرالزمان حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوئے اور کتاب (قرآن مجید) کی صورت میں محفوظ ہیں۔

فانی اور لافانی ہونے کے لحاظ سے فرق:

لادینی معاشیات کے اصول وقواعد بدلتے رہتے ہیں اور اکثر ملکوں میں ان میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے لیکن اس کے برعکس اسلامی معاشیات چونکہ قرآن حکیم پر مشتمل ہے اور قرآن مجید کا ایک لفظ تو کیا نقطہ تک بھی سابقہ چودہ سو سال سے نہیں بدلا۔اس کی حفاظت کی قسم خدا نے خود کھا رکھی ہے اور قیامت تک اسے من وعن اور صحیح وسلامت رکھنے کا وعدہ فرمایا ہے۔اس کے باوجود ہم اسے جامد قرار نہیں دے سکتے۔ ہر دور میں پیدا ہونے والے معاشی مسائل کو اجتہاد کے ذریعے حل کیا جاسکتا ہے۔(یاد رہے کہ اجتہاد میں صرف فروعی مسائل ہی کو کسی آیت قرآنیہ پر قیاس کر کے حل کیا جاسکتا ہے۔اس طرح اصل حکم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہوتی۔)

مادی اور غیر مادی ہونے کے لحاظ سے فرق:

لادینی معاشیات کی بنیاد مادیت پر ہے اور اس میں صرف مادی مفادات ہی کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔یہ مفادات صرف دُنیوی زندگی تک ہی محدود ہیں، جبکہ اسلامی معاشیات کی بنیاد روحانیت پر ہے اور یہ دین ودنیا دونوں کو ملحوظ رکھتی ہے، دونوں میں فلاح پانے کا درس دیتی ہے۔مثال کے طور پر ''انفاق فی سبیل اللہ'' خدا کو قرض دینے کے مترادف ہے، جس کا اجر دنیا میں بھی ملتا ہے اور آخرت میں ستر گنا بڑھا کر دیے جانے کا وعدہ ہے۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

و ما تنفقوا من خیر یوف الیکم و انتم لا تظلمون

(اور تم مال میں سے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، تم پر پورا پورا لوٹا دیا جائے گا اور تم پر زیادتی نہ کی جائے گی)

سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

من ذا الذی یقرض اللہ قرضًا حسنًا فیضعفهٗ لهٗ اضعافًا کثیرةً

(کون ہے ایسا جو اللہ کو قرض دے، اچھا قرض، تو اس کے واسطے وہ اس کو بہت گنا کر دے)مادہ پرست آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور صرف دینوی مفاد ہی کو ملحوظ رکھتے ہیں، لیکن مسلمان آخرت پر یقین رکھتے ہیں، اس لیے ان کی معیشت میں روحانی عنصر داخل ہے اور وہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنا مال صرف کرتے ہیں۔

تقسیم دولت کے لحاظ سے فرق:

لادینی معاشیات میں ہر شخص جائز و ناجائز طریقے سے دولت کما کر کروڑ پتی یا ارب پتی بن سکتا ہے۔اس طرح دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے۔اس کے برعکس اسلام گردش زر کا قائل ہے اور اکتناز اور احتکار وغیرہ پر پابندی عائد کرتا ہے اور انفاق فی سبیل اللہ (صدقہ، خیرات، زکوۃ) کے ذریعہ دولت کو گردش میں رکھنے کا درس دیتا ہے۔اسلام جائز پیشہ اور حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت پر کوئی قدغن نہیں لگاتا، لیکن دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز ہونے کی مذمت کرتا ہے۔

وسائل پیداوار کے لحاظ سے فرق:

لادینی معاشیات میں زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کرنے کے ذرائع تلاش کیے جاتے ہیں، خواہ یہ جائز ہوں یا ناجائز۔اس کے برعکس اسلامی معاشیات میں رزق کمانے کے حلال اور جائز ذرائع اختیار کرنے کا درس دیا گیا ہے۔مثلاً سود، یتیموں کا مال کھانا، چوری اور ڈاکہ زنی کے ذریعے مال اکٹھا کرنا، حرام قرار دی گئی چیزوں کا کاروبار کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ایک مسلمان صرف حلال چیزوں ہی کا کاروبار کر سکتا ہے۔

اخلاقی اقدار کے لحاظ سے فرق:

لادینی معاشیات میں اخلاق کا کوئی عمل دخل نہیں ہے، اس لیے رحم، ایثار، ہمدردی وغیرہ جیسے جذبات اس میں شامل نہیں، یہ صرف پیسے کو سلام کرنا سکھاتی ہے، خواہ جائز طریقے سے کمایا گیا ہو یا ناجائز طریقے سے۔اس کے برعکس اسلامی معاشیات اخلاقی اقدار کے تابع ہے اور اس میں رزق کمانے کا کوئی ذریعہ اختیار کرتے وقت اس کے حلال ہونے کا یقین کر لیا جاتا ہے۔اسلام کاروبار میں بد اخلاقی کی مذمت کرتا ہے اور محتاجوں، ضرورتمندوں کی مدد کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کا درس دیتا ہے۔برصغیر پاک و ہند میں اسلام مسلمان (عرب) تاجروں کے اخلاق کی بدولت پھیلا۔

رزق کمانے کے مقصد کے لحاظ سے فرق:

اسلام رزق کمانے کی تمام تر ذمہ داری مرد پر عائد کرتا ہے اور اہل وعیال کی کفالت اس پر فرض کرتا ہے۔اسلام میں رزق کمانے کی نیت اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔اس صورت میں مسلمان کا رزق کمانا عبادت بن جاتا ہے۔جو شخص رزق حلال کما کر اپنے اہل وعیال کو کھلاتا پلاتا ہے۔اس کا شمار عبادت گزاروں میں ہوتا ہے۔اس کے برعکس لادینی معاشیات میں اس قسم کا کوئی تصور نہیں۔اس میں صرف اپنے نفس کو راضی کرنے کے لیے کسی بھی جائز و ناجائز طریقے سے مال کمایا اور صرف کیا جاتا ہے۔

معاشیات کا نفس مضمون:

''معاشیات'' انسانی زندگی کے معاشی پہلو سے تعلق رکھتی ہے اور اس امر سے بحث کرتی ہے کہ

انسان محدود ذرائع کی مدد سے اپنی لاتعداد خواہشات کو کس طرح پورا کرتا ہے۔

معاشیات کی وسعت مضمون:

معاشیات میں انسان کی معاشی زندگی سے متعلقہ تمام امور کو زیر بحث لایا جاتا ہے، مثلاً:

1- اہم معاشی نظامات، مثلاً جاگیرداری، سرمایہ داری، اشتمالیت، فاشزم، سوشلزم وغیرہ
2- وسائل پیداوار اور پیدائش دولت
3- صرف دولت، تقسیم دولت
4- انتقال دولت
5- ریاست کی مالیاتی پالیسی و معاشی کردار
6- اسلامی معاشیات کی معاشی اقدار، مثلاً حلال وحرام، مساوات، عدل، تقویٰ وغیرہ
7- معاشی ترقی اور منصوبہ بندی

معاشیات کی ضرورت واہمیت:

انسان کا کھانا پینا، پہننا، رہنا سہنا الغرض کوئی کام بھی روپے پیسے کے بغیر نہیں ہوتا۔ اس لیے اسے قدم قدم پر معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے معاشیات میں مہارت ہونا ضروری ہے۔ صنعت وحرفت ہو یا تجارتی معاملات ہی کو سمجھنے کے لیے معاشیات سے مدد لینا پڑتی ہے۔ ملکی تعمیر و ترقی کے لیے حکومت ٹیکسوں کا نظام نافذ کرتی ہے۔ اس نظام کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کے لیے بھی معاشیات سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ متوازن زندگی گزارنے کے لیے بھی معاشیات میں مہارت تامہ کی موجودگی اشد لازم ہے۔

بین الاقوامی تجارت، بین الاقوامی اقتصادی معاہدات غیر ملکی قرضوں اور بیرونی سرمایہ کاری کے سلسلہ میں بھی معاشیات کے اصول وقواعد سے بہرہ ور ہونا ضروری، مذہبی معاملات مثلاً زکوٰۃ، صدقہ، وقف، حج، وصیت، حق مہر، قرض حسنہ، وراثت وغیرہ سے متعلقہ امور کو حل کرنے کے لیے بھی معاشیات سے آگاہ ہونا ضروری ہے۔ الغرض انسانی زندگی کے تمام معاملات کا تعلق چونکہ معاشی اصول وقواعد سے ہے، اس لیے انسان کا علم معاشیات سے واقف ہونا ضروری ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

اسلام کی معاشی اَقدار

سوال 1: اسلام کی معاشی اقدار پر روشنی ڈالیے؟

سوال 2: مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے:

(i) تقویٰ (ii) عدل (iii) احسان (iv) اخوت
(v) مساوات (vi) تعاون

اللہ کی رزاقیت

بہت سے لوگوں کی توجہ کا مرکز رزق حاصل کرنے کا مسئلہ ہے بلکہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد کا گمان یہ ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کی پابندی رزق میں کمی کا سبب ہے۔ اس سے زیادہ تعجب اور دکھ کی بات یہ ہے کہ کچھ بظاہر دین دار لوگ یہ اعتقاد رکھتے ہیں کہ معاشی خوشحالی اور آسودگی کے حصول کے لئے کسی حد تک اسلامی تعلیمات سے چشم پوشی کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح بعض لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ جب رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اٹھا رکھی ہے تو اس کے حاصل کیلئے انسان محنت و مشقت کیوں کرے۔

یہ نادان لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں یا باخبر ہونے کے باوجود اس بات کو فراموش کر چکے ہیں کہ کائنات کے مالک و خالق اللہ جل جلالہ کے نازل کردہ دین میں جہاں اخروی معاملات میں رشد و ہدایت کارفرما ہیں وہاں اس میں دینوی امور میں بھی انسانوں کی رہنمائی کی گئی ہے۔ جس طرح اس دین کا مقصد آخرت میں انسانوں کی سرفراز و سربلند کرنا ہے اسی طرح یہ دین اللہ تعالیٰ نے اس لئے بھی نازل فرمایا کہ انسانیت اس دین سے وابستہ ہو کر دنیا میں بھی خوش بختی اور سعادت مندی کی زندگی بسر کرے۔

زیر نظر مضمون میں ہم اسلام کے نظریہ رزاق پر سیر حاصل بحث کریں گے تاکہ لوگوں کی یہ غلط فہمی دور ہو سکے کہ اسلامی تعلیمات کشادگی رزق کی راہ میں رکاوٹ نہیں بلکہ کشادگی رزق کیلئے اہم کنجی ہے۔

رزق کے لغوی معنی

عربی زبان میں رزق کا لفظ جہاں روزی روٹی کے معنی میں آتا ہے وہاں ہر طرح کی عنایات کے لئے بھی آتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں بھی یہ مال و دولت کے لیے بھی ہے، متاع حیات کے لیے بھی آیا ہے اور ہدایت و معرفت کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ رزق کا لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو عطا ہونے والی ہر عنایت کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

کسب الی اللہ اور قرآن مجید

اسلامی نظام معیشت اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ کائنات میں انسان کی معاشی ضروریات کی

کفیل اللہ تعالیٰ کی ذات اقدس ہے اور اسی کے پیدا کردہ اسباب معیشت میں ہر انسان کو فائدہ اٹھانے کا مساوی حق حاصل ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں بار بار رزق کی ذمہ داری قبول فرمائی ہے۔ مثلاً سورہ ہود کی چھٹی آیت میں ارشاد ہوتا ہے:

''زمین پر چلنے والا کوئی جاندار ایسا نہیں جس کا رزق' عارضی ٹھکانہ اور مستقل رہائش کا ذمہ اللہ نے نہ لیا ہو۔ سب کچھ ایک کتاب میں درج ہے۔''

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

هو الذی خلق لکم ما فی الارض جمیعاً (البقرہ 29:2)

''وہی ہے جس نے سب کچھ جو زمین میں ہے تمہارے لئے پیدا کیا۔''

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وفی السماء رزقکم وما توعدون (الذٰریات 22:51)

''اور آسمان میں تمہارا رزق (بھی) ہے اور وہ (سب کچھ بھی) جس کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے۔''

سورۂ انعام میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولا تقتلوا اولادکم خشیة املاق نحن نرزقکم وایاھم

(سورۃ انعام)

''اور افلاس کے ڈر سے اپنی اولاد کو نہ مار ڈالا کرو ہم ہی تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور انہیں بھی۔''

سورہ نمل میں فرمایا:

ومن یرزقکم من السماء والارض ءالٰہ مع اللہ (سورۃ نمل)

''اور آسمان اور زمین سے تم کو روزی کون پہنچاتا ہے؟ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے۔''

سورہ الزاریات میں فرمایا:

''بے شک اللہ تعالیٰ ہی روزی دینے والا ہے' بڑی مضبوط قوت والا ہے۔''

سورہ الحجر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور ہم نے تمہارے لئے زمین میں معیشت کے سامان بنا دیئے اور ان کے لئے جن کو تم روزی نہیں دیتے۔''

ان آیات میں بغیر کسی تخصیص کے ہر فرد بشر کو خطاب ہے اور ان کی روح یہ ہے کہ معیشت و اسباب معیشت خدائے تعالیٰ کے خزانہ عامرہ کی ایسی عطاء و بخشش ہے کہ جس سے فائدہ اٹھانے کا ہر جاندار کو برابر کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا انسان کو رزق دینے کا وعدہ

اللہ تعالیٰ کی ذات نے انسان کو رزق دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مسلمان اپنے رزق کا حصہ خدا سے مانگتا ہے جب کہ دوسرے مذاہب کے لوگ پتھروں اور بتوں سے اپنا رزق مانگتے ہیں۔ اس کی سمجھ سے یہ چیز پتہ نہیں کیوں باہر ہے کہ پتھر کے بت انسان کو کیا دے سکتے ہیں جو خود چلنے پھرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ پتھر کے بت انسان کو کچھ نہیں دے سکتے۔ اللہ تعالیٰ پھر بھی ان کو بن مانگے عطا کررہا ہے۔

کسی نے کیا خوب کہا تھا۔

میرا نصیب نہ وقت سے پہلے نہ نصیب سے زیادہ۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے:

"فریضہ عبادت کے بعد حلال کی کمائی کو طلب کرنا بھی ایک فرض ہے۔"

رزق اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

نبی کریم صلی اللہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بیشک آپ کا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ فرما دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے، بیشک وہ اپنے بندوں (کے اعمال و احوال) کی خوب خبر رکھنے والا خوب دیکھنے والا ہے۔"

حضرت ابودرداء کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رزق بندے کی اس طرح تلاش کرتا ہے جس طرح انسان کو اس کی موت ڈھونڈتی ہے۔"

رزق کی اقسام

رزق و روزی کی دو قسمیں ہیں ایک وہ روزی ہے جس کی تلاش میں ہم جاتے ہیں دوسری وہ روزی جو ہمیں تلاش کرتی ہے روایات میں پہلی قسم کی روزی کو (رزق مطلوب) کہتے ہیں اور دوسری قسم کو (رزق طالب) کہتے ہیں، یقینی اور رزق طالب وہی وجود، ہستی، عمر، امکانات، محیط، ماحول، خاندان اور استعداد وغیرہ ہیں جو کسی کام کی تلاش اور اسے انجام دینے میں ہمیں قوت و طاقت اور ہوشیاری عطا ہوتی ہے اور انہیں کے زیر سایہ مطلوب روزی کا دروازہ ہمارے اوپر کھلتا ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فرمان ہے:

"رزق دو طرح کے ہیں ایک رزق وہ ہے جو تمہیں تلاش کرتا ہے اور دوسرا وہ ہے جسے تم تلاش کرتے ہو اگر وہ جسے تم تلاش کرتے ہو اگر نہ بھی پاؤ، تو وہ جو تمہیں تلاش کر رہا ہے تمہیں مل کر رہے گا۔"

مومن کی پہچان توکل الی اللہ

کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتا جب تک اللہ کے رازق ہونے کا اُسے پختہ یقین نہ ہوجائے۔ خواہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو۔ بہت سے تعلیم یافتہ اس یقین سے محروم ہوتے ہیں جبکہ کم پڑھے لکھے قابل رشک یقین کے حامل ہوتے ہیں۔ کتنی بار مالی مشکلات یا بے روزگاری کے عالم میں سنا ہے کہ رازق تو فقط ایک ہے' باقی تو سب عبدالرزاق ہیں۔ اور دل شاد ہوگیا ہے اور فکر دور ہوگئی ہے۔ جب کہ مغربی تعلیم سے بہرہ ور لوگ سوچتے ہیں کہ ہم تو اپنی ذہانت اور قابلیت سے روزی کما رہے ہیں۔ اور اس وسیع اور ہمہ گیر نظام کا ادراک کرنے میں ناکام رہتے ہیں جس کے تحت کائنات کی اربوں مخلوق کو رزق فراہم کیا جارہا ہے۔ قرآن عظیم میں رب تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"میں ان سے رزق نہیں چاہتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا کھلائیں۔ اللہ تو خود رزاق اور بے حد قوت والا ہے۔"

رزق کی وسعت اور تنگی آزمائش

یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ رزق کی وسعت اور تنگی کے معنی بے عزتی نہیں ہے۔

"جب ہم اسے رزق کی تنگی سے آزماتے ہیں تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے میری توہین کی۔" (۱۶:۸۹)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا' اللہ سے مانگنے میں عزت ہے اور غیر اللہ سے مانگنے میں ذلت' خواہ وہ تیرا باپ ہی کیوں نہ ہو'۔ آج ہم نے اس معیار کو ترک کردیا ہے اس لیے فریب' بے ایمانی اور دھونس دھاندلی کے ذریعے دولت حاصل کرنے والے ہمارے لیڈر بن گئے ہیں۔ اور اللہ کے خوف کے ساتھ جائز رزق حاصل کرنے والے بے حیثیت اور بے وقعت قرار دیئے جاتے ہیں۔ جب دولت ہی معیار ٹھہرا تو دنیا میں یہودیوں سے زیادہ کوئی دولت مند نہیں ہے۔

بہترین کسب توکل علی اللہ ہے

کون سا عمل سب سے اعلیٰ ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ذات الٰہی پر بھروسہ، تمام حاجات میں اس پر مکمل اعتماد اور ہر حالت میں اس پر حسنِ ظن رکھنا سب سے بہترین کسب ہے۔

طلب رزق کا اصول اور ذمہ داریاں

اس کی صورت یہ ہے کہ رزق کے متعلق جسے فکر دامن گیر ہو، اسے لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے التجا کرے اور محض اسی سے اس کی دعا و درخواست کرے۔ جیسا کہ حدیثِ قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے یوں خطاب فرماتا ہے:

يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ جَائِعٌ إِلَّا مَنْ أَطْعَمْتُهُ فَاسْتَطْعِمُوْنِيْ أُطْعِمْكُمْ

يَا عِبَادِيْ كُلُّكُمْ عَارٍ إِلَّا مَنْ كَسَوْتُهُ فَاسْتَكْسُوْنِيْ أَكْسُكُمْ

"میرے بندو! تم سب کے سب بھوکے ہو، ہاں جسے میں کھلا دوں؛ لہٰذا تم مجھ ہی سے کھانا طلب کرو میں تمہیں کھانا دوں گا۔ تم سب ننگے ہو ہاں جسے میں کپڑا پہنا دوں؛ لہٰذا تم مجھ ہی سے کپڑا مانگو میں تمہیں دوں گا۔ (یعنی ہر چیز جو مجھ سے مانگو میں تمہیں عطا کروں گا)۔"

جامع ترمذی میں سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے یوں مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يَسْأَلُ أَحَدُكُمْ رَبَّهُ حَاجَتَهُ كُلَّهَا حَتّٰى شِسْعَ نَعْلِهِ إِذَا انْقَطَعَ فَإِنَّهُ إِنْ لَمْ يُيَسِّرْهُ لَمْ يَتَيَسَّرْ

"ہر آدمی اپنی تمام حاجات حتیٰ کہ جوتے کا تسمہ تک اللہ رب العالمین سے مانگے کیونکہ اللہ تعالیٰ میسر نہ فرمائے تو جوتے کا تسمہ تک بھی میسر نہ آئے گا۔"

قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (۴۔۳۲)

"اللہ تعالیٰ سے اس کا فضل یعنی رزق طلب کرو۔"

نیز ارشاد ہے:

فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِي الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ

"جب نماز مکمل ہو جائے تو زمین میں چل پھر کر اللہ کا فضل (یعنی رزق) تلاش کرو۔"

[سورۃ الجمعۃ ۶۲۔۱۰]

یہ آیت اگرچہ جمعہ کے متعلق ہے۔ تاہم اس کا حکم ہر نماز کے ساتھ قائم ہے۔

یہ جان لینے کے بعد کہ رزق دینے والا صرف اللہ ہے ہم پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ:

- رزق کو صرف جائز ذرائع سے حاصل کریں۔
- اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر کریں اور اس سے ضرورت مندوں کی مدد کریں۔
- اسے صرف جائز چیزوں پر خرچ کریں۔
- اسے جوڑ جوڑ کر نہ رکھیں بلکہ اللہ پر توکل کریں کہ جس رب نے گزشتہ کل دیا تھا وہ آنے والے کل میں بھی دے گا۔
- فضول خرچی نہ کریں کیوں کہ فضول خرچی کرنے والوں کو اللہ عزوجل نے شیطان کے بھائی قرار دیا ہے۔

رزق کی کنجیاں / کشادگی رزق کے اصول

کسب معاش کے معاملے میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی نوع انسان کو حیرانی میں ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے نہیں چھوڑا بلکہ کتاب وسنت میں رزق کے حصول کے اسباب کو خوب وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔ اگر انسانیت ان اسباب کو اچھی طرح سمجھ کر مضبوطی سے تھام لے اور صحیح

انداز میں ان سے استفادہ کرے تو اللہ مالک الملک لوگوں کے لئے ہر جانب سے رزق کے دروازے کھول دیں۔ آسمان سے ان پر خیر و برکت نازل فرما دیں اور زمین سے ان کے لئے گوناگوں اور بیش بہا نعمتیں اگلوائیں۔

قرآن وسنت کی رو سے کشادگی رزق کے چند اصول درج ذیل ہیں:

اللہ پر بھروسہ کرنا

یعنی آدمی کے دل میں یہ عقیدہ پختہ ہونا چاہئے کہ جب اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کیا ہے تو روزی بھی وہی دے گا۔ اس نے میرے دنیا میں آنے سے قبل ہی میری روزی لکھی ہے۔ سورہ الطلاق میں ہے:

ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ

"اور جو شخص اللہ پر بھروسہ کرے تو اللہ اس کے لئے کافی ہے۔"

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اگر تم اللہ پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کا حق ہے تو وہ تمہیں اس طرح رزق دیتا جیسے پرندوں کو رزق دیتا ہے وہ صبح کو خالی پیٹ جاتے ہیں اور شام کو بھرے پیٹ واپس آجاتے ہیں۔" (ترمذی)

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"اگر تم اللہ پر اس طرح بھروسہ کرو جس طرح بھروسہ کرنے کا حق ہے تو وہ تمہیں ایسے ہی رزق دے گا جیسے وہ پرندوں کو رزق دیتا ہے جو صبح کے وقت خالی پیٹ نکلتے ہیں اور شام کے وقت پیٹ بھر کر واپس آتے ہیں۔"

[مسند امام احمد والترمذی وابن ماجہ۔ بحوالہ صحیح الجامع للالبانی: 5254]

عجیب بات ہے کہ اگر کوئی کافر کسی آدمی کو یقین دہانی کرائے کہ تم یہ کام کرو میں تیرے کھانے کا بندوبست کرتا ہوں تو آدمی اس پر بھروسہ کر لیتا ہے تو پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اللہ پر بھروسہ نہیں کرتا۔

توبہ اور استغفار

مالک کائنات فرماتے ہیں:

اور میں نے کہا کہ اپنے رب سے اپنے گناہ بخشواؤ (اور معافی مانگو) وہ یقیناً بڑا بخشنے والا ہے۔ وہ تم پر آسمان کو خوب برستا ہوا چھوڑ دے گا اور تمہیں خوب پے در پے مال اور اولاد میں ترقی دے گا اور تمہیں باغات دے گا اور تمہارے لیے نہریں نکال دے گا۔"

(سورۃ نوح)

تقویٰ

اللہ عزوجل فرماتا ہے:

"اور جو شخص اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے چھٹکارے کی شکل نکال دیتا ہے اور

اسے ایسی جگہ سے روزی دیتا ہے جس کا اسے گمان بھی نہ ہو اور جو شخص اللہ پر توکل کرے گا اللہ اسے کافی ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اپنا کام پورا کر کے ہی رہے گا۔ اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کا ایک اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔" (سورۃ الطلاق)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بے شک میں ایک ایسی آیت جانتا ہوں اگر لوگ اس پر عمل کر لیں تو ان کے لئے کافی ہو جائے وہ آیت یہ ہے:

ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب

"جو شخص اللہ سے ڈر اختیار کرے گا اللہ اس کے لئے مشکلات سے نکلنے کا راستہ پیدا کرے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کا گمان بھی نہ ہو گا۔

(مشکوۃ ' ص 453)

نماز کا اہتمام

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرتے رہیں اور اس پر ہم آپ سے رزق نہیں مانگتے بلکہ رزق تو ہم آپ کو دیں گے۔" (سورہ طہ)

یعنی ہم تم سے یہ مطالبہ نہیں کرتے کہ تم اپنا اور اپنے اہل و عیال کا رزق اپنے زور علم وعمل سے پیدا کرو بلکہ یہ معاملہ ہم نے اپنے ذمے لے رکھا ہے کیونکہ رزق کی تحصیل دراصل انسان کے بس میں ہے ہی نہیں۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت سے نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے ابن آدم تو میری عبادت کے لئے اپنے آپ کو فارغ کر لے تو میں تیرے سینے کو غنا و استغناء سے بھردوں گا اور تیری محتاجی کو دور کروں گا اور اگر تو نے ایسا نہ کیا تو تیرا سینہ فقر اور مشغولیت سے بھر دوں گا اور محتاجی دور نہ کروں گا (یعنی جتنا مال بڑھتا جائے گا حرص بھی اتنی ہی بڑھتی چلی جائے گی اسی لئے ہمیشہ محتاج رہے گا۔" (ترمذی)

حج اور عمرے میں متابعت

امام احمد، ترمذی، نسائی، ابن خزیمہ اور ابن حبان سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"حج اور عمرہ کو ایک دوسرے کے بعد ادا کرو کیونکہ وہ دونوں فقر اور گناہوں کو اس طرح دور کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی سونے اور لوہے کے میل کچیل کو دور کرتی ہے اور حج مبرور کا ثواب جنت ہے۔"

صلہ رحمی

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"جو شخص اپنے رزق میں کشادگی اور عمر میں اضافہ پسند کرے وہ صلہ رحمی کرے۔"

حافظ صلاح الدین یوسف حفظہ اللہ "ریاض الصالحین" کی شرح میں لکھتے ہیں:

"صلہ رحمی کے اخروی اجر و ثواب کے علاوہ یہ دو بڑے فائدے ہیں۔ جو انسان کو حاصل ہوتے ہیں رزق میں اضافے سے مراد یا تو فی الواقع مقدار میں زیادتی ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے کر دی جاتی ہے یا پھر مراد اس کے رزق میں برکت ہے، اسی طرح عمر کا مسئلہ ہے یا تو یہ حقیقی طور پر زائد کر دی جاتی ہے، یا مراد اس سے بھی اُس کی عمر میں برکت ہے یعنی اُس کی زندگی بھرپہلو فوائد سے لبریز ہوتی ہے۔"

اللہ کا شکر ادا کرنا

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اللہ کے ہاں رزق تلاش کرو اور اس کی عبادت کرو اور اس کا شکر ادا کرو۔"

(سورہ العنکبوت)

اس آیت کے متعلق حضرت عطاء فرماتے ہیں کہ:

"مطلب یہ ہے کہ اللہ کی اطاعت اور اس کی عبادت کر کے اس سے روزی تلاش کرو اور جائز طریقے سے کرنا ہے کیونکہ تمہیں اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے وہ ناجائز پر حساب لے گا۔" (روح البیان)

والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

"جس کو یہ پسند ہو کہ اللہ تعالیٰ اس کی عمر دراز کرے اور اس کا رزق بڑھائے اس کو چاہئے کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرے۔"

(انوار البیان بحوالہ در منثور بیہقی)

صدقہ کرنا

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"تین باتیں ایسی ہیں کہ میں ان پر حلفیہ بیان دے سکتا ہوں (1) صدقے سے کبھی

مال کم نہیں ہوتا۔ (2) سوال کرنے سے مال بڑھتا نہیں' (3) معاف کرنے سے ذلت نہیں ہوتی (احیاء العلوم)

یہ وہ اصول ہیں جن کے بارے میں قرآن وحدیث میں وضاحت ہے کہ ان سے بندہ کے رزق میں اضافہ ہوتا ہے اور اس کی تنگی دور کر دی جاتی ہے، لیکن انسان کو ہمیشہ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اصل بے نیاز تو اللہ کی ذات ہے، انسان کی بے نیازی یہ ہے کہ وہ اس غنی ذات کے سوا پوری دنیا سے بے نیاز ہو جائے اور یہ سمجھ لے کہ جو کچھ اسے ملے گا اس سے ملے گا، غیر کے آگے ہاتھ پھیلانا بے کار ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"تونگری مال واسباب کی کثرت کا نام نہیں' بلکہ اصل تونگری دل کی تونگری ہے۔"

توکل کسب الی اللہ کے انسانی زندگی پر اثرات

عزت نفس

جو لوگ اس کا پختہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ روزی دینے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اسی پر بھروسہ وتوکل رکھنا چاہئے۔ ایسے لوگوں رزق کی تلاش میں در در کی ٹھوکریں کھانے سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس کی عزت نفس کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ ہر مشکل اور پریشانی میں وہ صرف اللہ کو ہی پکارتے ہیں۔

صبر کی دولت

کسب الی اللہ کے توکل کرنے سے انسان کو صبر جیسی عظیم دولت نصیب ہوتی ہے۔ رزق میں تنگی یا کشادگی کی آزمائش کو اللہ تعالیٰ کی رضا سمجھتے ہوئے ہر مشکل گھڑی میں وہ صبر کے دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔

رحم دلی' سخی اور پاک دامنی

جو شخص صرف رزق حلال پر اکتفا کرتا ہے' وہ رحم دل' سخی اور پاک دامن ہو جاتا ہے۔

بغض ونفرت سے دوری

اس کے اندر دوسرے لوگوں کے لئے نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔

نیک اعمال کی توفیق

اسے نیک اعمال کی توفیق اللہ تعالیٰ کی طرف سے ودیعت کی جاتی ہے۔

عبادت میں لطف ولذت

اسے اپنی عبادت میں لطف ولذت نصیب ہوتی ہے۔

دولت سکون

اس کا دل دولت سکون سے معمور رہتا ہے۔ اس کی کم آمدنی بھی [illegible] کے لیے سکون کا باعث ہوتی

ہے اور اسی میں اللہ پاک برکت ڈال دیتا ہے' جس معاشرہ میں رزق حلال کا خیال رکھا جاتا ہو' اس معاشرہ میں امن وسکون پیدا ہوتا ہے۔

جرائم میں کمی

تمام جہانوں کے رزق کی ذمہ داری خدا تعالیٰ نے لے رکھی ہے۔ وہی تمام لوگوں کو رزق دیتا ہے۔ انسان کو صرف محنت کرنی چاہیے۔ روزی اسی کے ہاتھ میں ہے جب ایک انسان کو اس بات کا یقین ہو گا تو انسان کبھی جرم نہیں کرے گا۔

کیونکہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

واللہ خیر الرازقین

"اللہ تعالیٰ بہتر رزق دینے والا ہے۔"

رزق کے معاملے میں سرکشی کرنے والوں پر اللہ کا غضب

اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

{كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَلَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ وَمَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى} [طٰهٰ:۸۱]

"کھاؤ ان پاکیزہ چیزوں میں سے جو ہم نے تمھیں دی ہیں اور ان میں حد سے نہ بڑھو، ورنہ تم پر میرا غضب اترے گا اور جس پر میرا غضب اترا تو یقیناً وہ ہلاک ہو گیا۔"

الطغیان:

عربی میں حد سے تجاوز کر جانے کو "طغیان" کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{اِنَّا لَمَّا طَغَى الْمَآءُ حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ ۝} [الحاقة:۱۱]

"بلاشبہ ہم نے ہی جب پانی حد سے تجاوز کر گیا، تمھیں کشتی میں سوار کیا۔"

رزق میں سرکشی کرنے والوں سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جنھیں اللہ تعالیٰ نے وافر رزق عطا کر رکھا ہو اور وہ اپنے رزق میں حد سے تجاوز کریں۔ یعنی بغیر ضرورت کے رزق حاصل کریں اور جس بات کا انھیں اللہ تعالیٰ نے حکم دے رکھا ہے، اس کی وہ مخالفت کریں۔ اس طرح سے ان پر اللہ کا غضب حلال ہو جاتا ہے۔

ایسے لوگوں کو رزق کی فراوانی اور صحت و عافیت اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ نافرمانی کریں۔ اور کفرانِ نعمت کرتے ہوئے اپنے منعم حقیقی کا شکر ادا کرنا بھول جاتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو لمبی مدت تک رزق کو ذخیرہ کیے رکھتے ہیں۔ اور پھر اس رزق کو کام میں لانے سے پہلے پڑے پڑے اس میں کیڑے پڑ جاتے ہیں اور وہ خراب ہو جاتا ہے۔ اور اس رزق میں سے بعض کی صلاحیت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ یعنی قابل استعمال رہتا ہی نہیں۔ چنانچہ وہ اس سٹاک کو ضائع کر کے پھینک دیتے ہیں۔ اگر یہ لوگ ذخیرہ اندوزی نہ کریں تو یہ خوراک کبھی خراب اور ضائع نہ ہو۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

بعض افراد یہ گمان کرتے ہیں کہ اسلام میں جو خدا تعالیٰ پر توکل کرنے اور اس کے رازق ہونے کا ذکر آیا ہے اس میں اور کام اور محنت کرنے کی تاکید میں تضاد پایا جاتا ہے۔ مثلاً سورہ ہود کی آیت نمبر چھ میں ارشاد ہوتا ہے:

"اور زمین پر چلنے والی کوئی مخلوق ایسی نہیں ہے جس کا رزق خدا کے ذمے نہ ہو"۔

اب اگر خدا تعالیٰ رازق ہے اور ہر مخلوق کی روزی اسی کے ذمے ہے تو پھر انسان کیوں محنت کرے اور حصول رزق کے لئے بھاگ دوڑ کس لئے کرے؟

نبی کریم صلی اللہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"بیشک آپ کا رب جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ فرما دیتا ہے اور (جس کے لئے چاہتا ہے) تنگ کر دیتا ہے، بیشک وہ اپنے بندوں (کے اعمال و احوال) کی خوب خبر رکھنے والا خوب دیکھنے والا ہے۔"

حضرت ابو درداء کہتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رزق بندے کی اس طرح تلاش کرتا ہے جس طرح انسان کو اس کی موت ڈھونڈتی ہے۔"

اس روایت کو ابو نعیم نے کتاب میں نقل کیا ہے:

"مطلب یہ ہے کہ رزق اور موت دونوں کا پہنچنا ضروری ہے کہ جس طرح کہ اس بات کی کوئی حاجت نہیں ہوتی کہ کوئی اپنی موت کو ڈھونڈے اور اس کو پائے بلکہ خود موت اس کے پاس ہر صورت میں اور یقینی طور پر آتی ہے، اسی طرح رزق کا معاملہ ہے کہ اس کو تلاش کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے بلکہ جو کچھ مقدر میں ہوتا ہے وہ ہر صورت میں لازمی طور پر پہنچتا ہے، خواہ اس کو ڈھونڈا جائے یا نہ ڈھونڈا جائے۔ تاہم اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ڈھونڈنے کی صورت میں رزق نہیں ملتا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حصول رزق کے لئے سعی و تلاش بھی تقدیر الٰہی اور نظام قدرت کے مطابق ہے البتہ جہاں تک قلبی اعتماد و بھروسہ کا تعلق ہے اور وہ صرف خدا کی ذات پر ہونا چاہئے نہ کہ سعی و تلاش پر۔"

لہٰذا اس سلسلے میں انسان کو خدا پر توکل اور اعتماد کرنا چاہئے اور یہ پختہ یقین رکھنا چاہئے کہ رزق کا ضامن اللہ تعالیٰ ہے۔ نیز اگر رزق ملنے میں کوئی رکاوٹ اور تاخیر ہو جائے تو اضطراب و بے چینی کا مظاہرہ نہیں کرنا چاہئے پھر اس اعتقاد کے ساتھ اپنی ضرورت و حاجت اور ہمت و طاقت کے بقدر معتدل و مناسب طریقہ پر حصول معاش کی سعی و تلاش میں لگنا چاہئے کہ اصل رازق تو اللہ تعالیٰ ہے، لیکن یہ بھی طریقہ عبودیت ہے کہ اپنا رزق حاصل کرنے کے لئے مناسب جدوجہد کی جائے۔

تقویٰ:

کسی ضرر رساں چیز سے بچنا یا پرہیز کرنا ''تقویٰ'' کہلاتا ہے۔ اصطلاحاً ''تقویٰ'' سے مراد پرہیز گاری اور احتیاط ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمارا خالق و مالک ہے، اس لیے ہمیں ہر وقت یہ خیال رکھنا چاہئے کہ ہم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جائے جو اس کی ناراضگی کا سبب بنے۔ دل کے اس احساس کو ''تقویٰ'' کا نام دیا جائے گا۔

تقویٰ سے متعلقہ اقوال:

1- بقول امام ابوالقاسم قشیری:

(i) ''اتقا کے اصلی معنی اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ذریعہ سے اس کے عذاب سے بچنا ہے۔''

(ii) ''تقویٰ تمام نیکیوں کا مجموعہ ہے۔''

2- بقول ابوعلی وقاق:

''اصل تقویٰ شرک سے بچنا ہے۔ اس کے بعد معصیت اور برائیوں سے بچنے کا درجہ آتا ہے۔ پھر شبہات سے بچنے کا پھر یہ کہ فضول باتوں کو ترک کر دے۔''

3- جریری کا قول ہے:

''جس شخص کے اور اللہ کے درمیان تقویٰ اور مراقبہ حاکم نہیں، وہ شخص کشف اور مشاہدہ تک نہیں پہنچ سکتا۔''

4- بقول ابوعبداللہ رودباری:

''تقویٰ یہ ہے کہ تو ان تمام چیزوں سے اجتناب کرے جو اللہ سے دور رکھیں۔''

5- ابن عطا کا قول ہے کہ:

''تقویٰ کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن۔ اس کا ظاہر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی حدود کا لحاظ رکھا جائے اور باطن نیت اور اخلاص ہے۔''

6- طلق بن حبیب کا قول ہے:

''اللہ کے عذاب کے ڈر سے اللہ کے نور کے مطابق اطاعت خداوندی پر عمل کرنے کا نام تقویٰ ہے۔''

7- ابوالحسین زنجانی کا قول ہے کہ:

''وہ جس شخص کا سرمایہ تقویٰ ہے، اس کے نفع کا بیان زبان سے نہیں ادا ہو سکتا۔''

تقویٰ، قرآن کی روشنی میں:

1- سورۃ الطلاق میں فرمایا گیا ہے:

ومن یتق اللّٰہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب

(اور جو کوئی خدا سے ڈرے گا وہ اس کے لیے مخلصی کی صورت پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا، جہاں سے گمان بھی نہ ہو۔)

2- فرمان الٰہی ہے:

اتقوا اللّٰہ حق تقاتہ

(اللہ کے عذاب سے ایسا بچو جیسا بچنے کا حق ہے)

3- فرمایا گیا ہے:

و لدار الآخرۃ خیر للذین اتقوا افلا تعقلون

(اور آخرت کا گھر یقیناً ان لوگوں کے لیے جو پرہیز گار ہیں بہتر ہے، کیا تم سمجھتے نہیں)

4- ارشاد خداوندی ہے:

ان اکرم کم عنداللّٰہ اتقاکم

(اللہ کے یہاں تم میں سے سب سے زیادہ ذی عزت وہ شخص ہوگا جو تم میں سے سب سے زیادہ پرہیز گار ہوگا)

5- سورۃ النحل میں فرمایا گیا ہے:

انذروا انہ لا الہ الا انا فاتقون

(آگاہ کر دے کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں، لہٰذا تم مجھ ہی سے ڈرو)

6- سورۃ المومنون میں فرمایا گیا ہے:

انا ربکم فاتقون

(میں تمہارا رب ہوں مجھ ہی سے ڈرو)

7- سورۃ جاثیہ میں فرمایا گیا ہے:

واللّٰہ ولی المتقین

(اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے)

تقویٰ کی مثالیں:

1- حضرت کعب بن احبارؓ سے حضرت عمر فاروقؓ نے سوال کیا کہ: تقویٰ کیا ہے؟

حضرت کعبؓ نے جواباً پوچھا: آپ کو کبھی خاردار راستے پر چلنے کا اتفاق ہوا؟

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: ہاں، کئی مرتبہ

حضرت کعبؓ نے پوچھا: تو پھر آپ وہاں سے کیسے گزرتے ہیں؟

حضرت عمرؓ نے جواب دیا: میں اپنے کپڑے سمیٹ لیتا ہوں کہ مبادا کانٹے دامن سے اُلجھ جائیں اور بچ بچ کر احتیاط سے قدم رکھتا ہوں۔

حضرت کعبؓ نے جواب دیا: بس یہی تقویٰ ہے!

(یعنی دنیا کے خارزار سے اس طرح گزر جانا کہ گناہ کا کوئی کانٹا دامنگیر نہ ہونے پائے۔ اسی کا نام تقویٰ ہے)

2- ابن سیرین نے گھی کے چالیس مٹکے خریدے۔ ان کے غلام نے کسی ایک مٹکے سے چوہا نکالا۔ ابن سیرین نے پوچھا کس مٹکے سے چوہا نکالا تھا۔ اس نے جواب دیا، مجھے معلوم نہیں۔ اس پر ابن سیرین نے تمام مٹکے انڈیل دیے۔

3- امام ابو حنیفہؒ اپنے مقروض کے درخت کے سایہ کے نیچے نہیں بیٹھا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ حدیث میں آیا ہے کہ ہر وہ قرض جس سے فائدہ ہو، وہ فائدہ سود ہے۔

4- کسی نے عتبۃ الغلام کو جاڑے کے موسم میں ایک جگہ دیکھا کہ پسینے پسینے ہو رہے ہیں۔ جب ان سے اس کا سبب پوچھا گیا تو فرمایا، یہ وہ جگہ ہے جہاں میں نے اللہ کی نافرمانی کی تھی۔ فرمایا: میں نے دیوار سے مٹی کا ایک ٹکڑا الگ کیا تھا جس سے میرے مہمان نے اپنا ہاتھ صاف کیا۔ میں نے دیوار کے مالک سے مٹی لینے کی اجازت نہیں لی تھی۔

5- ابو زید نے اپنے ایک ساتھی کے ساتھ جنگل میں کپڑا دھویا۔ ساتھی نے کہا: اس کپڑے کو انگور کی دیوار پر لٹکا دو۔ فرمایا: ایسا نہیں ہو سکتا، کیونکہ ہم لوگوں کی دیوار میں میخ نہ گاڑیں گے۔ اس پر ساتھی نے کہا: اچھا درخت پر ہی لٹکا دو۔ کہنے لگے: یہ بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس طرح تو درخت کی ٹہنی ٹوٹ جائے گی۔ ساتھی نے پھر کہا: اچھا تو ہم اسے اذخر پر پھیلا دیتے ہیں۔ فرمایا: یہ بھی نہیں ہو سکتا، کیونکہ یہ جانوروں کا چارا ہے، ہم اسے ان سے چھپا کر نہیں رکھیں گے۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی قمیض پیٹھ پر ڈال کر سورج کی طرف کر دی۔ یہاں تک کہ ایک طرف سے سوکھ گئی۔ پھر قمیض کو پلٹ دیا۔ یہاں تک کہ دوسرا حصہ بھی خشک ہو گیا۔

عدل:

اسلامی نظام معیشت میں عدل وانصاف کو ملحوظ رکھنے کی بار بار تاکید کی گئی ہے۔ عدل سے مراد یہ ہے کہ کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو۔ معاشی عدل یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کی محنت کا پورا پورا معاوضہ ادا کر دیا جائے اور کسی کی حق تلفی نہ کی جائے۔

عدل، قرآن کی روشنی میں:

1- سورۃ النحل میں فرمایا گیا ہے:

ان اللّٰہ یامر بالعدل و الاحسان

(بے شک اللہ انصاف اور نیکی کا حکم دیتا ہے۔)

2- سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

واوفوا الکیل و المیزان بالقسط

(اور انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپ کرو اور پورا پورا تول)

3- سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا ہے:

ولیکتب کاتب بالعدل

(اور (تمہاری باہمی قرارداد کو) کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھ دے)

4- سورۃ نساء میں فرمایا گیا ہے:

یاایھا الذین امنوا کونوا قومین بالقسط شھدآء للہ و لو علٰی انفسکم والوالدین و الاقربین ان یکن غنیًا او فقیرًا فاللہ اولی بھما فلا تتبعوا الھوٰی ان تعدلوا و ان تلوٗا او تعرضوا فان اللہ کان بما تعملون خبیرًاo

(اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو، اللہ کے لیے گواہ بنو، اگرچہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا، اگر وہ دولتمند ہے یا محتاج ہے، تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو۔ اگر تم زبان طو گے یا کچھ بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔)

5- سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

یاایھا الذین امنوا کونوا قوامین للہ شھدآء بالقسط و لا یجرمنکم شنان قوم علٰی الا تعدلوا اعدلوا ھو اقرب للتقوٰیo

(اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو، انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیز گاری کی بات ہے۔)

6- سورۃ الحدید میں فرمایا گیا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتب والمیزان لیقوم الناس بالقسط

(ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان پر کتابیں نازل کیں اور ترازو تا کہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔)

7- سورۃ الشوریٰ میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

وقل امنت بما انزل اللّٰہ من کتب و امرت لاعدل بینکم

(اور کہہ دے کہ میں ہر اس کتاب کو مانتا ہوں جو اللہ نے اُتاری اور مجھے خدا سے یہ حکم ملا ہے کہ میں تمہارے بیچ میں انصاف کروں۔)

8- سورۃ المائدہ میں حکم دیا گیا ہے:

وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللّٰہ یحب المقسطین

(اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔)

پیدائش دولت اور عدل:

پیدائش دولت کے ضمن میں معاشی عدل یہ ہے کہ معاشرہ کا ہر فرد محنت و مشقت سے اپنی ذہنی و جسمانی و ذہنی صلاحیتیں صرف کر کے رزق حلال کمائے۔ اسلام کے تحت ہر شخص کو وسائل پیداوار سے استفادہ کرنے کا مساوی حق ہے۔ اس حق کو تحفظ دینا اسلامی حکومت کا فرض ہے۔

پیدائش دولت کا ایک اہم ذریعہ زمین ہے، جس کے بارے میں اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی ملکیت ہے اور کوئی انسان اس پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کرنے کا مجاز نہیں تاہم زمین انسان کے پاس بطور خلیفہ امانت ہے۔

بادشاہت میں ملک کی زمین بادشاہ کی ملکیت متصور ہوتی ہے لیکن اسلامی حکومت (خلافت) میں یہ عوام الناس کے پاس بطور امانت ہوتی ہے جس کا انتظام حکومت وقت کرتی ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

"زمین خدا کی ہے اور بندے بھی خدا کے ہیں۔ جو شخص کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہی اس زمین کا زیادہ حقدار ہے۔"

نبی اکرم ﷺ نے زمین کے بارے میں دو ضابطے مقرر فرمائے:

1- یہ کہ جو شخص دوسرے کی مملوکہ زمین کو آباد کرے، وہ اس فعل آبادکاری کی بناء پر ملکیت کا حقدار نہیں ہو جائے گا۔

2- یہ کہ جو شخص خواہ مخواہ احاطہ کھینچ کر یا نشان لگا کر زمین کو روک رکھے اور اس پر کوئی کام نہ کرے، اس کا حق تین سال کے بعد ساقط ہو جائے گا۔

جیسا کہ فرمان نبوی ﷺ ہے:

''غیر مملوکہ زمین جس کا کوئی ولی و وارث نہ ہو، خدا اور رسول کی ہے۔ پھر اس کے بعد وہ تمہارے لیے ہے۔ ہمیں جو کوئی مردہ زمین کو زندہ کرے، وہ اسی کی ہے اور بیکار روک رکھنے والے کے لیے تین سال بعد کوئی حق نہیں ہے۔''

ملکیتِ زمین کے بارے میں امام ابو یوسف ''کتاب الخراج'' میں لکھتے ہیں کہ:

''جس زمین کو امام بزور شمشیر فتح کرے، اس معاملہ میں اسے اختیار ہے کہ اگر چاہے تو فاتح فوج میں اُسے تقسیم کر دے۔ اس صورت میں وہ عشری زمین ہو جائے گی لیکن اگر وہ تقسیم کرنا مناسب نہ سمجھے اور بہتر خیال کرے کہ اسے اس کے پرانے باشندوں کے ہاتھوں میں رہنے دے، جیسا کہ حضرت عمر فاروقؓ نے عراق میں کیا، تو وہ ایسا کرنے کا بھی مجاز ہے۔ اس صورت میں وہ زمین خراجی ہو جائے گی اور خراج لگ جانے کے بعد امام کو یہ حق حاصل نہ رہے گا کہ اس کے باشندوں سے اس کو چھین لے، وہ ان کی ملکیت متصور ہو گی اور وہ اس کو وراثت میں ایک دوسرے کی طرف منتقل کر سکیں گے اور اس کی خرید و فروخت کر سکیں گے۔''

پیدائش دولت کا دوسرا اہم ذریعہ تجارت ہے۔ اسلام ہر فرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی حدود میں رہتے ہوئے تجارت کو اپنا ذریعہ معاش بنائے۔ اسلام نے تجارت کے ضمن میں جو قوانین اور اصول وضع کیے ہیں، ان پر عمل کرنا معاشی عدل کے قیام کے لیے ضروری ہے۔

زراعت و تجارت کے علاوہ پیدائش دولت کے اور بھی بے شمار ذرائع ہیں۔ اسلام کے مطابق ہر فرد ہر حلال چیز کی بیع وغیرہ کے ذریعے رزق کما سکتا ہے۔ اسلام میں اکتسابِ مال کے تمام حرام ذرائع کی سختی سے ممانعت کی گئی ہے۔ ان ذرائع کو حرام اس لیے قرار دیا گیا ہے کہ ان سے بے شمار معاشی، معاشرتی اور اخلاقی مفاسد پیدا ہوتے ہیں۔ اسلام میں عصمت فروشی، قحبہ گری، لونڈے بازی، قمار بازی، رقص و سرود، موسیقی آلات موسیقی، مخرب اخلاق اشیاء کی پیدائش و فروخت، سود، رشوت خوری، ملاوٹ، ذخیرہ اندوزی، منشیات فروشی، مصوری، چوری، حرابہ، ڈاکہ زنی وغیرہ کو ذریعہ آمدن بنانا حرام ہے۔

پیدائش دولت کے لیے محنت و مشقت از حد ضروری ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو اپنے ہاتھ سے سرتوڑ محنت کر کے رزق کمانے کی تلقین کرتا ہے اور مفت کی کمائی مثلاً گداگری اور طفیلی پن وغیرہ سے دور رہنے کا درس دیتا ہے۔

پیدائش دولت کے ضمن میں عدل تبھی قائم و برقرار رہ سکتا ہے، جب رزق کمانے والے کو اس پر حق تصرف بھی حاصل ہو اور اس کی کمائی ہوئی دولت اور جائز ذرائع سے خریدی ہوئی جائیداد یا ورثے میں ملی ہوئی

جائیداد پر اُسے حق ملکیت حاصل ہو۔ اسلام نجی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے تاکہ معاشرہ میں معاشی عدل برقرار رہے۔

تقسیم دولت اور عدل:

اسلام دولت کو گردش میں رکھنے کا قائل ہے، تاکہ یہ چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر نہ رہ جائے، دولت کو گردش میں رکھنے کا اسلام نے ایک باقاعدہ طریقہ کار مقرر کیا ہے، جس میں صدقہ، خیرات، فطرانہ، زکوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے علاوہ انتقال دولت کی بدولت دولت گردش میں رہتی ہے اور معاشرہ کے تمام افراد اس سے یکساں طور پر مفید ہو سکتے ہیں۔

اسلام نے تقسیم دولت کو عادلانہ بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جو قواعد و ضوابط وضع کیے ہیں، ان میں سے چند قواعد درج ذیل ہیں:

1- عاملین پیدائش کو ان کی خدمات کا منصفانہ معاوضہ ادا کیا جائے۔

2- مزدور کو اس کا معاوضہ فوری طور پر ادا کر دیا جائے، جیسا کہ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"مزدور کی اُجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کردو۔"

3- مزدور کے معاوضہ کا تعین بقدر محنت کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہا گیا ہے کہ کوئی کام کروانے سے پہلے اس کا معاوضہ طے کرلو اور معاملہ کو احاطہ تحریر میں لے آؤ تاکہ بعد میں کوئی نزاع پیدا نہ ہو۔

4- معاوضوں کی ادائیگی کو محنت اور خطر کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے۔

5- معاشی نظام میں جائز حدود کے اندر معاشی جدوجہد کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی آمدنیوں میں تفاوت کو کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

6- ضروریات سے زائد مال حاجتمندوں میں تقسیم کر دینے کی تلقین کی گئی ہے۔

7- ذخیرہ اندوزی (احتکار) اور اکتناز کی مذمت کی گئی ہے۔

8- دولت کو راہ خدا میں خرچ کیے بغیر جمع کرنا حرام قرار دیا گیا ہے۔

تبادلہ دولت اور عدل:

عام طور پر اشیاء کا لین دین تول کر یا ناپ کر کیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

واقیمو الوزن بالقسط ولا تخسروا المیزان

(اور وزن انصاف کے ساتھ پورا کرو اور تولنے میں کمی نہ کرو)

اسلام نے اشیاء و خدمات کے لین دین میں خریدنے اور بیچنے کی باہمی رضامندی کو بنیادی اصول قرار دیا ہے اور کاروبار کی ان تمام شکلوں کی ممانعت کر دی ہے۔ جو ظلم، جبر اور فریب پر مبنی ہوں اور جن سے کسی فریق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو۔ اسلام میں لین دین کرتے وقت اسے احاطہ تحریر میں لانے اور اس پر گواہ مقرر

کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تا کہ ہر فریق اپنے عہد پر قائم رہے اور نزاع کی صورت میں تحریر کو بطور سند پیش کیا جا سکے۔

انتقال دولت اور عدل:

اسلام میں انتقال دولت کی تین معروف صورتیں ہیں:

1- کسب
2- وراثت
3- ہبہ

کسب:

اسلام میں کسب صرف وہ جائز ہے جو کسی حلال طریقے سے کیا گیا ہو۔کوئی شخص کسی بھی اس چیز کا کاروبار کر سکتا ہے جسے اسلام نے حرام قرار نہ دیا ہو۔ان تمام اشیاء کی خرید وفروخت حرام ہے جنہیں اسلام نے حرام قرار دیا ہے۔

وراثت:

اسلام وراثت کے بارے میں ایک با قاعدہ قانون پیش کرتا ہے جس کے تحت متوفی کی جائیداد اس کے لواحقین میں تقسیم ہو جاتی ہے۔وراثت صرف وہی معتبر ہے جو کسی مال کے جائز مالک سے اس کے وارث کو شرعی قاعدہ کے مطابق پہنچے۔وراثت کے ذریعہ انتقال میں بھی اسلام نے عدل سے کام لیا ہے۔

ہبہ:

ہبہ یا عطیہ انتقال دولت کی ایک صورت ہے۔ہبہ وہی معتبر ہے جو کسی ملک کے جائز مالک نے شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے کیا ہو۔اگر حکومت نے کسی کو عطیہ دیا ہو تو وہ اسی صورت میں جائز ہو گا کہ وہ کسی قومی یا دینی خدمت کے صلہ میں معاشرہ کے مفاد کے لیے املاک حکومت میں سے معروف طریقے پر دیا گیا ہو۔اس قسم کا عطیہ دینے کی مجاز وہی حکومت ہے جو شرعی دستور کے مطابق شوریٰ کے طریقے سے چلائی جا رہی ہو اور جس کا محاسبہ کرنے کی قوم کو آزادی ہو۔

تصرف دولت اور عدل:

اسلام ہر شخص کو اجازت دیتا ہے کہ وہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی اپنی دولت کو جائز کاموں میں صرف کرے۔کوئی شخص اپنی ملکیت میں سے کسی ایسے طریقے پر صرف نہیں کر سکتا۔جو معاشرہ کے لیے نقصان دہ ہو یا اس میں خود اس کے دین کا،اس کے اہل وعیال کا اور حقداروں کا ضیاع ہوتا ہو۔

اسلام فضول خرچی اور حرام کاموں پر دولت صرف کرنے کی مذمت کرتا ہے اور میانہ روی کو پسند کرتا

ہے، یہ انفاق فی سبیل اللہ کا بھی درس دیتا ہے۔

ریاست کی معاشی ذمہ داریاں اور عدل:

اسلام ریاست وحکومت پر یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے شہریوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرے اور لوگوں کے ذریعہ معاش کے لیے زیادہ سے زیادہ وسائل پیدا کرے اور لوگوں کو معاشی جدوجہد کے مساوی مواقع فراہم کرے، حکومت پر فرض ہے کہ وہ آجرو اجیر کے تعلقات کو مساویانہ بنیادوں پر استوار کرے اور معاشی اجارہ داریوں کا سدباب کرے، محصولات کی وصولی اور سرکاری اخراجات میں اصول عدل کو ملحوظ رکھنا بھی ریاست کی ذمہ داری ہے۔

عدل کی مثالیں:

1- نبی اکرم ﷺ نے معاشرتی اور معاشی عدل کی بہت سی مثالیں قائم کیں۔ ہجرت کے بعد آپ نے مدینہ منورہ میں مواخات کا جو اصول قائم کیا، وہ معاشی عدل کی ایک عملی مثال ہے۔ انصار نے اپنے مال اور جائیداد میں مہاجرین کو حصہ دار بنالیا۔

2- مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب "سیرت النبی" میں لکھتے ہیں کہ عرب میں قبیلہ مخزوم کی ایک عورت تھی جو لوگوں سے چیزیں عاریت لے کر مکر جاتی تھی۔ یہ مقدمہ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا، تو آپ نے اس کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ یہ بڑے گھرانے کی عورت تھی۔ اچھے اچھے لوگوں نے اس کی سفارش کی تو آپ نے فرمایا:

"تم سے پہلے قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب معمولی لوگ قصور کرتے تھے تو ان کو سزا دیتیں اور جب کوئی معزز آدمی وہی کام کرتا تو اس کو چھوڑ دیتیں۔ خدا کی قسم! اگر محمد (ﷺ) کی بیٹی فاطمہ (رضی اللہ عنہا) بھی یہ کام کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹتا۔"

3- حضرت عمر فاروق ؓ کسی شخص کو عامل مقرر کرتے اس سے یہ عہد لیتے تھے کہ وہ مظلوم لوگوں کے لیے اپنے دروازے بند نہیں کرے گا اور اپنے دروازہ پر دربان نہیں رکھے گا۔ آپ نے عیاض بن غنم کو اسی شرط پر مصر کا عامل مقرر کیا تھا۔ کسی شخص نے ان کے خلاف شکایت کی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے اور اپنے دروازہ پر دربان رکھتے ہیں۔ اس پر آپ نے عامل مصر کو طلب کیا اور فرمایا کہ "اپنی قمیض اتار دو اور موٹے اون کی قمیض پہن کر بکریاں چراؤ۔ ان کا دودھ خود پیو اور راہگیروں کو پلاؤ، جو بچ رہے وہ محفوظ رکھو۔" عیاض بن غنم نے تذبذب سے کام لیا تو آپ نے فرمایا: تمہیں یہ بات اتنی ناگوار کیوں معلوم ہوتی ہے، جبکہ تمہارے باپ کا نام غنم اسی لیے پڑ گیا تھا کہ وہ بکریاں چرایا کرتے تھے۔

عیاض بن غنم نے آئندہ اپنی روش ترک کرنے کا عہد کرلیا تو آپ نے انہیں ان کے منصب پر بحال کردیا، اس کے بعد وہ اتنے اچھے بن گئے کہ حضرت عمرؓ کے دور کا کوئی عامل اتنا اچھا نہ تھا۔

احسان:

"احسان" کے لغوی معنی ہیں: اچھا سلوک، نیکی، مہربانی۔ اصطلاحاً "احسان" سے مراد یہ ہے کہ کسی کو برضا و رغبت اس کے حق سے زیادہ دے دیا جائے۔

"اردو دائرہ معارف اسلامیہ" میں "احسان" کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"باہمی معاملات میں دیتے وقت دوسرے کے حق سے زائد دینے کی سعی اور لیتے وقت اپنے حق سے کم پر راضی ہو جانے کا نام "احسان" ہے۔"

بقول سید سلیمان ندوی:

"بھلائی (احسان) کرنا ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام پر محیط ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا نیک سلوک کرنا، جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔"

احسان، قرآن کی روشنی میں:

ذیل میں احسان سے متعلقہ چند آیات درج کی جا رہی ہیں:

1- سورۃ النحل میں فرمایا گیا ہے:

ان اللّٰہ یامر بالعدل و الاحسان و ایتآئ ذی القربی

(بے شک اللہ انصاف اور احسان کرنے کا اور قرابتداروں کو دینے کا حکم دیتا ہے)

بقول سید سلیمان ندوی، انصاف تو کسی کی تکلیف و آرام اور رنج و راحت کی پروا نہیں کرتا۔ وہ ہر کسی کو اس کا واجبی حق دے دیتا ہے، لیکن احسان میں اس کا لحاظ رکھا جاتا ہے، اس لیے خداوند تعالیٰ نے عدل کے ساتھ اس کا ذکر کیا ہے۔ پھر احسان کی ایک خاص اور متداول صورت یعنی قرابتدوں کی مالی امداد کا ذکر کیا، لیکن احسان مالی امداد ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ احسان کے اور بھی مختلف طریقے ہیں اور عام لوگوں کے علاوہ باپ، ماں، قرابتدار، یتیم محتاج، پڑوسی، اجنبی، آس پاس کے بیٹھنے والے، مسافر اور لونڈی، غلام اس کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، اس لیے خدا نے سورۃ نساء کی ایک آیت (رکوع۔5) میں ان لوگوں کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ احسان کرنے کا حکم دیا ہے اور باپ ماں کے ساتھ احسان کرنے کی متعدد آیتوں میں تاکید کی ہے۔

2- سورۃ القصص میں فرمایا گیا ہے:

و احسن کما احسن اللّٰہ الیک

(اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے تو بھی اوروں کے ساتھ احسان کر)

3- قصورواروں کے قصور کو معاف کرنا اور غصہ کو پی جانا بھی احسان ہے۔ اسی قسم کا احسان کرنے والوں کے بارے میں سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

واللّٰہ یحب المحسنین

(اور اللہ احسان کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے)

4- سورۃ الاعراف فرمایا گیا ہے:

ان رحمت اللّٰہ قریب من المحسنین

(بے شک اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں کے قریب ہے)

5- سورۃ الرحمٰن میں فرمایا گیا ہے:

ھل جزآء الاحسان الا الاحسان

(نیکی کا بدلہ نیکی کے سوا کچھ نہیں ہے)

6- سورۃ النور میں فرمایا گیا ہے:

ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربی والمساکین والمھاجرین فی سبیل اللّٰہ ولیعفوا ولیصفحوا

(اور تم میں جو احسان اور کشائش والے ہیں، وہ قرابتداروں، غریبوں اور خدا کی راہ میں ہجرت کرنے والوں کو نہ دینے کی قسم نہ کھالیں، ان کو چاہئے کہ معاف کریں اور درگزر کریں)

اِحسان، اسوۂ رسول ﷺ کی روشنی میں:

نبی اکرم ﷺ کا دستور تھا کہ جب آپ کسی سے قرض لیتے تو واپسی پر اس سے زیادہ ادا فرماتے۔ ایک دفعہ آپ نے کسی سے ایک اُونٹ قرض لیا۔ جب واپس کیا تو اس سے بہتر اونٹ واپس کیا، بعض اوقات ایسا ہوتا تھا کہ آپ کسی شخص سے ایک چیز خریدتے اور قیمت چکا دینے کے بعد وہ چیز اسی کو بطور عطیہ عنایت فرمادیتے۔ چنانچہ ایک مرتبہ آپ نے حضرت عمر فاروقؓ سے ایک اُونٹ خریدا۔ پھر اُسی وقت وہ اُونٹ ان کے بیٹے کو ہبہ کردیا۔

آنحضور ﷺ کی زندگی احسان کا عملی نمونہ تھی۔ آپ نے کبھی کسی شخص کا حق سلب نہیں کیا بلکہ دوسروں کو ان کے حق سے زیادہ دیا۔ اگر کسی نے آپ سے ذرا سی نیکی کی تو آپ نے بڑھ چڑھ کر اس پر احسان کیا۔ عبداللہ بن ابی ایک منافق شخص تھا اور آنحضور ﷺ اس کی منافقت سے پوری طرح باخبر تھے، لیکن اُس کے مرنے پر کفن کے لیے اپنی قمیض عطا فرمائی، کیونکہ اس نے جنگِ بدر کے موقع پر آنحضور ﷺ کے چچا حضرت عباس کو اپنا کرتا دیا تھا۔ یہ وہ موقع تھا کہ حضرت عباس ابھی مسلمان نہ ہوئے تھے اور کفارِ قریش کی جانب سے لڑنے آئے تھے اور پھر کفارِ مکہ کی شکست کے نتیجے میں گرفتار ہوگئے تھے۔ چونکہ ان کے بدن پر کرتا وغیرہ نہیں تھا

اور کسی کا کرتا انہیں پورا نہیں آتا تھا، اس لیے عبداللہ بن ابی نے جو قد میں ان کے برابر تھا، پہننے کے لیے انہیں اپنا کُرتا دیا۔ نبی اکرم ﷺ نے اس احسان کو یاد رکھا اور اس کے مرنے پر اپنا کرتا عنایت فرمایا۔

آنحضور ﷺ جب یتیم ہو گئے تو آپ کے دادا عبدالمطلب نے آپ کی کفالت کی۔ ان کی وفات کے بعد آپ کے چچا حضرت ابو طالب نے آپ کی کفالت کی۔ اس احسان کا بدلہ آپ نے اس طرح اتارا کہ اپنے چچا کے بیٹے حضرت علیؓ کی پرورش اپنے ذمہ لے لی اور پھر ان کے جوان ہونے پر اپنی صاحبزادی حضرت فاطمۃ الزہرؓا کا عقد ان سے کر دیا۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

1۔ ''اللہ تعالیٰ نے ہر شے پر احسان کرنا فرض کیا ہے تو اگر تمہیں کسی کو کسی شرعی حکم کے سبب سے) جان سے مارنا بھی پڑے تو اس کو بھی اچھائی کے ساتھ کرو۔ کسی جانور کو ذبح کرنا چاہو تو بھی خوبی کے ساتھ کرو چھری کو خوب تیز کر لو اور اپنے ذبیحہ کو راحت دو۔''

2- ''جو شخص اپنے قرضدار کو مہلت دے گا یا اس کا قرض معاف کر دے گا تو قیامت کے دن خدا کے عرش کے سایہ میں ہوگا۔''

3- ''جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے، وہ تنگدست کو مہلت دے یا اُس کا قرض معاف کر دے۔''

4- ''ایسے نہ ہو کہ خود تمہاری گرہ کی عقل نہ ہو، صرف دوسروں کی دیکھا دیکھی کام کرو۔ کہتے ہو کہ اگر لوگ احسان کریں گے، تو ہم بھی احسان کریں گے اور اگر وہ ظلم کریں گے تو ہم بھی کریں گے، بلکہ اپنے آپ کو اس پر مطمئن کر لو کہ اگر دوسرے احسان کریں تو تم احسان کرو ہی گے اور اگر وہ برائی بھی کریں تو تم ظلم نہ کرو۔''

معیشت میں احسان:

اسلام نے جہاں عدل سے کام لینے کی تلقین کی ہے، وہاں احسان کا حکم بھی دیا ہے۔ عدل کا مفہوم تو یہ ہے کہ کسی کو انصاف کے ساتھ کوئی چیز دی جائے اور اس میں کمی بیشی نہ کی جائے۔ اس کے بالمقابل احسان کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو کوئی چیز دیتے وقت برضا و رغبت اس کے حق سے زیادہ دی جائے۔ مثال کے طور پر آپ نے مزدور کے ساتھ اُجرت طے کر لی ہے کہ وہ فلاں فلاں کام کرے گا تو اسے پانچ سو روپے بطور معاوضہ ادا کیے جائیں گے۔ اس معاملہ میں عدل یہ ہے کہ کام مکمل ہونے پر اسے پورے پانچ سو روپے ادا کیے جائیں، نہ اس سے ایک پیسا کم ہو یا نہ زیادہ۔ اس کے برعکس احسان یہ ہے کہ آپ اسے اجرت (پانچ سو روپے) دیتے وقت دس بیس روپے زیادہ دے دیں۔

معیشت میں احسان کی مختلف صورتیں:

امام غزالی نے اپنی کتاب ''کیمیائے سعادت'' میں باہمی لین دین اور کاروبار کے سلسلہ میں احسان کی مختلف صورتیں بیان کی ہیں، جن میں سے چند صورتیں درج ذیل ہیں:

1- معیشت میں احسان یہ ہے کہ بائع زیادہ نفع حاصل کرنا جائز نہ سمجھے، خواہ خریدار اپنی ضرورت کی بناء پر زیادہ قیمت ادا کرنے پر رضامند ہی کیوں نہ ہو۔

اس قسم کے احسان کی مثال یہ حکایت ہے کہ حضرت سری سقطیؒ نے ایک دفعہ ساٹھ دینار کے بادام خریدے۔ اس اثناء میں باداموں کا بھاؤ بڑھ گیا۔ دلال نے کہا ان دنوں باداموں کا بھاؤ نوے دینار ہو گیا ہے۔ آپ نے فرمایا، ہو گا لیکن میں نے تو عہد کر رکھا ہے کہ قیمت خرید پر پانچ فیصد سے زیادہ منافع پر کوئی چیز فروخت نہیں کروں گا، اس لیے میں اپنے عہد سے روگردانی نہیں کروں گا۔

2- معیشت میں احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر کسی شخص سے خرید و فروخت کرنے کے بعد محسوس ہو کہ دوسرا شخص پچھتا رہا ہے تو بیع کو فسخ کر دے۔ ایسا کرنا واجب تو نہیں لیکن یہ ایک احسان ہے۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

''جو شخص اس طرح بیع فسخ کر لیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ گویا سودا ہوا ہی نہیں تھا، تو اللہ تعالیٰ بھی یہی سمجھے گا کہ گویا اس نے کوئی گناہ کیا ہی نہیں۔''

3- احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ غریب اور محتاج کو ادھار پر چیز دی جائے۔ پھر جب وہ رقم لوٹانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اُسے مہلت دی جائے اور اگر وہ پھر بھی ادا نہ کر سکے تو اس پر احسان کرتے ہوئے ادھار کی رقم اسے معاف کر دے۔ اس ضمن میں نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ:

''پہلے زمانے میں ایک آدمی کے پاس فرشتہ آیا کہ اس کی روح قبض کرے۔ اسے کہا گیا کہ تو نے ایک نیک عمل کیا ہے۔ اس نے کہا میں نہیں جانتا۔ اسے کہا گیا کہ اچھی طرح غور کر لے۔ اس نے کہا کہ میں صرف اتنا جانتا ہوں کہ میں دنیا میں خرید و فروخت کرتا تھا اور احسان کرتا تھا۔ میں مالدار کو مہلت دیتا اور تنگدست سے درگزر کر جاتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے اسے اس عمل کے بدلے میں جنت میں داخل کر دیا۔''

4- کاروبار میں احسان کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر کسی محتاج، مسکین، یتیم یا بیوہ سے مال خریدا جائے تو اسے طے شدہ رقم سے زیادہ قیمت دی جائے تا کہ وہ خوشحال ہو سکے۔ ایسے شخص کو جان بوجھ کر زیادہ قیمت ادا کرنا صدقہ دینے سے بھی زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔

پیدائش دولت اور احسان:

دولت پیدا کرنے والوں میں مزدور، مزارع اور کسان وغیرہ شامل ہیں۔ اسلام نے پیدائش دولت کے سلسلہ میں بھی احسان سے کام لینے کی ہدایت کی ہے۔ اسلام کے معاشی نظام میں آجروں کو اس امر کی تلقین کی گئی ہے کہ وہ عاملین پیدائش کے معاوضوں کی ادائیگی کے سلسلہ میں فراخدلی سے کام لیں۔ مثال کے طور پر اگر ایک مزدور کے ساتھ ایک سو روپے اجرت طے کی گئی ہے تو ادائیگی کے وقت اُسے ایک سو روپے سے زائد دے دیئے ہیں۔ ایک سو سے زائد دی جانے والی رقم احسان متصور ہوگی۔ اسی طرح اگر ایک مزارع کو کھیت میں کاشتکاری کے عوض دس من گندم دینے کا معاہدہ کیا گیا ہے تو اسے دس من سے زائد دی جانے والی گندم اس پر احسان متصور ہوگی۔

اسلام کے معاشی نظام میں اس امر کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے کہ اشیاء کی قیمتوں کے تعین میں خلق خدا کی آسانی کو ملحوظ رکھا جائے یعنی منافع کم وصول کیا جائے تاکہ غریب لوگ بھی خریداری کر سکیں۔

تقسیم دولت اور احسان:

اسلام کے معاشی نظام میں اس بات کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ دولت گردش میں رہے اور چند ہاتھوں میں مرتکز نہ ہونے پائے کیونکہ اس طرح بیروزگاری اور غربت پھیل جاتی ہے۔ امیر طبقہ عیش وعشرت میں مگن رہتا ہے اور غریب طبقہ روٹی کو بھی ترستا رہتا ہے۔ اسلام کے معاشی نظام میں تقسیم دولت کے سلسلہ میں ہمواری پیدا کرنے کے لیے انفاق فی سبیل اللہ یعنی صدقہ، فطرانہ، زکوٰۃ اور خیرات وغیرہ کی جو صورتیں مقرر کی گئی ہیں۔ وہ بھی احسان ہی کی صورتیں ہیں۔ وقف املاک اور وصایا کے ذریعے اہل حاجت کی امداد کی جا سکتی ہے اور اوقاف کی آمدنی سے غریب لوگوں کو علوم وفنون کی تربیت دے کر حصول روزگار کے قابل بنایا جا سکتا ہے۔ اسلام میں یہ بھی تلقین کی گئی ہے کہ عاملین پیدائش کو معاوضوں کی ادائیگی کے وقت آجر فیاضانہ طرز عمل کا مظاہرہ کریں تاکہ ہر عامل پیدائش کو اپنی ضروریات زندگی پوری کرنے کے مناسب وسائل دستیاب ہو سکیں۔

اخوت:

عربی میں بھائی (برادر) کو "اَخی" کہتے ہیں۔ آپس میں بھائی بھائی ہونے کا رشتہ یا عمل "اخوت" کہلاتا ہے۔ اصطلاحاً "اخوت" سے مراد ہے کہ اگر کوئی مسلمان غربت، تنگدستی اور معاشی بدحالی کا شکار ہو تو دوسرے مسلمان اس مشکل وقت میں اس کی مدد کریں تاکہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے۔

اسلامی اخوت کا پس منظر یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مکہ سے ہجرت کرکے پہنچے تو آہستہ آہستہ صحابہ کرامؓ بھی ہجرت کرکے وارد مدینہ ہوئے۔ یہ مہاجرین مکہ سے بالکل بے سروسامان آئے تھے، اس لیے نبی اکرم ﷺ نے ان کی مدد کے لیے "مواخاۃ" کا طریقہ اپنایا۔

مولانا شبلی نعمانی اپنی کتاب "سیرت النبیؐ" میں لکھتے ہیں کہ:

"اگرچہ مہاجرین کے لیے انصار کا گھر مہمان خانہ عام تھا، تاہم ایک مستقل انتظام کی

ضرورت تھی۔ مہاجرین نذر اور خیرات پر بسر کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ دست و بازو سے کام لینے کے خوگر تھے۔ تاہم چونکہ بالکل نکھرے تھے اور ایک حبہ تک پاس نہ تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ نے خیال فرمایا کہ انصار اور ان میں رشتہ اخوت قائم کر دیا جائے۔ جب مسجد کی تعمیر قریب ختم ہوئی تو آپ نے انصار کو طلب فرمایا۔ حضرت انس بن مالکؓ، جو اس وقت دس سالہ تھے، ان کے مکان میں لوگ جمع ہوئے۔ مہاجرین کی تعداد پینتالیس تھی۔ آنحضرت ﷺ نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا: "یہ تمہارے بھائی ہیں"۔ پھر مہاجرین اور انصار میں سے دو دو شخصوں کو بلا کر فرماتے گئے کہ: "یہ اور تم بھائی ہو" اور اب وہ درحقیقت بھائی تھے۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ سعد بن الربیعؓ، جو عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے بھائی قرار پائے، ان کی دو بیویاں تھیں۔ عبدالرحمٰنؓ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں، آپ اس سے نکاح کر لیں، لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کیا۔ انصار کا مال و دولت جو کچھ تھا۔ نخلستان تھے۔ روپے پیسے تو اس زمانہ میں تھے نہیں۔ انہوں نے رسول اللہؐ سے درخواست کی کہ یہ باغ ہمارے بھائیوں میں برابر تقسیم کر دیے جائیں۔ مہاجرین تجارت پیشہ تھے اور اس وجہ سے کھیتی کے فن سے بالکل ناآشنا تھے۔ اس بناء پر آنحضرت ﷺ ان کی طرف سے انکار کیا۔ انصار نے کہا سب کاروبار ہم خود سنبھال لیں گے، جو کچھ پیداوار اس میں نصف حصہ مہاجرین کا ہوگا۔ مہاجرین نے اس کو منظور کیا۔ یہ رشتہ بالکل حقیقی رشتہ بن گیا۔ کوئی انصاری مرتا تھا تو اس کی جائیداد اور مال مہاجر کو ملتا تھا اور بھائی بند محروم رہتے۔"

اخوت قرآن کی روشنی میں:

1- سورۃ انفال میں فرمایا گیا ہے۔

ان الذین امنوا و ھاجروا و جھدوا باموالھم و انفسھم فی سبیل اللّٰہ و الذین اووا و نصروا اولٓئک بعضھم اولیآء بعض

بے شک (جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور خدا کی راہ میں مال و جان سے جہاد کیا اور وہ لوگ جنہوں نے ان لوگوں کو پناہ دی اور ان کی مدد کی، باہم بھائی بھائی ہیں۔)

2- سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا ہے:

انما المومنون اخوۃ

(مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں)

3- سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے۔

و اذکروا نعمت اللّٰہ علیکم اذ کنتم اعدآءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہٖ اخوانًا

(اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم دشمن تھے، اللہ نے تمہارے دلوں کو جوڑ دیا پھر تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی ہو گئے۔)

اخوت، حدیث کی روشنی میں:

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1- ''مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اس کی مدد چھوڑتا ہے اور جو اپنے (مسلمان) بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان سے کوئی غم دور کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے قیامت کے دن کے غموں میں سے کوئی غم دور کرے گا۔''

2- ''مومن، مومن کے لیے ایک مضبوط عمارت کی مانند ہے کہ اس کا بعض بعض کو مضبوط کرتا ہے۔'' (پھر آپ نے ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں داخل کیں)

3- ''تم ایمان والوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کھانے، محبت کرنے اور شفقت و مہربانی کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے، جب اس کے کسی عضو کو بھی تکلیف ہوتی ہے تو جسم کے باقی سارے اعضاء بھی بخار اور بے خوابی میں اس کے شریک حال ہو جاتے ہیں۔''

4- ''اے لوگو! میری بات سنو، اچھی طرح جان لو کہ ہر مسلمان دوسرے کا بھائی ہے۔ سب اہل اسلام کی ایک برادری ہے، کسی شخص پر اس کے بھائی کا مال حلال نہیں جب تک وہ خود اپنی خوشی سے نہ دے، ایک دوسرے پر ظلم نہ کرو۔''

5- ''مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، وہ اس سے خیانت نہیں کرتا، اس سے جھوٹ نہیں بولتا اور نہ تکلیف کے وقت اُسے تنہا چھوڑتا ہے، ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی آبرو، مال اور خون حرام ہے۔''

6- ''اللہ تعالیٰ قیامت کے روز فرمائے گا باہم محبت کرنے والے کہاں ہیں، مجھے اپنی عظمت کی قسم! آج میں انھیں اپنے سائے میں جگہ دوں گا، آج میرے سایہ کے سوا کوئی سایہ نہیں

ہے۔"

7- "ایک شخص کسی دوسرے کی ملاقات کے لیے دوسرے گاؤں گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس راستہ میں ایک فرشتہ مقرر کر دیا۔ جب یہ شخص فرشتہ کے پاس پہنچا تو اس نے دریافت کیا، کہاں جا رہے ہو؟ اس نے جواباً کہا، میں اپنے بھائی سے ملنے جا رہا ہوں۔ فرشتہ نے دریافت کیا کیا تم اس پر کوئی احسان کرنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ اس شخص نے جواب دیا، نہیں میں صرف رضائے الٰہی کے لیے اُسے ملنا چاہتا ہوں۔ فرشتے نے کہا غور سے سنیے، میں خدا کا بھیجا ہوا فرشتہ ہوں اور تمہیں اس بات سے آگاہ کرنے آیا ہوں کہ خدا تجھ سے محبت کرتا ہے۔"

معیشت میں اخوت:

معیشت میں اخوت یہ ہے کہ صاحب ثروت لوگ حاجتمندوں کی حاجت روائی کریں۔ اسلام نے معیشت میں اخوت کا جذبہ پیدا کرنے کے لیے انفاق فی سبیل اللہ یعنی صدقہ، خیرات، فطرانہ اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام اپنایا ہے، جس کے تحت غریبوں، بیروزگاروں، حاجتمندوں، یتیموں، بیواؤں اور مسافروں کی مدد کی جاتی ہے۔ انصار مدینہ نے جذبہ اخوت کے تحت ہی مہاجرین کی مدد کی تھی اور انہیں اپنے مال میں حصہ دار بنایا تھا۔

اخوت کے معاشی اثرات:

باہمی محبت واخوت کا اثر معاش پر براہِ راست ہوتا ہے۔ یہ جذبہ ایک مسلم معاشرے کے اندر اخوت واستطاعت رکھنے والوں کو اس بات پر ابھارتا ہے کہ وہ استطاعت نہ رکھنے والوں کے لیے معاشی امداد کا ذریعہ بنیں۔ عالم اسلام میں مختلف مسلم ممالک کے مابین جذبہ اخوت اس بات پر اُکساتا ہے کہ وہ اپنے مخصوص وسائل کو باہم متحد کر کے عالم اسلام کی معاشی ترقی اور بہتری کا بندوبست کریں۔ اس وقت اگر عالم اسلام کو بحیثیت مجموعی دیکھا جائے، تو اس میں نہ دولت کی کمی ہے، نہ ذہانت وصلاحیت اور شجاعت کی لیکن صحیح اسلامی اخوت نہ ہونے کے باعث وہ نتائج برآمد نہیں ہو رہے، جو ہونے چاہئیں۔ خوش قسمتی سے اکثر اسلامی ممالک جغرافیائی لحاظ سے ایک دوسرے سے ملحق ومتصل ہیں۔ اگر ان میں صحیح اسلامی اخوت پیدا ہو جائے اور یہ سچے جذبۂ ایمانی کے ساتھ جدوجہد کریں تو ایک اسلامی بلاک وجود میں آ سکتا ہے جسے کسی دوسرے بلاک کے رحم وکرم کی قطعی کوئی ضرورت لاحق نہیں ہو سکتی۔

مساوات:

"مساوات" کے معنی ہیں: مساوی ہونے کی حالت، برابر ہونا، برابری، ایک جیسا ہونا۔

اسلام میں بحیثیت انسان تمام انسان برابر ہیں۔ ان میں نسب، ذات، رنگ، نسل اور دولت کی بناء

پر کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔ تمام انسان چونکہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام (ایک ہی ماں باپ) کی اولاد ہیں، اس لیے رشتہ میں سب بھائی بھائی ہیں اور رُتبہ میں ایک دوسرے کے برابر ہیں۔ اسلام کسی کو رنگ و نسل اور نسب وغیرہ کی بنیاد پر برتر تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک برتری کی بنیاد تقویٰ پر ہے۔

سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا ہے:

یایھا الناس انا خلقناکم من ذکر وانثی وجعلناکم شعوبا وقبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم

(اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبیلے بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔)

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"تمام انسان آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں اور آدم مٹی سے بنائے گئے۔ پس کسی عربی کو عجمی پر اور کسی گورے کو کالے پر فضیلت نہیں، فضیلت صرف تقویٰ اور پرہیز گاری کی بناء پر ہے۔"

چنانچہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے کہ دین و دُنیا میں برتر صرف وہی ہے جو متقی اور پرہیز گار ہے۔ تقویٰ کے علاوہ برتری کا کوئی دوسرا سبب نہیں ہے۔

مرد اور عورت میں مساوات:

دینی لحاظ سے مرد اور عورت مساوی ہیں۔ دونوں آدمؑ وحواؑ کی اولاد ہیں اور دونوں شریعت کے مکلف ہیں، قرآن دونوں کی رہنمائی کرتا ہے، دونوں کے حقوق متعین کرتا ہے اور دونوں پر ذمہ داریاں عائد کرتا ہے۔ دونوں اپنے اعمال کی بناء پر جزاء یا سزا کے مستحق ہوں گے، جیسا کہ قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

"جو نیک عمل کرے گا، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، بشرطیکہ وہ مومن ہو، اُسے ہم دُنیا میں پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور آخرت میں ایسے لوگوں کو ان کے اجر، ان کے بہترین اعمال کے مطابق بخشیں گے۔"

حق ملکیت کے لحاظ سے بھی مرد اور عورت مساوی حیثیت کے حامل ہیں۔ جس طرح مرد اپنی نجی جائیداد رکھ سکتا ہے، اسی طرح عورت کو بھی اپنی نجی جائیداد رکھنے کا حق حاصل ہے اور اسے اپنی جائیداد یا ملکیت پر حق تصرف بھی حاصل ہے۔ علاوہ ازیں مرد کی طرح وہ وراثت میں بھی حصہ دار ہے۔

جیسا کہ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

"مردوں کے لیے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا۔"

سورۃ النساء ہی میں فرمایا گیا ہے:

"جو کچھ مردوں نے کمایا ہے ان کے مطابق اس کا حصہ ہے جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے، ان کے مطابق ان کا حصہ ہے۔"

تاہم معاشی ذمہ داریوں کے لحاظ سے اسلام نے مرد اور عورت میں امتیاز رکھا ہے۔ اسلام مرد کو "قوام" قرار دیتا ہے:

الرجال قوامون علی النساء

(مرد عورتوں پر قوام ہیں)

یعنی مرد گھر کا سربراہ ہونے کی حیثیت سے آقا ہے اور عورت نائب۔ اسلام رزق کمانے کی ذمہ داری مرد پر عائد کرتا ہے اور عورت پر صرف یہ فرض عائد کرتا ہے کہ وہ اپنے شوہر کی کمائی ہوئی دولت سے گھر کا نظام اور نظم ونسق چلائے۔ اس صورت میں عورت اپنے شوہر کے مال کی "امین" ہے۔

حقِ معیشت میں مساوات:

اسلام کے نزدیک حق معیشت میں تمام انسان برابر ہیں۔ اس ضمن میں چند آیات درج ذیل ہیں:

1- سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے:

ولقد مکنکم فی الارض وجعلنا لکم فیھا معایش

(اور ہم نے زمین میں تمہارا ٹھکانا بنایا اور اس میں تمہارے لیے سامان معیشت پیدا کیے)

2- سورۃ الذریت میں فرمایا گیا ہے:

وفی السمآء رزقکم وما توعدون

(اور تمہارا رزق اور جس چیز کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے آسمان میں ہے۔)

3- سورۃ جاثیہ میں فرمایا گیا ہے:

وسخر لکم ما فی السموت والارض جمیعا منہ

(اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو تمہارے کام میں لگایا)

مذکورہ آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ حق معیشت میں تمام انسان (مرد وعورت) مساوی ہیں۔ اس ضمن میں اسلامی حکومت پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ لوگوں کو رزق کمانے کے مساوی مواقع فراہم کرے اور کسی کو حق معیشت سے محروم نہ کرے۔

عدم مساوات/ درجات میں تفاوت:

تمام انسان اہلیت وصلاحیت کے لحاظ سے مساوی نہیں ہیں۔ کوئی ذہنی لحاظ سے دوسروں سے مختلف ہے کوئی ہمت وحوصلہ اور محنت کی بناء پر دوسروں سے زیادہ کمائی کر سکتا ہے۔ اس لیے تمام انسان مساوی دولت

پیدا کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ چنانچہ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ جو جتنا کما سکے اس پر اس کا حق تسلیم کیا جائے۔ اسلام کسی شخص پر یہ قدغن نہیں لگاتا کہ وہ ایک مقررہ حد سے زیادہ دولت نہ کمائے۔ وہ ہر شخص کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ اپنی صلاحیت کے مطابق کوئی بھی جائز پیشہ اپنا کر رزق حلال کمائے اور اسے اسلام کی مقررہ کردہ حدود و شرائط کے تحت صرف کرے۔ اس لحاظ سے کہا جا سکتا ہے کہ اسلام درجات معیشت میں عدم مساوات کا قائل ہے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں کہ۔

"قرآن اس حقیقت کو اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی فطرت کے ایک پہلو کی حیثیت سے پیش کرتا ہے کہ دوسری تمام چیزوں کی طرح انسانوں کے درمیان رزق اور وسائل اور وسائل زندگی میں بھی مساوات نہیں ہے۔ مختلف تمدنی نظاموں کی مصنوعی بے اعتدالیوں سے قطع نظر، جہاں تک بجائے خود اس فطری عدم مساوات کا تعلق ہے اسے قرآن اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا اور اس کی تقسیم و تقدیر (Dispensation) کا نتیجہ قرار دیتا ہے اور اس کی پوری سکیم میں کہیں اس تخیل کا نشان نہیں ملتا کہ اس عدم مساوات کو مٹا کر کوئی ایسا نظام قائم کرنا مطلوب ہے جس میں سب انسانوں کو ذرائع معاش برابر ملیں۔"

درجات معیشت میں عدم مساوات سے متعلقہ چند آیات درج ذیل ہیں:

1- سورۃ السباء میں فرمایا گیا ہے:

قل ان ربی یبسط الرزق لمن یشاء من عبادہ ویقدر لہ

(کہہ دیجیے کہ میرا رب اپنے بندوں میں سے جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے نپا تلا کر دیتا ہے۔)

2- سورۃ الشوریٰ میں فرمایا گیا ہے:

لہ مقالید السموت والارض یبسط الرزق لمن یشاء ویقدر

(آسمانوں اور زمین کی کنجیاں اسی کے قبضہ میں ہیں، جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔)

3- سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

ان ربک یبسط الرزق لمن یشآء و یقدر

(درحقیقت تیرا رب جس کے لیے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے)

4- سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض و للاخرۃ اکبر درجت و اکبر تفضیلاً

(دیکھو کس طرح ہم نے بعض لوگوں کو بعض پر فضیلت دی ہے اور آخرت تو درجات کے فرق اور تفصیل میں اور بھی زیادہ ہے۔)

5- سورۃ الزخرف میں فرمایا گیا ہے:

اھم یقسمون رحمۃ ربك نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجات لیتخذ بعضھم بعضًا سخریًا ورحمۃ ربك خیر مما یجمعون

(کیا تیرے رب کی رحمت (نبوت) یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں ہم نے دُنیا کی زندگی میں ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کی ہے اور ان میں سے بعض کو بعض پر بلند درجے دیئے ہیں، تاکہ ان میں سے کچھ لوگ کچھ دوسرے لوگوں سے کام لیں اور تیرے رب کی رحمت تو اس مال و دولت سے بھی بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کرتے ہیں۔)

تعاون:

"تعاون" سے مراد ہے ایک دوسرے کی مدد کرنا، باہمی امداد، افراد کا ایک دوسرے سے خیر خواہی اور ہمدردی سے پیش آنا۔ اسلام تمام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیتا ہے اور انہیں تلقین کرتا ہے کہ وہ دین و دُنیا کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔

سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

وتعاونوا علی البر والتقوی

(اور نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو)

تعاون صرف نیک اور جائز کاموں میں فرض ہے۔ بدی اور گناہ کے کاموں میں تعاون ممنوع ہے۔ اگر حاکم وقت کسی خلاف شرع کام کی انجام دہی کا حکم دے تو اس سے انکار کیا جا سکتا ہے۔

تعاون کے ضمن میں نبی اکرم علیہ السلام کا ارشاد ہے:

المسلم اخو المسلم لایظلمه ولا یسلمه ومن کان فی حاجة اخیه کان الله فی حاجته ومن فرج عن مسلم کربة فرج الله عنه کربة من کربات یوم القیامة

"(مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے، اس پر ظلم نہیں کرتا اور نہ اس کی مدد چھوڑتا ہے اور جو حاجت روائی کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی حاجت پوری کرتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان سے کوئی غم دُور کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کے غموں میں سے کوئی غم دُور کردے گا۔"

معاشی تعاون:

"معاشی تعاون" سے مراد ہے: افراد اور اداروں کی وہ مشترکہ کوشش جس کی بناء پر وہ معاش مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ اسلام مسلمانوں کو معیشت کے ضمن میں بھی ایک دوسرے سے تعاون کرنے پر زور دیتا ہے۔ وہ صاحب ثروت لوگوں کو تلقین کرتا ہے کہ حاجتمندوں کی حاجت روائی کریں۔ اس ضمن میں قرض حسنہ کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ وہ ترغیب دیتا ہے کہ اہل حاجت کو بلا سود قرض فراہم کیا جائے اور اگر مقروض بروقت قرض ادا نہ کر سکے تو اُسے مہلت دی جائے۔ قرض حسنہ کو خدا نے خود اپنے اوپر قرض قرار دیا ہے اور اسے کئی گنا کر کے لوٹانے کا عہد کیا ہے۔

معاشی تعاون کی ایک صورت انفاق فی سبیل اللہ، یعنی صدقہ، خیرات، زکوٰۃ وغیرہ بھی ہے۔ اس قسم کے تعاون کے ذریعے حاجتمندوں، یتیموں، بیواؤں، بیماروں، بوڑھوں، معذوروں اور مصیبت زدگان کے ساتھ مالی تعاون کیا جا سکتا ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

"بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا مجاہد فی سبیل اللہ کے مانند ہے اور اس شخص کی طرح ہے جو دن بھر روزے سے رکھے اور رات بھر نمازیں پڑھے۔"

اسلامی نظام معیشت کے اساسی تصورات

سوال: اسلامی نظام معیشت کے اساسی تصورات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے!

اسلامی نظام معیشت کے اساسی تصورات:

اسلامی نظام معیشت ایک الہامی یا خدائی نظام معیشت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی پیغمبر آخر الزمان پر نازل ہوا اور اس کی تشریح و تعبیر نبی اکرم ﷺ نے فرمائی۔ یہ نظام فلاح دین و دنیا ہے۔ اس کے اساسی تصورات وہی ہیں، جو اسلام کے اساسی تصورات ہیں۔ تاہم معیشت سے متعلقہ اہم اساسی تصورات حسب ذیل ہیں، جن کا جائزہ آئندہ سطور میں لیا جائے گا۔

1- اللہ کی ملکیت
2- انسان بطور خلیفہ
3- تصور آخرت
4- رزق منجانب اللہ

5- کسب معیشت کی تحسین

6- معیشت و اخلاق

7- درجات معیشت

اللہ کی ملکیت:

اسلامی عقیدہ کے مطابق پوری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے، اس لیے خالق ہونے کی بناء پر پوری کائنات کا مالک ہے۔ کائنات میں زمین بھی شامل ہے، جس پر خدا کی پیدا کردہ مخلوق زندگی گزارتی ہے۔

ذیل میں چند آیات قرآنیہ پیش کی جارہی ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے:

1- سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے۔

لِلّٰہِ مَا فِی السموت وما فی الارض

(جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں سب کچھ اللہ ہی کا ہے)

اس جملہ (آیت) کی تشریح کرتے ہوئے مولانا امین احسن اصلاحی "تدبر القرآن" میں لکھتے ہیں:

"یہ جملہ اپنے اندر بیک وقت تین مفہوم رکھتا ہے۔ ایک تو یہ کہ ہر چیز خدا ہی کی ملکیت ہے، دوسرا یہ کہ ہر چیز اسی کے اختیار و تصرف میں ہے، تیسرا یہ کہ بالآخر ہر چیز کا مرجع خدا ہی ہے۔"

2- سورۃ المومنون کی آیت نمبر 84 سے آیت نمبر 87 تک میں فرمایا گیا ہے:

قل لمن الارض ومن فیھا ان کنتم تعلمون ○ سیقولون للہ قل افلا تذکرون ○ قل من رب السموت السبع ورب العرش العظیم ○ سیقولون للہ قل افلا تتقون ○

(تو کہہ کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے بتاؤ اگر تم جانتے ہو۔ اب کہیں گے سب کچھ اللہ کا ہے، تو کہہ پھر تم سوچتے کیوں نہیں؟ تو کہہ کون ہے مالک ساتوں آسمانوں کا اور مالک اُس بڑے تخت کا۔ اب بتائیں گے اللہ کو، تو کہہ پھر تم ڈرتے کیوں نہیں؟)

ان آیات میں نبی اکرم ﷺ کو فرمایا گیا ہے کہ آپ منکرین و مشرکین حق سے پوچھیں کہ یہ زمین کس کی ملکیت ہے اور جو کچھ زمین کے اوپر اور نیچے ہے وہ کس کا ہے؟ تو وہ کہیں گے کہ یہ زمین بھی اللہ کی ہے اور جو کچھ اس میں ہے، وہ کچھ بھی اللہ ہی کا ہے۔ اسی طرح آپ ان سے پوچھیے کہ ساتوں آسمانوں اور عرش عظیم کا کون مالک ہے تو وہ جواب دیں گے کہ ان سب کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ آپ اُن سے کہیے یہ سب کچھ جانتے ہوئے تم سوچتے اور ڈرتے کیوں نہیں؟

3- سورۃ الواقعہ کی آیت نمبر 68 اور 69 میں فرمایا گیا ہے:

افرایتم الماء الذی تشربون ○ ء انتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون

(بھلا دیکھو تو پانی کو جو تم پیتے ہو۔ کیا تم نے اتارا اُس کو؟ یا ہم ہیں اُتارنے والے) یعنی بارش بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے آتی ہے اور زمین کے خزانوں میں پانی بھی وہی جمع کرتا ہے۔ انسان کو کیا قدرت تھی کہ وہ پانی بنالیتا۔

4- سورۃ الواقعہ کی آیت نمبر 63 اور 64 میں فرمایا گیا ہے:

افرایتم ما تحرثون ○ ء انتم تزرعونہٗ ام نحن الزّٰرِعون ○

(بھلا دیکھو تو جو تم بوتے ہو۔ کیا تم اس کو کرتے ہو کھیتی یا ہم ہیں کھیتی کر دینے والے) یعنی زمین میں بیج بظاہر تم ڈالتے ہو، لیکن زمین کے اندر اس کی پرورش کرنا اور پھر باہر نکال کر ایک لہلہاتی کھیتی بنا دینا کس کا کام ہے؟ اس کے بارے میں تو ظاہری اور سطحی دعویٰ بھی تم نہیں کر سکتے کہ ہماری تیار کی ہوئی ہوتی۔

5- سورۃ الواقعہ کی آیت نمبر 71 تا 73 میں فرمایا گیا ہے:

افرایتم النار التی تورون ○ ء انتم انشاتم شجرتھا ام نحن المنشؤن ○
نحن جَعَلْنٰھَا تذکرۃً و متاعًا للمقوین ○

(بھلا دیکھو تو آگ جس کو تم سلگاتے ہو۔ کیا تم نے پیدا کیا اس کا درخت یا ہم ہیں پیدا کرنے والے، ہم نے ہی تو بنایا وہ درخت یاد دلانے کو اور برتنے کو جنگل والوں کے)

ان آیات میں ''النار'' (آگ) کے ساتھ ''شجر'' کا ذکر کیا گیا ہے۔ محققین کا کہنا ہے کہ عرب میں کئی درخت سبز ایسے بھی ہیں جن کو رگڑنے سے آگ نکلتی ہے، جیسے ہمارے ہاں بانس۔

مولانا شبیر احمد عثمانی آیت نمبر 73 کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''یہ آگ دیکھ کر دوزخ کو یاد کریں کہ یہ بھی اس کا ایک حصہ اور ادنیٰ نمونہ ہے اور سوچنے والے کو یہ بات بھی یاد آ سکتی ہے کہ جو خدا سبز درخت سے آگ نکالنے پر قادر ہے، وہ یقیناً مردہ کو زندہ کرنے پر بھی قادر ہوگا۔''

مذکورہ بالا آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے اور کسی انسان کو حقیقی طور پر کسی بھی چیز پر حق ملکیت حاصل نہیں ہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے چونکہ انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے، اس لیے اس کے تصرف میں جو کچھ بھی دیا گیا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے اور انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہی اسے استعمال کرنے یا خرچ کرنے کا مجاز ہے۔

انسان بطور خلیفہ:

انسان کی حیثیت ومنصب کے بارے میں اسلامی تصور یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔

سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 30 کے شروع میں فرمایا گیا ہے۔

واذ قال ربك للملئكة انی جاعل فی الارض خلیفة

(اور جب کہا تیرے رب نے فرشتوں کو کہ میں بنانے والا ہوں زمین میں ایک خلیفہ (نائب))

اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی "تدبر القرآن" میں رقمطراز ہیں:

"خلیفہ اس کو کہتے ہیں جو کسی کے بعد اس کے معاملات سرانجام دینے کے لیے اس کی جگہ لے۔ اس وجہ سے یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نے زمین میں کس کا خلیفہ بنانے کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا؟ اپنا یا زمین میں بسنے والی کسی پیشرو مخلوق کا؟ ایک رائے یہ ہے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات آباد تھے۔ جب انہوں نے اس میں فساد مچایا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پراگندہ ومنتشر کر دیا اور ان کی خلافت بنی نوع انسان کے سپرد فرمائی۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے زمین میں خود اپنا خلیفہ مقرر کرنے کا فیصلہ فرمایا۔ پہلی رائے اگرچہ بالکل بے بنیاد تو نہیں کہی جا سکتی، لیکن قرآن یا تورات یا کسی قابل اعتماد حدیث میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جس سے یہ ثابت ہو سکے کہ انسان سے پہلے زمین میں جنات کی حکمرانی تھی، دوسری رائے مختلف اعتبارات سے قوی معلوم ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے انسان کی فضیلت کے بہت سے پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا ہے، مثلاً یہ کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزیں انسان کے لیے پیدا کی ہیں، فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ انسان کو سجدہ کریں، نیز اس کے بارے میں فرمایا کہ جو امانت آسمان اور زمین اٹھانے سے قاصر رہے، اس کو انسان نے اٹھا لیا۔ یہ ساری باتیں اس امر کے حق میں ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہو، لیکن ان تمام دلائل کے باوجود ایک سوال اس رائے سے متعلق بھی پیدا ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ خلیفہ تو اس کو مقرر کرنے کی ضرورت پیش آیا کرتی ہے جو غائب یا غیر حاضر ہوتا ہو، خدا تو نہ کبھی غائب ہوتا ہے، نہ غیر حاضر، آسمان وزمین ہر جگہ اس کی حکومت ہمیشہ رہی ہے۔ پھر اس کے کسی کو خلیفہ مقرر کرنے کے کیا معنی؟ یہ سوال ہمارے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خلیفہ بنانے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو زمین کے انتظام وانصرام کے

معاملہ میں کچھ اختیار دے کر یہ دیکھے گا کہ انسان ان اختیارات کو خدا کی مرضی کے مطابق استعمال کرتا ہے یا خلافت پا کر وہ مطلق العنان بن جاتا ہے اور اپنی من مانی کرنے لگ جاتا ہے۔ یہ گویا اصل حکمران کی طرف سے ایک نائب مقرر کیے جانے کی شکل ہوئی اور اس نائب کے تقرر کی ضرورت یہ نہیں تھی کہ اصل حکمران کو غائب یا غیر حاضر ہونا تھا بلکہ اس نائب کو کچھ اختیارات دے کر مقصود اس کی اطاعت و وفاداری کا امتحان کرنا تھا۔"

سید ابوالاعلیٰ مودودی کا خیال ہے کہ "انی جاعل فی الارض خلیفہ" میں "خلیفہ" سے مراد اللہ تعالیٰ کی خلافت پانے والا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"انسان کو جس خلافت سے سرفراز کیا گیا ہے وہ اصل میں خلافت الٰہی ہے۔"

قرآن مجید کا بیان ہے کہ:

1-لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین)

(خدا نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا)

2-خلقت بیدی

(اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا)

3- ثم سوٰہ و نفخ فیہ من روحہ (السجدہ)

(پھر اس میں اپنی طرف سے روح پھونکی)

4- وعلم آدم الاسماء کلھا : (بقرہ)

(اور اس کو علم کی نعمت سے سرفراز فرمایا)

5-وسخر لکم ما فی السموات وما فی الارض جمیعا منہ (جاثیہ)

(اور زمین و آسمان کی ساری چیزوں کو اس کے حق میں مسخر کر دیا)

ان صفات کے ساتھ جب انسان کی تخلیق پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کے آگے سجدہ کریں۔

سید مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کا خیال ہے کہ:

"انسان کو سجدہ کرنے کا جو حکم دیا گیا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو دونوں ہاتھوں سے بنایا تھا، یعنی وہ قدرت اور صنعت الٰہی کا مظہر اتم تھا اور اس کے اندر خود اپنی طرف سے ایک خاص روح پھونکی تھی اور ایک محدود پیمانے پر اس میں وہ صفات پیدا کر دی تھیں جو بدرجہ فوق التمام خود باری تعالیٰ میں پائی جاتی ہیں۔ اس شان اور ان صفات پر

انسان کو پیدا کرنے کے بعد اعلان کیا گیا کہ ہم اس کو زمین میں خلیفہ بنانے والے ہیں، جیسا کہ سورۃ البقرۃ کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوا ہے۔"

سورۃ الاحزاب میں فرمایا گیا ہے:

انا عرضنا الامانة علی السموات والارض والجبال فابین ان یحملنا واشفقن منها وحملها الانسان انه کان ظلوماً جهولا

(ہم نے اس امانت کو آسمان اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا مگر انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھالیا، بے شک وہ ظالم انجام سے بے خبر نکلا)

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا خیال ہے کہ: "اس آیت میں "بار امانت" سے مراد اختیار (Freedom of Choice) اور ذمہ داری و جواب دہی (Responsibility) ہے اور ارشاد الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں اور زمینوں اور پہاڑوں میں بار کو اٹھانے کی تاب نہ تھی۔ انسان سے پہلے کوئی مخلوق ایسی نہ تھی، جو یہ پوزیشن قبول کر سکتی۔ آخر کار انسان آیا اور اس نے یہ بار اٹھالیا۔"

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اس بیان سے متعدد نکات نکلتے ہیں:

1- انسان سے پہلے زمین و آسمان میں کوئی مخلوق بار امانت کی حامل نہیں تھی، انسان پہلی مخلوق ہے جس نے یہ بار اٹھالیا ہے۔ لہٰذا منصب امانت میں وہ کسی مخلوق کا جانشین نہیں ہے۔

2- جس چیز کو سورہ بقرہ میں خلافت کہا گیا ہے وہی چیز یہاں امانت کے لفظ سے تعبیر کی گئی ہے کیونکہ وہاں فرشتوں پر ثابت کیا گیا تھا کہ تم خلافت کے اہل نہیں ہو، اس کا اہل انسان ہے اور یہاں فرمایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی مخلوق ہماری امانت کا بار اٹھانے کی اہل نہیں تھی، صرف انسان اس کا متحمل ہوا۔

3- خلافت کے مفہوم کو امانت کا لفظ واضح کر دیتا ہے اور یہ دونوں لفظ نظام عالم میں انسان کی صحیح حالت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین کا فرمانروا ہے، مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں ہے بلکہ تفویض کردہ (Delegated) ہے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اس حیثیت سے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیارات مفوضہ (Delegated Power) کو امانت سے تعبیر کرتا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ اس کی طرف سے ان اختیارات مفوضہ کو استعمال کرتا ہے، اسے خلیفہ (Vicegerent) کہا ہے۔ اس تشریح کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔

چنانچہ خلافت سے مراد وہ طرز حکومت ہے جس میں کوئی پرہیزگار اور صالح مرد مومن خلیفہ الٰہی کی حیثیت سے احکام الٰہی نافذ کرے اور خود پر عائد ہونے والی تمام تر ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو۔

رزق منجانب اللہ:

اسلامی نظام معیشت کے بنیادی تصورات میں سے ایک تصور یہ بھی ہے کہ مخلوق کو رزق پہنچانے کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔اس ضمن میں چند آیات درج ذیل ہیں:

1- سورۃ ہود کی آیت نمبر 6 کے شروع میں فرمایا گیا ہے۔

وما من دآبۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا

(اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں، مگر اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے)

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''زمین پر چلنے والا ہر جاندار جسے رزق کی احتیاج لاحق ہو،اس کو روزی پہنچانا خدا نے اپنے فضل سے اپنے ذمہ لازم کر لیا ہے۔جس قدر روزی جس کے لیے مقدر ہے یقیناً پہنچ کر رہے گی۔جو وسائل و اسباب بندہ اختیار کرتا ہے وہ روزی پہنچنے کے دروازے ہیں۔اگر آدمی کی نظر اسباب و تدابیر پر اختیار کرتے وقت مسبب الاسباب پر ہو تو یہ توکل کے منافی نہیں۔البتہ خدا کی قدرت کو ان اسباب عادیہ میں محصور و مقید نہ سمجھا جائے۔وہ گاہ بہ گاہ سلسلہ اسباب کو چھوڑ کر بھی روزی پہنچاتا اور کوئی کام کر دیتا ہے۔بہر حال جب تمام جانداروں کی حسب استعداد غذا اور معاش مہیا کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے تو ضروری ہے کہ اس کا علم ان سب پر محیط ہو،ورنہ ان کی روزی کی خبر گیری کیسے کر سکے گا۔''

2- سورۃ الجمعہ میں فرمایا گیا ہے:

واللہ خیر الرزقین

(اور خدا سب سے بہتر رزق دینے والا ہے)

3- سورۃ النحل میں فرمایا گیا ہے:

ومن یرزقکم من السمآء والارض

(اور کون تم کو آسمان اور زمین سے رزق دیتا ہے)

4- سورۃ العنکبوت میں فرمایا گیا ہے:

وکاین من دآبۃ لا تحمل رزقھا اللہ یرزقھا وایاکم

(اور بہت سے جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے خدا ہی ان کو رزق دیتا ہے)

5- قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

ان اللہ ھو الرزاق ذوالقوۃ المتین

(بے شک خدا تعالیٰ ہی رزق دینے والا اور بڑی قوت والا ہے)

6- سورۃ الذاریات میں فرمایا گیا ہے:

وفی السماء رزقکم وما توعدون

(اور آسمانوں میں رزق کا اللہ تعالیٰ نے تم سے وعدہ کیا ہے)

7- سورۃ طٰہٰ میں فرمایا گیا ہے:

ولا تمدن عینیك الی ما متعنا به ازواجا منهم زهرة الحیوة الدنیا لنفتنهم فیه ورزق ربك خیر وابقی

(اور نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھو دنیوی زندگی کی اس شان و شوکت کو جو ہم نے ان میں سے مختلف لوگوں کو دے رکھی ہے۔ وہ تو ہم نے انہیں آزمائش میں ڈالنے کے لیے دی ہے اور تیرے رب کا دیا ہوا رزق حلال ہی بہتر اور پائندہ تر ہے)

اس آیت کی تفسیر میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی ''تفہیم القرآن'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''رزق'' کا ترجمہ ہم نے ''رزق حلال'' کیا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہیں بھی حرام مال کو ''رزق رب'' سے تعبیر نہیں فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا اور تمہارے ساتھی اہل ایمان کا یہ کام نہیں ہے کہ فساق و فجار ناجائز طریقوں سے دولت سمیٹ سمیٹ کر اپنی زندگی میں جو ظاہری چمک دمک پیدا کر لیتے ہیں، اس کو تم رشک کی نگاہ سے دیکھو۔ یہ دولت اور یہ شان و شوکت تمہارے لیے ہرگز قابل رشک نہیں ہے۔ جو پاک رزق تم جائز ذرائع سے کماتے ہو خواہ وہ کتنا ہی تھوڑا ہو راستباز اور ایماندار آدمیوں کے لیے وہی بہتر ہے اور اس میں وہ بھلائی ہے جو دُنیا سے آخرت تک برقرار رہنے والی ہے۔''

8- سورۃ النور میں فرمایا گیا ہے:

واللّٰه یرزق من یشآء بغیر حساب

(اور اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب رزق دیتا ہے)

بقول مولانا مودودی:

''اللہ کی طرف سے رزق کی کشادگی و تنگی جو کچھ بھی ہوتی ہے، اس کی مشیت کی بناء پر ہوتی ہے اور اس مشیت میں اس کی کچھ دوسری ہی مصلحتیں کارفرما ہوتی ہیں۔ کسی کو زیادہ رزق دینے کے معنی لازماً یہی نہیں ہیں کہ اللہ اُس سے بہت خوش ہے اور اُسے انعام دے رہا ہے۔ بسا اوقات ایک شخص اللہ کا نہایت مغضوب ہوتا ہے مگر وہ اسے بڑی دولت عطا کرتا

جاتا ہے، یہاں تک کہ آخر کار یہی دولت اس کے اوپر اللہ کا سخت عذاب لے آتی ہے۔ اس کے برعکس اگر کسی کا رزق تنگ ہے تو اس کے معنی لازماً یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے ناراض ہے اور اسے سزا دے رہا ہے۔ اکثر نیک لوگوں پر تنگی اس کے باوجود رہتی ہے کہ وہ اللہ کے محبوب ہوتے ہیں بلکہ بار ہا تنگی ان کے لیے خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ اس حقیقت کو نہ سمجھنے ہی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی ان لوگوں کی خوشحالی کو رشک کی نگاہ سے دیکھتا ہے، جو دراصل خدا کے غضب کے مستحق ہوتے ہیں۔"

تصورِ آخرت:

اسلام کا عقیدہ ہے کہ یہ دُنیا فانی ہے اور ایک دن یہ پوری کائنات فنا ہو جائے گی۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ کے حکم سے انسانوں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ان کا حساب کتاب لیا جائے گا۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ دینوی زندگی میں ہر انسان پر دو فرشتے مامور ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک فرشتہ اس کے نیک کاموں کا اندراج کرتا رہتا ہے اور دوسرا اس کی بدیوں کا۔ اس نوشتہ کو "اعمالنامہ" کہتے ہیں۔ آخرت میں اسی اعمالنامہ کی بنیاد پر جزا اور سزا کا فیصلہ کیا جائے گا۔ جن لوگوں نے دُنیا میں نیک کام کیے ہوں گے، انھیں جزا کے طور پر جنت میں داخل کیا جائے گا اور جنہوں نے دنیا میں برے کام اور گناہ کیے ہوں گے انھیں ان کے افعال بد کی پاداش میں دوزخ میں ڈال دیا جائے گا جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

سورۃ العنکبوت میں فرمایا گیا ہے:

وان الدار الآخرۃ لھی الحیوان

(اور بے شک آخری گھر اصلی زندگی ہے)

سورۃ الانعام میں مذکور ہے:

وللدار الآخرۃ خیرٌ

(اور بے شک آخری گھر بہتر ہے)

یوم آخرت پر ایمان لانا ہر مسلمان پر لازم ہے۔ اس کا انکار کفر ہے۔

اسلامی نظام معیشت میں بھی یوم آخرت پر ایمان لانے کی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام ہر مسلمان بالخصوص ہر مالدار کو انفاق فی سبیل اللہ کی تلقین کرتا ہے۔ اسلامی عقیدہ ہے کہ جو شخص راہ خدا میں کچھ دیتا ہے اس کا دس گنا اُسے دُنیا ہی میں لوٹا دیا جائے گا اور یوم جزاء میں اُسے ستر گنا کر کے لوٹایا جائے گا۔

جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال صرف نہیں کرتے، سورۃ آل عمران میں ان کے بارے میں فرمایا گیا

سیطوقون ما بخلوا به یوم القیمة

(جس مال کا بخل کیا تھا قیامت میں اس کا ان کے گلے میں طوق پڑے گا)

سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا ہے:

و الذین یکنزون الذھب و الفضة و لا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیمO یوم یحمی علیھا فی نار جھنم فتکوی بھا جباھھم و جنوبھم و ظھورھم ھذا ما کنزتم لانفسکم فذوقوا ما کنتم تکنزونO

(اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کے رستے میں خرچ نہیں کرتے ان کو عذاب الیم کی خبر سنا دو۔ جس دن وہ (مال) دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان (بخیلوں) کی پیشانیاں اور پہلو اور پیٹھیں داغی جائیں گی (اور کہا جائے گا) یہ وہی ہے جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، سو تم جمع کرتے تھے (اب) اس کا مزا چکھو)

سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

ان الذین یاکلون اموال الیتمی ظلمًا انما یاکلون فی بطونھم نارًا و سیصلون سعیرًاO

(جو لوگ یتیموں کا مال ناجائز طور پر کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور وہ دوزخ میں ڈالے جائیں گے۔)

رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

"جس کو اللہ نے مال دیا اور اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہ کی تو اس کا مال اس کو ایک گنجے سانپ کی صورت میں دکھایا جائے گا جس کا سر زہر کی شدت سے گنجا ہوگا، اس کے منہ میں دو دانت ہوں گے، وہ اس کے گلے میں قیامت کے دن پڑا ہوگا اور وہ اس کے دونوں جبڑوں کو کاٹے گا اور کہے گا میں ہوں تیرا مال، میں ہوں تیرا خزانہ۔"

سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

و ما تنفقوا من خیر فلانفسکم و ما تنفقون الا ابتغآء وجه اللہ و ما تنفقوا من خیر یوف الیکم و انتم لا تظلمونO

(اور جو بھی تم نیکی خرچ کرو تو وہ تمہارے ہی لیے ہے اور جو بھی تم خرچ کرو، وہ تم کو پورا دے دیا جائے گا اور تمہارے ساتھ ذرا بے انصافی نہ کی جائے گی۔)

کسبِ معاش کی تحسین:

اسلام میں کسبِ معاش کو نہایت اہمیت دی گئی ہے۔ ایک شخص جو حلال ذرائع سے رزق کما کر اپنے اہل وعیال کو کھلاتا ہے، وہ اس کی عبادت میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ رزق پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ذمہ داری ہے، جبکہ رزق کمانے کے لیے جدوجہد کرنا انسان کی ذمہ داری ہے۔

سورۃ الجمعہ کی آیت نمبر 10 میں فرمایا گیا ہے:

فاذا قضیت الصلوۃ فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللّٰہ واذکروا اللّٰہ کثیرًا لعلکم تفلحون ۝

(پھر جب نماز ہو چکے تو اپنی اپنی راہ لو اور اللہ کا فضل تلاش کرو اور اللہ کو بہت یاد کرتے رہو تاکہ نجات پاؤ)

یعنی نماز جمعہ کے بعد رزق کمانے کے لیے جانا حلال اور مستحسن ہے۔ ابن کثیر کا کہنا ہے کہ اس آیت کو پیش نظر رکھ کر بعض سلف صالحین نے فرمایا ہے کہ جو شخص جمعہ کے دن نماز جمعہ کے بعد خرید و فروخت کرے، اُسے اللہ تعالیٰ ستر حصے زیادہ برکت دے گا۔

کاسب (کمانے والے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا حبیب قرار دیا ہے:

الکاسب حبیب اللّٰہ

(کمانے والا اللہ کا دوست ہے)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

1- طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ

(حلال معیشت کا طلب کرنا اللہ کے فریضہ عبادت کے بعد (سب سے) بڑا فریضہ ہے)

2- اذا صلیتم الفجر فلا تنو مواعن طلب ارزاقکم

(جب تم فجر کی نماز پڑھ لو تو اپنے رزق کی جدوجہد کے بغیر نیند کا نام نہ لو)

3- الذنوب ذنوب لایکفرھا الاالھم فی طلب المعیشۃ

(بعض گناہوں سے ایسے گناہ ہیں جن کا کفارہ طلب معیشت کی فکر اور جدوجہد میں کاوش ہی سے ہو سکتا ہے)

درجاتِ معیشت:

اسلامی نظام معیشت میں ہر شخص معیشت میں مساوی حق رکھتا ہے لیکن درجات معیشت میں تفاوت ہے کیونکہ ہر شخص کی اہلیت اور کارکردگی دوسروں سے مختلف ہوتی ہے۔ ایک شخص اپنی صلاحیت کی بناء پر دوسروں

سے زیادہ کما سکتا ہے اور دوسرا شخص اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے دوسروں سے بہت پیچھے رہ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ضروری نہیں کہ سب کے لیے سامان معیشت ایک ہی طرح کا ہو، لیکن یہ ضروری ہے کہ ہو سب کے لیے۔ بقول محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی، درجات کا یہ تفاوت ایسے اعتدال پر قائم رہے کہ کسی حالت میں بھی وہ لوگوں کے درمیان وجہ ظلم نہ بن سکے، یعنی تفاوت درجات تو ہو لیکن نہ ایسا کہ معیشت انسانوں کے دو طبقوں میں اس طرح تقسیم کر دے کہ ایک کی ترقی دوسروں کے فقر و افلاس کا سبب بنے اور دوسرا پہلے کے معاشی اغراض کا آلۂ کار بن کر رہ جائے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ:

"خدا کی اس کائنات میں کہیں بھی مساوی تقسیم نہیں پائی جاتی۔ مساوی تقسیم ہے ہی غیر فطری چیز۔ کیا تمام انسانوں کو یکساں صحت دی گئی ہے؟ کیا تمام انسانوں کو یکساں ذہانت دی گئی ہے؟ کیا تمام انسانوں کا حافظہ یکساں ہے؟ کیا تمام انسان حسن میں، طاقت میں، قابلیت میں برابر ہیں؟ کیا تمام انسان ایک ہی طرح کے حالات پیدائش میں آنکھیں کھولتے ہیں اور دُنیا میں کام کرنے کے لیے بھی سب کو ایک ہی طرح کے حالات ملتے ہیں؟ اگر ان ساری چیزوں میں مساوات نہیں ہے تو ذرائع پیداوار یا تقسیم دولت میں مساوات کے کیا معنی؟ یہ عملاً ممکن ہی نہیں ہے اور جہاں بھی مصنوعی طور پر اس کی کوشش کی جائے گی، وہ لازماً ناکام ہوگی اور غلط نتائج بھی پیدا کرے گی۔ اسی لیے اسلام یہ نہیں کہتا کہ وسائل معیشت اور ثمرات معیشت کی مساوی تقسیم ہونی چاہئے، بلکہ وہ کہتا ہے کہ منصفانہ تقسیم ہونی چاہئے۔"

درجات معیشت میں تفاوت کے ضمن میں چند آیات ملاحظہ ہوں:

1- سورۃ الرعد میں فرمایا گیا ہے:

اللّٰه يبسط الرزق لمن يشاء ويقدر

(اللہ جس کے لیے چاہتا ہے رزق میں فراخی دیتا ہے اور جس کے لیے چاہتا ہے تنگی ڈال دیتا ہے)

مولانا شبیر احمد عثمانی اس آیت کی تفسیر کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"یعنی دنیا کے عیش و فراخی کو دیکھ کر سعادت و شقاوت کا فیصلہ نہیں ہوتا۔ نہ یہ ضروری ہے کہ جس کو دُنیا میں خدا نے رزق اور پیسہ زیادہ دیا ہے وہ اس کی بارگاہ میں مقبول ہو۔ بہت سے مقبول بندے بطور آزمائش وامتحان یہاں عسرت کی زندگی بسر کرتے ہیں اور مردود مجرموں کو ڈھیل دی جاتی ہے۔ وہ مزے اڑاتے ہیں۔ یہ ہی دلیل اس کی ہے کہ اس زندگی کے بعد

کوئی دوسری زندگی ہے جہاں ہر شخص کو اس کے نیک و بد اعمال کا پورا پھل مل کر رہے گا۔ بہر حال دنیا کی تنگی و فراخی مقبول و مردود ہونے کا معیار نہیں بن سکتا۔"

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ درجات معیشت میں تفاوت خدا تعالیٰ نے خود رکھا ہے۔

2- سورۃ زخرف میں فرمایا گیا ہے:

نحن قسمنا بینهم معیشتهم فی الحیوة الدنیا ورفعنا بعضهم فوق بعض درجات لیتخذ بعضهم بعضًا سخریًا

(ہم نے ان میں ان کی معیشت کو دنیا کی زندگی میں تقسیم کر دیا اور ایک کے دوسرے پر درجے بلند کیے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت لے)

3- سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

و هو الذی جعلکم خلٓئف الارض و رفع بعضکم فوق بعض درجات لیبلوکم فی مآ اٰتاکم

(اور وہی ہے جس نے تمہیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور بعض کو بعض پر مرتبے دیے تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے۔)

4- سورۃ النحل میں فرمایا گیا ہے:

و الله فضل بعضکم علی بعض فی الرزق فما الذین فضلوا برآدی رزقهم علی ما ملکت ایمانهم فهم فیه سوآء افبنعمة الله یجحدون

(اور اللہ نے رزق میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تو جن لوگوں کو فضیلت دی ہے وہ اپنا رزق اپنے مملوکوں کو تو دے ڈالنے والے ہیں نہیں کہ سب اس میں برابر ہو جائیں، تو کیا یہ لوگ نعمت الٰہی کے منکر ہیں۔)

تصورِ حلال وحرام:

"حلال" سے مراد ہے: جائز، درست، مباح۔ اصطلاحاً "حلال" سے مراد وہ چیز ہے جس کا کھانا، پینا، پہننا، استعمال کرنا یا اس کی خرید و فروخت کرنا شرعاً جائز ہو۔ اس کے برعکس "حرام" سے مراد وہ چیز ہے جس کا کھانا، پینا، پہننا استعمال کرنا یا اس کی خرید و فروخت کرنا شریعت محمدیہ میں ممنوع قرار دیا گیا ہے۔

اسلام نے حلال اور حرام چیزوں اور کاموں کا تعین کر دیا ہے۔ جن چیزوں کو اس نے حلال قرار دیا ہے صرف وہی چیزیں حلال ہیں اور جن چیزوں یا کاموں کو اس نے حرام قرار دیا ہے وہ حرام ہیں۔ کوئی شخص یا حاکم اپنی طرف سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دینے کا مجاز نہیں ہے۔

حلال وحرام، قرآن کی روشنی میں:

قرآن حکیم میں رزق حلال کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

1- کلوا مما فی الارض حلالا طیبا

(جو چیزیں زمین میں حلال وطیب ہیں وہ کھاؤ)

2- یاایھا الذین امنوا کلوا من طیبات ما رزقناکم

(اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تمہیں عطا کی ہیں ان کو کھاؤ)

حلال وحرام، حدیث کی روشنی میں:

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

1- طلب الحلال فریضۃ علی کل مسلم

(طلب حلال تمام مسلمانوں پر فرض ہے)

2- ''جو شخص اپنے عیال کو حلال مال کما کر کھلائے، وہ ایسا ہے کہ گویا اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور جو شخص کہ دنیا کو بوجہ حلال پارسائی کے ساتھ طلب کرے وہ شہیدوں کے درجہ میں ہو گا۔''

3- ''اللہ تعالیٰ کا ایک فرشتہ بیت المقدس پر ہر رات پکارتا ہے کہ جو شخص حرام کھائے گا اس کا فرض ونفل کچھ قبول نہ ہوگا۔''

4- ''جو شخص ایک کپڑا دس درہم کو مول لے اور اس کے ثمن میں ایک درہم حرام ہو تو جب تک وہ کپڑا اس کے بدن پر رہے گا اللہ تعالیٰ اس کی نماز قبول نہ کرے گا۔''

5- ''حلال کمائی کا طلب کرنا فرض کے بعد فرض ہے۔''

6- ''وہ بدن جنت میں داخل نہیں ہوگا جو حرام کے ساتھ پرورش کیا گیا۔''

دائرہ معیشت میں حلال وحرام:

اسلام پاک اور مفید چیزوں کو حلال اور ناپاک، نجس اور مضر چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے۔ قرآن نے جن چیزوں کو حلال قرار دیا ہے، ان چیزوں کے کاروبار کو پیشہ بنایا جا سکتا ہے اور حرام چیزوں کا کاروبار ممنوع ہے۔

کسب مال کے حرام طریقے اور ذرائع:

ذیل میں قرآن مجید کے حوالہ سے چند حرام ذرائع معاش کی نشاندہی کی جارہی ہے۔

1-باطل طریقے سے مال کھانے کی ممانعت:

سورۃ البقرۃ میں فرمایا گیا ہے:

و لا تاکلوآ اموالکم بینکم بالباطل و تدلوا بھآ الی الحکام لتاکلوا فریقًا من اموال الناس بالاثم و انتم تعلمون

"اور آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ اور نہ ان کو حکام کے سامنے پیش کرو تا کہ کھاؤ جانتے بوجھتے لوگوں کے مال گناہ کے ساتھ۔

2-چوری کی ممانعت:

قرآن نے چوری کی ممانعت کرتے ہوئے سورہ المائدہ میں اس کی سزا کا تعین کرتے ہوئے کہا ہے۔

السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما

(چوری کرنے والے مرد اور چوری کرنے والی عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔)

3-فساد پھیلانے کی ممانعت اور سزا:

سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

انما جزآؤا الذین یحاربون اللہ و رسولہٗ و یسعون فی الارض فسادًا ان یقتلوآ او یصلبوآ

(جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں ان کی جزا تو یہ ہے کہ قتل کیے جائیں یا صلیب دیے جائیں)

4- کم تولنے کی ممانعت:

سورۃ المطففین میں فرمایا گیا ہے:

ویل للمطففین ○ الذین اذا اکتالوا علی الناس یستوفون ○ واذا کالوھم او وزنوھم یخسرون ○

5-یتیموں کا مال کھانے کی ممانعت:

سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

ان الذین یاکلون اموال الیتمی ظلمًا انما یاکلون فی بطونھم نارًا ط و سیصلون سعیرًا

(جو لوگ یتیموں کے مال ظلم کے ساتھ کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں اور

عنقریب وہ جہنم کی آگ میں جلیں گے۔)

6-زنا اور بے حیائی کی ممانعت اور سزا:

سورۃ النور میں فرمایا گیا ہے:

الزانیة و الزانی فاجلدوا کل واحد منهما مائة جلدة

(زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے مارو)

7-سود کا حرام ہونا:

سورۃ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:

و احل اللّٰه البیع و حرم الربوا

(اور اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا)

8-قحبہ گری کی ممانعت:

سورۃ النور میں فرمایا گیا ہے:

ولا تکرهوا فتیاتکم علی البغاء ان اردن تحصنا لتبتغوا عرض الحیوة الدنیا

(اپنی لونڈیوں کو قحبہ گری پر مجبور نہ کرو جبکہ وہ بچنا چاہتی ہوں، محض اس لیے کہ تم دینوی زندگی کے فائدے حاصل کرنا چاہتے ہو۔)

حرام کاروبار:

اسلام نے مندرجہ ذیل قسم کے کاروبار کو حرام قرار دیا ہے:

1- دوسرے کا مال اس کی رضا کے بغیر اور بلاعوض لینا، یا بالعوض اور بالرضا یا بلاعوض اور برضا اس طرح لینا کہ رضامندی کسی دباؤ یا دھوکے کا نتیجہ ہو۔
2- شراب کی صنعت، بیع اور اس کی نقل وحمل۔
3- غصب
4- رشوت
5- سود
6- خیانت
7- ناپ تول میں کمی
8- مال یتیم میں بیجا تصرف
9- موسیقی و آلات موسیقی کی خرید و فروخت

10- ناچ گانا
11- عصمت فروشی (زنا)
12- لونڈے بازی (لواطت)
13- چوری، ڈاکہ، چھاپہ، رہزنی
14- جوا، قمار بازی
15- بُت گری، بُت فروشی، بُت خانوں کی خدمات
16- فال گیری، کہانت
17- ذخیرہ اندوزی
18- مخرب اخلاق اور فحش اشیاء کی خرید و فروخت
19- ملاوٹ
20- ذخیرہ اندوزی (احتکار)
21- زندہ جانوروں کی تصویر کشی، مصوری اور تصاویر کی خرید و فروخت
22- بغیر زکوٰۃ ادا کیے سونا چاندی جمع کرنا
23- اجارہ دارانہ استحصال کے تمام علانیہ اور خفیہ ہتھکنڈے
24- سمگلنگ، چور بازاری

پیدائش دولت کے حلال ذرائع:

اسلام کے نزدیک پیدائش دولت کے حلال ذرائع حسب ذیل ہیں:

1- ہاتھ کی کمائی (یعنی جسمانی و دماغی محنت سے حاصل ہونے والی آمدنی)
2- حلال اشیاء کی خرید و فروخت سے حاصل ہونے والی آمدنی)
3- وراثت کے ذریعے حاصل ہونے والی جائیداد اور مال
4- ہبہ یا عطیہ کے ذریعے حاصل ہونے والی جائیداد اور مال
5- تحائف اور ہدیہ کے طور پر ملنے والی اشیاء وغیرہ
6- تجارت، صنعت و حرفت، زراعت، کان کنی، ماہی گیری، ملازمت اور دیگر جائز پیشوں کے ذریعے حاصل ہونے والی آمدنی۔
7- وظائف اور ہدیہ کے طور پر ملنے والا مال یا اشیاء وغیرہ

تبادلۂ دولت کے شعبہ میں حلال وحرام:

تبادلۂ دولت کے شعبہ میں اسلام نے کسب حلال کے ضمن میں مندرجہ ذیل شرائط عائد کی ہیں:

1- تبادلۂ اشیاء فریقین کی باہمی رضامندی سے ہو۔

-2 اگر کسی شے میں نقص ہو تو تبادلہ کرنے سے قبل دوسرے فریق کو مطلع کیا جائے۔
-3 ناپ تول کے پیمانے درست ہوں۔
-4 اشیاء میں ملاوٹ نہ کی گئی ہو۔
-5 کاروباری عہد و پیمان کی مکمل پابندی کی جائے۔
-6 لین دین صرف حلال اشیاء کا کیا جائے۔
-7 ایسا لین دین نہ کیا جائے جس میں ایک کا فائدہ یقینی اور دوسرے کا مشکوک و مشتبہ ہو۔
-8 مال جھوٹی قسموں کے ذریعے فروخت نہ کیا جائے۔
-9 حد سے زیادہ منافع نہ لیا جائے۔
-10 کاروبار میں سود اور قمار کا شائبہ نہ ہو۔

تقسیم دولت کے شعبہ میں حلال و حرام:

اسلام نے تقسیم دولت کے ضمن میں حلال و حرام کے سلسلہ میں مندرجہ ذیل اصول متعین کیے ہیں:

-1 عدل کے ساتھ احسان کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔
-2 میانہ روی اختیار کی جائے، یعنی استطاعت سے بڑھ کر نہ تو ذاتی ضروریات پر خرچ کیا جائے اور نہ ہی صدقہ و خیرات اپنی استطاعت سے زیادہ کیا جائے۔
-3 عاملین پیدائش کے معاوضوں کی ادائیگی میں جبر و استحصال اور تاخیر سے کام نہ لیا جائے۔
-4 تقسیم دولت کے شعبہ میں ناہمواری پیدا نہ ہونے دی جائے۔
-5 ترکہ متوفی کے جائز ورثاء میں تقسیم کیا جائے۔
-6 اپنی دولت میں سے لواحقین اور مساکین و یتامیٰ کو بھی حصہ دیا جائے۔

☆ ☆ ☆ ☆

اسلامی معیشت کے اساسی تصورات

کسب معیشت میں جدوجہد کی اہمیت

سوال: اسلامی معاشیات کے اساسی تصورات پر نوٹ لکھیں۔

حضرت انسان کی دنیائے فانی میں آمد بے مقصد اور لایعنی نہیں۔ وہ خدا کی عبدیت (بندگی) کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ (الذاریات: 56) اور اس کے ساتھ ساتھ اپنی فطری احتیاجات کی تکمیل کے لیے معاشی جدوجہد پر مجبور ہے تاہم وہ کسب حلال کا پابند ٹھہرایا گیا ہے اور اس کی یہ معاشی جدوجہد دین وشریعت کے طے کردہ اصولوں کے تحت ہونا لازم ہے۔ کسب کے معنی ہیں کمانا' کسب معیشت کے لیے جدوجہد دینی لحاظ سے انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اسلام چونکہ دین فطرت ہے اس لیے انسان کی فطری و مادی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسب معاش کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

''وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے تابع کر رکھا ہے تاکہ تم اس کے کندھوں پر چلو اور اللہ کا رزق کھاؤ۔'' (الملک: 15)

یہ ہے اسلام کا اصول۔ زمین کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے مسخر کیا ہے۔ لہٰذا اس نعمت سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور اس کے پہلوؤں میں اللہ تعالیٰ کے فضل کے طالب بن کر دوڑ دھوپ کرنا چاہیے۔

اسلام میں دین اور دنیا کے لیے علیحدہ احکام نہیں ہیں بلکہ اسلام ایک ایسا دین ہے جو دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کی ضمانت دیتا ہے' اسلام دنیا سے نفرت نہیں سکھاتا بلکہ دنیا کو آخرت کے لیے کھیت قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو نماز کے اختتام پر یہ دعا سکھاتا ہے:

ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الاخرة حسنة (البقرة: 201)

''اے اللہ ہمارے رب ہمیں دنیا میں بھی اچھا دے اور آخرت میں بھی اچھا دے''

معاشی جدوجہد کے لیے قرآن مجید یہ تصریح کرتا ہے:

''اے ایمان والو! جب جمعہ کے دن اذان کہی جائے تو نماز کے لیے چل پڑا کرو اور خرید و فروخت چھوڑ دیا کرو' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔'' (الجمعہ: 8)

اور اس کے بعد فرمایا:

''اور جب نماز پوری ہو چکے تو زمین میں پھیل جاؤ' اور اللہ کی روزی تلاش کرو اور اللہ کو بکثرت یاد کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔'' (الجمعہ: 10)

دونوں آیات کا انداز ایک ہے' یعنی جس طرح نماز اور ذکر الٰہی کے لیے حکم سے بلایا گیا' اسی طرح تلاش معاش کے لیے زمین میں پھیل جانے کا بھی حکم دیا گیا۔ اگرچہ پہلا حکم لازمی ہے اور دوسرا اختیاری ہے۔ لیکن اگر بظاہر دیکھا جائے تو بھی قرآن مجید پر عمل یوں ہوگا کہ انسان نماز جمعہ کے بعد تلاش معاش کے لیے

نکل جائے۔اس میں بھی فضیلت ہے' اگرچہ امر وجوب کے لیے نہیں ہے۔اسلام میں دنیاوی کاروبار صرف ان اوقات میں ممنوع قرار دیا گیا ہے جو عبادت کے اوقات ہیں' جب عبادت ہو چکے تو پھر معاشی سرگرمیوں میں مصروف ہونا جائز بھی ہے اور لازم بھی۔دوران حج بھی اگر فرائض حج ادا کر چکنے کے بعد کسی کو کوئی تجارت کرنے کا موقع میسر ہو تو جائز ہے اور دوران حج ہر طرح کی جائز معاشی سرگرمیاں جائز ہیں۔

خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مبارک میں بعض صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے اس رائے کا اظہار کیا تھا کہ مزدوروں اور حج کے بار برداروں اور ٹرانسپورٹروں کا حج نہیں ہوتا۔یا دوسرے اس قسم کے لوگ جو حج کے دوران مختلف نوعیت کی خدمت سرانجام دیتے تھے۔بعض لوگ اس شبہ میں مبتلا ہو گئے تھے کہ شاید انہیں حج کا ثواب نہ ہوگا۔چنانچہ اس مسئلے پر براہ راست وحی نازل ہوئی کہ:

"تمہیں اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں کہ تم اپنے پروردگار کے ہاں سے تلاش معاش کرو"

(البقرۃ:198)

اس آیت کی تفسیر میں مولانا سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفر حج کے دوران میں کسب معاش کے لیے کام کرنے کو وہ برا سمجھتے تھے کیونکہ ان کے نزدیک کسب معاش ایک دنیادارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ ایک خدا پرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور کوئی گناہ نہیں' اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے۔"

(تفہیم القرآن۔جلد اول ص:156)

اسی آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"حج کے سفر میں اگر سوداگری بھی کرو تو گناہ نہیں بلکہ مباح ہے۔لوگوں کو اس میں شبہ ہوا تھا کہ شاید تجارت کرنے سے حج میں نقصان آئے۔اب جس کو مقصود اصلی حج ہو اور اس کے ذیل میں تجارت بھی کر لے تو اس کے ثواب میں نقصان نہ آئے گا۔"

(تفسیر عثمانی۔ترجمہ مولانا محمود حسنؒ۔ص 38)

ایک جگہ قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"وہی ہے جس نے زمین کو تمہارے لیے مسخر کر دیا' سو تم اس کے راستوں میں چلو پھرو اور اللہ کی پیدا کی ہوئی روزی میں سے کھاؤ اور آخر کار اسی کے پاس زندہ ہو کر جانا ہے۔"

(الملک:15)

زمین کے اوپر اور اندر جو کچھ ہے یہ انسان کے استعمال کے لیے ہے۔شریعت نے اس معاملے میں یہ آسان اصول وضع کر دیا ہے کہ ہر چیز کا استعمال جائز ہے' الا یہ کہ شریعت نے حرام کر دیا ہو' اگر اس کائنات کی

چیزوں کے استعمال کی حرمت ثابت نہ ہو تو وہ جائز ہیں۔

دوسری آیت میں ہے:

''آپ فرما دیجئے کہ اللہ کی زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے بنائی ہے کس نے حرام کر دیا ہے اور کھانے کی پاکیزہ چیزوں کو؟ آپ فرما دیجئے یہ اشیاء ایمان لانے والوں کے لیے بھی اس دنیا کی زندگی میں ہیں اور قیامت کے دن تو خالص انہی کے لیے۔ ہم اسی طرح کھول کر آیات کو بیان کرتے ہیں ان لوگوں کے لیے جو علم رکھتے ہیں۔'' (الاعراف: 32)

فقہاء نے ان آیات سے یہ اصول نکالا ہے کہ تمام اشیاء اصولاً مباح ہیں الا یہ کہ حرمت کا حکم نازل ہو۔

ان آیات کی تشریح سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے آثار میں کی گئی ہے۔ جہاں آثار و احادیث کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ مثلاً یہ کہ ہر شخص کو محنت و مزدوری کرنا چاہیے' سوال اور گداگری کی سخت ممانعت کی گئی ہے اور احادیث میں پاک ترین اور طیب ترین رزق اس کو بتایا گیا ہے کہ کوئی اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے یا جائز تجارت کے ذریعے کمائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اگر کوئی شخص لکڑی کا گٹھا اپنی پیٹھ پر لاد کر لائے اور اپنی آبرو بچائے تو یہ اس سے بہتر ہے کہ دوسروں کے آگے دست سوال دراز کرے۔'' (متفق علیہ)

ایک دفعہ ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کچھ مانگا۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا ''تمہارے پاس کچھ ہے؟'' انہوں نے عرض کیا ''صرف ایک بچھونا ہے جسے آدھا اوپر اوڑھ لیتا ہوں اور آدھا نیچے بچھا لیتا ہوں اور پینے کے لیے پانی کا ایک پیالہ ہے'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''دونوں چیزیں لے آؤ'' جب وہ دونوں چیزیں لے آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''یہ چیزیں کون خریدتا ہے؟'' ایک شخص نے دو درہم قیمت پیش کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چیزیں اس شخص کو دے دیں اور دو درہم انصاری کو دے دیئے اور فرمایا ''ایک درہم کا سودا خرید کر گھر دے آؤ اور ایک درہم کا رسہ خرید لاؤ اور جنگل سے لکڑیاں لا کر شہر میں بیچو۔''

پندرہ دن کے بعد وہ انصاری پھر حاضر ہوئے تو ان کے پاس دس درہم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دیکھ کر فرمایا ''یہ اچھا ہے یا قیامت کے روز چہرے پر گداگری کا داغ لگا کر جانا اچھا تھا؟''

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

''اوپر کا ہاتھ (یعنی دینے والا ہاتھ) نیچے کے ہاتھ (یعنی لینے والے ہاتھ) سے بہتر ہے۔''

''الکاسب حبیب اللہ'' یعنی محنت کار اللہ کا دوست ہوتا ہے۔ حضرت مقدام رضی اللہ عنہ بن معدیکرب سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''کبھی کسی نے اس سے بہتر کھانا نہیں کھایا کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے کما کر کھایا ہو اور اللہ کے

نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھوں سے کما کر کھایا کرتے تھے۔" (مشکوۃ شریف)

اسلامی تعلیمات کی رو سے جو شخص کام کی قدرت رکھتا ہو اس کا بیٹھے رہنا حرام ہے۔ مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ عبادت کے لیے یکسوئی یا اللہ تعالیٰ کے نام پر توکل کے نام سے طلب رزق سے بے پرواہ ہو جائے۔ کیونکہ آسمان سے سونے چاندی کی بارش ہونے والی نہیں۔ اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ وہ صدقات کے بھروسے پر بیٹھ جائے جبکہ اسے ذرائع میسر ہوں جن کو اختیار کر کے وہ اپنے معاش کے لیے دوڑ دھوپ کر سکتا ہے نیز اپنے زیر کفالت افراد کی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں ہادیٔ برحق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"صدقہ کسی غنی کے لیے جائز نہیں ہے اور نہ کسی ایسے شخص کے لیے جو توانا اور تندرست ہو۔" (الترمذی)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس بات کی سخت مذمت فرمائی ہے اور حرام ٹھہرایا ہے کہ ایک مسلمان لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے جس کے نتیجہ میں اس کے چہرہ کی رونق غائب ہو جائے اور اپنی انسانیت و شرافت کو بلاضرورت مجروح کر کے رکھ دے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"جو شخص بلاضرورت مانگتا ہے وہ گویا اپنے ہاتھ میں انگارے چنتا ہے۔" (البیہقی)

"جس نے لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کیا تا کہ وہ مالدار ہو جائے وہ اپنے چہرہ کو قیامت تک کے لیے مجروح کر دیتا ہے اور جہنم کے گرم پتھر کھائے گا۔ اب جو شخص چاہے اپنے لیے یہ چیزیں زیادہ مقدار میں فراہم کرے یا کم مقدار میں۔" (الترمذی)

نیز فرمایا:

"جو شخص اپنے آپ کو مانگنے کا عادی بنا لے وہ اللہ تعالیٰ سے اس حال میں ملے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کی کوئی بوٹی نہ ہوگی۔" (متفق علیہ)

اس انجام بد سے بچانے کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کی عزت کا تحفظ فرمایا ہے اور اس کے اندر خود اعتمادی اور مانگنے سے احتراز جیسے اوصاف کی پرورش کا سامان کیا ہے۔

ہمارے سلف وصالحین، صحابہ کرام تابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین اور بعد میں آنے والے آئمہ مجتہدین نے محنت اور مزدوری کو اپنا وطیرہ بنایا اور مفت خوری کو ناپسند فرمایا۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت نے سوال کی ممانعت کی اور پورے قرآن کریم میں انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا گیا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے کسی بڑے عقل وخرد کی ضرورت نہیں ہے کہ جب اللہ نے انفاق پر اس قدر زور دیا ہے، صدقات پر زور دیا ہے، اور زکوٰۃ کو فرض کیا ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی محنت مزدوری اور تجارت و کاروبار کر کے کمائے گا تب ہی ان احکامات پر عمل کر سکے گا۔

آج کل عام مسلمانوں میں یہ بھی بیماری عام ہے کہ وہ بڑے فخر سے یہ کہتے ہیں کہ میرا تو کوئی کام نہیں ہے۔ یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ میں بڑا آدمی ہوں، مجھے کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ ذہنیت اسلامی

ذہنیت نہیں ہے۔ اسلامی نظام میں ایسے اشخاص سے باز پرس ہوتی ہے جن کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو یہی وجہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس شخص کو سزا دی جو مسجد نبوی میں بیٹھا رہتا تھا' جب اس سے پوچھا گیا کہ وہ کھاتا پیتا کہاں سے ہے تو وہ کوئی معقول جواب نہ دے سکا۔

قرآن کریم نے ان مذہبی پیشواؤں کی طرف اشارہ کیا ہے جو محنت و مزدوری نہیں کرتے اور لوگوں سے مختلف قسم کے نذر و نیاز لے کر کھاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی ایسے لوگ بے شمار ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے:

> ''اے ایمان لانے والو! ان اہل کتاب کے اکثر علماء اور درویشوں کا حال یہ ہے کہ وہ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور انہیں اللہ کی راہ سے روکتے ہیں۔ دردناک سزا کی خوشخبری دو ان کو جو سونے اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور انہیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔''
>
> (التوبہ:34)

سوال کرنا کب جائز ہے؟

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کی ضرورتوں اور مجبوریوں کا پورا پورا لحاظ فرماتے تھے۔ اگر کوئی شخص سوال کرنے اور حکومت یا افراد سے اعانت طلب کرنے کے لیے مجبور ہو جائے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

> ''سوال کرنا خراش کے ہم معنی ہے۔ جو شخص سوال کرتا ہے وہ اپنے چہرہ کو نوچتا ہے۔ لہٰذا جو شخص چاہے اپنے چہرہ کو اس حال میں رکھے اور جو چاہے ترک کر دے۔ البتہ یہ صورت مستثنیٰ ہے کہ کسی صاحب اقتدار سے مانگنا پڑے یا کسی ایسے معاملہ میں سوال کرنا پڑے جو بالکل ناگزیر ہو۔''
>
> (ابوداؤد و النسائی)

ابی بشر قبیصہ بن المخارق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> ''میں نے ایک معاملہ میں ضمانت کی ذمہ داری قبول کر لی تھی۔ اس لیے میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر سوال پیش کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ٹھہرو۔ صدقہ کا مال آ جائے گا تو ہم تمہیں دلوا دیں گے۔ پھر فرمایا اے قبیصہ! سوال کرنا جائز نہیں ہے بجز تین اشخاص کے۔ ایک وہ شخص جو کسی کے لیے ضمانت کی ذمہ داری قبول کر لے۔ ایسے شخص کے لیے سوال کرنا جائز ہے جب تک کہ اسے مطلوبہ مال حاصل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد اسے رک جانا چاہیے۔ دوسرا وہ شخص جس کا مال کسی مصیبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے تباہ ہو جائے۔ ایسے شخص کے لیے سوال کرنا جائز ہے جب تک کہ اسے گزر بسر کی چیزیں حاصل نہ ہو جائیں اور تیسرا وہ شخص جو فاقہ میں مبتلا ہو یہاں تک کہ اس کے محلے کے تین سمجھدار لوگ یہ کہہ دیں کہ فلاں شخص فاقہ زدہ ہے۔ ایسی صورت میں اس کے لیے سوال کرنا جائز ہے جب تک کی گزر بسر کی چیزیں اسے فراہم نہ ہو جائیں۔ ان کے ماسوا جو شخص سوال کرتا ہے تو یہ حرام کا مال ہے جسے

وہ کھاتا ہے۔'' (مسلم وابوداؤد والنسائی)

زراعت کے ذریعے کسب معاش:

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں انسان پر اپنے فضل واحسان کا ذکر فرماتے ہوئے وہ اصولی باتیں بیان فرمائی ہیں جو زراعت کے قیام کے لیے ضروری ہیں:

زمین کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح تخلیق کیا ہے کہ وہ اگانے اور پیدا کرنے کی خدمت انجام دیتی ہے اور اسے فرش بنا دیا ہے جو مخلوق کے لیے ایک نعمت ہے۔ اس نعمت کو یاد رکھنا اور اس کی قدر کرنا نہایت ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

''اللہ نے تمہارے لیے زمین کو فرش بنایا تاکہ تم اس کے کھلے راستوں پر چلو''

(نوح:20,19)

''اور زمین کو اس نے مخلوقات کے لیے بنایا۔ اس میں پھل ہیں' کھجور کے درخت ہیں غلاف والے غلہ ہے بھوسہ والا' پھول ہیں خوشبودار۔ پھر تم اپنے رب کی قدرت کے کن کن کرشموں کا انکار کرو گے۔'' (الرحمٰن: 10تا13)

اللہ تعالیٰ نے بارش کی صورت میں پانی کو اتارا اور اس کی نہریں جاری کیں جس سے وہ مردہ زمینوں کو حیات نو بخشتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

''وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا' پھر ہم نے اس کے ذریعہ سے ہر قسم کی نباتات اگائیں' پھر اس سے سرسبز شاخیں پیدا کیں جن سے ہم تہ بہ تہ دانے نکالتے ہیں۔''

(الانعام:99)

اللہ تعالیٰ ہواؤں کو خوشخبری دینے والا بنا کر بھیجتا ہے جس سے بادل چلنے لگتے ہیں اور نباتات بارآور ہوتی ہیں۔ قرآن مجید میں ہے:

''اور زمین کو ہم نے بچھایا اور اس میں پہاڑ رکھ دیے اور اس میں ہر قسم کی چیزیں تناسب کے ساتھ اگائیں اور تمہاری معیشت کا سامان بھی رکھا اور ان کی معیشت کا بھی جن کو تم رزق نہیں دیتے۔ ہر چیز کے خزانے ہمارے پاس موجود ہیں اور اسے ہم مقررہ اندازہ کے ساتھ ہی اتارتے ہیں' اور ہواؤں کو ہم بارآور بنا کر بھیجتے ہیں۔ پھر آسمان سے پانی برساتے ہیں اور تم کو اس سے سیراب کرتے ہیں' ورنہ تم اس کے ذخیرہ کو جمع نہیں کر سکتے تھے۔'' (الحجر:19تا22)

ان تمام آیات مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے زراعت کی نعمت اور اس کے سہل الحصول ذرائع کی طرف انسان کو متوجہ فرمایا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

''جو مسلمان بھی پودا لگاتا ہے یا کھیتی کرتا ہے اور اس میں سے پرندے یا انسان جو کچھ کھا لیتے ہیں وہ اس کے لیے صدقہ ہو جاتا ہے۔'' (متفق علیہ)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ثواب جاری رہتا ہے۔ جب کہ پودا یا کھیتی سے کھانے وغیرہ کا فائدہ اٹھایا جاتا رہے اگرچہ کہ پودا لگانے والا یا کھیتی کرنے والا مر چکا ہو یا اس کی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل ہو گئی ہو۔

روایت ہے کہ ایک شخص کا ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے پاس سے گزر ہوا جبکہ وہ اخروٹ کا پودا لگا رہے تھے۔ اس شخص نے کہا آپ بڑھاپے میں اخروٹ کا پودا لگا رہے ہیں' اس کو پھل لانے میں تو کئی سال لگ جاتے ہیں۔ ابوالدرداء رضی اللہ عنہ نے فرمایا' اس میں کیا حرج ہے کہ میں اجر کماؤں اور دوسرے لوگ اسے کھائیں؟"

ایک صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے اپنے دونوں کانوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

"جس نے درخت لگایا' پھر اس کی حفاظت اور نگرانی کرتا رہا' یہاں تک کہ وہ درخت پھل لے آیا تو اس کے پھلوں کا جو نقصان بھی ہو گا اس کا اجر اللہ عزوجل کے پاس اسے ملے گا۔" (مسند احمد)

ان احادیث سے اور اس قسم کی دوسری احادیث سے بعض علماء نے یہ استدلال کیا ہے کہ زراعت کمانے کے دیگر ذرائع سے بہتر ہے۔ لیکن دوسرے علماء کہتے ہیں کہ صنعت اور دستکاری افضل ہے اور کچھ علماء تجارت کو افضل بتاتے ہیں۔

بعض محققین کا کہنا ہے کہ مختلف حالات میں مختلف چیزیں افضل ہو سکتی ہیں مثلاً جب غذا کی ضرورت شدید ہو تو زراعت افضل ہو گی کیونکہ اس کا فائدہ عام ہے اور جب ڈاکہ زنی وغیرہ کی وجہ سے منڈیوں میں مال کم آ رہا ہو تو تجارت افضل ہو گی' اور جب مصنوعات کی ضرورت ہو تو صنعت افضل ہو گی۔

صنعت وحرفت کے ذریعے کسب معاش:

اسلام نے زراعت کی ترغیب بھی دی ہے اور اس کے محاسن بھی بیان کر دیے ہیں نیز اس خدمت کو باعث ثواب قرار دیا ہے' لیکن اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ ملت اسلامیہ کی سرگرمیاں زراعت کے لیے وقف ہو کر رہ جائیں' جس طرح سیپی کا کیڑا سیپی کے اندر ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسلام نے اپنے پیروؤں کے لیے صرف کاشتکاری پر اکتفا کرنا اور بیلوں کی دم کے پیچھے پیچھے چلتے رہنا ناپسند کیا ہے کیونکہ ایسی صورت میں یہ مسلم امہ پیش آمدہ خطرات کا مقابلہ نہیں کر سکے گی' اس لیے اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے باعث ذلت قرار دیا اور زمانہ نے اس کی پوری طرح تصدیق کر دی۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جب تم عینہ کی بیع کرنے لگو گے (ایک خاص قسم کی بیع جس میں سود کی شکل پیدا ہو جاتی ہے) اور بیلوں کی دم پکڑے رہو گے' زراعت کو پسند کرو گے اور جہاد کو ترک کرو گے تو اللہ تم پر ذلت کو مسلط

فرمائے گا' پھر اسے دور نہیں کریگا جب تک کہ تم اپنے دین کی طرف لوٹ نہ آؤ۔" (ابوداؤد)

لہٰذا زراعت کے ساتھ صنعت وحرفت بھی ضرورت ہے۔ ان چیزوں کے ذریعہ خوشگوار زندگی کی ضرورتیں اور ایک آزاد اور طاقتور امت نیز ایک مستحکم اور خودکفیل حکومت کے لوازمات پورے ہو سکتے ہیں۔ صنعت وحرفت اسلام کی رو سے ایک جائز خدمت ہی نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ اس مفہوم میں کہ اسلامی جماعت کے اندر صنعت وحرفت اور ہر فن کو جاننے والے اتنی وافر تعداد میں ہونے چاہیں کہ جماعت کی ضرورتیں پوری ہو جائیں اور وہ اپنا کام ٹھیک طریقہ سے انجام دے سکے۔ اگر صنعت وحرفت کے کسی گوشہ میں اس طرح کی کمی واقع ہو جاتی ہے کہ اس خدمت کو انجام دینے والا کوئی شخص بھی نہیں ملتا تو پوری جماعت گنہگار ہو جاتی ہے۔ خصوصاً اولوالامر اور اہل حل وعقد۔ حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کے بقول:

"فرض کفایہ ہر وہ علم ہے جس سے انسان دنیوی معاملات میں بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ جیسے طب کہ بقائے جسم کے لیے ضروری ہے اور حساب کے معاملات اور وصیت ومیراث کی تقسیم وغیرہ کے لیے ضروری ہے۔ اور بہا ایسے علوم ہیں کہ اگر کوئی شہر ان کے جاننے والوں سے خالی ہو جائے تو لوگ تکلیف میں پڑیں گے اور جب کوئی شخص ان کاموں میں لگ جاتا ہے تو دوسروں پر سے ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں اس بات پر تعجب نہیں کرنا چاہیے کہ طب اور حساب فرض کفایہ ہیں اور بنیادی نوعیت کے کام اور صنعتیں بھی فرض کفایہ کی حیثیت رکھتی ہیں مثلاً زمین جوتنا' کپڑے بننا' جانوروں کی دیکھ بھال کرنا بلکہ پچھنے لگانا اور سلائی کا کام کرنا بھی۔ اگر کوئی شہر پچھنے لگانے والوں سے خالی ہو جائے تو ہلاکت تیزی کے ساتھ لوگوں کی طرف بڑھے گی' کیونکہ جس نے بیماری پیدا کی ہے اس نے دوا بھی پیدا کی ہے اور اس کے استعمال کی طرف رہنمائی بھی کی ہے نیز اس کی فراہمی کے اسباب بھی مہیا کیے ہیں۔ لہٰذا ان کو ترک کر کے اپنے آپ کو ہلاکت کے لیے پیش کرنا جائز نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم نے کتنی ہی صنعتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کا ذکر نعمت کی حیثیت سے کیا ہے مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

"ہم نے لوہے کو ان کے لیے نرم کر دیا کہ زرہیں بناؤ اور ان کی کڑیاں ٹھیک اندازہ سے جوڑو"
(سبا: 11,10)

"اور ہم نے انہیں تمہارے لیے زرہ بنانے کی صنعت سکھا دی تھی تا کہ لڑائی میں تمہارا بچاؤ کرے' پھر کیا تم شکر گزار ہو؟" (الانبیاء: 80)

اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے بارے میں فرمایا:

"اور ہم نے ان کے لیے تانبہ کا چشمہ بہا دیا اور ایسے جن ان کے تابع کیے جو اپنے رب کے حکم سے ان کے سامنے کام کرتے تھے۔ اور ان سے جو ہمارے حکم سے سرتابی کرتا ہم اسے بھڑکتی ہوئی آگ کا عذاب چکھاتے۔ وہ ان کے (سلیمان علیہ السلام کے) لیے بناتے جو انہیں منظور ہوتا' اونچی عمارتیں' تصویریں' بڑے بڑے حوض جیسے لگن اور اپنی جگہ سے نہ ہٹنے والی بھاری دیگیں

اے آلِ داوٗد! علیہ السلام عمل کرو شاکرانہ طریقہ پر" (سباء:13,12)

اسی طرح قرآن مجید نے ذوالقرنین کے بلند و بالا دیوار تعمیر کرنے اور حضرت نوح علیہ السلام کے کشتی بنانے کا ذکر فرمایا ہے اور بہت سی سورتوں میں شکار کی مختلف قسموں کا ذکر فرمایا ہے۔ مثلاً مچھلی کا شکار' آبی جانوروں کا شکار اور خشکی کے جانوروں کا شکار نیز موتی اور مرجان وغیرہ نکالنے کے لیے غوطہ لگانا۔

اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآن مجید نے لوہے کی صحیح قدر و قیمت بتا دی جس کی مثال اس سے پہلے نہیں ملتی' نہ کسی دینی کتاب میں اور نہ دنیوی کتاب میں۔ فرمایا:

"اور ہم نے لوہا اتارا جس میں سخت قوت ہے اور لوگوں کے لیے منافع بھی ہیں۔"

(الحدید:25)

جس ہنر یا پیشہ سے معاشرہ کی ضرورت پوری ہوتی ہو یا اسے حقیقی فائدہ پہنچتا ہو وہ عمل صالح ہے جبکہ اس کو اختیار کرنے والا خلوص نیز ہنر مندی کے ساتھ اس کو انجام دے جیسا کہ اسلام نے حکم دیا ہے۔ اسلام نے ایسے کئی پیشوں کو معزز بنایا جو لوگوں کی نظروں میں حقیر تھے' مثال کے طور پر بکریاں چرانے والے کو لوگ عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے لیکن نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے:

"اللہ نے کوئی ایسا نبی نہیں بھیجا جس نے بکریاں نہ چرائی ہوں' صحابہ نے کہا یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے بھی؟ فرمایا: میں مکہ والوں کی بکریاں اُجرت پر چرایا کرتا تھا۔" (بخاری شریف)

قرآن مجید نے ہمیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا قصہ سنایا ہے کہ آپ علیہ السلام نے ایک بوڑھے بزرگ کے پاس اجرت پر کام کیا تھا۔ اس بزرگ نے آٹھ سال تک خدمت کرنے کی شرط پر اپنے ہاں رکھ لیا تھا جس کا معاوضہ یہ طے ہوا تھا کہ وہ اپنی ایک لڑکی کا نکاح آپ علیہ السلام سے کر دیں گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بڑے اچھے خادم اور اجیر ثابت ہوئے اور اس بزرگ کی فراست صحیح ثابت ہوئی کہ:

"ان میں سے ایک لڑکی نے کہا' ابا جان! انہیں ملازم رکھ لیجئے' بہترین آدمی جسے آپ ملازم رکھیں وہی ہو سکتا ہے جو قوی بھی ہو اور امانت دار بھی۔" (القصص:26)

ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ حضرت داوٗد علیہ السلام زرہ بناتے تھے' حضرت آدم علیہ السلام کاشتکاری کرتے تھے' حضرت نوح علیہ السلام بڑھئی کا کام کرتے تھے' حضرت ادریس علیہ السلام سلائی کا کام کرتے تھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بکریاں چرانے کی خدمت انجام دیتے تھے۔ (الحاکم)

تجارت کے ذریعے کسب معاش:

اسلام نے قرآنی نصوص اور سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ تجارت کرنے کی پرزور طریقہ پر دعوت دی ہے اور اس مقصد کے لیے سفر کرنے کی بھی ترغیب دی ہے اور اسے اللہ کا فضل تلاش کرنے سے تعبیر کیا ہے' نیز تجارت کی غرض سے سفر کرنے والوں کا ذکر مجاہدین فی سبیل اللہ کے ساتھ کیا ہے۔ قرآن کریم میں ہے۔

"کچھ لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کریں گے اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں قتال کریں گے۔" (المزمل:20)

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے اپنے اس احسان کا ذکر فرمایا ہے کہ اس نے بحری مواصلات کے ذریعہ لوگوں کے لیے داخلی اور خارجی تجارت کی راہیں کھول دی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے سمندر کی تسخیر اور جہاز رانی کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

"اور تم دیکھتے ہو کہ اس میں کشتیاں پانی کا سینہ چیرتی ہوئی چلتی ہیں تا کہ تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔" (فاطر:12)

اور بعض مقامات پر اس کے ساتھ ہوائیں چلانے کا بھی ذکر کیا ہے:

"اس کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ وہ ہواؤں کو خوشخبری دینے اور تمھیں اپنی رحمت سے آشنا کرنے کے لیے بھیجتا ہے اور تا کہ کشتیاں اس کے حکم سے چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور اس کے شکر گزار بنو۔" (الروم:46)

اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر احسان فرما کر ان کے لیے ایسے اسباب مہیا کر دیے کہ ان کا شہر جزیرہ نما عرب میں ایک ممتاز تجارتی مرکز بن گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کہ "ان کو پھلوں سے رزق دے" ان کے حق میں یہی ثابت ہوئی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے قریش پر احسان فرما کر ان کے لیے موسم سرما اور موسم گرما کی تجارتی سفر آسان کر دیے۔

اسلام نے مسلمانوں کو بین الاقوامی سطح پر تجارتی لین دین کا موقع عطا کیا ہے چنانچہ ہر سال حج کے موسم میں یہ موقع فراہم ہوتا ہے۔ مسلمان حج کے موقع پر تجارت کرنے میں انقباض محسوس کرتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے واضح طور پر فرمایا:

"اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو۔" (البقرۃ:198)

قرآن مجید نے مسجد سے گہری دلچسپی رکھنے والوں کی تعریف کی ہے جو صبح شام اللہ کی پاکی بیان کرتے ہیں۔

"ایسے لوگ جنھیں تجارت اور خرید وفروخت اللہ کی یاد اور اقامت الصلوٰۃ اور ادائیگی زکوٰۃ سے غافل نہیں کرتی۔" (النور:37)

پس مومنین قرآن کی نظر میں مسجدوں میں بند ہو کر رہنے والے لوگ نہیں ہیں اور نہ تکیوں کے درویش ہیں اور نہ ہی خانقاہوں کے رہبان بلکہ وہ کام کاج کرنے والے لوگ ہیں اور ان کی خصوصیت یہ ہے کہ دنیوی کام انھیں دینی ذمہ داریوں سے غافل نہیں کرتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے تجارت کی ترغیب دی ہے اور اس کی بنیادوں کو استوار کیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"سچا اور دیانت دار تاجر قیامت کے دن شہیدوں کے ساتھ ہوگا۔" (ابن ماجہ، الحاکم)

"سچا اور دیانت دار تاجر قیامت کے دن انبیاء علیہم السلام صدیقین اور شہداء کرام رضوان اللہ علیہم کے ساتھ ہوگا۔"

(ابن ماجہ الحاکم)

اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سچے تاجر کو مجاہد اور شہید کے برابر قرار دیا کیونکہ دُنیوی زندگی کے تجربات اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ جہاد میدانِ قتال ہی میں نہیں ہوتا بلکہ اقتصادی میدان میں بھی ہوتا ہے۔

تجارت کے معاملہ میں ہماری رہنمائی کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ اُسوۂ حسنہ کافی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں روحانی پہلو کو پوری اہمیت کے ساتھ ملحوظ رکھا' جیسے مدینہ میں تقویٰ کی اساس پر مسجد قائم کی تاکہ وہ عبادت' علم' دعوت اور حکومت سب کا مرکز بنے' وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اقتصادی پہلو کا بھی پورا لحاظ فرمایا۔ چنانچہ خالص اسلامی بازار قائم کرکے یہودیوں کے تسلط کو ختم کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اس کا نظام مرتب کیا اور اس کی نگرانی فرماتے رہے اور ساتھ ہی اس سے متعلق تعلیمات اور ہدایات جاری فرماتے رہے۔ اس بازار کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ فریب' ناپ تول میں کمی' ذخیرہ اندوزی اور دوسروں کو ضرر پہنچانے والی باتوں سے بالکل پاک تھا'

ان تمام باتوں کے ساتھ ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ماہر قسم کے تاجر' کاریگر' کاشتکار اور ہر کام اور پیشہ کو اختیار کرنے والے لوگ موجود تھے۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے درمیان موجود تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ کی طرف سے آیات نازل ہوتیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں سے آسمانی باتیں کرتے' روح الامین صبح شام وحی لے کر آتے اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کا حال یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک لحہ کے لیے جدا ہونا پسند نہ کرتے۔ ان تمام باتوں کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ تمام صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین اپنے کاموں میں لگے رہتے ہیں' کوئی شخص تجارتی سفر کر رہا ہے تو کوئی اپنے نخلستان میں معروف ہے اور کوئی اپنے پیشے اور کاریگری میں مشغول ہونے کی وجہ سے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم کو سننے کا موقع نہیں پاتا تو وہ اپنے بھائی سے معلوم کر لیتا ہے۔

انصار زیادہ تر زراعت پیشہ اور نخلستان کے مالک تھے اور مہاجرین زیادہ تر بازاروں میں کاروبار کیا کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مہاجر دینی بھائی سعد بن ربیع انصاری رضی اللہ عنہ انہیں اپنا نصف مال اور اپنے دو مکانوں میں سے ایک مکان اور اپنی دو بیویوں میں سے ایک بیوی کو طلاق دے کر ان کے نکاح میں دینے کی پیش کش کرتے ہیں لیکن وہ اس عظیم ایثار کا جواب عظیم خودداری سے دیتے ہیں۔ وہ سعد رضی اللہ عنہ سے کہتے ہیں "اللہ تمہارے مال اور گھر والوں میں برکت دے' مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تجارت کے لیے کوئی بازار ہے تو بتاؤ۔" سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں' ہاں' بنی قینقاع کا بازار ہے۔" دوسرے روز صبح وہ پنیر اور گھی لے کر بازار جاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ اس کاروباری سلسلہ کو جاری رکھتے ہیں یہاں

تک کہ کافی دولت مند ہو جاتے ہیں۔ انتقال کے وقت انہوں نے کثیر مال چھوڑا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ برابر تجارت میں لگے رہے اور دوڑ دھوپ کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جس دن خلیفہ بنائے گئے اس دن بھی بازار جانے کا ارادہ کیا۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے بارے میں فرماتے مجھے حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سماعت سے بازار کے سودے نے مشغول رکھا۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اسلام کے زریں اصولوں کے مطابق تجارت کی اور خوب دولت کمائی اور اپنی دولت کو اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔

کسب معاش کے سلسلہ میں عام اُصول:

کسب معاش کے سلسلہ میں عام اصول یہ ہے کہ اسلام اپنے پیروؤں کو اس بات کی کھلی چھٹی نہیں دیتا کہ وہ جو مال چاہیں کمائیں اور جس طریقہ سے چاہیں کمائیں بلکہ وہ اجتماعی مصالح کے پیش نظر کسب معاش کے مشروع اور غیر مشروع طریقوں میں فرق کرتا ہے۔ یہ فرق ایک کلیہ پر مبنی ہے اور وہ یہ ہے کہ کسب مال کے وہ تمام طریقے جن سے افراد دوسروں کو نقصان پہنچا کر فائدہ حاصل کرتے ہوں غیر مشروع ہیں۔ اس کے بر خلاف ایسے طریقے جن سے افراد باہمی رضامندی سے عدل کے ساتھ منفعت کا تبادلہ کرتے ہیں مشروع ہیں۔ اس اصول کی توضیح قرآن مجید کی درج ذیل آیت سے ہوتی ہے۔

> "اے ایمان والو! اپنے مال آپس میں باطل طریقوں سے نہ کھاؤ مگر یہ ہے کہ باہمی رضامندی سے تجارت کے ذریعہ مال حاصل ہو جائے اور اپنی جانوں کو قتل نہ کرو۔ اللہ تم پر بڑا مہربان ہے۔ اور جو شخص ظلم و زیادتی کے ساتھ ایسا کرے گا اس کو ہم جلد ہی آگ میں جھونک دیں گے۔"
>
> (النساء:29, 30)

☆☆..........☆☆..........☆☆

درجات معیشت کا مقصد اور اسلامی فلسفہ

سوال: اسلام میں درجات معیشت کا مقصد اور اسلامی فلسفہ پر نوٹ لکھیں۔

کرۂ ارض پر آباد انسانوں کو درپیش مختلف النوع مسائل میں سے ایک اہم اور بنیادی مسئلہ معاش کا مسئلہ ہے۔ معاش کا انسانی زندگی سے گہرا تعلق ہے اور اسی سے انسان کی بقا وابستہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے معاشی لحاظ سے انسانوں کو مختلف درجات یا مراتب میں تقسیم کیا ہے۔ کوئی امیر ہے تو کوئی غریب' کوئی بادشاہ ہے تو کوئی گدا' کوئی دن رات محنت و مشقت کر کے بھی امارت کے حصول میں ناکام رہتا ہے اور کوئی پیدا ہی سونے کا چمچہ منہ میں لے کر ہوتا ہے۔ یہ سب مشیت ایزدی اور خداوند قدوس ہی کا فیصلہ ہے اور اسی کی عطا ہے۔

معاشی تفاوت کا مقصد اور اسلامی فلسفہ:

اسلام نے لوگوں کے مابین معیشت اور رزق کے فرق کا اعتراف کیا ہے کیونکہ یہ تفاوت فی الواقع ایک فطری تفاوت ہے جو نتیجہ ہے اس فرق اور تفاوت کا جو انسانوں کی صلاحیتوں' قدرتوں' قوتوں اور ان کے مواہب طبعی میں موجود ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

"کیا تیرے رب کی رحمت یہ لوگ تقسیم کرتے ہیں؟ دنیا کی زندگی میں ان کے گزر بسر کے ذرائع (معیشت) تو ہم نے ان کے درمیان تقسیم کیے ہیں اور ان میں سے کچھ لوگوں کو کچھ دوسرے لوگوں پر ہم نے بدرجہا فوقیت دی ہے تاکہ یہ ایک دوسرے سے خدمت لیں۔" (الزخرف:32)

قرآن حکیم کی اس آیت مبارک ہمیں انسانوں کے معاشی تفاوت کا مقصد یہ بیان ہوا ہے کہ اس تفاوت کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں۔

جسٹس مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یعنی ہم نے ان کے درمیان ان کی معیشت تقسیم کر دی ہے' اور ایک کو دوسرے پر درجات کے اعتبار سے فوقیت عطا کی ہے۔ اور اس کے بعد کتنا خوبصورت جملہ ارشاد فرمایا کہ "لیتخذ بعضھم بعضا سخریا" "تاکہ ان میں سے ایک دوسرے سے کام لے سکے"۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کا نظام بنایا ہے' اور اللہ تعالیٰ نے اس کی معیشت تقسیم کی ہے' یعنی وسائل کی تقسیم' اور قیمتوں کا تعین' اور تقسیم دولت کے اصول یہ سارے کے سارے کسی انسانی پلاننگ کی بنیاد پر وجود میں نہیں آتے' بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس بازار اور اسی دنیا کا نظام ایسے بنایا ہے کہ معیشت خود بخود تقسیم ہو جائے۔ یہ جو فرمایا کہ ہم نے تقسیم کیا' اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آ کر خود دولت تقسیم فرمادی کہ اتنا تم لے لو اور اتنا تم لے لو بلکہ اس کا مطلب ہے کہ ہم نے فطرت کے ایسے قوانین بنادیے ہیں' جن کی روشنی میں انسانوں کے درمیان معیشت کی تقسیم کا عمل خود بخود ہو جائے۔"

(اصلاحی خطبات: مفتی محمد تقی عثمانی۔ جلد 3 صفحہ 39۔ مطبوعہ میمن اسلامک پبلشرز لیاقت آباد کراچی)

اسی آیت کی تشریح کرتے ہوئے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

"دنیا میں زندگی بسر کرنے کے جو عام ذرائع ہیں' ان کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہی ہاتھ میں رکھی ہے' کسی اور کے حوالے نہیں کر دی۔ ہم کسی کو حسین اور کسی کو بدصورت' کسی کو خوش آواز اور کسی کو بدآواز' کسی کو قوی ہیکل اور کسی کو کمزور' کسی کو ذہین اور کسی کو کند ذہن' کسی کو قوی الحافظہ اور کسی کو نسیان میں مبتلا' کسی کو سلیم الاعضاء اور کسی کو اپاہج یا اندھا یا گونگا یا بہرا' کسی کو امیر زادہ اور کسی کو فقیر زادہ' کسی کو ترقی یافتہ قوم کا فرد اور کسی کو غلام یا پس ماندہ قوم کا فرد پیدا کرتے ہیں۔ اس پیدائشی قسمت میں کوئی ذرہ برابر بھی دخل نہیں دے سکتا جس کو جو کچھ ہم نے بنا دیا ہے وہی کچھ بننے پر وہ مجبور ہے۔ اور ان مختلف پیدائشی حالتوں کا جو اثر بھی کسی کی تقدیر پر پڑتا ہے اسے بدل دینا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ پھر انسانوں کے درمیان رزق' طاقت' عزت' شہرت' دولت حکومت وغیرہ کی تقسیم بھی ہم ہی کر رہے ہیں' جس کو ہماری طرف سے اقبال نصیب ہوتا ہے اسے کوئی گرا نہیں سکتا' اور جس پر ہماری طرف سے ادبار آ جاتا ہے اسے گرنے سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ ہمارے فیصلوں کے مقابلے میں انسانوں کی ساری تدبیریں دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔"

سید مودودیؒ مزید لکھتے ہیں:

"اس خدائی انتظام میں یہ مستقل قاعدہ ملحوظ رکھا گیا ہے کہ سب کچھ ایک ہی کو یا سب کچھ سب کو نہ دے دیا جائے۔ آنکھیں کھول کر دیکھو' ہر طرف تمہیں بندوں کے درمیان ہر پہلو میں تفاوت ہی تفاوت نظر آئے گا۔ کسی کو ہم نے کوئی چیز دی ہے تو دوسری کسی چیز سے اس کو محروم کر دیا ہے' اور وہ کسی اور کو عطا کر دی ہے۔ یہ اس حکمت کی بنا پر کیا گیا ہے کہ کوئی انسان دوسروں سے بے نیاز نہ ہو' بلکہ ہر ایک کسی نہ کسی معاملے میں دوسرے کا محتاج رہے۔"

(تفہیم القرآن: مولانا مودودیؒ' جلد چہارم صفحہ 537 مطبوعہ ادارہ ترجمان القرآن لاہور)

مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنی نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے:

"اگر سبھی برابر کے مالدار ہوتے تو کوئی کسی کا کام کیوں کرتا' اب صورت حال یہ ہے کہ کم پیسے والے مالداروں کے باغوں اور کھیتوں اور کارخانوں میں کام کرتے ہیں اور طرح طرح کے کاموں کی خدمت انجام دیتے ہیں۔ اس طرح سے عالم کا نظام قائم ہے۔ مالدار کام لیتے ہیں' کم پیسے والے مزدوری لیتے ہیں۔ دنیا اسی طرح چل رہی ہے' جب اللہ تعالیٰ شانہٗ نے دنیاوی معیشت کو انسانوں کی رائے پر نہیں رکھا جو ادنیٰ درجے کی چیز ہے اور اپنی حکمت کے موافق بندوں کی مصلحتوں کی رعایت فرماتے ہوئے خود ہی مال تقسیم فرما دیا تو نبوت کا منصب کسی کو لوگوں کی رائے کے موافق کیسے دے دیا جاتا جو بہت ہی بلند و بالا چیز ہے۔"

(انوار البیان فی کشف اسرار القرآن۔ مفتی محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنی۔
جلد ہشتم' صفحہ 231' مطبوعہ ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

رزق کی تقسیم کی مصلحتیں:

قرآن حکیم میں ہے:

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان سے فرمادیں' میرا رب جسے چاہتا ہے کشادہ رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا عطا کرتا ہے' مگر اکثر لوگ اس کی حقیقت نہیں جانتے۔" (سبا:36)

"اے نبیؐ' ان سے کہو میرا رب اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے کھلا رزق دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے نپا تلا دیتا ہے۔" (سبا:39)

ان آیات کی تفسیر میں سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"یعنی دنیا میں رزق کی تقسیم کا انتظام جس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے اس کو یہ لوگ نہیں سمجھتے اور اس غلط فہمی میں پڑ جاتے ہیں کہ جسے اللہ کشادہ رزق دے رہا ہے وہ اس کا محبوب ہے' اور جسے تنگی کے ساتھ دے رہا ہے وہ اس کے غضب میں مبتلا ہے۔ حالانکہ اگر کوئی شخص ذرا آنکھیں کھول کر دیکھے تو اسے نظر آ سکتا ہے کہ بسا اوقات بڑے ناپاک اور گھناؤنے کردار کے لوگ نہایت خوشحال ہوتے ہیں' اور بہت سے نیک اور شریف انسان' جن کے کردار کی خوبی کا ہر شخص معترف ہوتا ہے' تنگدستی میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ اب آخر کون صاحب عقل آدمی یہ کہہ سکتا ہے کہ اللہ کو یہ پاکیزہ اخلاق کے لوگ ناپسند ہیں اور شریر و خبیث لوگ ہی اسے بھلے لگتے ہیں"۔

(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم ص 207)

متذکرہ بالا دوسری آیت (سبا:39) کی تفسیر کرتے ہوئے سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"اس مضمون کو بتکرار بیان کرنے سے مقصود اس بات پر زور دینا ہے کہ رزق کی کمی و بیشی اللہ کی مشیت سے تعلق رکھتی ہے نہ کہ اس کی رضا سے۔ مشیت الٰہی کے تحت اچھے اور برے ہر طرح کے انسانوں کو رزق مل رہا ہے۔ خدا کا اقرار کرنے والے بھی رزق پا رہے ہیں اور اس کا انکار کرنے والے بھی۔ نہ رزق کی فراوانی اس بات کی دلیل ہے کہ آدمی خدا کا پسندیدہ ہے' اور نہ اس کی تنگی اس امر کی علامت ہے کہ آدمی اس کا مغضوب ہے۔ مشیت کے تحت ایک ظالم اور بے ایمان آدمی پھلتا پھولتا ہے' حالانکہ ظلم اور بے ایمانی خدا کو پسند نہیں ہے۔ اور اس کے برعکس مشیت ہی کے تحت ایک سچا اور ایمان دار آدمی نقصان اٹھاتا اور تکلیفیں سہتا ہے' حالانکہ یہ صفات خدا کو پسند ہیں۔ لہٰذا وہ شخص سخت گمراہ ہے جو مادی فوائد و منافع کو خیر و شر کا پیمانہ قرار دیتا ہے۔ اصل چیز خدا کی رضا ہے اور وہ ان اخلاقی اوصاف سے حاصل ہوتی ہے جو خدا کو محبوب ہیں۔ ان اوصاف کے ساتھ اگر کسی کو دنیا کی نعمتیں حاصل ہوں تو یہ بلاشبہ خدا کا فضل ہے جس پر شکر ادا کرنا چاہیے لیکن اگر ایک شخص اخلاقی اوصاف کے لحاظ سے خدا کا باغی و نافرمان بندہ ہو اور اسکے ساتھ دنیا کی نعمتوں سے نوازا جا رہا ہو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ سخت باز پرس اور بدترین عذاب کے لیے تیار ہو رہا ہے۔"

(تفہیم القرآن۔ جلد چہارم ص 208)

درجات معیشت اور اسلامی فلسفہ کے چند مزید پہلو

اسلامی فلسفہ کی رو سے معیشت کے تفاوت میں چند مزید پہلو بھی مضمر ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

مال اور اولاد آزمائش کی چیزیں ہیں:

قرآن حکیم میں یہ صراحت کی گئی ہے کہ مال اور اولاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی گئی وہ نعمتیں ہیں جن کے ذریعہ سے دراصل بندہ کی آزمائش کی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

''تمہارے مال اور تمہاری اولاد آزمائش کے لیے ہیں۔'' (التغابن:15)

''اور جان لو کہ بے شک تمہارے مال اور اولاد آزمائش کے لیے ہیں۔'' (الانفال:28)

ان آیات کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانی لکھتے ہیں کہ

''یعنی اللہ تعالیٰ مال و اولاد دے کر تم کو جانچتا ہے کہ کون ان فانی وزائل چیزوں میں پھنس کر آخرت کی باقی ودائم نعمتوں کو فراموش کرتا ہے اور کس نے ان سامانوں کو اپنی آخرت کا ذخیرہ بنایا ہے اور وہاں کے اجر عظیم کو یہاں کے حظوظ و مالوفات پر ترجیح دی ہے۔''

(تفسیر عثمانی: مولانا شبیر احمد عثمانی'' ۔صفحہ 729 مطبوعہ نفیس پبلشرز اردو بازار لاہور)

مال اور اولاد پر فخر کی مذمت:

قرآن مجید میں مال اور اولاد کو زیادہ بتانے اور فخر کا اظہار کرنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ فرمایا: ''جان رکھو کہ دنیا کی زندگانی یہی ہے کھیل اور تماشا اور زینت اور بڑائیاں کرنی آپس میں اور بہتاتیت ڈھونڈنی مال کی اور اولاد کی'' (الحدید:20)

مزید فرمایا: ''اور نہ شیخی کیا کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا اور اللہ کو خوش نہیں آتا کوئی اترانے والا اور بڑائی کرنے والا'' (الحدید:23)

افلاس کا اندیشہ ہو تو خدا پر توکل کیا جائے:

قرآن حکیم میں ہے کہ اگر بندہ مومن افلاس کے اندیشہ میں مبتلا ہو تو اسے چاہیے کہ وہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ پر توکل کرے۔ یہ اللہ کا توکل ہی ہے جو اسے مفلسی سے بچا کر طمانیت اور عافیت کی منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ فرمایا:

''اور اگر تم ڈرتے ہو فقر سے تو آئندہ غنی کر دے گا تم کو اللہ اپنے فضل سے اگر چاہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔'' (التوبہ:28)

رازق صرف خدا تعالیٰ ہے:

اس بات پر پختہ ایمان لازم ہے کہ رازق صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ اگر کوئی مال و متاع کی بہتات

رکھتا ہے تو یہ اس کا کمال نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی عطا ہے اور اگر کوئی مفلس اور نادار ہے اور کسمپرسی کی زندگی گزار رہا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اللہ خود ہی سب کو رزق پہنچانے والا' قوت والا نہایت قوت والا ہے۔" (الذاریات:58)

"اور کوئی (رزق کھانے والا) جانور روئے زمین پر چلنے والا ایسا نہیں کہ اس کی روزی اللہ تعالیٰ کے ذمہ نہ ہو۔" (ہود:6)

"جو (اللہ) آسمان (سے پانی برسا کر) اور زمین سے (نباتات نکال کر) تم کو رزق دیتا ہے۔" (النمل:64)

"اللہ ہی وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا پھر تم کو رزق دیا۔" (الروم:40)

"تم خدا کو چھوڑ کر جن کو پوج رہے ہو وہ تم کو کچھ بھی رزق دینے کا اختیار نہیں رکھتے' سو تم رزق خدا کے پاس سے تلاش کرو۔" (العنکبوت:17)

"وہ کون ہے جو تم کو روزی پہنچا دے اگر اللہ تعالیٰ اپنی روزی بند کر لے۔" (الملک:21)

"اور اللہ بہتر رزق دینے والا ہے۔" (الجمعہ:11)

"کیا ان کو یہ معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے زیادہ روزی دیتا ہے اور جس کو چاہے کم دیتا ہے۔ اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں۔" (الروم:37)

عطائے رزق پر تشکر کا رویہ:

اللہ تعالیٰ منعم حقیقی ہے اور اپنے بندوں کو اپنی رحمت کاملہ سے رزق عطا فرماتا ہے۔ اس کے اس انعام اور فضل پر اس کا شکر ادا کرنا لازم ہے تاکہ وہ اپنے انعامات میں اضافہ کرے۔ بندۂ مومن غربت و امارت دونوں طرح کے حالات میں اپنے معبودِ حقیقی کا شکر بجا لاتا ہے اور ناشکری سے ہر لحظہ گریز کرتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

"سو اللہ نے تم کو رہنے کی جگہ دی' اور تم کو اپنی نصرت سے قوت دی اور تم کو پاک چیزیں (کھانے کو) عطا فرمائیں تاکہ تم شکر کرو۔" (الانفال:26)

"اے ایمان والو جو پاک چیزیں ہم نے تم کو مرحمت فرمائی ہیں ان میں سے کھاؤ اور حق تعالیٰ کی شکر گزاری کرو اگر تم اس کے ساتھ غلامی کا تعلق رکھتے ہو۔" (البقرۃ:172)

"بے شک اللہ تعالیٰ بڑا فضل کرنے والے ہیں لوگوں پر مگر اکثر لوگ شکر نہیں کرتے۔" (النمل:73)

"بے شک آپ کا رب لوگوں پر (اپنا) بڑا فضل رکھتا ہے اور لیکن اکثر آدمی (اس بات پر) شکر نہیں کرتے۔" (النمل:73)

اللہ رب العزت بے حساب رزق دینے والا ہے:

اس بات پر کامل ایمان کی ضرورت ہے کہ اللہ ہی ہے جو بے حساب رزق دینے والا ہے۔ اگر کوئی

شخص بے حساب مال و متاع کا مالک ہے تو اس میں اس کے کمال، مہارت، قابلیت یا صلاحیت کا کوئی عمل دخل نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی عطا ہے جس کی رزاقی بحر بیکراں کی طرح ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے حساب رزق دیتے ہیں" (آل عمران: 27)

"اور روزی تو اللہ تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں بے اندازہ دے دیتے ہیں۔" (البقرۃ: 212)

دُنیا کا مال چند روزہ ہے:

اسلامی فلسفہ کے مطابق اگر کوئی شخص مال و متاع کی نعمت سے لبریز ہے تو وہ اس حقیقت کو فراموش نہ کرے کہ کسب معیشت کا اس کا اعلیٰ درجہ ہمیشہ باقی رہے گا بلکہ یہ تو چند روزہ ہے اور اس کا مال و متاع ہمیشہ اس کے پاس نہیں رہے گا۔ قرآن حکیم میں ہے۔

"اور جو کچھ تم کو دیا گیا ہے وہ محض (چند روزہ) دنیوی زندگی برتنے کے لیے اور یہیں کی زینت ہے اور جو (اجر و ثواب) اللہ کے ہاں ہے وہ بدرجہا اس سے بہتر ہے اور زیادہ باقی رہنے والا ہے۔ کیا تم لوگ نہیں سمجھتے۔" (القصص: 60)

"اور یہ دنیوی زندگی بجز لہو و لعب کے اور کچھ بھی نہیں اور اصل زندگی عالم آخرت ہے۔" (العنکبوت: 64)

"اور دنیاوی زندگی دھوکے کا سودا ہے۔" (الحدید: 20)

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"دنیا ایک مردار جانور کی طرح ہے، اور اس کے پیچھے لگنے والے کتوں کی طرح ہیں۔" (کشف الخفاء للعجلونی، حدیث نمبر 1313)

درجہ معاش بلند ہے تو اللہ کی راہ میں خرچ (انفاق فی سبیل اللہ) کیا جائے:

اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو دنیوی دولت سے نوازا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ اپنے رب کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ قرآن حکیم میں انفاق فی سبیل اللہ کے احکامات بے شمار جگہوں پر موجود ہیں۔ فرمایا:

"الف لام میم یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ (البقرۃ: 3,1)

"جو کچھ بھی تم لوگوں کو دیا گیا ہے وہ محض دنیا کی چند روزہ زندگی کا سروسامان ہے اور جو کچھ اللہ کے ہاں ہے وہ بہتر بھی ہے اور پائیدار بھی۔ وہ ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رب پر بھروسہ رکھتے ہیں جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں اور اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں، جو اپنے رب کا حکم مانتے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں، اپنے

معاملات آپس کے مشورے سے چلاتے ہیں' ہم نے جو کچھ بھی رزق انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔" (الشوریٰ:36, 38)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں انفاق سے مراد زکوۃ ہے کیونکہ یہاں پر نماز کے فوراً بعد اس کا ذکر آیا ہے' ضحاک رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہاں پر نفلی صدقہ مراد ہے۔ اس لیے زکوۃ کے لیے قرآن کریم میں زکوٰۃ ہی کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ایک قول یہ ہے کہ یہاں نفقہ سے مراد اہل وعیال پر نفقہ کرنا ہے...... اور ایک رائے یہ ہے کہ یہ عام ہے اور اس سے ہر طرح کا انفاق مراد ہے اور یہی رائے زیادہ صحیح ہے کیونکہ عمومیت کے ساتھ مؤمنین کی صفت بیان کی جا رہی ہے اور اس طرح بیان کی جا رہی ہے جس طرح ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔

"جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں" (البقرۃ:274)

"جو ہر حال میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں خواہ خوشحال ہوں یا بدحال" (آل عمران:134)

"یہ لوگ صبر کرتے ہیں' راست باز ہیں' فرماں بردار اور خرچ کرنے والے (فیاض) ہیں اور رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ سے مغفرت کی دعائیں مانگا کرتے ہیں۔" (آل عمران:17)

اسی طرح قرآن کریم میں مؤمنین کی اس صفت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

"اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروم کے لیے" (الذاریات:19)

"جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقرر حق ہے۔" (المعارج:25)

مزید برآں جو شخص اپنا مال دوسروں پر خرچ کر دینے اور اپنے دینی بھائیوں کی تکلیف دور کرنے کے لیے اپنی کمائی صرف کر دینے اور مصالح امت میں اپنے آپ کو شریک رکھنے کا عادی ہو وہ یقیناً اس امر سے بہت دور ہو گا کہ وہ کسی دوسرے کے مال پر چوری اور لوٹ مار کے ذریعے کوئی زیادتی کرے کیونکہ جو شخص محض رضائے الٰہی کے لیے اپنا مال خرچ کرتا ہو۔ وہ اللہ کی ناراضی مول لینے کے لیے دوسرے کے مال پر کس طرح دست درازی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"قسم ہے رات کی جبکہ وہ چھا جائے اور دن کی جبکہ وہ روشن ہو اور اس ذات کی جس نے نر و مادہ کو پیدا کیا' درحقیقت تم لوگوں کی کوششیں مختلف قسم کی ہیں' تو جس نے (راہ خدا میں) مال دیا اور (خدا کی نافرمانی سے) پرہیز کیا اور بھلائی کو سچ جانا اور اس کو ہم آسان راستے کے لیے سہولت دیں گے اور جس نے بخل کیا اور (اپنے خدا سے) بے نیازی برتی اور بھلائی کو جھٹلایا' اس کو ہم سخت راستے کے لیے سہولت دیں گے اور اس کا مال آخر اس کے کس کام آئے گا جبکہ وہ ہلاک ہو جائے گا۔" (اللیل:1-21)

کم حیثیت والے اور غرباء و نادار افراد کی تحقیر کی ممنوعیت:

آج قدریں بدل گئی ہیں' تصورات بدل گئے ہیں' اب دنیا کے اندر جو با وقعت ہے' جو اونچے مقام اور

منصب والا ہے' جو روپے پیسے والا ہے' اس کی عزت بھی ہے' اس کا اکرام بھی ہے اور جو شخص دنیاوی اعتبار سے کمزور ہے' اس کے پاس پیسے نہیں ہیں' وہ معمولی پیسے والا ہے نہ تو دل میں اس کی عزت ہے اور نہ اس کا احترام ہے' نہ اسکی طرف توجہ ہے بلکہ اسکے ساتھ حقارت کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ اس طرز عمل کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن مجید میں کم حیثیت اور مرتبہ والے شخص کی طرف توجہ نہ دینے یا اس سے بے اعتنائی برتنے کی ممنوعیت کا حکم موجود ہے۔ فرمایا:

"نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے تیوری چڑھائی اور متوجہ نہ ہوئے اس بات سے کہ ان کے پاس ایک نابینا شخص آ گیا اور آپ کو کیا خبر شاید وہ نابینا (آپ کی تعلیم سے پورے طور پر) سنور جاتا۔ یا نصیحت قبول کرتا' سو اس کو نصیحت کرنا فائدہ پہنچاتا۔ تو جو شخص (دین سے) بے پرواہی کرتا ہے آپ اس کی تو فکر میں پڑتے ہیں حالانکہ آپ پر کوئی الزام نہیں کہ وہ سنورے' اور جو شخص آپ کے پاس (دین کے شوق میں) دوڑتا ہوا آتا ہے اور وہ (خدا سے) ڈرتا ہے' آپ اس سے بے اعتنائی کرتے ہیں۔" (عبس: 1تا10)

ان آیات کی تفسیر میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ لکھتے ہیں:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض سرداران قریش کو مذہب اسلام کے متعلق کچھ سمجھا رہے تھے۔ اتنے میں ایک نابینا مسلمان (جن کو ابن ام مکتوم) کہتے ہیں' حاضر خدمت ہوئے اور اپنی طرف متوجہ کرنے لگے کہ فلاں آیت کیونکر ہے یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس میں سے کچھ سکھایئے جو اللہ نے آپ کو سکھلایا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کا بے وقت کا پوچھنا گراں گزرا۔ آپ کو خیال ہوا ہو گا کہ میں ایک بڑے اہم کام میں مشغول ہوں۔ قریش کے یہ بڑے بڑے سردار اگر ٹھیک سمجھ کر اسلام لے آئیں تو بہت لوگوں کے مسلمان ہونے کی توقع ہے۔ ابن ام مکتوم بہر حال مسلمان ہے' اس کو سمجھنے اور تعلیم حاصل کرنے کے ہزار مواقع حاصل ہیں' اس کو دکھائی نہیں دیتا کہ میرے پاس ایسے بااثر اور بارسوخ لوگ بیٹھے ہیں جن کو اگر ہدایت ہو جائے تو ہزاروں اشخاص ہدایت پر آ سکتے ہیں' میں ان کو سمجھا رہا ہوں' یہ اپنی کہتا چلا جاتا ہے۔ اتنا بھی نہیں سمجھتا کہ اگر ان لوگوں کی طرف سے ہٹ کر گوشہ التفات اس کی طرف کروں گا تو ان لوگوں پر کس قدر شاق ہو گا۔ شاید پھر وہ میری بات سننا بھی پسند نہ کریں۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم منقبض ہوئے اور انقباض کے آثار چہرے پر ظاہر ہونے لگے' اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ روایات میں ہے کہ اس کے بعد جب وہ نابینا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آتے آپ صلی اللہ علیہ وسلم بہت تعظیم و تکریم سے پیش آتے اور فرماتے "مرحبا بمن عاتبني فيه ربي" (تفسیر عثمانی صفحہ 767)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ جنتی کون ہے؟ پھر فرمایا کہ ہر وہ شخص جو کمزور ہے اور لوگ بھی اس کو کمزور سمجھتے ہیں' یا تو جسمانی اعتبار سے کمزور ہو' یا مالی اعتبار سے کمزور ہو' یا حیثیت اور رُتبے کے اعتبار سے کمزور ہو یعنی دنیا والے اس کو کم حیثیت اور کم مرتبہ والا سمجھتے ہیں' لیکن وہ کمزور شخص اللہ کے یہاں اتنا محبوب ہے کہ اگر وہ اللہ کے اُوپر کوئی قسم کھا لے تو اللہ تعالیٰ اس کی قسم کو پورا کر دیتے ہیں' یعنی اگر وہ شخص یہ قسم کھا لے کہ فلاں کام اس طرح ہوگا تو اللہ تعالیٰ وہ کام اسی طرح فرما دیتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا محبوب ہے' اور اللہ تعالیٰ اس کی محبت اور قدر کی بنا پر ایسا ہی کر دیتے ہیں۔" (صحیح بخاری' کتاب الادب' باب الکبر' حدیث نمبر 6071)

ایک دن کفار مکہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کو تیار ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات سننے کو تیار ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہر وقت معمولی قسم کے فاقہ مست لوگ بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے ساتھ بیٹھنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ اس لیے آپ ان کی مجلس الگ کر دیں اور ہمارے لیے علیحدہ مجلس منعقد کریں۔ بظاہر اس میں کوئی خرابی نہیں تھی کہ ان کے لیے علیحدہ وقت مقرر کر دیا جاتا اور ہو سکتا ہے دین کی باتیں سن کر ان کی اصلاح ہو جائے لیکن بات اصول کی تھی اس لیے فوراً قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی کہ:

"اور ان لوگوں کو مت دور کیجئے جو اپنے پروردگار کو صبح و شام اس کی رضا کا قصد کرتے ہوئے پکارتے ہیں۔" (الانعام:52)

چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعلان فرمایا کہ حق کی طلب لے کر آنا چاہتے ہو تو ان لوگوں کے ساتھ بیٹھنا ہوگا اور اگر نہیں بیٹھنا چاہتے تو اللہ تعالیٰ تم سے بے نیاز ہے اور اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تم سے بے نیاز ہے۔ لیکن تمہارے لیے الگ مجلس منعقد نہیں کی جائے گی۔

(صحیح مسلم' کتاب الفضائل الصحابہ' باب فضل سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ساری عمر یہ دعا فرماتے رہے کہ "اے اللہ! مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھئے' مسکینی کی حالت میں مجھے موت دیجئے اور مسکینوں کے ساتھ میرا حشر فرمائیے۔"

(ترمذی' کتاب الزھد' باب ماجاء ان فقراء المھاجرین یدخلون الجنة قبل اغنیاءھم۔ حدیث نمبر 2352)

ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دعا فرمائی ہے کہ:

"اے اللہ! میں فقر سے مفلسی سے اور دوسروں کی احتیاج سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔"

(ابوداؤد کتاب الصلاۃ' باب الاستعاذہ حدیث نمبر:1544)

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بہت سے ایسے لوگ جو پراگندہ بال والے ہیں' ان کے بالوں میں کنگھی نہیں کی گئی ہے' اور غبار آلود جسم اور چہرہ والے' محنت اور مزدوری کر کے کماتے ہیں' جس کی وجہ سے ان کے جسم اور چہرہ پر گرد کی تہہ جمی ہوئی ہے اور یہ لوگ اگر کسی کے دروازے پر جائیں تو لوگ ان کو دھکا دے

کر ان کو نکال دیں۔ یہ لوگ دنیاوی اعتبار سے تو بے حقیقت ہیں' لیکن اللہ کے یہاں ان کی یہ قدر و قیمت ہوتی ہے کہ اگر اللہ پر کوئی قسم کھالیں تو اللہ ان کی قسم پوری کر دیں اور اگر یہ لوگ کہہ دیں کہ یہ کام نہیں ہوگا تو اللہ تعالیٰ وہ کام روک دیتے ہیں۔"

(صحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ' باب فضل اوضعفاء والخاملین حدیث نمبر 2622)

تکبر سے گریز کیا جائے:

اسلام کی رُو سے اپنے مال و متاع اور حیثیت پر تکبر کرنے کو پسند نہیں کرتا اور متکبرانہ طرز عمل کی شدید مذمت کرتا ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا جنت اور دوزخ کے درمیان آپس میں مباحثہ ہو گیا کہ دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ دوزخ نے کہا کہ میری شان اونچی ہے اس لیے کہ میرے اندر بڑے بڑے جبار اور متکبر لوگ آ کر آباد ہوں گے۔ اس کے مقابلے میں جنت نے کہا کہ میرے اندر کمزور اور مسکین قسم کے لوگ آباد ہوں گے' اور جنت نے اس بات پر فخر کیا' پھر ان دونوں کے درمیان اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرمایا اور جنت سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ تو جنت ہے اور تو میری رحمت کا نشان ہے۔ تیرے ذریعہ سے میں جس پر چاہوں گا اپنی رحمت نازل فرما دوں گا۔ اور دوزخ سے خطاب کرکے فرمایا کہ تو دوزخ ہے جو میرے عذاب کا نشان ہے اور تیرے ذریعہ سے میں جس کو چاہوں گا' عذاب دوں گا اور دونوں سے میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں تم دونوں کو بھروں گا۔"

(صحیح مسلم' کتاب الجنۃ' باب النار یدخلھا الجبارون' حدیث نمبر 2847)

جہنم اللہ تعالیٰ نے متکبرین سے بھر دی ہے۔ اس واسطے کہ متکبر وہ شخص ہے جو دوسروں پر اپنی بڑائی جتائے اور دوسروں کو چھوٹا سمجھے۔ ایک روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ "بڑائی تو میری چادر ہے جو شخص مجھ سے اس چادر میں جھگڑا کرے گا' میں اس کو آگ میں ڈال دوں گا۔"

(ابو داؤد رضی اللہ عنہ کتاب اللباس' باب ماجاء فی الکبر' حدیث نمبر 409)

کفالتِ عامہ

(قرآن۔حدیث۔عہد خلافت راشدہ کے تعامل کی روشنی میں)

سوال: اسلام میں کفالت عامہ پر نوٹ لکھیں۔

کفالت عامہ کا مفہوم:

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی کفالت عامہ کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ دارالاسلام کے حدود کے اندر بسنے والے ہر انسان کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ یہ اہتمام اس درجہ تک ہونا چاہیے کہ کوئی فرد ان ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔"

اس ضمن میں انسان کی بنیادی ضرورت کی صراحت کرتے ہوئے ڈاکٹر نجات اللہ لکھتے ہیں:

"ہر وہ ضرورت بنیادی ضرورت ہے جس کی تکمیل پر کسی انسان کی زندگی کی بقاء کا انحصار ہو۔ شریعت کی کسی نص میں ان ضرورتوں کی صراحت نہیں کی گئی۔ مگر خود یہ اصول نصوص سے ثابت ہے...... اس فقرہ میں جن چار ضرورتوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی نوعیت یہ ہے کہ ان کی عدم تکمیل آدمی کی جان کو خطرہ میں ڈال دیتی ہے۔ متعلقہ نصوص اور ان کے مطابق عمل کی نظروں سے یہ استنباط کیا جاسکتا ہے کہ کم از کم ان ضرورتوں کی تکمیل اس اصول کا لازمی تقاضا ہے۔ البتہ مخصوص حالات میں مخصوص افراد کے لیے اسی اصول کے تحت بعض دوسری ضرورتیں بھی یہی نوعیت اختیار کرسکتی ہیں۔"

(اسلام کا نظریہ ملکیت' ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔ مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔ حصہ دوم صفحہ 92)

کفالتِ عامہ قرآن کی روشنی میں:

کفالتِ عامہ کا اصول اسلام کا امتیازی وصف ہے۔ مغربی دنیا نے یہ اصول اسلام ہی سے لیا ہے۔ قرآن مجید نے اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایتائے زکوٰۃ کا حکم کئی جگہوں پر جاری فرما کر دراصل معاشرہ کے محروم و نادار طبقہ کی کفالت کا شاندار بندوبست کیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اور ان کے مالوں میں سائل اور محروم کا حق رکھ دیا گیا ہے۔" (الذاریات:19)

قرآن مجید نے مسلمانوں کے مابین باہمی کفالت اور تعاون کو فرض قرار دیا ہے اور مساکین کو کھانا

کھلانا واجب کیا ہے اور ان اعمال کو ایمان اور اسلام کا مقتضا قرار دیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا کہ:

"اور آپس میں مدد کرو نیک کام پر اور پرہیزگاری پر اور مدد نہ کرو گناہ پر اور زیادتی پر۔" (المائدہ:2)

فرمایا: "صحابہ کرام رضی اللہ علیہم نرم دل ہیں آپس میں" (الفتح:29)

فرمایا: "اور دے ناتے والوں کو اس کا حق اور محتاج کو اور مسافر کو" (الاسراء:26)

فرمایا: اور ماں باپ سے نیکی اور قرابت والے سے اور یتیموں سے اور فقیروں سے اور ہمسایہ قریب سے اور ہمسایہ اجنبی سے اور برابر کے رفیق سے اور راہ کے مسافر سے اور اپنے ہاتھ کے مال سے۔"

(النساء:36)

قرآن حکیم کی متعدد آیات اطعام مسکین کی تائید کرتی ہیں اور اس کو ایمان کی علامت قرار دیتی ہیں اور اطعام مسکین کے ترک کو لوازم کفر اور آخرت کی تکذیب قرار دیتی ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

"تو نے دیکھا اس کو جو جھٹلاتا ہے انصاف ہونے کو۔ سو یہ وہی ہے جو دھکے دیتا ہے یتیم کو اور نہیں تاکید کرتا محتاج کے کھانے پر۔" (الماعون:1تا3)

مجرمین کے جہنم میں جانے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بیان ہوا:

"وہ بولے ہم نہ تھے نماز پڑھتے اور نہ تھے کھلاتے محتاج کو۔" (المدثر:43, 44)

اس شخص کے بارے میں جسے نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا اور وہ عذاب جہنم میں جلے گا۔ یہ فرمایا:

"وہ تھا یقین نہ لاتا اللہ پر جو سب سے بڑا۔ اور تاکید نہ کرتا فقیر کے کھانے پر" (الحاقہ:32,33)

ایک اور مقام پر فرمایا:

"سو نہ دھمک سکا گھاٹی پر اور تو کیا سمجھا کیا ہے وہ گھاٹی۔ چھڑانا گردن کا یا کھلانا بھوک کے دن میں۔ یتیم کو جو قرابت والا ہے یا محتاج کو جو خاک میں رل رہا ہے۔ پھر ہوئے ایمان والوں میں جو تاکید کرتے ہیں آپس میں تحمل کی اور تاکید کرتے ہیں رحم کھانے کی۔ وہ لوگ ہیں بڑے نصیب والے۔" (البلد:1تا18)

اسلامی ریاست کی ذمہ داری:

اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ کفالتِ عامہ کا مضبوط اور مؤثر نظام قائم کرے۔ نظام زکوٰۃ بھی اسلام کے پورے نظام کا ایک حصہ ہے اور اسی لیے یہ انفرادی معاملہ نہیں بلکہ اسلامی حکومت کی ایک ذمہ داری ہے اور اسی لیے اسلام نے حکومت پر لازم کیا ہے کہ وہ لوگوں سے زکوٰۃ وصول کرے اور اس کو مستحقین میں تقسیم کرے۔ بقول ڈاکٹر یوسف القرضاوی:

"زکوٰۃ کا معاملہ انفرادی ہو جانے سے اس کی تقسیم میں بے ربطگی پیدا ہو جائے گی کہ ہو سکتا ہے کہ ایک سے زائد دولت مند افراد ایک ہی شخص کو زکوٰۃ دے دیں اور دوسرا اس سے محروم رہ جائے۔

حالانکہ وہ تنگدستی میں پہلے سے بڑھا ہوا ہو۔"

(فقہ الزکوۃ: یوسف قرضاوی۔ مطبوعہ البدر پبلی کیشنز لاہور

حصہ دوم۔ صفحہ 279 مترجم ساجد الرحمٰن صدیقی)

کفالت عامہ کو مؤثر بنانے کے لیے ریاست اسلامیہ میں بیت المال کا قیام عمل میں لایا جاتا ہے تا کہ زکوۃ کی آمدنی کو بیت المال میں جمع کیا جائے اور اس سے مستحقین کی اعانت کی جائے۔ بقول ڈاکٹر یوسف القرضاوی:

"اسلام دین بھی ہے ریاست بھی' قرآن بھی ہے اور سلطان بھی' اور اس ریاست و سلطنت کے لیے مال ضروری ہے اور اسلام کے نظام حکومت میں زکوۃ بیت المال کی آمدنی کا اہم ترین ذریعہ ہے۔"

(الدکتور یوسف القرضاوی: مشکلۃ الفقر و کیف عالجہا دالاسلام۔ ص 95,94)

کفالت عامہ کا یہ مطلب نہیں کہ افراد محنت سے جی چراتے پھریں اور اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے ریاست کے وسائل کی طرف دیکھتے رہیں بلکہ وہ معاشی جدوجہد کے پابند ہیں اور محض مستحقین اور مجبور افراد ہی ریاست کی طرف سے کفالت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس حوالہ سے ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی لکھتے ہیں:

"اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ ہر فرد کو ان ضروریات کی تکمیل کرنے والی اشیاء اور خدمات کی مطلوبہ یا ضروری مقداریں بہم پہنچتی رہے' بلا لحاظ اس کے کہ وہ خود اپنے مال سے' یا اپنی محنت کے ذریعہ کسب مال کر کے' ان ضروریات کو پورا کر سکتا ہے یا نہیں۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔ عام حالات میں عام افراد ان ضروریات کو خود اپنے بل بوتے پر پورا کرتے رہیں گے۔ بقدر ضرورت مال نہ حاصل کر سکنے والے افراد کو اپنے خاندان یا عام افراد اجتماع سے اتنی مدد مل سکے گی کہ وہ اپنی ضروریات پوری کر سکیں۔ صنعتی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو عارضی بے روزگاری' مرض' بڑھاپے یا کسی حادثہ کے سبب معذور ہو جانے کی حالت میں کارخانہ یا متعلقہ صنعت سے اتنا امدادی وظیفہ دلوانے کا اصول بنایا جا سکتا ہے۔ جو ان کی ضروریات کے لیے کافی ہو۔ سماجی تحفظ (Social Secutiry) کے ان انتظامات کو سامنے رکھتے ہوئے اس اصول کا منشاء یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد ان انتظامات کے باوجود اس حال میں پایا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو تو بالآخر اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ فرد ان وسائل حیات سے محروم نہ رہے جو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اور بلا تاخیر اجتماعی خزانے سے بقدر ضرورت مال حاصل کر سکیں اور دارالاسلام کا کوئی باشندہ بھوکا' پیاسا' ننگا' بے ٹھکانا اور مرض کی حالت میں بے علاج نہ رہے۔"

(اسلام کا نظریہ ملکیت: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی۔ مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لاہور۔ حصہ دوم صفحہ 92-93)

کفالت عامہ احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور عہد خلافت راشدہ کی روشنی میں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اصول واضح فرما دیا ہے کہ اصحاب امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمہ دار ہیں:

''ہم سے سلیمان بن عبدالرحمٰن دمشقی نے بروایت یحییٰ بن حمزہ یہ حدیث بیان کی ہے کہ انہوں نے کہا کہ مجھ سے ابن ابی مریم نے یہ حدیث بیان کی ہے کہ قاسم بن مخیمرہ نے انہیں خبر دی ہے کہ ابو مریم ازدی نے ان سے کہا کہ میں معاویہ کے پاس گیا۔ انہوں نے کہا ابو فلاں' کیسے تشریف لائے؟ میں نے کہا' آپ کو ایک حدیث سے باخبر کرنے آیا ہوں جسے میں نے سنا ہے۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''جسے اللہ عزوجل نے مسلمانوں کے بعض امور کا نگران بنایا ہے اور وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ گیا' اللہ تعالیٰ بھی ان کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔'' (ابوداؤد: کتاب الخراج)

راوی کہتا ہے کہ معاویہ نے (یہ سن کر) ایک آدمی کو عوام کی ضروریات (پوری کرنے) پر مامور کر دیا۔
عمرو بن مرہ نے معاویہ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ ''جو امام ضرورت مندوں' فقراء اور مساکین پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ اس کی ضروریات' فقر اور مسکینی پر آسمان کے دروازے بند کر لیتا ہے۔'' (یہ سن کر) معاویہ نے ایک آدمی کو عوام کی ضروریات (پوری کرنے) پر مامور کر دیا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ اگر صاحب امر ضرورت مند افراد کی ضروریات پوری کرنے کا اہتمام نہ کرے گا تو اللہ کی سخت ناراضگی مول لے گا۔ یہ وعید اس بات کے لیے کافی ہے کہ تکمیل ضروریات کو اسلامی ریاست کی ذمہ داری قرار دیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ ان کی ذمہ داری یاد دلائی گئی تو انہوں نے فوراً اس کو پورا کرنے کا اہتمام کیا۔

اسلامی ریاست کی اس ذمہ داری کی اہمیت کا اندازہ ''خلافت'' کی اس تعریف سے بھی کیا جاسکتا ہے جو حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کی ہے۔ جسے سن کر کعب بن احبار رضی اللہ عنہ نے ان کی تصویب فرمائی ہے۔

''سلمان سے روایت ہے کہ انہوں نے کہا ''خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور رعایا پر اس طرح شفقت کرے جس طرح آدمی اپنے اہل وعیال پر شفقت کرتا ہے۔ یہ سن کر کعب بن احبار رضی اللہ عنہ نے کہا: سچ کہا۔''

(ابوعبید: کتاب الاموال۔ صفحہ 6)

رعایا کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام دراصل اس ''خیر خواہی'' کے اندر شامل ہے جو صاحب

امر پر لازم قرار دی گئی ہے۔ جو حکمران رعایا کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتے اس کا اُخروی انجام برا ہوگا۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

”جس بندہ کو خدا نے کسی رعایا کا حکمران بنایا اور اس نے اس کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔“ (بخاری کتاب الاحکام)

”جو امیر مسلمانوں کے امور کا نگران ہے اور پھر ان (کی بھلائی) کے لیے محنت نہ کرے اور ان کی خیر خواہی نہ کرے۔ وہ ان کے ساتھ جنت میں نہیں داخل ہوگا۔“

(مسند ابی عوانہ۔ جلد اول صفحہ 32' دائرۃ المعارف حیدرآباد 1362ھ)

شریعت نے اسلامی ریاست کو اپنے تمام شہریوں کا ولی (سرپرست) قرار دیا ہے۔ سرپرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

”جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔“ (ترمذی: ابواب الفرائض)

”جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔“

(ترمذی: ابواب النکاح' ابوداؤد' کتاب النکاح)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک نو مسلم قبیلہ کے سردار زرعہ بن ذی یزن کے نام ایک خط لکھا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سردار کے توسط سے اس کے قبیلہ حمیر کے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

”اہل حمیر میں تم کو بھلی روش اختیار کے رہنے کی تلقین کرتا ہوں۔ نہ خیانت کرنا اور مخالفانہ روش اختیار کرنا۔ اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مال دار اور غریب تمام لوگوں کا سرپرست ہے۔ صدقہ کا مال محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یا اس کے گھر والوں کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ یہ زکوۃ ہے جسے تم (اپنی پاکیزگی کے لیے) غریب مسلمانوں کے لیے نکالتے ہو۔“

(ابوعبید: کتاب الاموال صفحہ 202)

اس خط میں اہل حمیر کو یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے ان کے مال کا جو حصہ بطور زکوۃ وصول کیا جائے گا وہ صدر ریاست کے ذاتی مصرف میں نہیں آئے گا بلکہ ضرورت مند مسلمانوں کو دیا جائے گا۔ ان کو اطاعت ترک کر کے سرکشی کی روش اختیار کرنے یا امانت ترک کر کے ادائے عشر و زکوۃ میں خیانت کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ جو فرد بھی ضرورت یا معیشت سے پریشان ہوگا۔ خواہ وہ مال دار ہو یا مفلس' اللہ کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس کو سہارا دینے کے لیے موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں ”رسول اللہ“ سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وہ حیثیت پیش نظر ہے جو اسلامی ریاست کے صدر کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حاصل تھی۔ یہ بات حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ایک اثر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح کو ایک خط لکھا تھا جس میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد ”اللہ و رسولہ مولی من لا مولی

لہ" کا حوالہ دے کر ریاست کی ذمہ داری کی طرف اشارہ کیا گیا تھا۔

(ترمذی: ابواب الفرائض. باب ما جاء فی میراث المال)

اس سرپرستی میں بنیادی ضروریات کے علاوہ، بشرط گنجائش افراد کی دوسری ضروریات کی تکمیل بھی داخل ہو جاتی ہے۔ فتوحات کے بعد جب بیت المال میں کافی مال آنے لگا تو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اعلان فرمادیا کہ جو لوگ مقروض ہوں اور وفات پا جائیں ان کے قرضے اسلامی ریاست کے خزانے سے ادا کیے جائیں گے۔ فرمایا: "مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے۔ پس جو مقروض وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی۔" (ابوعبیدہ: کتاب الاموال صفحہ 220)

"............ پھر جب اللہ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے۔ لہٰذا جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہوگا۔" (بخاری: کتاب النفقات، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی)

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرض کے علاوہ مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دوسری ذمہ داریوں مثلاً بے سہارا اہل و اولاد کی کفالت کے سلسلہ میں بھی یہی اعلان فرمایا تھا۔ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جو مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو (کسی کو) بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری میرے سر ہوگی۔"

(ترمذی: ابواب الفرائض، ابوداؤد کتاب الخراج)

حضرت ابوعبید رضی اللہ عنہ نے حضرت مقدام رضی اللہ عنہ بن معدی کرب سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جو متوفی مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے وراثوں کے لیے ہے اور جو ذمہ داریاں چھوڑ کر مرے وہ اللہ کے ذمہ ہیں اور کبھی یہ فرمایا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذمہ ہیں۔" (ابوعبید: کتاب الاموال صفحہ 237)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو افراد اسلامی ریاست کی صدارت کے منصب پر فائز ہوئے انہیں اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا شعور اور احساس تھا۔ اس حقیقت پر خلافتِ راشدہ کی پوری تاریخ گواہ ہے۔

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنی ذمہ داریاں گناتے ہوئے ایک عام خطبہ میں یہ فرمایا تھا:

"لوگو! اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری عائد کی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکوں"

(ابومحمد عزالدین عبدالعزیز بن عبدالسلام: قواعد الاحکام فی مصالح الانام۔ جلد 1 صفحہ 140 مکتبہ حسینیہ مصر 1934ء)

اسی اصول کا اعلان حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس وقت بھی فرمایا تھا جب آپ رضی اللہ عنہ سعد بن مالک الزہری رضی اللہ عنہ کو عراق کا امیر بنا کر بھیج رہے تھے۔ (طبری: تاریخ صفحہ 2220 (حوادث 14ھ)، ابن کثیر البدایہ والنہایہ جلد 7 صفحہ 36)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد عوام سے خطاب میں فرمایا:

''مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں اسے پورا کر دوں' جب تک ہم سب مل کر اسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے اندر اتنی گنجائش نہ رہ جائے تو ہم باہمی امداد کے ذریعہ گزراوقات کریں گے۔ یہاں تک کہ سب کا معیار زندگی ایک سا ہو جائے۔ کاش تم جان سکو کہ میرے دل میں تمہارا کتنا خیال ہے۔ لیکن میں یہ بات تمہیں عمل کے ذریعہ ہی سمجھا سکتا ہوں۔ خدا کی قسم میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تم کو اپنا غلام بنا کر رکھوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔ (حکمرانی کی یہ) امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اس کو اپنی ذاتی ملکیت نہ سمجھوں بلکہ (تمہاری چیز سمجھ کر) تمہاری طرف واپس کر دوں اور (تمہاری خدمت کے لیے) تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو میں تمہارے ذریعہ فلاح پاؤں گا۔ اور اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور (اپنے حقوق کے مطالبہ کے لیے) اپنے گھر آنے پر مجبور کر دوں تو تمہارے ذریعہ انجام خراب ہوگا۔ (دنیا میں) کچھ عرصہ میں خوشی منا لوں گا مگر (آخرت میں) عرصۂ دراز تک غمگین رہوں گا۔ میرا حال یہ ہوگا کہ مجھ سے کچھ کہنے والا ہوگا' نہ کوئی میری بات کا جواب دے گا کہ میں اپنا عذر بیان کر کے معافی حاصل کر سکوں۔'' (ابن کثیر' البدایہ والنہایہ جلد 7 صفحہ 46)

جب حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو آپ کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کی گراں باری محسوس کر کے رونے لگے۔

(ابو یوسف: کتاب الخراج۔ صفحہ 10 ابو محمد عبداللہ بن عبدالحکم:
سیرت عمر بن عبدالعزیز۔ صفحہ 179,178 مطبع رحمانیہ۔ مصر 1927ء)

کفالتِ عامہ کے سلسلے میں حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کو اپنی وسیع ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا بلکہ آپ نے واضح طور پر اعلان کر دیا کہ: ''تم میں سے جس کسی کی بھی ضرورت کا علم مجھے ہوگا اس کی ضرورت پوری کرنے کی میں حتی الامکان پوری کوشش کروں گا۔'' (ابن الحکم: سیرت عمر بن عبدالعزیز صفحہ 41)

یہی اعلان آپ سے پہلے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بھی کر چکے تھے۔ فرمایا: ''اور جو مال مانگنا چاہے وہ میرے پاس آئے کیونکہ اللہ نے مجھے (اپنے مال کا) خزانچی اور تقسیم کنندہ بنا دیا ہے۔''

(ابن جوزی: سیرت عمر بن الخطاب صفحہ 101۔ مطبعۃ السعادۃ مصر 1924ء)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ کے عہد میں ایک زبردست قحط پڑا تو عرب سے کچھ لوگ ایک وفد کی شکل میں آپ کے پاس آئے۔ انہوں نے آپ سے گفتگو کرنے کے لیے ایک آدمی کو منتخب کر لیا۔ اس شخص نے کہا: ''اے امیر المؤمنین ہم ایک شدید ضرورت کے سبب آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہمارے جسم کی چمڑی سوکھ گئی کیونکہ اب ہڈیاں بھی میسر نہیں آتیں اور ہماری مشکل کا حل صرف بیت المال کے ذریعہ ممکن ہے۔ اس مال کی حیثیت تین میں سے ایک ہو سکتی ہے۔ یا تو یہ خدا کے لیے ہے یا بندگان خدا کے لیے' یا آپ کے لیے۔ اگر یہ خدا کے لیے ہے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں' اگر بندگانِ خدا کے لیے ہے تو اسے انہیں دے دیجئے' اور اگر آپ کا ہے تو

صدقہ کے طور پر ہمیں دے دیجئے' اللہ صدقہ کرنے والوں کو جزائے خیر دے گا۔"
یہ سن کر عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور آپ نے فرمایا کہ اس کی حیثیت وہی ہے جس کا تم نے ذکر کیا ہے اور حکم دے دیا کہ ان لوگوں کی ضروریات بیت المال سے پوری کی جائیں۔

(امام غزالی' التبر المسبوک فی نصائح الملوک۔ علی ہامش سراج الملوک۔ لابی بکر بن محمد ابن الولید الفہری الطرطوشی المالکی۔ صفحہ 62,61 مطبع خیریہ مصر 1306ھ)

متعدد دیگر مواقع پر یہ ہوا کہ کوئی ضرورت مند آپ کے پاس آیا اور آپ نے اس کی ضرورت معلوم کرنے کے بعد اسے پورا کرنے کا اہتمام کیا۔ (ابن جوزی: سیرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ۔ صفحات 56, 57 اور 74)

ایک بار ایک صاحب مدینہ سے حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ کے پاس آئے تو آپ نے ان سے وہاں کے حالات دریافت کرتے ہوئے پوچھا کہ فلاں مقام پر جو فقیر بیٹھا کرتے تھے ان کا کیا حال ہے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ لوگ اب وہاں نہیں بیٹھتے' اللہ نے ان کو ایسا کرنے سے بے نیاز کر دیا ہے۔

(ابن جوزی: سیرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ صفحہ 76)

کفالتِ عامہ کے فریضہ کی عملاً انجام دہی کی متعدد مثالیں حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ملتی ہیں۔ جب آپ رضی اللہ عنہ شام تشریف لے گئے تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے بڑے مؤثر انداز میں آپ رضی اللہ عنہ کو یہ بتایا کہ عوام بھوک سے پریشان ہیں۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً مقامی حکام کو حکم دیا کہ ہر مسلمان کے لیے بقدر کفایت غذائی اجناس فراہم کریں۔ (ابوعبید: کتاب الاموال۔ صفحہ 264)

کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا تصور اتنا وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ آپ رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ اگر دارالاسلام کے حدود کے اندر کوئی جانور بھی بھوک سے مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ کے حضور مجھے اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "اگر ساحل فرات پر کوئی اونٹ بے سہارا مر جائے تو مجھے ڈر ہے کہ اللہ مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کرے گا۔"

(محمد ابن سعد: الطبقات الکبریٰ جلد 3 صفحہ 305)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کسی نہر کے کنارے کوئی خارشی بکری اس حال میں چھوڑ دی جائے کہ اسے (علاج کے طور پر) تیل کی مالش نہ کی جا سکے تو مجھے اندیشہ ہے کہ قیامت کے دن مجھ سے اس کے بارے میں جواب طلب کیا جائے گا۔ (امام غزالی: التبر المسبوک صفحہ 17)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس ارشاد سے واضح ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ کفالتِ عامہ کی ذمہ داری میں دوا و علاج کو بھی داخل سمجھتے تھے۔ جو حکمران جانوروں کے علاج کو اپنی ذمہ داری سمجھتا ہو وہ انسانوں کے علاج کو بدرجہ اولیٰ اپنی ذمہ داری میں داخل سمجھے گا۔ آپ رضی اللہ عنہ عوام کی حاجت روائی کا اہتمام کرنے کے لیے راتوں میں گشت لگاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ رضی اللہ عنہ کو کسی کی کسی ضرورت کا پتہ اسی گشت کے دوران

لگا اور آپ رضی اللہ عنہ نے فوراً وہ ضرورت پوری کی۔ (ابن جوزی: سیرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ۔ صفحہ 64-68)

بصرہ کے والی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ جب ایک وفد کے ساتھ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ملاقات کے لیے آئے تو آپ رضی اللہ عنہ نے ان لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ "سنو! لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے متعلقین کو کھلانے کا سامان کرو۔" (طرطوشی: سراج الملوک۔ صفحہ 109 مطبع خیریہ مصر 1306ھ)

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو آپ رضی اللہ عنہ اسے اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے لا کر اسے کچھ دیا۔ پھر آپ رضی اللہ عنہ نے بیت المال کے خزانچی کو بلوایا اور اس سے کہا۔

> "اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو کیونکہ خدا کی قسم یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے (جزیہ وصول کر کے) کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔" (ابو یوسف: کتاب الخراج۔ صفحہ 150, 151)

شام کے سفر میں آپ رضی اللہ عنہ کو راستہ میں کچھ عیسائی ملے جو جذام کے مرض میں مبتلا تھے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے ان کی معذوری کے پیش نظر ان کے لیے روزینہ جاری کرنے کا حکم دے دیا۔ (بلاذری: فتوح البلدان۔ صفحہ 135)

غیر مسلم رعایا کی ضروریات کی تکمیل کا یہ اہتمام صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شفقت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ابتداء ہی سے یہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک اہم اصول تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے اہل حیرہ کے ساتھ جو عیسائی تھے معاہدہ کیا' تو اس میں ایک دفعہ یہ بھی رکھی تھی کہ "میں نے ان کا یہ حق قرار دیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے' یا جس پر کوئی مرض یا مصیبت آ پڑے' یا جو آدمی پہلے مال دار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں۔ اس کا جزیہ ساقط کر دیا جائے گا اور جب تک وہ دار الہجرت اور دار السلام میں مقیم رہے گا اس کی اور اس کے اہل و عیال کی کفالت مسلمانوں کے بیت المال سے کی جائے گی۔" (ابو یوسف' کتاب الخراج صفحہ 172)

اُوپر جو احادیث و آثار نقل کیے گئے ہیں ان کا تعلق بہت بنیادی ضروریات سے ہے۔ اگرچہ بعض احادیث میں ادائے قرض کا بھی ذکر آیا ہے اور سرپرستی (ولایت) کی احادیث کا تعلق ہر طرح کی بنیادی ضروریات سے ہے۔ بعض دیگر آثار سے پتہ چلتا ہے کہ خوراک' لباس' مکان اور علاج جیسی بنیادی ضروریات کے علاوہ دیگر ضرورت کی تکمیل کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔

ان دیگر ضروریات میں سے ایک اہم ضرورت عام تعلیم کی ہے۔ اسلامی ریاست اپنے شہریوں کو لکھنا پڑھنا بھی سکھاتی تھی۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کا اہتمام کرتے تھے کہ لوگ لکھنا اور پڑھنا سیکھیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے حکم سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے یہود کی زبان (سریانی) لکھنا اور پڑھنا سیکھا تھا۔ (ابوداؤد: کتاب العلم۔ باب روایت حدیث اہل الکتاب)۔ بدر کے موقع پر متعدد قیدیوں کا فدیہ یہ قرار دیا گیا کہ ان میں سے ہر ایک مدینہ کے دس بچوں کو لکھنا سکھا دے۔ (محمد ابن سعد: الطبقات الکبیر۔ جلد 2۔ صفحہ 222)

صفہ کی اسلامی درسگاہ میں شریک ہونے والے قرآن کریم اور تعلیمات دین کے ساتھ لکھنا اور پڑھنا بھی سیکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے یہاں بعض لوگوں کو لکھنا بھی سکھا دیا تھا۔ (ابوداؤد۔ کتاب البیوع۔ باب فی کسب المعلم)

ایک روایت میں آتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعید بن العاص رضی اللہ عنہ کو اس بات پر مامور کیا تھا کہ مدینہ کے لوگوں کو لکھنا سکھائیں۔

(ابن عبدالبر: الاستیعاب فی معرفۃ الصحابہ۔ جلد 1 صفحہ 393۔ دائرہ المعارف حیدرآباد۔ 1318ھ)

ایک بار عرب کے چند قبائل نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمائش کی کہ ان کے عوام کو دین سکھانے کے لیے اپنے چند رفقاء کو بھیجیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصار میں سے ستر افراد کو جو اپنے زمانہ میں "قرآء" (عالم قرآن) کہلاتے تھے اور "جو دنوں میں لکڑیاں چنتے تھے مگر راتوں کو لکھتے تھے" ان کے یہاں بھیجا تھا۔ (بخاری: کتاب المغازی۔ باب غزوۃ ذات الرجیع ورعل وذکوان بئر معونۃ ..... عن انس بن مالک)

ان روایات کی روشنی میں ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑے پیمانے پر اس کا اہتمام کیا تھا کہ مسلمان دین کا علم حاصل کرنے کے ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سیکھیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بچوں کی تعلیم کے لیے معلم مقرر کیے تھے جن کو بیت المال سے تنخواہ دی جاتی تھی۔ وضیف بن عطاء سے مروی ہے کہ انہوں نے کہا کہ مدینہ میں تین آدمی تھے جو بچوں کو تعلیم دیا کرتے تھے اور عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ان میں سے ہر ایک کو پندرہ درہم ماہانہ دیا کرتے تھے۔ (کنز العمال: جلد 2 بحوالہ مسند ابن ابی شیبہ)

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے گورنروں کو لکھا کہ آپ کو ان لوگوں کی فہرست بھیجی جائے جن کو قرآن کریم حفظ ہے تاکہ ان کو اونچے وظیفے دے کر مختلف علاقوں میں لوگوں کو قرآنِ مجید کی تعلیم دینے پر مامور کر دیا جائے۔ (کنز العمال: جلد 1 صفحہ 217 حدیث نمبر 4030)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے بھی دیہات کے مسلمانوں کو اسلامی آداب زندگی کی تعلیم دینے کے لیے باتنخواہ معلم مقرر کیے تھے۔ (ابوعبید: کتاب الاموال۔ صفحہ 262' ابن الحکم سیرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ صفحہ 167)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے طالب علموں کے لیے اور ایسے افراد کے لیے جو اپنے علمی مشاغل کے سبب کسب معاش سے قاصر تھے وظائف بھی مقرر کیے تھے۔ (ابوعبید: کتاب الاموال صفحہ 261)

بعض دوسرے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ معذور افراد کو خادم بھی فراہم کیے جاتے تھے۔ حضرت عمر

بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے شام میں نابینا افراد' فالج یا کسی دوسرے مزمن مرض کے سبب معذور افراد اور بے سہارا یتیم بچوں کی خدمت کے لیے سرکاری طور پر خادم فراہم کیے تھے۔ (ابن جوزی: سیرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ۔ صفحہ 155-154)

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے مکہ اور مدینہ کے درمیانی راستہ پر مسافروں کے عارضی قیام اور اکثر اوقات ان کے کھانے پینے کا بندوبست کر رکھا تھا۔ (بلاذری' فتوح البلدان صفحہ 53)۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے بھی حکام کو اپنے مسافر خانے بنوانے کا حکم دیا تھا جہاں مسافروں کو قیام و طعام مفت فراہم کیا جائے۔

(ابن اثیر الکامل۔ جلد 6 صفحہ 22)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ بیت المال سے مقروض افراد کو ادائے قرض کے لیے مالی امداد دی جائے۔ (ابن الحکم: سیرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ' صفحہ 67, 171)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے یہ حکم جاری کیا تھا کہ بیت المال سے مقروض افراد کو ادائے قرض کے لیے مالی امداد دی جائے۔ (ابن الحکم: سیرت عمر بن عبدالعزیز' صفحہ 67)

ان آثار و احادیث کی روشنی میں واضح ہے کہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ محروم اہل حاجت کی حاجت روائی کا اہتمام کرے۔ بعض بنیادی ضروریات کی تکمیل لازمی ہے مگر حتی الامکان دیگر اہم ضروریات کی طرف بھی توجہ کی جانی چاہیے۔ مسلمان حکمرانوں کے فرائض پر اظہار خیال کرنے والے متعدد مفکرین نے اس فرض کی صراحت کی ہے۔ جن مفکرین نے اسے "فرائض امیر" کی فہرست میں نہیں داخل کیا ہے (مثلاً ماوردی اور ابو یعلی) ان کے پیش نظر غالباً یہ امر رہا ہے کہ زکوۃ اور صدقات واجبہ کی تحصیل و تقسیم سے یہ مقصد تمام و کمال سے حاصل ہو جائے گا۔ اس ضمن میں ابن حزم نے بنیادی اصول کو واضح کر دیا ہے۔

> "ہر ملک کے مال دار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریب لوگوں کی کفالت کریں۔ اگر زکوۃ کی آمدنی اور سارے مسلمانوں کی فئے اس کے لیے کافی نہ ہو تو سلطان ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ ان (اہل حاجت) کے لیے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا جس سے کہ وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کر سکیں اور اسی طرح جاڑے اور گرمی کا لباس' اور ایک ایسا مکان جو انہیں بارش' گرمی' دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے۔" (ابن حزم المحلی۔ جلد 6 صفحہ 156)

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

> "سلطان پر واجب ہے کہ جب اس کی رعایا تنگی میں مبتلا ہو اور فاقہ اور مصیبت سے دوچار ہو تو ان کی مدد کرے۔ بالخصوص قحط اور گرانی کے زمانہ میں' کیونکہ ایسے حالات میں لوگ کسب معاش میں ناکام رہتے ہیں اور گزر اوقات کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں سلطان کو چاہیے کہ ان کو کھانا فراہم کرے اور ان کے خزانے سے انہیں مال دے کر ان کی حالت بہتر بنائے۔"

(امام غزالی۔ التبر المسبوک۔ صفحہ 94)

اسلام اور معاشی استحصال

سوال: اسلام اور معاشی استحصال پر نوٹ لکھیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو دنیا میں بھیجنے کے بعد نعمتوں سے نوازا اور ساتھ ہی چند حدود کو بھی مقرر کر دیا تاکہ انسان ان حدود کو توڑ کر دوسروں کا استحصال نہ کرے۔ رائج الوقت معاشی نظاموں میں بداخلاقیاں اس طرح سرایت کر چکی ہیں کہ ان میں حلال و حرام کی تمیز ہی مٹ کر رہ گئی ہے۔ انسانوں کو اپنے معاشرے میں ساتھ رہتے ہوئے بھی لوگوں کے معاشی حقوق کا احساس نہیں۔ اسلام اخلاقیات کو ایمانیات کے ساتھ مربوط کرتا ہے تاکہ انسان اخلاقی ترغیبات سے دوسروں کے حقوق ادا کرے اور کسی کے حق پر دست درازی نہ کرے۔ انسان کی زندگی میں لاتعداد خواہشات ہوتی ہیں، لیکن ان کو پورا کرنے کے وسائل محدود ہیں۔ نتیجتاً انسان اپنی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے دوسروں کے حقوق پر دست درازی شروع کر دیتا ہے۔ اگر انسان اخلاقی اصولوں کو اپنائے تو مختلف خواہشات کو ایک اصولِ واحد کے تحت منظم کر کے پرسکون زندگی بسر کر سکتا ہے۔

استحصال کسے کہتے ہیں

یہ لفظ عام طور پر حق تلفی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا۔ مثلاً آج کل روزگار کی کمی ہے کہیں چپڑاسی کی آسامی خالی ہوتی ہے تو ایم اے پاس بھی درخواست دے رہے ہوتے ہیں اس لئے کہ بے روزگاری ہے یا ایک شخص کو اس کی صلاحیت کے مطابق کم از کم دس ہزار تنخواہ ملنی چاہئے لیکن چونکہ وہ بے روزگار ہے لہذا پانچ ہزار کی بھی ملے گی تو وہ بھی قبول کرے گا یہ استحصال ہے۔ اس کے علاوہ بھی استحصال کی بے شمار شکلیں ہیں اس کی اصل بنیاد انسان کی مذہب سے دوری اور لالچی ذہن ہے جو اسے سرکشی پر مجبور کرتا ہے۔

اسلام کا معاشی استحصال

اسلام کی اخلاقی تعلیمات معیشت، سیاست اور نظام عبادت میں اسی طرح جاری و ساری ہیں جس طرح جسم میں گردش کرتا ہوا خون۔ عصری نظام تجارت میں معاشی بداخلاقیاں رائج ہیں۔ احتکار (ذخیرہ اندوزی) ہی کو لے لیں کہ اشیاء فروخت کرنے کے لیے بازار میں نہیں لائی جا رہی ہیں۔ غذائی اجناس کو ضائع کیا جا رہا ہے، ناپ تول میں کمی، بدعہدی، سود، رشوت اور ملاوٹ وغیرہ ــــ ان کی وجہ سے صارفین کا استحصال ہوتا ہے۔ ارتکاز دولت کو تقویت ملتی ہے اور طبقاتی کش مکش پروان چڑھتی ہے۔

اسلام معاشی استحصال کے خاتمے کے لیے معاشی اخلاقیات کی تعلیم دیتا ہے۔ ذیل میں چند اہم معاشی استحصال اور اسلامی نقطہ نظر کا جائزہ لیا جا رہا ہے:

معاشی استحصال اور ناجائز ذرائع آمدن

اسلام میں ناجائز ذرائع دولت کی ممانعت ہے:

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: "اے لوگو جو ایمان لائے ہو، آپس میں ایک دوسرے کے مال باطل طریقوں سے نہ کھاؤ ماسوائے تجارت جو کہ تمہاری باہمی رضامندی سے ہو۔" (النساء)

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کے ضمن میں لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے باطل طریقوں سے مال کھانے کی ممانعت فرمائی ہے، جیسے سود خوری، قمار بازی، اور ایسے ہی ہر طرح کے ناجائز ذرائع جن سے شریعت نے منع فرمایا ہے۔" (تفسیر ابن کثیر)

حرام مال سے مراد صرف کھانا نہیں بلکہ مال کا ناجائز استعمال اور اپنے تصرف میں لے آنا ہے۔ باطل سے مراد ہے ہر ناجائز طریقہ جو عدل و انصاف، قانون اور سچائی کے خلاف ہو۔ اس کے تحت جھوٹ، خیانت، غصب، رشوت، سود، سٹہ، جوا، چوری اور معاملات کی وہ ساری قسمیں آتی ہیں جن کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ لکھتے ہیں:

"تم تجارت میں باہمی رضامندی کی خرید و فروخت یا کرایہ داری کے ساتھ مال کھاؤ، لیکن ہر رضامندی تجارت میں معتبر نہیں ہوتی۔ رضامندی شرعی حدود کے اندر ہونی چاہیے۔ تجارت میں سود کا مال اور قرض حلال نہیں ہے اور نہ ایسا مال لینے اور دینے والے کے درمیان سٹہ بازی اور گروی جائز قرار پاتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر دونوں طرف سے رضامندی بھی ہو، کیونکہ ان کی رضامندی شریعت الٰہی کے برعکس ہے۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے افضل عمل حلال کمائی کے لیے جدوجہد کو قرار دیا ہے:

"اعمال میں افضل حلال ذرائع سے کمانا ہے۔" (کنز العمال، ج، ص)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"افضل ترین کمائی وہ تجارت ہے جو خیانت اور جھوٹ سے پاک ہو، اور انسان کا اپنے ہاتھ سے کام کرنا ہے۔" (ایضاً)

عصری نظام تجارت کو اسلامی اصولوں سے ہم کنار کرنا ضروری ہے جس میں حلال و حرام کو واضح کیا جائے اور اخلاقی اقدار کو روشناس کروایا جائے تاکہ معیشت خوش حالی سے ہم کنار ہو سکے۔ احتکار اور اتلاف مال کے بجائے اشیاء کو مناسب قیمتوں پر فروخت کیا جائے۔ ایفائے عہد، سچائی، شرکت، مضاربت،

اخوت اور عدل و احسان کو متعارف کروایا جائے، جیسا کہ ناپ تول کے بارے میں آتا ہے: اے تولنے والے تولو اور جھکتا ہو ۔۔۔ (ابن ماجہ)۔ ان اخلاقی اقدار ہی کے ذریعے نظامِ تجارت ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکتا ہے۔

اسراف، فضول خرچی و تبذیر

قرآن مجید میں تبذیر کی ممانعت کچھ یوں وارد ہوئی ہے:

"اور قرابت داروں کو ان کا حق ادا کرو اور محتاجوں اور مسافروں کو بھی (دو) اور (اپنا مال) فضول خرچی سے مت اڑاؤ O بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ہی ناشکرا ہے۔"

قرآن مجید کی سورۃ الاعراف کی آیت نمبر 31 میں ارشادِ ربانی ہے:

ترجمہ: "کھاؤ اور پیو مگر اسراف نہ کرو۔"

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

"کھاؤ اور پیو اور دوسروں پر صدقہ کرو، کپڑے بنا کر پہنو بشرطیکہ اسراف اور نیت میں فخر و استکبار نہ ہو۔"

اسراف سے مراد لغو امور پر خرچ کرنا، احتیاجات (ضروریات) سے زیادہ خرچ کرنا، انسان کو جو چیز پسند آئے اس کو خرید لینا، جو جی چاہے کھا لینا ہے اور مال کو حق کے علاوہ خرچ کرنا، گناہ کے کاموں پر خرچ کرنا چاہے وہ ایک درہم ہی کیوں نہ ہو۔ اگر جائز اور بھلائی کے کاموں پر خرچ کیا جائے تو وہ تبذیر کے زمرے میں نہیں آئے گا۔ گویا اسراف سے مراد جائز اشیاء پر خرچ کرنے میں حد سے تجاوز کرنا ہے، جب کہ تبذیر سے مراد ناجائز امور پر خرچ کرنا ہے۔ شادی بیاہ کی رسموں اور غمی کے موقع پر کئی غیر ضروری رسم و رواج پر خرچ بھی اسراف میں آتا ہے، جب کہ دوسری طرف غریب طبقے میں احساسِ کمتری اور مصائب میں اضافہ ہوتا ہے۔ بخیل شخص اپنی بنیادی ضروریات، اہل و عیال، رشتہ داروں، ضرورت مندوں اور سائلین پر خرچ کرنے سے اجتناب کرتا ہے۔ عادتِ بخل کے سبب دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جاتی ہے۔ معیشت میں اشیاء کے لیے صارفین کی طلب میں کمی واقع ہو جاتی ہے اور حسد و نفرت کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔ اسی لیے اسلام میں اسراف و تبذیر سے منع کیا گیا ہے۔

اسلام ہمیں خرچ کرنے میں قناعت کا حکم دیتا ہے۔ قناعت سے مراد یہ ہے کہ حلال ذرائع سے انسان کو جو کچھ ملے، اس پر وہ راضی اور مطمئن ہو جائے۔ زیادہ حرص و لالچ نہ کرے کیونکہ حرص و طمع انسان کو حرام ذرائع کو اپنانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ وہ انسان جس کو ایمان کی دولت نصیب ہو، گزر بسر کا سامان میسر ہو، اور اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ اسے قناعت جیسی نعمت عطا فرما دے، تو اس سے بڑھ کر خوش نصیب انسان دنیا میں اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: امیر ہونا سامان بہت ہونے سے نہیں بلکہ دل سے ہے (مسلم، ترمذی)۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مزید ارشاد فرمایا: اس شخص نے فلاح پائی

جو اسلام لایا اور اسے ضرورت کے مطابق رزق دیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی روزی پر قناعت دی (مسلم، ترمذی)۔ فلاح سے مراد قلبی سکون اور آخرت کے عذاب سے چھٹکارا ہے۔

اسلام کا معاشی استحصال اور سود کی ممانعت

ملکی سطح پر اگر نظامِ مالیات کا جائزہ لیا جائے تو یہ سود پر مبنی ہے۔ سودی نظام نہ صرف قوموں کی معاشی بدحالی کا سبب ہے بلکہ معاشرے سے محبت و اخلاص کے جذبات کو بھی ناپید کر رہا ہے۔ سود خور انسانی ہمدردی سے عاری اور دوسروں کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھانے کے درپے ہوتا ہے۔ سودی نظام میں ایثار و احسان جیسی اخلاقی قدروں کا تصور بھی محال ہے۔ عالمی اقتصادی نظام سودی سامراجیت کو پروان چڑھاتا ہے۔ قوموں میں بغض و عداوت کا بیج بوتا ہے جو بالآخر جنگ کا پیش خیمہ بھی بن جاتا ہے۔

اسلام میں سود کی قطعی حرمت کا حکم ہے

> اے لوگو جو ایمان لائے ہو، خدا سے ڈرو اور جو کچھ تمہارا سود لوگوں پر باقی رہ گیا ہے اسے چھوڑ دو، اگر واقعی تم ایمان لائے ہو۔ لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا، تو آگاہ ہو جاؤ کہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے تمہارے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔ (البقرہ: 278)

سود کی ممانعت حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی ثابت ہے

> "سود 70 گناہوں کے برابر ہے، جیسا کوئی اپنی ماں سے نکاح کرے۔ (ابن ماجہ)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا :

> "معراج کی رات مجھے کچھ لوگوں کے پاس سے گزارا گیا جن کے پیٹ مکانوں کے مانند تھے۔ ان میں سانپ باہر سے نظر آتے تھے۔ میں نے جبرئیل علیہ السلام سے کہا: یہ کون لوگ ہیں؟ انہوں نے کہا: یہ سود خور ہیں۔" (ابن ماجہ)

سود کے نقصانات لکھتے ہوئے خورشید احمد کہتے ہیں کہ:

> " اسلام میں سود کی ممانعت محض اخلاقی بنیادوں پر ہی نہیں بلکہ اس کے خطرناک اقتصادی، سماجی اور سیاسی مضرات کی بناء پر بھی ہے۔ سود کی لعنت متعدد قدیم معاشروں کی تباہی کا باعث بنی ہے اور آج بھی جدید سرمایہ دارانہ معاشرے کی جڑوں کو کھوکھلا کر رہی ہے۔ اس کی بنیاد استحصال اور ظلم پر ہے اور اس کی وجہ سے ملک کی معیشت پر چند سرمایہ داروں کا اقتدار مسلط ہو جاتا ہے جو صحت مند معاشی جدوجہد کو ختم کر دیتا ہے اور معیشت میں عدمِ استحکام کا باعث ہوتا ہے۔"

اسلامی نقطہ نگاہ کے مطابق سود قطعاً حرام ہے۔ دینِ اسلام بنیادی طور پر عدل و احسان اور تعاون کو باہمی معاملات میں کلیدی وسعت دیتا ہے اور دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کو ممنوع قرار

دیتا ہے۔ ضرورت مند افراد کو بلا منافع قرض دینے کی ترغیب دیتا ہے اور قرض لینے والوں کو جلد از جلد قرض خواہ کو ادائیگی کی ترغیب دیتا ہے۔

غیر ضروری ٹیکسوں کا نظام

نظام مالیات کی دوسری بڑی بداخلاقی غیر ضروری ٹیکسوں کا نظام ہے۔ ان ٹیکسوں کی بھرمار نے صارفین کو مشکلات کا شکار کر دیا ہے۔ اسلام زکوٰۃ اور صدقات کے نظام کو رائج کرتا ہے۔ زکوٰۃ کو فرض قرار دینے کے ساتھ غریبوں کا حق قرار دیا اور ان کے مالوں میں سوال کرنے والے اور محروم لوگوں کا حق ہے تاکہ غریبوں کی عزت نفس برقرار رہے، اور آج زکوٰۃ لینے والا کل دینے والا بن جائے۔ دنیا آج اس نہج پر سوچتی ہے کہ سودی قرضوں کے بغیر ترقی ممکن ہی نہیں۔ اگر وہ صرف ایک نظر تاریخ پر ڈالیں تو ان کو راہ عمل مل سکتی ہے۔

حضرت عمر فاروقؓ کے عہد میں زکوٰۃ دینے والے تو ملتے تھے مگر لینے والا نہیں ملتا تھا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن وسنت کی اعلیٰ اخلاقی اقدار جو کہ حرام ذرائع دولت کا خاتمہ اور گردش دولت کے عمدہ اصولوں سے متعارف کرواتی ہیں، کو اپنایا جائے، نیز مادہ پرستانہ رویوں کو چھوڑ کر احسان وایثار جیسے اوصاف کو اپنی زندگیوں کا حصہ بنایا جائے۔

احتکار اور معاشی استحصال

معاشی نظام کی ایک بڑی خرابی احتکار ہے۔ احتکار کا مفہوم یہ ہے کہ غلہ اور دوسری اشیاء کا اس غرض سے ذخیرہ کر لیا جائے کہ ان کی قیمتیں بلند ہو جائیں اور من مانی قیمتیں وصول کرنے کا موقع میسر آئے۔ عام طور پر اشیاء کی رسد کو روک کر مصنوعی قلت پیدا کی جاتی ہے اور جب طلب بڑھ جاتی ہے اور قیمتیں چڑھ جاتی ہیں تو آہستہ آہستہ مال کو مارکیٹ میں لایا جاتا ہے۔ محتکر ذخیرہ اندوزی کرنے والے کو کہتے ہیں۔

احتکار کے استحصال کو ختم کرنے کیلئے اسلام کی ہدایات

اسلام ہی صرف واحد مذہب ہے جس نے سرمایہ داروں کو احتکار سے روکا ہے۔

قرآن مجید میں احتکار کی ممانعت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ترجمہ: ''اور جو لوگ سونا اور چاندی کا ذخیرہ کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو انہیں دردناک عذاب کی خبر سنا دیں۔ جس دن اس (سونے، چاندی اور مال) پر دوزخ کی آگ میں تاپ دی جائے گی پھر اس (تپے ہوئے مال) سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی (اور ان سے کہا جائے گا) کہ یہ وہی (مال) ہے جو تم نے اپنی جانوں (کے مفاد) کے لئے جمع کیا تھا سو تم

مال کا) مزہ چکھو جسے تم جمع کرتے رہے تھے۔" (سورہ الانفال: آیت 34)

علاوہ ازیں سورہ توبہ، سورہ الحشر، انبیاء، منافقون، سورۂ بقرہ میں بھی ایسے مضامین پائے جاتے ہیں۔ دولت وثروت جمع کرنے کے نہیں بلکہ صرف وخرچ کے لئے ہے۔

نبی کریمؐ اور احتکار

حسب ذیل احادیث میں احتکار کی حرمت کا بیان ہے۔

امام ابوداؤد روایت کرتے ہیں:

"رسول اللہ ﷺ نے فرمایا احتکار کرنے والا گنہگار ہے۔"

امام ابن ماجہ روایت کرتے ہیں:

"حضرت عمر بن الخطابؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: احتکار کرنے والا لعنتی ہے۔"

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جو شخص چالیس دن تک غلہ کو روک رکھتا ہے اور اس کے مہنگا ہونے کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اللہ سے بیزار ہوا اور اللہ اس سے بیزار ہوا۔"

(مشکوٰۃ المصابیح (ترجمہ) ج 2 ص 27)

یہاں یہ امر بھی واضح رہے کہ احتکار کو روکنے کے لیے اسلام صرف اخلاقی دباؤ پر ہی اکتفاء نہیں کرتا بلکہ قانونی وسائل کو بھی استعمال کرتا ہے۔ اسلام نے حکومت کو اختیار دیا ہے کہ وہ ذخیرہ اندوز کو مجبور کرے کہ وہ اپنے تمام ذخیرہ کو نکال کر ان داموں پر فروخت کرے جو حکومت کی رائے میں مالک اور صارفین کے حق میں بہتر ہوں اور یہ کام ان خصوصی ذمہ داریوں میں سے ایک ہے جو محتسب پر ڈالی گئی ہیں جو معاملات وغیرہ سے متعلق تمام امور کو شرعی احکام کے مطابق نافذ کرانے میں سرکاری وکیل کے قائم مقام ہوتا ہے۔

ملاوٹ اور جعلی اشیاء

سرمایہ دار اپنے سرمایہ کو بڑھانے کیلئے تمام جائز اور ناجائز طریقوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ اس سلسلہ میں ملاوٹ کرنا اور جعلی اشیاء بنانا بھی ان کا ایک عام وطیرہ ہے۔ ملاوٹ اور نقلی دواؤں کے نتیجہ میں کتنے لوگوں کی صحت تباہ ہوجاتی ہے اور کتنے لوگ مرجاتے ہیں ان کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ ان کی دلچسپی صرف اپنے بنک بیلنس میں اضافہ سے ہوتی ہے۔

اسی طرح سمگلنگ بھی سرمایہ داری کے فروغ کا ایک اہم جز ہے۔ یہ لوگ کسٹم ڈیوٹی ادا کئے بغیر غیر قانونی راستوں سے اشیاء ملک میں لے آتے ہیں۔ سمگلر اس سلسلے میں رشوت سے کام لیتے ہیں اور اگر رشوت سے کام نہ چلے تو رکاوٹ بننے والے قومی محافظوں کو شوٹ کر دیتے ہیں۔ نیز زیادہ تر سمگلنگ ان اشیاء کی جاتی ہے جن کی کھلے عام خرید وفروخت قانوناً ممنوع ہوتی ہے۔

ملاوٹ اور جعلی اشیاء وغیرہ کی روک تھام کیلئے اسلام کے احکام

ہر قسم کے ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنے کی اللہ تعالیٰ نے ممانعت فرمادی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔

"یایھا الذین امنوا لاتاکلوا اموالکم بینکم بالباطل الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم ولا تقتلوا انفسکم ان اللہ کان بکم رحیما٥ ومن یفعل ذلک عدوانا وظلما فسوف نصلیہ نارا۔"

"اے ایمان والو! ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طریقوں سے نہ کھایا کرو، البتہ تم آپس میں باہمی رضامندی سے تجارت کر سکتے ہو اور اپنے آپ کو قتل مت کرو، اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے، جو شخص اپنی حد سے تجاوز کرے گا اور ظلماً ایسا کرے گا ہم اس کو جہنم میں جھونک دیں گے۔"

اسلام اور شخصی و نجی ملکیت

شخصی یا نجی ملکیت کے سلسلے میں اسلام نے بے لگامی کو قطعاً محدود کر دیا ہے اور اسی کے ساتھ شخصی ملکیت کو قانونی حیثیت بھی بخشی ہے بشرطیکہ وہ مشروع اور صحیح طریقے سے حاصل کی گئی ہو لیکن اگر دولت و ثروت کو غیر قانی اور غیر مشروع طریقے سے حاصل کیا گیا ہے تو پھر اسلام اس پر تسلط کو قبول نہیں کرتا۔ اسلام نے ظلم و تعدی، احتکار، قتل و غارتگری کے ذریعے سے حصول دولت پر پابندی لگا دی ہے اور اس قسم کی دولت کو خلاف شرع سمجھا ہے۔

اسلام میں شخصی ملکیت کی بنیاد کسی بھی طرح سے سود، احتکار، غارت گری، غصب، تغلب، رشوت، چوری وغیرہ پر نہیں رکھی گئی، اور کسی کو بھی حق نہیں ہے کہ ان ذرائع سے دولت جمع کرے۔ اسلام نے مال حلال کے لئے جو قید و بند لگائی ہے اس کا قہری نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایہ دارانہ نظام میں جو خرابی تھی اسلام میں نہ ہو سکے گی اور اسلامی معاشرہ سرمایہ داری کے ان برے نتائج سے جو نا قابل اجتناب ہیں محفوظ رہے گا۔

رشوت اور معاشی استحصال

اسلام نے ہر اس ذریعہ اکتساب کو منع اور حرام قرار دیا ہے جس میں کسی کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے کچھ کمایا جائے۔ انہیں حرام ذرائع میں سے ایک نہایت قبیح ذریعہ اکتساب رشوت ہے، جو شریعت کی نظر میں انتہائی جرم ہے اور یہ جرم آج ہمارے معاشرے میں ناسور کی مانند پھیل چکا ہے، جس کا سد باب مسلمان معاشرے کے لئے ضروری ہے۔ در حقیقت جرم یا جریمہ عربی زبان میں ارتکاب گناہ کو کہا جاتا ہے

اسلام میں رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے دونوں کی سخت مذمت کی گئی ہے اور دونوں کو آتش جہنم کا مستحق قرار دیا گیا ہے اور جو پیسے اس طرح سے حاصل ہوتے ہیں وہ ناجائز اور حرام ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

یاأیہا الذین آمنوا لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل. (النساء: 29)

ترجمہ: ”اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقے سے نا کھاؤ“

دوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”اور تم دیکھتے ہو کہ ان میں سے بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں تگ و دو کرتے پھرتے ہیں اور مال حرام کھانے میں تیز گام ہیں۔ (افسوس ان کے ایمانی دعویٰ پر) کیا ہی برے کام ہیں جو شب و روز کر رہے ہیں کیونکہ وہ علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور مال حرام کھانے سے روکتے یقیناً بہت ہی برا کارنامۂ زندگی ہے جو وہ کر رہے ہیں۔“

احادیث نبوی ﷺ کی رو سے رشوت کی ممانعت

بیشتر احادیث مبارکہ میں رشوت خور حکام پر لعنت کی گئی ہے اور ان کی مذمت بیان کی گئی ہے۔ نیز اس کے بھیانک نتائج سے لوگوں کو متنبہ کیا گیا ہے جیسا کہ نبی ﷺ نے فرمایا

”جو بھی گوشت پوست مال سحت (مال رشوت سے بڑھتا اور پروان چڑھتا ہے) تو اس کے لئے دوزخ کی آگ ہی زیادہ موزوں ہے۔“

امام ترمذی، احمد اور ابن حبان نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور امام ابوداؤد نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ:

”حضور ﷺ نے فرمایا فیصلہ کرنے کے سلسلے میں رشوت لینے اور دینے والے پر اللہ نے لعنت فرمائی۔“

رشوت انسانی سوسائٹی کے لئے ایک ایسا رستہ ہوا ناسور اور مہلک مرض ہے جو کینسر سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ بایں طور کہ جو شخص اس کا شکار ہوتا ہے اس کو لقمہ جہنم بنا دیتی ہے۔ جب کہ کینسر کا مرض ایسا نہیں ہے، جب کسی معاشرہ میں رشوت کی بیماری عام ہوتی ہے تو وہ پہلی فرصت میں عدل و انصاف کا گلا گھونٹ کر حق کا خون کر دیتی ہے جس کے نتیجے میں وہ معاشرہ جو امن و سکون کا گہوارہ تھا، اختلاف و افتراق اور انتشار و خلفشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ انسانی افراد میں اخوت و محبت، ہمدردی و بھائی چارے کے رشتے ٹوٹ جاتے ہیں۔ بغض و عناد، نفرت، عداوت و شقاوت کا شعلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ ہر شخص ایک دوسرے کے خون کا پیاسا ہو جاتا ہے۔ رشوت، خیانت، امن و شانتی، صلح و آشتی کا خرمن جل کر پیوند خاک ہو جاتا ہے۔ معاملات میں دھوکہ دہی، جھوٹی گواہی، ظلم و تشدد اور اس طرح دیگر بد افعال کی وجہ سے جب ایک دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے تو سماج کا ہر فرد و بشر ایک دوسرے پر جبر و استبداد کو اپنا شعار بنا لیتا ہے۔ یہ سب ایسے مبغوض اور بدترین قسم کے جرائم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور مسلمانوں میں بغض و عداوت اور عام فتنوں کا سبب بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں رشوت لینے والے، ... کو سخت عذاب کی وعید دیتے

ہوئے اس سے بچنے کی تلقین کی ہے۔

معاشی استحصال اور اسلام کے پیش کردہ حل

اسلام نے مختلف طبقوں میں اقتصادی توازن برقرار رکھنے کے لئے اور دولت کو ایک مرکز پر جمع ہونے سے روکنے کے لئے بہت سے طریقے ایجاد کئے ہیں۔ چند طریقوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

1۔ ٹیکس کا قانون مثلاً لوگوں کو جمع شدہ مال پر خمس، زکوٰۃ قسم کے ٹیکس لازم قرار دیے ہیں تاکہ ہر سال مالداروں اور سرمایہ داروں کا مال گھٹتا رہے۔

2۔ انفال یعنی عمومی ثروت کو اسلامی حکومت کی سپردگی میں دے دینا، مثلاً جنگلات، چراگاہ، بنجر زمینیں، پہاڑ، پہاڑوں پر اُگے ہوئے درخت، معدنیات، موقوفات عامہ، اموال مجہول المالک، بغیر جنگ کئے حاصل ہونے والی زمینیں، کفارات، لاوارث افراد کی میراث اور اس قسم کی چیزیں انفال (ثروت عمومی) کہلاتی ہیں۔

3۔ میراث کا قانون بھی ایک ایسی چیز ہے جو دولت کو متحرک رکھتی ہے اور ہر نسل پر دولت تقسیم ہوتی رہتی ہے۔

4۔ اضطراری حالت یعنی شخصی ملکیت کا احترام اسلام اسی وقت تک کرتا ہے جب تک اجتماع کسی خطرے سے دوچار نہ ہو اور اگر اضطراری حالت پیدا ہو گئی تو پھر عادل اسلامی حکومت مقررہ شرائط کے ساتھ اپنے اختیارات کو استعمال کر کے معاشرے کو اس خطرے سے بچائے گی۔ مسلمانوں کی اجتماعی ضرورت جس وقت بھی متقضی ہو اور اسلامی اجتماع کا فائدہ ہو تو حکومت شخصی مالکیت میں حسب ضرورت دخل اندازی کرے گی۔ اسلامی حکومت کو یہ حق اسی لئے دیا گیا ہے تاکہ ضرورت کے وقت استعمال کر سکے۔ اسلامی حاکم کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ انگلیوں پر گنے جانے والے افراد کے ہاتھوں میں دولت کو جمع ہوتا ہوا دیکھے اور دوسروں کی محرومی و گرسنگی پر خاموش تماشائی بنا رہے کیونکہ یہ بات اسلامی اصول کے بالکل برخلاف ہے۔ آج کی مغربی دنیا میں جس قسم کی سرمایہ داری ہے اسلام اس کو صحیح نہیں سمجھتا۔ قرآن میں ارشاد ہے: ”تقسیم مال کے جو طریقے ہم نے معین کئے ہیں وہ صرف اس لئے کہ تمہارے دولت مندوں کے ایک گروہ کے پاس دولت متمرکز نہ ہو جائے۔“

5۔ سخاوت: سرمائے کو متحرک کرنے کے لئے اسلام نے لوگوں کو راہ خدا میں انفاق و بخشش پر بہت آمادہ کیا ہے اور اس اخلاقی دعوت کو قانون سے ہم آہنگ کر دیا ہے۔ اس سلسلے میں ایسے مضبوط دستور بنائے ہیں جو عاطفہ انسانی کے لئے شدید محرک ہیں، ایسے محرک کہ ان کو دیکھ کر کوئی بھی شخص اپنے ہم جنس کے استحصال پر تیار ہی نہیں ہو سکتا۔

6۔ فضول خرچی کی مذمت: اسلام نے ایک گروہ کے ہاتھ میں ثروت جمع ہو جانے کے جو نتائج ہوتے

ہیں (یعنی سرمایہ داری کے نتائج) ان نتائج کی شدت سے مخالفت کی ہے تاکہ سرمائے میں جمود نہ ہونے پائے مثلاً فضول خرچی، عیاشی، خوش گزرانی یہ چیزیں سرمایہ داری کی دین ہیں اور اسلام نے ان چیزوں سے شدت کے ساتھ منع کیا ہے۔

7۔ بخل کی مذمت: اسی طرح بخل کی مذمت کر کے مالداروں کو راہ خدا میں خرچ کرنے کی ترغیب دلائی ہے تاکہ دولت وثروت چند ہاتھوں میں منجمد ہو کر نہ رہ جائے۔

8۔ اجرت روکنے کی ممانعت: اسلام نے شدت کے ساتھ اس بات سے بھی روکا ہے کہ خبردار مزدوروں کی مزدوری نہ روکو کیونکہ اس سے عمومی فقر کا اندیشہ ہے۔ اسلام کی یہ دعوت انسان و خدا کے درمیان ارتباط کا کام دے گی اور انسان کے ضمیر میں ایسے پاکیزہ احساسات پیدا ہوں گے جن کی وجہ سے انسان اخروی جزا اور رضائے پروردگار عالم کا خواہش مند ہو جائے گا اور جب یہ خواہش بڑھے گی تو اس کے حصول کے لئے تمام دولت وثروت اور تمام لذتیں بیکار ہو جائیں گی کیونکہ بد نیتی، حرص، بے عدالتی، ستم گری، یہ ساری چیزیں قیامت پر ایمان نہ ہونے اور خالق و مخلوق کے رابطہ کے منقطع ہونے کی وجہ سے ہوتی ہیں۔ اور جب خالق سے رابطہ قائم ہو جائے گا تو مرضی خدا کے حصول کے لئے مال بے قدر و قیمت ہو جائے گا اس کے نتیجے میں دولت میں جمود نہیں پیدا ہوگا۔

اسلام میں فرد و اجتماع کے منافع کی نگرانی حکومت پر رکھی گئی ہے۔ حکومت کا فریضہ ہے کہ غلط آزادی سے روکے اور اپنی پوری طاقت کے ساتھ اسلامی قوانین کو نافذ کرے۔ اجتماع کے اندر اخلاقی فضائل کے نشر کرنے اور نگرانی کے علاوہ بھی حکومت پر لازم ہے کہ معاشرے کو ان تمام انحرافات و پلیدگیوں سے روکے جن سے تمام افراد کا فائدہ ہو اور نتیجے میں فرد کی زندگی ایک فعال عنصر کے مثل ہو جائے۔

ایک قابل توجہ چیز یہ ہے کہ اسلام بدیع نظام ہے۔ اس نے دنیا کو اجتماعی عدالت کے مفہوم سے روشناس کرایا اور اقتصادی عوامل کے وزن و اعتبار کو سمجھایا۔ اسلام کی نظر میں انسان مجبوریوں کا غلام نہیں ہے بلکہ اس دنیائے رنگ و بو میں انسان ہی تنہا فعال و مثبت قوت ہے جو اقتصاد کے جبری تحویلات کا بندۂ بے دام ہونے کے بجائے اپنے ارادے و اختیار سے اپنے اقتصاد کی بنیاد رکھتا ہے۔ دیگر مذاہب کے مقابلے میں اسلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں جبری تحویل کا وجود نہیں ہے۔

اسلامی نظام نے اپنے تمام دور حکومت میں اسلامی معاشرے کی ضرورتوں کو پورا کیا ہے اور اجتماعی زندگی چاہے وہ مسلمانوں کی ہو یا غیروں کی، کو بہت ہی وسیع پیمانے پر منظم کیا ہے۔ اسلامی معاشرہ اپنی طویل تاریخ میں کبھی وضع قانون کے سلسلے میں دوسروں کا محتاج نہیں رہا ہے اسی طرح آج بھی اس زمانے کے تمام تحولات کے باوجود دنیا کی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے اور اسلامی معاشرے کی رہبری کر سکتا ہے اور اس کی ضرورتوں کا صحیح جواب دے سکتا ہے۔

♦♦♦

اسلام میں معاشی استحصال کی ممنوعیت

سوال: اسلام میں معاشی استحصال کی ممنوعیت پر نوٹ لکھیں۔

اسلام نے ہر طرح سے معاشی استحصال کا راستہ روکا ہے اور افراد کو معاشی تحفظ فراہم کیا ہے۔ سورۃ فاتحہ کے دعائیہ کلمات کے بعد جب ہم سورۃ بقرہ سے قرآن مجید کی تلاوت کا آغاز کرتے ہیں تو ابتدائی آیات ہی میں قرآن کریم اور اس پر ایمان لانے والوں کی یہ صفات بیان کی گئی ہیں:

> ''الف' لام' میم' یہ اللہ کی کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ ہدایت ہے ان پرہیزگاروں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں' نماز قائم کرتے ہیں' جو رزق ہم نے انہیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔'' (البقرۃ:1تا3)

ان آیات پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اللہ کی کتاب پر اور اس میں بیان کردہ غیب کی باتوں مثلاً وجودِ باری تعالیٰ' تقدیر' تخلیق کائنات' تخلیق آدم' جنت دوزخ' آخرت اور جن وملائکہ کے وجود وغیرہ پر ایمان لاتے ہی انسان پر دو حقوق واجب ہو جاتے ہیں۔ خدا اور بندے کے درمیان قائم ہونے والے تعلق کے دائرہ میں اولین حق یہ ہے کہ اپنی پیشانی خدا کے آگے جھکائی جائے اور نماز قائم کر کے اپنی عبدیت اور خدا کی معبودیت کا اقرار دن میں پانچ مرتبہ اپنے اوپر لازم کر لیا جائے۔

نماز کے فوراً بعد ایمان لانے والوں پر انسان اور انسان کے درمیان قائم ہونے والے تعلقات کے دائرہ میں جو اولین حق قائم ہوتا ہے وہ انفاق ہے۔ یعنی خدا کے دیے ہوئے مال میں سے اس کے حاجت مندوں کی کفالت۔ یہ ترتیب حقوق صرف اسی ایک آیت کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ پورا قرآن حکیم صلوٰۃ کے فوراً بعد زکوٰۃ کے لاحقہ کو ساتھ ساتھ لیے آگے بڑھتا ہے بلکہ بعض مقامات پر وہ صلوٰۃ کو ایسی صورت میں بالکل ضائع قرار دیتا ہے جہاں نماز پڑھنے والے نے اپنے کسی حاجت مند بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں بخل سے کام لیا ہو۔

سورۃ الماعون میں ہے۔

> ''تم نے دیکھا اس شخص کو جو آخرت کی جزا و سزا کو جھٹلاتا ہے' وہی تو ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے اور مسکین کو کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ پھر تباہی ہے ان نماز پڑھنے والوں کے لیے جو اپنی نماز میں غفلت برتتے ہیں' جو ریاکاری کرتے ہیں اور معمولی ضرورت کی چیزیں (لوگوں کو) دینے سے انکار کرتے ہیں۔''

اس سورۃ کی پہلی آیت اب سورۃ بقرہ میں مذکورہ حقیقت کو ایک دوسرے زاویہ سے ہمارے سامنے لا رہی ہے۔ جو شخص غیب پر یعنی آخرت کی جزا و سزا پر ایمان نہیں لائے گا۔ اس سے نہ خدا کا حق (صلوٰۃ) ٹھیک

طور پر ادا ہو گا اور نہ وہ انفاق کے ذریعہ اپنے حاجت مند بھائیوں کی کفالت کا حق ادا کرے گا۔ نماز ادا کرے گا تو سستی اور کاہلی سے اور محض دکھاوے کی خاطر اور اللہ کے دیے ہوئے مال پر سانپ بن کر بیٹھ جائے گا۔ یتیم کو دھکے دے گا' مسکین کو نہ صرف یہ کہ خود کھانا نہیں دے گا بلکہ دوسروں کو بھی اس کی ترغیب نہیں دے گا اور کوئی حاجت مند معمولی ضرورت کی چیز بھی مانگے گا تو یہ صاف انکار کر دے گا۔ اس قسم کا طرز عمل اختیار کرنے والوں کو صاف وعید سنائی جا رہی ہے کہ تمہاری یہ نماز تمہارے کسی کام نہ آئے گی' یہ تمہارے منہ پر دے ماری جائے گی اور خدا کے بندوں کا حق ادا نہ کرنے کے جرم میں تمہیں جس تباہی کا سامنا کرنا ہو گا یہ نماز تمہیں اس سے بچا نہ سکے گی۔

یہ ہے اسلام میں انسان کے معاشی مسئلہ کی اہمیت اور اسے حل کرنے کے لیے مقتدر اعلیٰ کی جانب سے مسلمانوں کو دی گئی ہدایات کی نوعیت۔ قرآن حکیم میں 30 سے زائد مقامات پر اقامت صلوٰۃ کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کا ذکر ہے اور 70 سے زائد مقامات پر انفاق کا۔ بدقسمتی سے خود مسلمانوں نے نہ جانے کس بنا پر ارکان اسلام کے زیر عنوان قائم کردہ ترتیب میں زکوٰۃ کو پانچویں نمبر پر رکھا ہے۔ جب کہ حقیقتاً خود قرآن مجید نے اسے کلمہ اور نماز کے بعد تیسرے درجے پر رکھا ہے اور اپنی اہمیت کے اعتبار سے روزہ و حج اس کے بعد آتے ہیں۔

اسلام میں معاشی مسئلہ کی اہمیت پر غور کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہے کہ انسان کو معاشی تحفظ فراہم کرنے کے لیے خدا کے دین میں انفاق پر کس قدر زور دیا گیا ہے' اس کے لیے کیا تدابیر اختیار کی گئی ہیں اور اس سلسلہ میں اسلامی ریاست پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

انفاق کے قرآنی احکام:

انفاق کے احکام اور اس کی ترغیب سے متعلق قرآن کریم میں ہے:

"جن کے (مسلمانوں کے) مالوں میں سائل اور محروم کا ایک مقررہ حق ہے۔" (المعارج:24)

"اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے محروم دونوں کا حق ہے۔" (الذاریات:19)

"نماز قائم کرو زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دیتے رہو۔" (المزمل:20)

سورۃ بقرہ میں یہ فرما کر کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تم نے اپنے چہرے مشرق کی طرف کر لیے یا مغرب کی طرف" ارشاد ہوتا ہے:

"(نیکی یہ ہے کہ) اللہ کی محبت میں اپنا دل پسند مال رشتہ داروں اور یتیموں پر' مسکینوں اور مسافروں پر' مدد کے لیے ہاتھ پھیلانے والوں پر اور غلاموں کی رہائی پر خرچ کرے' نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔" (البقرہ:177)

اس آیت میں ترتیب احکام پر غور کیجئے۔ یہاں ایمان کی جو شرائط گنوائی جا رہی ہیں ان میں دل پسند مال کے خرچ کا ذکر اقامتِ صلوٰۃ سے بھی پہلے ہے۔ اسی سورۃ میں مزید فرمایا گیا:

"لوگ پوچھتے ہیں ہم کیا خرچ کریں؟ جواب دو کہ جو مال بھی تم خرچ کرو اپنے والدین پر' رشتے داروں پر' یتیموں پر' مسکینوں پر اور مسافروں پر خرچ کرو" (البقرۃ:215)

"اور لوگ پوچھتے ہیں ہم راہِ خدا میں کیا خرچ کریں؟ فرما دیں جو کچھ تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو۔" (البقرۃ:219)

انفاق پر غیر معمولی زور دینے کی وجہ بیان کرتے ہوئے قرآن حکیم کہتا ہے:

"تا کہ وہ تمہارے مالداروں ہی کے درمیان گردش نہ کرتا رہے۔" (الحشر:7)

پھر انفاق کی صورت میں انسان کو مال میں کمی آ جانے اور مفلس ہو جانے کا جو دھڑکا لگا رہتا ہے اس سے دل و دماغ کو نجات دلانے کے لیے فرمایا گیا:

"اور خیرات میں جو مال تم خرچ کرتے ہو وہ تمہارے اپنے لیے بھلا ہے۔ آخر تم اسی لیے تو خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا حاصل ہو، جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمہیں دیا جائے گا اور تمہاری حق تلفی ہرگز نہ ہو گی۔" (البقرۃ:272)

"جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے اور ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا مقام نہیں۔" (البقرۃ:274)

انفاق حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں:

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "جس شخص کے قوت و طاقت کے سامان اپنی ضرورت سے زائد ہوں اس کو چاہیے کہ فاضل سامان نادار اور حاجت مند کو دے دے۔" ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح مختلف انواع مال کا ذکر فرماتے رہے کہ ہم نے گمان کر لیا کہ ہم میں سے کسی شخص کو اپنے حاصل مال پر کسی قسم کا کوئی حق نہیں۔"

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا "جس بات کا مجھے آج اندازہ ہوا اگر اس کا پہلے اندازہ ہو جاتا تو کبھی تاخیر نہ کرتا اور بلا شبہ اربابِ ثروت کی فاضل دولت لے کر فقراء اور مہاجرین میں تقسیم کر دیتا۔"

حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ اور تین سو صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے یہ روایت صحت کو پہنچ چکی ہے کہ "ایک موقع پر ان کا اسباب خورد و نوش ختم ہونے کے قریب آ لگا۔ پس حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا کہ جس کے پاس جس قدر موجود ہے وہ حاضر کرو اور پھر سب کو یکجا کر کے ان سب میں برابر تقسیم کر کے قوتِ لایموت کا سامان کر دیا۔"

انفاق نفع کا سودا ہے خسارے کا نہیں:

قرآن حکیم ہمیں بتاتا ہے کہ مال خرچ کرنے سے کم نہیں ہوتا بڑھتا ہے۔ یہ خسارے کا نہیں سراسر نفع کا سودا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اور (مومنین) اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) ہم تمہیں صرف اللہ کی رضا جوئی کی خاطر کھلا رہے ہیں۔ ہم نہ تم سے بدلہ چاہتے ہیں نہ

شکریہ۔ ہمیں تو اپنے رب سے اس دن کے عذاب کا خوف لاحق ہے جو سخت مصیبت کا انتہائی طویل دن ہوگا۔ پس اللہ تعالیٰ انہیں اس دن کے شر سے بچالے گا اور انہیں تازگی اور سرور بخشے گا۔" (الدھر 8 تا 11)

"جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک دانہ بویا جائے اور اس میں سے سات بالیں نکلیں اور ہر بالی میں سو دانے ہوں۔ اسی طرح اللہ جس کے مال کو چاہتا ہے فراوانی عطا فرماتا ہے۔ وہ فراخ دست بھی ہے اور علیم بھی۔" (البقرۃ: 261)

"جو لوگ اپنے مال محض اللہ کی رضا جوئی کے لیے دل کے پورے ثبات وقرار کے ساتھ خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال ایسی ہے جیسے کسی سطح مرتفع پر ایک باغ ہو اگر زور کی بارش ہو جائے تو دوگنا پھل لائے اور اگر زور کی بارش نہ بھی ہو تو ایک ہلکی پھوار ہی اس کے لیے کافی ہے۔" (البقرۃ: 265)

"تم میں سے کون ہے جو اللہ کو قرض حسنہ دے کہ اللہ اس سے کئی گنا بڑھا کر واپس کردے! گھٹانا بھی اللہ کے اختیار میں اور بڑھانا بھی اور تمہیں اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔" (البقرۃ: 245)

مال جمع کرنے کی ممانعت:

قرآن مجید میں حکم ہے کہ جائز طریقوں سے جو دولت کمائی جائے اس کو جمع نہ کیا جائے' کیونکہ اس سے دولت کی گردش رک جاتی ہے اور تقسیم دولت میں توازن برقرار نہیں رہتا۔ قرآن مجید میں ہے:

"دردناک سزا کی وعید سنا دو ان لوگوں کو جو سونے اور چاندی جمع کرکے رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے۔ ایک دن آئے گا کہ اسی سونے چاندی پر جہنم کی آگ دہکائی جائے گی اور پھر اسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں' پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا۔ یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا۔ سو اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔" (التوبہ: 33 تا 35)

"جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے' ہرگز نہیں۔ یہ ان کے حق میں نہایت بری ہے جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے دن ان کے گلے کا طوق بن جائے گا۔"

(آل عمران: 180)

"جس نے مال جمع کیا اور گن گن کر رکھا' وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا؟ ہرگز نہیں' وہ شخص تو چکنا چور کردینے والی جگہ میں پھینک دیا جائے گا۔" (الھمزۃ: 2 تا 4)

راہ اعتدال اختیار کرنے کا حکم:

انفاق پر غیر معمولی زور دینے اور بخل سے بچنے کی تلقین کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے خرچ کی راہ اعتدال بھی متعین فرما دی ہیں تاکہ وہ افراط وتفریط کا شکار نہ ہوں۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے:

''اے بنی آدم ہر عبادت کے موقع پر اپنی زینت سے آراستہ رہو اور کھاؤ پیو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔'' (الاعراف: 31)

یہاں زینت سے آراستہ ہونے کا مطلب ہے مناسب لباس جو نہ صرف ستر پوشی ہی کی ضرورت پوری کرے بلکہ صاف ستھرا بھی ہو۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کی جو فطری ضروریات ہیں وہ بھی پوری کی جانی چاہیئں۔ البتہ لباس و خوراک اور دیگر ضروریات زندگی کے معاملہ میں اسراف نہ کیا جائے۔ کیونکہ اللہ کو اپنے دیے ہوئے مال کا ضیاع سخت ناپسند ہے اسی آیت کے فوراً بعد نفس کشی اور رہبانیت کے منفی رجحانات کی حوصلہ شکنی کرتے ہوئے فرمایا گیا:

''اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے فرمادیں کس نے اللہ کی اس زینت کو حرام کردیا' جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کردیں؟ فرمادیں یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو خالصتاً انہی کے لیے ہوں گی۔''

(الاعراف:32)

معاشی تحفظ کے لیے اسلام کی عملی تدابیر:

مذکورہ بالا عمومی احکام و ہدایات کے ساتھ افرادِ معاشرہ کے معاشی تحفظ اور ان کی خوشحالی کے لیے اسلام نے جو عملی تدابیر اختیار کی ہیں وہ مختصراً یہ ہیں:

1- ہر انسان کو معاشی جدوجہد میں بھرپور حصہ لینے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ وہ کسی کا دست نگر نہ رہے۔

2- قرآن حکیم میں ہے ''انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے سعی کی ہے۔'' (النجم:39)

3- حرام و حلال اور جائز و ناجائز کی حدود متعین کرکے سعی و عمل کا دائرہ مقرر کردیا گیا۔ سود' شراب' جوئے' رشوت' فحاشی و بدکاری کے ذرائع آمدنی' ممنوعہ اشیاء کی خرید و فروخت' ملاوٹ' ناپ تول میں کمی' چور بازاری' ذخیرہ اندوزی اور اسی طرح کے دوسرے کاروبار پر پابندی عائد کرکے معاشرے سے لوٹ کھسوٹ کا قلع قمع کردیا گیا اور معاشی استحصال کی راہ روک دی گئی۔

4- حاصل شدہ آمدنی کو غیر شرعی مصارف میں استعمال کی ممانعت' اسراف و بے اعتدالی کی ممانعت' عیش و عشرت کی ممانعت اور مال کو ضائع کرنے کی ممانعت کے ذریعہ اسے غلط راستوں پر صرف ہونے سے روک دیا گیا اور اس کا رخ اصل مستحقین کی جانب موڑ کر انہیں اپنے حقوق سے محروم ہونے سے بچالیا گیا۔

5- ہر فرد کی کمائی میں دوسرے افراد کا حصہ مقرر کرکے اسے اجتماعی نظام کی کفالت کا معاون بنالیا گیا۔ شریعت کی رو سے اس کی متعین ذمہ داریاں حسب ذیل ہیں۔

(i) نفقاتِ واجبہ' یعنی والدین' بیوی' بچوں' دادا' دادی' نانا' نانی' پوتے' نواسے' بھائی' بہن' پھوپھی' بھتیجی اور صُلبی و جدی قرابت کے دوسرے رشتہ داروں کی کفالت۔

(ii) زکوٰۃ جو معاشرے کے ان عام حاجت مندوں کی کفالت پر صرف ہوگی جن کی صراحت قرآن حکیم میں کر دی گئی ہے۔ اس رقم سے فقراء مساکین اور عاملین زکوٰۃ کی ضروریات پوری ہوں گی' نو مسلموں کی دل جوئی اور حوصلہ افزائی ہوگی۔ (مؤلفۃ القلوب)' غلاموں کو یا دشمن کے پنجے میں پھنسے ہوئے مسلمانوں کو آزاد کرایا جائے گا۔ نادار یا انتقال کر جانے والے قرض داروں کا قرض ادا کرنا ہوگا۔ اللہ کی راہ میں سرگرم مجاہدین' طالب علموں اور دیگر لوگوں کی کفالت ہوگی اور جن مسافروں کا کوئی ٹھکانہ نہ ہو ان کی مدد کی جائے گی۔

(iii) خاندان' قریبی رشتہ داروں کی کفالت اور ادائیگی زکوٰۃ کے بعد بھی اہل ثروت پہ ذمہ داری ہے کہ وہ ناداروں اور حاجت مندوں کی مدد کے لیے صدقہ و خیرات کرتے رہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ''تمہارے اموال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔'' (مسند دارمی' ترمذی' مسلم)

(iv) قرض و عاریت' اہل ثروت کو اسلام نے ہدایت کی ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر لوگوں کو فراخدلی سے قرض دیں اور کوئی چیز ان سے عاریتاً مانگی جائے تو اسے دینے سے انکار نہ کریں۔ فرمایا گیا:

''کسی بندے کے لیے یہ مناسب نہیں کہ اس کا بھائی اس سے قرض مانگنے آئے اور وہ اس کو دینے کی گنجائش رکھتا ہو پھر بھی اس سے انکار کر دے۔'' (کنز العمال۔ جلد 3 حدیث نمبر 3581)

''قرض دینا صدقہ ہے'' (طبرانی' المعجم الصغیر' صفحہ 80)

(v) وراثت' وصیت' مہر اور طلاق کی صورت میں بیوی بچوں کے لیے مقررہ مدت تک نفقہ وغیرہ' قانون وراثت کے تحت' ایک شخص کا ترکہ اس کی وفات کے بعد شریعت کے مقرر کردہ وارثوں میں تقسیم ہو جائے گا اور اپنی ایک تہائی ملکیت کی حدِ وصیت کے تحت اس نے جن لوگوں کو اپنا وصی مقرر کیا ہوگا انہیں بھی اس میں سے حصہ ملے گا۔

ایک شخص کے کمائے ہوئے مال میں زیر کفالت افراد' قریبی رشتہ داروں' معاشرہ کے عام نادار لوگوں اور وارثوں کے ان معاشی حقوق کا حساب پھیلا کر دیکھا جائے تو یہ ہزاروں افراد تک پہنچتا ہے اور یوں اسلامی گروہ میں ہر فرد کی کمائی ایک ایسا چشمہ فیض بن جاتی ہے جس سے بے شمار لوگ سیراب ہوتے ہیں اور خود وہ بھی اسی طرح دوسروں کے جاری کردہ چشمہ ہائے فیض سے سیراب ہوتا رہتا ہے۔

جہاں اس طرح کا نظام معیشت موجود ہو کہ ہر فرد دسرے درجنوں افراد کو سنبھالے ہوئے ہو اور وہ باہم ایک دوسرے کا سہارا بنے ہوئے ہوں وہاں بمشکل ہی ایسے لوگ نکلیں گے جو فی الواقع روٹی کپڑے اور علاج در ہائش کی ضروریات پوری ہونے سے محروم رہ جائیں۔

اسلام میں اجتماعی کفالت کی صورت یہ نہیں ہے کہ حکومت تمام املاک پر خود قابض ہو کر پوری قوم کے ایک ایک فرد کو اپنا تنخواہ دار نوکر بنا کر اور انہیں تمام آزادیوں سے محروم کر کے ان سے حسب منشاء کام لے اور اس جبری محنت کے صلے میں انہیں غلاموں کی طرح روٹی' کپڑا' دوا اور سر چھپانے کی جگہ فراہم کر دے۔ اس کے

برعکس یہاں کفالتِ عامہ یا اجتماعی عدل (Social Justice) کی یہ صورت رکھی گئی ہے کہ ہر فرد حدودِ شریعت میں رہ کر زیادہ سے زیادہ کمائے' اپنی ضرورت پر کم سے کم خرچ کرے اور جو کچھ زائد از ضرورت ہو وہ معاشرے کے نسبتاً پسماندہ اور نادار لوگوں کو منتقل کر کے انہیں پورا اٹھنے میں مدد دے۔ تا کہ اس عمل سے بتدریج معاشی ناہمواریاں ختم ہوں اور معاشرہ میں اعتدال' توازن قائم ہو۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نوعیت کی معاشی جدوجہد کو جہاد قرار دیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"اللہ کے لیے صدقہ وخیرات کی کوشش' جہاد فی سبیل اللہ کی مانند ہے۔"

(سیاست شرعیہ: ابن تیمیہ' مترجم مولانا محمد اسماعیل گودھروی۔ مطبوعہ کلام کمپنی کراچی صفحہ 111)

اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں:

اسلامی ریاست کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ معاشرہ میں کسب حرام کے تمام دروازے بند کرے' کسب حلال کی راہیں کشادہ کرے اور اپنی معاشی وتعلیمی اسکیموں کے ذریعہ ہر فرد کو کسب حلال کے لیے ضروری تعلیم وتربیت کے مواقع فراہم کر کے معاشی جدوجہد کے قابل بنائے۔

اس کی دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے مقرر کردہ حقوق دلانے میں ان کی مدد کرے۔ کوئی بیٹا باپ کی کفالت سے انکار کر دے تو وہ قانوناً اسے اس کی کفالت کا پابند بنائے' کوئی شوہر بیوی کا مہر یا نفقہ یا بچوں کا حق دینے سے انکار کر دے تو اس سے بزور قوت یہ حق دلوایا جائے' غرض جس کا جو حق نکلتا ہو وہ اس کی ادائیگی کو یقینی بنائے۔

ریاست کی تیسری ذمہ داری یہ ہے کہ وہ زکوٰۃ کے نظام کو قائم کرے اور مستحقین زکوٰۃ کا حق صاحب نصاب لوگوں سے وصول کر کے ان تک پہنچائے یا ان کی فلاح وبہبود پر خرچ کرے۔ ڈاکٹر یوسف قرضاوی لکھتے ہیں:

"زکوٰۃ کو اسلام نے لوگوں کے ضمیر پر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اسلامی ریاست کو اس امر کا ذمے دار بنایا ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ زکوٰۃ وصول کرے اور حق کے ساتھ اسے تقسیم کرے اور یہ کوئی محض احسان نہیں ہے کہ احسان کرنے والا چاہے دے اور چاہے نہ دے..... زکوٰۃ معاشرے کے مالدار لوگوں سے وصول کی جاتی ہے اور ان کے غریبوں کو لوٹا دی جاتی ہے۔"

(فقہ الزکوٰۃ: یوسف قرضاوی' حصہ اول۔ صفحہ 122,121

مترجم ساجد الرحمٰن صدیقی۔ مطبوعہ البدر پبلی کیشنز' اردو بازار لاہور)

ریاست کی چوتھی ذمہ داری یہ ہے کہ جن کا کوئی کفیل نہ ہو ان کی کفیل وہ خود بنے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ اور اس کا رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔"

(ترمذی)

"جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے۔" (ترمذی)

اسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرنے والے کے قرض کی ادائیگی اور اس کے پسماندگان کی سرپرستی بھی اسلامی حکومت کی ذمہ داری قرار دی۔

"جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی اور جو مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کا ہوگا۔" (بخاری' مسلم' ترمذی' ابوداؤد' نسائی)

"جو شخص مال چھوڑ جائے تو وہ اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو کسی کو بے سہارا چھوڑ جائے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔" (ترمذی' ابوداؤد)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ بن جبل کو یمن روانہ کرتے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریوں کے سلسلہ میں یہ اصول بیان فرمایا:

"انہیں اطلاع دینا کہ اللہ نے ان مالوں میں صدقہ فرض کیا ہے۔ جو ان کے مال داروں سے لیا جائے گا اور ان کے ناداروں پر تقسیم کیا جائے گا۔"

(بخاری' موطا' مسلم' ابوداؤد' نسائی' ترمذی)

یہ اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ منشاء الٰہی کے مطابق وافر مال و دولت رکھنے والوں سے ان کی یہ وافر دولت لے کر غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کرے تاکہ سلطنت اسلامی میں کوئی فرد ایسا نہ رہے جو ضروریات زندگی کے لیے کسی دوسرے کا محتاج بن کر اپنی حمیت کو داغدار کرتا پھرے یا پھر پورے معاشرے کے لیے ایک بوجھ کی حیثیت اختیار کر جائے۔ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروری اسی حوالے سے لکھتے ہیں:

"اسلام کے نظام کا مکمل نقشہ جن نگاہوں کے سامنے ہے وہ بآسانی یہ جواب دے سکتے ہیں کہ اس عالم تشریع میں یہ فریضہ نائب الٰہی خلیفہ پر عائد ہوتا ہے کہ قلمرو اسلامی میں ایک فرد بھی ایسا نہیں ہونا چاہیے جو حق معیشت سے محروم ہو اور نہ کسی کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ حق معیشت میں دراندازبن سکے اور جو حکومت اس منشاء الٰہی کو پورا نہیں کرتی نظام عدل سے منحرف ہے۔"

(اسلام کا اقتصادی نظام: مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروری' مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔ 1959ء صفحہ 47)

یہ معاشی تحفظ صرف مسلمانوں ہی کے لیے مخصوص نہیں غیر مسلم رعایا بھی اس کی یکساں حقدار ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک یہودی کو بھیک مانگتے دیکھا تو اسے گھر لے گئے' پہلے اپنے گھر سے کچھ دیا اور پھر بیت المال کے خزانچی کو بلا کر ہدایت کی کہ اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا روزینہ مقرر کر دو اور فرمایا:

"خدا کی قسم! یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے جزیہ لے کر کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔"

(اسلام کا نظریہ ملکیت: ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی۔ مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ 1968ء۔ حصہ دوم صفحہ 110 بحوالہ کتاب الخراج)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دور خلافت میں شہریوں کے معاشی حقوق کے سلسلہ میں حسب ذیل

ضروریات کی فراہمی حکومت کے ذمہ رکھی تھی۔

(i) خورد و نوش کا ضروری سامان۔ (ii) سردی اور گرمی کے کپڑے۔ (iii) نقل و حمل، حج اور جہاد کے لیے سواری۔

(اسلام کا نظریہ حکومت: حامد الانصاری غازی مطبوعہ ندوۃ المصنفین دہلی۔
1956 صفحہ 398، بحوالہ طبری)

چنانچہ عہد فاروقی رضی اللہ عنہ میں عام شہریوں سے لے کر نومولود بچوں تک کے وظائف بیت المال سے مقرر ہوئے اور انہیں معاشی احتیاجات سے مکمل طور پر نجات دلا دی گئی۔ بیت المال کا یہ استعمال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی برقرار رہا۔

آج کی اسلامی ریاست اسی اصول کی بنیاد پر اپنے وسائل اور شہریوں کی کم سے کم ضروریات کو مدنظر رکھ کر معاشی حقوق کا تعین کر سکتی ہے۔ اسلام نے ریاست کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر عام شہری محاصل اجتماعی بہبود اور کفالت عامہ کی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ناکافی ثابت ہوں تو وہ مزید محاصل عائد کر کے ان کے لیے وسائل مہیا کر سکتی ہے۔

معاشی تحفظ کے معاملہ میں اسلامی ریاست کے مزاج و کردار اور اس کے احساس ذمہ داری کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ایک تقریر اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی ایک مراسلت کے آئینہ میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تقسیم مال کے سلسلے میں اپنی ذمہ داری کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''خدا کی قسم اگر میں زندہ رہا تو صنعاء کی پہاڑی پر مویشی چرانے والے کو بھی اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے اس مال میں سے اس کا حصہ پہنچ جائے گا۔ بغیر اس کے کہ اس کا چہرہ سرخ ہو۔ (آپ رضی اللہ عنہ کا مطلب یہ تھا کہ بغیر اس کے کہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے کوئی بھاگ دوڑ کرنی پڑے اور اس میں اس کا چہرہ تمتما اٹھے'' (کتاب الخراج صفحہ 212)

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے گورنر عراق عبدالحمید بن عبدالرحمٰن کو لکھا ''لوگوں کو ان کے وظائف دے دو'' اس کے جواب میں عبدالحمید نے لکھا ''میں لوگوں کے مقررہ وظائف دے چکا ہوں اور اس پر بھی بیت المال میں مال بچا ہوا ہے۔'' اس پر حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ نے جواب میں لکھا۔ ''اب ایسے لوگوں کو دیکھو جو مقروض ہوں لیکن انہوں نے یہ قرضہ کسی فضول خرچی یا بے راہ روی کے سلسلہ میں نہ لیا ہو اور ان کے قرض (بیت المال میں بچی ہوئی رقم سے) ادا کر دو۔''

اس پر عبدالحمید نے انہیں لکھا ''میں نے ایسے مقروض افراد کے قرض بھی ادا کر دیے ہیں۔ بایں ہمہ بیت المال میں رقم باقی رہتی ہے۔'' اس پر عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں لکھا ''اب ایسے کنواروں کو تلاش کرو جو نادار ہوں اور وہ یہ پسند کریں کہ تم ان کی شادی کرا دو۔ تو تم ان کی شادی کر کے ان کی طرف سے ان کے ذمہ واجب الادا مہر بھی ادا کر دو۔'' اس کے بعد عبدالحمید نے انہیں لکھا ''مجھے جتنے بھی کنوارے ملے ان کی شادی بھی کرا چکا ہوں۔ بایں ہمہ بیت المال میں رقم باقی رہتی ہے۔'' اس کے جواب میں عمر بن عبدالعزیزؒ نے انہیں لکھا ''اب ایسے لوگوں کو تلاش کرو جن پر جزیہ مقرر ہے اور وہ اپنی زمین کا انتظام نہیں کر پاتے۔ ایسے ذمیوں کو اتنی رقم قرض دو کہ وہ اپنی زمین کا بندوبست کر سکیں۔ اس لیے کہ ان سے ہمارا واسطہ ایک دو سال کے لیے نہیں ہے۔''

(کتاب الاموال: جلد اول صفحہ 414)

زمین کے خزانے سب کے لیے ہیں:

قرآن کریم انسان کو یہ تصور دیتا ہے کہ زمین کے اندر چیزیں بھی پیدا کی گئی ہیں وہ تمہارے لیے ہیں' یعنی تم سب کے لیے اور کسی ایک شخص یا ایک طبقے کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ معیشت کے لیے ضروری بعض چیزیں اپنے لیے مخصوص کرے اور دوسروں کا معاشی استحصال کرے۔ زمین کے خزانے سب کے لیے ہیں' مواقع سب کے لیے ہیں اور معاشی نظام ایک جیسا ہونا چاہیے کہ اللہ کی پیدا کردہ اشیاء کا مفاد سب کو حاصل ہو۔ قرآن کریم میں ہے:

''اللہ وہ ہے جس نے زمین کی سب چیزیں تمہارے لیے پیدا کیں۔'' (البقرۃ:29)

حدیث شریف میں اس کی مزید تشریح یہ کی گئی ہے کہ ''بے شک تمہارے لیے پیدا کی گئی ہے اور تم آخرت کے لیے پیدا کیے گئے ہو تا کہ تم اس سے دین اور دنیا کا نفع حاصل کرو۔'' (کشاف)

اس ضمن میں سید معروف شاہ شیرازی رضی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''جب پوری دنیا سب انسانوں کے لیے نفع کے لیے ہے تو پھر کوئی ایک انسان اور طبقہ اسے اپنے لیے مخصوص نہیں کر سکتا' کوئی شخص دولت کا پجاری نہیں بن سکتا اور کسی کو یہ اجازت بھی نہیں ہے کہ وہ زر ہی کو قاضی الحاجات سمجھے یا بنائے یا دنیا کے کسی بھی مظہر کی پرستش کرے۔''

(اسلامی شریعت کے بنیادی معاشی تصورات۔ سید معروف شاہ شیرازی' صفحہ 16۔ مطبوعہ ادارہ منشورات اسلامی لاہور)

استحصال بے جا یا دوسروں کو ضرر پہنچانے کی ممنوعیت:

سرمایہ دارانہ نظام کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بیماریوں میں سے ایک بیماری سرمایہ دار کو استحصال بے جا کے مواقع فراہم کرنا ہے۔ محترم محمد فہیم عثمانی اس حوالے سے لکھتے ہیں۔

''اس (سرمایہ دارانہ) نظام میں سرمایہ دار کو بازار کی قوتوں پر غیر معمولی قابو حاصل ہو جاتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اشیاء کو گراں کر کے یا بے جا نفع اندوزی کے ذریعے دوسروں کو استحصال کا نشانہ بناتا ہے۔ چونکہ اسے بازار پر پوری اجارہ داری حاصل ہوتی ہے اس لیے اپنی مرضی کے مطابق اشیاء کی قیمت لاگت سے بہت زیادہ وصول کرتا ہے' اشیاء کا معیار گرا دیتا ہے اور صرف نفع اندوزی کی خاطر سماجی ضرورت سے کم مقدار میں مال تیار کرتا ہے۔ غرض اپنے نفع کو زیادہ سے زیادہ کرنے کی فکر میں وہ دوسروں کی مضرت کی پرواہ کیے بغیر جو پالیسی چاہتا ہے اختیار کرتا ہے اور سرمایہ دارانہ نظام اس کی ان تمام پالیسیوں کو قانونی حفاظت بخشتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں فرد کو آزادئ سعی کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ وہ اپنی پیداوار اور اشیاء کی تیاری کو جس قدر چاہے بڑھائے' جس قدر چاہے گھٹائے اپنے مال کی جو قیمت چاہے رکھے' جتنے آدمیوں سے جس اجرت پر چاہے کام لے' اپنے کاروبار کے سلسلے میں جو پالیسی چاہے اختیار کرے' حکومت یا ریاست کو

ان سارے معاملات میں مداخلت کا کوئی حق نہیں۔ اس کے نزدیک معیشت کا یہ فطری عمل ہے جس میں کسی بھی قسم کی مداخلت معیشت کے توازن کو بگاڑنے کے ساتھ ساتھ انفرادی ملکیت کے حقوق پر دست اندازی کے مترادف ہے۔ مگر اسلام اس نقطہ نظر کا سخت مخالف ہے۔ وہ کہتا ہے کہ فرد کو اپنی ملکیت اس طرح استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں جس سے دوسرے اشخاص یا بحیثیت مجموعی پورے معاشرہ کو نقصان اور ضرر پہنچے۔ صرف دانستہ نقصان پہنچانے ہی کا ذکر نہیں بلکہ وہ دوسروں کو مضرت رسانی کا ارادہ نہ بھی رکھتا ہو تو بھی اگر اس کے کسی مالکانہ تصرف سے دوسروں پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہوں تو اس کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اپنے تصرف میں اس طرح ترمیم کرے کہ دوسرے اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں۔"

(اسلامی معیشت کے چند نمایاں پہلو محمد محترم فہیم عثمانی۔ اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ لاہور۔ صفحہ 20-21)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسی مضرت رسانی سے اجتناب کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اسلام میں مضرت رسانی کی کوئی گنجائش نہیں۔ نہ ابتدائً نہ جوابی کارروائی کے طور پر۔"

(یحییٰ بن آدم القرشی کتاب الخراج صفحہ 68)

ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے گا اس کو اللہ نقصان پہنچائے گا اور جو کسی دوسرے کو تکلیف دے گا اس کو اللہ تکلیف دے گا۔" (ترمذی)

اسی عدم مضرت رسانی کے تحت اسلام اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ مال کو مہنگا کرنے کے لیے ذخیرہ اندوزی کی جائے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واضح الفاظ میں اس کی ممانعت فرمائی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جو مسلمانوں کے لیے نرخ گراں کرنے کی نیت سے ذخیرہ اندوزی کرے وہ غلط کار ہے اور اللہ اس سے بری ہے۔" (حاکم' مستدرک' جلد 3 صفحہ 2)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں اس لیے دخل دے کہ اسے گراں کر دے تو اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن اسے زبردست آگ میں جھونک دے۔"

(مسند ابوداؤد الطیالسی' صفحہ 25 طبع حیدر آباد)

اسی طرح خریدار کی شدت احتیاج اور اس کی اضطراری کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اشیاء کو مہنگے داموں فروخت کرنے کی بھی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ فقہاء نے ایسے معاہدے کو بیع فاسد سے تعبیر کیا ہے۔ غرض اسلام ملکیت کے استعمال پر افراد کا ایسا کوئی حق تسلیم کرنے کو تیار نہیں جس سے دوسرے افراد یا بحیثیت مجموعی پورے معاشرے کو نقصان اور ضرر پہنچے اور اس طرح اسلام معاشرہ میں ہر قسم کے استحصال بے جا کا دروازہ بند کر دیتا ہے۔

اہم معاشی نظامات

جاگیرداری

سوال: جاگیرداری سے کیا مراد ہے؟ اس کی اہم خصوصیات بیان کریں۔ یہ نظام کس طرح اختتام پذیر ہوا؟

جاگیرداری:

"جاگیر" فارسی زبان کا لفظ ہے، جس سے مراد وہ زمین ہے جو بادشاہ یا حکومت کی طرف سے انعام کے طور پر دی جائے۔ جاگیر حاصل کرنے والا "جاگیردار" کہلاتا ہے۔ جاگیردارانہ نظام کو "جاگیرداری" کہتے ہیں۔ انگریزی میں جاگیرداری کا مترادف "Feudalism" ہے۔

ماضی بعید میں، سلطنت روم کے زوال کے بعد یورپ کے مختلف علاقوں میں جاگیرداروں نے خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ پورے یورپ میں جاگیرداروں نے خودمختارانہ حیثیت حاصل کر لی۔ یہ نظام جاگیردارانہ نظام (Feadal System) کہلاتا ہے۔

جاگیردارانہ نظام کی خصوصیات:

جاگیردارانہ نظام حسب ذیل خصوصیات کا حامل تھا:

1. جاگیردار اپنے علاقوں پر حکمرانوں کی مانند تھے۔
2. جاگیردار کی جاگیر (زمین) پر کاشتکاری کرنے والے کسان یا مزارعے کہلاتے تھے۔
3. زمین جاگیردار کی ملکیت متصور ہوتی تھی۔
4. زمین کی پیداوار سے جاگیردار کے حصہ کے علاوہ کلیسا کا حصہ بھی نکالا جاتا تھا۔ یہ حصے نکالنے کے بعد جو کچھ باقی بچتا تھا، وہ کسان اپنے گھر لے جاتا تھا۔
5. عام طور پر لین دین مبادلہ جنس یا محنت کی صورت میں ہوتا تھا۔
6. کسان اور اس کے اہل و عیال کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت جاگیردار پر فرض تھی۔
7. کسان پر مندرجہ ذیل فرائض عائد ہوتے تھے:

(i) ضرورت پڑنے پر آقا کو فوجی اور مالی امداد دینا

(ii) ہر قسم کے ٹیکس ادا کرنا

(iii) جاگیردار کے کسی جنگ میں قید ہو جانے پر اس کا فدیہ ادا کر کے اُسے رہا کرانا

(iv) جاگیردار کے ہر حکم کی تعمیل کرنا

8. ہر قسم کے جھگڑوں کا فیصلہ کرنا جاگیردار کا کام تھا۔ اس مقصد کے لیے باقاعدہ جاگیرداری عدالتیں

موجود تھیں۔

9- کسان اپنی مرضی کے مطابق اچھی فصل نہیں بو سکتا تھا۔ اس لیے فصلوں کو ادل بدل کر کے نہ بونے کے سبب سے زمین کی پیداوار کم ہو جاتی تھی۔

10- جاگیردار کبوتروں کے جھنڈ یا ہرن اور شکار پالتے تھے، جن کی خوراک فصلوں سے حاصل ہوتی تھی۔ اس لیے کھیتوں کے گرد باڑ لگانے کی اجازت نہ تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ تمام فصل کھائے جانے کا اندیشہ لگا رہتا تھا۔

11- کسان کو جاگیردار کی چکی سے اناج پسوانا پڑتا تھا۔ یہ چکی کسان کے گھر سے کافی فاصلہ پر ہوتی تھی۔ اگر کوئی کسان گھر کی چکی پر اناج پیس لیتا تو اُسے سزا دی جاتی تھی۔

12- جاگیردار کسانوں کو بڑی سخت سزائیں دیا کرتے اور بھاری جرمانے کیا کرتے تھے۔

13- کسانوں کو جاگیردار کی زمینوں پر ہفتہ میں تین دن کام کرنا پڑتا تھا۔ فصل کٹنے کے دنوں میں اسے ہفتہ میں پانچ دن جاگیردار کے کھیتوں میں کام کرنا پڑتا تھا۔

14- اگر کسان اپنی زمین بیچتا تو قیمت فروخت کا پانچواں حصہ جاگیردار کو دینا پڑتا تھا۔

15- مزارع کو کلیسا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ جس کی مقدار کل سالانہ پیداوار کا بارھواں یا پندرھواں حصہ ہوتی تھی۔

16- کسانوں پر جائیداد ٹیکس بھی عائد کیا جاتا تھا۔ جس کی مقدار کسان کے مکان اور زمین کے لحاظ سے مقرر کی جاتی تھی۔

17- ٹیکس جمع کرنے کا اختیار سب سے زیادہ بولی دینے والے کے سپرد کیا جاتا تھا اور یہ ٹیکس جمع کرنے والے ایک مقررہ رقم سرکار کو ادا کرتے اور مزارعین سے جتنی زیادہ رقم وصول کر سکتے تھے، وصول کر کے مالدار بننے کی کوشش کرتے تھے۔

18- ٹیکس ادا کرنے کے بعد کسان کے پاس پیداوار کا صرف بیس فیصد حصہ بچتا تھا، جس سے سال بھر کے اخراجات پورے نہیں ہوتے تھے۔

19- کسانوں کو سڑکیں بنانے میں بھی کافی وقت صرف کرنا پڑتا تھا۔

20- عام طور پر کسان جاگیرداروں کے تنوروں پر سے روٹیاں پکواتے تھے اور اس مقصد کے لیے انہیں اُجرت دینا پڑتی تھی۔

21- جاگیردار کسانوں سے پیداوار کے تحفے اور نذرانے جبراً وصول کرتے تھے۔

22- جاگیردار کو اپنے علاقے میں شراب کشید کرنے پر اجارہ داری حاصل تھی۔

23- امراء اور پادری ٹیکس سے مبرا تھے۔ طبقہ امراء کو صرف جنگ کے موقع پر ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا اور اس پر بھی معافیاں ہو جاتی تھیں۔

24- جاگیردارانہ نظام کی وجہ سے شاہی اقتدار روز بروز کمزور ہوتا چلا گیا۔

جاگیرداری نظام کا زوال اور خاتمہ:

جاگیردارانہ نظام جرمنی، آسٹریا، پولینڈ، فرانس اور برطانیہ وغیرہ میں کافی عرصہ مروج رہا۔ لوگ جاگیرداروں کے مظالم سے تنگ آ گئے۔ دوسری طرف بادشاہ بھی جاگیرداروں کی خودسری سے تنگ آ چکے تھے اور چاہتے تھے کہ وہ جاگیرداروں کو پوری طور اپنا محکوم بنالیں۔ آہستہ آہستہ پورے یورپ میں بادشاہوں اور جاگیرداروں میں کشمکش شروع ہوگئی۔ عوام نے جاگیرداروں کے مقابلہ میں حکومت کا ساتھ دیا۔ اس طرح یورپ کے اکثر ممالک میں مضبوط مرکزی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ جنہوں نے جاگیرداری نظام کا مکمل طور پر خاتمہ کر دیا۔

☆ ☆ ☆ ☆

سرمایہ داری (Capitalism)

سوال (1): سرمایہ دارانہ نظام معیشت سے کیا مراد ہے۔ اس کی بنیادی خصوصیات بیان کریں؟

سوال (2): سرمایہ دارانہ نظام کی خوبیاں اور خامیاں بیان کریں؟

سوال (3): سرمایہ دارانہ نظام اور اسلامی معاشی نظام کا موازنہ کریں!

سرمایہ داری کی تعریف:

ذیل میں سرمایہ داری یا سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی تعریف درج کی جارہی ہے:

1- پروفیسر جویب نے سرمایہ دارانہ معاشی نظام کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''سرمایہ داری یا سرمایہ دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ تہذیب سے ہماری مراد حقیقی ترقی اور قانونی اداروں کے ارتقاء کا وہ مرحلہ ہے جس میں محنت کار آلات پیداوار کی ملکیت کے حق سے اس انداز سے دست بردار ہو جاتے ہیں کسان کی حیثیت محض اُجرت کاروں کی رہ جاتی ہے۔ ان کی بقاء، تحفظ اور شخصی آزادی قوم کے اقلیتی گروہ کی خواہش اور صوابدید پر انحصار کرنے لگتی ہے۔ یہ گروہ اپنے قانونی حق کی رُو سے زمین، مشین اور قوت و محنت کے اداروں پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں اور ان کا بنیادی مقصد زیادہ سے زیادہ انفرادی مفاد کا حصول ہوتا ہے۔''

2- انسائیکلوپیڈیا امریکانا کی رُو سے:

''سرمایہ دارانہ معیشت، معاشی نظام کی ایک ایسی قسم ہے جس میں سرمایہ نجی ملکیت ہوتا ہے اور سرمایہ کار اپنے معاشی کاروبار کی بدولت حصول نفع کی خاطر اسے جس طرح چاہتے

استعمال میں لانے کے لیے آزاد ہوتا ہے۔"

3-ولیم این لوکس کے نزدیک:

"سرمایہ دارانہ نظام ایک ایسی معاشی تنظیم ہے، جس میں افراد انفرادی طور پر یا اجتماعی حیثیت سے پیداواری ذرائع بشمول زمین کے مالکانہ حقوق لیے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ان ذرائع کو جس طرح چاہیں استعمال کر سکتے ہیں۔"

4-بقول جے ایل ہینن:

"سرمایہ دارانہ نظام سے مراد وہ سیاسی اور اقتصادی نظام ہے، جس میں حقیقی سرمائے کو نجی ملکیت میں رکھنے کی آزادی اور اجازت ہوتی ہے۔"

5-چرچل کا کہنا ہے کہ:

"سرمایہ داری سے مراد معاشی مفادات و برکات کی غیر مساوی تقسیم ہے۔"

6-بقول ایچ جی ویلز:

"سرمایہ داری ایک ایسی چیز ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی اس کی تعریف کرنے سے قاصر ہے، مگر ہم نے اسے سرمایہ دارانہ نظام کا نام دیا ہے۔ یہ روایتی معمولات بے پناہ اور بے لگام اکتسابی قوتوں، اخلاق کے معکوس ارتقا اور زندگی کے ضیاع کا نام ہے۔"

سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادی خصوصیات:

ذیل میں سرمایہ دارانہ نظام کی بنیادی خصوصیات کی نشاندہی کی جارہی ہے۔

1- نجی ملکیت اور وراثت کا حق:

سرمایہ دارانہ نظام میں ہر فرد کو نجی ملکیت (Private Property) بنانے اور رکھنے کا حق حاصل ہوتا ہے اور کوئی شخص بھی اس حق کو اس سے چھیننے کا مجاز نہیں ہوتا۔ یہ حق نجی ملکیت رکھنے والے کی زندگی تک قائم رہتا ہے اور اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء کو منتقل ہو جاتا ہے۔

اس نظام کے تحت کوئی بھی شخص، کوئی بھی کاروبار کر کے اپنے لیے جائیداد خرید سکتا ہے اور جیسے چاہے اُسے استعمال کر سکتا ہے۔ اگر وہ چاہے تو اسے فروخت بھی کر سکتا ہے۔ اس نظام میں یہ سوال نہیں اُٹھتا کہ کسی شخص نے دولت جائز طریقے سے کمائی ہے یا ناجائز طریقے سے۔ جائیداد پر بھی کوئی تحریر نہیں ہوتی۔ نجی جائیداد منقولہ بھی ہو سکتی ہے اور غیر منقولہ بھی۔

2- طبقاتی کشمکش:

سرمایہ دارانہ نظام میں معاشرہ دو طبقات یعنی امیر اور غریب میں تقسیم ہوتا ہے۔ امیر طبقہ دولت سمیٹنے

کے لیے غریب طبقہ کا استحصال کرتا ہے۔ غریب طبقہ جب خود پر ظلم ہوتے دیکھتا ہے تو سرمایہ دار طبقے کے خلاف محاذ آرائی پر کمربستہ ہو جاتا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہڑتالیں، مطالبہ کی تحریکیں اور جلسے جلوسوں کی وجہ سے ہر طرف بے چینی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے یہ طبقاتی کشمکش ہر دور میں جاری رہتی ہے۔

3- کاروبار کی آزادی:

سرمایہ داری نظام میں ہر فرد کو آزادی ہوتی ہے کہ وہ جو پیشہ چاہے اپنائے، تاہم حکومت کو اختیار ہوتا ہے کہ وہ کسی پیشہ پر پابندی عائد کردے۔ غیر مسلم ممالک میں عام طور پر حلال وحرام کی تمیز نہیں کی جاتی۔

4- معاہدہ کی آزادی:

سرمایہ دارانہ نظام میں ہر فرد کو مکمل آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی دوسرے فرد کے ساتھ اپنے مفاد کے تحت کوئی بھی معاہدہ کرے۔ معاہدات پر عمل کرنے اور کرانے کے لیے عدالتیں موجود ہوتی ہیں، جو قانون معاہدہ کے تحت فیصلے کرتی ہیں۔

5- غیر مربوطی نوعیت:

سرمایہ دارانہ نظام میں معاشی سرگرمیوں کو باہمی طور پر مربوط کرنے کے لیے کوئی مرکزی ہدایاتی ادارہ نہیں ہوتا۔ اس لیے ہر معاشی سرگرمی ایک دوسرے سے غیر متعلق ہوتی ہے اور پیداواری فیصلے متعدد افراد اور پیداوار کار علیحدہ علیحدہ کرتے ہیں۔ غیر مربوطی نوعیت طلب ورسد کی عدم مسابقت کا سبب بنتی ہے۔

6- آجر کا کلیدی کردار:

سرمایہ دارانہ نظام میں آجر کلیدی کردار ادا کرتا ہے اور ملک کی پوری پیداواری مشینری اسی طبقہ کی ہدایات کے مطابق عمل کرتی ہے۔ یہ نظام آجر کے وجود کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔

7- مقابلہ اور تعاون:

سرمایہ داری نظام میں ایک جانب سخت مسابقت ہوتی ہے تو دوسری طرف تعاون کی فضا بھی پائی جاتی ہے۔ خریدار اشیاء کی خریداری کے لیے آپس میں مسابقت کرتے ہیں، لیکن ضرورت پڑنے پر اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے وہ سرمایہ کار یا آجر کے خلاف مزدور انجمن کی صورت میں تعاون بھی کرتے ہیں۔ اس طرح آجرین نہ صرف آپس میں مسابقت کرتے ہیں، بلکہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لیے ایسوسی ایشن بھی بنا لیتے ہیں۔ اس طرح سرمایہ دارانہ نظام میں معیشت اور تعاون شانہ بشانہ چلتے نظر آتے ہیں۔

8- احساس ذمہ داری:

سرمایہ دارانہ نظام کا یہ اصول ہے کہ کاروبار پر اسی کو کنٹرول حاصل ہوتا ہے، جو اپنا سرمایہ کاروباری

خطرات میں ڈالتا ہے۔ اگر سرمایہ کسی اور کا ہو اور کاروبار ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہو جن پر کاروباری نقصان کا کوئی اثر نہ پڑے تو سوچا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر غیر ذمہ دارانہ فیصلے کریں گے۔

9- صارف کی بالادستی:

سرمایہ دارانہ نظام میں صارف کو حکمران کی حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ سرمایہ کار وہی اشیاء پیدا کرتا ہے جن کی طلب بازار میں ہوتی ہے۔ زراعت کار بھی وہی فصلیں اگاتا ہے جو صارفین کو مطلوب ہوں۔ اسی طرح درآمد کنندہ وہی اشیاء درآمد کرتا ہے جو لوگ طلب کرتے ہیں اور برآمد کنندہ وہی اشیاء پیدا کرتا ہے جو بیرونی ملکوں کے صارفین پسند کرتے ہیں۔ چنانچہ ہر حال میں صارف کی خواہش کو ملحوظ رکھنا پڑتا ہے۔

10- تشہیر:

سرمایہ دارانہ نظام میں تشہیر (Advertisement) کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ کوشش کی جاتی ہے کہ اشتہارات کے ذریعے صارف کی حقیقی خواہش میں تبدیلی کر کے اپنی پیدا کردہ اشیاء خریدنے پر مجبور کیا جائے، خواہ وہ مارکیٹ میں موجود دوسری اشیاء سے کمتر اور غیر معیاری ہی کیوں نہ ہوں۔

11- قیمتوں کی خودکاریت:

سرمایہ دارانہ نظام میں قیمتوں کی خودکاریت آزاد بازار پر منحصر ہوتی ہے، جہاں صارفین سے اور آجرین آجرین سے شدید مسابقت کرتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں قیمتوں کی خودکاریت اس انداز سے عمل پیرا ہوتی ہے کہ معاشی نظام میں مطابقت خود بخود قائم ہوتی ہے اور اس مطابقت میں کسی مرکزی ادارے کو مداخلت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ عمل پیداوار اور عمل صرف دونوں کا تعین اور رہنمائی قیمتیں کرتی ہیں۔ صارفین اپنی پسند و ناپسند اس قیمت کے تعین کے ذریعے کر دیتے ہیں جس پر کہ وہ مخصوص اشیاء خدمات خریدنا چاہتے ہیں۔ اسی طرح پیدا کاران پیش کردہ قیمتوں کی بنیاد پر اس امر کا اظہار کر دیتے ہیں کہ ان کے پاس اشیاء کا وافر ذخیرہ موجود ہے یا ان کی کمیابی ہے، اگر آجرین کسی چیز کی قیمت میں اضافہ کر دیں تو طلب میں کمی واقع ہو جاتی ہے جس کا مطلب فروخت میں کمی ہے۔ یہی کمی آجرین کے مجموعی منافع میں کمی کا باعث ہوگی۔ چنانچہ آجرین کو مجبوراً اشیاء کی قیمتیں اس سطح پر لانا پڑیں گی جہاں صارفین کی پیش کردہ قیمت طلب پر مطابقت ہو سکے۔ اسی طرح اگر رسد طلب سے زیادہ ہو جائے تو قیمتیں گر جائیں گی اور طلب و رسد میں پھر توازن پیدا ہو جائے گا۔

سرمایہ داری نظام کی خوبیاں:

ذیل میں سرمایہ داری نظام کی خوبیاں بیان کی جا رہی ہیں۔

1- اہلیت کے مطابق حصول:

سرمایہ داری نظام معیشت میں ہر شخص اپنی اہلیت و استعداد کے مطابق منافع کما سکتا ہے اس میں

چونکہ مسابقت کا چلن عام ہے، اس لیے ہر فرد دوسروں سے بڑھ چڑھ کر اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لاتا ہے اور جتنی زیادہ محنت کرتا ہے اُتنا ہی زیادہ منافع کماتا ہے۔

2- صحیح اقتصادی فیصلے:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں کاروباری کنٹرول اسی شخص کو حاصل ہوتا ہے جو کاروباری خطرہ برداشت کرنے کی ذمہ داری قبول کرتا ہے۔ لہٰذا ایسا فرد جو اقتصادی فیصلے کرے گا وہ یقینی طور پر درست ہوں گے کیونکہ یہ فیصلے نہایت سوچ سمجھ کر پیشگی جائزہ لینے کے بعد کیے جاتے ہیں۔

3- مختلف النوع معیاری اشیاء کی وافر رسد:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں چونکہ نجی منافع کمانے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی، اس لیے آجرین زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی غرض سے کاروباری خطرہ برداشت کرنے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتے اور اپنے پیداکاروں کو شکست دینے کے لیے نئی نئی ضرورتوں کو تلاش کرتے اور انہیں پورا کرنے کے لیے معیاری سامان تیار کرتے ہیں۔ اس طرح لوگوں کو نا صرف معیاری اشیاء ملتی ہیں بلکہ انہیں نئی سے نئی آسائشیں مہیا ہوتی ہیں۔

4- لچک پذیری:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں کافی لچک پائی جاتی ہے۔ اس لیے یہ نظام گرم بازاری، سرد بازاری اور معاشی بحران کے باوجود جاری وساری رہتا ہے اور ہر چیلنج کو اپنی لچک پذیری کی بنیاد پر قبول کرتا ہے۔

5- وسائل کی صحیح تخصیص:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں اگر کوئی آجر وسائل کی تقرری غلط اندازوں پر انحصار کرتے ہوئے غلط کرتا ہے تو اس کو نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ اس لیے وسائل کی موزوں ترین تخصیص واستعمال سرمایہ دارانہ نظام ہی میں ممکن ہے۔

6- جمہوری فروغ:

سرمایہ دارانہ معیشت میں صارف کو یہ قطعی آزادی حاصل ہوتی ہے کہ وہ کسی شے کا استعمال کرے یا نہ کرے، یعنی کوئی بیرونی قوت اُسے کسی شے کے استعمال کرنے یا نہ کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ بلکہ پیداوار کو صارفین کی پسند ناپسند کے لحاظ سے مطابقت دی جاتی ہے یعنی وہ صرف انہی اشیاء کو استعمال کرتے ہیں جنھیں وہ پسند کرتے ہیں نہ کہ ایسی اشیاء جو انہیں رسد کی جائیں۔ چنانچہ یہ درست ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں جمہوری اصولوں کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔

7- سستی اشیاء کا حصول:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں مسابقت کی وجہ سے ہر آجر اپنی اشیاء کی قیمتیں کم سے کم مقرر کرتا

ہے، اس لیے صارفین کو سستی اشیاء حاصل ہوتی ہیں۔

8-وسائل نقل وحمل میں بہتری پیدا ہونا:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں جہاں پیداوار میں اضافہ پر زور دیا جاتا ہے، وہیں ان کے نقل وحمل کو بہتر بنانے پر زور دیا جاتا ہے۔ حکومت دیہات سے منڈیوں تک سامان پہنچانے کے لیے سڑکیں تعمیر کراتی ہے اور بار برداری سے دلچسپی رکھنے والے لوگ حرکت میں آتے ہیں۔ اس طرح وسائل نقل وحمل میں بہتری پیدا ہوتی ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی خرابیاں:

ذیل میں ہم سرمایہ دارانہ نظام معیشت کی خرابیوں کا جائزہ لینے جارہے ہیں۔

1-صارفین کا استحصال:

سرمایہ دارانہ نظام میں مسابقت پائی جاتی ہے اور مسابقت کرنے والے صارفین کی لاعلمی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یا تو رسد کو کم کر دیتے ہیں یا قیمتیں بڑھا دیتے ہیں۔ اس طرح صارفین کا استحصال ہوتا ہے۔

2-وسائل کا ضیاع:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں تشہیر (Advertisement) پر بے تحاشا روپیہ خرچ کیا جاتا ہے اور یہ خرچہ اشیائے فروخت کی چیزوں کی قیمت میں شامل کر دیا جاتا ہے۔ جس قدر وسائل اشتہاروں پر خرچ کیے جاتے ہیں، اگر ان کو اشیاء کے معیار کو بہتر بنانے پر صرف کیا جائے تو اس کا فائدہ صارفین کو حاصل ہو سکتا ہے۔

3-احساس عدم تحفظ:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں محنت کار (مزدور) کو ہر روز خدشہ رہتا ہے کہ شاید اسے آج کام ملے یا نہ ملے چنانچہ اس نظام میں عدم تحفظ کا احساس ہر وقت سر پر سوار رہتا ہے۔

4-مزدور کا استحصال:

سرمایہ دارانہ معیشت کا زیادہ تر انحصار مزدور پر ہے۔ آجر مزدور کا استحصال کرتا ہے اور اسے اس کی محنت کا پورا معاوضہ نہیں دیتا۔

5-ارتکاز دولت:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں سرمایہ دار کی دولت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ اس طرح ملکی دولت سمٹ کر چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتی ہے اور تمام وسائل پیداوار پر ان کا مکمل قبضہ ہو جاتا ہے۔

6-سیاست پر اثر اندازی:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں ملک کے بڑے بڑے تاجر، صنعتکار اور سرمایہ دار لوگ سیاست میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات وہ براہ راست سیاست میں حصہ لیتے ہیں اور بعض اوقات کسی دوسرے شخص کو انتخابات میں کامیاب کرانے کے لیے اسے مالی مدد دیتے ہیں۔ تاکہ وہ اسمبلی میں پہنچ کر ان کی مرضی کے مطابق قانون سازی کرنے یا کرانے میں کامیاب ہو سکے۔

7-عدم مساوات:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں مساوات نام کی کسی چیز کا وجود نہیں پایا جاتا۔ اس میں کوئی بھی شخص دوسروں کا استحصال کر کے ان کے حقوق غصب کر سکتا ہے اور فریب، جھوٹ، ملاوٹ، جعل سازی اور حرام کاری وغیرہ کے ذریعے دوسروں پر سبقت حاصل کر سکتا ہے۔ اس میں ایماندار اور بے ایمان میں کوئی تمیز نہیں کی جاتی۔ دیکھا صرف یہ جاتا ہے کہ زیادہ دولت کس کے پاس ہے۔

8-مذہب سے دُوری:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں، مذہب کو صرف ایک نجی معاملہ قرار دے کر اسے مسجدوں، مندروں اور کلیساؤں تک محدود کر دیا جاتا ہے۔

9-اخلاق سے عاری نظام:

سرمایہ دارانہ نظام معیشت میں اخلاق کی کوئی وقعت نہیں، اس لیے اس نظام میں ہمدردی اور رحم وغیرہ جیسے جذبات مفقود ہیں۔

10-چھوٹی صنعتوں اور دستکاریوں کا تباہ ہونا:

جس طرح بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھا جاتی ہے اسی طرح بڑے بڑے مل مالکان اور کارخانہ داران گھریلو صنعتوں اور دستکاریوں کو ختم کر دیتے ہیں کیونکہ یہ ادارے مشینوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اس طرح دستکار اپنا آزاد پیشہ ترک کر کے کسی کارخانہ میں مزدوری یا ملازمت کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

11-سرمایہ داری کا گھناؤنا پن:

سرمایہ داری نظام معیشت جرائم کو ہوا دیتا ہے کیونکہ یہ نہ تو کسی اخلاقی اصول پر قائم ہے اور نہ ہی کسی مذہب کے تابع۔ اس میں جائز و ناجائز اور حرام و حلال کا قطعاً کوئی خیال نہیں رکھا جاتا۔ ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، احتکار، مخرب اخلاق اشیاء، منشیات کی فروخت اور مصنوعی قلت و مصنوعی اجارہ داری جیسے ہتھکنڈوں سے کام لینا کوئی عیب تصور نہیں کیا جاتا۔

سرمایہ دارانہ نظام اور اسلامی معاشی نظام کا موازنہ:

ذیل میں سرمایہ دارانہ نظام اور اسلامی معاشی نظام کا موازنہ کیا جارہا ہے۔

1- الہامی نظام:

اسلامی نظام معیشت قرآن مجید پر مبنی ہے، جو بذریعہ وحی پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ قرآن مجید میں بیان کردہ معاشی اصولوں کی تشریح و تعبیر حضرت محمد ﷺ نے فرمائی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک الہامی اور خدائی نظام ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام انسانوں کا وضع کردہ ہے۔

2- مذہبی نظام:

اسلامی نظام معیشت کی بنیاد مذہب اسلام پر ہے۔ اسلام میں معیشت اور مذہب الگ الگ چیزیں نہیں ہیں بلکہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ یہ نظام ہر شعبہ زندگی میں مذہب کو ساتھ لے کر چلتا ہے اور کسی بھی قدم پر مذہب سے دُور نہیں ہوتا۔ اس نظام کے تحت اپنے اور اپنے اہل و عیال کے لیے رزق کمانا عبادت میں داخل ہے۔ رزق حلال کمانے اور اسے مستحقین پر خرچ کرنے کا مقصد دین و دُنیا میں فلاح پانا ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور نہ ہی یہ فلاح دین و دُنیا کا قائل ہے۔

3- تصور حلال وحرام:

اسلامی نظام معیشت میں حلال وحرام اور جائز و ناجائز کا تصور پایا جاتا ہے۔ اسلام نے جو چیز حرام قرار دی ہے، اس کا کاروبار کرنا یا اس سے رزق کمانا بھی حرام ہے۔ مثلاً سود، سٹہ، قمار بازی، منشیات، رقص و سرود اور عصمت فروشی وغیرہ سے متعلقہ کاروبار۔ اس کے برعکس سرمایہ دار نظام میں حلال وحرام اور جائز و ناجائز کا کوئی تصور نہیں۔

4- استحصال سے پاک نظام:

اسلام دوسروں کے مال کو ناحق کھانے کو حرام قرار دیتا ہے اور تاکید کرتا ہے کہ کسی کا استحصال نہ کیا جائے اور نہ ہی کسی کے حقوق سلب کیے جائیں۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں ایسا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

5- اخلاقی اقدار کا فروغ:

اسلام کا معاشی نظام اخلاق کے تابع ہے۔ اس میں ناپ تول کو پورا رکھنے، وعدوں کو پورا کرنے اور ہر معاملہ میں عدل کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ رشتہ داروں سے حسن سلوک، صلہ رحمی، ہمدردی، ایثار اور احسان کا درس دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں اخلاقی اقدار کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

6- گردشِ زر کا نظام:

اسلام چاہتا ہے کہ دولت ہر وقت گردش میں رہے اور کسی ایک یا چند ہاتھوں میں مرتکز نہ ہو۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ معاشی نظام میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ نظام تقسیم دولت میں ناہمواری پیدا کرتا ہے اور اس کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہو جاتی ہے۔

7- نجی ملکیت اور مفادِ عامہ:

اسلام نجی ملکیت کی اجازت دیتا ہے۔ اسلامی قانون کے تحت نجی ملکیت وراثت کی صورت میں تقسیم ہوتی رہتی ہے، اس لیے جائیداد اور مال و دولت ایک جگہ مرتکز نہیں ہوتے۔ اسلام نجی ملکیت کو خدا کی امانت قرار دیتا ہے اور خدا کے مقررہ کردہ طریقوں کے مطابق صرف کرنے کی ہدایت دیتا ہے، گویا ایک دولتمند شخص حقیقی معنوں میں دولتمند نہیں بلکہ دولت کا محافظ ہے اور اسے تقسیم کرنے کا ذمہ دار۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں اس قسم کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ہر دولتمند شخص اپنے مال کو جس طرح چاہے حرام یا حلال طریقوں سے صرف کر سکتا ہے۔

8- غیر سودی معیشت:

اسلام سُود کو حرام قرار دیتا ہے کیونکہ اس میں قرض لینے والے مجبور شخص کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔ اسلام ایک دوسرے کی مالی مدد کرنے اور کسی ضرورت مند کو قرض حسنہ دینے کی ترغیب دیتا ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد ہی سُود پر ہے جو مجبور انسانوں کا خون چوس کر حاصل کیا جاتا ہے۔

9- حاجتمندوں کی کفالت:

اسلام مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی قرار دیتا ہے اور انہیں ایک دوسرے کے دُکھ سُکھ میں شریک رہنے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام محتاجوں، ضرورت مندوں، یتیموں، بیواؤں، معذوروں، اپاہجوں اور بے سہارا افراد کی مدد کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اس سلسلہ میں انفاق فی سبیل اللہ مثلاً صدقہ، خیرات اور زکوٰۃ کا نظام موجود ہے۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام خود غرضی پر مبنی ہے اور کسی دوسرے پر خرچ کرنے کو دولت کا ضیاع تصور کرتا ہے۔

10- دُنیوی واُخروی فلاح:

اسلام کا معاشی نظام دین و دُنیا میں فلاح کی ضمانت دیتا ہے، یہ نفس پروری کے بجائے روح پروری پر زور دیتا ہے۔ ایک مسلمان رزق حلال کما کر خود اور اپنے اہل وعیال کو کھلاتا ہے تو اس کا یہ عمل عبادت میں شامل ہوتا ہے۔ اگر وہ راہِ خدا میں صرف کرتا ہے تو اسے دُنیا میں بھی اجر ملتا ہے اور آخرت میں بھی ثواب ملے گا۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں آخرت کا تصور ہی موجود نہیں۔ وہ صرف اس دنیائے فانی اور مادیت پر یقین رکھتا

ہے۔

11-امانت کا تصور:

اسلام دولت کو خدا کی امانت قرار دیتا ہے اور درس دیتا ہے کہ اسے اس کے حقداروں (اہل وعیال، اقرباء، یتیموں، بیواؤں، مسکینوں وغیرہ) تک پہنچایا جائے۔ اسلام یہ بھی درس دیتا ہے کہ اگر کسی کے پاس کوئی چیز فالتو ہے تو وہ اسے کسی ضرورت مند کو دیدے، سرمایہ دارانہ نظام میں نفع کو بڑھانے کے لیے کسی چیز کی رسد کو کم کر دیا جاتا ہے یا اسے تلف کر دیا جاتا ہے۔ یہ اتلاف دولت کا ضیاع ہے لیکن مغربی قانون میں اسے سرمایہ دار کا استحقاق تصور کیا جاتا ہے۔

12-مزدور کا استحصال:

اسلام کہتا ہے کہ مزدور کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اس کی مزدوری ادا کر دو۔ اسلام مزدور کا استحصال کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کے برعکس سرمایہ دارانہ نظام میں مزدور کا استحصال کیا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆ ☆

اشتراکیت واشتمالیت

سوال (1): "اشتراکیت" سے کیا مراد ہے؟ اشتمالیت اور اشتراکیت میں کیا فرق ہے؟ اس کی مختصر تاریخ اور مقاصد بیان کریں:

سوال (2): اشتراکیت واشتمالیت کی خوبیاں اور خامیاں بیان کریں!

سوال (3): اشتراکی نظام معیشت اور اسلامی نظام معیشت کا موازنہ کریں!

اشتراکیت کی تعریف:

اشتراکیت کی تعریف درج ذیل ہے:

1-انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں مذکور ہے کہ:

"اشتراکیت بنیادی طور پر ایک ایسا نظریہ یا تحریک ہے جس کا نصب العین پیداواری ذرائع کو اجتماعی کنٹرول میں لیتے ہوئے قوم کو اجتماعی طور پر اس طرح منظم کرنا ہے کہ عام لوگوں کے مفادات کا تحفظ ممکن ہو۔"

2-بقول ولیم این لاؤکس (William,N.Louks):

"اشتراکیت سے مراد ایسی تحریک ہے جو بڑے پیمانے پر پیدائش دولت عمل میں لانے والی ہر قسم کی اشیائے سرمایہ کو انفرادی انتظامیہ کی تحویل ملکیت میں دینے کے بجائے مجموعی طور پر

پورے معاشرہ کی ملکیت میں دینا چاہتی ہے، تاکہ بڑھتی ہوئی قومی آمدنی کی مساوی تقسیم عمل میں لائی جا سکے۔"

3- آکسفورڈ ڈکشنری (The Oxford Dictionary) میں مرقوم ہے کہ:

"اشتراکیت معاشرتی تنظیم کا ایک ایسا نظریہ ہے، جو عوامل پیدائش، سرمایہ، زمین اور املاک وغیرہ کی ملکیت اور اجتماعی تصرف کا مدعی ہے اور جس کا مقصد سب کے مفاد میں ان کی تنظیم اور تقسیم ہے۔"

اشتمالیت اور اشتراکیت میں فرق:

اشتمالیت اور اشتراکیت کو بعض اوقات مترادف تصور کیا جاتا ہے اور بعض اوقات ان دونوں میں امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ اشتمالیت (کمیونزم) کے مقابلہ میں اشتراکیت (سوشلزم) ایک نئی اصطلاح ہے۔ ان دونوں میں جو فرق پایا جاتا ہے، اسے ذیل میں واضح کیا جا رہا ہے:

1- اشتراکیت وسائل پیداوار کو قومی تحویل میں لینے کے لیے جمہوری طریقہ اختیار کرنے پر زور دیتی ہے، جبکہ اشتمالیت خونی انقلاب کے ذریعے تبدیلی لانے کی خواہاں ہے۔

2- اشتراکیت ریاست کے ادارے کو یکسر ختم کر دینے کی خواہاں نہیں جبکہ اشتمالیت اپنی انتہائی شکل میں ریاستی ادارے کو ختم کر کے جماعتی کنٹرول میں دینا چاہتی ہے۔

اشتمالیت و اشتراکیت کی مختصر تاریخ:

سب سے پہلے مشہور یونانی فلسفی افلاطون نے اشتراکیت و اشتمالیت کا نظریہ پیش کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ایک ایسی جمہوریت قائم ہونی چاہیے، جس میں اعلیٰ طبقے کے شہریوں کی املاک اور بیویاں مشترک ہوں۔ اس نے سوشلزم اور کمیونزم کے بارے میں اپنے نظریات اپنی کتاب "الجمہوریہ" میں "مثالی ریاست" کے عنوان کے تحت بیان کیے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ:

"ریاست، حکومت یا قانون کی بہترین شکل وہی ہے جس سے ہر شخص پوری آزادی سے سماج کی ہر چیز میں شریک ہو سکے۔"

افلاطون سے کافی عرصہ بعد چھٹی صدی عیسوی میں مزدک نامی ایک ایرانی شخص نے شاہ قباد کے دور حکومت میں انفرادی ملکیت کے خلاف آواز بلند کرتے ہوئے کہا کہ: دنیا میں ہر قسم کی خونریزی اور عداوتیں عام طور پر دولت یا عورت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں، اس لیے ان دونوں کی انفرادی ملکیت و تصرف کو ختم کر کے امن قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ یہ دونوں چیزیں خدا کی ملکیت ہیں، جس سے فائدہ اٹھانے میں تمام انسان برابر کے شریک ہیں۔ مزدک کی تحریک نوشیرواں عادل کے عہد میں ختم ہو گئی۔

اشتراکیت نے بتدریج مختلف نظریات وتحریکات، مثلاً حریت پسندی(Libralism) عقلیت پسندی(Rationalism)، انسانیت پرستی(Humanism)، تحریک اصلاح مذہب سے انفرادیت پسندی وغیرہ قوت حاصل کی، یہاں تک کہ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اواخر میں ہیگل نامی مفکر نے اس کو ایک علمی نظریہ کی شکل میں پیش کیا اور اقتصادی امور میں اسے بنیاد قرار دیا۔ پھر کارل مارکس نے اس نظریہ کو آگے بڑھایا اور ''داس کیپٹل (Dascapital) نامی کتاب میں کمیونزم اور سوشلزم سے متعلقہ نظریات کی وضاحت کی۔ بعد میں لینن اور اس کے ساتھیوں نے اس نظریہ کو عملی جامہ پہنایا اور روس میں ''سوویت یونین'' کے نام سے ایک باقاعدہ کمیونسٹ سٹیٹ کی بنیاد رکھی جو بالآخر 1991ء میں ناکام ہو کر پارہ پارہ ہو گئی۔

اشتراکیت کے مقاصد:

اشتراکیت کے اہم مقاصد حسب ذیل ہیں:

1- اشتراکیت کا مقصد اولین وسائل پیداوار کو سماجی ملکیت میں لینا ہے تاکہ اقتصادی ناہمواریوں کو دور کر کے آمدنی کی منصفانہ تقسیم کی جاسکے۔

2- اشتراکیت کا دوسرا اہم مقصد یہ ہے کہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کو دور کیا جائے جن کے باعث زبردست معاشی افراتفری پیدا ہوتی ہے۔

3- اشتراکیت کا تیسرا اہم مقصد مادی وسائل اور محنت کی بربادی کو روکنا ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اشیاء اور وقت دونوں کا ضیاع ہوتا ہے، کیونکہ اس نظام کی بنیاد نجی منافع پر ہے، اس لیے سرمایہ دار اپنا منافع چند در چند کرنے کے لیے پیدوار کو اندھا دھند بڑھا کر اور قیمت کو کم کر کے ایک دوسرے کا زبردست مقابلہ کرتے ہیں۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ اشیا نہیں بنائی جاتیں جن کی سماجی طور پر ضرورت ہوتی ہے۔ کبھی پیداوار طلب کے مقابلہ میں بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے، اس لیے بیکار پڑی رہتی ہے۔ اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام میں درمیانی اشخاص یا دلالوں کی ایک بڑی تعداد کام کرتی ہے۔ یہ لوگ پیدا کرنے والوں اور صرف کرنے والوں کے درمیان کڑی کا کام کرتے ہیں۔ اس طبقہ کی صلاحیتوں کو بشرطیکہ سرمایہ دارانہ مقابلہ کو ختم کر دیا جائے، مفید تر اور پیداواری کاموں میں لگایا جا سکتا ہے۔ اندھا دھند مقابلہ کا نتیجہ سوائے معاشی تباہی اور کساد بازاری کے کچھ نہیں ہوتا۔ اشتراکیت اس امر کی خواہاں ہے کہ اس ساری طاقت کو جو سرمایہ دارانہ مقابلہ میں صرف ہوتی ہے تعمیری کاموں میں صرف کیا جائے۔

اشتراکیت کے اصول:

اشتراکیت کے اصول حسب ذیل ہیں:

1- مادی نظریہ حیات:

اشتراکیت کے بانی کارل مارکس کے نظریات ڈارون کے نظریات سے ہم آہنگ ہیں۔ مارکس کا خیال ہے کہ مادہ کے اندر ہمیشہ دو قوتیں برسرِ پیکار رہتی ہیں۔ پہلے مادہ کے اندر تبدیلی ہوتی رہتی ہے، بعد میں اس میں تضاد کی وجہ سے ماہیتی تبدیلی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ انسان مادہ کی اسی تبدیلی کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان مادی جرثومے کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

2- دہریت:

لینن کے نزدیک مذہب اور خدا کا تصور مذہبی پیشواؤں، زمینداروں اور سرمایہ داروں کا پیدا کردہ ہے تاکہ وہ غریب اور نچلے طبقہ میں لوٹ کھسوٹ کے ذریعے اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ سوشلزم کے بانیوں کے نزدیک مذہب ایک افیون ہے جسے ہر حالت میں ختم کر دینا چاہیے۔

3- طبقاتی کشمکش:

مارکس کا خیال ہے کہ جو طبقہ معاشیات پر قابض ہوتا ہے، وہ ریاست پر بھی قابض ہو جاتا ہے اور دوسرے محروم طبقہ کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ پھر پسا ہوا طبقہ معاشی اور سیاسی آزادی کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے حتیٰ کہ وہ معاشیات پہ قابض ہو کر حکومت پر بھی قبضہ کر لیتا ہے۔ یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے اور نئے طبقات وجود میں آتے رہتے ہیں جو آپس میں کشمکش میں مبتلا رہتے ہیں۔ مارکس کا خیال ہے کہ جب غیر طبقاتی سماج پیدا ہو جائے گا تو وہ آخری مرحلہ ہوگا جسے سوشلزم یا اشتراکیت کا نام دیا جائے گا۔

4- نظریہ قدرِ زر:

مارکس کا خیال ہے کہ کوئی بھی مادی شے اپنی ماہیت مزدور اور کاریگر کے ہاتھوں تبدیل کرتی ہے، قیمت کی اس بڑھوتری کا نام "قدر زائد" اس کا کہنا ہے کہ مزدور یا کاریگر کی قدر زائد میں سے بہت زیادہ حصہ سرمایہ دار بلا معاوضہ اور بلا محنت حاصل کر لیتا ہے۔ یوں مزدوروں کا استحصال ہوتا ہے اور دولت سرمایہ دار کے پاس جمع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ سرمایہ دار کا منافع دراصل مزدور کی محنت کا استحصال ہے یوں جب دولت ایک ہاتھ میں اکٹھی ہو جاتی ہے تو ارتکاز زر اور افراط زر جیسی خرابیاں جنم لیتی ہیں اور ملک میں معاشی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی حال سے سامراجیت اُبھرتی ہے۔

5- خاندانی نظام کا خاتمہ:

سوشلزم میں خاندان کو سرمایہ داری کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ کنبہ یا خاندان کا سوشلزم میں کوئی وجود نہیں۔ لینن نے حلال اور حرامی بچوں میں کوئی تمیز نہیں کی۔

6- شخصی ملکیت کا خاتمہ:

مارکس نجی ملکیت کو سرمایہ دار طبقہ کا حربہ قرار دیتا ہے۔ لینن کا کہنا ہے کہ کمیونسٹ معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں تمام چیزیں، یعنی زمین اور فیکٹریاں وغیرہ مشترکہ ملکیت ہوتی ہیں اور لوگ مشترکہ طور پر کام کرتے ہیں۔

7- پارٹی ڈکٹیٹر شپ:

سوشلزم اور کمیونزم میں ملک کا سیاسی نظام ایک پارٹی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ پارٹی کے سربراہ کا انتخاب کمیونسٹ پارٹی کرتی ہے۔ نامزدگی کو الیکشن اور پارٹی کی آمریت کو جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔

8- لیڈروں کی ڈکٹیٹر شپ:

پارٹی کے اختیارات نمائشی ہوتے ہیں، اصل اختیارات پارٹی کے لیڈر کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اشتراکیت اپنی اصلی نوعیت کے لحاظ سے لیڈر کی شخصی آمریت اور فرد واحد کی استبدادی بادشاہت کا دوسرا نام ہے۔

9- مزدوروں کی آمریت:

کارل مارکس کا خیال ہے کہ عبوری دور میں مزدوروں کی ڈکٹیٹر شپ کا قیام ضروری ہے تاکہ سرمایہ داروں کے بقیہ نشانات اور پوشیدہ اثرات سے معاشرہ کو صاف کیا جائے۔ اشتراکی لیڈروں کا خیال ہے کہ مزدوروں کی آمریت بہت تیزی اور شدت سے قائم کرنی چاہیے۔

اشتراکیت واشتمالیت کی خوبیاں:

ذیل میں اشتراکیت اور اشتمالیت کی خوبیاں بیان کی جارہی ہیں۔

1- اشتراکیت واشتمالیت میں ذاتی ملکیت کا تصور ختم ہوجاتا ہے اور ملک من حیث القوم تیزی سے ترقی کی منازل طے کرنے لگتا ہے۔ اس نظام میں کارخانے، زمین، باغات، تجارتی مراکز منڈیاں، حتیٰ کہ تمام وسائل پیداوار سرکاری کنٹرول میں ہوتے ہیں، اس لیے ہر شخص حسب ہمت کام کرتا ہے اور مقررہ ضروریاتِ زندگی حاصل کرتا ہے۔

2- تمام ملک کے ذرائع پیداوار ایک ہی نظم ونسق کے تحت آجانے سے یہ ممکن ہوجاتا ہے کہ ایک طرف طے شدہ منصوبہ کے مطابق ان سب کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی جدوجہد کی جائے اور دوسری طرف تمام ملک کی ضروریات کو سامنے رکھ کر پورا کرنے کی منظم کوشش کی جائے۔ چنانچہ اس نظام کی موجودگی میں جامع منصوبہ بندی کی جاسکتی ہے۔

3- اس نظام کے تحت ضروریات کے مطابق کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔ اس طرح نہ تو بے جا مال کا ذخیرہ ہونے پاتا ہے اور نہ کوئی کمی رہتی ہے۔ یعنی رسد اور طلب میں ایک توازن برقرار رکھا جاسکتا ہے۔

4- اجتماعی منصوبہ بندی کے ذریعے روزگار کی فراہمی حکومت کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں سے کام لیا جاسکتا ہے اور ان کی اہلیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔
5- معذوروں، اپاہجوں اور کام نہ کرسکنے والے لوگوں کی مالی دستگیری حکومت خود کرتی ہے۔
6- مصنوعی قلت کا سوال پیدا نہیں ہوتا، اس لیے قیمتیں مناسب رہتی ہیں۔
7- امیر و غریب میں بُعد کم ہو جاتا ہے۔
8- بے روزگاری ختم ہو جاتی ہے اور کوئی بھوکا اور بے علاج نہیں رہتا۔
9- حکومت میں ایک ہی پارٹی ہوتی ہے، اس لیے حزب اختلاف کا وجود نہیں ہوتا۔اس طرح حکومت مضبوط بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔
10- اجارہ داری اور ملکیتی حقوق نہ ہونے کے باعث رشوت کے مواقع بہت کم پیش آتے ہیں۔
11- نظام تعلیم بہتر ہو جاتا ہے اور تمام لوگوں کو تعلیمی اداروں سے مفاد کے یکساں مواقع حاصل ہوتے ہیں۔
12- صرف ایسی سکیمیں تیار کی جاتی ہیں جن سے پوری قوم کو فائدہ پہنچے۔ یوں فضول اور غیر ضروری اخراجات سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔
13- کوئی شخص نسب، خاندان اور دولت کی بنا پر معزز و برتر نہیں ہوتا۔
14- ایک سوشلسٹ یا کیمونسٹ ملک دوسرے ملکوں کی نسبت زیادہ ترقی کرتا اور دوسروں سے زیادہ طاقتور بن جاتا ہے۔

اشتراکیت واشتمالیت کی خامیاں:

ذیل میں اشتراکیت واشتمالیت کی خامیوں کی نشاندہی کی جارہی ہے:
1- سوشلزم اور کیمونزم دونوں لادینی نظام ہیں اور خدا کے قائل نہیں۔
2- کیمونزم اور سوشلزم کے نفاذ کے لیے کروڑوں انسانوں کا خون بہایا گیا اور مخالفین کو سخت سزائیں دی گئیں۔اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ ان دونوں نظاموں کی بنیاد ظلم پر ہے۔
3- حلال اور جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت یا جائیداد پر ہر انسان کا اپنا حق ہے لیکن کیمونزم اور سوشلزم میں حق سلب کرلیا گیا ہے اور نجی جائیداد کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔
4- کیمونزم اور سوشلزم میں پارٹی، لیڈروں اور مزدوروں کی آمریت قائم ہوتی ہے۔حزب مخالف کا وجود نہ ہونے کے باعث پارٹی کی حکومت من مانی کرتی ہے۔
5- حکومت کے خلاف اُٹھنے والی ہر آواز کو دبانے کے لیے انٹیلی جنس کا جال بچھا دیا جاتا ہے جس سے بے چینی اور مسلسل اضطراب کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔اس طرح جہاں لوگ اپنا سکون کھو بیٹھتے

ہیں، وہاں حکومت پر سے ان کا اعتماد اُٹھ جاتا ہے۔

6- کمیونزم اور سوشلزم کے حامل نظاموں میں طبقاتی کشمکش پیدا ہو چکی ہے کیونکہ ان نظاموں کی وجہ سے معاشرہ دو طبقات میں بٹ چکا ہے۔ ایک انتظامیہ جو بے رحم اور ظالم انتظامیہ کا کردار ادا کر رہی ہے اور دوسرے عوام، جن کو بھیڑ بکریاں سمجھ کر ہر میدان میں غلاموں کی طرح کام لیا جا رہا ہے۔

7- یہ نظام اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر قائم نہیں رہ سکا۔ اس کے کتابی اصول اور ہیں اور عملی اصول کچھ اور جیسے ہاتھی کے دانت کھانے کے اور دکھانے کے اور۔

8- ذاتی ملکیت کا تصور ختم ہونے سے کام نہ کرنے اور صرف فائدہ حاصل کرنے کے مقاصد ابھرنے لگتے ہیں اور پھر ملک زوال پذیر ہو جاتا ہے۔

9- یہ دونوں نظام اخلاق سے عاری ہیں۔

اشتراکی نظام معیشت اور اسلامی نظام معیشت کا موازنہ:

ذیل میں اشتراکی و اشتمالی نظاموں کا اسلامی نظام معیشت سے موازنہ کیا جا رہا ہے۔

1- اسلامی نظام معیشت ایک الہامی اور خدائی نظام ہے، جو بذریعہ وحی قرآن مجید کی صورت میں پیغمبر آخر الزمان حضرت محمد ﷺ پر نازل ہوا۔ اس کے برعکس اشتراکی و اشتمالی نظام انسانوں (افلاطون، مارکس، لینن وغیرہ) کا وضع کردہ ہے۔ اسلامی نظام معیشت خدا کا بنایا ہوا ہے، اس لیے اس میں غلطی کا احتمال نہیں، اس کے برعکس سوشلزم انسانوں کا وضع کردہ ہے، اس لیے یہ اغلاط کا پلندہ ہے۔

2- اسلامی نظام معیشت میں خدا اور رسول ﷺ پر ایمان لانا شرط اول ہے۔ اس کے برعکس سوشلزم اور کمیونزم دونوں خدا اور مذہب پر یقین نہیں رکھتے۔ دونوں کے نزدیک مذہب عوام کے لیے افیون ہے، دونوں کا خیال ہے کہ مذہب غریب اور محنت کش عوام کو ظلم واستبداد کے مقابلے میں محض صبر وشکر کی تلقین کر کے سُلا دیتا ہے اور ظالم سرمایہ دار کے ظلم سے نپٹنے کی صلاحیت پیدا نہیں کرتا۔

3- اسلامی نظام معیشت میں انسانی فطرت کو ملحوظ رکھا گیا ہے، جبکہ اشتراکیت ایک غیر فطری نظام ہے۔

4- اسلامی نظام معیشت میں حلال و حرام میں امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔ جو چیز اسلام میں حرام ہے، اس کا کاروبار کرنا بھی حرام قرار دیا گیا ہے۔ اس کے برعکس سوشلزم اور کمیونزم میں حلال و حرام کا کوئی تصور موجود نہیں۔

5- اسلامی نظام معیشت میں رحم، ہمدردی، ایثار اور محبت جیسے جذبات موجود ہیں جبکہ سوشلزم اور کمیونزم میں ایسے جذبات کی کوئی وقعت نہیں۔

6- اسلامی نظام معیشت میں نجی ملکیت کا حق موجود ہے جبکہ اشتراکیت و اشتمالیت میں اس فطری حق کو سلب کر لیا گیا ہے۔

-7 اسلامی نظام معیشت میں انفاق فی سبیل اللہ کے ذریعے اپنے رزق میں دوسروں کو بھی شریک کیا جاتا ہے۔ جبکہ اشتراکیت واشتمالیت میں اس قسم کا کوئی تصور موجود نہیں۔

-8 اسلامی نظام معیشت میں منصفانہ مساوات کا تصور پایا جاتا ہے، جس کے تحت تمام لوگوں کو رزق کمانے کے مساوی مواقع حاصل ہیں اور کوئی شخص اپنی مرضی سے کوئی بھی جائز پیشہ اختیار کر کے رزق کما سکتا ہے۔ اس کے برعکس اشتراکی نظام معیشت میں نام نہاد مساوات کا چرچا کیا جاتا ہے جبکہ معاشرہ کے تمام لوگ مساوی درجہ کے حامل نہیں ہوتے۔ اس نظام میں ہر شخص کو حکومت کی مرضی سے کام کرنا پڑتا ہے لیکن اسے محنت کا معقول معاوضہ نہیں دیا جاتا۔ اس میں کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے ذاتی کاروبار نہیں کر سکتا۔

-9 اسلامی حکومت اللہ کے قوانین کے تابع ہے، جس میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور حکومت صرف نیابت کے فرائض ادا کرتی ہے۔ اس کے برعکس اشتراکیت واشتمالیت میں حکومت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ اس میں حاکمیت اعلیٰ پارٹی کو حاصل ہوتی ہے۔

-10 اسلامی نظام معیشت میں فرد، جماعت اور معاشرہ کے حقوق وفرائض میں اعتدال کا درس دیا جاتا ہے جبکہ اشتراکیت واشتمالیت میں معاشرہ ہی کے حقوق کو ملحوظ رکھا جاتا ہے اور فرد سے فرائض کی انجام دہی کا تقاضا کیا جاتا ہے، لیکن فرد کی انفرادیت ختم کر دی جاتی ہے۔

-11 اسلامی نظام معیشت میں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی پاسداری پر زور دیا جاتا ہے، جبکہ اشتراکیت اور اشتمالیت میں اس قسم کا کوئی تصور موجود نہیں۔

-12 اسلام میں کنبہ اور خاندان کا تصور موجود ہے۔ بچے اپنے والدین کی ملکیت متصور ہوتے ہیں اور انہیں والدین سے جدا کرنے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا، جبکہ اشتراکیت میں بچے حکومت کی ملکیت متصور ہوتے ہیں، والدین کا ان پر ثانوی حق ہے۔

-13 اسلامی نظام معیشت میں عورت کا بوجھ مرد پر ہے، اس لیے اس پر رزق کمانے کی پابندی عائد نہیں ہوتی جبکہ اشتراکیت میں عورت ہو یا مرد ہر ایک کو اپنا بوجھ خود اٹھانا پڑتا ہے۔

-14 اسلامی نظام معیشت روحانی فلسفہ حیات پر مبنی ہے، جبکہ اشتراکیت اور اشتمالیت مادی نظریہ پر مبنی ہیں۔

-15 اسلامی نظام معیشت میں فلاحِ دین ودنیا کا تصور پایا جاتا ہے جبکہ اشتراکیت اور اشتمالیت میں صرف دنیوی مفاد کو ملحوظ رکھا جاتا ہے۔ اس میں دین اور آخرت کا کوئی تصور موجود نہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

فاشزم (فسطائیت) (Fascism)

سوال: "فاشزم" (فسطائیت) پر نوٹ لکھیں!

فاشزم (فسطائیت):

"فاشزم" جسے اردو میں "فسطائیت" کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، سرمایہ دار طبقے کی جارحانہ آمریت ہے۔ اس نظریہ کے حامیوں میں میکیاوتی، شوپنہار، برگساں، راک، ہٹلر اور مسولینی وغیرہ شامل ہیں۔

فاشزم کے بنیادی تصورات:

ذیل میں فاشزم کے بنیادی تصورات بیان کیے جا رہے ہیں۔

(i) طاقت کا استعمال:

فاشزم میں جبر اور طاقت کے استعمال کو ناگزیر تصور کیا جاتا ہے جیسا کہ مسولینی کا کہنا ہے:

"فسطائیت فکر بھی ہے اور عمل بھی۔ یہ تحریک بعض خاص قسم کے اداروں کو تخلیق کرنے کے لیے معرض وجود میں نہیں آئی، بلکہ یہ انسان کی روحانی زندگی کی معلمہ بھی ہے۔ یہ اس کی داخلی اور خارجی زندگی کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھالنے کا عزم رکھتی ہے۔ اس کے پیش نظر انسان اس کے اخلاق اور اعتقادات کو بدلنا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے یہ قوت کے استعمال کو بالکل جائز سمجھتی ہے۔
فسطائیت میں اس بات کو ایمان کی حد تک تسلیم کیا جاتا ہے کہ طاقتور کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ قبضہ کرے اور کمزور کو اپنے تصرف میں رکھے کیونکہ مغلوب ومحکوم رہنا کمزور کی قسمت ہے۔"

قوم پرستی:

فسطائیت (فاشزم) میں قوم پرستی کو از حد اہمیت دی جاتی ہے۔ بقول عبدالحمید صدیقی، ہٹلر نے کہا تھا کہ:

"فسطائیت ایک ایسا عقیدہ ہے جو خون، رنگ، نسل اور شخصیت کی اہمیت کو ابھارتا ہے۔"

ہٹلر نے اپنی قوم کو سب سے برترین تصور کرتے ہوئے اس میں قوم پرستی کا جذبہ بیدار کر کے جنگ عظیم دوم میں جھونک دیا تھا جس کے بدترین نتائج اس کی قوم کو بھگتنا پڑے۔

ریاست کی ہمہ گیریت:

بقول مسولینی:

"زندگی کے فسطائی تصور میں ریاست کو بہتر اور زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہ تصور ایک فرد کے وجود کو اسی حد تک تسلیم کرتا ہے جس حد تک اس کے مفاد ریاست کے مفاد سے ہم آہنگ ہو۔ ہمارے اس نظام میں ریاست ہمہ گیر ہے۔ اس سے ہٹ کر نہ تو کسی انسان یا روحانی تصور کو مانا جاسکتا ہے اور نہ اسے کسی قدر و قیمت کا حامل سمجھا جاسکتا ہے۔ جو کچھ بھی دُنیا میں موجود ہے وہ ریاست کے دم قدم سے ہے۔ ریاست کے علاوہ دُنیا میں کسی دوسری چیز کا وجود نہیں۔"

میکاویلی کا خیال ہے کہ:

"ریاست چونکہ تمام معاشرتی اداروں سے برتر اور اعلیٰ ترین ہے، اس لیے انسان کو چاہیے کہ وہ دیگر تمام مقاصد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے صرف اور صرف ریاست کی بقاء اور اس کے استحکام کے لیے جدوجہد کرے۔"

فطرتِ انسانی:

میکاویلی کے نزدیک انسان فطری طور پر حریص، خودغرض، انا پرست اور بزدل ہے۔ وہ با مقصد کام صرف اس وقت کرتا ہے جب وہ اسے اپنے مفاد کے لیے بہتر سمجھتا ہے۔ میکاویلی کا خیال ہے کہ انسان دولت اکٹھی کرنے کی کوشش میں مصروف رہتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان خودغرضی اور اَنا دو قوتوں کا مجموعہ ہے۔ وہ نیکی کی طرف صرف اس وقت مائل ہوتا ہے جب نیکی سے اس کا کوئی ذاتی مفاد وابستہ ہو۔

فرد کی بے وقعتی:

فسطائیت جماعت، گروہ یا قوم کی قائل ہے۔ اس نظریہ کے تحت فرد کو اجتماع میں فہم ہو جانا چاہیے، کیونکہ اس کی قدر و منزلت جماعت ہی کی بدولت ہے۔ یہ نظریہ اس بات کا خواہاں ہے کہ فرد کو اپنی زندگی ریاست کے لیے قربان کر دینی چاہیے۔

فسطائیت کی خوبیاں:

فسطائیت حسب ذیل خوبیوں کی حامل ہے:

1- فسطائیت سودی کاروبار کو جائز قرار نہیں دیتی۔ اس نظریہ کے مطابق سُود معاشی ترقی میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

2- فسطائیت میں نجی جائیداد رکھنے کی اجازت ہے۔ اس نظریہ کے مطابق ہر شخص کوئی بھی کاروبار کر کے اپنے لیے جائیداد خرید سکتا ہے اور اسے جس طرح چاہے استعمال کر سکتا ہے، وہ اسے فروخت بھی کر سکتا ہے اور وصیت کے ذریعے کسی دوسرے کے نام منتقل بھی کر سکتا ہے۔

3- فسطائیت گردشِ زر کی قائل ہے اور تقسیم دولت کی ناہمواریوں کو ختم کرنا چاہتی ہے۔
4- فسطائیت میں کاروباری سلسلہ میں آجر اور اجیر کے حقوق و فرائض متعین شدہ ہیں تاکہ ایک دوسرے کے حقوق میں مداخلت نہ کی جائے۔
5- فسطائیت میں "سوشل انشورنس" کے نام سے ایک پروگرام متعارف کرایا گیا جس کا مقصد معذور، اپاہج، بیمار اور بوڑھوں کی مدد کرنا تھا۔
6- فسطائیت میں معاشی وسائل کو بہتر بنانے کے لیے تنظیم کی ضرورت پر زور دیا گیا ہے۔

فسطائیت کی خامیاں:

فسطائیت میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی جاتی ہیں:

1- فسطائیت میں فسطائی نظریہ کی بے چوں وچرا اطاعت کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ کوئی بھی فرد اپنی مرضی کے مطابق کوئی کام نہیں کر سکتا۔ اس میں کوئی عقلی دلیل اور مشورہ قبول نہیں کیا جاتا۔
2- اس نظریہ میں انسانی جذبات کو برانگیختہ کیا جاتا ہے اور کوئی ٹھوس دلیل نہیں دی جاتی۔
3- اس میں شخصی آزادی کو سلب کر لیا گیا ہے۔
4- یہ نظریہ آمریت پر مبنی ہے۔ برسر اقتدار پارٹی کی کسی بھی بات سے اختلاف کرنا جرم قرار پاتا ہے۔
5- اس نظریہ میں جنگ کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور امن عالم کو کوئی وقعت نہیں دی گئی۔ اس نظریہ کے مطابق امن ایک فضول سی چیز ہے۔
6- یہ نظریہ ایک انتہائی طاقتور مملکت و ریاست کے قیام کا خواہشمند ہے، جو پوری دنیا پر غالب و فائق ہو۔
7- یہ نظریہ بین الاقوامیت کو تسلیم نہیں کرتا اور عالم انسانیت کو ایک بے حقیقت چیز تصور کرتا ہے۔

فسطائیت اور اسلامی نظام معیشت کا موازنہ:

ذیل میں فسطائیت اور اسلام نظام معیشت کا موازنہ کیا جا رہا ہے:

1- اسلامی نظام معیشت ایک خدائی اور الہامی نظام ہے، جبکہ فسطائیت چند بدنام زمانہ جابرین کا وضع کردہ نظام ہے۔
2- اسلامی نظام معیشت میں صرف خدا کی اطاعت فرض ہے۔ اس میں خلیفہ، امام یا اولی الامر کی اطاعت بطور نائب کی جاتی ہے۔ اگر خلیفہ یا اولی الامر معصیت کا حکم دے تو اس کی اطاعت سے انکار کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس فسطائیت میں پارٹی کی اطاعت بے چوں وچرا کی جاتی ہے، خواہ اس کا حکم جائز ہو یا ناجائز۔
3- اسلامی نظام معیشت میں مشورہ طلب کرنا احسن تسلیم کیا جاتا ہے، لیکن فسطائیت میں مشورہ کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔

4- اسلامی نظام معیشت میں انفاق فی سبیل اللہ کے تحت دوسروں کو بھی اپنے رزق میں شریک کیا جاتا ہے، جبکہ فسطائیت میں ایسا کوئی تصور وجود نہیں۔

5- اسلامی نظام معیشت میں اخلاق کو نہایت اہمیت دی گئی ہے لیکن فسطائیت میں اخلاق کو کوئی اہمیت حاصل نہیں۔

6- اسلامی معیشت کا تعلق مذہب سے ہے لیکن فسطائیت مذہب پر یقین نہیں رکھتی۔

7- اسلامی نظام معیشت کا تعلق جمہوریت (خلافت، امامت، شورائی نظام) سے ہے، لیکن فسطائیت ایک آمرانہ نظام ہے۔

8- اسلامی نظام معیشت میں حاکم کا محاسبہ و مواخذہ کیا جا سکتا ہے لیکن فسطائیت میں حاکم ہر قانون سے مستثنٰی ہے۔ اس کے خلاف ایک لفظ بھی زبان سے نہیں نکالا جا سکتا۔

9- اسلامی نظام معیشت میں عصبیت کا کوئی عمل دخل نہیں، لیکن فسطائیت میں اپنی قوم کو اہمیت دی جاتی ہے اور دوسری قوموں کو دشمن تصور کیا جاتا ہے۔

10- اسلامی نظام معیشت بین الاقوامیت کا قائل ہے، لیکن فسطائیت اس پر ایمان نہیں رکھتی۔

11- اسلامی نظام معیشت میں حرام چیزوں کو رزق کمانے کا پیشہ بنانا ممنوع ہے جبکہ فسطائیت میں حرام و حلال کی کوئی تمیز نہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

سوال: برصغیر میں معاشی نظریات کی کشمکش پر نوٹ لکھیں۔

برصغیر میں معاشی نظریات کی کشمکش

برصغیر "نظام جاگیرداری" کی گرفت میں تو پہلے دن سے تھا' پھر جوں جوں تجارت و صنعت کو فروغ دیا' نا اہل حکمران جو دور استعمار میں انگریزوں کی نوکری چاکری میں پروان چڑھے اور تقلید مغرب سے ہٹ کر کچھ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکے تھے ان کی معاشی پالیسیاں نظام سرمایہ داری کے جال میں پھانسی چلی گئیں۔ اسی کے انتہا پسندانہ ردعمل کے طور پر یہاں سوشلزم اور کمیونزم کے نعرے بھی گونجنے لگے۔ یہاں تک کہ 1970ء میں "سوشلزم" اور "اسلامی سوشلزم" کی تحریک ملک گیر طوفان کی صورت میں اٹھ کھڑی ہوئی اور سوشلزم جو اس وقت تک افغانستان کے حکمرانوں کو اپنی گرفت میں لے چکا تھا برصغیر کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں پر بھی دستک دینے لگا تھا۔

برصغیر میں نظام سرمایہ داری نے ایک انتہاء کو اپنایا تھا کہ نجی ملکیت کو اتنا بے لگام کر دیا کہ سرمایہ داروں کو دین و اخلاق کی ہر بندش سے آزاد کر کے عوام اور مفلوک الحال غریبوں کا خون چوسنے کی کھلی چھوٹ دی۔ سوشلزم نے دوسری انتہاء پر پہنچا کر سرے سے نجی ملکیت پر ہی "ہتھوڑا اور درانتی" چلا دی جو نجی ملکیت کے ساتھ لاکھوں کروڑوں انسانوں کی زندگی ہی کا صفایا کرتی چلی گئی۔

آج کے پرفتن دور میں اسلامی تحریکیں، مذہبی حلقے اور دینی فکر رکھنے والے افراد مختلف قسم کے فتنوں سے نبرد آزما ہیں ایک طرف مسلمانوں میں بڑھتی ہوئی بے دینی اور مادیت پرستی ہے تو دوسری طرف شرک و بدعت کا سیلاب ہے مسلم اقلیتوں سے ناروا سلوک اور مسلمان ممالک پہ کافروں کی یلغار الگ سے پریشانی کا باعث ہے۔ برصغیر میں اسلامائزیشن کی کوششیں اور سیکولر ازم' اشتراکیت و کمیونزم کے معاشی نظریات اسلام کی کشمکش بھی ایک اہم دینی محاذ ہے۔

برصغیر کے علماء اور مفکرین نے ان دونوں نظاموں کی تباہ کاریوں کو جان لیا تھا۔ یہی وجہ تھی انہوں نے ان نظاموں کے اسلامی نظام رائج کرنے اور اس کی خوبیوں کو بیان کرنے میں حتی المقدور سعی کی علاوہ ازیں اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بھرپور مزاحمت کی اور اس کی تباہ کاریوں کے متعلق عوامی شعور اجاگر کرنے میں ہر ممکن اقدامات اٹھائے۔

نظام سرمایہ داری کا سرسری جائزہ:

صاف اور سادہ لفظوں میں سرمایہ دارانہ نظام اس نظریہ کی بنیاد پر استوار ہے کہ ہر شخص تن تنہا اس مال کا مالک ہے جو اس نے کمایا ہے۔ کوئی اسکی کمائی میں کسی قسم کا کوئی حق نہیں رکھتا۔ وہ اس بات کا اختیار کامل رکھتا ہے کہ اپنا مال جس طرح چاہے استعمال یا خرچ کرے۔ جتنے بھی مالی وسائل اس کو حاصل ہوں وہ انہیں روک کر رکھے اور اپنے لیے کوئی فائدہ حاصل کیے بغیر انہیں خرچ کرنے سے انکاری ہو جائے۔ دراصل یہ نظریہ اس خود غرضی سے آغاز پکڑتا ہے جو انسانی فطرت میں موجود ہے اور بالآخر اس انتہائی خود غرضی تک پہنچ جاتا ہے جو انسان

کی جملہ ان خوبیوں کو مٹا دیتی ہے یا دبا دیتی ہے جن کی موجودگی انسانوں کی فلاح و ترقی کے لیے ناگزیر ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ سرمایہ داری کے بنیادی نظریہ کی صراحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر اخلاقی نقطہ نظر کو چھوڑ کر خالص معاشی نقطہ نظر سے بھی دیکھا جائے تو اس نظریہ کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تقسیم ثروت کا توازن بگڑ جائے' وسائل ثروت رفتہ رفتہ سمٹ کر ایک زیادہ خوش قسمت یا زیادہ ہوشیار طبقہ کے پاس جمع ہو جائیں' اور سوسائٹی عملاً دو طبقوں میں تقسیم ہو جائے۔ ایک مال دار اور دوسرا نادار۔ مالدار طبقہ تمام وسائل ثروت پر قابض و متصرف ہو کر ان کو محض اپنی ذاتی مفاد کے لیے استعمال کرے اور اپنی دولت کو زیادہ سے زیادہ بڑھانے کی کوشش میں سوسائٹی کے مجموعی مفاد کو جس طرح چاہے قربان کر دے۔ رہا نادار طبقہ تو اس کے لیے وسائل ثروت میں سے حصے پانے کا کوئی موقعہ نہ ہوا لا یہ کہ وہ سرمایہ دار کے مفاد کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر کے زندگی بسر کرنے کا کم سے کم سامان حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظامِ معیشت ایک طرف ساہوکار' کارخانہ دار' اور زمیندار پیدا کرے گا اور دوسری طرف مزدور' کسان اور قرضدار۔ ایسے نظام کی عین فطرت اس کی متقضی ہے کہ سوسائٹی میں ہمدردی اور امداد باہمی کی سپرٹ مفقود ہو۔ ہر شخص بالکلیہ اپنے ذاتی وسائل سے زندگی بسر کرنے پر مجبور ہو۔ کوئی کسی کا یار و مددگار نہ ہو محتاج کے لیے معیشت کا دائرہ تنگ ہو جائے۔"

سید مودودیؒ مزید لکھتے ہیں:

سرمایہ داری کے اس نظام میں ناگزیر ہے کہ لوگوں کا میلان روپیہ جمع کرنے کی طرف ہو اور وہ اس کو صرف نفع بخش اغراض کے لیے استعمال کرنے کی سعی کریں۔ مشترک سرمایہ کی کمپنیاں بنائی جائیں' امداد باہمی کی جمعیتیں مرتب کی جائیں اور ان تمام مختلف معاشی تدبیروں میں ایک ہی روح کام کرے' یعنی روپے سے مزید روپیہ پیدا کرنا' خواہ وہ تجارتی لین دین کے ذریعہ سے ہو یا سود کے ذریعہ سے۔ سرمایہ داری کے نقطہ نظر سے سود اور تجارتی لین دین کے درمیان کوئی جوہری فرق نہیں ہے۔ اس لیے نظام سرمایہ داری میں یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ نہ صرف خلط ملط ہو جاتے ہیں' بلکہ کاروبار کی ساخت میں ان کی حیثیت تانے بانے کی سی ہوتی ہے۔ ان کے ہاں تجارت کے لیے سود اور سود کے لیے تجارت لازم و ملزوم ہیں' کسی کو دوسرے کے بغیر فروغ نہیں ہو سکتا۔ سود نہ ہو تو سرمایہ داری کا تار و پود بکھر جائے۔"

(سود: سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ۔ صفحہ 20,19 مطبوعہ اسلامی پبلیکیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور)

نظام سرمایہ داری کے معایب پر محمد محترم فہیم عثمانی خامہ فرسائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"نظام سرمایہ داری کے نتیجے میں انسانی معیشت جس فساد کا شکار ہے' وہ محتاج بیان نہیں۔ جاگیردارانہ نظام کی اصلاح کی خاطر جس نظامِ معاش کو انسان کی محدود عقل نے اپنی نجات کا راستہ سمجھا تھا' وہ مکمل طور پر ناکام ہو چکا ہے۔ اب اس کی ایک ایک خامی پوری طرح کھل کر دنیا کی نگاہوں کے سامنے آ چکی ہے۔ بے لگام انفرادی ملکیت کی کھلی آزادی اور ارتقائے معیشت

کے فطری اسباب پر بے جا اعتماد نے معیشت انسانی کی جڑیں کھوکھلی کر کے رکھ دی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کی بے قید معیشت کے مبالغہ آمیز اصولوں نے انسان کو تباہی کے غار پر لا کھڑا کیا ہے اور انسان ایک بار پھر نجات کی کسی نئی راہ کی تلاش میں ہے۔ مگر ستم یہ ہے کہ اس بار پھر اسی غلطی کا اعادہ کرنے لگا ہے جو نظام جاگیرداری سے پیچھا چھڑانے کے سلسلہ میں وہ اس سے پہلے کر چکا ہے۔ وہ اک بار پھر اپنی محدود اور ناقص عقل پر اعتماد کر کے ایک ایسے نظام کو تجربہ کی سان پر چڑھانے لگا ہے جس کا نقص اور جس کے مضر نتائج ابتداء ہی سے روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ دراصل جو نظام فساد سرمایہ داری کی اصل وجہ ہی نہ پہچان سکے وہ اس کی اصلاح کیا کرے گا۔"

محمد محترم فہیم عثمانی مزید لکھتے ہیں:

"سرمایہ داری کی تمام تر خرابیوں کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس نے انفرادی ملکیت اور اس کے حصول کی کوششوں کے سلسلہ میں اچھے اور برے کی کوئی تمیز نہیں رکھی۔ اس نے شخصی آزادی کا ایک مبالغہ آمیز تصور اختیار کرتے ہوئے قطعاً اس بات کا خیال نہ رکھا کہ اس آزادی فرد کے نتیجے میں اجتماع کا مفاد مجروح نہ ہو۔ اس نے افراد کو کھلی چھٹی دے دی کہ وہ جس طرح چاہیں دولت کمائیں اور اس کے جائز مالک بن جائیں۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرمایہ دار اپنے بدنام مفہوم میں سرمایہ دار بنتا ہی ناجائز ذرائع سے ہے۔ اگر آج سود کا کاروبار بند کر دیا جائے' اتلاف مال کو ممنوع ٹھہرا دیا جائے' غائب سودے اور تجارتی قمار بازی کو سرے سے ختم کر دیا جائے۔ Trade Cycle (کاروبار کا چکر) کے نام پر جو مصنوعی کساد بازاری ہر سال ارادتاً پیدا کی جاتی ہے۔ اس کی قانونی طور پر روک تھام کی جائے۔ اسی طرح دولت کمانے کے دیگر وہ تمام ذرائع جو اجتماعی مفاد کے لیے نقصان دہ ہیں حکماً مسدود کر دیے جائیں تو ہزار کوششوں کے باوجود کوئی ایک شخص بھی اس قدر دولت مند نہیں ہو سکتا کہ اس پر سرمایہ دار کے مفہوم کا اطلاق ہو سکے۔"

(اسلامی معیشت کے چند نمایاں پہلو: محمد محترم فہیم عثمانی' صفحہ 12 تا 15'
اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور)

سید قطب شہیدؒ نے نظامِ سرمایہ داری پر ان الفاظ میں تنقید کی ہے:

"میں ان موجودہ اجتماعی نظاموں پر الزام لگاتا ہوں کہ وہ قوم کی عملی اور پیداوارانہ قوتوں کو بیکار کر دیتے ہیں۔ ان سے امت میں بیکاری اور نکھٹو پن پیدا ہوتا ہے۔ وہ جماعت کو فطری اور انسانی ذرائع و وسائل کو کام میں لانے سے روکتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم روز افزوں داخلی و خارجی خطرات کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہو جاتی ہے۔

ہماری سرزمین سے جس قدر غلہ پیدا ہوتا ہے وہ اس سے کئی گنا زیادہ پیدا کرنے کی طاقت رکھتی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ اس کا باعث زمین کی غلط تقسیم ہے۔ جاگیرداری کے

تاریک ترین دور میں زمین کی تقسیم کا جو قاعدہ تھا وہ اب بھی موجود ہے۔ وہ چند ہاتھوں میں رکی پڑی ہے جو نہ خود اس سے پوری پیداوار حاصل کرتے ہیں اور نہ ان بے زمین کاشت کاروں کو ایسا کرنے دیتے ہیں جو زیادہ غلہ اُگانے پر قادر ہیں۔ زمین کو اس بیکار زمینداری سے آزاد کرو اور ان کے ہاتھوں کے سپرد کرو جنہیں کرنے کا کوئی کام نہیں مل رہا۔ تب حالت یقیناً مختلف ہو جائے گی۔

قابل زراعت زمین بھی کئی گناہ بڑھ سکتی ہے' لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا؟ اس لیے کہ آب پاشی کے ذرائع بیکار پڑے ہیں۔ تم پوچھو گے کہ یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہ ذرائع مال و دولت کے محتاج ہیں اور وہ سرمایہ داروں کے قبضے میں ہے' اور حکومت سرمایہ داروں پر اس کے واجبی حصے کا بوجھ ڈالنے سے ڈرتی ہے۔ سوال ہو گا کہ ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ حکومت حاجت مند عوام کی نمائندہ نہیں بلکہ سرمایہ داروں کی نمائندہ ہے۔ فیصلے کی کنجیاں حقیقی عوام کے سپرد کرو۔ پھر عوام جائز ٹیکسوں کے نتیجے میں اپنے خزانے میں اتنی سکت پالیں گے کہ ایک معقول مدت کے اندر بنجر اور بیکار زمینوں کو آباد کر سکیں۔"

(معرکۂ اسلام اور سرمایہ داری: سید قطب شہیدؒ صفحہ 45۔ ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور' مترجم میاں منظور احمد ایم اے)

سید قطب شہیدؒ سرمایہ دارانہ نظام پر تنقید کرتے ہوئے مزید لکھتے ہیں:

"یہ تو مسلّم ہے کہ فقر و فاقہ سرمایہ داری کے آگے یوں ٹک نہیں سکتا۔ مال کا مقابلہ تو مال ہی کر سکتا ہے۔ وہ مصلحت جو سرمایہ داری میں مشترک ہوتی ہے وہی مقابلے کے قوت پیدا کرتی ہے۔ عوام کے حقوق و مصالح کے سامنے یہی گٹھ جوڑ کھڑا ہو جاتا ہے' عوام بے چارے کمزور ہوتے ہیں۔ مقابلے میں انہیں اپنی جانیں بچانے کو بھی کچھ میسر نہیں آتا۔ ان کے پاس تو بیداری اور ہوشیاری کی قوت بھی نہیں ہوتی۔"

(معرکۂ اسلام اور سرمایہ داری' سید قطب شہیدؒ "صفحہ 52)

نظامِ اشتراکی کی حقیقتیں:

سرمایہ داری کے مقابلے میں اشتراکی نظام ہے جس کی اساس اس تصور پر ہے کہ تمام مالی وسائل معاشرہ کے درمیان مشترک ہیں' لہٰذا افراد کو فرداً فرداً ان پر قبضہ کرنے اور ان کے منافع سے مستفید ہونے کا کوئی حق اور اختیار نہیں ہے۔ اشخاص کو محض ان کی خدمات کا معاوضہ ملے گا جو وہ معاشرہ کے مشترک مفاد کے لیے انجام دیں گے۔ معاشرہ انہیں ضروریات زندگی کا انتظام کرے گا اور وہ اس کے عوض کام کریں گے۔ یہ نظریہ سرمایہ داری نظام سے مختلف ہے۔ اشتراکی تنظیم معیشت میں ملکیت شخصی کا یکسر وجود نہیں ہے۔ یہاں اصول اور نظریہ میں اختلاف ہو گیا ہے اس لیے مناہج بھی تبدیل ہو چکے ہیں۔ نظام سرمایہ داری کا کارخانہ بنکاری' انشورنس' جائنٹ سٹاک کمپنیز اور اسی طرح کے دیگر اداروں کے بغیر نہیں چل سکتا۔ مگر اشتراکیت (کمیونزم) کی ساخت اور اس کے معاشی امور میں اداروں کی کوئی گنجائش اور ضرورت نہیں ہے۔

اشتراکیت اور سرمایہ داری کا تقابلی جائزہ لیتے ہوئے سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"اشتراکیت اور سرمایہ داری ایک دوسرے کے خلاف دو انتہائی نقطوں پر ہیں۔ سرمایہ داری افراد کو ان کے فطری حقوق ضرور دیتی ہے مگر اس کے اصول ونظریات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو افراد کو جماعت کے مشترک مفاد کی خدمت کے لیے آمادہ کرنے والی اور تا بحد ضرورت اس پر مجبور کرنے والی ہو۔ بلکہ درحقیقت وہ افراد میں ایک ایسی خود غرضانہ ذہنیت پیدا کرتی ہے جس سے ہر شخص اپنے شخصی مفاد کے لیے جماعت کے خلاف عملاً جنگ کرتا ہے اور اس جنگ کی بدولت تقسیم ثروت کا توازن بالکل بگڑ جاتا ہے۔ ایک طرف چند خوش نصیب افراد پوری جماعت کے وسائل ثروت کو سمیٹ کر لکھ پتی اور کروڑ پتی بن جاتے ہیں اور اپنے سرمایہ کی قوت سے مزید دولت کھینچتے چلے جاتے ہیں۔ دوسری طرف جمہور کی معاشی حالت خراب سے خراب تر ہوتی چلی جاتی ہے اور دولت کی تقسیم میں ان کا حصہ گھٹتے گھٹتے بمنزلہ صفر رہ جاتا ہے۔ ابتداء میں سرمایہ داروں کی دولت اپنے شاندار مظاہر سے تمدن میں ایک دلفریب چمک دمک تو ضرور پیدا کردیتی ہے مگر دولت کی غیر متوازن تقسیم کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ معاشی دنیا کے جسم میں دوران خون بند ہوجاتا ہے' جسم کے اکثر حصے قلتِ خون کی وجہ سے سوکھ کر تباہ ہوتے ہیں اور اعضاء رئیسہ کو خون کا غیر معمولی اجتماع تباہ کر دیتا ہے۔"

سید مودودیؒ آگے لکھتے ہیں:

"اشتراکیت اس خرابی کا علاج کرنا چاہتی ہے مگر وہ ایک صحیح مقصد کے لیے غلط راستہ اختیار کرتی ہے۔ اس کا مقصد تقسیم ثروت میں توازن قائم کرنا ہے اور یہ بلاشبہ صحیح مقصد ہے' مگر اس کے لیے وہ ذریعہ ایسا اختیار کرتی ہے جو درحقیقت انسانی فطرت سے جنگ ہے۔ افراد کو شخصی ملکیت سے محروم کر کے بالکل جماعت کا خادم بنا دینا نہ صرف معیشت کے لیے تباہ کن ہے بلکہ زیادہ وسیع پیمانے پر انسان کی پوری تمدنی زندگی کے لیے مہلک ہے۔ کیونکہ یہ چیز معاشی کاروبار اور نظامِ تمدن سے اس کی روحِ رواں' اس کی اصلی قوت محرکہ کو نکال دیتی ہے۔ تمدن ومعیشت میں انسان کو جو چیز اپنی انتہائی قوت کے ساتھ سعی وعمل کرنے پر ابھارتی ہے' وہ دراصل اس کا ذاتی مفاد ہے۔ یہ انسان کی فطری خود غرضی ہے جس کو کوئی منطق اس کے دل ودماغ کے رشتوں سے نہیں نکال سکتی...... یہ تو اشتراکی نظام کا باطنی پہلو ہے۔ اس کا خارجی اور عملی پہلو یہ ہے کہ وہ سرمایہ دار افراد کا خاتمہ کر کے ایک بہت بڑے سرمایہ دار کو وجود میں لاتا ہے یعنی اشتراکی حکومت۔ یہ بڑا سرمایہ دار لطیف انسانی جذبات کی اس اقل قلیل مقدار سے بھی خالی ہوتا ہے جو سرمایہ دار افراد میں پائی جاتی ہے۔ وہ بالکل ایک مشین کی طرح پورے استبداد کے ساتھ ان کے درمیان اسبابِ حیات تقسیم کرتا ہے۔ اس کے پاس نہ ہمدردی ہے' نہ قدر واعتراف۔ وہ انسانوں سے انسانوں کی طرح کام نہیں لیتا بلکہ مشین کے کل پرزوں کی طرح کام لیتا ہے' اور ان سے فکر ورائے اور عمل کی آزادی بالکل سلب کر لیتا ہے۔ اس شدید استبداد کے بغیر نظامِ اشتراکی نہ قائم ہوسکتا ہے' نہ قائم رہ سکتا ہے

کیونکہ افراد کی فطرت اس نظام کے خلاف ہر وقت آمادۂ بغاوت رہتی ہے۔"

(شو ٔسید مودودیؒ صفحہ 21 تا 23)

سید قطب شہیدؒ نے نظامِ اشتراکی کا مذہبی لحاظ سے محاسبہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

"اشتراکیت ایک ایسی دعوت ہے جس نے مذہبی لوگوں کا ہر طرح سے موازنہ کیا ہے۔ وہ قیصروں کی حکومت کو تہس نہس کرنے اور عوام کو ضروریات زندگی مہیا کرنے کی خاطر لڑتی ہے جن سے وہ پہلے محروم تھے .... یہ ایک فلسفی نظریہ ہے۔ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اس زندگی کو چلانے میں کوئی مؤثر قوت ہو جو اس کے مادے سے باہر ہو۔ گویا یہ اولین لحظے سے کسی خدا کی موجودگی کا منکر ہے' ایسا خدا جس کی مثل اس زندگی میں کوئی چیز نہیں .... اس نظریئے کی رو سے تمام انسانی تاریخ میں مؤثر قوت فقط عملی مادہ ہے' پس وہ اولین لحظے سے ہی پیغمبروں اور وحی کا منکر ہے ...... اس نظریے نے تاریخ کی مادی تعبیر کا مذہب اختیار کیا ہے' لہٰذا یہ اولین لحظے سے اس چیز سے منکر ہے کہ افراد ...... رسول ہوں یا دوسرے ہیرو ...... کا معاشرے کے اتار چڑھاؤ میں کوئی مثبت حصہ ہو ...... باوجودیکہ اس میں معاشی نقطۂ نگاہ سے اسلامی نظام کے ساتھ بہت سی موافقت بھی پائی جاتی ہی لیکن کائنات' زندگی اور انسان کے متعلق وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات کے قطعی خلاف ہے' اور اس فکری بنیادی اختلاف کی وجہ سے وہ اسلام کے ساتھ شدید عداوت رکھتا ہے۔"

(معرکۂ اسلام اور سرمایہ داری' سید قطب شہیدؒ ' مترجم میاں منظور احمد ایم اے' صفحہ 179 ' ادارہ ترجمان القرآن لاہور)

نظامِ اشتراکی اسلام کے ساتھ شدید عداوت رکھتا ہے۔ بقول سید قطب شہیدؒ:

"اشتراکیت اپنے آپ کو جنگ اور مقابلے کے مرحلے میں شمار کرتی ہے۔ سو ہر وہ عقیدہ جس میں روح کا کوئی ذکر اور اللہ کو کوئی مقام حاصل ہے اشتراکیت اسے اپنا دشمن شمار کرتی ہے۔ اگرچہ اشتراکیت میں اور اس عقیدے میں معاشی پہلو میں بہت سی مشابہتیں بھی موجود ہوں بلکہ اشتراکیت اسلام کے ساتھ مسیحیت سے بھی زیادہ عداوت رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ مسیحیت کو اپنے راستے میں کوئی مثبت طاقت شمار نہیں کرتی اور اسلام معاشی اجتماعی عدل کو قائم کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک طرف تو اسے عقیدے میں خدا پر بھروسہ ہے اور دوسری طرف زندگی میں روحانیت پر اعتماد ہے۔ اسلام کی یہ خصوصیت اشتراکی دعوت کے لیے ایک عظیم خطرہ ہے کیونکہ وہ صرف اجتماعی احوال کی خرابی پر اعتماد کرتی ہے تاکہ عوام اشتراکیت کے سوا عدل و انصاف کے ہر راستے سے مایوس ہو جائیں اور اس کی راہ ہموار ہو سکے۔"

(معرکۂ اسلام اور سرمایہ داری' سید قطب شہیدؒ ' مترجم میاں منظور احمد۔ صفحہ 179, 180)

واضح رہے کہ سوشلزم اور کمیونزم (اشتراکیت) میں فرق صرف طریق کار کا ہے۔ رہا یہ اصول کہ ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنا دیا جائے' تو وہ دونوں میں مشترک ہے۔ سوشلزم کا نظریہ سماجی و معاشی انصاف کی وہ جدوجہد ہے جو انفرادی ملکیت کے پیدا کردہ مسائل کے خلاف کی گئی۔ یہ بنیادی طور پر ایک ایسا معاشی نظریہ ہے

جو تمام ذرائع پیداوار کو اجتماعی ملکیت میں لے کر دولت کی مساویانہ تقسیم پر یقین رکھتا ہے۔ بیسویں صدی میں مختلف ممالک میں مختلف اشتراکی نظریات پائے گئے حالانکہ وہ سب بنیادی طور پر مارکس کی تعلیمات سے متاثر ہیں۔ مارکسزم کو روس اور چین میں نئے حالات سے ہم آہنگ کر کے نافذ کیا گیا۔ جبکہ انگلستان میں اشتراکی تحریکیں جمہوری اصولوں پر استوار کی گئیں۔ فیبیزیم (Fabianism)' گلڈ سوشلزم اور لیبر پارٹی کی پالیسی اس کا بین ثبوت ہے۔ فرانس میں سینڈیکلوم کے نظریہ کے تحت اشتراکیت (سوشلزم) کا ایک مختلف روپ اجاگر ہوا۔ مزید برآں کہیں ''عرب سوشلزم'' کا نعرہ بلند کیا گیا تو کہیں نام نہاد ''اسلامی سوشلزم'' کی آڑ میں اشتراکی (سوشلسٹ) نظریات کا پرچار کیا گیا۔

سوشلزم سے مراد ایسا نظام ہے جس میں فرد کے ذاتی مفادات کو معاشرے کے اعلیٰ مجموعی مفادات کے تابع کر دیا جاتا ہے۔ اس کا مقصد انصاف' رواداری' آزادی اور مساوات کا قیام ہے اور ایسے اقدامات کرنا تاکہ معاشرتی بہبود میں اضافہ ہو۔ سوشلزم کی بنیادی خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

(i) یہ نظام سرمایہ دارانہ نظام کی خرابیوں کی اصلاح کے لیے وجود میں آیا۔

(ii) یہ نظام انفرادیت کی ضد ہے جس کی اساس آزاد مقابلہ پر ہے۔

(iii) اس نظام میں فرد کے مقاصد کو معاشرے کے مقاصد کے ماتحت کر دیا جاتا ہے یعنی اس میں اصل اہمیت معاشرے کو حاصل ہے۔

(iv) اس نظام میں معاشی عنصر کو انسانی زندگی میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔ مذہبی' سیاسی' سماجی اور ثقافتی عناصر ذیلی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوشلزم دراصل مندرجہ ذیل چھ اصولوں کا نام ہے۔

(i) معاشرہ کی اہمیت اور برتری (ii) انسانی حالات کی مساویانہ حیثیت

(iii) سرمایہ داری کا خاتمہ (iv) زمیندار کا انخلاء

(v) نجی کاروبار کا خاتمہ (vi) مقابلہ بازی اور مسابقت کا خاتمہ

نظامِ اسلامی کی صراحت:

اسلام سرمایہ داری اور اشتراکیت جیسے معاشی نظاموں کے درمیان ایک معتدل نظام قائم کرتا ہے۔ جس کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فرد کو اس کے پورے پورے شخصی و فطری حقوق بھی دیے جائیں اور اس کے ساتھ تقسیم ثروت کا توازن بھی برقرار رہے۔ ایک جانب وہ فرد کو شخصی ملکیت کا حق اور اپنے مال سے بھرپور طور پر مستفید ہونے کا اختیار دیتا ہے اور دوسری جانب وہ ان تمام حقوق اور اختیارات پر باطن کی راہ سے کچھ اخلاقی بندشیں اور ظاہر کے راستے کچھ ایسی قانونی حدود و قیود نافذ کر دیتا ہے جن کا مقصد یہ ہے کہ کسی جگہ مالی وسائل غیر معمولی طور پر جمع نہ ہو سکیں' دولت اور اس کے وسائل ہمیشہ گردش میں رہیں اور اس گردش دولت کی وجہ سے جامعت کے ہر فرد کو اس کا متناسب حصہ مل سکے۔ اس غرض کے واسطے اسلام نے معیشت کی تنظیم ایک اور طریقہ پر کی ہے جو اپنی روح' اپنے اصول اور اپنے انداز کے لحاظ سے سرمایہ داری اور اشتراکیت (سوشلزم) دونوں سے

مختلف ہے۔ نظام اسلامی کی صراحت سید مودودیؒ نے ان الفاظ میں کی ہے:

"اس نظریئے پر جس نظمِ معیشت کی بنیاد رکھی گئی ہے اس کا مقصد نہ تو یہ ہے کہ چند افراد کروڑ پتی بن جائیں اور باقی تمام لوگ فاقے کریں' اور نہ اس کا مقصد یہ ہے کہ کوئی کروڑ پتی نہ بن سکے اور جبراً سب کو ان کے فطری تفاوت کے باوجود ایک حال میں کر دیا جائے۔ ان دونوں انتہاؤں کے بین بین اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ جماعت کے تمام افراد کی معاشی ضروریات پوری ہوں۔ اگر ہر شخص دوسروں کو نقصان پہنچائے بغیر اپنی فطری حد کے اندر رہ کر اکتساب مال کی کوشش کرے اور پھر اپنے کمائے ہوئے مال کو خرچ کرنے میں کفایت شعاری اور امداد باہمی کو ملحوظ رکھے تو سوسائٹی میں وہ معاشی ناہمواری پیدا نہیں ہو سکتی جو سرمایہ داری کے نظام میں پائی جاتی ہے۔ کیونکہ اس قسم کا طرز معیشت اگرچہ کسی کو کروڑ پتی بننے سے نہیں روکتا' مگر اس کے ماتحت یہ بھی ناممکن ہے کہ کسی کروڑ پتی کی دولت اس کے ہزاروں ابنائے نوع کی فاقہ کشی کا نتیجہ ہو۔ دوسری طرف یہ طرز معیشت تمام افراد کو خدا کی پیدا کی ہوئی دولت میں سے حصہ ضرور دلانا چاہتی ہے' مگر ایسی مصنوعی بندشیں لگانا جائز نہیں رکھتا جس کی وجہ سے کوئی شخص اپنی قوت و قابلیت کے مطابق اکتساب مال نہ کر سکتا ہو" (سود: سید مودودیؒ صفحہ 25)

چوہدری افضل حق لکھتے ہیں:

"اسلام دنیا میں عادلانہ اور مساویانہ نظام حکومت پیش کرتا ہے' وہ سرمائے کو سوائے بیت المال کے اشخاص کے ہاتھ میں اکٹھا دیکھنا نہیں چاہتا' اس لیے سود اور جمع زر کی ممانعت اور مذمت کی گئی ہے۔ سونے کے کٹورے میں آب زمزم ڈال دیں' اگر پیندے میں چھید ہو گا تو پانی سارا بہہ جائے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اسلام چھدا ہوا برتن ہے۔ اگر سونے چاندی کے پہاڑ بھی مسلمانوں کے حوالے کر دیے جائیں تو وہ بھی ایک دن افلاس کی موجودہ حالت کو پہنچ جائیں گے......... پختہ رائے یہی ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام میں مسلمان ہمیشہ ماہیٔ بے آب اور طائرِ بے ہوا رہے گا۔ وہ صرف ایسے نظام حکومت میں آسودہ رہ سکتا ہے جو کامل اقتصادی بنیادوں پر قائم ہو' اگر چودہ سو سال پہلے غریبوں کو حکومت پر حاوی کرنے والے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے درمیان آ جائیں تو پھر یقیناً دنیا کے موجودہ سرمایہ دارانہ نظام کو درہم برہم کرنے میں اپنی جوانی کی ساری بہاریں قربان کر دے اور تمام امور میں خلفیہ اور اعمال حکومت اور رعایا کے حقوق یکساں کر دے کیونکہ مساوی نظام کے بغیر عدل قائم ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر اس نقطہ کو وہ نہیں سمجھ سکتے جنہوں نے مفلسی کا بھیانک نظارہ اپنے گھر میں نہیں دیکھا' بھوک سے بے تاب بیوی کی بے تاب نگاہوں کا جائزہ نہیں لیا۔ افلاس زدہ اولاد کے غمگین چہروں پر نگاہ نہیں کی' پس وہ عبادت کھرا سونا ہے جو دل میں مخلوق خدا کے لیے رحم پیدا کرے اور پھر خدمت کے لیے بے پناہ جذبے کی تحریک کرے........." (دین اسلام: چوہدری افضل حق' صفحہ 203 تا 207)

سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

''اسلام ایک ایسی قوی حجت ہے کہ استحصالی سرمایہ داری اسے یوں نہ ہٹا سکے گی جس طرح وہ کمیونزم کو پرے ہٹا دیتی ہے' وہ لوگ جو عدل اجتماعی کی طرف دعوت دینے میں وطن اور معاشرے کے لیے مخلص ہیں' جو عدل اجتماعی کو اس کی ذات کی خاطر چاہتے ہیں۔ وہ ان کا حقیقی مقصود ہے۔ وہ عوام کو بھڑکانے کے لیے صرف ایک پردہ نہیں بناتے تاکہ ایک خاص مسلک کو پھیلائیں..... کہ ان کی اصل غرض تو وہ مسلک ہے اور عدل اجتماعی محض ایک وسیلہ ہے!..... سو ایسے لوگ اسلامی عقیدے جیسے مضبوط ہتھیار سے کبھی غافل نہیں رہ سکتے۔ یہ ہتھیار ہمارے ہاتھوں میں موجود ہے۔ دلوں میں جاگزیں ہے اس کے نام پر دعوت دی جائے تو مانی جاتی ہے' اس کے نام پر جذبات کو ابھارا جائے تو وہ متحرک و مشتعل ہو جاتے ہیں۔

جو لوگ عدل اجتماعی کے معرکہ سے اسلام کو الگ رکھنا چاہتے ہیں تاکہ وہ اس میں اشتراکیت کے جھنڈے تلے داخل ہوں۔ اگر وہ دعوائے عدل میں مخلص ہیں تو اپنے آپ سے خیانت کے مرتکب ہو رہے ہیں' یا پھر وہ عوامی قضیے سے خیانت کر رہے ہیں' وہ نہیں جانتے کہ اسلام انہیں کتنی بڑی قوت بہم پہنچاتا ہے' یا وہ اس عظیم قوت سے پوشیدہ عداوت رکھتے ہیں' یا پھر اپنے آپ کو حقیر جانتے ہیں اور اپنی قدر و قیمت سے منکر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غلاموں کی مانند دستر خوانوں کے ٹکڑوں پر راضی ہیں اور دوسروں کا دُم چھلا بنا رہنا پسند کرتے ہیں''

(معرکہ اسلام اور سرمایہ داری' صفحہ 86)

علم معاشیات کے ارتقاء میں مسلم مفکرین کا کردار

امام ابو یوسفؒ

سوال (1): امام ابو یوسفؒ کے مختصر حالات زندگی بیان کریں!
سوال (2): امام ابو یوسفؒ کے معاشی افکار پر روشنی ڈالیں!

نام ونسب اور پیدائش:

امام ابو یوسفؒ کا اصل نام یعقوب اور والد کا نام ابراہیم ہے۔ آپ قبیلہ بجیلہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ انصار مدینہ سے ننھیالی تعلق کی بنا پر "انصاری" کہلاتے ہیں۔ آپ 113 ہجری (مطابق 731ء) میں کوفہ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت:

امام ابو یوسفؒ نے ابتدائی تعلیم کے بعد فقہ میں مہارت تامہ حاصل کرنے پر زور دیا۔ ابتدا میں کچھ عرصہ عبدالرحمن بن ابی لیلی سے استفادہ کیا۔ آپ کے والدین غربت کے باعث آپ کی تعلیم کے اخراجات برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ امام ابو حنیفہؒ کو جب ان کی کمزور مالی حالت کا پتا چلا تو انہوں نے آپ کو اپنے پاس بلا لیا اور نہ صرف آپ کے بلکہ آپ کے گھر والوں کے مصارف کی کفالت بھی اپنے ذمہ لے لی۔ آپ نے امام ابو حنیفہؒ کے لیے دیگر جید اساتذہ سے بھی استفادہ کیا۔ یہاں تک کہ آپ نے فقہ، حدیث، تفسیر، مغازی، تاریخ عرب، لغت، علم الکلام اور ادب میں مہارت تامہ حاصل کر لی۔

تدوین فقہ حنفی:

امام ابو حنیفہؒ نے تدوین فقہ کے لیے جو فقہی کمیٹی تشکیل دی تھی امام ابو یوسفؒ اس کمیٹی کے سرگرم رکن تھے۔ اس کمیٹی کا مرتب کردہ فقہی مجموعہ "دفتر" کے نام سے موسوم ہوا۔ امام ابو حنیفہ کی وفات کے بعد امام ابو یوسفؒ نے اپنے استاد کے علمی وتعلیمی کام کو جاری رکھا اور قانون کے مختلف شعبوں سے متعلق کتب مرتب کیں، جن میں امام ابو حنیفہؒ کی فقہی مجلس کے فیصلے اور خود اپنی رائے کو باقاعدہ منضبط کیا۔ اس سے قبل کوئی دوسرا مرتب و منظم قانونی ذخیرہ موجود نہ تھا۔ آپ کی مرتب کردہ کتب جب ملک میں پھیلیں تو نہ صرف یہ کہ عام علمی حلقوں کو ... متاثر کیا بلکہ عدالتوں اور تمام سرکاری محکموں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی رائے بھی فقہ حنفی کے حق

میں ہموار ہو گئی۔

منصبِ قضاء:

امام ابو یوسفؒ عباسی خلیفہ المہدی کے دورِ حکومت میں شرقی بغداد کے قاضی مقرر ہوئے اور الہادی کے عہد میں بھی اس منصب پر فائز رہے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے آپ کو سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) مقرر کر دیا۔ اس منصب میں ان دنوں وزیر قانون کے فرائض بھی شامل تھے۔

وفات:

امام ابو یوسفؒ 182 ہجری (مطابق 798ء) میں فوت ہوئے۔ خلیفہ ہارون الرشید نے آپ کی نماز جنازہ پڑھائی۔ آپ عباسیوں کے شاہی قبرستان (بغداد) میں مدفون ہوئے۔

علمی کمالات:

امام ابو یوسفؒ کے بارے میں ان کے ہمعصروں کی رائے درج ذیل ہے:

1- آپ کے ہمعصروں نے آپ کو ثقہ قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں کوئی ان کا ہمسر نہ تھا۔

2- طلحہ بن محمد کے نزدیک، امام ابو یوسفؒ زمانے کے سب سے بڑے فقیہ تھے، کوئی ان سے بڑھ کر نہ تھا۔

3- بقول داؤد بن رشید: "اگر ابوحنیفہؒ نے صرف یہی ایک شاگرد پیدا کیا ہوتا، تو ان کے فخر کے لیے یہ بالکل کافی تھا۔"

4- آپ کے استاد امام ابوحنیفہؒ کا کہنا ہے کہ: "میرے شاگردوں میں سب سے زیادہ جس نے علم حاصل کیا ہے، وہ ابو یوسفؒ ہے۔"

5- خلیفہ ہارون الرشید کا امام ابو یوسفؒ کے بارے میں کہنا ہے کہ:

"میں نے اس شخص کو علم کے جس باب میں بھی جانچا، کامل پایا۔ اس کے ساتھ وہ ایک راست رو اور مضبوط سیرت کا آدمی ہے۔ اس جیسا کوئی دوسرا آدمی ہو تو لاؤ۔"

معاشی افکار پر مشتمل "کتاب الخراج":

"کتاب الخراج" امام ابو یوسفؒ کے معاشی افکار پر مشتمل ہے، یہ کتاب انہوں نے عباسی خلیفہ ہارون الرشید کی فرمائش پر مرتب کی۔ وہ لکھتے ہیں۔

"امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ چاہا کہ میں ان کے لیے ایک جامع کتاب تیار کروں، جس کے مطابق خراج، عشور، صدقات اور جزیوں کی تحصیل میں اور دوسرے معاملات میں عمل کیا جائے، جن کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری ان پر ہے۔ انہوں نے

کچھ امور کے متعلق سوالات بھی مجھ سے کیے ہیں، جن کا وہ تفصیلی جواب چاہتے ہیں، تاکہ آئندہ ان امور میں اس پر عمل درآمد ہو۔"

کتاب الخراج کے اہم موضوعات:

"کتاب الخراج" (مرتبہ امام ابویوسفؒ) کے اہم موضوعات درج ذیل ہیں:

1- محاصل (ٹیکس) کی اقسام
2- محصول عائد کرنے کے اصول
3- وصول شدہ محصول کی تقسیم
4- سامان تجارت پر محصول
5- زرعی زمینوں پر محصول
6- محصول ترک یا وراثت
7- محصول چونگی
8- نئے مفتوحہ علاقوں میں زرعی رقبہ کا انتظام
9- زرعی زمینداریاں، ان کی کاشت اور تقسیم
10- لگان کی شرائط
11- پانی کی فراہمی سے متعلق مسائل
12- قابل محصول اشیاء
13- ضرب محاصل
14- حکومت کے ذرائع آمدن
15- بیت المال
16- بیع سے متعلقہ احکام
17- زمینوں، چراگاہوں، چشموں، نہروں اور دریاؤں سے متعلقہ احکام
18- دیوانی اور فوجداری قوانین
19- آبپاشی
20- شاہرات
21- قیمتوں سے متعلقہ احکام
22- قوانین جنگ
23- محکمہ ڈاک و خبر رسانی

-24 بیع وشریٰ

-25 انتظامی امور

امام ابو یوسفؒ کے معاشی افکار:

ذیل میں امام ابو یوسفؒ کے معاشی افکار بیان کیے جا رہے ہیں:

-1 جزیہ یا صدقہ وغیرہ کا عامل ایسے شخص کا مقرر کیا جائے جو سیرت و کردار میں قابل اعتماد ہو۔ اسے خوشامدی نہیں ہونا چاہیے۔

-2 والی کے ساتھ ایک فوجی دستہ مقرر ہونا چاہیے جو خلیفہ کا وفادار اور قابل اعتماد ہو۔

-3 خراج اور صدقات کے محصل کا حساب علیحدہ علیحدہ ہونا چاہیے۔

-4 جن لوگوں سے جزیہ یا خراج وصول کیا جائے ان کے ساتھ نرم سلوک کیا جائے۔

-5 تحفہ، ہرکاروں کی اُجرت، کاغذات کی قیمت اور بار برداری کے اخراجات پر جو ناجائز رقمیں وصول کی جاتی ہیں، ان کی ممانعت ہونی چاہیے۔

-6 افسرانِ حکومت کے طرزِ عمل کی جانچ اور ان کے احتساب کے لیے خصوصی عملہ مقرر کیا جانا چاہیے۔

-7 سرکاری غلہ کھلیانوں میں زیادہ نہیں پڑا رہنا چاہیے، پیداوار میں سے حکومت کا حصہ وصول کرنے کے لیے پیداوار کی مقدار اندازہ کے ذریعے نہیں بلکہ ناپ تول کے ذریعے ٹھیک ٹھیک معلوم ہونی چاہیے۔ سرکاری حصہ وصول کرنے کا دوسرا طریقہ یہ ہے کہ پیداوار فروخت کر کے قیمت میں سے حکومت کا حصہ نقد وصول کر لیا جائے یا قیمت کا منصفانہ تخمینہ کرا کے اس کے مطابق حکومت کا حصہ وصول کیا جائے۔

-8 زمینوں پر معینہ ٹیکس کے بجائے متناسب ٹیکس عائد کیا جائے۔

-9 ٹیکس صرف زائد از ضرورت اموال پر عائد کیا جائے۔

-10 ٹیکس قوتِ برداشت سے زیادہ نہ لیا جائے۔

-11 ٹیکس مالداروں سے وصول کر کے غریب طبقہ پر خرچ کیا جائے۔

-12 از روئے قانون مقرر کیے ہوئے محاصل کے سوا کسی قسم کے ناجائز ٹیکس نہ حکومت اور نہ مالکانِ زمین یا اپنے عاملوں کو لینے دے۔

-13 تحصیل ٹیکس میں ظالمانہ طریقوں سے اجتناب کیا جائے۔

-14 جو ذمی مسلمان ہو جائیں ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔

-15 حکومت اس بات کی مجاز نہیں کہ کسی شخص سے زمین لے کر کسی دوسرے کو بطور جاگیر دیدے۔

-16 زمین کا عطیہ صرف اس صورت میں جائز ہے جبکہ غیر آباد اور غیر مملوکہ زمینیں یا لاوارث متروکہ اراضی

آبادکاری کی غرض کے لیے یا حقیقی اجتماعی خدمات کے صلے میں انعام کے طور پر معقول حد کے اندر دی جائیں۔ اگر مذکورہ قسم کے عطیہ میں دی گئی زمین تین سال تک آباد نہ کی جائے تو حکومت اُسے واپس لے لے۔

17- زمینداری کی وہ قسم حرام ہے جس میں حکومت کاشتکاروں سے مالگزاری وصول کرنے کے لیے ایک شخص کو ان پر زمیندار بنا کر بٹھا دیتی ہے اور اس کو عملاً یہ اختیار دے دیتی ہے کہ حکومت کا لگان ادا کرنے کے بعد باقی جو کچھ جس طرح چاہے کاشتکاروں سے وصول کرتا رہے۔

18- شریعت نے جن محاصل کو متعین شرحوں کے ساتھ نافذ کیا ہے انہیں اسی طرح وصول کیا جانا چاہیے اور ان کو شریعت کے مقرر کردہ مصارف ہی میں صرف کرنا چاہیے۔

19- نقد مال تجارت اور مویشیوں کی زکوٰۃ پر عشر اور نصف عشر اور رکاز کا خمس متعینہ اصول کے تحت وصول کیا جانا چاہیے۔

20- بیت المال خلیفہ یا بادشاہ کی ملکیت نہیں بلکہ خدا اور خلق کی امانت ہے۔

21- دریاؤں کی کھدائی اور مرمت کی ذمہ داری خلیفہ پر عائد ہوتی ہے۔ اس ضمن میں مصارف کا بار بیت المال پر ڈالا جا سکتا ہے۔

22- نرخ کی گرانی اور ارزانی اللہ کے فیصلے اور اس کے حکم کے تحت ہوتی ہے۔

23- عشور کی تحصیل میں کوئی حرج نہیں، کیونکہ یہ محاصل حضرت عمر فاروقؓ نے نافذ کیے تھے۔

24- خراج اور جزیہ کی شرحیں مرکزی حکومت کی طرف سے متعین کی جانی چاہئیں اور ان میں عمال حکومت کو ردوبدل کرنے کا حق نہیں دیا جانا چاہیے۔

☆ ☆ ☆ ☆

امام ابو عبید القاسمؒ

سوال: امام ابو عبید القاسمؒ کے مختصر حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ان کے معاشی افکار کا جائزہ لیجیے!

نام و نسب:

آپ کی کنیت ابو عبید اور نام قاسم ہے۔ آپ کے والد کا نام سلام ہے۔

ولادت:

امام ابو عبید القاسمؒ 150 ہجری میں ہرات میں پیدا ہوئے۔

تعلیم و تربیت:

آپ نے ابتدائی تعلیم ہرات میں رہ کر حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ نے کوفہ، بصرہ اور بغداد

کے جید اساتذہ سے استفادہ کیا۔ آپ نے تفسیر، فقہ، حدیث، عربی ادب اور دیگر مروجہ علوم میں مہارت تامہ حاصل کی۔ آپ کے اساتذہ میں اسماعیل بن جعفر، شجاع بن ابی نصر، اسماعیل بن عیاش، جریر بن عبدالحمید، سفیان بن عینیہ، عباد بن عباد، عباد بن العوام، ہشام بن عمار اور یحییٰ القطان شامل ہیں۔

بحیثیت استاد و اتالیق:

امام ابو عبید القاسمؒ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد ہرثمہ بن اعین (جو رشید اور مامون کے عہد میں سپہ سالار تھے) کی اولاد کے اتالیق رہے۔ علاوہ ازیں وہ مرو میں طاہر بن حسین (گورنر عہد مامون) کے بچوں کے اتالیق کے طور پر بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

بحیثیت قاضی:

امام ابو عبید القاسمؒ شام کے سرحدی علاقہ ثغور کے گورنر کے عہد میں بطور قاضی فرائض انجام دیتے رہے اور ان کے بچوں کو پڑھاتے رہے۔ مؤرخین نے اس گورنر کا نام ثابت بن نصر بن مالک بتایا ہے۔ وہ 18 برس تک عہدہ قضاء پر فائز رہے۔

تصانیف:

امام ابو عبید کی مشہور تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

1- کتاب الاموال
2- کتاب الناسخ والمنسوخ
3- غریب الحدیث
4- کتاب الامثال

وفات:

امام ابو عبیدؒ القاسم 224 ہجری میں مکہ معظمہ میں فوت ہوئے۔

کتاب الاموال کے معاشی موضوعات:

امام ابو عبید القاسمؒ نے اپنی "کتاب الاموال" میں مندرجہ ذیل معاشی موضوعات پر بحث کی ہے:

1- جزیہ
2- جزیہ، فئے اور خمس وغیرہ کی وصولی
3- مصارف فئے
(i) فئے میں سے وظائف مقرر کرنے کا نظام
(ii) فئے میں سے عورتوں، بچوں اور غلاموں کے وظائف

4- صلح کے ذریعے مفتوحہ علاقوں پر خراج عائد کرنا
5- فوجی قوت کے ذریعے مفتوحہ علاقوں پر خراج عائد کرنا
6- زمینوں سے متعلقہ احکام
7- اراضی کی آبادکاری
8- زکوۃ، خمس، صدقہ اور عشر وغیرہ سے متعلقہ احکام
9- زمین سے پیدا ہونے والے غلہ جات اور پھلوں کی زکوۃ
10- گھاس اور پانی والی زمین کی مشترک ملکیت کا تصور
11- عشور کا تصور اور اس کی شرحیں
12- پیمانوں (ناپ تول) سے متعلقہ احکام
13- بیت المال
14- معدن پر خمس اور صدقہ سے متعلقہ احکام
15- عطایا اور وظائف
16- وقف سے متعلقہ احکام
17- اقطاع (جاگیر)
18- غنیمت
19- محصول (ٹیکس) سے متعلقہ نظام

ابوعبید القاسمؒ کے معاشی نظریات:

ذیل میں ''کتاب الاموال'' کے حوالہ سے امام ابوعبید القاسمؒ کے چند معاشی افکار پیش کیے جا رہے ہیں۔

عشور:

عشور تجارت کے سامان پر چنگی کا نام ہے جو ذمیوں اور اہل عرب تاجروں سے ان کے اموال پر وصول کی جاتی تھی، جسے وہ اپنے علاقوں سے دوسرے علاقوں یا ایک ملک سے دوسرے ملک درآمد یا برآمد کرتے تھے۔ ابوعبید القاسم نے عشور کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ:

> ''حضرت عمرؓ نے عشور کی وصولی کے سلسلہ میں جو کارروائیاں کیں، ان کی بنیاد ان صلح ناموں پر تھی، جو ان کے ساتھ طے پائے تھے۔ یہ صورت رسول (ﷺ) کے عہد میں پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے آپ نے جن سے صلح کی تھی، ان سے اس قسم کی کوئی شرط نہ رکھی تھی۔ اسی طرح یہ صورت حال حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں بھی نہ تھی۔ چونکہ عجمی ممالک کی

فتح کا آغاز حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوا، اس لیے یہ سلسلہ بھی انہی کے عہد میں جاری ہوا۔''

اہل عراق عشور کو زکوٰۃ سے مشابہ تصور کرتے تھے۔ ابو عبید القاسمؒ نے اس تصور کو غلط قرار دیتے ہوئے کہا ہے کہ زکوٰۃ سال گزرنے کے بعد وصول کی جاتی ہے، جبکہ عشور نیا سامان درآمد کرنے پر بغیر سال گزرے وصول کیا جاتا ہے۔

ابو عبید القاسمؒ کا خیال ہے کہ عشور ایک سو درہم سے کم مال پر نہیں عائد کیا جائے گا۔ جب مال کی قیمت ایک سو درہم ہو تو اس پر ہر نصف عشر ($^1/_{20}$) وصول کیا جائے گا۔

عطایا اور وظائف:

حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد حکومت میں مختلف قسم کے لوگوں کو عطیات دیئے اور اکثر لوگوں کے وظائف بھی مقرر کیے۔ اس ضمن میں ابو عبید القاسمؒ لکھتے ہیں:

> ''جب حضرت عمرؓ کے زمانہ میں حکومت میں مال کی بہتات ہوگئی اور اعداد وشمار کے رجسٹر مرتب ہو گئے تو حکومت کے کارکنوں، گورنروں اور قاضیوں وغیرہ کے مشاہرے مقرر کر دیئے گئے اور مال اور خزانے جمع کرنے کی ممانعت کر دی گئی اور مسلمانوں پر کاشتکاری اور زمینداری ممنوع قرار دی گئی، اس لیے ان کے اور ان کے اہل وعیال کے روزینے بیت المال سے مقرر کر دیئے گئے تھے، بلکہ ان کے غلاموں اور آزاد شدہ غلاموں کے بھی، اس کا مقصد یہ تھا کہ قوم عسکری بن جائے اور اس طرح وہ کوچ کے لیے چست و چالاک رہے کہ ان کے سفر کے سامنے نہ زمیندار مانع آئے، نہ کاشتکاری اور یہ کہ وہ بے محنت کی زندگی اور عیش وعشرت میں نہ پڑ جائے۔''

ابو عبید القاسمؒ نے بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ شیر خوار بچہ کا دودھ چھوٹنے پر وظیفہ عائد کرتے تھے لیکن ایک خاص واقعہ کے بعد آپ نے اعلان کر دیا آئندہ بچہ پیدا ہوتے ہی اس کا روزینہ مقرر کر دیا جائیگا۔

ابو عبید القاسم نے بتایا ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ مؤذنوں، اماموں اور معلموں کو ماہانہ وظائف دیا کرتے تھے۔

وقف:

''وقف'' سے مراد اپنی کوئی جائیداد فی سبیل اللہ وقف کر دینا ہے۔ ابو عبید القاسمؒ نے ''کتاب الاموال'' میں لکھا ہے کہ جب وقف سے متعلقہ آیت نازل ہوئیں تو حضرت طلحہؓ نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا، یا رسول اللہ ﷺ! میں اپنا فلاں باغ، جو میرا بہت پیارا ہے، راہ خدا میں دیتا ہوں۔ آپ نے

فرمایا: ''تم اس کو اپنی قوم کے محتاجوں کے لیے وقف کر دو۔''

جزیہ:

ابوعبید القاسمؒ نے ''جزیہ'' کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ: جزیہ اس معاوضے کو کہتے ہیں، جو ذمیوں سے طے شدہ شرائط کے مطابق، ان کی جان اور مال کی حفاظت کے ضمن میں وصول کیا جائے۔ ابوعبید کا کہنا ہے کہ جزیہ صرف بالغ مردوں سے وصول کیا جانا چاہیے، عورتیں اور بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ ابوعبید القاسمؒ کا خیال ہے کہ مشرکین عرب کے سوا تمام اہل کتاب، عرب اور غیر عرب اقوام سے وصول کیا جائے گا، خواہ یہ اقوام اہل کتاب ہوں یا نہ ہوں۔ امام ابوعبید نے جزیہ کی رقم کا تعین نہیں کیا۔ یہ کام انہوں نے حکومت کے سربراہ پر چھوڑ دیا ہے اور کہا ہے کہ جزیہ ذمیوں کی طاقت برداشت کے مطابق مقرر کیا جائے۔ ان کے جزیہ کی رقم میں کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔

خراج:

امام ابوعبید کے نزدیک خراج زمین کے کرائے سے مشابہ ہے کیونکہ یہ ان زمینوں کی آمدنی کا نام ہے جو مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار پاتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ حضرت عمر فاروقؓ نے زمینوں پر خراج لیا تھا، وہ گویا زمین کا کرایہ تھا۔ ان کے نزدیک خراج کی زمین مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہے اور اس پر آباد کام کرنے والے ایک مقررہ اجرت ادا کرتے رہنے کی شرط پر مسلمانوں کے مزارع متصور ہوتے ہیں۔ اس مقررہ اجرت یا خراج کے بعد زمین سے پیدا ہونے والی بقیہ تمام اشیاء انہی مزارعین کی ہوں گی، جو اس پر کام کرتے ہیں۔ امام صاحب کا خیال ہے کہ خراج کا تعین زمین کی پیداوار کے لحاظ سے کرنا چاہیے۔ ان کا کہنا ہے کہ خراج اتنا زیادہ نہیں ہونا چاہیے کہ کام کرنے والوں کے لیے بوجھ بن جائے اور اتنا کم بھی نہیں ہونا چاہیے کہ اسلامی حکومت کو اس علاقے کا دفاع اور انتظام کرنا مشکل ہو جائے۔

غنیمت:

بقول ابوعبید القاسمؒ مشرکین سے دوران جنگ، بزور بازو جو کچھ حاصل کیا جائے، اسے ''غنیمت'' کا نام دیا جائے گا۔ امام ابوعبید کا کہنا ہے کہ غنیمت کے پانچ حصے کیے جائیں اور تمام حصے خصوصیات کے ساتھ ان کے مستحقین کو دیے جائیں اور دوسرے لوگوں کو اس میں سے کچھ نہ دیا جائے۔

فئے:

امام ابوعبید القاسمؒ کا کہنا ہے کہ جو کچھ مشرکین سے جنگ ختم کر چکنے اور مفتوحہ علاقوں کے اسلامی مملکت میں شامل ہو جانے کے بعد حاصل ہو، وہ فئے ہے جو عامۃ الناس کی اجتماعی ملکیت ہوگا۔ علاوہ ازیں وہ تمام اموال بھی فئے ہوں گے جو اہل حرب سے جنگ ہونے سے پیشتر ملیں، مثلاً ایک لشکر دشمن پر حملہ کا قصد

کرے اور دشمن مطلع ہو کر اپنے بچاؤ کے لیے مال بھیج دے کہ ان پر حملہ نہ کیا جائے اور واپسی اختیار کی جائے، امام صاحب کا کہنا ہے کہ غنیمت کی طرح فئے کے پانچ حصے نہیں کئے جائیں گے بلکہ یہ تمام مسلمانوں کی ملکیت متصور ہوگا۔

اقطاع:

حکومت کی طرف سے کسی کو جاگیر عطا کرنا "اقطاع" کہلاتا ہے۔امام ابوعبید القاسمؒ کا کہنا ہے کہ اقطاع اس جاگیر کا نام ہے، جو حکومت کی طرف سے عوام الناس کی اجتماعی خیر خواہی اور مفاد کے پیش نظر کسی کو دی جائے۔امام صاحب کا خیال ہے کہ اقطاع صرف انہی زمینوں میں جائز ہے، جو غیر آباد اور بیکار ہوں یا پرانے زمانہ میں کاشت ہو چکنے کے بعد اب پھر غیر کاشت حالت میں باقی رہ گئی ہوں اور ان پر کوئی آباد نہ رہا ہو اور اس زمین کے متعلق فیصلہ کرنے کا اختیار امام (حکومت) کو حاصل ہو جائے۔امام صاحب کا کہنا ہے کہ اگر کسی کو کوئی جاگیر دی جائے تو زمین سے فائدہ اٹھانے والے کو اجتماعی مفاد کے تابع رہ کر کام کرنا ہوگا۔

امام ابوعبیدؒ نے یہ بھی بتایا ہے کہ یہ اصطلاح (اقطاع) ہر ایسی زمین کے لیے بھی مستعمل ہے جسے کسی نے آباد نہ کیا ہو اور نہ وہ کسی مسلمان کی ملکیت میں ہو نہ معاہد کی۔

حمی:

ہر وہ چیز "حمی" کہلاتی ہے، جسے کوئی فرد یا جماعت اپنے مفاد کے لیے محفوظ کر لے اور اس میں دوسروں کی دخل اندازی ممنوع ہو۔رسول اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

"کسی علاقہ کو حمی قرار دینے کا حق اللہ اور اس کے رسول کے سوا کسی کو حاصل نہیں ہے۔"

امام ابوعبید القاسمؒ نے بتایا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے کسی علاقہ کو حمی قرار دینے کی دو صورتیں ہیں:

1- ایک یہ کہ علاقے کو اس غرض سے ممنوعہ قرار دے دیا جائے کہ وہاں سے راہ خدا میں لڑنے والے مجاہدین کے گھوڑے خوراک پائیں۔

2- دوسری صورت یہ ہے کہ کسی زمین کو صدقہ (زکوٰۃ) کے جانوروں کے چرنے کے لیے اس وقت تک ممنوعہ قرار دے دیا جائے، جب تک جانور اپنے مستحقین میں منقسم ہو جائیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

علامہ ابن حزم

سوال: علامہ ابن حزم کے حالات زندگی بیان کرتے ہوئے ان کے معاشی افکار کا جائزہ لیجیے!

نام ونسب:

آپ کا نام علی اور کنیت ابو محمد ہے۔ آپ کے والد کا نام احمد بن سعید بن حزم ہے۔

پیدائش:

علامہ ابن حزم 384 ہجری (994ء) میں قرطبہ میں پیدا ہوئے۔

تعلیم وتربیت:

ابن حزم نے تفسیر، حدیث، فقہ اور دیگر مروجہ علوم میں مہارت تامہ حاصل کی۔

مسلک:

ابن حزم ابتدا میں شافعی مذہب کے پیرو تھے۔ بعد میں انہوں نے ظاہری مذہب اختیار کرلیا۔

تصانیف:

ابن حزم نے تقریباً 400 کتب تصنیف کیں۔ ان کی مشہور کتاب کا نام "المحلی" ہے، جس میں معاشیات کے موضوعات پر بحث کی گئی ہے۔

وفات:

ابن حزم 456 ہجری (مطابق 1064ء) میں فوت ہوئے۔

ابن حزم کے معاشی افکار:

ابن حزم نے اپنی کتاب "المحلی" میں مختلف موضوعات پر معاشی افکار پیش کیے ہیں۔ ذیل میں ہم ان کے اہم معاشی افکار کا جائزہ لینے جا رہے ہیں۔

ضرورت سے زائد سامان حاجتمندوں کو دے دینا:

ابن حزم اس بات کے قائل ہیں کہ اگر کسی کے پاس اپنی ضرورت سے زائد سامان موجود ہو، تو فالتو سامان کسی حاجتمند کو دے دینا چاہیے۔ اس ضمن میں اس نے یہ حدیث پیش کی ہے۔

حضرت ابو سعید الخدریؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"جس شخص کے پاس اپنی ضرورت سے زائد سامان ہو، اس کو چاہئے کہ یہ فالتو سامان کسی

غریب آدمی کو دیدے۔ جس شخص کے پاس خورد ونوش کا سامان اپنی ضرورت سے زیادہ ہو، اس کو چاہئے کہ فالتو سامان نادار اور حاجتمند کو دیدے۔"

ابن حزم نے حضرت علیؓ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"اللہ تعالیٰ نے اہل ثروت کے اموال پر ان کے غریبوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ کفالت پورا کرنا فرض کر دیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے، وہ محض اس لیے کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے، تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز ان سے باز پُرس کرے گا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔"

ابن حزم مذکورہ بالا احادیث نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ:

"ہر بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں اور اگر بیت المال کی آمدنی سے ان غرباء کی معاشی ضروریات پوری نہ ہوں تو امیر (خلیفہ، امام) ارباب دولت کو ان کی کفالت کے لیے مجبور کر سکتا ہے۔ ان کی زندگی کے اسباب کے لیے کم از کم یہ انتظام ضروری ہے کہ ان کی ضرورت کے مطابق روٹی مہیا ہو، پہننے کے لیے گرمی اور سردی دونوں کے لحاظ سے لباس فراہم ہو اور رہنے کے لیے ایک ایسا مکان ہو جو ان کو بارش گرمی دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھے۔"

ابن حزم نے اپنی کتاب "المحلی" میں لکھا ہے کہ:

"اس بات پر صحابہؓ کا اجماع ہے کہ اگر کوئی شخص بھوکا، ننگا یا ضروریات سکونت سے محروم ہو، تو مالدار کے فاضل مال سے اس کی کفالت کرنا فرض ہے۔"

ابن حزم نے یہ بھی لکھا ہے کہ:

"ضرورت مند کے لیے درست ہے کہ وہ مالدار سے لڑ کر زبردستی ضرورت کی مقدار مال پر قبضہ کر لے۔ پس اگر اس نے قبضہ کر لیا تو سرمایہ دار مارنے والے پر قصاص آئے گا اور اگر سرمایہ دار اس آویزش سے مارا گیا تو ملعون ہوا، اس لیے کہ اس نے اس حق کو ادا کرنے سے انکار کیا، جو اس کے ذمہ فرض تھا اور اس صورت میں اس مالدار شخص کا حکم "طائفہ باغیہ" کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ صاحب حق کے مقابلہ میں حق و فرض کا منکر باغی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے منکرین زکوٰۃ کے مقابلہ میں جہاد کیا۔"

ابن حزم کا کہنا ہے کہ:

"میں کہتا ہوں کہ اگر ایک شخص کے پاس اپنی حاجت اصلیہ سے زائد خورد ونوش کا سامان

موجود ہے اور دوسرا شخص بھوک سے اس درجہ بے چین ہے کہ موت طاری ہو جانے کا اندیشہ ہے، تو اس کو مُردار یا خنزیر کھانا جائز نہیں ہے بلکہ اس کا حق ہے کہ زبردستی اس پر قبضہ کر کے بقدر حاجت استعمال کرے، خواہ وہ مال مسلمان کا ہو، یا ذمی کا، اس لیے صاحب طعام پر فرض ہے کہ وہ بھوکے کو کھانا کھلائے۔ ایسی صورت میں اس حاجتمند کو یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ خنزیر یا مردار کھانے پر مجبور ہو چکا ہے۔"

محصول (ٹیکس) لگانا:

ابن حزم کے نزدیک جہاں کاروبار حکومت چلانے کے لیے ٹیکس عائد کرنا جائز ہے، وہیں اہل ضرورت کی معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے مزید ٹیکس لگانا بھی جائز ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر بیت المال کا خزانہ اہل ضرورت کی معاشی حاجات کو پورا نہ کر سکے، تو خلیفہ اہل ثروت پر مزید ٹیکس عائد کر کے ان کی ضرورت کو پورا کر سکتا ہے اور اہل ثروت رکاوٹ پیدا کریں تو جبراً ان سے وصول کر سکتا ہے۔"

اس ضمن میں ابن حزم نے یہ آیت نقل کی ہے:

وات ذالقربی حقه والمسکین وابن السبیل

(اور قرابتداروں اور مسکین اور مسافر کے جو حق تم پر واجب ہیں، ادا کرو)

ابن حزم کا کہنا ہے کہ جس طرح غرباء کی ضروریات کے لیے خصوصی ٹیکس عائد کیا جا سکتا ہے، اسی طرح جہاد اور دوسری ضروریات کے لیے بھی ٹیکس لگایا جا سکتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ نے غزوہ تبوک کے موقع پر اسی قسم کی اعانت کی ترغیب دی تھی، جس پر پُر جوش طریقے سے لبیک کہا گیا۔

مزارع سے بیگار لینا ناروا ہے:

ابن حزم کے نزدیک مزارعت میں کاشتکار یا مزارع سے زمین کی کاشت سے متعلقہ کاموں کے علاوہ اور کوئی خدمت یا بیگار لینا ناجائز ہے، مثلاً مکان بنوانا، مکان کی صفائی کرانا، باغ کی دیوار بنوانا یا اپنا گھریلو کام کروانا۔

ابن حزم لکھتے ہیں کہ:

"سنت نبوی ﷺ سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ کاشتکار کے ذمہ ایک ہی شرط ہے کہ وہ اجارہ پر لی ہوئی زمین کو مال اور محنت کے ذریعے بوئے اور جوتے تاکہ پیداوار حاصل ہو۔"

وصیت اور میراث:

غیر وارث اقارب کے سلسلہ میں فقہاء وصیت کی فرضیت کو تسلیم نہیں کرتے لیکن ابن حزم کے

نزدیک وصیت غیر وارث اقارب کے لیے فرض ہے۔ وصیت کنندہ اتنے مال پر وصیت کر سکتا ہے جس سے اس ثابت شدہ فریضہ کی تکمیل ہو جائے۔ ابن حزم کے نزدیک وصیت واجبہ کا ترک ظلم کے مترادف ہے۔ اس لیے یہ کام حاکم یا قاضی کے سپرد ہونا چاہئے کہ وہ وصیت کے نفاذ کی نگرانی کرے یا عدم وصیت کی صورت میں متاثرین کو ان کے حقوق دلائے۔

ابن حزم کے اس مسلک کا مقصد یہ ہے کہ دولت ترکہ کی صورت میں صرف چند ہاتھوں تک ہی محدود رہے، بلکہ متوفی کے کنبہ کے زیادہ سے زیادہ لوگوں میں تقسیم ہو جائے۔

اکثر فقہاء نے کہا ہے کہ اگر ترکہ کی تقسیم کے وقت یتیم و مسکین جمع ہوں تو انہیں از راہ احسان کچھ نہ کچھ دے دینا چاہیے، لیکن ابن حزم کی رائے میں یہ عطیہ اختیاری نہیں بلکہ وجوبی ہے۔ لہٰذا اگر ورثاء دینے سے انکار کریں تو حاکم ان سے جبرا دلائے۔ ابن حزم کے نزدیک ترکہ کی مالیت اور تحصص کے اعتبار سے حاکم یتامیٰ اور مساکین کے حصے کا تعین کر سکتا ہے۔

اجارہ زمین:

اکثر فقہاء کے نزدیک زمین اجارہ پر دی جا سکتی ہے لیکن ابن حزم کے نزدیک ایسا کرنا جائز نہیں۔ وہ کہتے ہیں:

> "زمین کو کسی حالت میں بھی اجارہ پر دینا جائز نہیں، نہ کھیتی باڑی کے لیے نہ باغ لگانے کے لیے، نہ تعمیر کے لیے، نہ کسی اور مقصد کے لیے، خواہ تھوڑی مدت کے لیے ہو یا زیادہ مدت کے لیے، بلا تعین مدت یہ اجارہ داری نہ درہم و دینار کے عوض درست ہے اور نہ کسی چیز کے عوض، اگر زمین اجارہ پر دیدی جائے تو اسے فسخ کر دیا جائے گا۔"

ابن حزم کے نزدیک کاشت زمین کی مندرجہ ذیل صورتیں جائز ہیں۔

1- زمین کا مالک اپنے آلات اور حیوانات سے خود کاشت کرے اور بیج ڈالے۔

2- دوسروں کو زراعت کے لیے مفت (بلا معاوضہ) دے۔ اگر مالک اور مزارع حیوانات، آلات اور بیج میں شریک ہوں، مگر زمین کا مالک اس کا کچھ وصول نہ کرے تو اچھا ہے۔

3- مالک اپنی زمین مزارع کو دے اور مزارع اپنے آلات و حیوانات کی مدد سے خود کاشت کرے اور بیج ڈالے، تو زمین کا مالک اس میں سے پیداوار کا مقرر کیا ہوا حصہ (مثلاً نصف، ربع یا اس سے کم و بیش) وصول کر سکتا ہے۔

اجیر مشترک اور اجیر خاص پر تاوان کا مسئلہ:

"اجیر مشترک" وہ مزدور ہے، جو اپنا ایک مستقل فنی کاروبار کرتا ہے، مثلاً بار برداری، کپڑا سینا وغیرہ۔

"اجیر خاص" سے مراد وہ مزدور ہے جو اپنی خدمات کسی ایک شخص کے لیے وقف کر دیتا ہے، مثلاً گھریلو ملازم۔

فقہاء کے نزدیک اس بات میں اختلاف ہے کہ اگر اجیر مشترک یا اجیر خاص سے کوئی نقصان ہو جائے تو اس پر کیا تاوان عائد کیا جائے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک اجیر مشترک سے کام میں کوئی نقصان ہو جائے، تو اس پر تاوان عائد نہیں کیا جائے گا۔ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ کے نزدیک اس پر تاوان عائد ہو گا۔ اجیر خاص سے اگر کام میں نقصان ہو تو، تمام فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اس سے تاوان نہیں لیا جائے گا۔ امام ابن حزم کا خیال ہے کہ اجیر مشترک ہو یا اجیر خاص، دونوں سے تاوان نہیں لیا جائے گا۔ بشرطیکہ نقصان ارادتاً نہ ہوا ہو۔ اس سلسلہ میں ابن حزم اپنی کتاب ''المحلی'' میں لکھتے ہیں کہ:

> ''اجیر مشترک ہو یا خاص یا کاریگر ہو، اس پر مال میں نقصان ہو جانے یا ہلاک ہو جانے سے کوئی تاوان نہیں آتا، تاوقتیکہ اس کا ارادہ قصور یا ضائع کر دینا ثابت نہ ہو اور ان تمام امور میں جب تک اس کے خلاف گواہ موجود نہ ہوں، اسی اجیر کا قول معتبر ہے، قسم کے ساتھ۔''

☆ ☆ ☆ ☆

شاہ ولی اللہؒ

سوال: شاہ ولی اللہؒ کے حالات زندگی بیان کریں اور ان کے معاشی افکار پر روشنی ڈالیں۔

نام و نسب:

آپ کا نام احمد، کنیت ابوالفیاض اور عرف ولی اللہ ہے۔ آپ شاہ ولی اللہؒ کے نام سے مشہور ہیں۔ آپ کے والد ماجد کا نام شیخ عبدالرحیم ہے، جو اپنے وقت کے مشہور عالم دین اور مدرسہ رحیمیہ کے بانی تھے۔ آپ کا سلسلہ نسب والد کی طرف سے حضرت عمر فاروقؓ سے اور والدہ کی طرف سے حضرت موسیٰ رضاؒ تک پہنچتا ہے۔ اس طرح آپ والدہ کی طرف سے سادات میں شامل ہیں۔ آپ خالص عربی النسل تھے۔

دور حیات:

شاہ ولی اللہؒ 4 شوال 114 ہجری (مطابق 1703ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے اور 29 محرم 1174 ہجری کو دہلی میں فوت ہوئے۔

تعلیم و تربیت:

آپ نے اپنے والد شیخ عبدالرحیم سے دینی تعلیم حاصل کی اور علم حدیث کی سند شیخ ابوطاہر محمد بن ابراہیم کردی مدنی سے حاصل کی۔ آپ نے تفسیر، حدیث، فقہ، منطق، کلام، صرف، نحو، تاریخ اور دیگر علوم میں مہارت تامہ حاصل کی۔

بیعت:

شاہ ولی اللہؒ نے پندرہ سال کی عمر میں اپنے والد ماجد شیخ عبدالرحیم کے دست حق پر سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی۔

درس و تدریس:

شاہ ولی اللہؒ اپنے والد کی وفات (1719ء) کے بعد مسند ارشاد پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کے قائم کردہ مدرسہ رحیمیہ میں درس و تدریس کا سلسلہ شروع کیا۔

حج:

شاہ ولی اللہؒ نے 1143 ہجری میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔ اسی زمانہ میں آپ نے مدینہ منورہ میں قیام کے دوران علم حدیث میں سند حاصل کی۔

تصنیفات:

شاہ ولی اللہ کثیر التصانیف مصنف ہیں۔ ان کی چند اہم تصانیف کے نام درج ذیل ہیں:

1- حجتہ اللہ البالغہ
2- الفوز الکبیر
3- البدور البازغہ
4- المسوی فی شرح المؤطا
5- المصفی فی احادیث المؤطا
6- حسن العقیدہ
7- خیر الکثیر
8- عقد الجید
9- فتح الرحمٰن فی ترجمۃ القرآن
10- البلاغ المبین

معاشی افکار:

شاہ ولی اللہؒ کے معاشی افکار ان کی تصانیف حجتہ اللہ البالغہ، خیر الکثیر اور البدور البازغہ وغیرہ میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ذیل میں ان کے معاشی افکار کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

سرمایہ و محنت میں عادلانہ توازن:

شاہ ولی اللہؒ دہلوی رقمطراز ہیں کہ:

"اگر معاشی معاملات میں لوگوں کے درمیان باہمی تعاون اور اشتراک عمل کے ذریعہ مالی ترقی بروئے کار نہ آئے تو تمدن کا صالح اور صحیح رہنا دشوار ہو جائے گا مثلاً ایک شخص تجارت کو کسب معاش کا ذریعہ بناتا ہے اور دوسرا شخص اپنی جدوجہد کے ذریعے دوسرے کے مال کی دلالی کرتا ہے، تیسرا اپنی ایجادات کے ذریعے دوسروں کے مال کو بیش قیمت اور بہتر بناتا ہے یعنی صنعت و حرفت کو وسیلہ معاش بناتا ہے، تو ان سب صورتوں میں تعاون کے بغیر معاشی زندگی میں استواری پیدا نہیں ہو سکتی۔ ان تمام معاملات میں صحیح تعاون و اشتراک عمل میں واجب ہے اور اگر یہ مالی ترقی ایسے طریقے سے کی جائے کہ اس میں سرے سے تعاون کا کوئی دخل ہی نہ ہو، جیسے کہ قمار بازی کا کاروبار، یا ایسے طریقے سے عمل میں آئے کہ بظاہر تعاون نظر آتا ہو لیکن حقیقت میں وہ زبردستی ہو، حقیقی تعاون نہ ہو۔ جیسا کہ سودی

کاروبار۔ پس اس طرح کے کاروبار ناپسندیدہ اور ناجائز معاملات کہلائیں گے ۔ان کو معاشیات کے اسباب صالحہ نہیں کہا جائے گا بلکہ یہ باطل کہلائیں گے، جو ظلم کے مترادف ہیں۔"

کسی کی مخصوص چیز میں مداخلت نہ کرنا:

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ:

''اللہ تعالیٰ نے جب زمین پر اپنی مخلوق پیدا کی تو ان کی معاش اور روزی بھی زمین پر مقدر فرمائی اور زمین کی پیداوار سے ان کے لیے انتفاع مباح کیا اور چونکہ حرص کی وجہ سے ان کے درمیان نزاع پیدا ہوا، تو اس وقت اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہوا کہ کوئی شخص دوسرے کی مخصوص و مختص چیز میں کسی قسم کی مزاحمت و مداخلت نہ کرے اور یہ اس کی مخصوص چیز اس طرح ہوگی کہ اس چیز پر سب سے پہلے اس کا قبضہ ہوا ہے یا اس کے کسی مورث کا قبضہ تھا یا کسی ایسے طریقہ سے اس چیز پر اس کا، جو ان لوگوں میں عمومی طور پر قبضہ اور ملکیت کے لیے معتبر مانا جاتا ہے۔ اس قسم کے قبضہ اور ملکیت میں سوائے تبادلہ کے اور سوچ سمجھ کر بلا کسی فریب، دھوکا اور قابل اعتماد باہمی رضامندی کے کسی قسم کی مزاحمت کرنا حرام اور ناجائز ہے۔"

مملکتوں کی بربادی کا سبب:

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ:

''اس زمانہ میں مملکتوں کی بربادی کا سبب دو امور ہیں ۔ایک یہ کہ بیت المال کے مالیہ پر تنگدستی چھا جائے، یعنی ایسے افراد بھی اپنی تمام معیشت کا بار اس پر ڈال دیں جن کا واقعی بیت المال میں حق ہے، مثلاً مجاہدین، علماء اور وہ افراد بھی جن کے لیے آج کل بادشاہوں نے داد و عیش کے خزانے کھول رکھے ہیں، جیسے صوفی اور شاعر وغیرہ یا اسی قسم کے دوسرے غلط اسباب سے بیت المال کو زیر بار کیا جائے۔ دراصل ان کے دماغوں میں یہ بات آنی چاہئے کہ بہترین معاش قوت بازو سے رزق کمانا ہے نہ کہ بیت المال پر انحصار کرنا کیونکہ اس طرح ایک جماعت دوسری جماعت کے ساتھ مزاحمت کرتی ہے اور پھر ایک دوسرے کے لیے خرابی کا سبب بنتی ہے۔"

اصول معاشیات:

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ:

''زراعت، جانوروں کی پرورش، معدنیات، نباتات اور حیوانات کا خشکی اور تری سے حاصل کیا جانا اور بڑھئی، لوہار اور کپڑا بننے کی صنعتیں یہ اور اسی قسم کی وہ تمام چیزیں کہ جن کے طبعی جوہر سے انتفاع مطلوب ہو سکے ''اصول معاشیات'' کہلاتی ہیں۔''

معاشی بگاڑ کا اخلاقیات سے تعلق:

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ:

''انسانیت کے اجتماعی اخلاق اس وقت بالکل برباد ہو جاتے ہیں، جب کسی جبر سے ان کو اقتصادی تنگی پر مجبور کیا جائے اور وہ گدھے اور بیل کی طرح صرف روٹی کے لیے کام کریں۔''

معاشی وسائل کا بنیادی مسئلہ:

بقول شاہ ولی اللہ:

''معاشی وسائل کو وسیلہ بنانے کے لیے بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اموال مباح پر قبضہ کیا جائے یا مال مباح میں سے جو جس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے، اس کے خصوصی جوہروں کے ذریعہ اموال مباح پر قبضہ کیا جائے یا مال مباح میں ترقی کی جائے، مثلاً مویشیوں کی افزائش نسل، آبپاشی اور اصلاح زمین کے ذریعہ زراعت وغیرہ۔''

زراعت کی اہمیت:

شاہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ:

''اگر باشندگان ملک کی اکثریت صنعت و حرفت اور شہری سیاسیات ہی میں معروف رہے اور زراعت اور مویشیوں کی حفاظت کی جانب بہت تھوڑے لوگ مشغول ہوں تو ان کی دنیاوی اور تمدنی زندگی فاسد اور خراب ہو جائے گی۔''

درباداری کی مذمت:

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ:

''جب کسب معاش کے طریقوں کا فقدان ہو جاتا ہے، تو انسانوں کا ایک گروہ چاپلوسی، مصاحبت، چرب زبانی اور درباداری کو ذریعہ معاش بنا لیتا ہے جس سے اس کے افکار عالیہ ختم ہو جاتے ہیں اور ذہنی نشوونما کی تمام خوبیاں مٹ جاتی ہیں۔ اخلاق کریمہ کو گھن لگ جاتا ہے اور انسان ذلت و پستی پر قانع ہو جاتا ہے۔''

امداد باہمی:

شاہ ولی اللہؒ کا کہنا ہے کہ:

''جبکہ انسان مدنی الطبع پیدا ہوا ہے کہ انسان کی معاشی زندگی انسانوں کے باہمی تعاون کے بغیر درست نہیں ہو سکتی، تو خدائی فیصلہ یہ ٹھہرا کہ امداد باہمی کو واجب قرار دیا جائے اور یہ کہ جس شخص کے ذریعے بھی تمدن کو فائدہ پہنچ سکتا ہے اس کو تمدنی زندگی سے علیحدہ نہیں ہونا چاہیے۔''

آدابِ معیشت:

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

''آدابِ معیشت حکمت کا ایک شعبہ ہے۔ ان میں اصلی امر یہ ہے کہ تدابیر اولی کو ہر بات میں صحیح تجربہ پر پیش کریں۔ جو ضرر سے بعید ہیں اور نفع سے قریب ہیں، وہی اختیار کی جائیں اور ان آداب کا عمدہ اخلاق سے موازنہ کیا جائے، جو کامل الخراج لوگوں کی پیدائش میں ہوا کرتے ہیں۔ جو آداب ان اخلاق کے زیادہ منسوب ہوں وہی اختیار کیے جائیں اور ان کے سوا سب ترک کر دیے جائیں۔ نیز ان آداب کا اندازہ حسنِ معاشرت اور لطف مشارکت سے کیا جائے۔ ان میں وہ مقاصد ملحوظ رکھے جائیں جو رائے کلی سے پیدا ہوتے ہیں۔''

معاش کے اہم مسائل:

بقول شاہ ولی اللہؒ:

''معاش کے اہم مسائل یہ ہیں: کھانے پینے کے آداب، چلنے کے، نشست و برخاست کے، سونے کے، سفر کرنے کے، قضائے حاجت کے، ہمبستری کے، لباس کے، مکان کے، ستھرائی اور پاکیزگی کے، آرائش کے، باہمی گفتگو کے طریقے، آفات کے وقت دواؤں منتروں کا استعمال، حوادث پیش آنے کے وقت پیش بینی، خوشی، ولادت، نکاح، عید مسافروں کے آنے وغیرہ کی خوشی کے موقعوں میں اور ولیموں میں فرحت اور سرور کا اظہار، مصائب میں رنج و غم کا اظہار، مریضوں کی عیادت اور مردوں کو دفن کرنا وغیرہ وغیرہ۔''

حُرمتِ سُود:

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

''سود باطل اور حرام ہے۔اس قسم کا قرض لینے والے عام طور پر مفلس اور نادار ہوتے ہیں۔ قرض لینے والا رقم بروقت ادا نہیں کر سکتا اور سود در سود کا چکر چلنے لگتا ہے۔آدمی کو اس سے نجات نہیں ملتی اور بالآخر وہ برباد ہو جاتا ہے۔سود کا معاملہ سخت جھگڑے کا باعث بنتا ہے۔ جس قوم یا ملک میں یہ بے محنت روپیہ حاصل کرنے کا رواج بڑھ جاتا ہے، وہاں کے عوام کے لیے صنعت وحرفت، زراعت اور تجارت کی سب راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔''

حرام چیزوں کی بیع کا حرام ہونا:

شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے۔ان اللّٰہ ورسولہ حرم بیع الخمر والمیتۃ والخنزیر والاصنام ۔(اللہ تعالیٰ نے اور اس کے رسول ﷺ نے شراب اور مردار اور سود اور بتوں کا فروخت کرنا حرام کیا ہے)اور نیز آپ ﷺ نے فرمایا:ان اللّٰہ اذا حرم شیئا حرم ثمنہ (اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام کیا تو اس کے ثمن کو بھی حرام کیا)یعنی جب ایک چیز سے نفع اٹھانے کا طریقہ متعین ہے۔مثلاً شراب صرف پینے کے لیے اور بُت صرف پرستش کے لیے بنائے جاتے ہیں۔پس اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو حرام کیا ہے،اس لیے حکمت الٰہیہ کا تقاضا ہے کہ ان کی بیع کو بھی حرام کیا جائے۔''

حکومت کے فرائض:

شاہ ولی اللہؒ کا کہنا ہے کہ:

''بادشاہ کا فرض ہے کہ وہ عوام کی بہبود اور معاشی فارغ البالی کے لیے مختلف اقدامات کرے،ناجائز ذرائع آمدن پر پابندی عائد کرے اور جوا،سُود،رشوت،ذخیرہ اندوزی اور ناجائز منافع خوری کو مٹانے اور عوام کی خوشحالی کے لیے منصوبہ بندی کرے۔ایسا نہ ہو کہ اکثر لوگ زراعت کو چھوڑ کر صنعتوں میں چلے جائیں اور زرعی شعبے کو نظر انداز کر دیا جائے یا اہل صنعت غیر ضروری اشیاء بنانے میں مصروف ہو جائیں اور بنیادی ضرورت کی چیزوں میں کمی واقع ہو جائے اور ملک بحران کا شکار ہو جائے۔''

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی

سوال: ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کے حالات زندگی بیان کریں اور ان کی کتب اور معاشی افکار پر روشنی ڈالیں۔

تعارف (Introduction):

''کنگ فیصل انٹرنیشنل پرائز فار اسلامک سٹڈیز'' حاصل کرنے والے محمد نجات اللہ صدیقی 1931ء میں بھارت میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور ثانوی درسگاہ جماعت اسلامی ہند رام پور سے تعلیم حاصل کی۔ انہوں نے مدرسۃ الاصلاح سرائے میر اعظم گڑھ سے بھی تعلیم پائی۔

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقیؒ کے تعلیمی کوائف وغیرہ کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقیؒ کی مطبوعہ کتب کی فہرست

انگریزی کتب (Books in English):

1- معاشیات' ایک اسلامی انداز فکر' اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر' برطانیہ (1999ء)
2- اسلامی تناظر میں معاشیات کی تدریس' مرکز برائے تحقیق اسلامی معاشیات' جدہ (1996ء)
3- معیشت میں ریاست کا کردار' اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر' برطانیہ (1996ء)
4- اسلامی معیشت میں انشورنس' اسلامک فاؤنڈیشن لیسٹر' برطانیہ (1985ء)
5- اسلامی قانون میں شراکت داری اور منافع میں حصہ داری' اسلامک فاؤنڈیشن' برطانیہ (1985ء)
نائیجیریا میں کئی پی ایچ ڈی کے مقالہ جات کی نگرانی کرتے رہے۔
6- جون 2000ء تک نئے قائم شدہ عالمی مرکز برائے تحقیق اسلامی معاشیات میں کام کرتے رہے۔
6- سود کے بغیر بنکاری' اسلامی فاؤنڈیشن' برطانیہ (1983ء)
7- اسلامی بنکاری میں مسائل' اسلامک فاؤنڈیشن' برطانیہ (1983ء)
8- مسلم معاشی فکر' اسلامک فاؤنڈیشن' لیسٹر' برطانیہ (1981ء)
9- اسلامی معاشیات پر ہم عصر تحریری مواد' اسلامک فاؤنڈیشن' لیسٹر' برطانیہ (1978ء)
10- اسلام میں معاشی معرکہ' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1972ء)
11- اسلامی معیشت کے بعض پہلو' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1972ء)

-12 مسلم شخصی قانون' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1972ء)
-13 منافع کے موجودہ نظریات' ایک تنقیدی جائزہ' ایشیا پبلشنگ ہاؤس' بمبئی' انڈیا (1971ء)

متذکرہ بالا کتب میں سے بعض کتب عربی' فارسی' ترک' انڈونیشی' مالائی' ہندی اور بنگالی زبانوں میں بھی شائع ہو چکی ہیں۔

اُردو کتب (Books in Urdu):

-1 تحریک اسلامی عصر حاضر میں (ہم عصر اسلامی تحریک)' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1995ء)
-2 قرآن اور سائنس (مفصل تعارف کے ساتھ سید قطبؒ کی تفسیر سے اقتباسات)
-3 نشاۃ ثانیہ کی راہ (اسلامی احیائے علوم کی طرف)' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1974ء)
-4 انشورنس اسلامی معیشت میں' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1974ء)
-5 غیر سودی بنکاری' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1969ء)
-6 شرکت و مضاربت کے شرعی اصول' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1969ء)
-7 اسلام کا نظریہ ملکیت' (دو جلدیں)' اسلامک پبلی کیشنز' لاہور' پاکستان (1969ء)
-8 اسلام کا نظامِ محاصل (ابو یوسف کی کتاب الخراج کا ترجمہ)' اسلامک پبلی کیشنز' لاہور' پاکستان (1966ء)
-9 اسلام میں عدل اجتماعی (سید قطب کی 'العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام' کا ترجمہ)' اسلامک پبلی کیشنز' لاہور' پاکستان (1963ء)
-10 اسلامی ادب' مرکزی مکتبہ اسلامی' دہلی' انڈیا (1960ء)

زمانہ طالب علمی میں اعلیٰ قابلیت کا اعزاز:

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی نے 1956ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (انڈیا) میں بی اے میں داخلہ لیا۔ انہوں نے 1958ء میں بی اے اور 1960ء میں ایم اے کے امتحانات میں کامیاب ہونے والے امیدواروں میں ٹاپ پوزیشنز حاصل کیں۔ ایم اے کے بعد ڈاکٹر صدیقی کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات میں 1961ء میں لیکچررشپ دے دی گئی۔ وہ 1975ء تک اس حیثیت پر سرفراز رہے۔ تاہم 1975ء میں انہیں اسی یونیورسٹی میں ایسوسی ایٹ پروفیسر مقرر کر دیا گیا۔ لیکچرار کے طور پر کام کرنے کے دوران میں وہ 1961ء سے 1963ء کے عرصہ میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہاسٹل کے وارڈن کے طور پر بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کی تحریری کاوشوں سے استفادہ:

عالم اسلام کے نامور مفکر اور سکالر ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی نے علم معاشیات میں اسلامی نقطہ نظر کے فروغ کے لیے گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی تحریری کاوشوں سے کچھ اہم مؤقفات اور نکات حسب ذیل ہیں۔

اللہ کی نعمتیں چند افراد یا کسی طبقہ کی میراث نہیں:

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی کا کہنا ہے کہ اللہ کی نعمتیں سب انسانوں کے لیے ہیں' یہ کسی خاص طبقہ یا مخصوص افراد کے لیے نہیں ہیں کہ وہ ان پر قابض ہو کر بیٹھ جائیں۔ وہ لکھتے ہیں:۔

> ''ملکیت کے یہ مقاصد اور وحدت بنی آدم کا اسلامی تصور تقاضا کرتا ہے کہ خدا نے انسان کو جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں وہ چند افراد یا کسی طبقہ کی میراث بن کر نہ رہ جائیں بلکہ ان سے تمام انسانوں کو مستفید ہونے کا موقع ملے۔ بنی آدم ایک خاندان ہیں اور کائنات کی جن اشیاء اور قوتوں کو اس پورے خاندان کی تحویل میں دیا گیا ہے ان سے استفادہ میں سارے انسانوں کو ایک خاندان کے افراد کی طرح کا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔ ملکیت کے باب میں ایک انسان اور دوسرے انسان کا باہمی تعلق صلہ رحمی' مواخات اور ایثار و تعاون پر مبنی ہونا چاہیے نہ کہ خود غرضی اور کشمکش و نزاع پر۔ قرآن مال و املاک کی کسی ایسی تقسیم کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں جو انسانوں کے ایک طبقہ کو مقصد زندگی کے حصول کے ناگزیر ذرائع سے محروم کر دے یا بیشتر وسائل حیات کو چند افراد' کسی ایک گروہ یا طبقہ کے ہاتھوں میں مرکوز کر دے۔ ملکیت قیام حیات اور تزکیہ و ترقی کا ذریعہ ہے اور خدا کی مرضی یہی ہے کہ یہ ذریعہ ہر ایک کو حاصل ہو اور وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھائے۔''

(اسلام کا نظریۂ ملکیت: ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی' جلد اول' صفحہ 37,36' مطبوعہ اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور)

انفرادی حقوق کا مغربی و اسلامی تصور:

ڈاکٹر نجات اللہ نے انفرادی حقوق کے بارے میں مغربی اور اسلامی تصور کے اختلاف کی صراحت ان الفاظ میں کی ہے:

> ''معاصر مغربی تہذیب نے حقوق و فرائض کی یہ ترتیب بالکل اُلٹ دی ہے اور ایک ایسا مزاج بنا دیا ہے جو سماجی فکر کا آغاز فرد کے حقوق سے کرتا ہے نہ کہ اس کی ذمہ داریوں سے۔ انفرادیت پرستانہ سرمایہ داری کے تحت یہ کج روی انتہا تک جا پہنچی۔ عملی سیاست اور نظری علوم دونوں پر اس

فسادِ مزاج کا گہرا اثر پڑا۔ خاص طور پر ملکیت کے سلسلہ میں عام آدمی کے سوچنے کا انداز' ماہرین معاشیات کا طرزِ استدلال' اور حکومتوں کی قانون سازی اسی سانچہ میں ڈھل گئی۔ اس رجحان کا آغاز یورپ میں سولہویں اور سترہویں صدی میں ہوا تھا۔ اس وقت سیاست' معیشت اور معاشرت' ہر میدان میں جبر و استبداد اور قہر و برتری کا تسلط تھا۔ اس کے ردِ عمل میں لبرل سیاست دانوں اور آزادی کاروبار کے قائل ماہرین معاشیات نے انفرادی حقوق اور انفرادی آزادی پر زور دیا۔ ابتداءً اس تحریک نے رائج طور طریقوں کو اعتدال پر لانے کا مفید عمل انجام دیا مگر جلد ہی انتہا پسندانہ انفرادیت کے برے اثرات ظاہر ہونے لگے۔ بیسویں صدی میں دھارے کا رخ بدلنے تک ساری متمدن دنیا پر یہی مزاج چھا گیا۔ اسلام انفرادی حقوق کی کسی مطلق اور مقدس فہرست کا قائل ہیں۔ حقوق کسی کے بھی ہوں' فرد کے یا ریاست کے' کبھی غیر مشروط' مطلق اور مقدس نہیں ہوتے۔ ان کی نوعیت اور وسعت کا انحصار تمام تر ان ذمہ داریوں پر ہوتا ہے جن کی انجام دہی کے لیے وہ دیے گئے ہوں۔ ریاست کے اختیارات اس کی ذمہ داریوں کی روشنی میں اور فرد کے حقوق اسکی ذمہ داریوں کی روشنی میں متعین ہوتے ہیں۔ متعلقہ ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوتاہی صاحب حق کے استحقاق کو کمزور کر دیتی ہے اور مسلسل غلط کاری اور فرض ناشناسی پر ان حقوق کو سلب بھی کر لیا جاتا ہے۔ اس اصول سے نہ ریاست مستثنیٰ ہے نہ فرد۔ اس اصول کا اطلاق مال واملاک رکھنے اور ان میں تصرف کرنے کے حق' آزادیٔ کاروبار اور سیاسی آزادی کے حق' اور زندہ رہنے کے بنیادی حق' سب پر یکساں ہوتا ہے۔"

(اسلام کا نظریۂ ملکیت' جلد اول' صفحہ 72,71)

حقیقی جمہوریت کے لیے کسبِ معاش کا ایک وسیع میدان ضروری ہے:

ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اس مؤقف کے قائل ہیں کہ اصلی جمہوریت صرف اسی صورت میں پنپ سکتی ہے جب کہ افرادِ معاشرہ کو آزادانہ اور وسیع کسبِ معاش کے ذرائع اور مواقع حاصل ہوں۔ اس نقطۂ نظر کو وہ ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

"جمہوریت کے تقاضے اسی وقت پورے کیے جاسکتے ہیں جب معاشرہ میں افراد کی ایک بڑی تعداد اپنی معاشی زندگی میں حکومت کی دست نگر نہ ہو اور اس کی دو وقت کی روٹی کا انحصار حکومت کی تنخواہ یا وظیفے پر نہ ہو۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب آزادانہ کسبِ معاش کے مواقع حاصل ہوں اور افراد پیدائش دولت کا کاروبار کر سکتے ہوں۔ اس کے لیے بہت سے ذرائع پیدائش کا اجتماعی ملکیت سے باہر ہونا ضروری ہے۔ فرد کی سیاسی طاقت کا انحصار اس پر ہے کہ وہ معاشی طور پر حکومت وقت سے بے نیاز ہو کر بھی زندہ رہ سکے اور ترقی کر سکے۔ جو فرد معاشی طور پر کسی کا دست نگر ہو وہ اس کے خلاف کسی سیاست طاقت کا حامل نہیں ہوسکتا۔ سماج میں بہت سے ذرائع

پیدائش دولت' اور بہت سے مواقع روزگار کا حکومت کے پورے قبضہ واختیار سے باہر ہونا اس بات کی ضمانت ہوگا کہ بہت سے افراد آزادانہ رائیں قائم کریں اور اس کا اظہار کریں۔ اسی شکل میں یہ ممکن ہوگا کہ حکومتِ وقت کا کوئی ملازم یا قومی صنعتوں میں کام کرنے والا کوئی مزدور' اگر حکومت کی پالیسیوں کو غلط سمجھے اور اس کا ضمیر ان پالیسیوں کے نفاذ میں تعاون کے لیے آمادہ نہ ہو' تو وہ حکومت کی چاکری ترک کر کے نجی کاروبار کے دائرہ میں روزگار حاصل کر لے۔ سچی آزادی ضمیر اور حقیقی جمہوریت کے لیے کسب معاش کا ایک وسیع میدان ضروری ہے۔ جہاں کوئی بھی فرد حکومت سے بے نیاز ہو کر اپنی روزی کما سکے۔ (اسلام کا نظریہ ملکیت' جلد اول صفحہ 120, 121)

معدنیات اور دفینوں (رکاز) کی ملکیت کا مسئلہ:

ڈاکٹر نجات اللہ نے معدنیات اور دفینوں (رکاز) کی ملکیت کے مسئلہ کو زیر بحث لاتے ہوئے اس کی وضاحت مختلف معتبر حوالہ جات کے ساتھ مندرجہ ذیل الفاظ میں کی ہے۔

''پانی' آگ اور چارے وغیرہ کی طرح معدنی اشیاء کے وہ ذخیرہ بھی مباح عام ہیں جو سطح زمین پر کھلے ہوئے پائے جائیں (یعنی معاون ظاہرہ) اور جن کے حصول میں زیادہ محنت کی ضرورت نہ پڑتی ہو۔ نمک' تارکول' پارہ اور کیمیاوی خاصیتیں رکھنے والے معدنی پانی کے ذخیرے اسی ذیل میں آتے ہیں۔ ہر فرد کو ان ذخیروں سے استفادہ کا حق حاصل ہے جو فرد ان چیزوں کو جتنی مقدار میں نکالے گا وہ قبضہ کی بنا پر ان کا مالک ہو جائے گا۔ البتہ خود یہ ذخیرے انفرادی ملکیت نہیں بنائے جا سکتے۔ یہی حیثیت سمندر میں پائے جانے والے موتی' مرجان اور دوسری قیمتی اشیاء کی بھی ہے۔

ان معدنی ذخیروں کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے جو زمین کے اندر چھپے ہوئے پائے جاتے ہیں (یعنی معاون باطنہ) اور جن کے نکالنے میں کافی محنت اور اخراجات کی ضرورت پڑتی ہے۔ مثلاً سونے' چاندی' لوہے اور تانبے وغیرہ کی کانیں۔ حنفی' شافعی اور حنبلی رحمہم اللہ علیہم مکاتب فقہ کی رائے یہ ہے کہ اگر یہ کانیں کسی شخص کی مملوکہ زمین میں پائی جائیں تو مالک زمین کی یا اس شخص کی ملکیت ہوں گی جس کو زمین کے مالک نے ان کے نکالنے کی اجازت دی ہو۔ اگر یہ کانیں غیر مملوکہ اور مباح عام زمینوں میں پائی جائیں تو اس شخص کی ملکیت ہوں گی جو ان کو دریافت کرے اور نکالے۔ تفصیلات کے اندرون مکاتب فقہ کے درمیان اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک اس مسئلہ میں قابلِ ترجیح رائے مالکی مکتب فقہ کی ہے۔ جس کے مطابق زمین کے اندر پائی جانے والی کانیں اصلاً تمام مسلمانوں کی ملکیت ہیں اور ان کی مالک مختار اسلامی ریاست ہے۔''

ڈاکٹر نجات اللہ آگے لکھتے ہیں:

''دفینوں سے مراد وہ سکے' سونے چاندی کے برتن' اسلحہ' اور دوسرے قیمتی سامان ہیں جو زمین

کے اندر دفن کیے ہوئے پائے جائیں۔ اگر قرائن سے یہ ثابت ہو جائے کہ دفینہ اسلامی دورِ حکومت سے پہلے کا ہے اور اس کا مالک کوئی مسلمان یا ذمی نہیں تھا تو وہ پانے والے کی ملکیت بن جائے گا۔ بشرطیکہ اس نے اسے اپنی مملوکہ زمین میں یا کسی ایسی زمین میں پایا ہو جو کسی کی ملکیت نہ ہو۔ مملوکہ زمین میں پائے جانے والے دفینے زمین کے مالک کی ملکیت قرار پائیں گے۔ دفینہ اگر ریاست کی کسی زمین میں پایا گیا ہے تو وہ ریاست کی ملکیت قرار پائے گا۔

اگر سکے اسلامی دور کے ہوں' یا قرائن سے یہ ثابت ہو جائے کہ مال مدفون کسی مسلمان یا ذمی کی ملکیت تھا تو وہ 'لقطہ' قرار پائے گا اور پانے والے کی ملکیت میں نہیں داخل ہوگا۔ اگر دفینہ کی حیثیت مشتبہ ہو' اور قرائن سے اس بات کا فیصلہ نہ کیا جا سکے کہ وہ کس دور کا ہے اور کس کی ملکیت ہے تو ایک رائے یہ ہے کہ اسے غیر اسلامی دور کا دفینہ قرار دے کر زمین کے مالک کی' یا غیر مملوکہ زمین میں اسے پانے والے کی ملکیت قرار دیا جائے اور دوسری رائے یہ ہے کہ اسے اسلامی دور کا مال سمجھ کر لقطہ قرار دے دیا جائے۔" (اسلام کا نظریہ ملکیت' جلد اول' صفحہ 142، 143)

اسلام میں کاروبار کے لیے دیے جانے والے قرضوں پر سود حرام ہے:

ڈاکٹر نجات اللہ نے لکھا ہے کہ اسلام میں کاروباری مقاصد کے لیے دیے جانے والے قرضہ جات پر سود قطعاً حرام ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"پیداواری عمل میں سرمایہ کا حصہ یہ ہے کہ وہ خود کو کاروباری فرد کے ان فیصلوں کا تابع بنائے جو وہ غیر متعین کاروباری امور میں کرتا ہے' اور خسارہ کا خطرہ مول لے۔ قرض سرمایہ پیداواری عمل میں یہ حصہ نہیں لیتا۔ پھر وہ کون سا عمل ہے جس کے عوض اصل سرمایہ کی واپسی کے ساتھ سود کا بھی مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔ ...... اسلام کے نزدیک کاروباری اغراض کے لیے دیے جانے والے قرضوں پر بھی سود حرام ہے کیونکہ اس کے اصول کے مطابق سرمایہ دار اسی صورت میں اپنے سرمایہ کے ذریعہ نفع کما سکتا ہے جب وہ ہر حال میں کاروبار کے نتائج میں شریک رہے۔ نفع ہو تو نفع پائے اور نقصان ہو تو نقصان اٹھائے۔ نفع وہی حاصل کر سکتا ہے جو نقصان ہونے کی شکل میں نقصان بھی گوارا کرے۔ نقصان کی ذمہ داری سے کنارہ کش رہ کر سرمایہ پر نفع کمانے کی کوئی بھی شکل اسلام میں جائز نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت واضح الفاظ میں اس اصول کی تصریح فرما دی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "فائدہ نقصان اٹھانے کی ذمہ داری کے ساتھ وابستہ ہے۔"

(اسلام کا نظریہ ملکیت' جلد اول' صفحہ 174، 175)

ایک تہائی ترکہ کی حد تک وصیت کے حق کی حکمت:

اسلام نے ایک تہائی ترکہ کی حد تک وصیت کا حق دیا ہے۔ اس میں کیا حکمت پوشیدہ ہے اس کا

جواب ڈاکٹر نجات اللہ نے ان الفاظ میں دیا ہے:

"اسلام نے ایک تہائی ترکہ کی حد تک وصیت کا حق دے کر اہم انسانی مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ مثلاً بعض اوقات مالک کا کوئی رشتہ دار دوسرے قریبی ورثاء کے موجود ہونے کے سبب ترکہ میں حق دار نہیں ہوتا' حالانکہ وہ ناداری کے باعث اس کا مستحق ہوتا ہے' یا اس سے تعلق یا کسی اور مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ترکہ میں اسے بھی کچھ حصہ ملے۔ حق وصیت کے ذریعہ مالک کو اس بات کا موقع ملتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے حق میں بھی کچھ مال چھوڑ جائے۔ اسی طرح اس حق سے کسی محسن کے احسان کا بدلہ دینے' کسی کمزور کو سہارا دینے اور رفاہ عامہ یا دینی امور کے نگران کسی ادارہ کی مدد کرنے کے بھی مواقع ملتے ہیں۔" (اسلام کا نظریہ ملکیت' جلد اول' صفحہ 195)

قرض اور عاریت کی اہمیت:

قرض اور عایت کی اہمیت بیان کرتے ہوئے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی رقمطراز ہیں:

"قرض اور عاریت کی اہمیت بعض اوقات انفاق مال سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ غیرت مند افراد ضرورت کے باوجود صدقہ خیرات قبول کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔ ان سے کبھی اس بات کی توقع نہیں کی جاتی کہ وہ دوسروں کے آگے دست سوال دراز کریں گے' اور ان کو اپنی حاجت مندی کا یقین دلانے کے لیے الحاح سے کام لیں گے۔ لیکن اس حقیقت سے کسے انکار ہو سکتا ہے کہ سفید پوش شرفاء کو بھی ضرورتیں لاحق ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی مدد قرض یا عاریت دے کر بدرجۂ احسن کی جا سکتی ہے۔" (اسلام کا نظریہ ملکیت' جلد اول' صفحہ 280)

ڈاکٹر نجات اللہ نے اس ضمن میں علامہ ابن قیم کا اقتباس (الطرق الحکمیہ فی السیاسۃ الشرعیہ۔ صفحہ 239' مطبعۃ المؤید مصر' 1317ھ) نقل کیا ہے:

"فرض کیجئے کہ آدمی کسی دوسرے فرد کے گھر میں قیام پر مجبور ہو جائے اور اسکے علاوہ اسے کوئی ٹھکانہ نہ میسر ہو' یا کسی خاص سرائے میں اترنے پر مجبور ہو جائے یا اسے کوئی کپڑا مستعار لینے کی شدید ضرورت ہو تا کہ اس کے ذریعہ سردی سے بچ سکے۔ یا اسے آٹا پیسنے کی چکی کی سخت ضرورت ہو' یا پانی نکالنے کے لیے ڈول کی شدید حاجت ہو' یا ہانڈی' کلہاڑی وغیرہ کی سخت ضرورت پیش آ جائے' تو اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ مالک پر ان چیزوں کا اسے دے دینا واجب ہے۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ اسے کرایہ وصول کرنے کا حق ہو گا یا نہیں .... ہمارے استاد رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے کہ اس پر ان چیزوں کا بلاعوض مستعار دینا واجب ہے' اور کتاب وسنت میں اس کے دلائل موجود ہیں۔" (اسلام کا نظریہ ملکیت' جلد اول' صفحہ 283)

لاوارث ترکے:

ڈاکٹر نجات اللہ نے لاوارث ترکوں کے بارے میں لکھا ہے:

"ایسے تمام ترکے جن کا کوئی وارث نہ موجود ہو' نہ مالک نے وصیت کے ذریعہ کسی کی طرف

منتقل کیا ہوا اسلامی ریاست کی ملکیت قرار پاتے ہیں' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے" اور جس کا کوئی وارث نہ ہو اس کا وارث میں ہوں' میں اس کا ترکہ پاؤں گا اور اس کی طرف سے دیت ادا کروں گا۔"

ماوردی نے لکھا ہے:

"جن املاک کے مالک مر گئے ہوں اور کوئی وارث حصہ وراثت یا عصبہ کے حق کی بنا پر ان کا مستحق نہ ہو۔۔۔ تمام مسلمانوں کی میراث کے طور پر بیت المال کی طرف منتقل ہو جائیں گی اور ان کی مصلحت کے کاموں میں خرچ کی جائیں گی۔"

(اسلام کا نظریہ ملکیت' حصہ دوم' صفحہ 57, 59, 59)

معاشی ترقی کا اہتمام کرنا ریاست کی بھی ذمہ داری ہے:

ڈاکٹر نجات اللہ کا کہنا ہے کہ اسلامی ریاست کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کی معاشی ترقی کے لیے خاطر خواہ اقدامات کرے' وہ لکھتے ہیں کہ" کفالتِ عامہ کی طرح ملک کی معاشی تعمیر و ترقی بھی ایک اجتماعی فریضہ ہے۔ اگر کفالتِ عامہ سے افراد کی ضروریات کی تکمیل اور قیامِ حیات وابستہ ہے تو معاشی تعمیر و ترقی سے پورے اجتماع کا قیام و بقاء' اس کی قوت کا استحکام اور اس کے جملہ دنیوی مصالح وابستہ ہیں' جن کا تحفظ ریاست کو وجود میں لانے کا ایک اہم سبب ہے۔ یہ ذمہ داری اگرچہ افراد پر ان کی انفرادی حیثیتوں میں بھی عائد ہوتی ہے لیکن اجتماع کے نمائندہ صاحب اقتدار ادارہ ریاست پر اس کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔"

(اسلام کا نظریہ ملکیت' حصہ دوم' صفحہ 123)

تقسیم دولت میں تفاوت کو کم کرنا اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے:

ڈاکٹر نجات اللہ لکھتے ہیں کہ:

"ہمیں اس حقیقت میں کوئی شبہ نہیں کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کا صحیح مفہوم وہ ہے جو خلافتِ راشدہ کے عمل سے ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسلام کسی فرد پر کسبِ دولت کے سلسلہ میں کوئی اصولی اور دائمی پابندی نہیں عائد نہیں کرتا لیکن اسے یہ بات پسند نہیں ہے کہ دولت سماج کے ایک طبقہ میں مرکوز ہو کر رہ جائے۔ قرآن' سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم اور خلافتِ راشدہ کے نظائر کی روشنی میں ہم اطمینان کے ساتھ یہ رائے قائم کر سکتے ہیں کہ دولت اور آمدنی کی تقسیم کے اندر تفاوت کو کم کرنا اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک رہنما اصول ہے۔"

(اسلام کا نظریہ ملکیت' حصہ دوم' صفحہ 152)

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی

سوال: علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی حالات زندگی بیان کریں اور ان کے معاشی افکار پر روشنی ڈالیں۔

تعارف (Introduction):

علامہ یوسف القرضاوی ایک مصری اسلامی سکالر تھے۔ وہ "الجزیرہ" ٹی وی پر چلنے والے اپنے پروگرام "الشریعۃ والحیاۃ" (شریعت اور زندگی) کی وجہ سے خاصے مشہور رہے۔ وہ "اسلام آن لائن" نامی ویب سائٹ کے باعث بھی مشہور تھے جو انہوں نے 1997ء میں قائم کی تھی۔ اور اس کے لیے انہوں نے عظیم مذہبی سکالر کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

القرضاوی 9 ستمبر 1926ء کو مصر میں دریائے نیل کے ڈیلٹا میں واقع ایک گاؤں سفات تراب (Safat Turab) میں آباد راسخ العقیدہ مسلمان کسانوں کے ایک غریب خاندان کے ہاں پیدا ہوئے۔ صرف دو سال کی عمر میں ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کے چچا نے ان کی پرورش کی ذمہ داری اٹھائی۔ انہوں نے صرف نو سال کی عمر میں پورا قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ انہوں نے اس کے بعد مذہبی علوم کی درسگاہ میں داخلہ لے لیا۔ انہوں نے اسلامی علوم کے حصول کے لیے دینیات (علم کلام) میں داخلہ لیا اور 1953ء میں گریجویشن کی۔ انہوں نے 1958ء میں ایڈوانسڈ عریبک سٹڈیز انسٹی ٹیوٹ سے عربی زبان وادب میں ڈپلوما حاصل کیا۔ انہوں نے اس کے بعد اصول دین کے پروگرام میں گریجویشن کے لیے داخلہ لیا اور 1960ء میں قرآنی علوم میں ماسٹرز ڈگری کے ساتھ گریجویشن بھی کی۔ 1962ء میں الازہر یونیورسٹی نے انہیں مذہبی علوم کے ثانوی قطری ادارہ کی سربراہی کے لیے قطر بھیج دیا۔ انہوں نے اول درجہ میں 1973ء میں پی ایچ ڈی کا مقالہ بعنوان "زکوٰۃ اور سماجی مسائل کے حل پر اس کے اثرات" مکمل کیا اور الازہر یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی ڈگری سے نوازا۔

1977ء میں انہوں نے اسلامی علوم کی فیکلٹی کی بنیاد رکھی اور اس فیکلٹی کے ڈین (Dean) بنے۔ اسی برس انہوں نے "مرکز تحقیق سیرت وسنت صلی اللہ علیہ وسلم" کی بنیاد رکھی۔ انہوں نے مصر کے ادارہ آئمہ (Institute of Imams) کے لیے بھی خدمات انجام دیں۔ بعد ازاں وہ قطر میں واقع فیکلٹیز آف شریعہ اینڈ ایجوکیشن میں اسلامی شعبہ کے ڈین (Dean) کے طور پر دوحا چلے گئے جہاں انہوں نے 1990ء تک اپنی گرانقدر خدمات پیش کیں۔ 1990-91ء میں ان کی تقرری الجیریا میں واقع "دی سائنٹفک کونسل آف اسلامک یونیورسٹی اینڈ ہائیر انسٹی ٹیوشنز" کے چیئرمین کے طور پر کی گئی۔ وہ ایک مرتبہ پھر قطر یونیورسٹی کے "سیرت وسنت کے مرکز" کے ڈائریکٹر کے طور پر قطر واپس گئے۔ القرضاوی آئرلینڈ میں واقع اسلامی علوم کے ادارہ "یورپی کونسل برائے فتویٰ وتحقیق" کے سربراہ بھی رہے۔

القرضاوی نے 120 سے زائد کتب تصنیف کیں۔ انہوں نے آٹھ بین الاقوامی پرائز بھی حاصل

کیے۔ عالمی سطح پر بے حد مؤثر دینی سکالر تسلیم کیے جاتے تھے۔ انہوں نے ایک مصری تنظیم "Muslim Brother Hood" کی فکری قیادت میں طویل عرصہ نمایاں کردار ادا کیا۔ لیکن 1976ء اور 2004ء میں انہوں نے دو مرتبہ اس تنظیم میں سرکاری کردار ادا کرنے کی پیشکش ٹھکرا دیں۔

قرضاوی کے بعد خیالات مغربی دنیا میں خاصے متنازعہ رہے، چنانچہ 2008ء میں انہیں برطانیہ نے ویزا دینے سے انکار کیا اور 2012ء میں انہیں فرانس میں داخلے سے روک دیا گیا۔ قرضاوی سوئٹزرلینڈ کے التقویٰ گروپ کے ایک بنک "التقویٰ بنک" کے حصے دار اور مشیر بھی رہے۔ 2008ء میں ایک آن لائن رائے دہی (Poll) میں القرضاوی کو دنیا کے تیسرے سب سے بڑے دانش ور (صاحب فکر و دانش) کے طور پر منتخب کیا گیا۔

اعزازات (Awards):

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی نے مندرجہ ذیل اعزازات حاصل کیے جو انہیں مختلف ممالک اور اداروں نے اسلامی معاشرہ کے لیے ان کی گراں قدر خدمات کے اعتراف میں جاری کیے:

(i) دی پرائز ان اسلامک اکنامکس (1991ء)

(ii) دی پرائز فار اسلامک سٹڈیز (1994ء)

(iii) سلطان حسن البولکیا (سلطان آف برونائی) ایوارڈ فار اسلامک جیورس پروڈنس (1997ء)

(iv) سلطان الاویس ایوارڈ فار کلچرل اینڈ سائنٹفک اچیومنٹس (1999ء۔1998ء)

(v) دی ایوارڈ فار اسلامک پرسنالٹی آف دی ایئر (2000ء)

(vi) حکومتِ قطر کی طرف سے علوم اسلامیہ کے میدان میں خدمات کے اعتراف میں ریاستی اعتراف کا ایوارڈ (2008ء) (The State Acknowledgment Award)

(vii) ملائیشیا کی حکومت کی طرف سے توکو ما آل ہجرہ (ہجرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم) Tokah Ma'al Hujrah Award (2009ء)

القرضاوی کی اہم کتب (Al-Qaradawi's Major Books):

(i) دوحا (1996ء)

(ii) اسلام: خاتون اور خاندان کے مسائل پر جدید فتوے (دار الشہاب 'الجیریا' 1987ء)

(iii) فقہ الزکوٰۃ (دار التقویٰ 2005ء)

(iv) فقہ الجہاد (واہبہ بک شاپ' 2009ء)

(v) اسلام: مستقبل کی تہذیب۔

(vi) اسلام اور معاشی تحفظ۔

(vii) اسلام میں حلال و حرام' ترجمہ شمس پیرزادہ' اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور۔

(viii) غیر ملکی نظام ہائے زندگی (الحلول المستوردہ)

شیخ یوسف القرضاوی سکالرشپس:

2009ء میں قطر فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز نے ہر سال پانچ طلبہ کو پوسٹ گریجویٹ سطح کے لیے ''شیخ یوسف القرضاوی سکالرشپس'' دینے کا آغاز کیا۔

قرضاوی سنٹر برائے اسلامی اعتدال پسندی وتجدید:

قطر فیکلٹی آف اسلامک سٹڈیز نے ڈاکٹر قرضاوی کی خدمات کے اعتراف میں اپنا ایک نیا تحقیقی مرکز قائم کیا جس کا نام انہوں نے ڈاکٹر قرضاوی سے منسوب کیا اور اس کا نام ''قرضاوی سنٹر برائے اسلامی اعتدال پسندی وتجدید'' (The Qaradawi Center for Islamic Moderation and Renewal) رکھا۔

ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی تحریری کاوشوں سے استفادہ:

علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی کی شہرہ آفاق تصانیف میں سے بعض اہم افکار وخیالات حسب ذیل ہیں۔

اسلام اور معاشیات:

''اکثر لوگ اس وہم کا شکار ہیں کہ اسلام کا معاشیات کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ دین اور دولت دو متضاد چیزیں ہیں جو کبھی اکٹھا نہیں ہوتی ہیں۔ معاشیات زندگی کے صرف مادی پہلو سے سروکار رکھتی ہے جبکہ دین کا تعلق اس کے روحانی پہلو کے ساتھ ہے۔ معاشیات مادہ میں استغراق کا نام ہے جبکہ دین اس مادہ پر بالادستی اور غلبہ پانے کا سبق دیتا ہے......... یہ تصور دوسرے مذاہب کے بارے میں تو صحیح ہوسکتا ہے لیکن اسلام کے بارے میں یہ رائے درست نہیں ہے۔ اسلام نے مال کو انسانی زندگی کا قوام ومدار قرار دیا ہے۔ ''اپنے اموال کو جن کو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے' نادان افراد کے سپرد نہ کرو'' (النساء: 4)۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی طرح' جیسا کہ ان کی طرف ایک قول منسوب کیا جاتا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مال کی کشادگی کی وجہ سے آسمانی بادشاہت کے دروازے انسان پر بند نہیں کیے ہیں۔ اس کے برعکس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے ''بہترین صالح مال ایک صالح آدمی کا حق ہے۔'' اسلام کے ارکان خمسہ میں سے ایک رکن مالی ہے جسے زکوٰۃ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ سات بڑی بڑی برائیاں جو ایمان کو برباد کردیتی ہیں ان میں سے ایک کا تعلق مال سے ہے اور وہ سود ہے...... اسلام نے صنعت وحرفت کی ترغیب دی ہے اور ہمارے سامنے کئی ایسے انبیاء علیہم السلام وصلحاء کرام کی مثالیں پیش کی گئی ہیں جن کا پیشہ دستکاری تھا۔''

(اسلامی نظام کے خدوخال: علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی' مترجم ابوالظفر احمد انصاری' صفحہ 37 تا 39 مطبوعہ ادارہ دراسات اسلامیہ لاہور)

انفرادی ملکیت:

''اسلام نے اپنے اقتصادی نظام کی بنیاد انفرادی ملکیت کے اقرار پر رکھی ہے کیونکہ اس میں انسان کے اندر پائے جانے والے فطری محرک کی تسکین پائی جاتی ہے۔ ورنہ یہ نظام سیادت و قیادت کے شعور سے پروان چڑھتا ہے کیونکہ ایک آزاد آقا کی شان یہ ہے کہ وہ صاحب ملکیت ہوتا ہے اور اپنی ملکیت میں تصرف کا اختیار رکھتا ہے۔ اس کے برعکس ایک غلام نہ کسی چیز کا مالک ہوتا ہے اور نہ اسے اس میں تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے.........
لیکن اسلام نے ملکیت حاصل کرنے کے لیے کچھ اسباب مقرر کیے ہیں' ان کی افزائش و نمو کے کچھ حدود متعین کیے ہیں اور اس پر چند ہنگامی اور مستقل نوعیت کے حقوق عائد کیے ہیں۔ سب سے پہلے اسلام نے مال کے مالکِ حقیقی کو ملحوظ رکھا ہے جو اللہ تعالیٰ کی بزرگ و برتر ذات ہے۔ مال کے بارے میں انسان کی حیثیت صرف امین کی ہے یا پھر وکیل کی۔ اور قرآن مجید کی تعبیر کے مطابق انسان اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ کا نائب اور خلیفہ ہے۔''

(اسلامی نظام کے خدوخال' صفحہ 39, 40)

عادلانہ اجرت:

''ہر محنت کار کو ایسی عادلانہ اجرت دی جائے جو اس کے کام کی نوعیت کے مطابق ہو اور معروف طریقہ سے اس کی ضروریات کو پورا کرتی ہو۔ چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیدل جہاد کرنے والے مجاہد کو مال غنیمت سے ایک حصہ دیا اور گھوڑ سوار مجاہدین کو دو یا تین حصے عطا کیے' کیونکہ جنگ میں پیدل مجاہد کی نسبت گھوڑ سوار مجاہد کی صلاحیت زیادہ ہوتی ہے۔ اسی طرح غیر شادی شدہ سپاہی کو مال فے میں سے ایک حصہ دیتے اور شادی شدہ سپاہی کو دو حصے دیتے۔ کیونکہ شادی شدہ سپاہی کی ضروریات غیر شادی شدہ سپاہی کی ضرورت سے زیادہ ہوتی ہیں۔ شادی شدہ سپاہی پر ہی صاحب عیال سپاہی کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کام اور صلاحیت کے ساتھ فرد کی ضروریات کو بھی مدِنظر رکھتے تھے۔''

(اسلامی نظام کے خدوخال' صفحہ 41)

فریضہ زکوٰۃ:

''جس طرح فریضہٴ زکوٰۃ ''تالیف قلوب'' اور ''انفاق فی سبیل اللہ'' کی مدوں پر صرف ہونے والی زکوٰۃ کے ذریعہ دعوت الی الاسلام کی ترغیب میں حصہ لیتا ہے اسی طرح اجتماعی کفالت کے لیے سرمایہ کی فراہمی' عدل اجتماعی کے قیام' سرمایہ اندوزی کے خلاف جنگ' سودی قرضوں کے خاتمہ کی جدوجہد' قرضداروں کو قرض کی ذلت و رسوائی سے نجات دلانے میں زکوٰۃ شریک ہے۔'' (اسلامی نظام کے خدوخال' صفحہ 42)

سرکاری ملازمین کا احتساب:

''سرکاری ملازمین کو عموماً اور کلیدی مناصب پر فائز اعلیٰ افسروں کو خصوصاً قانون کا تابع بنایا جائے۔ ان سے باز پرس کی جائے کہ انہوں نے دولت کہاں سے کمائی ہے تاکہ ان کو ناجائز ذرائع سے دولت سمیٹنے کے

جرم کی سزا دی جاسکے اور وہ تمام دولت یا اس کا وہ حصہ جس پر حرام کا شبہ ہو بحق سرکار ضبط کرلیا جائے اور یہ عمل نبی عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے عین مطابق ہوگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابن اللبیہ سے باز پرس کے بعد اس کا مال ضبط کرلیا تھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنے عہد خلافت میں اپنے گورنروں اور ان کے کارندوں کا گاہے بگاہے محاسبہ کیا کرتے تھے اور ان اہل کاروں نے اپنے دور میں جو مال و دولت کمائی ہوتی اس کا نصف حصہ ضبط کرلیتے۔"

(اسلامی نظام کے خدوخال' صفحہ 45)

قیمتوں سے کھیلنا:

"اسلام نے بازار کو آزاد چھوڑنا پسند کیا ہے کہ طبعی قوانین اپنا کام کرتے ہیں۔ بازار میں اشیاء کی آمد اور ان کی مانگ کی مناسبت سے قیمتوں میں اتار چڑھاؤ ہوتا رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں عہد رسالت میں جب قیمتیں چڑھ گئیں اور لوگوں نے کہا یا رسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم ہمارے لیے اشیاء کے نرخ مقرر کر دیجیے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ ہی قیمتوں کا مقرر کرنے والا ہے۔ گرانی اور ارزانی وہی پیدا کرتا ہے اور رزق دینے والا بھی وہی ہے۔ میں اللہ سے اس حال میں ملنا چاہتا ہوں کہ تم میں سے کوئی شخص بھی خون یا مال کے سلسلہ میں مجھ سے کوئی مطالبہ نہ کرے۔" پیغمبر اسلام نے اس حدیث کے ذریعہ اعلان فرمایا کہ افراد کی آزادی میں بلا ضرورت مداخلت کرنا ظلم ہے۔ لیکن اگر بازار میں غیر طبعی عوامل داخل ہو جائیں مثلاً ذخیرہ اندوزی اور قیمتوں سے کھیلنا تو ایسی صورت میں نرخ مقرر کرنا سماج کی ضرورت کا تقاضا ہے تاکہ نفع اندوزی کرنے والے حریصوں سے سماج کو بچایا جاسکے........ مذکورہ حدیث کا مطلب یہ نہیں کہ نرخ مقرر کرنا ہر حال میں ممنوع ہے خواہ رفع حرج اور صریح ظلم سے روکنے کے لیے کیوں نہ کئے جائیں بلکہ محقق علماء اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ نرخ مقرر کرنا بعض حالات میں تو حرام اور ظلم ہے لیکن بعض حالات میں منصفانہ اور جائز کام ہے۔"

(اسلام میں حلال وحرام: علامہ یوسف القرضاوی۔ مترجم شمس پیرزادہ صفحہ 306-307 اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ لاہور)

سُود کی حرمت:

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سُود اور سُود خوار دونوں کے خلاف اعلان جنگ کردیا اور واضح فرمایا کہ سود سماج کے لیے نہایت خطرناک ہے۔ "جب کسی بستی میں سود اور زنا کا ظہور ہو جاتا ہے تو لوگ اللہ کے عذاب کو دعوت دیتے ہیں۔" (حاکم' ابو یعلی)۔ آسمانی مذاہب میں اسلام پہلا دین نہیں ہے جس نے سُود کو حرام ٹھہرایا ہو بلکہ یہودی مذہب میں بھی سُود حرام تھا' چنانچہ عہد نامہ قدیم میں ہے "جب تیرا بھائی محتاج ہو تو اس کی مدد کر اس سے فائدہ اور نفع طلب نہ کر۔ (خروج 22:24) اور نصرانی مذہب کے بارے میں انجیل لوقا میں ہے "بھلائی کے کام کرو اور قرض دو اس کی واپسی کا انتظار کیے بغیر' ایسی صورت میں تمہارا اجر بڑا ہوگا۔" (لوقا

25,24)۔ افسوس ناک بات یہ کہ عہد نامہ قدیم میں تحریف کر کے "اپنے بھائی" کا مفہوم خاص طور سے "یہودی" لے گیا۔ چنانچہ "سفر تثنیہ الاشتراع" میں ہے: "تو پردیسی کو سود پر قرض دے تو دے پر اپنے بھائی کو سود پر قرض نہ دینا" (استثنا 23:2)۔ (اسلام میں حلال وحرام صفحہ 317,316)

محنت اور سرمایہ کا تعاون:

"اسلامی شریعت نے سرمایہ اور صلاحیت یا مال اور محنت کے درمیان تعاون سے روکا نہیں ہے بلکہ عدل کی بنیاد پر اور صحیح نہج پر تعاون کی صورت پیدا کی ہے۔ چنانچہ اگر صاحب مال اپنے ساتھی کے ساتھ شرکت کا معاملہ کرنا چاہتا ہو تو اسے شرکت کی ذمہ داری اس کے جملہ نتائج کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔ اسی بناء پر اسلامی شریعت نے اس قسم کے معاملہ میں جسے فقہاء "مضاربت" یا "قراض" کہتے ہیں یہ شرط عائد کی ہے کہ معاملہ کے دنوں فریق نفع اور نقصان میں شریک ہوں اور اس کا تناسب وہ آپس میں طے کر لیں.........اور خسارہ ہونے کی صورت میں خسارہ منافع میں سے وضع کر لیا جائے گا۔ لیکن اگر منافع سے زیادہ خسارہ ہو تو یہ زائد خسارہ سرمایہ میں سے وضع کر لیا جائے گا۔ اس میں تعجب کی بات نہیں ہے کہ صاحب مال کو اپنے سرمایہ میں سے خسارہ برداشت کرنا چاہیے کیونکہ اس کے شریک کار کو بھی اپنی محنت اور کوشش کا خسارہ برداشت کرنا پڑتا ہے۔" (اسلام میں حلال و حرام صفحہ 323)

سرمایہ لگانے والوں کا اشتراک:

"اسلام اشتراک کو نہ صرف جائز بلکہ باعث برکت قرار دیتا ہے اور دنیا میں معونت الٰہی اور آخرت میں اجر کا وعدہ کرتا ہے۔ بشرطیکہ جواز کے دائرہ میں رہ کر اور سود، دھوکہ بازی، ظلم، لالچ اور خیانت سے پوری طرح اجتناب کرتے ہوئے شرکت میں کاروبار کیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے ہی کاروباری شرکاء کے بارے میں فرمایا ہے: "اللہ کا ہاتھ اشتراک کرنے والوں پر ہے بشرطیکہ وہ ایک دوسرے کی خیانت نہ کریں لیکن اگر کوئی شریک اپنے ساتھی کے ساتھ خیانت کا معاملہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اپنا ہاتھ اٹھالیتا ہے۔"

(اسلام میں حلال وحرام صفحہ 325)

اسلام کا انشورنس سسٹم:

"اسلام موجودہ صورت میں بیمہ کمپنیوں کا مخالف ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام نفسِ بیمہ ہی کا مخالف ہے۔ نہیں بلکہ اسلام طریقہ اور ذریعہ کا مخالف ہے اگر بیمہ کے لیے دوسرے طریقے اختیار کیے جائیں جو اسلامی معاملات کے منافی نہ ہوں تو اسلام اس کا خیر مقدم کرے گا۔....... بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام نے اسلام کے فرزندوں اور اس کی حکومت کے زیر سایہ رہنے والوں کو اجتماعی تکافل کے ذریعہ یا حکومت اور بیت المال کے ذریعہ بیمہ کی ضمانت دے دی ہے اور وہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اس کی اقتدار کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہو۔" (اسلام میں حلال وحرام صفحہ 329)

حرام تجارت:

''اسلام میں تجارت حرام نہیں ہے الا یہ کہ اس میں ظلم' فریب' نفع اندوزی اور ممنوعات کی ترویج جیسی خرابیاں شامل ہوں۔ لہٰذا شراب' مخدرات' خنزیر' بُت' مجسمہ وغیرہ سے استفادہ کرنا اسلام میں حرام ہے۔ ان کی تجارت کرنا بھی حرام ہے اور ہر وہ کمائی جو ایسی چیزوں کے ذریعہ حاصل ہو حرام اور خبیث ہے اور جو گوشت اس حرام سے پرورش پائے وہ آگ ہی کے لائق ہے...... سونے اور ریشم کی تجارت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ چیزیں عورتوں کے لیے جائز ہیں الا یہ کہ (ان سے بنی ہوئی) کسی ایسی چیز کا کاروبار کیا جائے جن کو صرف مرد استعمال کرتے ہوں۔'' (اسلام میں حلال وحرام' صفحہ 174)

اسلام اور مسئلہ غربت:

''اسلام نے مسئلہ غربت کا جو حل پیش کیا ہے اور جس طرح ضرورت مندوں اور کمزوروں کی کفالت کا نظام قائم کیا ہے اس کی آسمانی مذاہب میں یا وضعی قوانین (انسانوں کے بنائے ہوئے مروجہ قوانین) میں کوئی نظیر نہیں ملتی۔ اور اسلام نے اس سلسلے میں جو نظامِ تربیت و راہنمائی دی ہے اور جو قوانین اور تنظیمات فراہم کیے ہیں اور جو ان قوانین کے نفاذ اور تطبیق کے جو قواعد بتائے ہیں ان کی دنیا کے مذاہب و قوانین میں کوئی مثال نہیں ملتی۔''

(فقہ الزکوۃ: ڈاکٹر یوسف القرضاوی' حصہ اول' صفحہ 71 مترجم ساجد الرحمن صدیقی' مطبوعہ البدر پبلی کیشنز' اردو بازار لاہور)

عہد مدینہ منورہ میں زکوٰۃ کی نوعیت:

''مکی دور میں مسلمانوں کی دعوت اسلام انفرادی تھی اور وہ اپنی اس دعوت کی بنا پر معاشرے سے کٹ کر الگ تھلگ ہو گئے تھے جبکہ مسلمان جب مدینہ منورہ پہنچے تو ایک منظم اجتماعی صورت میں آ گئے اور مدینہ منورہ میں مسلمانوں کی ریاست تشکیل پا گئی اور ان کا اقتدار قائم ہو گیا۔ اس لیے اسلامی ذمہ داریوں نے بھی اس نئی صورت حال میں تعیم اور اطلاق کی جگہ تحدید اور تخصیص کی صورت اختیار کر لی اور جو پہلے راہنمائی کرنے والی ہدایات تھیں وہ اب لازمی قوانین کی صورت اختیار کر گئیں اور ان قوانین کے نفاذ کے لیے ایمان ویقین کے ساتھ ساتھ اقتدار اور قوت سے کام لینا بھی ناگزیر ہو گیا ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں آ کر زکوٰۃ نے بھی یہی صورت اختیار کی کہ شارع علیہ السلام نے ان اموال کی تحدید فرما دی جن میں زکوٰۃ فرض ہے' اور اس کی فرضیت کی شرائط اور اس کی لازمی مقداروں کا تعین فرمایا' اس کے مصارف مقرر کر دیے اور اس کی تنظیم اور اس کے دائرہ کار کا ایک لائحہ عمل مقرر فرما دیا۔'' (فقہ الزکوۃ' حصہ اول' صفحہ 86)

زکوٰۃ ادا نہ کرنے پر دنیاوی سزا:

''سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم نے مانعین زکوٰۃ کو صرف اخروی سزا ہی بیان نہیں کی ہے بلکہ دنیا کی شرعی (قانونی) اور تقدیری سزائیں بھی بیان کی ہیں۔ چنانچہ تقدیری سزا کے بارے میں ارشاد نبوی صلی اللہ علیہ

وسلم ہے کہ "جو قوم زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتی ہے اللہ اسے بھوک اور قحط میں مبتلا فرما دیتا ہے۔" ایک اور حدیث میں ہے کہ "جو لوگ اپنے مالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا چھوڑ دیتے ہیں اللہ ان پر بارش روک دیتا ہے اور اگر جانور نہ ہوں تو بارش بالکل ہی بند ہو جائے۔"

(فقہ الزکوٰۃ' حصہ اول صفحہ 107)

کیا غیر مسلموں سے زکوٰۃ کے بقدر ٹیکس لیا جانا درست ہے؟

"بہرحال یہ مسئلہ اجتہاد کے اہل علمائے کرام کے اجتہاد کا محتاج ہے لیکن بہرحال مطلوبہ اجتماعی اجتہاد خاصا دشوار ہے۔ اس لیے میں ضروری سمجھتا ہوں کہ اس موقع پر میں اپنے مطالعہ اور تحقیق کی روشنی میں بننے والی اپنی ذاتی رائے کا اظہار کر دوں کیونکہ اس انفرادی اجتہاد ہی سے اجتماعی اجتہاد کی راہ ہموار ہو سکے گی ...... میری رائے یہ ہے کہ اگر حکومت وقت موزوں خیال کرے تو غیر مسلم ذمیوں سے بطور ٹیکس زکوٰۃ لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" (فقہ الزکوٰۃ' حصہ اول صفحہ 135)

وقف زمین وغیرہ پر زکوٰۃ:

"صحیح رائے یہ ہے کہ جو ملکیت فقراء کے لیے وقف ہو' یا مجاہدین اور یتیموں کے لیے وقف ہو' یا مساجد' مدارس اور دیگر امور خیر کے لیے وقف شدہ ملکیتوں پر زکوٰۃ نہیں ہے۔ برخلاف اس کے کہ وقف کسی ایک معین فرد یا ایک متعین جماعت کے حق میں ہو مثلاً کسی نے اپنے بیٹے کے حق میں وقف کیا ہو' یا اپنی تمام اولاد کے حق میں وقف کیا ہو' یا کسی اور شخص کی اولاد کے لیے وقف کیا ہو تو اس وقف پر زکوٰۃ واجب ہے' کیونکہ اس صورت میں ملکیت دراصل واقف سے موقوف علیہ (جس کے حق میں وقف کیا گیا ہے) کو منتقل ہو گئی اور وہ مستقلاً اس شے کا مالک ہو گیا اور اس لحاظ سے یہ ملکیت غیر موقوف کے مشابہ ہو گئی۔" (فقہ الزکوٰۃ' حصہ اول' صفحہ 177)

سونے چاندی کے برتنوں اور ان کی آرائشی اشیاء پر زکوٰۃ ہے:

"اس اصول پر فقہاء اسلام متفق ہیں کہ سونے اور چاندی کی جن اشیاء کا استعمال حرام ہے ان پر زکوٰۃ لازم ہے۔ برتنوں کی حرمت صحیح حدیث میں بیان ہوئی ہے اور ان کے استعمال پر سرزنش (وعید) بھی آتی ہے کیونکہ سونے اور چاندی کے برتنوں کے استعمال سے تعیش کا اظہار ہوتا ہے اور یہ اسراف بھی ہے اور نیز اس لیے کہ سونے اور چاندی کے برتن بنا لینے سے یہ کنز (خزانہ) بن جاتے ہیں اور ان نقود کی ثروت بلا ضرورت معطل ہو جاتی ہے۔ خواہ یہ برتن کھانے پینے کے استعمال کے لیے ہوں یا محض زینت و آرائش کے طور پر ہوں۔ دونوں صورتوں میں انہیں قابل مذمت تعیش قرار دیا جائے گا۔" (فقہ الزکوٰۃ' حصہ اول' صفحہ 374)

تجارتی سامان پر زکوٰۃ کا وجوب:

"کتاب و سنت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسی کوئی دلیل موجود نہیں ہے جس سے تجارتی سامان اس حق معلوم (زکوٰۃ) سے مستثنیٰ قرار پاتا ہو بلکہ ابن العربی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ خذ من اموالهم صدقة کے

حکم عام ہے جو ہر قسم کے مال پر اور اس کی انواع پر مشتمل ہے اور اس عموم میں تخصیص کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ (شرح الترمذی ج 3 ص 104) (فقہ الزکوٰۃ حصہ اول صفحہ 420)

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مسلک ہر ارضی پیداوار پر زکوٰۃ:

''امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک ہر اس ارضی پیداوار پر جس سے افزائش زمین مقصود ہو اور جس سے لوگ بالعموم فائدہ حاصل کرتے ہوں زکوٰۃ ہے اور ان کے نزدیک لکڑی، گھاس پھوس اور ایرانی بانس مستثنیٰ ہے۔ اس لیے کہ ان اشیاء کی لوگ بالعموم پیداوار نہیں کرتے۔ بلکہ اس سے زمین کو صاف کر دیتے ہیں لیکن اگر کوئی شخص (حصول منفعت کے لیے) لکڑی والے درخت یا بانس یا گھاس ہی زمین میں اُگا لے تو اس پر عشر عائد ہو جائیگا۔'' (فقہ الزکوٰۃ حصہ اول صفحہ 470)

خراج ہمیشہ کے لیے لازم ہوتا ہے:

''خراجی زمین پوری امت کی ملکیت ہے اور اس کے اصل مالکوں کی ملکیت، ملکیت رقبہ (حقیقی ملکیت) نہیں ہے بلکہ ملکیت یَــــدْ (قابضانہ ملکیت) ہے۔ اور اس زمین پر جو خراج عائد ہوتا ہے وہ اجرت کے درجے میں ہوتا ہے...... اگر اس زمین کے مالک اسلام لے آئیں یا ان کی یہ ملکیت بذریعہ بیع وشراء مسلمانوں کی طرف منتقل ہو جائے...... جیسا کہ عملاً ہوا ہے تو خراج بدستور باقی رہے گا۔ اور اس پر ہر دور کے فقہاء کا اجماع ہے اور کوئی بھی اس کو ساقط نہیں کر سکتا، کیونکہ یہ تمام ادوار میں امت اسلامیہ کی ملکیت میں باقی رہے گی اور خراج کی دائمی فرضیت کی صورت میں حاصل ہونے والے امت کے اس حق کو کوئی حکومت یا امام ساقط نہیں کر سکے گا۔''

(فقہ الزکوٰۃ حصہ اول صفحہ 533)

ٹیکس کا ظرف اور زکوٰۃ کا ظرف:

''ماہرین مالیات کے نزدیک ٹیکس کی بلحاظ ظرف درج ذیل چار اقسام ہیں: (1) راس المال پر ٹیکس (2) آمدنی پر ٹیکس (3) اشخاص پر ٹیکس (4) مصارف پر ٹیکس...... زکوٰۃ میں مصارف ٹیکس کی کوئی صورت نہیں ہے اس لیے کہ حقیقت زکوٰۃ تو یہ ہے کہ اغنیاء سے لے کر فقراء پر تقسیم کی جاتی ہے اور دین وملت کے مصالح پر صرف کی جاتی ہی کیونکہ خرچ کرنے والا جس طرح غنی ہوسکتا ہے اسی طرح فقیر بھی ہوسکتا ہے۔ نظام ٹیکس میں مصارف واخراجات پر ٹیکس اس لیے لگایا جاتا ہے تا کہ زیادہ آمدنی حاصل ہو۔ جبکہ اسلام کی نظر میں یہ بات اہمیت کی حامل نہیں ہے۔ البتہ اسلام میں باقی تین طرح کے ٹیکس موجود ہیں، یعنی رأس المال پر ٹیکس، آمدنی پر ٹیکس اور اشخاص پر ٹیکس۔'' (فقہ الزکوٰۃ حصہ دوم صفحہ 622)

نفاذ زکوٰۃ میں انصاف کی رعایت:

''اسلام نے نظام زکوٰۃ کے قوانین میں عدل کی واضح صورتوں اور انصاف کے روشن پہلوؤں پر ہی اکتفاء نہیں کیا ہے بلکہ ان قوانین کے نفاذ اور ان کے اجراء میں بھی عدل وانصاف کو ملحوظ رکھا ہے اور عاملین زکوٰۃ کو

ہر طرح کی ہدایت اور راہنمائی کی ہے کہ وہ انصاف کریں اور عدل سے کام لیں۔"

(فقہ الزکوٰۃ' حصہ دوم' صفحہ 642)

ٹیکسوں کے وزن کی منصفانہ تقسیم:

"اگر حکومت کو سرمایہ کی احتیاج ہو اور ٹیکس کے ماسوا حصول سرمایہ کا کوئی ذریعہ نہ ہو تو ٹیکس لگانا نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ٹیکس کے بار کو لوگوں میں منصفانہ طریقے پر تقسیم کیا جائے کہ کسی پر زیادتی اور ظلم نہ ہو۔ واضح رہے کہ اس مقام پر عدل و انصاف سے مراد مساوات نہیں ہے کیونکہ دو مختلف درجے کے لوگوں میں مساوات انصاف نہیں ہوتا ظلم ہوتا ہے' یہاں پر تقاضائے انصاف یہی ہے کہ ہر اجتماعی اور اقتصادی طبقے کے لوگوں سے ان کی حیثیت کے مطابق لیا جائے۔" (فقہ الزکوٰۃ' حصہ دوم' صفحہ 678)

اجتماعی کفالت:

ڈاکٹر یوسف قرضاوی اپنی شہرہ آفاق تصنیف "فقہ الزکوٰۃ" حصہ دوم کے آخر میں لکھتے ہیں:

"میں اپنی یہ تحقیق ان حضرات کی خدمت میں پیش کرتا ہوں جو کسی بھی طرح اجتماعی کفالت سے متعلق ہیں تاکہ انہیں معلوم ہو جائے کہ انسانی تاریخ میں یہ اولین و اجتماعی کفالت کا نظام ہے جو حکومت کے توسط سے بروئے کار آتی ہے۔ درآنحالیکہ مغرب میں ضعفاء اور محتاجین کی مدد اور تعاون کی تاریخ ہی سترہویں صدی سے شروع ہوئی ہے اور ہم نے بھی انشورنس کا نظام مغرب ہی سے لیا ہے' کیوں نہ ہم اسلام کے "نظام کفالت" اور اجتماعی ضمانت کے نظام کو اختیار کریں۔"

(فقہ الزکوٰۃ' حصہ دوم' صفحہ 717)

اسلامی معاشرہ:

"اسلامی معاشرہ ایک عقیدہ اور نظریہ پر مبنی معاشرہ ہے' یہ دعوت اور نصب العین کا معاشرہ ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں .... خواہ وہ روحانی و مادی ہوں' فکری و عملی ہوں یا تعلیمی و ثقافتی...... خواہ روحانی و اجتماعی یا اقتصادی و سیاسی..... اس عقیدہ و نظریہ کو عملی جامہ پہنایا جائے۔" (مقالہ "اسلامی نظام کے قیام کا راستہ" علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی' مترجم محمد طفیل انصاری' صفحہ 10 مطبوعہ ادارہ دراسات اسلامیہ لاہور)

انقلابی تبدیلی:

"اسلحہ' سازوسامان' آلات اور تمام مادی اشیاء میں انقلابی تبدیلی آسان ہے اور قلعوں اور مدرسوں اور کارخانوں کی تعمیر بھی کی جا سکتی ہے لیکن جو کام حقیقتاً سخت اور مشکل ہے وہ انسان کی تبدیلی اور اس کی تعمیر ہے۔"

(مقالہ "اسلامی نظام کے قیام کا راستہ" صفحہ 18 حوالہ ایضاً)

حقیقی اسلامی معاشرہ کے قیام کے عالمی قوتوں پر اثرات:

''انہیں ڈر ہے کہ مسلمان کہیں سچے مسلمان نہ بن جائیں جس کی وجہ سے ان کی بہت سی حرام تجارت مندی پڑ جائے اور بلادِ اسلام میں ان کے لیے کوئی منڈی باقی نہ رہے۔ ایسا نہ ہو کہ مسلمان خود کفیل بن جائیں اور مشترکہ اقتصادی یک جہتی قائم کرنے کے لیے آپس میں تعاون کرنے لگیں۔ مثلاً انہیں ڈر ہے کہ مسلمان باہمی تعاون واشتراک سے بھاری صنعتیں قائم کرلیں جو ان کی ضروریات پوری کرنے لگیں اور وہ ان کو غیر ممالک سے اشیاء درآمد کرنے سے بے نیاز کر دیں اور نتیجہ یہ ہو کہ ان کے معاملات طے کرنے میں مشرقی یا مغربی بلاک کا کوئی عمل دخل باقی نہ رہے اور اس سے اسلامی ممالک کو برآمد کی جانے والی پیداوار میں کمی واقع ہوجائے۔''

(مقالہ ''اسلامی نظام کے قیام کا راستہ'' صفحہ 21)

مفلس آدمی کی مدد کرنا ریاستی ذمہ داری ہے:

''یہ کافی نہیں ہے کہ ایک مفلس آدمی کو چند کوڑیاں بخششیں کر دی جائیں جو اس کی اور اس کے خاندان کی کسی فوری ضرورت کو پوری کر دیں بلکہ جو بات ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اس کے لیے ایک مناسب کام مہیا کرنے کا اہتمام کیا جائے جس کے ذریعہ وہ اتنی روزی کما لے جو اس کی اور اس کے خاندان کی مکمل کفالت کے لیے کافی ہو اور یہ کام کسی ایک تنظیم یا انجمن کے بس کی بات نہیں ہے۔ یہ تو ایک جوابدہ اور ذمہ دار ریاست کا فرض منصبی ہے۔'' (مقالہ اسلامی نظام کے قیام کا راستہ' صفحہ 62)

زکوٰۃ:

عربی زبان کا لفظ ''زکوٰۃ'' ''زکا'' سے ماخوذ ہے، جس کے معنی ہیں: اضافہ، نشوونما، عمدہ زرخیز زمین پاکیزگی، طہارت۔ ذیل میں فقہی لحاظ سے ''زکوٰۃ'' کی تعریف درج کی جارہی ہے:

1- بقول امام احمد بن حنبلؒ:

''زکوٰۃ خاص قسم کے مال پر خاص قسم کے لوگوں کا حق ہے، جو معینہ وقت گزر جانے کے بعد واجب ہوتا ہے۔''

2- علامہ ابن قدامہ کے نزدیک:

''زکوٰۃ ایک حق ہے جو مال میں واجب ہوتا ہے۔''

3- بقول عبدالرحمٰن الجزیری:

''زکوٰۃ سے مراد ایک مخصوص مال کو مخصوص شرائط کے مطابق مستحق کی ملکیت میں دینا ہے۔''

4- ڈاکٹر سید تنویر بخاری کے نزدیک:

''زکوٰۃ'' سے مراد اُس مال کا وہ مخصوص حصہ مستحقین پر صرف کرنا ہے جو نصاب یا نصاب سے زائد ہو اور ایک سال تک موجود ہے۔

فرضیتِ زکوٰۃ، قرآن کی روشنی میں:

بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی:

''یہ راہِ خدا کا خرچ، جسے قرآن کبھی انفاق کبھی انفاق فی سبیل اللہ، کبھی صدقہ اور کبھی زکوٰۃ کے الفاظ سے تعبیر کرتا ہے، محض ایک نیکی اور خیرات نہیں ہے بلکہ ایک عبادت اور اسلام کے پانچ ارکان۔ ایمان، نماز، روزہ اور حج میں سے تیسرا رکن ہے۔ قرآن مجید میں 37 مقامات پر اس کا اور نماز کا ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور پورے زور کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ یہ دونوں چیزیں لازمۂ اسلام اور مدارِ نجات ہیں۔''

ذیل میں چند آیاتِ قرآنیہ درج کی جارہی ہیں جن سے زکوٰۃ کی فرضیت واہمیت ثابت ہوتی ہے۔

1- واقیموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ

(اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو)

2- زکوٰۃ صرف اسلام ہی میں فرض نہیں بلکہ انبیائے سابقین (مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام) کو بھی زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم دیا گیا تھا جیسا کہ سورۃ الانبیاء میں فرمایا گیا ہے:

و جعلنٰھم ائمۃً یھدون بامرنا و اوحینآ الیھم فعل الخیرٰت و اقام الصلوۃ و ایتآء الزکوۃ و کانوا لنا عٰبدین

(اوران کو ہم نے پیشوا بنایا جو ہمارے حکم سے لوگوں کی رہنمائی کرتے تھے اور ان کی طرف ہم نے نیک کاموں کا اور نماز قائم کرنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا اور وہ ہمارے عبادت گزار تھے۔)

3- سورۃ الحج میں فرمایا گیا ہے:

واقیموا الصلوۃ و اتوا الزکوۃ و اعتصموا باللّٰہ

(اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کا دامن مضبوطی سے تھامے رہو)

4- سورۃ البقرہ کے شروع ہی میں فرمایا گیا ہے:

ذٰلک الکتٰب لا ریب فیہ ھدًی للمتقین○الذین یؤمنون بالغیب و یقیمون الصلوۃ و مما رزقنٰھم ینفقون

(یہ اللہ کی کتاب ہے، اس میں کوئی شک نہیں، راہ بتانے والی ہے خدا سے ڈرنے والوں کو۔ وہ جو بے دیکھے ماننے والے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو رزق ہم نے ان کو دیا ہے

اُس میں سے خرچ کرتے ہیں)

5- سورۃ مریم میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

واذکر فی الکتب اسمعیل انہٗ کان صادق الوعدو کان رسولاً نبیًّاo وکان یامر اھلہٗ بالصلوۃ والزکوۃ و کان عند ربہ مرضیًّا

(اور ذکر کرو اس کتاب میں اسماعیل کا، وہ وعدے کا سچا اور رسول نبی تھا اور وہ اپنے متعلقین کو نماز اور زکوۃ کا حکم دیتا تھا اور اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ آدمی تھا)

6- سورۃ مریم میں حضرت عیسیٰ ؑ کے پابند زکوۃ رہنے کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

قال انی عبد اللہ اتنی الکتب و جعلنی نبیًّاo وجعلنی مبرکًا این ما کنت و اوصنی بالصلوۃ و الزکوۃ ما دمت حیًّا

کہا (عیسیٰ نے) میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور مجھے نبی بنایا۔ اور مجھ کو برکت والا بنایا، جہاں بھی میں رہوں اور مجھے ہدایت دی کہ جب تک زندہ رہوں، نماز اور زکوۃ کا پابند رہوں)

7- سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

انما ولیکم اللّٰہ و رسولہٗ و الذین امنوا الذین یقیمون الصلوۃ و یؤتون الزکوۃ و ھم رکعون

(تمہارے رفیق تو اللہ اور اللہ کا رسولؐ اور وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے ہیں، نماز قائم کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں اور وہ خدا کے سامنے جھکنے والے ہیں)

8- سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے:

و رحمتی وسعت کل شیء فساکتبھا للذین یتقون و یؤتون الزکوۃ

(اور میری رحمت ہر چیز پر چھائی ہوئی ہے، میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھ دوں گا جو پرہیز گاری کرتے ہیں اور زکوۃ دیتے ہیں)

9- سورۃ المومنون میں مومنین کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

قد افلح المؤمنونo الذین ھم فی صلاتھم خاشعونo والذین ھم عن اللغو معرضونo والذین ھم للزکوۃ فاعلون

(تحقیق فلاح پاگئے وہ مومن جو اپنی نماز میں عجز و نیاز کرتے ہیں۔ اور جو بیہودہ باتوں سے منہ موڑتے رہتے ہیں اور جو زکوۃ ادا کرتے ہیں)

10- سورۃ التوبہ میں نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

خذ من اموالهم صدقۃ تطهرهم و تزكيهم بها وصل عليهم ان صلوتك سكن لهم

(ان کے اموال میں سے ایک صدقہ وصول کر کے انہیں پاک کرو اور ان میں اوصاف حمیدہ کو نشو ونما اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو تمہاری دعا ان کے لیے باعث تسکین ہو گی)

فرضیت زکوۃ، حدیث کی روشنی میں:

نبی اکرم ﷺ نے جب حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن کی طرف بھیجا تو انہیں رخصت کرتے وقت کچھ نصیحتیں کیں، جن میں سے ایک نصیحت یہ بھی تھی کہ انہیں بتایا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر زکوۃ فرض کی ہے جو ان کے مالداروں سے لی جائے گی اور ان کے فقیروں پر تقسیم کر دی جائے گی۔

حضرت جریر بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ: میں نے رسول اللہ ﷺ سے نماز قائم کرنے اور زکوۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان کے ساتھ خیر خواہی کرنے پر بیعت کی۔

ایک مرتبہ ایک شخص نبی اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا اور عرض کیا: ”یا رسول اللہ! مجھے ایسا کام بتایئے جو مجھ کو جنت میں لے جائے۔“

آپؐ نے توحید کے اقرار اور نماز کی ادائیگی کے بعد زکوۃ کی ادائیگی کا ذکر فرمایا۔

زکوۃ کا مقصد:

زکوۃ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کے شکر کا اظہار ہے۔ یہ ایک مالی عبادت ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ناداروں کی کفالت ہو سکے۔ نظام زکوۃ پورے معاشرے کو بخل، تنگدلی، خود غرضی، حسد و بغض اور استحصال سے پاک کر کے محبت، ایثار، احسان، خلوص، تعاون، رحمدلی، صلہ رحمی، مواخات اور رفاقت کے جذبات پیدا کرنے کا خواہاں ہے۔ یہ حصول رضائے الٰہی کا ایک ذریعہ بھی ہے۔

منکرِ زکوۃ کافر ہے:

زکوۃ کی حیثیت اختیاری نیکی یا نفلی صدقہ کی نہیں بلکہ اس کی ادائیگی فرض (لازم) ہے۔ زکوۃ کا منکر کافر ہے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے عہد خلافت میں بعض قبائل نے زکوۃ کی ادائیگی سے انکار کر دیا تو حضرت ابو بکر صدیقؓ نے ان کے خلاف جنگ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پر بعض کبار صحابہؓ نے اختلاف کرتے ہوئے کہا کہ: جو لوگ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہیں اور صرف زکوۃ دینے سے انکار کرتے ہیں، ان پر کس طرح تلوار اٹھائی جا سکتی ہے؟ اس پر حضرت ابو بکر صدیقؓ نے فرمایا: ”خدا کی قسم! جو شخص رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بکری کا ایک بچہ زکوۃ میں دیتا تھا، اگر وہ اس کے دینے سے انکار کرے تو میں اس کے مقابلہ میں جہاد کروں گا۔ آپؓ کے اصرار پر حضرت عمر فاروقؓ کو بھی آپ کی اصابت رائے کا اعتراف کرنا پڑا کہ اگر آج

انہیں زکوٰۃ نہ دینے پر چھوڑ دیا جائے تو کل وہ صوم وصلوٰۃ کے بھی منکر ہو جائیں گے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق نے مانعین زکوٰۃ کے مقابلہ میں فوجیں بھیجیں، یہاں تک کہ انہوں نے زکوٰۃ ادا کر دی۔

منکرین زکوٰۃ کے بارے میں امام ابن حزم لکھتے ہیں کہ:

''زکوٰۃ نہ دینے والے کے بارے میں یہ حکم ہے کہ اس سے زکوٰۃ لی جائے، قطع نظر اس کے کہ وہ دینا چاہے یا نہ دینا چاہے، کیونکہ اگر وہ زکوٰۃ نہیں دے گا تو گویا وہ اسلامی نظام کے خلاف برسر جنگ ہے اور اگر وہ سرے سے زکوٰۃ کی فرضیت ہی سے انکار کر رہا ہے تو وہ مرتد ہے اور اگر اسے چھپا رہا ہے تو وہ ایک جرم کا ارتکاب کر رہا ہے۔ لہٰذا اس کو سزا دینا یا مارنا حکومت وقت پر واجب ہے، یہاں تک کہ وہ زکوٰۃ لے آئے یا مر کر ہمیشہ کے لیے خدا کی لعنت اور پھٹکار کا مستحق بن جائے۔''

امام نووی کا فتویٰ ہے کہ:

''جس نے زکوٰۃ کے واجب ہونے کا انکار کیا۔ اس نے اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ کو جھٹلایا۔ لہٰذا اس کے کفر کا حکم دیا جائے گا۔''

امام ابن قدامہ فرماتے ہیں کہ:

''جو شخص بر بنائے جہالت زکوٰۃ کے وجوب کا منکر ہو، اس کی لاعلمی کا سبب خواہ یہ ہو کہ وہ نیا نیا مسلمان ہوا ہو یا وہ شہروں سے دور کہیں جنگلوں میں رہا ہو بعد میں اُسے زکوٰۃ کے وجوب کا پتا چلے تو اسے کافر نہیں کہا جائے گا، کیونکہ وہ معذور ہے، لیکن اگر زکوٰۃ کے وجوب کا منکر کسی اسلامی ملک میں اہل علم کے درمیان رہتا ہو تو وہ مرتد ہوگا۔ اس پر مرتدین کے احکام لاگو ہوں گے۔ اسے تین مرتبہ توبہ کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اگر وہ توبہ کر لے تو چھوڑ دیا جائے گا، ورنہ قتل کر دیا جائے گا، کیونکہ وجوب زکوٰۃ کے دلائل قرآن وسنت اور اجماع امت سے بالکل واضح ہیں۔''

زکوٰۃ واجب ہونے کی شرائط:

زکوٰۃ حسب ذیل صورتوں میں واجب ہوتی ہے:

1- مسلمان ہو

2- صاحب نصاب ہو اور نصاب ضرورت اصلیہ سے زائد ہو

3- مقروض نہ ہو

4- مال پر پورا سال گزر چکا ہو

5- بالغ ہو

6- عاقل ہو

نصاب زکوٰۃ:

''نصاب'' سے مراد مال کی وہ مقدار ہے، جس پر شریعت نے زکوٰۃ واجب کی ہے۔ جس شخص کے پاس بقدر نصاب مال ہو اسے ''صاحب نصاب'' کہتے ہیں۔

مختلف اموال کا نصاب مختلف ہے۔

مدت:

زکوٰۃ ایک سال تک نصاب کے مطابق مال کے جمع رہنے پر ادا کی جاتی ہے۔ اگر ایک سال سے پہلے مال نصاب کم ہو جائے یا مال صرف یا تلف ہو جائے تو زکوٰۃ واجب نہ ہو گی۔

شرح زکوٰۃ:

مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کی شرح مختلف ہے۔ ذیل میں مختلف قسم کے اموال پر زکوٰۃ کی شرح بیان کی جا رہی ہے۔

(1) نقد مال پر زکوٰۃ:

''نقد مال'' سے مراد سکہ، کاغذی نوٹ اور ڈرافٹس وغیرہ ہیں۔

نقد مال پر زکوٰۃ کی شرح اڑھائی فیصد (چالیسواں حصہ) ہے۔

2- سونے اور چاندی پر زکوٰۃ:

سونا یا چاندی، خواہ زیورات کی شکل میں ہو، یا کسی اور شکل میں، اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ چاندی کا نصاب دو سو درہم (ساڑھے باون تولے) ہے۔ ایک سو نوے درہم پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ ایک حدیث کے مطابق سو درہم چاندی پر پانچ درہم زکوٰۃ بیان کی گئی ہے۔

سونے کا نصاب بیس مثقال (ساڑھے سات تولے) ہے۔ ایک حدیث کے مطابق سونے کی زکوٰۃ بیس مثقال پر 1/2 مثقال کا ذکر کیا گیا ہے۔

جمہور فقہاء کے نزدیک سونے اور چاندی میں سے چالیسواں حصہ (اڑھائی فیصد) زکوٰۃ واجب ہے۔

پہننے والے زیورات پر زکوٰۃ کے سلسلہ میں فقہاء کے مابین اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام محمدؒ، امام ابو یوسفؒ، امام ثوریؒ اور دیگر کئی فقہاء ایسے زیورات میں زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ فقہاء کا گروہ قرآن و سنت سے استدلال کرتا ہے اور اس سلسلہ میں یہ حدیث بھی بیان کرتا ہے کہ:

''حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ سے روایت ہے کہ دو عورتیں نبی اکرم ﷺ کے پاس آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں سونے کے دو کنگن تھے۔ آپؐ نے اُن سے فرمایا کہ:

''کیا تم پسند کرتی ہو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں آگ کے کنگن پہنائے؟'' انہوں نے کہا: ''نہیں''۔
آپؐ نے فرمایا'' پھر تم ان کی زکوٰۃ ادا کیا کرو۔''

فقہاء کے دوسرے گروہ میں امام مالکؒ، امام احمد بن حنبلؒ، اسحاق بن راہویہؒ، امام شافعیؒ اور امام ابو عبید القاسمؒ وغیرہ شامل ہیں، جو زیب و زینت کے لیے پہنے جانے والے زیورات پر زکوٰۃ کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک زیورات پر زکوٰۃ واجب کرنے والی احادیث ضعیف ہیں۔

3- مال تجارت پر زکوٰۃ:

''مال تجارت'' سے مراد ہر وہ مال ہے جس کی نفع کی غرض سے خرید و فروخت کی جاتی ہو۔ چنانچہ نقدی کے علاوہ مادی اشیاء، مویشی اور جانور بھی اموال تجارت میں شامل ہیں۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

''اے ایمان والو! جو کچھ تم نے فرمایا ہے اور جو کچھ ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے، اس میں یہ عمدہ چیزیں (راہ خدا میں) خرچ کرو۔''

4- کان اور دفینہ پر زکوٰۃ:

کان (رکاز) میں پانچواں حصہ زکوٰۃ واجب ہے۔

5- جانوروں کی زکوٰۃ:

جانوروں میں اونٹ، گائے اور بکری کے علاوہ بعضوں کے نزدیک گھوڑوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ کھیتی باڑی، آبپاشی اور بار برداری کے کام آنے والے جانور زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔

ذیل میں جانوروں پر زکوٰۃ کی شرح بیان کی جا رہی ہے:

اُونٹ:

اونٹوں کا نصاب پانچ اُونٹ ہے۔ اس ضمن میں یہ حدیث پیش کی جا سکتی ہے:

''رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: پانچ اونٹ سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔''

اونٹوں کی زکوٰۃ بکریوں، اونٹوں اور اونٹنیوں کی شکل میں دی جاتی ہے۔

اونٹوں کی زکوٰۃ کی شرح درج ذیل ہے:

1- اگر کسی کے پاس پانچ سے نو اونٹ ہوں، تو اس پر واجب ہو گا کہ وہ ایک سال کی عمر کی ایک بکری یا بکرا بطور زکوٰۃ دے۔

2- دس سے چودہ اونٹوں تک کی زکوٰۃ دو بکریاں ہیں۔

3- پندرہ سے انیس بکریوں تک کی زکوٰۃ تین بکریاں ہو گی۔

4- بیس سے چوبیس اونٹوں تک کی زکوٰۃ چار بکریاں ہیں۔

-5 پچیس سے پینتیس بکریوں کی زکوۃ اونٹ کا ایک مادہ بچہ جسے ایک سال پورا ہو گیا ہو اور وہ دوسرے سال میں داخل ہو چکا ہو۔

-6 چھتیس سے پینتالیس تک اونٹوں کی زکوۃ ایک سال کی اونٹنی ہے، جو دوسرے سال میں داخل ہو چکی ہو۔

-7 چھیالیس سے ساٹھ اونٹوں تک کی زکوۃ چار سال کی عمر مکمل کر لینے والی ایک اونٹنی ہے۔

-8 اکسٹھ سے پچھتر اونٹوں کی زکوۃ چار سال کی ایک اونٹنی ہے، جو پانچویں سال میں داخل ہو چکی ہو۔

-9 چھہتر سے نوے اونٹوں کی زکوۃ اونٹ کے دو مادہ بچے ہیں، جنہیں دو سال مکمل ہو گئے ہوں۔

-10 اکانوے تا ایک سو بیس اونٹوں کی زکوۃ تین تین سال کی دو اونٹنیاں ہیں۔

اونٹ کی زکوۃ میں جب ایک دو یا تین سال کا اونٹ دیا جائے تو ضروری ہے کہ وہ مادہ ہو یا اس کی قیمت مادہ کی قیمت کے برابر ہو۔

گائے پر زکوۃ:

گائے کی تعریف میں بیل اور بھینس بھی شامل ہے۔

گائے کی زکوۃ کے ضمن میں یہ حدیث پیش کی جا سکتی ہے۔

''حضرت معاذ بن جبلؓ سے روایت ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انہیں یمن کی طرف بھیجا تو حکم دیا کہ تیس گائیوں میں ایک سالہ نر یا مادہ بچھڑا (زکوۃ) ہے اور ہر چالیس میں دو سالہ بچھڑا ہے۔''

گائے کی زکوۃ کی شرح درج ذیل ہے:

-1 ایک تا انتیس گائیوں پر کوئی زکوۃ نہیں۔

-2 تیس سے انتالیس گائیوں پر ایک سال کا نر یا مادہ بچھڑا بطور زکوۃ دیا جائے گا۔

-3 چالیس سے اُنسٹھ گائیوں پر دو سال کا نر یا مادہ بچھڑا بطور زکوۃ دیا جائے گا۔

-4 ساٹھ سے اُنہتر گائیوں پر ایک دو سالہ نر یا مادہ بچھڑا اور ایک سالہ نر یا مادہ بچھڑا بطور زکوۃ دیا جائے گا۔

-5 اسی سے انانوے گائیوں پر دو دو سالہ نر یا مادہ بچھڑے دیئے جائیں گے۔

-6 نوے تا ننانوے گائیوں پر ایک ایک سال کے تین نر یا مادہ بچھڑے دیئے جائیں گے۔

-7 سو سے ایک سو نو تک گائیوں کی زکوۃ ایک دو سالہ اور ایک یکسالہ بچھڑا ہے۔

جیسے جیسے گائیوں کی تعداد بڑھتی جائے گی ان کی زکوۃ کی شرح بھی بڑھتی جائے گی۔

بھیڑ بکریوں پر زکوۃ:

بعض فقہاء کے نزدیک پانچ بکریوں پر زکوۃ واجب ہے اور بعضوں کے نزدیک چالیس سے کم بکریوں پر زکوۃ واجب نہیں۔ چالیس سے ایک سو بیس بکریوں کی زکوۃ ایک بکری ہے۔ ایک سو اکیس سے دو سو

تک بکریوں کی زکوٰۃ دو بکریاں ہیں۔ دوسرا ایک سے تین سو ننانوے بکریوں پر تین بکریاں بطور زکوٰۃ دی جائیں گی۔ چار سو سے چار سو ننانوے بکریوں کی زکوٰۃ میں چار بکریاں دی جائیں گی اور پانچ سو سے پانچ سو ننانوے بکریوں تک کی زکوٰۃ پانچ بکریاں ہوں گی۔ اس طرح ہر سو پر ایک بکری بطور زکوٰۃ دی جائے گی۔

گھوڑا:

سواری اور جہاد کے لیے استعمال ہونے والے گھوڑے زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں۔ زکوٰۃ صرف ان گھوڑوں پر واجب ہے جن کی خرید و فروخت کی جاتی ہے۔ گھوڑوں کی قیمت کا چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ دیا جائے گا۔

6- کمپنیوں کے حصص پر زکوٰۃ:

کمپنیوں کے حصص پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ حصہ داران اپنی اصل رقم اور منافع دونوں پر زکوٰۃ دیں گے، لیکن اصل رقم کا وہ حصہ جو کمپنی کی عمارت، آلات، اور مشینوں پر خرچ ہوا ہو، اس کو منہا کر کے باقی اور حاصل شدہ منافع پر اڑھائی فیصد کی شرح سے زکوٰۃ ادا کریں گے۔

7- زرعی پیداوار پر زکوٰۃ (عُشر):

زرعی پیداوار پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔ ایک حدیث کے مطابق پانچ سیر سے کم غلہ اور کھجور پر کوئی زکوٰۃ نہیں، زرعی پیداوار پر دس فی صد زکوٰۃ ہے، جبکہ وہ بارانی زمینوں سے ہو۔

اگر زمین مصنوعی آبپاشی سیراب ہو تو اس پر پانچ فیصد کی شرح سے زکوٰۃ واجب ہوگی۔

امام ابو حنیفہؒ کا قول ہے کہ زمین کی ہر قسم کا عشر $\left(\frac{1}{10}\right)$ دینا چاہیے۔ قاضی ابو یوسف کے نزدیک عشر صرف اس پیداوار پر ہے جس کا ذخیرہ کیا جائے۔

8- اموال غنیمت پر خمس:

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ:

''زکوٰۃ عائد کرنے سے جو فنڈ فراہم ہوتا ہے اس پر قرآن نے ایک اور مد کا اضافہ بھی کیا ہے اور وہ ہے اموال غنیمت (Spoils of War) کا ایک حصہ۔ قرآن نے یہ قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ہر لڑائی میں جو غنیمت کا مال فوج کے ہاتھ آئے، اُسے سپاہی بطور خود نہ لیں، بلکہ سب کچھ لا کر اپنے کمانڈر کے حوالہ کر دیں اور کمانڈر اس کے پانچ حصے کر کے چار حصے ان سپاہیوں میں تقسیم کرے، جنہوں نے معرکے میں حصہ لیا ہو اور پانچواں حصہ الگ کر کے حکومت کے حوالہ کر دے۔''

اس ضمن میں مولانا موصوف نے سورۃ الانفال کی یہ آیت پیش کی ہے:

و اعلموآ انما غنمتم من شیء فان لله خمسهٗ و للرسول ولذی القربی و الیتمی و المسکین و ابن السبیل

(تم کو معلوم ہو کہ جو کچھ بھی غنیمت تم حاصل کرو، اس کا پانچواں حصہ اللہ اور رسول اور قرابتداروں اور یتامی اور مسافر کے لیے ہے)

مصارف زکوٰۃ/مستحقین زکوٰۃ:

مصارف زکوٰۃ اور مستحقین زکوٰۃ کے ضمن میں سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا ہے:

انما الصدقت للفقرآء و المسکین و العملین علیھا و المؤلفة قلوبھم و فی الرقاب و الغرمین و فی سبیل اللہ و ابن السبیل فریضةً من اللہ

(صدقات تو مخصوص ہیں فقراء کے لیے اور مساکین کے لیے اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام کریں اور ان کے لیے جن کی تالیف قلب مطلوب ہو، نیز وہ صرف ہونے چاہئیں غلاموں کی گردنیں چھڑانے میں، قرضداروں کی مدد میں، اللہ کی راہ میں اور مسافروں کی خبر گیری میں، اللہ کی طرف سے ایک فریضہ کے طور پر)

آیت ہذا کے مطابق مصارف زکوٰۃ حسب ذیل ہیں:

1- فقراء
2- مساکین
3- عاملین زکوٰۃ
4- مؤلفۃ القلوب
5- فی الرقاب
6- غارمین
7- فی سبیل اللہ
8- ابن السبیل

1- فقراء:

''فقراء'' کی تعریف میں حسب ذیل قسم کے لوگ شامل ہیں:

1- جو زکوٰۃ کے نصاب (بیس مثقال سونا) سے کم مال رکھتے ہوں۔
2- جو مالدار ہونے کے باوجود اس قدر مقروض ہوں کہ قرض ادا کرنے کے بعد صاحب نصاب نہ رہیں۔
3- جو کسی جسمانی معذوری کے سبب روزی کمانے کے اہل نہ ہوں۔

-4 جن پر کوئی ایسی مصیبت آن پڑی ہو جس کے باعث وہ زیر کفالت افراد کی معاش کا بندوبست نہ کر سکیں۔

2-مساکین:

مساکین "مسکین" کی جمع ہے۔ بقول حضرت عمر فاروقؓ "مسکین وہ شخص ہے جو کمانہ سکتا ہو یا کمانے کا موقع نہ پاتا ہو۔ اس میں مندرجہ ذیل لوگ شامل ہیں:

-1 جو اپنی بنیادی ضروریات پوری کرنے سے قاصر ہوں۔

-2 بے روزگار افراد جو عارضی طور پر ذریعہ روزگار سے محروم ہوں۔

-3 جو کمانے کے لائق نہ رہے ہوں۔

-4 جو کثیر العیال ہوں اور اپنے زیر کفالت افراد کی کفالت کرنے سے قاصر ہوں۔

-5 نادار، بوڑھے، اپاہج وغیرہ جو کمانے کے قابل نہ رہے ہوں۔

3-عاملین زکوۃ:

"عاملین زکوۃ" سے مراد وہ افراد (ملازمین) ہیں، جنہیں اسلامی حکومت زکوۃ کی وصولی کے لیے مقرر کرے۔ ان کی تنخواہیں زکوۃ کی جمع شدہ رقم سے ادا کی جاسکتی ہیں۔

4-مؤلفۃ القلوب:

"مؤلفۃ القلوب" سے مراد حوصلہ افزائی اور استعانت کی غرض سے ان لوگوں کو زکوۃ میں سے حصہ دینا ہے جنہوں نے ابھی ابھی اسلام قبول کیا ہو۔ کیونکہ ممکن ہے کہ وہ بے گھر ہو گئے ہوں یا اپنا مال ومتاع لٹا چکے ہوں۔ اس کا مقصد دوسرے لوگوں کو اسلام کی طرف رغبت دلانا بھی ہے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں کہ:

"نبی ﷺ کے زمانے میں تین قسم کے لوگوں کو تالیف قلب کے لیے روپیہ دیا جاتا تھا۔"

-1 جو مخالفین اسلام کمزور مسلمانوں کو تکلیفیں دیتے یا اسلام کی عداوت میں سخت تھے، انہیں روپیہ دے کر نرم رویہ اختیار کرنے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔

-2 جو لوگ اپنی قوم یا قبیلے کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے زبردستی روکتے تھے، انہیں روپیہ دے کر اس روش سے باز آجانے پر آمادہ کیا جاتا تھا۔

-3 جو لوگ نئے نئے اسلام میں داخل ہوتے تھے، ان کی مالی مدد کی جاتی تھی تا کہ ان کا اضطراب رفع ہو اور وہ مطمئن ہو کر مسلمانوں کے گروہ میں رہیں۔

احناف کے نزدیک اب یہ مد ساقط ہو چکی ہے، کیونکہ حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں

اس کی وجہ یہ بیان کی تھی کہ اب اسلام کمزور نہیں ہے کہ اسے کسی سے تقویت لینے کی ضرورت ہو۔ تاہم بعض فقہا نے اپنے زمانے کے حالات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مد کو قائم رکھا۔

5- فی الرقاب:

''فی الرقاب'' کے لغوی معنی ہیں: گردنیں چھڑوانے میں، گردنیں چھڑوانے سے مراد غلاموں کو آزاد کروانا ہے۔ سید ابوالاعلیٰ مودودی کے نزدیک اس سے مراد وہ مسلمان بھی ہیں، جو لڑائیوں میں دشمنوں کے ہاتھ گرفتار ہو کر غلام بنا لیے جاتے تھے اور وہ غیر مسلم بھی جو مسلمانوں کے ہاں جنگ میں گرفتار ہو کر آتے اور فدیہ ادا کر کے رہائی حاصل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ نیز وہ غلام بھی مراد ہیں، جو پہلے سے غلام چلے آ رہے تھے۔

''فی الرقاب'' کی مد سے مندرجہ ذیل تین طریقوں سے زکوٰۃ صرف کی جا سکتی ہے:

1- مکاتب (یعنی وہ غلام جس نے اپنے آقا سے معاہدہ کیا ہو کہ وہ متعینہ رقم دے کر آزاد ہو جائے گا) کی مدد کی جائے۔

2- زکوٰۃ کے مال سے لونڈی یا غلام خرید کر انہیں آزاد کر دیا جائے۔

3- مسلم جنگی قیدیوں کا فدیہ دے کر انہیں دشمن کی قید سے رہائی دلائی جائے،

6- غارمین:

''غارمین'' سے مراد وہ مقروض لوگ ہیں جو اپنا قرض ادا کرنے سے قاصر ہوں۔ وہ شخص جو مقروض ہو اور اپنی ضروریات سے بچا کر قرض ادا نہ کر سکتا ہو، خواہ وہ بے روزگار ہو یا برسر اقتدار، وہ شخص جس کا کاروبار فیل ہو گیا ہو یا اثاثہ تباہ ہو گیا ہو یا اسے کسی غیر معمولی تاوان یا جرمانہ دینا پڑا ہو، بھی ''غارمین'' یا قرضدار کے حکم میں داخل ہے۔

7- فی سبیل اللہ:

''فی سبیل اللہ'' سے مراد ہے: راہ خدا میں، اللہ کے لیے۔ مولانا مودودی کے نزدیک:

> ''''اللہ کی راہ'' سے مراد جہاد اور حج ہے۔ جہاد میں جانے والا رضا کار اگر اپنی ضروریات کی حد تک مالدار بھی ہو تب بھی وہ زکوٰۃ ...ے سکتا ہے کیونکہ جہاد کے لیے تیاری کرنے اور سفر وغیرہ کے مصارف بہم پہنچانے کے لیے آدمی کا ذاتی مال کافی نہیں ہو سکتا۔ اس طرح حج کے سفر میں اگر آدمی کا زادِ راہ ختم ہو جائے تو وہ بھی زکوٰۃ کا مستحق ہے۔''

اس مد میں سے حصول علم دین اور دیگر نیک کاموں پر بھی خرچ کیا جا سکتا ہے لیکن اس صورت میں کسی شخص کو مالک بنانا لازم ہے۔ بغیر تملیک کے زکوٰۃ ادا نہیں ہو سکتی۔

8-ابن السبیل:

عربی میں مسافر کو "ابن السبیل" کا نام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی مسافر کے پاس سفر کے دوران مال نہ رہا ہو تو وہ زکوٰۃ کا مستحق ہے، خواہ اس کے گھر میں مال موجود ہو لیکن شرط یہ ہے کہ وہ اس قدر مال لے جس سے اس کی حاجت پوری ہو جائے۔

زکوٰۃ سے مستثنیٰ اشیاء:

مندرجہ ذیل اشیاء زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں:

1- گھریلو استعمال کے برتن
2- ذاتی رہائش کا مکان
3- پہننے کے کپڑے
4- تزئین و آرائش کی وہ اشیاء جو سونے یا چاندی کی نہ ہوں
5- آلات حرب
6- کھانے کے لیے غلہ
7- مطالعہ کی کتب
8- پیشہ وروں کے اوزار

جن افراد پر زکوٰۃ صرف کرنا جائز نہیں:

مندرجہ ذیل قسم کے افراد کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی۔

1- بنو ہاشم یعنی خاندان نبوی۔ نہ تو انہیں زکوٰۃ دی جا سکتی ہے اور نہ ہی یہ آپس میں زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔
2- صاحب نصاب شخص، بشرطیکہ سفر میں نہ ہو۔
3- والدین (باپ، دادا، پردادا، نانا، پرنانا وغیرہ اُوپر تک)
4- اولاد (بیٹی، بیٹا، پوتا، پوتی، نواسہ، نواسی وغیرہ نیچے تک)
5- زیر کفالت افراد
6- شوہر
7- بیوی

حُرمتِ سُود

سوال 1: سُود (ربوا) سے کیا مراد ہے۔قرآن وسنت کی روشنی میں اس کی حرمت پر روشنی ڈالیے!

سوال 2: سود کے مفاسد (نقصانات) بیان کیجیے!

سوال 3: سُود کے اسلامی متبادلات پر روشنی ڈالیے!

سُود (ربوا):

"سود" کو عربی زبان میں "ربا" یا "ربوا" کہتے ہیں، جس کا مادہ ر، ب، و ہے۔اس کے لفظی معنی ہیں: نمو، بڑھوتری، بڑھنا، کسی چیز کا زیادہ ہونا، زیادتی، اضافہ۔اصطلاحاً ربوا (سُود) سے مراد مال میں وہ زیادتی ہے جو سرمایہ دار اپنے مقروض کو قرض کی ادائیگی کی مہلت دے کر حاصل کرتا ہے۔

بقول ابن عربی: "ربوا ہر ایسی زیادتی کا نام ہے، جس کے مقابلے میں مال کا عوض نہ ہو۔"

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی "سُود" کے بارے میں لکھتے ہیں:

"قرض میں دیئے ہوئے راس المال پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعین کے ساتھ لی جائے وہ "سُود" ہے۔"

مولانا موصوف مزید لکھتے ہیں:

"راس المال پر اضافہ، اضافہ کی تعین کے لحاظ سے کیا جانا اور معاملہ میں اس کا مشروط ہونا، یہ تین اجزائے ترکیبی ہیں، جن سے سود بنتا ہے اور ہر وہ معاملہ قرض جس میں یہ تینوں اجزاء پائے جاتے ہوں ایک سودی معاملہ ہے۔قطع نظر اس سے کہ قرض کسی بار آور کام میں لگانے کے لیے لیا گیا ہو یا کوئی شخصی ضرورت پوری کرنے کے لیے اور راس قرض کا لینے والا آدمی غریب ہو یا امیر۔"

حُرمتِ سُود، قرآن کی روشنی میں:

اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے۔اس کی حرمت و مذمت میں چند آیات درج ذیل ہیں:

1- سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

يمحق الله الربوا ويربي الصدقت

(اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صداقات کو بڑھاتا ہے)

2- سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

يايها الذين امنوا لا تاكلوا الربوا اضعافًا مضعفةً واتقوا الله لعلكم تفلحون

(اے ایمان والو! سود کئی کئی حصہ بڑھا کر نہ کھاؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ فلاح پاؤ)

3- سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

یاایها الذین امنوا اتقوا اللّٰہ و ذروا ما بقی من الربٰوا ان کنتم مؤمنین

(اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سود کا بقایا ہے اسے چھوڑ دو، اگر تم ایمان والے ہو)

4- سورۃ الروم میں فرمایا گیا ہے:

و مآ اٰتیتم من ربًا لیربوا فیٓ اموال الناس فلا یربوا عند اللّٰہ

(اور جو سود تم نے دیا ہے تا کہ لوگوں کے اموال بڑھیں تو اللہ کے نزدیک اس سے مال نہیں بڑھتا)

5- سورۃ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:

واحل اللّٰہ البیع وحرم الربوا

(اور اللہ نے بیع کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے)

حُرمتِ سُود، حدیث کی روشنی میں:

1- حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

"سود کا ایک درہم جس کو کوئی آدمی کھاتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے چھتیس مرتبہ زنا کرنے سے سخت ہے۔"

2- حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے سود کھانے والے، کھلانے والے، اس کے لکھنے والے اور اس کے گواہوں پر لعنت فرمائی ہے اور فرمایا:

"گناہ میں یہ سب برابر ہیں۔"

3- حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"سود کے ستر جزو ہیں، سب سے کم درجہ جزو کا گناہ اس قدر ہے جیسے آدمی اپنی ماں سے زنا کرے۔"

4- حضرت عبداللہ بن مسعود سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جس شخص نے سود کے ذریعہ سے مال کمایا انجام کار اس میں کمی ہوگی۔"

سُود کے نقصانات:

سود بنی نوع انسان کو نقصان پہنچانے کی وجہ سے حرام ہے۔ ذیل میں اس کے مفاسد اور نقصانات کی نشاندہی کی جا رہی ہے۔

اخلاق حسنہ کا خاتمہ:

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں کہ:

”وہ بخل، خودغرضی، شقاوت، بے رحمی اور زر پرستی کی صفات پیدا کرتا ہے وہ قوم اور قوم میں عداوت ڈالتا ہے۔ وہ افرادِ قوم کے درمیان ہمدردی اور امداد باہمی کے تعلقات کو قطع کرتا ہے۔ وہ لوگوں میں روپیہ جمع کرنے اور صرف اپنے ذاتی مفاد کی ترقی پر لگانے کا میلان پیدا کرتا ہے۔ وہ سوسائٹی میں دولت کی آزادانہ گردش کو روکتا ہے بلکہ دولت کی گردش کا رُخ اُلٹ کرناداروں سے مالداروں کی طرف پھیر دیتا ہے۔ اس کی وجہ سے جمہور کی دولت سمٹ کر ایک طبقہ کے پاس اکٹھی ہوتی چلی جاتی ہے اور یہ چیز آخر کار پوری سوسائٹی کے لیے بربادی کا موجب ہوتی ہے۔“

سستی اور کاہلی کا موجب:

بقول امام فخر الدین رازی:

”حرمتِ ربوا کی ایک حکمت یہ بھی ہے کہ ربا کی وجہ سے انسان محنت سے جی چرانے لگتا ہے اور وہ روزی کمانے کے لیے جدوجہد چھوڑ دیتا ہے کیونکہ اگر کسی مالدار کو بغیر محنت و مشقت کے گھر بیٹھے زائد رقم ملنے لگے، خواہ وہ نقد رقم کے عوض میں یا ادھار کے بدلے میں، تو بھلا اسے کیا پڑی ہے کہ روزی کمانے کے لیے مشقت اٹھائے تجارت کرے اور محنت طلب پیشے اختیار کرے۔ اس سے خلق کی نفع بخشی متاثر ہو کر یکسر منقطع ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ بات تو واضح ہے کہ دنیا کا کاروبار تجارت اور صنعت وحرفت سے وابستہ ہے۔“

عدل وانصاف کے منافع:

- حافظ ابن قیم سُود کو عدل وانصاف کے منافی قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”وہ (سود خور) اپنے مفلس بھائی کو سودی قرض دیتا ہے اور غریب صرف روپیہ کو اپنی ضروریات میں صرف کرتا ہے، جس سے کوئی نفع نہیں ہوتا اور نہ مال زیادہ ہوتا ہے۔ لیکن ساہوکار تو اس سے رقم وصول کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے بھائی کا مال باطل طریقے سے کھاتا ہے۔“

صرف دائن کا مفاد:

بقول مولانا ابوالاعلیٰ مودودی:

''سود کے معاملہ میں راس المال دینے والا مسلسل اپنے مال پر منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔ مدیون نے اس کے مال سے خواہ کتنا ہی فائدہ حاصل کیا ہو بہر طور اس کا فائدہ ایک خاص حد تک ہی ہوگا مگر اس کے معاوضہ میں دائن جو نفع اٹھاتا ہے اس کے لیے کوئی حد نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی تمام کمائی، اس کے تمام وسائل ثروت، اس کے تمام مایحتاج پر محیط ہو جائے اور پھر بھی اس کا سلسلہ ختم نہ ہو۔''

ناجائز منافع:

مولانا مودودی مزید لکھتے ہیں:

''سودی کاروبار میں وہ (سود خور) محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت اور صرف مال کے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اصطلاحی شریک کی نہیں ہوتی، جو نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے اور نفع میں جس کی شرکت نفع کے تناسب سے ہوتی ہے بلکہ وہ ایک ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ نفع و نقصان اور بلا لحاظ تناسب نفع اپنے مقرر اور مشروط منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔''

ارتکاز زر کا سبب:

پیر کرم شاہ الازہری مفاسد سود کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''اگر روپیہ پر سود لینے کی اجازت دی جائے تو روپیہ صرف تبادلہ اشیاء کا ذریعہ نہیں رہے گا بلکہ اس کی اپنی ذات کا سبب اور نفع خیز بن جائے گی اور لوگ دوسرے سامان تجارت کی طرح اس کی ذخیرہ اندوزی شروع کر دیں گے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ بازار میں سے یہ غائب ہوتا چلا جائے گا اور جب روپیہ بازار سے غائب ہونا شروع ہو گیا تو صنعتی ترقی رک جائے گی، تجارتی سرگرمی ختم ہو جائے گی اور دوسری اشیاء کی قیمتوں میں وہ اتار چڑھاؤ شروع ہوگا جس سے سارا اقتصادی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ شریعت اسلامیہ نے ان مفاسد کے سد باب کے لیے سود کو حرام کیا ہے۔''

مواخات کا خاتمہ:

امام رازی رقمطراز ہیں کہ:

''ربا کی حرمت کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ قرض کے معاملے میں جو احسان کرنے اور لوگوں

کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے وہ منقطع ہو جاتا ہے کیونکہ اگر سود نہ لیا جائے تو اس سے طرفین کو خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن اگر سود کو جائز قرار دیا جائے تو بیچارا ضرورتمند شخص مجبوراً ایک درہم کے عوض دو درہم تو ضرور ادا کرے گا۔ لیکن اس سے اسلامی مواخات اور ہمدردی متاثر ہوگی اور معروف واحسان کا دروازہ بند ہو جائے گا۔"

اخلاقی وروحانی مفاسد:

سید ابوالاعلیٰ مودودی رقمطراز ہیں کہ:

"اخلاقی وروحانی حیثیت سے دیکھیئے تو یہ بات بالکل واضح ہے کہ سود دراصل خودغرضی، بخل، تنگدلی جیسی صفات کا نتیجہ ہے اور وہ انہی صفات کو انسان میں نشوونما بھی دیتا ہے۔"

تمدنی مفاسد:

بقول سید ابوالاعلیٰ مودودی:

"تمدنی لحاظ سے دیکھیئے تو بادنیٰ تامل یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں آ جائے گی کہ جس سوسائٹی میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خودغرضی کا معاملہ کریں، کوئی شخص اپنی ذاتی غرض اور ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے، ایک آدمی کی حاجتمندی کو دوسرا آدمی اپنے لیے نفع اندوزی کا موقع سمجھے اور اس کا پورا فائدہ اٹھائے اور مالدار طبقوں کا مفاد عامۃ الناس کے مفاد کی ضد ہو جائے، ایسی سوسائٹی کبھی مستحکم نہیں ہو سکتی۔ اس کے افراد میں آپس کی محبت کے بجائے باہمی بغض وحسد اور بےزاری وبےتعلقی نشوونما پائے گی۔ اس کے اجزاء ہمیشہ انتشار و پراگندگی کی طرف مائل رہیں گے اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورت حال کے لیے مددگار ہو جائیں تو ایسی سوسائٹی کے اجزاء کا باہم متصادم ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں۔"

خودغرضی اور مفاد پرستی کا سبب:

سید محمد باقر رقمطراز ہیں کہ:۔

"سودی اور غیر سودی معاشرہ دراصل انسانی اور غیر انسانی معاشرہ ہے۔ انسانی معاشرہ میں باہمی تعاون اور سماجی ہمدردی ہے۔ اس میں سود کا گزر نہیں ہے اور غیر اسلامی سماج میں خود غرضی، مفاد پرستی ہے۔ اس کا کام جمع مال، افراط زر، سودخوری اور احتکار کے بغیر نہیں چل سکتا۔"

سود کے مفاسد ونقصانات کی فہرست:

1- خدا اور رسول کی ناراضگی
2- اخلاق حسنہ کا خاتمہ
3- باہمی ہمدردی اور امداد باہمی کا خاتمہ
4- مفت خوری کا سبب
5- سستی اور کاہلی کا سبب
6- عدل وانصاف کا خاتمہ
7- معاشرہ کی تباہی کا سبب
8- امن کے لیے خطرہ
9- بین الاقوامی کھنچاؤ کا سبب
10- ارتکاز دولت کا سبب
11- اسلامی نظام معیشت سے متصادم
12- قرض حسنہ کا خاتمہ
13- معاشی استحصال کا سبب
14- بیروزگاری پھیلانے کا سبب
15- اشیائے صرف میں قیمتوں میں اضافہ کا سبب
16- عیاشانہ طرز زندگی کو فروغ دینے کا سبب
17- قوم اور قوم میں عداوت کا سبب
18- حرص اور طمع کے بڑھنے کا سبب
19- حرام خوری کی عادت ڈالنے کا سبب

سود کے اسلامی متبادلات:

سود اسلام میں حرام ہے، اس لیے ہر سودی کاروبار بھی حرام، ناجائز اور موجب گناہ ہے۔ دور جدید میں سودی کاروبار کے خاتمہ کے لیے فقہاء وعلمائے اسلام نے سود کے اسلامی متبادلات کے ضمن میں بہت سی تجاویز پیش کی ہیں۔

سود کا تعلق قرض سے ہے۔ قرض کی فراہمی کے ضمن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں۔

"شخصی حاجات کے لیے قرض فراہم کرنے کی ایک اور صورت بھی اسلامی نظام میں اختیار کی جا سکتی ہے۔ وہ یہ کہ تمام تجارتی کمپنیوں اور کاروباری اداروں پر ان کے ملازموں اور

مزدوروں کے جو کم سے کم حقوق از روئے قانون مقرر کیے جائیں، ان میں ایک حق یہ بھی ہو کہ وہ ان کی غیر معمولی ضرورت کے مواقع پر ان کو قرض دیا کریں۔ نیز حکومت خود بھی اپنے اوپر اپنے ملازموں کا یہ حق تسلیم کرے اور اس کو فیاضی کے ساتھ ادا کرے۔ یہ معاملہ درحقیقت صرف اخلاقی نوعیت ہی کا نہیں بلکہ اس کی معاشی و سیاسی اہمیت بھی اتنی ہی ہے جتنی اس کی اخلاقی اہمیت ہے۔ آپ اپنے ملازموں اور مزدوروں کے لیے غیر سودی قرض کی سہولت بہم پہنچائیں گے تو صرف ایک ہی نیکی نہیں کریں گے بلکہ ان اسباب میں سے ایک بڑے سبب کو دور کر دیں گے جو آپ کے کارکنوں کو فکر، پریشانی، خستہ حالی، جسمانی آزاد اور مادی بربادی میں مبتلا کرتے ہیں۔"

مولانا محمد حفظ الرحمٰن کا خیال ہے کہ امداد باہمی کے بعض طریقے سودی کاروبار کے متبادل ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"چونکہ امداد باہمی تو اجتماعی زندگی کا اہم ترین فریضہ ہے جو مذہب، سیاست، معاشرت اور اقتصاد تمام شعبوں پر یکساں حاوی ہے جیسا کہ قرآن کے نص قطعی کا اعلان ہے:

تعاونوا علی البر و التقوی ولا تعاونوا علی الاثم و العدوان

(بھلائی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور برائی و سرکشی میں ہرگز ہرگز ایک دوسرے کی مدد نہ کرو)

اس لیے ترغیب کے ساتھ ساتھ اسلام ان شعبوں کے امداد باہمی کے بعض طریقے بھی بیان کرتا ہے، مثلاً تجارتی شعبہ میں مضاربت، معاوضہ، عناف، شرکت صنائع و جوہ وغیرہ اور زراعتی شعبہ میں مزارعۃ، معاملہ، مساقاۃ وغیرہ۔"

سودی کاروبار کے اہم متبادلات:

اسلام میں سودی کاروبار کے اہم متبادلات حسب ذیل ہیں:

1- مشارکہ
2- مضاربہ
3- مرابحہ
4- اجارہ
5- مسلم

6- استصناع

مشارکہ:

شیخ الاسلام مولانا مفتی جسٹس محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں:

"مشارکہ" اصل میں عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی شریک ہونا (حصہ دار بننا) ہے۔ کاروبار اور تجارت کے سیاق وسباق میں اس سے مراد ایک ایسا مشترکہ کاروبار ہے جس میں سب حصہ دار مشترکہ کاروباری مہم کے نفع یا نقصان میں شریک ہوتے ہیں۔ یہ سود پر مبنی تمویل کا ایک مثالی متبادل ہے جس کے دولت کی پیدائش اور تقسیم دونوں پر دُور رَس اثرات مرتب ہوتے ہیں۔"

مولانا محمد تقی موصوف نے "شرکۃ" اور "مشارکہ" میں قدرے فرق بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"مشارکہ" کی اصطلاح فقہ کی کتابوں میں نہیں ملتی۔ یہ اصطلاح ان حضرات نے آج کل متعارف کروائی جنھوں نے اسلامی طریقہ ہائے تمویل پر لکھا ہے اور یہ اصطلاح عموماً "شرکۃ" کی اس خاص قسم تک محدود ہوتی ہے جسے "شرکۃ الاموال" کہا جاتا ہے، جہاں دو یا زیادہ افراد کسی مشترکہ کاروباری مہم میں سرمایہ لگاتے ہیں۔ تاہم بعض اوقات یہ اصطلاح (مشارکہ) شرکۃ الاعمال کو بھی شامل ہوتی ہے جبکہ شراکت خدمات (Services) کے کاروبار میں وجود میں آئے۔"

مولانا موصوف کے نزدیک:

"مشارکہ" کا مفہوم شرکۃ الاموال تک ہی محدود ہے جبکہ شرکۃ کا لفظ ساجھی ملکیت اور شراکت داری کی ساری صورتوں کو شامل ہے۔"

مشارکہ (شرکت الاموال) میں فریقین کا تعلق معاہدہ کے ذریعے قائم ہوتا ہے۔ اس میں شرکاء میں تقسیم ہونے والے منافع کی شرح معاہدہ کرتے وقت طے کر لی جاتی ہے۔ نفع کی شرح کاروبار میں حقیقتاً ہونے والے نفع کی نسبت سے طے ہونا ضروری ہے۔ امام ابو حنیفہؒ کا خیال ہے کہ نفع کا تناسب سرمایہ کاری کے تناسب سے مختلف ہو سکتا ہے لیکن اگر کوئی شریک معاہدے میں یہ صریح شرط لگا دیتا ہے کہ وہ مشارکہ کے لیے کوئی کام نہیں کرے گا اور مشارکہ کی پوری مدت کے دوران وہ غیر عامل حصہ دار رہے گا تو نفع میں اس کے حصے کا تناسب اس کی سرمایہ کاری کے تناسب سے زیادہ نہیں ہو سکتا۔"

مشارکہ میں نقصان کے بارے میں تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ ہر شریک اپنی سرمایہ کاری کی

نسبت ہی سے نقصان برداشت کرے گا۔ امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک نفع فریقین میں طے پانے والی نسبت پر مبنی ہو گا اور خسارہ راس المال کے مطابق۔

مشارکہ میں فریقین کی حیثیت کے ضمن میں مولانا محمد تقی عثمانی کا کہنا ہے کہ اگر سارے شرکاء مشترکہ کاروباری مہم کے لیے کام کرنے پر اتفاق کرتے ہیں تو اس کاروبار کے تمام معاملات میں ہر شریک دوسروں کا وکیل سمجھا جائے گا اور کاروبار کے عام حالات میں ان میں سے کوئی شریک جو کام بھی کرے گا، اس کے بارے میں یہ تصور کیا جائے گا کہ دوسروں نے بھی اس کی منظوری دیدی ہے۔

مشارکہ میں ہر فریق اس کے انتظام میں حصہ لینے کا مستحق ہوتا ہے، تاہم شرکا اس شرط پر بھی اتفاق کر سکتے ہیں کہ مینجمنٹ ان میں سے ایک شریک کے ذمہ ہوگی اور باقی شرکاء میں سے کوئی بھی مشارکہ کے لیے کام نہیں کرے گا۔ اس صورت میں غیر عامل شریک اپنی سرمایہ کاری کی حد تک ہی نفع کا مستحق ہوگا۔

مضاربہ:

بقول مولانا مفتی محمد تقی عثمانی:

> "''مضاربہ'' شراکت کی ایک خاص شکل ہے جس میں ایک شریک دوسرے کو کاروبار میں لگانے کے لیے رقم فراہم کرتا ہے۔ سرمایہ کاری پہلے شخص کی طرف سے کی جاتی ہے اور اُسے ''رب المال'' کہا جاتا ہے، جبکہ کاروبار کے انصرام اور عمل کی ذمہ داری دوسرے فریق کے ساتھ خاص ہے، جسے ''مضارب'' کہتے ہیں۔"

مضاربہ کی دو قسمیں ہیں:

1- مضاربۃ المقیدہ جس میں رب المال مضارب کے لیے کوئی خاص کاروبار متعین کردے۔

2- مضاربۃ المطلقہ، جس میں رب المال مضارب کو آزاد چھوڑ دے کہ وہ جو کاروبار چاہے کرے۔

مولانا مفتی محمد تقی موصوف کا کہنا ہے کہ ایک رب المال ایک ہی عقد میں ایک سے زائد افراد کے ساتھ بھی مضاربہ کا معاملہ طے کر سکتا ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ رقم ''الف'' اور ''ب'' دونوں کو (مشترکہ طور پر) پیش کر سکتا ہے، لہٰذا ان دونوں میں سے ہر ایک اس کے لیے بطور مضارب کام کر سکتا ہے اور مضاربہ کا سرمایہ دونوں مشترکہ طور پر استعمال کریں گے اور مضارب کا حصہ ان دونوں کے درمیان طے شدہ تناسب سے تقسیم کیا جائے گا۔ اس صورت میں دونوں مضارب کاروبار ایسے چلائیں گے جیسا کہ دونوں آپس میں شریک ہوں۔

بقول مفتی محمد تقی عثمانی، مضاربہ کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ فریقین بالکل شروع میں حقیقی منافع کے خاص تناسب پر متفق ہوں جس کے مطابق رب المال اور مضارب میں ہر ایک منافع کا مستحق ہوگا۔ شریعت نے منافع کی کوئی متعین نسبت بیان نہیں کی بلکہ اسے فریقین کی باہمی رضامندی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اگر کاروبار کو بعض معاملات میں نقصان ہو اور بعض میں نفع تو پہلے اس نفع سے نقصان کو پورا کیا جائے گا۔ پھر بھی اگر کچھ بچ جائے تو اسے طے شدہ تناسب سے فریقین میں تقسیم کیا جائے گا۔

مرابحہ:

بقول مولانا محمد تقی عثمانی:

''''مرابحہ'' حقیقت میں اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے اور اس سے مراد ایک خاص قسم کی بیع ہوتی ہے جس کا اپنے اصل تصور کے اعتبار سے تمویل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ اگر کوئی بائع اپنے خریدار کے ساتھ اس پر اتفاق کر لیتا ہے کہ وہ اسے ایک متعین سامان متعین نفع پر دے گا جسے اس سامان کی لاگت پر زائد کیا جائے گا تو اسے ''مرابحہ'' کہا جاتا ہے۔
مرابحہ کا بنیادی عنصر یہ ہے کہ بیچنے والا اس لاگت کو ظاہر کرتا ہے جو اس نے اس سامان کے حصول پر برداشت کی ہے اور اس پر کچھ نفع شامل کر لیتا ہے۔ یہ نفع ایک متعین رقم کی شکل میں بھی ہو سکتا ہے اور فیصدی شرح پر مبنی بھی۔''

مرابحہ ایک قسم کی بیع ہے، اس لیے اس میں بیع کے تمام لوازمات کا پایا جانا ضروری ہے، مثلاً:

1- بیچی جانے والی چیز بیع کے وقت موجود ہونی چاہیے۔
2- فروخت کی جانے والی چیز بیع کے وقت بائع کی ملکیت میں ہو۔
3- بوقت بیع بیچی جانے والی چیز بیچنے والے کے حسی یا معنوی قبضے میں ہو۔

مرابحہ میں نفع کا تعین باہمی رضامندی سے دو طریقوں سے کیا جا سکتا ہے۔ یا تو کوئی بندھی مقدار طے کر لی جائے (مثلاً اصل لاگت پر اتنے روپے زائد) یا اصل لاگت پر خاص تناسب طے کر لیا جائے (یعنی اصل لاگت پر اتنے فیصد زائد)

یاد رہے کہ مرابحہ ادھار قیمت پر ایک چیز کی بیع ہے، جس کی قیمت میں لاگت کے علاوہ طے شدہ نفع بھی شامل ہے۔

اجارہ:

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ:

''''اجارہ'' اسلامی فقہ کی ایک اصطلاح ہے، جس کے لغوی معنی ہیں، کوئی چیز کرائے پر لینا۔
اسلامی فقہ میں اجارہ کی اصطلاح دو مختلف صورتوں کے لیے استعمال ہوتی ہے۔ پہلی صورت میں اجارہ کا معنی ہے کسی شخص کی خدمات حاصل کرنا جس کے معاوضے میں اسے تنخواہ دی جاتی ہے۔ خدمات حاصل کرنے والے کو ''مستاجر'' اور ملازم کو ''اجیر'' کہتے ہیں۔ اجارہ کی

دوسری قسم کا تعلق انسانی خدمات کے ساتھ نہیں بلکہ اثاثہ جات اور جائیداد کے منافع (حق استعمال) کے ساتھ ہے۔ اس مفہوم میں "اجارہ" کے معنی ہیں کسی متعین مملوکہ چیز کا منافع کسی دوسرے شخص کو اپنے کرائے کے بدلے میں منتقل کر دینا، جس کا اس سے مطالبہ کیا جائے۔ اس صورت میں اجارہ کی اصطلاح انگریزی اصطلاح "Leasing" کے ہم معنی ہوگی۔ کرائے پر دینے والا "موجر" کہلاتا ہے اور کرائے پر لینے والے کو "مستاجر" کہتے ہیں اور موجر کو جو کرایہ دیا جاتا ہے اُسے "اُجرت" کہتے ہیں۔"

یاد رہے کہ اجارہ اپنی اصل کے اعتبار سے کوئی طریقہ تمویل نہیں ہے بلکہ یہ بیع کی ایک معمول کی کاروباری سرگرمی ہے۔

اجارہ (Leasing) کے اہم قواعد درج ذیل ہیں:

1- اس میں کسی چیز کا مالک طے شدہ مدت کے لیے طے شدہ معاوضہ کے بدلے میں چیز کا حق استعمال کسی کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔
2- اجارہ ایسی چیز کا ہوسکتا ہے جس کا کوئی ایسا استعمال ہو جس کی کوئی قدر و قیمت ہو۔
3- اجارہ پر دی گئی چیز کی ملکیت موجر ہی کے پاس رہے گی اور مستاجر کو صرف حق استعمال منتقل ہوگا۔
4- اجارہ پر دی گئی چیز کی ملکیت کے ضمن میں موجر اور استعمال کے ضمن میں مستاجر ذمہ دار ہوگا۔
5- اجارہ کی مدت کا تعین واضح طور پر ہونا چاہیے۔
6- اجارہ پر دی جانے والی چیز کے استعمال کا مقصد بھی متعین ہونا چاہیے۔
7- مستاجر کی طرف سے اس چیز کے غلط استعمال یا غفلت و کوتاہی کی وجہ سے نقصان ہو، وہ اس کا معاوضہ ادا کرے گا۔
8- اجارہ پر دی جانے والی چیز متعینہ ہونی چاہیے۔
9- اجارہ پر دی جانے والی چیز کا کرایہ متعین ہونا چاہیے۔

مسلم:

مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ:

""مسلم" ایک ایسی بیع ہے، جس کے ذریعے بائع یہ ذمہ داری قبول کرتا ہے کہ وہ مستقبل کی کسی تاریخ میں متعین چیز خریدار کو فراہم کرے گا اور اس کے بدلے میں مکمل قیمت بیع کے وقت ہی پیشگی لے لیتا ہے۔"

اس قسم میں خریدار کو "رب السلم" اور بائع کو "مسلم الیہ" کہتے ہیں۔ خریدی ہوئی شے "مسلم فیہ" کہلاتی ہے۔

مولانا محمد تقی عثمانی کا کہنا ہے کہ مسلم کی حضور اقدس ﷺ نے مخصوص شرائط کے ساتھ اجازت دی تھی۔ اس بیع کا بنیادی مقصد چھوٹے کاشتکاروں کی ضرورت کو پورا کرنا تھا جنہیں اپنی فصل اگانے کے لیے اور فصل کی کٹائی تک اپنے بیوی بچوں کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ ربا کی حرمت کے بعد وہ سودی قرضہ نہیں لے سکتے تھے، اس لیے انہیں اجازت دی گئی کہ وہ اپنی زرعی پیداوار پیشگی قیمت پر فروخت کر دیں۔

مسلم کی شرائط حسب ذیل ہیں:

1- خریدار پوری کی پوری رقم عقد کے وقت ادا کر دے۔
2- مسلم انہی اشیاء میں جائز ہے جن کی کوالٹی اور مقدار کا پیشگی طور پر تعین ہو سکتا ہو۔
3- کسی متعین چیز یا متعین کھیت یا فارم کی پیداوار کی بیع سلم نہیں ہو سکتی۔
4- جس چیز کی سلم کرنا مقصود ہو اس کی نوعیت اور معیار کا تعین واضح طور پر ہونا چاہیے۔
5- بیچی جانے والی چیز کی مقدار یا وزن متعین ہونا چاہیے۔
6- بیچی جانے والی چیز کی سپردگی کی تاریخ اور جگہ کا تعین عقد میں ہونا چاہیے۔
7- جن اشیاء کی فوری ادائیگی ضروری ہو، ان کی بیع سلم نہیں ہوگی۔

استصناع:

استصناع بیع کی ایک قسم ہے جس میں سودا چیز کے وجود میں آنے سے پہلے ہی کر لیا جاتا ہے۔ اس میں خریدار کوئی چیز تیار کروانے کے لیے کسی کاریگر یا صانع سے معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اس کے لیے فلاں چیز تیار کر دے۔ اگر تیار کنندہ اپنے پاس سے خام مال لگا کر خریدار کے لیے اس کی مطلوبہ چیز تیار کرنے کی ذمہ داری قبول کرے تو معاہدہ استصناع وجود میں آ جائے گا۔ معاہدہ استصناع کے لیے ضروری ہے کہ مطلوبہ چیز کی قیمت، اوصاف اور معیار کا تعین کر لیا جائے۔ اس میں مدت کا تعین بھی کر لینا چاہیے۔ اگر تیار کنندہ فراہمی میں متعین وقت سے تاخیر کر دے تو خریدار اسے قبول کرنے اور قیمت ادا کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔ بعضوں کا خیال ہے کہ اس (مذکورہ) صورت میں چیز تیار نہ کرنے والے پر جرمانہ عائد ہوگا۔ جس کا حساب یومیہ بنیاد پر کیا جائے گا۔ استصناع میں یہ ضروری نہیں ہے کہ قیمت پیشگی ادا کی جائے۔ قیمت فریقین کے معاہدے کے مطابق کسی بھی وقت تک مؤجل ہو سکتی ہے۔

مولانا مفتی محمد تقی عثمانی کا خیال ہے کہ استصناع کو مخصوص معاہدوں میں تمویل کی سہولت فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ خاص طور پر ہاؤس بلڈنگ فنانس کے شعبے ہیں۔ اگر کلائنٹ کے پاس اپنی زمین ہے اور وہ گھر کی تعمیر کے لیے تمویل چاہتا ہے تو تمویل کار اس کھلی زمین پر استصناع کی بنیاد پر گھر تعمیر کر دینے کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے اور اگر کلائنٹ کے پاس اپنی زمین نہیں ہے اور وہ زمین بھی خریدنا چاہتا ہے تو

Shahzad 1 + 1 1 1 1 + گھر 1 ، فلیٹ 2

تمویل کار یہ ذمہ داری قبول کرسکتا ہے کہ وہ اسے زمین کے ایسے قطعے پر تعمیر شدہ گھر مہیا کرے گا جس کی تفصیلات پہلے سے طے کر لی گئی ہوں۔ یہ ضروری نہیں کہ تمویل کار گھر کی خود تعمیر کرے بلکہ وہ کسی تیسرے فریق کے ساتھ متوازی استصناع کے معاہدے میں بھی داخل ہوسکتا ہے یا وہ ٹھیکیدار کی خدمات بھی حاصل کرسکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

غیر سُودی بنکاری

سوال 1: غیر سودی بنکاری کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالیے اور اس سلسلہ میں علمائے کرام کی طرف سے پیش کی جانے والی تجاویز کی نشاندہی کریں!

سوال 2: اسلامی سرمایہ کاری کے مختلف فنڈز (آلات) پر روشنی ڈالیے!

سوال 3: پاکستان میں اسلامی بنکاری کے لیے کی جانے والی کوششوں کا جائزہ لیجیے!

غیر سُودی بنکاری کی اس کی ضرورت واہمیت:

اسلام میں سُود حرام ہے۔ مرجہ قسم کے بنک سودی کاروبار کرتے ہیں۔ اسلامی نقطہ نظر سے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس قسم کے بنک قائم کیے جائیں جو سودی کاروبار سے پاک ہوں اور انہیں صحیح معنوں میں ''اسلامی بنک'' قرار دیا جاسکے۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ''بنکنگ کی اسلامی صورت'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں:

''دراصل بنکنگ بھی موجودہ تہذیب کی پرورش کی ہوئی بہت سی چیزوں کی طرح ایک ایسی اہم اور مفید چیز ہے، جس کو صرف ایک شیطانی عنصر کی شمولیت نے گندہ کر رکھا ہے۔ اوّل تو وہ بہت سی ایسی جائز خدمات انجام دیتا ہے جو موجودہ زمانے کی تمدنی زندگی اور کاروباری ضروریات کے لیے مفید بھی ہیں اور ناگزیر بھی، مثلاً رقموں کا ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجنا اور ادائیگی کا انتظام کرنا، بیرونی ممالک سے لین دین کی سہولتیں بہم پہنچانا، قیمتی اشیاء کی حفاظت کرنا، اعتماد نامے، سفری چیک اور گشتی نوٹ جاری کرنا، کمپنیوں کے حصص کی فروخت کا انتظام کرنا اور بہت سی وکیلانہ خدمات جنہیں تھوڑے سے کمیشن پر بنک کے سپرد کر کے آج ایک مصروف آدمی خلاصی پالیتا ہے۔ یہ وہ کام ہیں جنہیں بہرحال جاری رہنا چاہیے اور ان کے لیے ایک مستقل ادارے کا ہونا ضروری ہے۔''

مولانا موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں کہ:

''پھر یہ بات بھی بجائے خود تجارت، صنعت، زراعت اور ہر شعبۂ تمدن ومعیشت کے لیے نہایت مفید اور آج کے لحاظ سے نہایت ضروری ہے کہ معاشرے کا فاضل سرمایہ بکھرا ہوا

رہنے کے بجائے ایک مرکزی ذخیرہ میں مجتمع ہو اور وہاں سے زندگی کے ہر شعبے کو آسانی کے ساتھ ہر وقت ہر جگہ بہم پہنچ سکے۔ اس کے ساتھ عام افراد کے لیے بھی اس میں بڑی سہولت ہے کہ جو تھوڑا بہت سرمایہ ان کی ضرورت سے بچ رہتا ہے، اسے وہ کسی نفع بخش کام میں لگانے کے مواقع الگ الگ بطور خود ڈھونڈتے پھرنے کے بجائے سب اس کو ایک مرکزی ذخیرے میں جمع کرا دیا کریں اور وہاں ایک قابل اطمینان طریقے سے اجتماعی طور پر ان سب کے سرمائے کو کام پر لگانے اور حاصل شدہ منافع کو ان پر تقسیم کرنے کا انتظام ہوتا رہے۔''

مولانا موصوف مزید لکھتے ہیں کہ:

''مستقل طور پر مالیات ہی کا کام کرتے رہنے کی وجہ سے بنک کی منتظمین اور کارکنوں کو اس شعبہ فن میں ایک ایسی مہارت اور بصیرت حاصل ہو جاتی ہے جو تاجروں، صناعوں اور دوسرے معاشی کارکنوں کو نصیب نہیں ہوتی۔ یہ ماہرانہ بصیرت بجائے خود ایک نہایت قیمتی چیز ہے اور بڑی مفید ثابت ہو سکتی ہے، بشرطیکہ یہ محض ساہو کار کی خود غرضی کا ہتھیار بن کر نہ رہے بلکہ کاروباری لوگوں کے ساتھ تعاون میں استعمال ہو۔''

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا کہنا ہے کہ سود کی کشش سے جو سرمایہ کھنچ کھنچ کر بنکوں میں مرتکز ہوتا ہے وہ عملاً چند خود غرض سرمایہ داروں کی دولت بن کر رہ جاتا ہے، جسے وہ نہایت دشمن اجتماع طریقوں سے استعمال کرتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ اگر یہ خرابیاں دور کر دی جائیں تو بنکنگ ایک پاکیزہ کام بھی ہو جائے گا، تمدن کے لیے موجودہ حالت کی بہ نسبت بدرجہا زیادہ منافع بھی ہوگا اور عجب نہیں کہ خود ساہو کاروں کے لیے بھی سود خواری کی بہ نسبت یہ دوسرا پاکیزہ طریق کار مالی حیثیت سے زیادہ فائدہ مند ہو۔

انسدادِ سود:

مولانا مودودی کا خیال ہے کہ اسلامی بنکاری شروع کرنے سے قبل ضروری ہے کہ بنکوں سے سود کو یک لخت خاتمہ کر دیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ اجتماعی معیشت اور نظام مالیات میں بے شمار خرابیاں صرف اس وجہ سے پیدا ہوئی ہیں کہ قانون نے سود کو جائز کر رکھا ہے۔

وہ لکھتے ہیں کہ:

''ظاہر بات ہے کہ جب ایک آدمی کے لیے سُود کا دروازہ کھلا ہوا ہے تو وہ اپنے ہمسائے کو قرض حسن کیوں دے؟ اور ایک کاروباری آدمی کے ساتھ نفع ونقصان کی شرکت کیوں کرے؟ اور اپنی قومی ضروریات کی تکمیل کے لیے مخلصانہ اعانت کا ہاتھ کیوں بڑھائے؟

اور کیوں نہ اپنا جمع کیا ہوا سرمایہ ساہوکار کے حوالہ کر دے جس میں اس کو گھر بیٹھے ایک لگا بندھا منافع ملنے کی امید ہو؟"

مولانا موصوف کا کہنا ہے کہ اسلامی بنکاری کے لیے لازم ہے کہ سب سے پہلے اس دروازے کو بند کیا جائے جس سے خرابی آرہی ہے، یعنی سُود کو قانوناً ختم کر دیا جائے۔

انسدادِ سُود کے بعد سرمایہ:

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسدادِ سُود کے بعد بنکوں میں سرمایہ اکٹھا ہونا ہی بند ہو جائے گا کیونکہ لوگوں کو سُود ملنے کی توقع نہ رہے گی۔ اس خدشہ کو رفع کرنے کے لیے مولانا مودودی کا جواب یہ ہے کہ جو لوگ ایسا سوچتے ہیں، غلطی پر ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس وقت سود نہ سہی، نفع ملنے کی توقع تو ضرور ہوگی اور چونکہ نفع کا امکان غیر معین اور غیر محدود ہوگا، اس لیے عام شرح سود کی نسبت کم نفع حاصل ہونے کا جس قدر امکان ہوگا اسی قدر اچھا خاصا زیادہ نفع ملنے کا امکان بھی ہوگا۔ اس کے ساتھ بنک وہ تمام خدمات بدستور انجام دیتے رہیں گے جن کی خاطر اب لوگ بنکوں کی طرف رجوع کیا کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ بالکل ایک یقینی بات ہے کہ جس مقدار میں اب سرمایہ بنکوں کے پاس آتا ہے، اسی مقدار میں انسدادِ سُود کے بعد بھی آتا رہے گا بلکہ اس وقت چونکہ ہر طرح کے کاروبار کو فروغ حاصل ہوگا، روزگار بڑھ جائے گا اور آمدنیاں بھی بڑھ جائیں گی اس لیے موجودہ حالت کی بہ نسبت کہیں بڑھ چڑھ کر فاضل آمدنیاں بنکوں میں جمع ہوں گی۔"

بنکوں میں جمع ہونے والے سرمایہ سے متعلق:

بنکوں میں عام طور پر قلیل مدت کے لیے یا طویل مدت کے لیے سرمایہ جمع کرایا جاتا ہے۔ قلیل مدت کے لیے جمع کرایا جانے والا کھاتا "چالو کھاتا" کہلاتا ہے۔ اس ضمن میں مولانا مودودی کی تجویز ہے کہ:

"جمع شدہ سرمایہ کا جس قدر حصہ چالو کھاتے یا عندالطلب کھاتے میں ہوگا اس کو تو بنک کسی نفع بخش کام میں نہ لگا سکیں گے، جس طرح اب بھی نہیں لگا سکتے، اس لیے وہ زیادہ تر دو بڑے کاموں میں استعمال ہوگا۔ ایک روز مرہ کا لفظ لین دین دوسرے کاروباری لوگوں کو قلیل المدت قرضے بلا سُود دینا اور ہنڈیاں بلا سُود بھُنانا۔"

طویل مدت کے لیے جمع کرائے جانے والے سرمایہ کے ضمن میں مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ:

"وہ سرمایہ جو لمبی مدت کے لیے بنکوں میں رکھا جائے گا، وہ لازماً دو ہی قسم کا ہوگا:

1- ایک وہ جس کے مالک صرف اپنے مال کی حفاظت چاہتے ہوں۔ ایسے لوگوں کے مال کو بنک قرض

کے طور پر لے کر خود کاروبار میں استعمال کر سکیں گے۔

2- دوسرا وہ جس کے مالک اپنے مال کو بنکوں کے توسط سے کاروبار میں لگانا چاہتے ہوں۔ ان کے مال کو امانت میں رکھنے کے بجائے ہر بنک کو ان کے ساتھ شراکت نامہ عام طے کرنا ہوگا۔ پھر بنک اس سرمایہ کو دوسرے سرمایوں سمیت مضاربت کے اصول پر تجارتی کاروبار میں، صنعتی اسکیموں میں زراعتی کاموں میں اور پبلک اداروں اور حکومتوں کے نفع آور کاموں میں لگا سکیں گے۔"

مولانا موصوف کا خیال ہے کہ مضاربت وغیرہ میں لگائے گئے سرمایہ سے جو منافع بنکوں کو حاصل ہوگا، وہ اس کو اپنے انتظامی مصارف نکالنے کے بعد ایک مقرر تناسب کے مطابق اپنے حصے داروں اور کھاتا داروں میں تقسیم کر دیں گے۔

اسلامی سرمایہ کاری کے لیے مختلف فنڈز:

مولانا مفتی جسٹس محمد تقی عثانی نے اسلامی بنک کے لیے "اسلامی سرمایہ کاری" کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ "اسلامی سرمایہ کاری سے ان کی مراد ایسا مشترکہ حوض ہے جس میں سرمایہ کار اپنی ضرورت سے زائد بچی ہوئی رقم شامل کرتے ہیں تاکہ ان رقوم سے حلال منافع حاصل کرنے کے لیے اسلامی شریعت کے بالکل مطابق سرمایہ کاری کی جائے۔ اس ضمن میں رقم لگانے والوں کو کوئی ایسی دستاویز بھی دی جاسکتی ہے جو ان کی شامل کردہ رقم کی تصدیق کرے اور انہیں فنڈ کو عملاً حاصل ہونے والے منافع میں ان کے حصے کے تناسب سے نفع کا حقدار ٹھہرائے۔ اس دستاویز کو سرٹیفکیٹ، یونٹ، شیئر یا کوئی اور نام دیا جاسکتا ہے۔

مولانا موصوف نے اسلامی سرمایہ کاری کے لیے حسب ذیل قسم کے فنڈز تجویز کیے ہیں:

1- ایکویٹی فنڈ (Equity Fund)

2- اجارہ فنڈ (Lease Fund)

3- اشیاء کا فنڈ

4- مرابحہ فنڈ

5- مخلوط اسلامی فنڈ (Mixed Islamic Fund)

ایکویٹی فنڈ:

بقول جسٹس محمد تقی عثانی، ایکویٹی فنڈ میں رقم جوائنٹ سٹاک کمپنیوں کے شیئرز میں لگائی جاتی ہے اور شیئرز کی قیمتیں بڑھ جانے پر انہیں بیچ کر منافع حاصل کیا جاتا ہے۔ متعلقہ کمپنیوں کی طرف سے تقسیم کیے جانے والے منافع منقسمہ کے ذریعے بھی منافع حاصل کیا جاسکتا ہے۔ فقہائے اسلام کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر کسی کمپنی کے تمام معاملات شریعت کے مکمل طور پر مطابق ہیں اور وہ کمپنی نہ تو سودی قرضہ لیتی ہے اور نہ ہی اپنی رقوم سودی کھاتوں میں رکھواتی ہو تو اس کے شیئرز خریدنا، اپنے پاس رکھنا اور انہیں بیچنا جائز ہے۔

شیئرز میں سرمایہ کاری کی شرائط حسب ذیل ہیں:

1- کمپنی کا مرکزی کاروبار شریعت کے خلاف نہ ہو۔

2- اگر کمپنی کا مرکزی کاروبار حلال ہے، لیکن وہ اپنا زائد سرمایہ سودی اکاؤنٹ میں رکھواتی ہے یا سودی قرضے لیتی ہے تو شیئر ہولڈرز کو اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔

3- اگر کمپنی کی آمدن میں سودی کھاتوں سے حاصل ہونے والی کچھ آمدن بھی شامل ہو تو شیئر ہولڈر کو ادا کیے گئے منافع سے اس تناسب سے نفع کا حصہ خیرات کر دیا جائے اور شیئر ہولڈر خود اس کا فائدہ نہ اٹھائے۔

4- اگر کمپنی کے سارے اثاثہ جات زر کی صورت میں ہوں تو شیئرز لکھی ہوئی قیمت پر ہی بیچے اور خریدے جاسکتے ہیں، کیونکہ زر کا تبادلہ صرف برابر برابر ہی کیا جاسکتا ہے۔

بقول مفتی محمد تقی عثمانی، ایکویٹی فنڈ میں پیسے ڈالنے والے شرعی طور پر باہم شریک متصور ہوں گے اور تمام رقوم سے ایک مشترکہ حوض بن جائے گا، جسے مختلف کمپنیوں کے شیئرز کی خریداری کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ نفع متعلقہ کمپنیوں کی طرف سے تقسیم کیے گئے منافع مقسمہ سے بھی حاصل کیا جاسکتا ہے اور حصص کی قیمتوں میں اضافے کے ذریعے بھی، مولانا محمد تقی کا خیال ہے کہ فنڈ کا نظم ونسق دو طریقوں سے چلایا جاسکتا ہے۔ پہلی صورت یہ ہے کہ انتظامیہ رقم لگانے والوں کے لیے بطور مضارب کام کرے۔ اس صورت میں ایکویٹی فنڈ کو حاصل ہونے والے سالانہ منافع میں سے متعین فیصد تناسب انتظامیہ کے معاوضے کے طور پر مقرر کیا جاسکتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ انتظامیہ شرکاء کے وکیل کے طور پر کام کرے اور خدمات کے عوض پہلے سے طے شدہ فیس وصول کرے، جو یک مشت بھی ہوسکتی ہے، ماہانہ بھی اور سالانہ بھی۔

اجارہ فنڈ:

''اجارہ'' سے مراد ہے، کرایہ پر دینا، اجارہ فنڈ میں لوگوں کی جمع شدہ رقوم کو جائیداد، موٹر گاڑیاں اور دوسرا ساز وسامان خریدنے کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ ان اثاثوں کا مالک فنڈ ہی رہتا ہے اور استعمال کنندگان سے کرایا لیا جاتا ہے، جو فنڈ کے لیے آمدن کا ذریعہ ہوتا ہے۔ منافع بقدر حصص حصہ داران میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس میں ہر حصہ دار کو ایک سرٹیفکیٹ دیا جاتا ہے جو کرائے پر دیئے گئے اثاثوں میں اس کی متناسب ملکیت کا ثبوت ہوتا ہے۔ ان سرٹیفکیٹس کو ''صک'' (جمع: صکوک) کہا جاتا ہے جو قابل تبادلہ ہوتے ہیں اور ان کی خرید وفروخت کی جاسکتی ہے۔ اجارہ کے معاہدہ کا شرعی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

اشیاء کا فنڈ:

اشیاء کے فنڈ میں جمع شدہ رقوم کو مختلف اشیاء کی خریداری کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جنھیں فروخت کر کے منافع حاصل کیا جاتا ہے۔ یہ منافع پیسے شامل کرنے والوں میں بحصہ رسدی تقسیم کر دیا جاتا

ہے۔اس ضمن میں بیع کے شرعی احکام کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

مرابحہ فنڈ:

مرابحہ بیع کی ایک قسم ہے جس میں اشیاء اصل لاگت پر زائد منافع شامل کر کے بیچی جاتی ہیں۔ مرابحہ فنڈ میں جمع ہونے والی رقم سے بنک اپنے کلائنٹ کے لیے کوئی چیز خریدتے ہیں اور وہ اس کلائنٹ کے ہاتھ لاگت پر طے شدہ نسبت سے نفع کا اضافہ کر کے ادھار بیچ دیتے ہیں۔ یہ مشترکہ فنڈ یا تو نقد رقم پر مشتمل ہوتا ہے یا قابل وصول دیون پر اس لیے اس فنڈ کے یونٹ زر قابل وصول دیون کی نمائندگی کرتے ہیں۔

مخلوط اسلامی فنڈ:

مخلوط اسلامی فنڈ میں لوگوں کی لگائی ہوئی رقوم سرمایہ کاری کی مختلف اقسام، مثلاً ایکویٹی، لیزنگ یا اشیاء کے کاروبار وغیرہ میں لگائی جاسکتی ہیں۔ مولانا محمد تقی کا خیال ہے کہ اس صورت میں اگر فنڈ کے حسی اور مادی اثاثے 51 فیصد سے زائد اور سیال اثاثے اور دیون 50 فیصد سے کم ہوں تو فنڈ کے یونٹ قابل فروخت ہوں گے۔ تاہم اگر سیال اثاثے اور دیون 50 فیصد سے زائد ہوں، تو اکثر معاصر علماء کی رائے کے مطابق ان کی تجارت نہیں ہو سکے گی۔

اسلامی بنکاری سے متعلقہ تجاویز:

علماء وفقہائے اسلام کا خیال ہے کہ موجودہ دور میں سود سے پاک معیشت کے لیے اسلامی بنک کا قیام عمل میں لایا جائے۔ اس ضمن میں انہوں نے حسب ذیل تجاویز پیش کی ہیں:

1- بنک کا قیام افراد کے ذاتی سرمایہ سے بھی عمل میں لایا جا سکتا ہے اور سرکاری طور پر حکومتی سرمایہ کے ذریعے بھی۔
2- حصہ داروں کی طرف سے فراہم کیے جانے والے سرمایہ سے مختلف قسم کے کاروبار کیے جا سکتے ہیں، مثلاً ضرابت، اجارہ اور مرابحہ (تجارت) وغیرہ۔
3- کل بنیادی سرمایہ کو مساوی حصص میں تقسیم کر دیا جائے اور لوگ بیش، کم یا برابر تعداد میں حصص خریدیں۔
4- ہر حصص بردار کا منافع اس کے حصص کے تناسب سے مقرر ہو۔
5- نقصان کی صورت میں تاوان کا تناسب حصہ داروں کے حصص کے تناسب سے عائد کیا جائے۔
6- بنک آمدنی میں اضافہ کے لیے عام افراد یا اداروں اور حکومت کے لیے مختلف قسم کی خدمات انجام دے۔
7- بنک کے اخراجات سرمایہ میں سے کیے جائیں۔

8- بنک کے تمام فیصلے حصہ داران کی باہمی مشاورت سے کیے جائیں۔
9- حصہ داروں کی مالی ذمہ داری غیر محدود ہو اور بنک کو اس کے حصص برداران کی طرف سے قرض کے لین دین کرنے کی اجازت ہو۔
10- ہر حصہ دار کو کاروبار سے کسی بھی وقت علیحدہ ہونے کی اجازت ہو اور علیحدگی کے نوٹس کے ساتھ ہی اس کا سرمایہ بمعہ نفع ونقصان واپس کر دیا جائے۔
11- کسی حصہ دار کی وفات کے بعد اس کا حصہ بمعہ نفع ونقصان اس کے قانونی وارثان کو دیا جائے۔
12- کرنٹ اکاؤنٹ میں کھاتا دار کو یہ اجازت ہونی چاہیئے کہ وہ جب جی چاہے رقم جمع کرائے اور جب جی چاہے نکلوائے یا اپنا کھاتا ختم کر دے۔ کرنٹ اکاؤنٹ کے کھاتا دار بنک کے نفع ونقصان کے ذمہ دار نہیں ہوں گے اور نہ ہی وہ کوئی نفع طلب کریں گے۔
13- سرمایہ کاری اکاؤنٹ میں رقم جمع کروانے والے کاروبار میں نفع پانے کے مستحق اور نقصان کے ذمہ دار ہوں گے۔
14- کارخانہ دار لوگ بنک کی طرف سے مضاربت کے لیے رقم لے سکیں گے۔ اسی طرح کوئی بھی ضرورت مند مضاربت کی بناء پر بنک سے رقم حاصل کر سکے گا۔
15- مضاربت کھاتا داروں میں ایک مقررہ مدت کے بعد ان کے سرمایوں کے لحاظ سے جس شرح سے بنک کو منافع ہوا ہے، اسی شرح پر تقسیم کیا جائے گا۔ اگر بنک کو مجموعی طور پر نقصان ہوا ہو تو یہ نقصان مضاربت کھاتا داروں کو شرح نقصان کے مطابق برداشت کرنا پڑے گا۔
16- مضاربت کھاتا میں جمع کروائی گئی رقم چیک کے ذریعے نہیں نکلوائی جا سکے گی اور نہ ہی اسے کسی دوسرے فرد کے نام منتقل کیا جا سکے گا۔ اس کھاتا سے رقم نکلوانے کے لیے ایک مناسب عرصہ پہلے بنک کو مطلع کرنا ہوگا۔

مالیات کی فراہمی کے اسلامی طریقے:

سٹیٹ بنک آف پاکستان نے مالیات کی فراہمی کے لیے مندرجہ ذیل طریقوں کو منظور کیا ہے۔

1- قرضہ جاتی طریقے:

حق الخدمت (سروس چارج) کے عوض غیر سودی مالیات کی فراہمی کا طریقہ برآمدات، چھوٹے کاشتکاروں کو زرعی مداخل فراہم کرنے اور تنخواہ دار طبقہ کو مالیات فراہم کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

2- قرض حسنہ:

ضرورت مند طلباء کو اندرون ملک اور بیرون ملک حصول تعلیم میں مدد دینے کے لیے قومی بنک قرض

حسن جاری کرتے ہیں۔اس مد سے قرض حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ امیدوار کی عمر 35 سال سے کم ہو اور وہ مالی مشکلات میں مبتلا ہو۔قرضہ کی واپسی تعلیم مکمل کرنے کے دو سال بعد شروع ہوتی ہے۔

3- تجارت سے متعلق مالیات کی فراہمی کا طریقہ:

اس شعبہ میں بنک اشیاء خرید کر اپنے گاہکوں کو لاگت پر طے شدہ منافع پر فروخت کرتا ہے۔یہ قیمت آئندہ طے شدہ قیمت پر یک مشت یا بالاقساط ادا کی جاسکتی ہے۔اسے ''بیع المؤجل'' بھی کہا جاسکتا ہے۔

4- مارک ڈاؤن (Mark Down):

اس طریقے سے بنک منقولہ یا غیر منقولہ جائیداد خریدتا ہے اور گاہک عہد کرتا ہے کہ وہ اسے بعد میں بنک سے خریدلے گا۔ قیمت خرید اور قیمت فروخت میں پایا جانے والا فرق بنک کا منافع ہوتا ہے، جسے "Mark Down" کہتے ہیں۔

5- لیزنگ (Leasing):

لیزنگ (اجارہ) درمیانی مدت اور طویل المدت کا مالیاتی آلہ ہے، جس میں مستجر آجر سے ایک مقررہ طے شدہ مدت کے لیے کسی اثاثہ کو استعمال کرنے کا حق حاصل کرتا ہے جبکہ حق ملکیت مستجر ہی کے پاس رہتا ہے اور وہ مذکورہ چیز طے شدہ مدت کے بعد واپس حاصل کر لیتا ہے۔اس شعبہ میں بہت سی مضاربہ کمپنیاں کاروبار کر رہی ہیں۔

6- کرائے پہ خریداری (Hire Purchases):

اس طریقہ میں بنک کو کرائے کی شکل میں مناسب منافع مل جاتا ہے اور دوسری طرف خریدار کو مطلوبہ اشیاء آسانی سے مل جاتی ہیں۔

7- ڈویلپمنٹ چارجز (Development Charges):

اس طریقہ میں زمین یا جائیداد کی ترقی کے لیے اقدامات کرنے کی غرض سے بنک کی طرف سے قرضے جاری کیے جاتے ہیں اور بنک جائیداد کی قدر میں اضافہ شدہ مالیت میں سے حصہ پاتا ہے۔

سرمایہ کاری کے آلات:

سرمایہ کاری کے آلات حسب ذیل ہیں:

1- مشارکہ
2- مضاربہ
3- ایکویٹی فنڈ

4- اجارہ فنڈ

5- اشیاء کا فنڈ

6- مرابحہ فنڈ

7- کرایہ میں شراکت کی بنیاد پر سرمایہ کاری

(مذکورہ بالا آلات سرمایہ کاری کا تذکرہ سابقہ صفحات میں کیا جا چکا ہے)

پاکستان میں اسلامی ذرائع تمویل و سرمایہ کاری:

جنرل محمد ضیاء الحق کے عہد میں ستمبر 1977ء میں اسلامی نظریاتی کونسل کو حکم دیا گیا کہ وہ سود سے پاک اسلامی معیشت کے ضمن میں اپنی سفارشات مرتب کر کے پیش کرے۔ کونسل ہذا نے اپنی سفارشات پیش کیں تو ان سفارشات کی روشنی میں جنوری 1982ء میں ملک کے تمام بنکوں میں نفع و نقصان میں شراکت کی بنیاد (PLS) پر کاؤنٹر کھول دیئے۔ اس سے پہلے 1975ء میں مندرجہ ذیل تین اداروں کو بلا سود بنکاری کے لیے چنا جا چکا تھا۔

1- NIT

2- CP

3- HBFC

یکم جولائی 1980ء سے ہاؤس بلڈنگ فنانس کارپوریشن نے بلا سود بینکاری کا کام شروع کیا، جنوری 1982ء سے تجارتی بنک (Pls) کاؤنٹر کے تحت معیاری کھاتے کھولے گئے، جن میں کم از کم ایک ہزار روپے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔ غیر معیاری کھاتے میں صرف ایک سو روپے سے اکاؤنٹ کھولا جا سکتا ہے۔ بنک ہر چھ ماہ بعد نفع و نقصان کا اعلان کرتا ہے۔

1985ء میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سرکاری کارپوریشنوں اور پرائیویٹ کمپنیوں کو شریعت کے مطابق قرضے فراہم کیے جائیں گے اور سٹیٹ بنک بھی تجارتی بنکوں سے اسلامی بنکاری کے تحت معاملات کرے گا۔

IDBP نے جنوری 1985ء سے اور NDFC نے جون 1985ء سے بلا سود کاروبار شروع کیا۔

کونسل (CLL) نے بلا سود بنکاری کے ضمن میں مندرجہ ذیل سفارشات مرتب کی تھیں:

1- بنک ان صنعتی اداروں کو قرض دیں گے، جو PLS اکاؤنٹ کے تحت اپنے حسابات رکھتے ہیں اور CA سے آڈٹ کراتے ہیں۔

2- ایسے ادارے جو CA سے آڈٹ نہیں کرواتے، بیع المؤجل کے تحت قرضے حاصل کر سکیں گے۔

3- چھوٹے کاروباری افراد معیاری شرح منافع، بیع المؤجل اور لیزنگ کے تحت قرضے حاصل کر

سکیں گے۔

4- بنک تمام منصوبے اور پراجیکٹ غیر بنکاری مالیاتی اداروں کے ساتھ مل کر تیار کریں گے۔

5- کاشتکاری کو چھوٹے قرضے بلا سود فراہم کیے جائیں گے۔

6- بنک مالیات غیر سودی ذرائع سے حاصل کریں گے۔

7- گزارہ حد کے کسانوں کو بلا سود قرضے نقدی یا اجناس کی صورت میں اور گزارہ حد سے اوپر کے کسانوں کو تجارتی بنک بیع المؤجل اور بیع سلم کے طریق پر قرضے دیں گے۔

8- درمیانی اور طویل المدت زرعی قرضے زرعی مشینری کی خریداری، ٹیوب ویلوں کی تنصیب، زمین کی ترقی، گوداموں کی تعمیر اور پولٹری فارمنگ وغیرہ کے لیے دیئے جائیں گے۔

9- چھوٹے پرچون فروشوں کو جو اپنے حسابات رکھتے ہوں بیع المؤجل کے تحت قرضے دیئے جائیں گے۔

10- آفات ارضی وسماوی کے باعث فصلیں تلف ہونے پر کسانوں کو زکوۃ فنڈ سے قرضے فراہم کیے جائیں گے۔

11- تمام منافع جات کی شرح کم وبیش یکساں ہوگی۔

12- PICIC کے تمام کھاتے غیر سودی (PLS) کھاتا میں منتقل کر دیئے جائیں گے۔

13- ڈبنچر کے بجائے PTC جاری کیے جائیں گے۔

14- امداد باہمی بنکوں کے قرضوں کو بھی غیر سودی نظام کے تحت جاری کیا جائے گا۔

15- پاکستانی بنکوں کی بیرونی ملک کام کرنے والی شاخیں بدستور سودی معاملات جاری رکھیں گی۔ بیرونی حکومتوں، مالیاتی اداروں اور بین الاقوامی مالیاتی اداروں کے ساتھ رائج الوقت لین دین کا طریقہ اور سودی واجبات کی ادائیگی اس وقت تک جاری رہے گی جب تک ہم ایسے معاملات کے لیے سود سے مبرا متبادل طریق کار وضع نہیں کر لیتے، جو فریقین کے لیے قابل قبول ہو۔

16- سٹیٹ بنک اپنے فرائض انجام دیتا رہے گا، تاہم کمرشل بنکوں اور دیگر مالیاتی اداروں کو Pls سسٹم کے تحت قرضے فراہم ہوں گے۔

17- سٹیٹ بنک اپنے ملازمین کو غیر سودی قرضے فراہم کرے گا۔

18- غیر ملکی زر مبادلہ سے متعلق سودی معاملات فی الحال اسی طرح جاری رہیں گے۔

19- سٹیٹ بنک زری رسد کو کنٹرول کرنے کے ساتھ ساتھ زر اور زر اعتبار کی تقسیم کو منصفانہ بنانے کی پوری کوشش کرے گا تا کہ فلاحی مقاصد حاصل ہو سکیں۔

20- مالیاتی پالیسی اور مرکزی بنک پالیسی (SBP) کی زرعی پالیسی میں مطابقت وموافقت پیدا کرنے پر خصوصی توجہ دی جائے گی۔

عدالت کا فیصلہ:

1992ء میں فیڈرل شریعت کورٹ نے تجارتی بنکوں کے سود کو "ربوا" قرار دیتے ہوئے حکم دیا کہ غیر سودی بنکاری نظام کو ختم کر دیا جائے لیکن حکومت نے اسے قبول نہ کرتے ہوئے سپریم کورٹ میں اپیل دائر کر دی۔ عدالت نے سود کے خاتمہ کے معاملہ پر تفصیلی بحث کرنے کے بعد 23 دسمبر 1999ء کو فیصلہ سنایا کہ ہر قسم کا ربوا اسلام کے تحت حرام اور ناجائز ہے، اس لیے حکومت 31 مارچ 1901ء تک ربوا کا مکمل خاتمہ کر دے اور سٹیٹ بنک آف پاکستان ایک اعلیٰ اختیاراتی کمیشن تشکیل دے، جو اس فیصلہ پر عمل درآمد کرانے کے لیے حکمت عملی تیار کرے۔ عدالت ہذا نے مالیاتی اداروں کو ہدایت کی کہ وہ چھ ماہ کے اندر ماڈل پرابیئت کا خاکہ تیار کریں۔

☆ ☆ ☆ ☆

انشورنس اسلام کی نظر میں

سوال: اسلام میں انشورنس پر بحث کریں۔

بیمہ (انشورنس) کی حقیقت:

بیمہ درحقیقت دو اطراف یا دو فریقین (Parties) کے مابین واقع ہونے والا ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ایک طرف سے کچھ رقم دی جاتی ہے اور دوسری طرف سے اس رقم کے بدلے میں پہلی طرف (فریق) کو ممکنہ طور پر پیش آنے والے خطرات اور حادثات کی تلافی کرنے کا وعدہ کیا جاتا ہے۔ بیمہ کو انگریزی میں ''انشورنس'' (Insurance) کہا جاتا ہے۔ انشورنس انگریزی لفظ Insure سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں ''یقین دہانی کرانا''۔ بیمہ کو انشورنس اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں انشورنس کمپنی بیمہ کرانے والے کو مستقبل کے بعض اندیشوں اور نقصانات کی تلافی کی یقین دہانی کراتی ہے۔ عربی میں انشورنس کے لیے ''عقد التامین'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

معروف مصری ماہر قانون ڈاکٹر عبدالرزاق السنہوری نے انشورنس کی تعریف اس طرح کی ہے:

> ''یہ ایک ایسا عقد ہے جس کی رو سے تحفظ دینے والے کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے کہ وہ اس شخص کو جس نے پالیسی خریدی ہے یا وہ شخص جس کی خاطر پالیسی خریدی گئی ہے کو ایک مخصوص رقم یا طے شدہ منافع یا کوئی دوسرا مالی معاوضہ حادثہ یا معاہدہ میں بیان کردہ نقصان کے پہنچنے کی صورت میں بیمہ دار کو ادا کردہ قسط یا کسی دوسری مالی ادائیگی کی نسبت سے ادا کرے۔''

(الوسیط فی شرح القانون المدنی' ڈاکٹر عبدالرزاق السنہوری' بیروت' داراحیاء التراث العربی الطبعۃ الاولی 1964ء۔ 1084/7)

بلیکس لاء ڈکشنری کے مطابق ''انشورنس ایک ایسا معاملہ ہے جس میں ایک پارٹی مخصوص معاوضے کے بدلے یہ ذمہ داری لیتی ہے کہ وہ مخصوص خطرات کا ازالہ کرے گی۔''

(Black's Law Dictionary, Black (Henry Campbell Black) U.S.A, West Publishing Co.5th Ed.1979, Page. 721)

بیمہ کی مذکورہ بالا تعریفات سے پتہ چلا کہ عقد بیمہ میں ایک شخص یعنی بیمہ دار ایک دوسرے شخص (اور آج کل کمپنی) کے ساتھ یہ معاہدہ کرتا ہے کہ وہ اسے ایک مخصوص رقم متعین اقساط کی صورت میں ادا کرے گا جس کے بدلے کمپنی یہ ذمہ داری لے گی کہ وہ خود اسے یا اس شخص کو جسے یہ نامزد کرے' کو معاہدہ میں تحریر شدہ نقصان پہنچنے کی صورت میں ایک معین رقم ادا کرے گی۔

آج کل انشورنس کے مروجہ طریق کار میں دو فریقین ہوتے ہیں:

1- انشورر (Insurer) انشورنس کرنے والی کمپنی۔ اسے عربی میں ''مؤمِّن'' کہتے ہیں۔

2- انشورڈ (Insured) یعنی وہ شخص جو انشورنس کراتا ہے۔ اسے عربی میں ''مؤمن لہ'' کہتے ہیں۔ اردو میں یہ بیمہ دار کہلاتا ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ انشورنس کمپنی (انشورر) کے بہت سے کلائنٹس (Clients) ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے ایک حوض (Pool) (مشترکہ فنڈ) وجود میں آتا ہے لیکن ایک معاہدہ (ایگریمنٹ) میں صرف دو فریق ہوتے ہیں: انشورر (یعنی انشورنس کمپنی) اور انشورڈ۔ انشورنس کمپنی یہ وعدہ کرتی ہے کہ اگر اسے انشورڈ اتنا پریمیم (Premium) ادا کرے تو وہ اس کے مقابلہ میں اسے اتنی رقم کی پالیسی فراہم کرے گی (یعنی اتنی رقم کی حد تک اس کے نقصانات کا تحفظ فراہم کرے گی) اور انشورڈ اس پالیسی کے بدلے میں پریمیم ادا کرتا ہے' اس طرح ایک خرید وفروخت کا معاملہ (Commutative Contract) وجود میں آتا ہے' جس میں انشورڈ پریمیم کے بدلے پالیسی خریدتا ہے جبکہ انشورنس کمپنی پالیسی فروخت کرتی ہے۔ مثلاً زید بیس لاکھ روپے کی گاڑی خریدتا ہے' وہ چاہتا ہے کہ اس کی یہ گاڑی ہر طرح کے نقصانات سے محفوظ رہے' اگر وہ حادثہ میں تباہ ہوجائے تو اسے اس کے بدلے اس کی قیمت مل جائے تاکہ وہ اس سے نئی گاڑی خرید سکے اور اگر حادثہ میں اس کے کسی حصے کو نقصان پہنچے تو اس کی تلافی بھی ہوجائے' اس غرض کے لیے وہ ایک انشورنس کمپنی سے رابطہ کرتا ہے جو اسے کہتی ہے کہ پچاس ہزار روپے سالانہ ادا کرو تو ہم اس بات کی ضمانت لیتے ہیں کہ تمہاری گاڑی کے ہر طرح کے نقصانات کی تلافی کی جائیگی' زید کمپنی سے معاملہ کر لیتا ہے۔ گویا وہ کمپنی کو سالانہ پچاس ہزار روپے اس شرط پر دیتا ہے کہ اس کی گاڑی تباہ ہوگئی تو کمپنی اسے بیس لاکھ دے گی۔ یہ جنرل انشورنس کی صورت ہے۔

لائف انشورنس میں کمپنی اپنے ڈاکٹر کے ذریعے بیمہ کرانے والے کا معائنہ کرتی ہے۔ ڈاکٹر اسکے فزیکل معائنہ سے اندازہ لگاتا ہے کہ اگر کوئی قدرتی آفت نہ آئی تو یہ شخص اتنے سال مثلاً تیس (30) سال تک زندہ رہ سکتا ہے۔ چنانچہ کمپنی تیس سال کے لیے اسکی زندگی کا بیمہ کرلیتی ہے' اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بیمہ کمپنی بیمہ کرانے والے کے لیے ایک متعینہ رقم مثلاً دس لاکھ روپے مقرر کردیتی ہے جسے بیمہ دار (انشورڈ) تیس سال میں اقساط کی شکل میں ادا کرتا ہے۔ جب انشورڈ اتنے عرصہ تک اقساط کے ذریعہ دس لاکھ روپے ادا کرتا ہے تو بیمہ مکمل ہوجاتا ہے۔ اب اگر تیس سال کی مدت پوری ہونے کے بعد بھی وہ شخص زندہ ہے تو کمپنی اسے دس لاکھ اور کچھ مزید رقم دیتی ہے لیکن اگر وہ مذکورہ میعاد سے قبل انتقال کرجائے (خواہ طبعی موت سے یا حادثہ وغیرہ سے) تو کمپنی اس کے پسماندگان میں سے جسے وہ نامزد کرے یا اگر نامزد نہ کرے اس کے قانونی ورثاء کو پوری رقم مع کچھ زائد رقم ادا کرتی ہے۔

انشورنس کی تاریخ:

انشورنس کی ابتداء کے بارے میں ایک قول یہ ہے کہ اس کا آغاز سترہویں صدی عیسوی میں اٹلی کے تاجران اسلحہ سے ہوا۔ اٹلی کے ان تاجروں نے دیکھا کہ لوگوں کا مال تجارت بعض اوقات سمندر میں غرق ہو جاتا ہے جس کے باعث وہ انتہائی افلاس کا شکار ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ غور وفکر کے بعد اس مشکل کا یہ حل نکالا کہ انہوں نے ان تمام تاجروں پر یہ بات لازم کی کہ اگر کسی کا مال تباہ ہوجائے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے

طور پر ہر ماہ یا ہر سال ایک متعین رقم ادا کریں۔ یہ طریق کار ترقی کر کے جہازوں کے بیمہ کی شکل اختیار کر گیا۔

دوسرا قول یہ ہے کہ انشورنس کا آغاز اندلس کی مسلم حکومت کے عہد میں بحری تجارت میں حصہ لینے والے مسلمانوں سے ہوا۔ اس کا آغاز بھی بہت سادہ تھا۔ اس کا مقصد صرف یہی تھا کہ جن تاجروں کا سامان سمندر میں تباہ ہو جاتا ہے' ان کے ساتھ تعاون کیا جائے' چنانچہ تعاون کی بنیاد پر تمام تاجروں سے معینہ رقوم لی جاتیں اور متاثرہ تاجر کی اعانت کی جاتی۔ یہ دونوں صورتیں جنرل انشورنس کی ہیں۔

بیمۂ زندگی (لائف انشورنس) کا آغاز برطانیہ سے ہوا۔ ابتداء میں تعاون کا دائرہ کار صرف تجہیز و تکفین کے اخراجات تک محدود تھا لیکن بعد میں یہ طریقہ کار مسلسل ترقی کرتا چلا گیا۔

بیمہ جدید شکل میں:

بیمہ کی مذکورہ تمام اشکال فی الحقیقت تعاونی بیمہ (کوآپریٹو انشورنس) کی ابتدائی اشکال تھیں۔ ان میں سے پہلی دو اشکال جنرل انشورنس کی جبکہ تیسری شکل لائف انشورنس کی ہے۔ چونکہ یہ طریق کار باہمی تعاون کی اساس پر عطیات (Donations) کے ذریعہ ہوتا تھا۔ لہٰذا اصولاً یہ شریعت کے منافی نہ تھا۔ مگر وقت کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ جوں جوں اس کی ضرورت بڑھتی گئی توں توں یہ معاملہ کاروبار کا روپ دھارتا گیا۔ چنانچہ سرمایہ دارانہ ذہنیت نے لوگوں کی مجبوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے باقاعدہ کاروبار بنا لیا۔ نتیجتاً اس میں کئی خرابیاں در آئیں۔ سرمایہ دار نے سمندر کے ذریعے مال تجارت منگوانے والے تاجروں کے نقصانات کا تخمینہ لگایا اور اس نقصان کو اس نے تمام تاجروں کے اموالِ تجارت پر تقسیم کیا' پھر اس میں اپنا نفع شامل کر کے اس نے حساب لگایا کہ ایک تاجر سے کتنے فیصد رقم وصول کی جائے کہ وہ خود بھی نفع میں رہے اور تاجروں سے حاصل شدہ رقم سے ان کے ممکنہ نقصانات کی تلافی بھی ہوتی رہے۔ یہ حساب لگا کر اس نے تاجروں سے کہا کہ اگر تم سمندر کے ذریعے منگوائے جانے والے ہر سامان کی مالیت پر اتنے فیصد پریمیم ادا کرو تو میں تمہارے تباہ ہونے والے سامان کے نقصان کی تلافی کرنے کے لیے تیار ہوں۔ یہ شکل عقدِ معاوضہ (Commutative Contract) کی ہے۔ یہ بیمہ کی ترقی یافتہ شکل ہے' اسے سرمایہ دارانہ نظامِ بیمہ بھی کہتے ہیں۔ اس وقت انشورنس کی جتنی صورتیں رائج ہیں ان کے پیچھے یہی کاروباری ذہنیت کارفرما ہے۔

انشورنس کے ممنوع ہونے کے اسباب:

انشورنس کا آغاز تو باہمی تعاون پر ہوا تھا لیکن رفتہ رفتہ اس میں تبدیلی آتی گئی حتیٰ کہ یہ ایک عقدِ معاوضہ بن گیا' جس کے باعث اس میں کئی شرعی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔ مشہور مؤرخ ابوزہرہ لکھتے ہیں کہ "اگرچہ انشورنس کی اصلیت تو تعاون محض تھی لیکن اس کا انجام بھی اس ادارہ کا سا ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا کہ یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد "تعاون علی البر والتقویٰ" پر تھی' اسے ایک ایسے یہودی نظام میں تبدیل کر دیا جس میں قمار اور ربا دونوں پائے جاتے ہیں۔"

(لواءِ اسلام بحوالہ ماہنامہ "برہان" دہلی تا مارچ 1960ء)

تحقیق و جستجو کے نتیجے میں ابھی تک یہ بات سامنے آئی ہے کہ سب سے پہلے جس فقیہ نے انشورنس کے ناجائز ہونے کا فتویٰ دیا' وہ ملک شام کے معروف عالم دین جناب علامہ ابن عابدین شامی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے زمانے میں یہ رواج ہوگیا تھا کہ بعض لوگ تاجروں کا سامان سمندر کے راستے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے تو اس سامان کا کرایہ لینے کے علاوہ کچھ مزید متعین رقم بھی لیتے اور اس سے زائد متعین رقم کے بدلے وہ انہیں ضمانت دیتے کہ اگر کسی تاجر کا مال ہلاک ہوگیا تو رقم لینے والا اس نقصان کی تلافی کرے گا' اس زائد رقم کو اس وقت "سوکرۃ" کہا جاتا تھا۔ علامہ ابن عابدین نے اپنی کتاب "ردالمحتار (المعروف بفتاویٰ شامی) کے اندر اس صورت کو ذکر کرکے اسے ناجائز قرار دیا۔

(تکافل' انشورنس کا اسلامی طریقہ: ڈاکٹر مولانا اعجاز احمد صمدانی' صفحہ 28,27 مطبوعہ ادارۂ اسلامیات کراچی' لاہور)

علماء کرام کی آراء کی روشنی میں مروجہ انشورنس کا معاملہ درج ذیل تین خرابیوں کی وجہ سے شرعاً ناجائز ہے۔

1- ربا (Interest)
2- قمار (Gambling)
3- غرر (Uncertainty)

مولانا مفتی تقی عثمانی کے الفاظ میں "بلا شبہ عصر حاضر کے اکثر علماء کرام اور فقہی اکیڈمیوں اور مجالس کا کنونشنل انشورنس کے حرام ہونے پر اتفاق ہے' کیونکہ یہ غرر' قمار اور ربا پر مشتمل ہے۔"

(تاصیل التأمین التکافلی علی أساس الوقف. صفحه 1)

بعض معاصر علماء نے ایک اور خرابی "بیع الکالی بالکالی" کا بھی ذکر کیا ہے۔ بیع الکالی بالکالی اس بیع (Sale) کو بھی کہا جاتا ہے جس میں دونوں عوض (Considerations) یعنی مبیع اور ثمن (Subject matter and price) ادھار ہوں۔

مروجہ انشورنس کے اندر یہ خرابیاں کس طرح موجود ہیں؟ اس کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

ربا (Interest):

ربا کی حقیقت یہ ہے کہ ایک فریق دوسرے کو کم رقم اس شرط پر دے کہ دوسرا فریق اس کے بدلے اسے بڑھا کر دے گا۔ انشورنس کے اندر کم پریمیم کے بدلے زیادہ رقم کی پالیسی خریدی جاتی ہے۔ یہ ایسا ہے جیسے کم رقم اس شرط پر دینا کہ اس کے بدلے زیادہ رقم ملے۔ یہی سود ہے اور بعض مرتبہ انشورنس کمپنی زیادہ رقم لے کر پالیسی ہولڈر کو کم رقم دیتی ہے' یہ بھی سود ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوسکتا ہے وہ یہ کہ یہ ضروری نہیں کہ انشورنس کے اندر جتنی رقم جمع کرائی جائے اس سے کم یا زیادہ ملے بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ اسے اتنی ہی رقم ملے جتنا اس نے انشورنس کرایا ہوا ہو' یعنی پریمیم اور کلیم دونوں برابر ہوں۔ تو کیا ایسی صورت کے بارے میں بھی کہا جائے

گا کہ اس میں ربا ہے؟.........اس کا جواب یہ ہے کہ شرعاً کسی معاملے میں "ربا" ہونے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ بلا آخر کم رقم دینے والے کو زیادہ رقم مل جائے بلکہ اگر کوئی معاملہ ایسا ہے کہ اس میں دوسرے فریق کی طرف سے کسی صورت میں بھی زیادہ رقم دینا مشروط ہے تو وہ بھی "ربا" میں داخل ہے۔ یا یہ کہ اگر کسی معاملے کی عملی طور پر کئی صورتیں ہوں اور ان میں کئی صورتیں ایسی بھی ہو سکتی ہوں جس میں ربا کی خرابی لازم آتی ہی ہو تو بھی یہی کہا جائے گا کہ یہ ربا والا معاملہ ہے۔ لہٰذا یہ پورا معاملہ ناجائز ہے۔

انشورنس کے اندر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ یا تو پالیسی ہولڈر کو پریمیم سے زیادہ رقم کا کلیم ملتا ہے (کیونکہ اس کا نقصان ادا شدہ پریمیم سے زیادہ ہوتا ہے) اس صورت میں وہ ربا لینے والا جبکہ کمپنی ربا دینے والی ہوتی ہے اور بہت سی صورتوں میں ایسا بھی ہوتا ہے کہ وہ اپنے ادا شدہ پریمیم سے کم رقم وصول کرتا ہے' اس صورت میں کمپنی ربا لے رہی ہوتی ہے اور وہ ربا دے رہا ہوتا ہے۔

چونکہ مروجہ انشورنس کمپنیوں کے قوانین و ضوابط میں یہ بات درج ہوتی ہے کہ جنرل انشورنس میں اگر پالیسی ہولڈر کا نقصان پریمیم کی رقم سے زیادہ ہو تو بھی کمپنی وہ نقصان پورا کرے گی' یعنی زائد رقم دے گی اور لائف انشورنس کی صورت میں جب پالیسی ہولڈر اپنی اتنی رقم ادا کرے گا تو انشورنس کمپنی' اسے اس کے پریمیم سے زائد رقم دینے کی پابند ہے۔ ظاہر ہے کی یہ صورتیں اسی معاملے کا حصہ ہوتی ہیں جو معاملہ پالیسی ہولڈر اور کمپنی کے درمیان ہو رہا ہوتا ہے' اس لیے یہ پورا معاملہ ہی ربا کی خرابی آ جانے کی وجہ سے شرعاً ناجائز [illegible] ر پائے گا۔ اس میں صرف سُود ہی نہیں بلکہ سُود در سُود ہے کیونکہ مروجہ انشورنس کا پالیسی ہولڈر در حقیقت دو طرح [illegible] دی معاملات سے وابستہ ہو جاتا ہے۔

1- بلاواسطہ (Direct) اور بالواسطہ (Indirect)

بلاواسطہ (Direct) اس طرح کہ وہ انشورنس کمپنی سے جو معاہدہ کرتا ہے اس میں سُود کا عنصر شامل ہوتا ہے اور بالواسطہ (Indirect) اس طرح کہ عموماً انشورنس کمپنیاں پالیسی ہولڈرز سے حاصل ہونے والے پریمیم کے ایک بہت بڑے حصہ سے سودی کاروبار کرتی ہیں۔ اور حاصل ہونے والے سود میں سے کچھ خود رکھ کر بقیہ پالیسی ہولڈرز کے درمیان تقسیم کرتی ہیں۔ اس طرح مروجہ انشورنس سے پالیسی لینے والا شخص دہرے سُود کے گناہ میں شریک ہو جاتا ہے۔ سود سخت گناہ ہے' قرآن مجید میں ہے:

> "اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو اور جو کچھ سُود کا بقایا ہے' اس کو چھوڑ دو' اگر تم ایمان والے ہو۔ اگر تم (اس پر عمل) نہ کرو گے تو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اعلانِ جنگ سُن لو"
>
> (البقرۃ:278 ,279)

قمار (Gambling):

انشورنس کے اندر موجود دوسری خرابی "قمار" ہے یعنی جُوا۔ قمار یہ ہے کہ دو یا دو سے زائد افراد آپس میں اس طرح کا کوئی معاملہ طے کریں جس کے نتیجے میں ہر فریق کسی غیر یقینی واقعے کی بنیاد پر اپنا کوئی مال (فوری

ادائیگی کر کے یا ادائیگی کا وعدہ کر کے) اس طرح داؤ پر لگائے کہ وہ مال یا تو بلا معاوضہ دوسرے فریق کے پاس چلا جائے یا دوسرے فریق کا مال پہلے فریق کے پاس بلا معاوضہ آ جائے۔ قمار کی بنیادی طور پر دو صورتیں ہیں (1) پہلی صورت یہ ہے کہ غیر یقینی واقعہ پیش آنے سے پہلے کوئی فریق دوسرے کو ادائیگی کا پابند نہ ہو بلکہ غیر یقینی واقعہ کے نتیجہ میں ایک فریق پر دوسرے کی ادائیگی لازم ہو جیسے شرط لگانا مثلاً زید خالد سے یہ شرط لگائے کہ اگر پاکستان میچ جیت گیا تو میں تمہیں سو روپے دوں گا اور اگر ہار گیا تو تم مجھے سو روپے دو گے۔ اسی طرح بعض مرتبہ لڑکے کوئی کھیل کھیلنے سے پہلے یہ شرط لگاتے ہیں کہ جو ہار گیا' وہ جیتنے والے کو اتنی متعین رقم ادا کرے گا۔ (2) دوسری صورت یہ ہے کہ ایک فریق پہلے سے ادائیگی کر دیتا ہے' پھر اگر وہ غیر یقینی واقعہ پیش آ جائے تو وہ اپنی رقم سمیت کئی گناہ زیادہ لے لیتا ہے' ورنہ اپنی دی ہوئی رقم سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔ مثلاً لاٹری (Lottery)۔ اس میں مقابلہ میں حصہ لینے والا پہلے متعین رقم ادا کر کے ٹکٹ خریدتا ہے اگر اسکے نام قرعہ نکل آئے تو وہ دی ہوئی رقم سے کئی گنا بڑھ کر رقم حاصل کرتا ہے اور نہ نکلے تو اپنی رقم سے بھی محروم رہتا ہے۔

انشورنس کے اندر پایا جانے والا ''قمار'' دوسری قسم کا ہے کہ اس میں پالیسی ہولڈر کی طرف سے ادائیگی تو یقینی ہوتی ہے لیکن جنرل انشورنس کے اندر اس کے بدلے میں رقم کا ملنا یقینی نہیں ہوتا' بلکہ ایک غیر یقینی واقعہ مثلاً گاڑی کے حادثہ وغیرہ سے متعلق ہوتا ہے' اگر وہ پیش آئے تو وہ نقصان کے بقدر تلافی کی جاتی ہے' ورنہ اصل پریمیم بلا معاوضہ چلا جاتا ہے۔ گویا جنرل انشورنس کے اندر اس بات کا امکان ہوتا ہے کہ پالیسی ہولڈر کو پریمیم کے بدلے کچھ بھی نہ ملے اور لائف انشورنس کی وہ صورت جس میں اصل پریمیم بہر حال واپس ملنا یقینی ہو' اس میں قمار نہیں ہوتا لیکن وہ صورتیں جس میں پریمیم کے کچھ حصے ڈوبنے کا خطرہ ہو اس میں جزوی (Partial) قمار ہوتا ہے۔ جیسے بعض مرتبہ تجارتی کمپنیاں اپنی مصنوعات کی شہرت کے لیے انعامی اسکیمیں جاری کرتی ہیں تو اگر اس اسکیم کے باعث قیمت بڑھ جائے تو اس میں قیمت میں اضافہ کی حد تک قمار ہے۔ مثلاً ٹپال چائے کا ایک ڈبہ پہلے چالیس روپے میں ملتا تھا' اب اسکیم آنے سے ساٹھ روپے کا ہو گیا تو یوں کہا جائے گا کہ اس میں بیس روپے کی حد تک قمار ہے۔ بلاشبہ' مروجہ انشورنس کی ایک صورت ایسی ہو سکتی ہے کہ اس میں انجام کار کے طور پر قمار کی حقیقت مکمل طور پر موجود نہ ہو' لیکن اس کے اندر وہ صورتیں بھی موجود ہوں' جو قمار میں داخل ہیں' جیسے ایک پالیسی ہولڈر نے پچاس ہزار روپے جمع کرائے ا[illegible] سے اس کے بدلے کچھ بھی نہ ملا یا پچاس ہزار کے بدلے دس [illegible] روپے مل گئے تو اس عقد کے اندر چونکہ ایسی صورتیں موجود ہیں جو قمار میں داخل ہیں اور یہی صورتیں بکثرت پائی جاتی ہیں' اس لیے اسے قمار کی وجہ سے ناجائز کہا جائے گا۔

سود کی طرح قمار کی حرمت بھی قرآن و حدیث میں صراحتاً موجود ہے۔ قرآن حکیم میں ہے: ''اے ایمان والو! شراب' قمار' بت اور پانسے یہ سب گندے شیطانی کام ہیں۔ ان سے بالکل الگ رہو تا کہ تم نجات پاؤ'' (المائدہ: 90)۔ ایک حدیث میں ہے: ''اگر کسی نے اپنے ساتھی سے کہا'' آؤ قمار کھیلیں'' تو اسے (محض یہ بات کہنے پر) صدقہ کرنا چاہیے۔''

غرر (Uncertainty):

مروجہ انشورنس میں موجود تیسری خرابی "غرر" کی ہے۔ "غرر" بھی سود اور قمار کی طرح ناجائز ہے اور احادیث میں اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ (مسلم' کتاب البیوع' حدیث نمبر 3691)

لغوی لحاظ سے غرر "غیر یقینی کیفیت" کا نام ہے جبکہ شرعی اصطلاح میں غرر وہ معاملہ ہے جس میں کم از کم کسی ایک فریق کا ایسا معاوضہ غیر یقینی کیفیت کا شکار ہو' جس کا تعلق معاملے کے اصل اجزاء سے ہے۔ اس کی مختلف صورتیں ہیں' مثلاً اصل اجزاء کی مقدار نا معلوم ہو جیسے کوئی شخص غیر متعین شے فروخت کرے یا جو شے بیچی جا رہی ہے اس کا سپرد کرنا غیر یقینی ہو مثلاً بیچنے والا شخص اس کا مالک نہ ہو یا وہ چیز اس کے قبضہ میں نہ ہو وغیرہ۔ ان کے علاوہ "غرر" کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں۔ "قمار" بھی غرر کی ایک قسم ہے یعنی غرر کا لفظ بہت عام ہے جس میں قمار کے علاوہ اور بھی بہت سی صورتیں ہیں جبکہ "قمار" خاص ہے اور وہ غرر کی ایک صورت ہے۔ فقہاء کرام نے غرر کی دو قسمیں بیان کی ہیں۔ (1) غرر کثیر اور (2) غرر یسیر۔

اگر غرر معمولی درجے کا ہو اور باہمی جھگڑے کا باعث نہ بنے تو یہ غرر یسیر ہے اور شرعاً اس کی اجازت ہے۔ حالانکہ یہ امکان ہوتا ہے کہ تنخواہ ملنے میں دو چار روز کی بیشی ہو جائے۔

اگر غرر ایسا ہے جو کسی چیز کے وجود کے اندر پایا جائے اور باہمی جھگڑے کا ذریعہ بنے' وہ غرر کثیر ہے جو کہ ناجائز ہے' جیسے یہ معلوم نہ ہو کہ کون سی چیز بیچی جا رہی ہے یا وہ چیز ابھی وجود میں نہ آئی ہو اس کی بیع کرنا وغیرہ یہ غرر شرعاً ناجائز اور ممنوع ہے۔

علماء کرام کی اکثریت نے یہ ثابت کیا ہے کہ انشورنس کے اندر غرر کثیر کی خرابی موجود ہے۔ چنانچہ معروف مذہبی سکالر ڈاکٹر وہبۃ الزحیلی کا کہنا ہے کہ "انشورنس کی تعریف سے یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ انشورنس ان معاملات میں شامل ہے جن کے اندر غرر پایا جاتا ہے کیونکہ اس میں عقد کے دوران یہ معلوم نہیں ہوتا کہ ایک فریق دوسرے کو کیا دے گا اور دوسرا فریق کیا لے گا' کیونکہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ پالیسی ہولڈر صرف ایک قسط ادا کرتا ہے اور وہ حادثہ پیش آ جاتا ہے (جس کے لیے انشورنس کیا گیا) اور کبھی ایسا ہے کہ وہ ساری اقساط ادا کر دیتا ہے لیکن اس کے باوجود بھی وہ حادثہ پیش نہیں آتا۔"

(التامین واعادۃ التامین' بحث لمجمع الفقہ الاسلامی العالمی' العدد الثانی' الجزء الثانی' 1407ھ صفحہ 547)

سوڈانی دینی سکالر ڈاکٹر صدیق محمد الامین لکھتے ہیں کہ "ہم اپنی اس بحث کے اندر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ انشورنس کے اندر غرر پایا جاتا ہے اور یہ غرر اتنا زیادہ ہے کہ جس کی وجہ سے اس عقد کو اسی کے ساتھ موصوف کر کے یوں کہا جا سکتا ہے کہ انشورنس غرر والا عقد ہے۔" (الغرر واثرہ فی العقود' صفحہ 656)

ڈاکٹر عبداللطیف الفرفور لکھتے ہیں کہ "غرر انشورنس کا ایک لازمی حصہ اور اس کی ان خصوصیات میں شامل ہے جن کی وجہ سے یہ عقد دوسرے مالی معاملات سے ممتاز ہو جاتا ہے' اس بات کی دلیل کہ غرر انشورنس کے

موجود ہے اور اس کی لازمی صفت بن چکا ہے' یہ ہے کہ قوانین کی اکثر کتابوں میں اسے عقود غرر کے تحت ذکر کیا جاتا ہے۔

(عقود التامین وإعادة التأمین في الفقه الاسلامي' بحث لمجمع الفقه الاسلامي' العدد الثاني' الجزء الثاني' صفحه 599)

علماء عرب کے علاوہ پاک و ہند کے علماء نے بھی انشورنس کے اندر سود' قمار اور غرر کی خرابیوں کی وجہ سے اسے ناجائز کہا ہے' ڈاکٹر مفتی نظام الدین شامزئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

''آج تک جن جن مشائخ عظام اور معاصر علماء کرام نے انشورنس کی حرمت کو بیان فرمایا تقریباً سبھی نے انشورنس کی وجہ ربا' قمار اور غرر تینوں کو قرار دیا ہے' جن جن مشائخ عظام کو ہم مرجع و ماویٰ قرار دیتے ہیں ان کی تحقیق کو صحت مانتے ہیں' وہ انہی تین عناصر کی بناء پر انشورنس کو ناجائز کہتے ہیں۔ اور یہ بے غبار حقیقت ہے کہ انشورنس کی ابتداء عقد غرر اور قمار و مخاطر پر جبکہ نتیجہ و انتہاء ربا اور سود پر ہے۔''

(شرکت التکافل اور درپیش مسائل کا شرعی جائزہ' شامزئی ''ڈاکٹر مفتی محمد نظام الدین شامزئی'' مقالہ غیر مطبوعہ صفحہ 14)

دینی سکالر ڈاکٹر حسین حامد حسان کا کہنا ہے کہ انشورنس میں چار اعتبار سے غرر موجود ہے۔

1- وجود یعنی ذات کے اعتبار سے 2- حصول یعنی معاوضہ حاصل ہونے کے اعتبار سے

3- معاوضہ کی مقدار کے اعتبار سے 4- مدت کے اعتبار سے

چنانچہ وہ وجود کے اعتبار سے پائے جانے والے غرر کو ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اور (وجود کے اعتبار سے پایا جانے والا غرر) انشورنس کی اندر پوری طرح منطبق ہوتا ہے کیونکہ انشورنس کے نتیجے میں ملنے والی رقم انشورنس کمپنی کے ذمہ ایسا قرض ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ اس لیے کہ یہ ایک ایسا قرض ہے جو حادثے کے پائے جانے پر موقوف ہے۔ اگر حادثہ پایا گیا تو یہ قرض پایا جائے گا اور حادثہ واقع نہ ہوا تو یہ قرض بھی وجود میں نہیں آئے گا' اور ہم نے دیکھا ہے کہ قانون کے شارحین بھی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں اور ان کا بھی یہ خیال ہے کہ یہ انشورنس کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اس کے بغیر انشورنس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔''

(حکم الشریعة الاسلامیه في التامین' صفحه 67)

اور حصول یعنی معاوضہ حاصل ہونے کے اعتبار سے پائے جانے والے غرر کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ ''معاوضہ کے حصول اور عدم حصول کے اندر غرر میں جو معاملات داخل ہیں ان میں شکاری کا ایک مرتبہ جال پھینکنے کا معاملہ اور اس کے ایک تیر پھینکنے کا معاملہ شامل ہے اور اس کے ناجائز ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس میں حصول کے اعتبار سے غرر پایا جاتا ہے کہ کبھی خریدار کو کچھ حاصل ہوتا ہے اور کبھی کچھ حاصل نہیں ہوتا اور حاصل ہونے کی صورت میں بھی عقد کے وقت یہ معلوم نہیں ہوتا کہ کتنی مقدار حاصل ہوگی' انشورنس کے عقد کی اس

کے ساتھ زیادہ مشابہت ہے کہ (اس میں بھی بعینہ یہی صورت حال پائی جاتی ہے کہ) جب کوئی شخص کسی انشورنس کمپنی کے ساتھ معاملہ کرتا ہے تو اسے عقد کے وقت معلوم نہیں ہوتا کہ اسے انشورنس کی پالیسی کی رقم ملے گی یا نہیں اور ملنے کی صورت میں جنرل انشورنس میں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ مقدار کتنی ہوگی؟

اوپر اقتباس میں جال پھینکنے اور تیر پھینکنے کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے کہتا ہے کہ تم ایک مرتبہ جال پانی میں پھینکو اس میں جتنی مچھلیاں آئیں گی وہ میں نے مثلاً دس روپے میں خرید لیں یا یہ کہتا ہے کہ تم تیر چلاؤ ایک مرتبہ تیر چلانے میں جتنے پرندے شکار ہوں گے وہ میں نے مثلاً سو روپے میں خرید لیے تو اس صورت میں غرر پایا جاتا ہے کیونکہ یہ معلوم نہیں کہ ایک مرتبہ جال پھینکنے یا ایک مرتبہ تیر مارنے سے کوئی شکار ہاتھ آئے گا یا نہیں؟

معاوضہ کی مقدار میں غرر کے اعتبار سے بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر حسین حامد لکھتے ہیں:

معاوضہ کی مقدار یا نوع کی جہالت کے اعتبار سے پایا جانے والا غرر ایسا ہے کہ اس کے بارے میں فقہائے کرام کا یہ اتفاق ہے کہ یہ عقود معاوضہ پر اثر انداز ہو کر انہیں ناجائز بنا دیتا ہے کیونکہ بلاشبہ یہ غرر فاحش ہے اور یہ انشورنس کمپنی کے پہلو سے بہت واضح ہے کیونکہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ صرف ایک قسط وصول کرتی ہے اور حادثہ پیش آ جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اسے پالیسی میں طے شدہ تمام رقم یا نقصان کی بقدر رقم دینی پڑتی ہے اور کبھی حادثہ واقع ہونے سے پہلے وہ بہت ساری قسطیں وصول کر چکی ہوتی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں بڑا فرق ہے۔ پالیسی ہولڈر کے اعتبار سے بھی یہ غرر موجود ہے کیونکہ وہ کمپنی سے کیے گئے معاملے کی بنیاد پر متعینہ رقم کو قسطوں کی شکل میں ادا کر دیتا ہے لیکن کمپنی کبھی اسے پوری رقم ادا کر دیتی ہے کبھی آدھی اور کبھی دسواں حصہ یعنی جتنا نقصان ہوتا ہے اتنی رقم دی جاتی ہے (جو ادا کی گئی رقم کے ساتھ تناسب میں مختلف ہوتی رہتی ہے)۔

(حکم الشریعۃ الاسلامیۃ فی التامین' صفحہ 72)

اور مدت کے اعتبار سے پائے جانے والے غرر کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ انشورنس کی بعض صورتوں میں معاوضہ کی ادائیگی کی مدت کے اعتبار سے غرر پایا جاتا ہے۔ شارحین قانون نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ انشورنس پالیسی کی مقدار جو کمپنی کے ذمہ ہوتی ہے بسا اوقات کسی غیر متعینہ مدت کی طرف منسوب ہوتی ہے جیسے لائف انشورنس کی بعض صورتوں میں ہوتی ہے کہ اس میں انشورنس کمپنی یہ وعدہ کرتی ہے کہ انشورڈ کی وفات پر اتنی رقم ادا کرے گی۔ حالانکہ یہ ایک مجہول مدت ہے جس کی وجہ سے معاوضہ والا عقد بالاتفاق باطل ہو جاتا ہے لہٰذا اب بھی یہی حکم ہے۔"

(حکم الشریعۃ الاسلامیہ فی التامین' صفحہ 72)

اسلامی فقہ اکیڈمی کی قرارداد:

موتمر العالم الاسلامی (O.I.C) کی ذیلی تنظیم اسلامی فقہ اکیڈمی (جدہ) کے اجلاس (منعقدہ

1986ء) میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کے بعد علماء کرام نے طے کیا کہ انشورنس کا معاملہ غرر پر مشتمل ہے اور ناجائز ہے قرارداد یہ تھی:

"تجارتی انشورنس جس میں متعین پریمیم پر عقد کیا جاتا ہے اور جس پر انشورنس کمپنیاں عمل کرتی ہیں ایسے غرر فاحش پر مشتمل ہے جو اس عقد کے فاسد ہونے کا سبب ہے اس لیے شرعاً یہ عقد حرام ہے۔" (مرجع سابق صفحہ 731 قرارداد نمبر 2/9/9)

بیع الکالی بالکالی:

بعض معاصر علماء کے نزدیک انشورنس میں ایک اور خرابی بھی پائی جاتی ہے اور وہ ہے "بیع الکالی بالکالی" یہ وہ بیع ہے جس میں دونوں عوض (Considerations) ادھار ہوں۔ جیسے کوئی شخص کسی سے پچاس روپے کے بدلے قلم خریدے لیکن نہ خریدار قلم پر قبضہ کرے اور نہ بیچنے والا قیمت پر قبضہ کرے بلکہ دونوں پر قبضہ آئندہ تاریخ میں ہونا طے ہو۔ یہ عقد شرعاً ناجائز ہے اور حدیث کے اندر اس کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔ (مجمع الفقہ الاسلامی عدد 3 صفحہ 71) انشورنس کے اندر بیع الکالی بالکالی کی خرابی اس طرح پائی جاتی ہے کہ پالیسی ہولڈر پریمیم کی رقم مستقبل میں ادا کرتا ہے اور اس کے بدلے اسے پالیسی بھی مستقبل میں ملتی ہے گویا دونوں عوض (Considerations) پر قبضہ آئندہ تاریخ میں ہوتا ہے۔

ری انشورنس (Re-insurance):

عصر حاضر میں انشورنس کمپنیوں کے لیے یہ بات تقریباً ممکن نہیں کہ وہ کامیابی کے ساتھ کام کر سکیں جب تک کہ وہ کسی دوسری بڑی کمپنی سے ری انشورنس کا معاہدہ نہ کریں۔ ری انشورنس کمپنیوں کا طریق کار وہی ہوتا ہے جو انشورنس کمپنیوں کا ہے صرف اتنا فرق ہے کہ ری انشورنس کمپنیوں کے پالیسی ہولڈرز افراد کے بجائے مختلف انشورنس کمپنیاں ہوتی ہیں یعنی جو انشورنس کمپنیاں مختلف افراد کے ساتھ انشورنس کا معاملہ کرتی ہیں وہ اپنے خطرے (Risk) کو کم کرنے کے لیے بعض دوسری کمپنیوں سے اپنا انشورنس کراتی ہیں۔ اس میں انکی حیثیت انشورڈ (Insured) کی ہوتی ہے اور جس کمپنی سے وہ اپنا انشورنس کراتی ہیں وہ "ری انشورنس کمپنی" کہلاتی ہے۔ چونکہ ری انشورنس کمپنیاں انشورنس کمپنیوں کی طرح کام کرتی ہیں اس لیے ان کے اندر بھی وہ خرابیاں موجود ہوتی ہیں جو انشورنس کمپنی کے اندر پائی جاتی ہیں۔ لہٰذا ان کا کاروبار بھی شرعاً ناجائز ہے۔

(انشورنس کا متبادل اسلامی طریقہ از ڈاکٹر محمد ... صفحہ 64 ادارہ اسلامیات لاہور کراچی)

کیا بیمہ کمپنیاں امداد باہمی کے ادارے ہیں؟

بیمہ کرنے والے اور بیمہ کمپنی کے درمیان جب تعلق کی نوعیت شرکت کی نہیں ہے تو پھر اس کی نوعیت کیا ہے؟ کیا ان کے درمیان باہمی تعاون کا تعلق ہے اور کیا یہ ادارے امداد باہمی کے ادارے ہیں جنہیں عطیہ دہندگان کے اشتراک سے چلایا جاتا ہو اور مالی اشتراک ایک دوسرے کی مدد کی غرض سے وہ کرتے ہیں؟ لیکن

اس مقصد کے پیش نظر کہ تعاون کی صحیح صورت اختیار کی جائے اور مصیبت زدگان کی مدد کی جائے' جو مال جمع کیا جائے اس کے سلسلہ میں درج ذیل امور کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

1- فرد مقررہ چندہ بھائی چارگی کی خاطر عطیہ کے طور پر ادا کرے اور اس فنڈ میں سے حسب ضرورت حاجت مندوں کی مدد کی جائے۔

2- فنڈ سے استفادہ کے صرف جائز ذرائع اختیار کیے جائیں۔

3- کسی شخص کا اس بنا پر عطیہ دینا جائز نہیں کہ حادثہ کی صورت میں اسے ایک معین رقم معاوضہ میں ملے گی بلکہ ادارہ کے فنڈ میں سے حسب گنجائش اتنا دیا جائے کہ نقصان کی مکمل یا کسی حد تک تلافی ہو سکے۔

4- عطیہ بخشش ہے اور اس کو واپس لینا حرام ہے۔لہٰذا جب کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اس معاملہ میں شرعی احکام کو ملحوظ رکھا جائے۔

(الاسلام و المناهج الاشتراکیه' از محمد غزالی صفحہ 131۔ بحوالہ "اسلام میں حلال و حرام" ڈاکٹر یوسف القرضاوی' صفحہ 327, 328 اسلامک پبلی کیشنز لاہور)

ان شرائط کا انطباق صرف چند انجمنوں اور اداروں پر ہوتا ہے جو اس غرض سے قائم ہوئے ہیں جن کو افراد عطیہ کے طور پر اپنا ماہانہ اشتراک پیش کرتے ہیں جن کو واپس لینے کا اختیار نہیں ہوتا اور نہ یہ شرط ہوتی ہے کہ حادثہ کی صورت میں انہیں معین رقم مل جانی چاہیے............رہ گئیں بیمہ کمپنیاں اور خاص طور سے بیمۂ زندگی تو ان پر ان شرائط کا کسی طرح انطباق نہیں ہوتا:

1- بیمہ کرانے والے عطیہ کی نیت سے (اقساط) ادا نہیں کرتے بلکہ اس کا خیال بھی ان کے دل میں نہیں آتا۔

2- بیمہ کمپنیاں اپنا سرمایہ حرام سُودی کاموں میں لگا کر نفع کماتی ہیں اور ایک مسلمان کے لیے سُودی کام میں اشتراک جائز نہیں ہے۔اس بات پر رخصت پسند اور تشدد پسند سب ہی متفق ہیں۔

3- بیمہ کرانے الا معاہدہ کی مدت ختم ہو جانے پر تمام اقساط کی رقم واپس لیتا ہے اور اسے مزید رقم بھی ملتی ہے جو سُود نہیں تو اور کیا ہے؟

4- جو شخص بیمہ کا معاہدہ ختم کرنا چاہے اسے ادا شدہ رقم کے بڑے حصہ کا نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے۔ اس نقصان کے لیے شرعاً کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔

(اسلام میں حلال و حرام' یوسف قرضاوی' صفحہ 328, 329 مترجم شمس پیرزادہ' اسلامک پبلی کیشنز لاہور)

اسلام میں انشورنس کا متبادل: تکافل:

اسلام میں انشورنس کا متبادل طے کرنے کے لیے تا حال کی گئی علماء کرام کی کاوشوں کے نتیجے میں دو طرح کے متبادل وجود میں آ چکے ہیں۔

پہلا متبادل: وقف کی بنیاد پر

دوسرا متبادل: تبرع کی بنیاد پر

پہلے متبادل وقف کی بنیاد پر کی وضاحت:

وقف فقہ اسلامی ایک اصطلاح ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں "روکنا"۔ شرعی اصطلاح میں کسی شے کو اپنی ملکیت سے نکال کر اس کے منافع کو شرعی مصارف پر خرچ کرنے کے لیے دیئے جانے کا نام وقف ہے' جیسے مساجد' قبرستان اور رفاہی ادارے کے لیے کوئی جگہ وقف کرنا۔

شرعی نقطہ نظر سے وقف کے صحیح ہونے کے لیے دیگر شرائط کے علاوہ ایک بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ وقف دائمی یعنی ہمیشہ کے لیے ہو اور ایسی جہت اور مصرف کے لیے ہو جو شرعاً معتبر ہے' کسی ناجائز یا حرام کام کے لیے کوئی چیز وقف کرنا جائز نہیں۔

(تکافل انشورنس کا اسلامی طریقہ' ڈاکٹر مولانا اعجاز احمد صمدانی' صفحہ 95' ادارہ اسلامیات لاہور۔ کراچی)

وقف شخص قانونی (Juristic Person) ہے' یعنی یہ اپنا مستقل وجود رکھتا ہے اور بعض ایسے اوصاف جو شخصِ حقیقی میں پائے جاتے ہیں' وہ اس میں بھی پائے جاتے ہیں۔ مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں کہ "وقف کے لیے اگرچہ شخص قانونی کی اصطلاح استعمال نہیں ہوئی مگر حقیقت میں یہ ایک شخص قانونی ہے۔ اس لیے کہ وقف مالک ہوتا ہے' مسجد یا وقف کو چندہ دیا جائے یا کوئی اور چیز دی جائے تو وہ چندہ یا دیگر عطیات وقف نہیں ہوتے جب تک ان کے وقف کی تصریح نہ کر دی جائے' بلکہ وقف کے مملوک ہوتے ہیں اور وقف مالک ہوتا ہے۔ وقف دائن بھی ہوتا ہے مثلاً کوئی شخص وقف کی زمین کرایہ پر لیتا ہے تو یہ کرایہ وقف کا دین ہے اور وقف دائن ہے..... ایسے ہی وقف مدیون بھی ہوتا ہے' مثلاً کوئی شخص وقف کا ملازم ہے تو اس کی تنخواہ وقف کے ذمے میں ہے' عدالت میں مقدمہ ہو تو وقف مدعی اور مدعی علیہ بھی ہو سکتا ہے اور متولی اس کی نمائندگی کرتا ہے۔ مالک ہونا' دائن ہونا' مدیون ہونا' مدعی یا مدعی علیہ ہونا شخص کے اوصاف میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ وقف میں شخص قانونی کی خصوصیات تسلیم کی گئی ہیں۔" (اسلام اور جدید معیشت و تجارت' صفحہ 80)

وقف کا شخص قانونی ہونا ایک ایسی خصوصیت ہے کہ اس کے باعث انشورنس کا شرعی متبادل پیش کرنے میں کافی سہولتیں پیدا ہوئی ہیں۔ اسی لیے علماء نے وقف کی بنیاد پر تکافل کا نظام قائم کرنے کو ترجیح دی ہے' کیونکہ تبرع کے مقابلے میں وقف کے اندر وسعتیں (Flexibilities) قدرے زیادہ ہیں اور موجودہ دور میں تکافل کا جو طریق کار مروج ہے' اس میں تبرع والے نظام کو اختیار کرنے سے اس بات کا پوری طرح اطمینان نہیں ہوتا کہ کیا یہ معاملہ عقد معاوضہ سے پوری طرح نکل چکا ہے یا نہیں۔

وقف چونکہ خود شخص قانونی ہے اور دیے گئے عطیات براہ راست وقف کی ملکیت میں چلے جاتے ہیں اور وقف پھر اپنے طے کردہ ضوابط کی روشنی میں کلیم کی ادائیگی کرتا ہے اس لیے وقف کا نظام زیادہ قابل اطمینان ہے' خصوصاً جبکہ وقف کے اندر شرعاً اس کی بھی گنجائش ہے کہ وقف کرنے والا شخص خود اپنے لیے بھی اس وقف

سے نفع حاصل کرنے کی شرط لگا سکتا ہے۔ گویا تکافل کے لیے جو وقف فنڈ قائم کیا جاتا ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کنواں خرید کر وقف کر دے یا قبرستان کے لیے جگہ وقف کر دے اور یہ کہے کہ اس بستی کے جس شخص کو بھی پیاس لگے وہ اس کنویں سے پانی پی سکتا ہے یا اس بستی میں جس شخص کا بھی انتقال ہو' اسے اس قبرستان میں دفن کیا جا سکتا ہے' اور اگر خود مجھے پیاس لگے یا میرا انتقال ہو تو مجھے بھی اس وقف سے فائدہ اٹھانے کا اختیار ہو گا۔ فقہ کی کتب میں اس بات کی تصریح ہے کہ وقف کرنے والے کے لیے اس قسم کی شرط لگانا جائز ہے اور اس شرط کی وجہ سے وقف پر کوئی اثر نہیں پڑے گا' بلکہ اس شرط کا خیال رکھنا اتنا ضروری ہے جتنا کسی ایسے شرعی حکم کا' جس کا ثبوت قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ سے ہو' چنانچہ فقہ کا مشہور اصول ہے کہ: شرط الواقف کنص الشارع یعنی واقف کا کوئی شرط لگانا بمنزلہ صاحب شریعت کے فرمان کے ہے۔

یہ تو وقف کی حیثیت ہوئی' پھر جو لوگ اس وقف کی اس پر بننے والے پول کو تبرع (Donate) کرتے ہیں' وہ تبرع وقف کی ملکیت میں چلا جاتا ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی وقف (مثلاً مدرسہ یا قبرستان) کے لیے چندہ دے۔ جب کوئی چیز وقف کی ملکیت میں آ جاتی ہے تو اسے بھی ان مصارف میں صرف کیا جا سکتا ہے جو وقف کے ہیں۔ چنانچہ اگر کوئی شخص مثلاً کسی مدرسے کو چندہ دیتا ہے تاکہ اس میں مسلمانوں کے بچے پڑھ سکیں تو اس کے لیے یہ بھی جائز ہے کہ اپنے بچے کو بھی اس مدرسہ میں تعلیم دلوائے۔ یہ اس لیے کہ وہ وقف اسی مقصد کے لیے قائم ہوا ہے۔

اسی طرح وقف کی بنیاد پر جو تکافل قائم ہوتا ہے' وہ خاص قسم کے افراد یعنی ایسے افراد کے لیے قائم ہوتا ہے جنہیں مخصوص قسم کا نقصان پہنچ سکتا ہے' تو اس وقف کو تبرع کے طور پر رقم دینے والا اسی طرح پول سے فائدہ اٹھا سکتا ہے' جس طرح مدرسہ یا قبرستان کو چندہ دینے والا۔ اس بات پر تمام فقہاء کرام کا اتفاق ہے کہ واقف کوئی چیز وقف کرتے وقت اس سے خود نفع اٹھانے کی نیت کرے بلکہ وقف نامے میں باقاعدہ اپنے انتفاع کی شرط بھی لگائے تو شرعاً اس کی بھی اجازت ہے

(دیکھیے حدیث سنن نسائی: کتاب الاحباس' باب وقف المساجد'

صحیح بخاری: کتاب المساقاۃ' باب فی الشرب' جامع

ترمذی: ابواب المناقب' باب مناقب عثمان بن عفان)

وقف کی بنیاد پر مروجہ انشورنس کے شرعی متبادل کا تصور سب سے پہلے مفتی محمد شفیع صاحبؒ نے 1964ء میں پیش کیا۔ بعد ازاں ستمبر 2002ء میں جامعہ دارالعلوم کراچی میں بنگلہ دیش' سالم اور پاکستان کے اہل علم کا اجتماع ہوا۔ اس میں بھی وقف کی بنیاد پر تکافل کمپنی قائم کرنے پر اتفاق ہوا۔ اس مجلس کے شرکاء نے باہمی اتفاق سے تکافل کمپنی (وقف کی بنیاد پر) قائم کرنے کا ایک بنیادی خاکہ ان الفاظ میں پیش کیا:

''اس کے اندر سب سے پہلے شیئر ہولڈر یعنی تکافل کمپنی کے حصہ داران اپنے طور پر اموال غیر منقولہ یا نقود یا دونوں کو شرعی اصول وضوابط کے مطابق وقف کریں گے جنہیں وقف کہا جائے گا اور ان کے لیے آخری جہت ''قربت'' یعنی فقراء اور مساکین پر تصدق (صدقہ کرنا) ہوگی' پھر

پالیسی ہولڈرز اس وقف میں جو رقوم دیں گے یا وقف کے جتنے منافع اور زوائد ہوں گے وہ سب وقف کے مملوک ہوں گے اور وقف کو وقف کے طے شدہ اصول وضوابط کے مطابق ان مملوکات اور منافع میں تصرف کا مکمل اختیار ہوگا۔"

(بحوالہ "تکافل انشورنس کا اسلامی طریقہ" مولانا اعجاز صمدانی" صفحہ 107 'ادارۂ اسلامیات لاہور)

دوسرے متبادل تبرع کی بنیاد پر کی وضاحت:

"تبرع" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں کہ کسی عوض کی خواہش کے بغیر کسی کو کوئی چیز احسان کے طور پر دینا۔ جیسے کسی کو ہدیہ یا انعام دینا کہ ان کے اندر کسی معاوضے کی خواہش کے بغیر دوسرے کو کچھ دیا جاتا ہے۔ تبرع کی بنیاد پر انشورنس کا متبادل ملائیشیا اور شرقِ اوسط کے ممالک میں رائج ہے۔ اس کا طریق کار بھی تقریباً وہ یہ ہے جو وقف کی بنیاد پر پیش کیے گئے متبادل کے اندر ہے۔ البتہ "وقف ماڈل" اور "تبرع ماڈل" کے درمیان بنیادی طور پر دو فرق ہیں:

1- پہلا فرق یہ ہے کہ وقف ماڈل کے اندر پہلے کمپنی کے حصہ داران کچھ منقولہ وغیر منقولہ جائیداد یا نقد رقم وقف کرتے ہیں۔ یہ وقف ان لوگوں کے لیے ہوتا ہے جنہیں خاص قسم کا ضرر پہنچ سکتا ہے۔ جبکہ تبرع ماڈل میں کوئی چیز وقف نہیں کی جاتی۔

2- دوسرا فرق یہ ہے کہ وقف ماڈل کے اندر پالیسی ہولڈر "وقف پول" کو پریمیم دیتے ہیں جو وقف کی ملکیت میں چلا جاتا ہے اور پھر اسے وقف کے طے شدہ اصول وضوابط کے مطابق استعمال کیا جاتا ہے جبکہ تبرع کا ماڈل میں یہ عطیہ اس پول کی ملکیت میں جاتا ہے جو مختلف تبرعات سے وجود میں آتا ہے۔

یہاں یہ واضح رہنا ضروری ہے کہ اگر چہ وقف اس اعتبار سے تبرع ہی کی ایک قسم ہے کہ اس پر تبرع کی حقیقت صادق آتی ہے یعنی وقف کرنے والا کسی بدلے اور معاوضے کی شرط اور خواہش کے بغیر کوئی چیز وقف کرتا ہے اور تبرع بھی اس عطیہ کو کہا جاتا ہے جو کسی عوض کی خواہش کے بغیر کیا جاتا ہے تاہم شرعاً وقف کے احکام میں تبرع کے مقابلے میں زیادہ لچک ہے' اس لیے وقف کی بنیاد پر تکافل کا انتظام چلانے میں ان بہت سارے شبہات سے حفاظت ہو جاتی ہے جو تبرع کی بنیاد پر پیش کیے گئے متبادل پر کیے گئے ہیں۔

علامہ یوسف القرضاوی "اسلام کا انشورنس سسٹم" کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ "اسلام کا بیت المال عوامی بیمہ کمپنی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور وہ ہر اس شخص کے لیے ہے جو اس کے اقتدار کے زیر سایہ رہنا چاہتا ہو...... اسلامی شریعت حادثات اور مصائب میں فرد کی معاونت کرنے کی ذمہ داری قبول کرتی ہے۔ جب کوئی شخص مصیبت میں مبتلا ہو جائے تو وہ صاحب امر کے سامنے اپنا مسئلہ پیش کر سکتا ہے تا کہ وہ اس کی تلافی کا سامان کر سکے۔ اسی طرح مرنے کے بعد وارثوں کے لیے بھی ضمانت دی گئی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: "میں ہر مسلمان سے اس کے نفس سے زیادہ قریبی تعلق رکھتا ہوں جو مسلمان مال چھوڑ دے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے اور جو قرض یا چھوٹے چھوٹے بچے چھوڑے تو قرض کی ادائیگی اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری مجھ

پر ہے"........ مزید برآں اسلام نے اپنے فرزندوں کے بیمہ کے لیے جو سب سے بڑی چیز شروع کی وہ زکوٰۃ کے مصارف میں عازمین (مقروض) کا حصہ ہے۔ اس کی تفسیر میں بعض مفسرین سلف سے یہ منقول ہے کہ عازم وہ شخص ہے جس کا گھر جل گیا ہو جس کا مال یا کاروبار کو سیلاب بہا لے گیا ہو وغیرہ اور بعض فقہاء اس بات کو جائز قرار دیتے ہیں کہ زکوٰۃ کی آمدنی سے ایسے شخص کو اتنا مال دیا جائے کہ اس کی سابقہ مالی پوزیشن بحال ہو جائے خواہ اسے ہزاروں کی رقم دینا پڑے۔

(اسلام میں حلال وحرام یوسف القرضاوی صفحہ 329, 330)

جدید معاشی مسائل اور ان کا حل

(بیع وشراء کی جدید صورتیں)

قسطوں پر خرید وفروخت یا قسطوں کا کاروبار

سوال: قسطوں پر خرید وفروخت یا قسطوں کا کاروبار کرنے والوں پر روشنی ڈالیں۔

مفہوم:

قسطوں پر بیع کا مطلب وہ بیع ہے جس میں بیچنے والا اپنا سامان خریدار کو اسی وقت دے دے لیکن خریدار اس چیز کی قیمت فی الحال ادا نہ کرے۔ بلکہ وہ طے شدہ قسطوں کے مطابق اس کی قیمت ادا کرے۔ لہٰذا جس بیع میں مذکورہ صورت پائی جائے اس کو ''بیع بالتقسیط'' کہیں گے' چاہے اس چیز کی طے شدہ قیمت اس کی بازاری قیمت کے برابر ہو یا کم یا زیادہ۔ لیکن ''بیع بالتقسیط'' میں عام معمول یہ ہے کہ اس میں چیز کی قیمت بازاری قیمت سے زیادہ مقرر کی جاتی ہے' لہٰذا اگر خریدار اس چیز کو نقد خریدنا چاہے تو وہ اس چیز کو مقررہ قیمت سے کم قیمت پر بازار سے خرید سکتا ہے' لیکن اگر خریدار اس چیز کو ادھار خریدنا چاہے گا تو بیچنے والا اس وقت اس کو بیچنے پر تیار ہوگا۔ جب اس کو نقد کے مقابلے میں زیادہ قیمت وصول ہو۔ اس لیے عام طور پر ''بیع بالتقسیط'' میں نقد بیع کے مقابلے میں زیادہ قیمت مقرر کی جاتی ہے۔

(قسطوں پر خرید وفروخت: مولانا محمد تقی عثمانی' عربی مقالہ مترجم مولانا عبداللہ میمن' صفحہ 8 مطبوعہ میمن اسلامک پبلشرز کراچی)

مُدت کے مقابلے پر قیمت بڑھانا:

ادھار فروخت کرنے کی صورت میں نقد فروخت کے مقابلے میں قیمت بڑھانا جائز ہے یا نہیں؟ اس مسئلہ پر قدیم وجدید دونوں قسم کے فقہاء نے بحث کی ہے' چنانچہ بعض علماء کرام اس زیادتی کو ناجائز کہتے ہیں' اس لیے کہ ثمن (قیمت) کی یہ زیادتی ''مدت'' کے عوض میں ہے' اور جو ثمن ''مدت'' کے عوض میں دیا جائے وہ سود ہے' یا کم از کم سود کے مشابہ ضرور ہے۔ یہ زین العابدین علی بن الحسین' اور الناصر' المنصور باللہ اور ہادویہ کا مسلک ہے اور علامہ شوکانی نے ان فقہاء کا یہی مسلک نقل فرمایا ہے۔ (نیل الاوطار' 5:172)۔ لیکن آئمہ اربعہ اور جمہور فقہاء اور محدثین کا مسلک یہ ہے کہ ادھار بیع میں نقد بیع کے مقابلے میں قیمت زیادہ کرنا جائز ہے' بشرطیکہ عاقدین عقد کے وقت ہی بیع موجل ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں قطعی فیصلہ کر کے کسی ایک ثمن پر اتفاق کر لیں' لہٰذا اگر بائع یہ کہے کہ میں نقد اتنے میں اور ادھار اتنے میں بیچتا ہوں' اور اس کے بعد کسی ایک بھاؤ پر متفق ہوئے بغیر دونوں جدا ہو جائیں تو یہ بیع ناجائز ہے' لیکن اگر عاقدین مجلسِ عقد میں ہی کسی ایک شق اور کسی ایک ثمن

پر اتفاق کر لیں تو یہ بیع جائز ہوگی۔ چنانچہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ جامع ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث "نهى رسول الله صلى الله عليه و آله وسلم" عن بيعتين في بيعة " کے تحت تحریر فرماتے ہیں۔ "بعض اہل علم نے اس حدیث کی یہ تشریح بیان کی ہے کہ "بيعتين في بيعة" سے مراد یہ ہے کہ بائع مشتری سے کہے کہ "میں یہ کپڑا تمہیں نقد دس درہم میں بیچتا ہوں اور ادھار بیس درہم میں بیچتا ہوں اور پھر کسی ایک بیع پر اتفاق کر کے جدائی نہیں ہوئی۔ لیکن اگر ان دونوں میں سے کسی ایک پر اتفاق ہونے کے بعد جدائی ہوئی تو اس میں کوئی حرج نہیں (یعنی بیع جائز ہے) کیونکہ معاملہ ایک پر طے ہو گیا ہے۔" (ترمذی کتاب البیوع باب نمبر 18 حدیث نمبر 1331)

آئمہ اربعہ اور جمہور فقہاء کا بھی وہی مسلک ہے جو امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا ہے (المغنی لابن قدامۃ 4-177 المبسوط للسرخسی 13-8) اور دلائل سے ہی راجح ہے۔ اس لیے کہ قرآن و حدیث میں اس بیع کے عدم جواز پر کوئی نص موجود نہیں اور اس بیع میں ثمن کی جو زیادتی پائی جا رہی ہے اس پر ربا کی تعریف بھی صادق نہیں آ رہی ہے کیونکہ وہ قرض نہیں ہے اور نہ ہی یہ اموال ربویہ کی بیع ہو رہی ہے بلکہ یہ عام بیع ہے اور عام بیع میں بائع کو شرعاً مکمل اختیار ہے کہ وہ اپنی چیز جتنی قیمت پر چاہے فروخت کرے۔ اور بائع کے لیے شرعاً یہ ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اپنی چیز بازاری دام پر ہی فروخت کرے۔ بعض اوقات ایک ہی چیز کی قیمت حالات کے اختلاف سے مختلف ہو جاتی ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنی چیز کی قیمت ایک حالت میں ایک مقرر کرے اور دوسری حالت میں دوسری مقرر کرے تو شریعت اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کرتی۔

دو قیمتوں میں سے کسی ایک کی تعیین شرط ہے:

عقد بیع صرف اس وقت جائز ہے جب عاقدین کے درمیان قیمت اور مدت دونوں کی تعیین پر اتفاق ہو چکا ہو۔ لہٰذا بھاؤ تاؤ میں مذکور مختلف قیمتوں اور مدتوں میں سے کسی ایک کی تعیین بیع کے وقت ہی ضروری ہے۔ ورنہ بیع جائز نہ ہوگی۔ اور اگر بھاؤ تاؤ کے وقت بائع مشتری سے کہے کہ اگر تم ایک ماہ بعد اس کی قیمت ادا کرو گے تو اس کی قیمت پندرہ روپے ہے اور پھر مجلس عقد میں کسی ایک شق کی تعیین کے بغیر عاقدین اس خیال سے جدا ہو گئے کہ مشتری ان تین شقوں میں سے ایک شق کو بعد میں اپنے حالات کے مطابق اختیار کر لے گا۔ تو یہ بیع بالاجماع حرام ہے اور عاقدین پر واجب ہے کہ وہ اس عقد کو فسخ کریں اور دوبارہ از سر نو جدید عقد کریں۔ جس میں کسی ایک شق کو وضاحت کے ساتھ معین کریں۔

ثمن میں زیادتی جائز لیکن منافع کا مطالبہ ناجائز:

اوپر مذکور بیع کا جواز اس وقت ہے جب نفس ثمن میں اضافہ کر دیا جائے لیکن اگر یہ بیع یوں کی جائے کہ نقد بیچنے کی بنیاد پر ہو اس شے کی ایک قیمت مقرر کر لی اور پھر اس قیمت کی ادائیگی میں تاخیر کی بنیاد پر اس کی اصل قیمت بڑھا لی تو یہ صورت سود میں داخل ہے۔ مثلاً بائع یہ کہے کہ میں فلاں شے تم کو آٹھ روپے میں نقد فروخت کرتا ہوں لیکن اگر تم نے ایک ماہ تک قیمت ادا نہ کی تو تمہیں دو روپے مزید دینے ہوں گے۔ اب اس دو

روپے کو منافع کہا جائے یا کچھ اور مگر اس کے سود ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ لہٰذا یہ صورت شرعاً ناجائز ہے۔

دین کی توثیق اور اس کی قسمیں:

چونکہ بیع موجل میں بیع کے مکمل ہوتے ہی ثمن مشتری کے ذمہ دین ہو جاتا ہے۔ اس لیے بائع کو مشتری سے اس دین پر کسی توثیق کا مطالبہ کرنا' یا مقررہ وقت پر دین ادا کرنے پر کسی گارنٹی کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

رہن کا مطالبہ کرنا:

دین کی ادائیگی پر گارنٹی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک رہن رکھنا' دوسرے یہ کہ تیسرے شخص کا ضمانت دینا۔ پہلی صورت میں مشتری اپنی کوئی مملوکہ چیز بائع کے پاس بطور رہن رکھوائے اور بائع گارنٹی کے طور پر اس چیز کو اپنے پاس رکھ لے' لیکن اس شے مرہون سے مستفید ہونا اس کے لیے کسی طرح جائز نہیں' اس لیے کہ اس شے مرہون سے مستفید ہونا بھی ربا کی ایک صورت ہے' البتہ وہ چیز بائع کے پاس اس لیے رکھی رہے گی تاکہ مشتری اس رہن کے دباؤ کے باعث مقررہ وقت پر دین ادا کرنے کا اہتمام کرے' اگر مشتری وقت مقررہ پر دین ادا کرنے سے قاصر ہو جائے تو پھر بائع اس چیز کو بیچ کر اپنا دین وصول کر لے۔ مگر عقد کے وقت جو قیمت مقرر ہوئی تھی' اس سے زیادہ وصول کرنا اس کے لیے جائز نہیں۔ جس طرح مشتری کے لیے اپنی مملوکہ اشیاء کو رہن رکھوانا جائز ہے۔ اسی طرح ان اشیاء کی صرف دستاویزات اور کاغذات کو رہن رکھوانا بھی جائز ہے۔

ادائیگی کی ضمانت (گارنٹی) حاصل کرنے کے لیے بائع کا مبیع کو محبوس کر لینا:

بیع موجل میں بائع کے لیے مبیع کو محبوس کرنے کی صورت دو طریقوں سے ممکن ہے' ایک یہ کہ ثمن کی وصولی کے لیے مبیع کو روکنا اور دوسرا یہ کہ بطور رہن کے مبیع کو روکنا۔ دونوں صورتوں میں فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں جب ثمن کی وصولی کے لیے مبیع کو محبوس کیا جائے گا تو اس وقت مبیع "مضمون بالثمن" ہوگی' "مضمون بالقیمۃ" نہیں ہوگی' لہٰذا اگر حالت حبس میں وہ مبیع ہلاک ہوگئی تو اس صورت میں بیع فسخ ہو جائے گی اور بازاری قیمت کا ضمان' اس پر نہیں آئے گا۔ دوسری یعنی رہن کی صورت میں اگر وہ مبیع بائع کے پاس تعدی کے بغیر ہلاک ہو جائے تو بیع فسخ نہیں ہوگی' بلکہ وہ مشتری کے مال سے ہلاک ہوگی اور مشتری کے ذمہ سے ثمن ساقط نہ ہوگا۔ اور اگر بائع کی تعدی کی وجہ سے ہلاک ہوئی ہو تو مرتہن (بائع) اس چیز کی بازاری قیمت کا ضامن ہوگا' ثمن کا ضامن نہ ہوگا۔ جہاں تک پہلی صورت کا تعلق ہے یعنی ثمن کی وصولی کے لیے مبیع کو روکنا۔ بیع بالتقسیط میں یہ صورت جائز نہیں' اس لیے کہ بیع بالتقسیط بیع موجل ہے۔ اور بائع کو ثمن کے استیفاء کے لیے حبس مبیع کا حق صرف نقد بیع میں حاصل ہوتا ہے۔ ادھار بیع میں یہ حق بائع کو حاصل نہیں ہوتا۔ فتاویٰ ہندیہ میں ہے کہ "نقد بیع میں ثمن کی وصولی کے لیے بائع کو حبس مبیع کا حق حاصل ہے' لیکن بیع موجل میں بائع کو حبس مبیع کا حق حاصل نہیں' نہ ادائیگی کے وقت سے پہلے اور نہ ادائیگی کے وقت کے بعد"۔ (فتاویٰ ہندیہ' 3:15' باب نمبر 4' کتاب البیوع)

جہاں تک دوسری صورت کا تعلق ہے' وہ یہ ہے کہ مشتری کے ذمہ اس مبیع کا جو ثمن واجب ہو چکا ہے

اس کے عوض میں بائع وہی مبیع بطور رہن کے اپنے قبضے میں رکھے۔ ایسا دو طریقوں سے ممکن ہے: اول یہ کہ مشتری اس مبیع پر قبضہ سے پہلے ہی بائع کے پاس بطور رہن چھوڑ دے۔ یہ صورت جائز نہیں ہے کیونکہ یہ وہی صورت ہے کہ بائع حصول ثمن کے لیے بیع کو اپنے پاس روک لے اور حصول ثمن کے لیے حبس مبیع بیع مؤجل میں جائز نہیں۔ دوم یہ کہ مشتری اس مبیع کو پہلے اپنے قبضہ میں لے اور پھر بطور رہن کے وہی مبیع بائع کے پاس واپس رکھ دے۔ یہ صورت اکثر فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ چنانچہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ ''الجامع الصغیر'' میں لکھتے ہیں کہ ''اگر کسی شخص نے چند درہم کا کوئی کپڑا خریدا' اور پھر مشتری نے بائع سے کہا کہ اس کپڑے کو اپنے پاس ہی رکھو' جب تک میں تمہیں اس کی قیمت ادا نہ کروں۔ اس صورت میں یہ کپڑا بائع کے پاس رہن سمجھا جائے گا۔'' اس عبارت کو صاحب ہدایہ نے بھی نقل کیا ہے' اور پھر صاحب کفایہ اس کی شرح کرتے ہیں کہ ''اس لیے کہ جب مشتری نے کپڑا خرید کر اس پر قبضہ بھی کر لیا تو پھر اس کپڑے کو بطور رہن رکھوانا جائز ہے' جیسے دیگر مملوک اشیاء کا رہن جائز ہوتا ہے۔''

(الکفایہ شرح الہدایہ' برحاشیہ فتح القدیر' جلد 9 صفحہ 99)

علامہ ابن قدامہ' المغنی میں فرماتے ہیں کہ ''اگر بائع اور مشتری اس شرط پر بیع کا معاملہ کریں کہ مبیع بائع کے پاس ہی ثمن کے مقابلے میں بطور رہن کے رکھی جائے گی تو یہ بیع صحیح نہیں' علامہ ابن حامد رحمۃ اللہ علیہ نے ایسا ہی فرمایا ہے اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی قول ہے' اس لیے کہ جب مبیع کو بائع کے پاس بطور رہن رکھنے کی شرط لگائی گئی اس وقت وہ مبیع مشتری کی ملکیت میں نہیں تھی' چاہے یہ شرط ہو کہ مشتری اس مبیع پر قبضہ کرنے کے بعد رہن کے طور پر رکھوائے گا۔ یا قبضہ سے پہلے رہن رکھوانے کی شرط ہو مگر ظاہر الراویہ کے مطابق یہ' درست ہے..... لیکن اگر بیع کے اندر رہن کی شرط نہیں لگائی مگر بیع مکمل ہونے کے بعد اسی بائع کے پاس مبیع کو رہن رکھوایا۔ تو اس صورت میں اگر بیع لازم ہونے کے بعد وہ مبیع بطور رہن رکھوائی ہے تو یہ صورت بطریق اولیٰ درست ہے' اس لیے کہ جب مشتری یہ مبیع غیر بائع کے پاس رہن رکھوا سکتا ہے تو پھر بائع کے پاس رکھوانا بھی جائز ہے۔''

(المغنی لابن قدامہ' جلد 4' صفحہ 427' کتاب الرہن)

گارنٹی پر اُجرت کا مطالبہ کرنا:

اسلامی فقہ میں یہ بات معروف ہے کہ قرض کی طرح گارنٹی بھی ایک عقد تبرع ہے' اور اس پر کسی طرح کی اجرت کا مطالبہ کرنا جائز نہیں ہے۔ مگر موجودہ دور کے بعض حضرات نے اجرت لینے کے جواز پر اس سے استدلال کیا ہے کہ چونکہ گارنٹی موجودہ دور کی تجارت کا ایک لازمی جز بن گیا ہے' اس لیے گارنٹی پر اجرت دینا جائز ہے۔ لیکن یہ دلیل صحیح نہیں کیونکہ اگر یہ دلیل درست مان لی جائے تو پھر قرض پر بھی منافع کا مطالبہ جائز ہونا چاہیے' اس لیے کہ یہ دلیل قرض پر بھی پوری طرح صادق آتی ہے کیونکہ قرض بھی اصلاً محض ایک عقد تبرع ہے۔ لیکن موجودہ دور کی تجارت کی ایک ضرورت بن چکا ہے' اور قرض فراہم کرنے کے لیے مستقل ادارے اور بینک قائم ہیں اور مطلوبہ مقدار میں تبرعاً قرض دینے والا کوئی شخص نہ ملے گا۔ ان سب چیزوں کے باوجود کوئی بھی شخص یہ نہیں

کہہ سکتا کہ قرض پر منافع لینا جائز ہے۔

دراصل عقد تبرع ہونے کے اعتبار سے کوئی گارنٹی اور قرض میں کوئی فرق نہیں۔ جس طرح قرض پر نفع لینا ناجائز ہے' اسی طرح گارنٹی پر اجرت لینا بھی ناجائز ہے بلکہ گارنٹی پر اُجرت کا مطالبہ کرنا قرض پر منافع کے مقابلے میں بطریق اولیٰ جائز نہیں۔ مثلاً زید نے عمر سے سوڈالر قرض طلب کیے۔ اب عمر نے زید سے ضمانت مانگی' اب خالد زید سے کہتا ہے کہ میں تمہارا قرض بھی ادا کر دیتا ہوں' بشرطیکہ بعد میں تم مجھے ایک سو دس ڈالر ادا کرو گے۔ اور یہ دس ڈالرز زائد اس خدمت کے عوض میں ہیں جو میں نے تمہاری طرف سے دین ادا کر کے کی ہے۔ پھر بکر زید کے پاس آتا ہے کہ میں عمر کے لیے تمہاری طرف سے دین کا ضامن بنتا ہوں' بشرطیکہ تم مجھے دس ڈالر اس ضمانت کی اُجرت کے طور پر ادا کرو' اور جب تم دین ادا کرنے سے عاجز ہو جاؤ گے تو میں تمہاری طرف سے دین ادا کر دوں گا' سوڈالر قرض ہو جائے گا۔

کفالت (گارنٹی) پر اجرت لینے کے قائل افراد کے نزدیک بکر کا اجرت کا مطالبہ جائز ہے اور خالد کا اجرت کا مطالبہ ناجائز۔ جبکہ خالد بالفعل اپنا مال بھی لگا رہا ہے' بکر نے اپنا مال نہیں لگایا اور صرف مقررہ وقت پر ادائیگی کا ضامن ہے' لہٰذا مال لگانے والے شخص کے لیے اجرت کا مطالبہ کرنا حرام ہے' تو وہ شخص جو ادائیگی کی صرف ذمہ داری لے رہا ہے' اس کے لیے اجرت کا مطالبہ بطریق اولیٰ حرام ہے۔ یعنی ضمانت پر اجرت لینا کسی حال میں جائز نہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ اسلامی بینکوں کو عالمی تجارت اور لین دین میں اور لیٹر آف کریڈٹ (L.C) جاری کرنے میں اس کی ضرورت رہتی ہے' تو پھر اس کی متبادل صورت کیا ہو سکتی ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ بینک کے لیے اپنے عمیل سے دو چیزوں کا مطالبہ کرنا جائز ہے۔

(i) L.C جاری کرنے میں بینک کے واقعی اخراجات کا مطالبہ کرنا عمیل سے جائز ہے۔

(ii) امپورٹر اور ایکسپورٹر کے درمیان معاملہ کی تکمیل کے سلسلہ میں بینک کی خدمات پروکیل' دلال' یا درمیانی واسطہ ہونے کی حیثیت سے اپنی خدمات پر اُجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز ہے' لیکن صرف گارنٹی پر کسی اجرت کا مطالبہ کرنا بینک کے لیے جائز نہیں۔

(قسطوں پر خرید و فروخت' مولانا محمد تقی عثمانی' صفحہ 28 تا 32
مترجم مولانا عبداللہ میمن' مطبوعہ میمن اسلامک پبلشرز کراچی)

تعجیل کے مقابلے میں دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

بعض تاجر "دیون موجلہ" (وہ دین جس کی ادائیگی کی تاریخ ابھی نہیں آئی) میں یہ معاملہ کرتے ہیں کہ وہ اپنے دین کے کچھ حصے کو اس شرط پر چھوڑ دیتے ہیں کہ مدیون باقی دین فی الحال ادا کرے' مثلاً عمر پر زید کے ایک ہزار روپیہ دین تھا' اب زید عمر سے کہتا ہے کہ میں سو روپے دین کے چھوڑ دیتا ہوں' بشرطیکہ تم نو سو روپے فی الحال ادا کر دو۔ فقہی اصطلاح میں اس معاملے کو "وضع وتعجل" (کچھ ساقط کرو اور جلدی حاصل کرلو) کہا جاتا ہے۔ اس کے حکم میں فقہاء کا اختلاف ہے (موطا' امام مالک 1-606' مصنف عبدالرزاق' 8,71 تا 74)۔ اس ضمن

میں دو مرفوع حدیثیں آپس میں متعارض ہیں اور بلحاظ سند دونوں ضعیف ہیں۔ پہلی حدیث بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ "جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکل جانے کا حکم دیا تو کچھ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے بنی نضیر کو مدینہ سے نکلنے کا حکم فرمایا ہے' حالانکہ لوگوں پر ان کے دیون باقی ہیں' جن کی ادائیگی کا ابھی وقت نہیں آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "کچھ ساقط کر دو اور جلدی ادا کر دو۔" (بیھقی کتاب البیوع' باب من عجل له ادنی من حقه)۔ دوسری حدیث بیہقی نے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ "میں نے ایک شخص کو ایک سو دینار بطور قرض دیئے' اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو وفد بھیج رہے تھے' اس میں میرا نام بھی آ گیا' میں نے اس شخص سے کہا کہ اگر تم مجھے نوے دینار فوراً دے دو' میں تمہیں دس دینار چھوڑ دیتا ہوں' اس نے منظور کر لیا' پھر بعد میں کسی وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اس کا تذکرہ ہوا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے مقداد! تم نے خود بھی سود کھایا اور اس کو بھی کھلایا۔" (بیھقی' کتاب البیوع' باب من عجل له ادنیٰ من حقه)

امام بیہقی نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ سند کے لحاظ سے دونوں حدیثیں ضعیف ہیں۔ اس لیے دونوں میں سے کسی ایک کو حجت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا' البتہ فقہاء کرام نے جانب حرمت کو ترجیح دی ہے۔ اس لیے کہ جب دین کی تاخیر کی صورت میں دین میں زیادتی کرنا سود میں داخل ہے' اسی طرح دین کی تعجیل اور جلدی کی صورت میں دین کے اندر کمی بھی اس میں دخل ہے۔ علامہ شمس الائمہ سرخسی رحمۃ اللہ علیہ نے بنی نضیر کا واقعہ ذکر کر استدلال کیا ہے کہ مسلمان اور حربی کے درمیان سود نہیں ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو نضیر کو جلا وطن کر دیا تو وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین ہیں' تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا: دین کا کچھ حصہ ساقط کر دو اور بقیہ دین فوراً لے لو۔ اور یہ بات طے ہے کہ مسلمانوں کے درمیان آپس میں یہ معاملہ ناجائز ہے۔ اس لیے کہ اگر کسی شخص کا دوسرے کے ذمہ دین ہو اور دین کی ادائیگی کا وقت ابھی نہ آیا ہو تو وہ دائن اگر اس شرط پر دین کا کچھ حصہ چھوڑ دے کہ مدیون بقیہ دین فوراً ادا کر دے تو یہ معاملہ جائز نہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اس معاملہ کو مکروہ کہا ہے۔"

(شرح السیر الکبیر للسرخی 4-1412 فقرہ نمبر 2738)

اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ اس وقت مسلمان بنو نضیر کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھے اور اس وقت ان کے لیے بنی نضیر کے پورے مال پر قبضہ کر لینا بھی جائز تھا۔ لہٰذا اگر مسلمانوں نے ان کے دین کا بعض حصہ کم کر دیا تو یہ بطریق اولیٰ جائز ہوگا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دین کے جس حصے کو ساقط کرنے کا حکم فرمایا تھا' اس سے مراد وہ سود تھا جو راس المال سے زائد تھا۔ رأس المال میں کمی کرنے کا حکم نہیں دیا' اس کی تائید واقدی کے اس بیان سے ہوتی ہے۔ "حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ بنو نضیر کو مدینہ سے جلا وطن کر دیا اور حضرت محمد بن مسلمہ کو اس کا نگران

مقرر فرمایا' اس وقت وہ لوگ حضور علیہ السلام کی خدمت میں آئے' اور کہا کہ لوگوں پر ہمارے دین واجب ہیں' جن کی ادائیگی مختلف مدتوں میں ہونی ہے' تو حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جلدی لے لو اور ساقط کر دو۔ اور ابی رافع سلام بن الحقیق کے حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ کے ذمہ ایک سو بیس دینار دین تھے۔ جن کی واپسی سال گزرنے پر ہونی تھی۔ چنانچہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ نے اصل راس المال جو اسی دینار تھے اس پر اس سے صلح کر لی اور جو زائد (سود کے) کے چالیس دینار تھے ان کو چھوڑ دیا۔'' (معازی لواقدی' ج 1 صفحہ 374)۔

یہ روایت اس بارے میں بالکل صریح ہے کہ دین کا جو حصہ ساقط کیا گیا تھا' وہ سود ہی تھا' اصل رآس المال کا حصہ نہیں تھا۔ اس لیے جمہور علماء کے نزدیک ''ضع وتعجل'' (کچھ ساقط کر دو اور فوراً دے دو) کا معاملہ حرام ہے۔ چنانچہ امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ''وہ امر مکروہ جس میں ہمارے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہے' وہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کا دوسرے کے ذمہ کسی مدت پر دین واجب ہو' اور وہ دائن (طالب) دین کا کچھ حصہ ساقط کر کے بقیہ دین کا فوری مطالبہ کرے۔'' امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ ''یہ صورت ہمارے نزدیک اس صورت ہی کی طرح ہے کہ کوئی شخص مدیون کو ادا دین کی تاریخ کے بعد اور مہلت دے دے اور وہ مدیون اس مہلت کے بدلے دین میں کچھ اضافہ کر دے۔ یہ صریح ربا ہے' جس میں کسی شک کی گنجائش نہیں۔'' (موطا امام محمد' کتاب البیوع' باب ما جاء فی الربا فی الدین' ج 1 صفحہ 606)

مندرجہ بالا نصوص فقہیہ کی بنیاد پر مدت کے مقابلے میں دین کے کچھ حصے کو سقوط کی حرمت کو راجح قرار دیا گیا ہے۔

فوری ادائیگی والے دیون میں ''ضع وتعجل'' کا اصول نافذ کرنا:

''ضع وتعجل'' کی ممنوعیت صرف دیون موجلہ میں ہے' جہاں تک دیون حالہ کا تعلق ہے' جن کی ادائیگی کے بارے میں عقد کے اندر کسی مدت کو شرط قرار نہیں دیا گیا ہے' بلکہ مدیون ان کی ادائیگی میں کسی وجہ سے تاخیر کر رہا ہے' تو ظاہر یہی ہے کہ ایسے دیون میں دین کے کچھ حصے کو چھوڑنے پر صلح کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ مدیون باقی دین فوراً ادا کر دے' علماء مالکیہ نے اس کے جواز کی تصریح کی ہے۔ چنانچہ المدونۃ الکبریٰ میں ہے کہ ''میں نے ان سے کہا: اس مسئلے میں آپ کی کیا رائے ہے کہ اگر ایک شخص کے ذمہ میرے ایک ہزار روپے دین ہوں' اور اس کی ادائیگی کا وقت آ چکا ہو' اور میں اس سے کہوں کہ اگر تم نے مہینہ شروع ہونے پر سو درہم ادا کر دیے تو نو سو درہم تمہارے ہیں' اور اگر تم نے ادا نہیں کیے تو پھر پورے ایک ہزار درہم ادا کرنے پڑیں گے؟ اس کے جواب میں امام مالک رحمۃ اللہ نے فرمایا: اس میں کوئی حرج نہیں' اگر وہ مہینے کے شروع میں سو درہم ادا کرے تو پھر ایسا ہی ہوگا جیسے تم نے کہا' اور نو سو درہم اس سے ساقط ہو جائیں گے' اور اگر مہینے کے شروع میں اس نے سو درہم ادا نہیں کیے تو پھر پورا دین اس کے ذمہ رہے گا۔'' (المدونۃ الکبریٰ جلد 11 صفحہ 27)

تعجیل کی صورت میں بلا شرط کے دین کا کچھ حصہ چھوڑ دینا:

دین موجل اگر جلد ادا کر دیا جائے تو اس صورت میں دین کا کچھ حصہ چھوڑنا اس وقت جائز ہے جب

یہ ''چھوڑنا'' (دست برداری) تعجیل کے لیے شرط نہ ہو بلکہ تبرعاً دائن کچھ دین ساقط کر دے' لیکن اگر یہ سقوط تعجیل کے ساتھ مشروط ہو تو اس صورت میں سقوط اور کمی جائز نہیں۔ چنانچہ علامہ جصاص رحمۃ اللہ علیہ نے ''ضع و تعجل'' کے جواز پر جتنے آثار اور روایات ہیں' ان کو اسی پر محمول کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''جن اسلاف نے اس صورت کو جائز قرار دیا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے مدیون سے کہے کہ ''تم میرا دین جلد ادا کر دو' میں تمہیں کچھ دین معاف کر دوں گا'' بظاہر تو انہوں نے جواز کا یہ قول اس صورت میں اختیار کیا ہے جبکہ دین میں یہ کمی تعجیل کے ساتھ مشروط نہ ہو' دائن بغیر شرط کے دین کا کچھ حصہ ساقط کر دے' اور مدیون بغیر کسی شرط کے دین جلدی ادا کر دے۔''

(احکام القرآن للجصاص۔ ج 1' صفحہ 467' آیت ربا)

مرابحہ موجلہ میں ''ضع و تعجل'' کا اصول:

دین موجل میں تعجیل کی شرط کے ساتھ دین کا کچھ حصہ ساقط کرنا ''بیع مساومہ'' میں تو ناجائز ہے' یعنی ان بیوع کے اندر تو جائز نہیں جس میں بائع اپنا منافع بیان کیے بغیر اپنی چیز مشتری کے ہاتھ بھاؤ تاؤ کے ذریعہ فروخت کرتا ہے' لیکن اگر ''بیع مرابحہ'' ہو' جس میں بائع مدت کے مقابلے میں ثمن میں جو اضافہ کر رہا ہے' اس کو صراحتاً بیان کر دے' اس کے بارے میں متاخرین احناف کا فتویٰ یہ ہے کہ اس صورت میں اگر مدیون مقررہ مدت سے قبل اپنا دین ادا کر دے' یا مقررہ مدت سے قبل فوت ہو جائے' تو اس صورت میں بائع صرف اتنا ثمن وصول کرے گا جتنا سابقہ ایام کے مقابل ہو گا' اور مقررہ مدت تک جتنے ایام باقی ہیں' اس کے مقابل کا ثمن چھوڑنا ہو گا۔

علامہ حصکفیؒ درمختار میں کہتے ہیں کہ ''اگر مدیون نے اپنا دین موجل وقت سے پہلے ادا کر دیا' یا وقتِ ادائیگی سے قبل اس کا انتقال ہو جائے تو اس کے انتقال کے باعث دین کی فوری ادائیگی ہونے لگے' اب دائن جب اپنا دین اس کے ترکہ سے وصول کرے گا تو اس صورت میں دائن مرابحۂ صرف اتنا دین وصول کر سکتا ہے جتنا گزشتہ ایام کے مقابل میں ہو' اور اس کی علت یہ بیان کی ہے کہ اس میں جانبین کی رعایت موجود ہے۔''

''ضع و تعجل'' کے قانون کے عدم جواز پر دلائل ہر دین موجل پر ثابت ہوتے ہیں' ان میں ''بیع مساومہ'' اور ''بیع مرابحہ'' کا کوئی فرق نہیں' اور اگر مندرجہ بالا فتویٰ پر عمل کیا گیا تو اس صورت میں ''بیع مرابحہ'' اور ''قسطوں پر بیع'' کا ان سودی معاملات سے زیادہ مشابہت ہو جائے گی جن میں مختلف مدتوں کے ساتھ ارتباط کی وجہ سے اصل واجب ہونے والی رقم میں شبہ رہتا ہے کہ کم ہو گی یا زیادہ۔ لہٰذا بیع بالتقسیط اور ''بیع مرابحہ'' کے وہ معاملات جو اسلامی بنکوں میں رائج ہیں' ان میں مندرجہ بالا فتویٰ پر عمل کرنا مناسب نہیں۔''

(قسطوں پر خرید و فروخت' مولانا تقی عثمانی' صفحہ 57 تا 63)

کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی سے مہلت کا خاتمہ:

یہ مسئلہ بعض کتب حنفیہ میں مذکور ہے۔ خلاصۃ الفتاوریٰ میں ہے کہ:

''اور اگر (بائع نے) کہا کہ اگر قسط ادا کرنے کا وقت آیا' اور تم نے قسط ادا نہیں کی تو اس صورت میں وہ مال فوراً واجب الاداء ہو گا' یہ شرط صحیح ہے۔ اور وہ مال فی الفور واجب الاداء ہو گا۔''

(خلاصۃ الفتاوریٰ 54/3' کتاب البیوع)

علامہ رمیؒ کہتے ہیں:

''بزازیہ میں ہے کہ مدت کا ابطال شرط فاسد سے باطل ہو جاتا ہے' مثلاً بائع یہ کہے کہ اگر قسط ادا کرنے کا وقت آیا' اور تم نے اس وقت قسط ادا نہیں کی' تو اس صورت میں تمام دین فوراً واجب الاداء ہوگا' تو یہ معاملہ درست ہے اور دین فوراً واجب الاداء ہوگا' اور خلاصہ الفتاوری کی عبارت یہ ہے کہ ''مدت کا ابطال شرط فاسد سے باطل ہو جاتا ہے' اور بائع یہ کہے کہ اگر قسط کی ادائیگی کے وقت تم نے قسط ادا نہ کی تو اس صورت میں تمام دین فوراً واجب الاداء ہوگا' تو یہ شرط درست ہے' لہٰذا وقت پر قسط ادا نہ کرنے کی صورت میں دین فوراً واجب الاداء ہوگا' پس انہوں نے یہ دو مسئلے الگ الگ کر دیئے' اور یہی صحیح ہے۔ واللہ اعلم''

(الفوائد الجزیہ علی جامع الفصولین' جلد 2 صفحہ 4 طبع مصر)

اداء دین میں ٹال مٹول کے نقصان کا عوض مقرر کرنا:

''بیع موجل'' سے متعلق یہ مسئلہ بھی ہے کہ بسا اوقات مدیون مشتری وقت مقررہ پر دین کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے' یا دین کی کسی قسط کی ادائیگی میں کوتاہی کرتا ہے' اس وقت یہ دیکھا جائے گا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ اگر تنگدستی کے باعث وہ ایسا کر رہا ہے تو قرآن حکیم کا حکم واضح ہے کہ' اگر مدیون تنگدست ہو تو اس کو فراخی ہونے تک مہلت دو'' (البقرۃ: 280)۔ لہٰذا اس صورت میں دائن پر واجب ہے کہ وہ مدیون کو مہلت دے' تاوقتیکہ اس کی تنگی دور ہو جائے' اور اس کے لیے دین کی ادائیگی ممکن ہو' اور دوسری طرف دائن کے لیے جائز نہیں کہ وہ (مدیون کے وقت پر ادا نہ کرنے پر) اپنے دین میں اضافہ کر دے۔ اس لیے کہ اس اضافے کے سود ہونے میں کوئی شک نہیں ہے۔ وقت پر دین کی ادائیگی نہ کرنے پر ٹال مٹول کرنے پر اسلامی بنک شرعاً اس دین میں نہ تو اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ اس پر سود لگا سکتے ہیں۔ البتہ دین کی ادائیگی میں تاخیر کرنے والے کو آئندہ مستقبل میں بنک کی سہولتوں سے محروم کرنے' اس کا نام بلیک لسٹ میں شامل کرنے اور آئندہ کسی بنک کے ساتھ کسی قسم کا لین دین کا معاملہ نہ کرنے کی سزا دی جا سکتی ہے جو کہ شرعاً جائز ہے۔ یہ بہت اچھا دباؤ ہے جو سود کے مقابلے میں زیادہ موثر ہے۔ اسی طرح تعزیری سزا بھی دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: ''مالدار کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے'' (بخاری' کتاب الاستقراض' حدیث نمبر 2400)۔ ایک اور حدیث میں فرمایا ''مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا اس کی سزا اور اس کی آبرو کو حلال کر دیتا ہے۔'' (بخاری)

موجودہ دور کے بعض علماء کرام نے یہ تجویز دی ہے کہ دین کی ادائیگی میں تاخیر کی وجہ سے جو واقعی نقصان لاحق ہوا اس کی تلافی کے لیے مدیون پر کوئی جرمانہ لازم کر دیا جائے۔ چنانچہ بعض اسلامی بینکوں نے یہ کیا ہے کہ اس مدت کے دوران اتنی مقدار کی رقم پر جتنا منافع بینک نے اپنے کھاتہ داروں کے درمیان تقسیم کیا ہے' اس کے بقدر مالی معاوضہ اس ٹال مٹول کرنے والے مدیون سے وصول کیا جائے اور اگر اس مدت کے دوران بینک کو سرمایہ کار سے کوئی منافع نہ ملا ہو تو بینک بھی اپنے مدیون سے دین کی ادائیگی میں تاخیر کا کوئی معاوضہ وصول نہ

کرے گا۔ اگر اس مدت کے دوران سرمایہ کے ذریعہ نفع حاصل ہوا ہے تو وہ بینک بھی اسی حساب سے مدیون سے مالی معاوضہ وصول کرے گا۔ علماء معاصرین کے نزدیک اس مالی معاوضہ کا "سود" سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ "مالی معاضہ" کا جواز اس حدیث سے فراہم کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا "نہ نقصان اٹھاؤ' نہ نقصان پہنچاؤ۔" (المقاصد الحسنہ للسخاوی' صفحہ 468)

چنانچہ "مالی معاوضہ" کے جواز کے قائلین استدلال کرتے ہیں کہ یہ "مالی معاوضہ" ایک طرح کا مالی جرمانہ ہے' جو دین کی ادائیگی میں ٹال مٹول کرنے والے کے ذمہ ڈالا جاتا ہے۔ تاہم اس مسئلہ پر تحقیق کی ضرورت ہے۔

مدیون کی موت سے قرض کی ادائیگی کی مہلت کا خاتمہ:

اس مسئلہ میں فقہاء کرام کے مختلف اقوال ہیں' حنفیہ' شافعیہ اور مالکیہ کے جمہور فقہاء کرام کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے دین موجل فوری واجب الاداء ہو جاتا ہے اور امام احمد بن حنبلؒ سے بھی ایک روایت اسی طرح منقول ہے' لیکن حنابلہ کے نزدیک مختار قول یہ ہے کہ اگر مدیون کے ورثاء اس دین کی توثیق کر دیں' اور اس کی ادائیگی پر اطمینان دلا دیں تو اس صورت میں وہ دین مدیون کی موت سے فوری واجب الاداء نہیں ہوتا' بلکہ وہ پہلے کی طرح موجل ہی رہے گا۔ علامہ ابن قدامہ رحمۃ اللہ کا بھی یہی مسلک ہے۔ (المغنی لابن قدامہ' 486:4' کتاب المفلس)

جہاں تک حنفیہ کا تعلق ہے' اگرچہ فقہاء کے مذہب کے مطابق ان کا اصل مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت کی وجہ سے فی الفور واجب الاداء ہوگا' لیکن متاخرین حنفیہ نے اس قول پر فتویٰ نہیں دیا ہے۔

مولانا تقی عثمانی لکھتے ہیں:

> "میرے نزدیک اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ اگرچہ جمہور فقہاء کا مسلک یہ ہے کہ مدیون کی موت سے وہ دین فی الفور واجب الاداء ہو جائے گا' لیکن بیع بالتقسیط" اور "مرابحہ موجلہ" جن میں ثمن کا کچھ حصہ "مدت" کے مقابلے میں بھی ہوتا ہے' اگر ان میں ہم "فوری واجب الاداء" والا قول لے لیں' تو اس صورت میں مدیون کے ورثاء کا نقصان ہے' لہٰذا مناسب یہ ہے کہ دو قولوں میں سے ایک قول کو اختیار کر لیا جائے: یا تو متاخرین حنفیہ کا یہ قول لے لیا جائے کہ اداء دین کی جو مدت متفق علیہ تھی' اس کے آنے میں جتنا ثمن آتا ہو' وہ وصول کر لیا جائے' یا پھر حنابلہ کا قول اختیار کرتے ہوئے جس طرح وہ دین موجل تھا' اب بھی اسی طرح موجل رہنے دیا جائے' البتہ اس کے لیے شرط یہ ہے کہ مدیون کے ورثاء کسی قابل اعتماد ذریعہ سے اس دین کی توثیق کر دیں' شاید حنابلہ کا یہ قول اختیار کرنا زیادہ بہتر ہے' اس لیے کہ مدتوں کے اختلاف کی وجہ سے ثمن میں جو تذبذب کی صورت ہوتی ہے' اور جس کی وجہ سے صورۃ سودی معاملات سے مشابہت ہو جاتی ہے وہ تذبذب اس صورت میں نہیں پایا جاتا ہے۔"

(قسطوں پر خرید و فروخت' محمد تقی عثمانی' صفحہ 92' مترجم مولانا عبداللہ میمن' میمن اسلامک پبلشرز کراچی)

حصص کی خرید و فروخت

سوال: حصص کی خرید و فروخت پر نوٹ لکھیں۔

حصص کی ابتداء (Beginning of Shares):

موجودہ دور کی تجارت میں حصص (شیئرز) کی تجارت ایک نیا اضافہ ہے۔ اس لیے قدیم فقہاء کی کتب میں اس کے بارے میں احکام اور تفاصیل معدوم ہیں۔ پہلے زمانہ میں جو "شراکت" کی جاتی تھی' وہ چند افراد کے مابین ہوتی تھی۔ جس کو "پارٹنرشپ" کہا جاتا ہے۔ مگر پچھلی دو تین صدیوں سے شراکت داری کا ایک نیا انداز سامنے آیا' جو جائنٹ اسٹاک کمپنی کہلایا' اس کے باعث کاروباری دنیا میں جدت آئی اور اس کے حصص (Shares) کے کاروبار کا نیا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس کی بنیاد پر دنیا بھر میں اسٹاک مارکیٹیں سرگرم عمل ہیں جن میں کروڑوں' بلکہ اربوں کا لین دین ہوتا ہے۔

حصص کی حقیقت (Reality of Shares):

کمپنی کے شیئرز کو اردو میں "حصص" اور عربی میں "سہم" کہتے ہیں' یہ شیئرز دراصل کسی کمپنی کے اثاثہ جات میں شیئرز ہولڈر (Share holder) کی ملکیت کے ایک متناسب حصے کی نمائندگی کرتا ہے۔ کمپنی کا شیئر سرٹیفکیٹ کمپنی میں شیئر ہولڈر کی ملکیت کی نمائندگی کرتا ہے۔ کمپنی بازار میں اپنے شیئرز فلوٹ (Float) کرتی ہے اور لوگوں کو مدعو کرتی ہے کہ وہ شیئرز خریدیں' تو جو شخص بھی ان شیئرز کو خریدتا ہے' وہ دراصل اس کمپنی کے کاروبار میں حصہ دار بن جاتی ہے۔

نئی کمپنی کے حصص کا حکم بمطابق شریعت اسلامیہ:

جب کسی کمپنی کے حصص ابتداء میں جاری ہو رہے ہوں' اس وقت ان کو ایک شرط کے ساتھ لینا جائز ہے وہ یہ کہ کمپنی مذکورہ کوئی حرام کاروبار مثلاً شراب کی تیاری' سودی بینکاری' انشورنس کمپنی کا قیام وغیرہ نہ کر رہی ہو۔ لیکن بنیادی طور پر حلال کاروبار مثلاً ٹیکسٹائل کمپنی یا آٹوموبائل کمپنی ہو تو کمپنی مذکورہ کے حصص خریدنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

حصص کی خرید و فروخت کی شرائط کا بیان:

اگر کسی شخص کو "اسٹاک مارکیٹ" سے حصص خریدنے ہوں تو اسے مندرجہ ذیل چار شرائط کا لحاظ رکھنا ہوگا۔

پہلی شرط: یہ کہ وہ کمپنی حرام کاروبار میں ملوث نہ ہو' مثلاً سودی بنک' سود اور قمار پر مبنی انشورنس کمپنی' شراب کا کاروبار یا دیگر حرام کاموں کی کمپنی وغیرہ۔

دوسری شرط: یہ کہ اس کمپنی کے تمام اثاثہ جات اور املاک سیال اثاثہ جات (Liquie Assets) یعنی نقد رقم کی صورت میں نہ ہوں بلکہ اس کمپنی نے کچھ فکسڈ اثاثے (Fixed Assets) حاصل کر لیے ہوں مثلاً عمارت تعمیر کر لی ہو یا ارضی خرید لی ہو۔ لہٰذا اگر اس کمپنی کا کوئی فکسڈ اثاثہ وجود میں نہیں آیا بلکہ اسکے تمام اثاثے ابھی سیال (Liquid) یعنی نقد رقم کی صورت میں ہیں تو اس صورت میں اس کمپنی کے حصص کو فیس ویلیو (Face Value) سے کم یا زیادہ میں فروخت کرنا جائز نہیں' بلکہ برابر برابر خریدنا ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس صورت میں دس روپے کا حصہ (شیئر) دس روپے ہی کی نمائندگی کر رہا ہے' بالکل ویسے ہی جیسے دس روپے کا بانڈ (Bond) دس روپے ہی کی نمائندگی کرتا ہے' لہٰذا جب دس روپے کا شیئر دس روپے ہی کی نمائندگی کر رہا ہے تو اس شیئر کو گیارہ روپے' یا نو روپے میں خرید و فروخت کرنا جائز نہیں' اس لیے کہ یہ عمل سود ہونے کی وجہ سے قطعاً ناجائز ہے۔

لیکن اگر کمپنی کے اثاثے منجمد ہیں' مثلاً کمپنی نے خام مال یا تیار مال یا مشینری خرید لی ہے یا عمارت تعمیر کر لی ہے تو اس صورت میں دس روپے کے اس شیئر کو کمی یا بیشی پر فروخت کرنا جائز ہے۔ اس کی وجہ ایک فقہی اصول ہے کہ جب سونے کو سونے سے فروخت کیا جائے' یا چاندی کا چاندی سے تبادلہ کیا جائے تو برابر برابر ہونا ضروری ہے۔ لیکن بعض چیزیں مرکب ہوتی ہیں' مثلاً سونے کا ہار ہے اور اس میں موتی بھی جڑے ہوئے ہیں' تو اب سونے کے بارے میں یہ حکم ہے کہ وہ بالکل برابر کر کے خریدنا اور فروخت کرنا ضروری ہے' مگر یہ حکم موتیوں سے متعلق نہیں ہے' اس لیے دس موتیوں کے بدلے بارہ موتی لینا جائز ہے' لہٰذا اگر ایسا ہار خریدنا ہو جو سونے اور موتی سے مرکب ہے' تو اس کی صورت یہ ہے کہ اس ہار میں جتنا سونا ہے' اس سے تھوڑا سا زیادہ سونا دے کر اس کو خریدنا درست ہے۔

اسی طرح اگر کمپنی کے کچھ اثاثے نقد روپے کی شکل میں ہوں' اور کچھ اثاثے منجمد یا خام مال (Raw Material) کی شکل میں ہوں تو وہاں بھی فقہ کا یہی اصول منطبق ہوتا ہے۔ جس کمپنی کا ابھی تک کوئی وجود نہیں ہے۔ لیکن اسٹاک مارکیٹ میں اس کے شیئرز کی خرید و فروخت شروع ہو جاتی ہے۔ جیسے پروویژنل لسٹڈ کمپنی (ProvisionalListed Company) ہوتی ہے' اور بالعموم اس کمپنی کا ابھی تک وجود نہیں ہوتا۔ ایسی کمپنی کے شیئرز کو بھی کمی یا زیادتی پر فروخت کرنا جائز نہیں۔

الغرض دوسری شرط کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک کسی کمپنی کے منجمد اثاثے وجود میں نہ آ جائیں' اس وقت تک اس کے شیئرز کو کمی بیشی پر فروخت کرنا ناجائز ہے۔

تیسری شرط: اکثر کمپنیوں کے بنیادی کاروبار حرام تو نہیں ہیں' مثلاً ٹیکسٹائل' آٹو موبائل کمپنیاں وغیرہ۔ لیکن یہ کمپنیاں کسی نہ کسی طرح سودی کاروبار میں ملوث ہوتی ہیں' یعنی یا تو یہ کمپنیاں فنڈ بڑھانے کے لیے بنک سے سود پر قرض لیتی ہیں' اور اس قرض سے اپنا کام چلاتی ہیں' یا پھر وہ زائد اور فاضل رقم سودی اکاؤنٹ میں رکھوائی ہیں اور اس پر وہ بنک سے سود حاصل کرتی ہیں' وہ سود بھی ان کی آمدنی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسی کمپنی کے شیئرز خریدنا سودی کاروبار میں ملوث ہونا ہے۔

ایسی کمپنیوں کے بارے میں عصر حاضر کے علماء کرام کی آراء مختلف ہیں۔ایک گروہ کے نزدیک چونکہ یہ کمپنیاں حرام کاموں میں ملوث ہیں' لہٰذا ایک مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اس کمپنی کے ساتھ حرام کام میں حصہ دار بنے۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ اگرچہ ان کمپنیوں میں یہ نقص موجود ہے' مگر اس کے باوجود اگر کسی کمپنی کا بنیادی کاروبار مجموعی طور پر حلال ہے' تو پھر مشروط طور پر اس کمپنی کے شیئرز لینے کی گنجائش ہے۔یعنی وہ شیئر ہولڈر اس کمپنی کے اندر سودی کاروبار کے خلاف آواز ضرور اٹھائے' اگرچہ اس کی آواز مسترد ہو جائے' یہ آواز کمپنی کے سالانہ اجلاس عام میں اٹھانی چاہیے۔مولانا محمد تقی عثمانی' مفتی محمد شفیعؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ اسی رائے پر متفق ہیں۔

چوتھی شرط: یہ کہ جب منافع (Dividend) تقسیم ہو تو وہ شخص انکم اسٹیٹ منٹ (Income Statement) کے ذریعے یہ معلوم کرے کہ آمدنی کا کتنا حصہ سودی ڈیپازٹ سے حاصل ہوا ہے' مثلاً اس کمپنی کو کل آمدنی کا پانچ فیصد حصہ سودی ڈیپازٹ میں رقم رکھوانے سے حاصل ہوا ہے' تو اب وہ شخص (شیئر ہولڈر) اپنے نفع کا پانچ فیصد حصہ صدقہ کردے۔

شیئرز خریدنے کے مقاصد اور ان کا جواز:

آج کل اسٹاک مارکیٹ میں شیئرز کے سودے دو مقاصد کے تحت ہوتے ہیں:

(1) بعض لوگ سرمایہ کاری (انویسٹمنٹ) کے لیے شیئرز خریدتے ہیں' ان کا مقصد شیئرز خرید کر کسی کمپنی کا حصہ دار بننا اور پھر گھر بیٹھے اس کا سالانہ منافع حاصل کرنا ہوتا ہے۔ایسے لوگوں کے لیے مذکورہ بالا چار شرائط کے ساتھ شیئرز خریدنا جائز ہے۔

(2) بعض لوگ شیئرز کی خرید و فروخت ''کیپٹل گین'' (Capital Gain) کے لیے کرتے ہیں۔وہ کمپنی کے شیئرز خرید لیتے ہیں اور پھر چند روز بعد شیئرز کی قیمت بڑھنے پر انہیں فروخت کر کے نفع حاصل کر لیتے ہیں۔اور یا کسی کمپنی کے شیئرز کی قیمت کم ہو جاتی ہے تو اس کے شیئرز خرید لیتے ہیں اور بعد میں فروخت کر دیتے ہیں۔اسی طرح خرید و فروخت کے ذریعے سے نفع حاصل کرنا ان کا مقصود ہوتا ہے' اس کمپنی میں حصہ دار بننا اور اس کا سالانہ منافع حاصل کرنا ان کا مقصود نہیں ہوتا' بلکہ خود شیئرز ہی کو ایک سامان تجارت بنا کر اس کا لین دین کرتے ہیں۔

جس طرح شیئرز خریدنا جائز ہے اسی طرح انہیں فروخت کرنا بھی جائز ہے۔بشرطیکہ پیچھے مذکور چار شرائط کا لحاظ رکھا گیا ہو' اور جس طرح یہ جائز ہے کہ ایک چیز آپ آج خرید کر کل فروخت کر دیں' اور کل خرید کر پرسوں فروخت کر دیں بالکل اسی طرح شیئرز کی بھی خرید و فروخت جائز ہے۔

(فقہی مقالات: مولانا محمد تقی عثمانی' مترجم مولانا محمد عبداللہ میمن' 2012ء
مطبوعہ میمن اسلامک پبلشرز' صفحہ 141 تا 152)

فرق برابر کرنا سٹہ بازی ہے اور شرعاً حرام ہے:

شیئرز کی خرید وفروخت کو اس وقت درست کہنا دشوار ہے جب بعض اوقات اسٹاک مارکیٹ میں شیئرز کا لین دین بالکل مقصود نہیں ہوتا' بلکہ آخر میں جا کر آپس کا فرق (Difference) برابر کر لیا جاتا ہے' اور شیئرز پر نہ تو قبضہ ہوتا ہے اور نہ ہی قبضہ پیش نظر ہوتا ہے۔ لہٰذا جہاں یہ صورت ہو کہ قبضہ بالکل نہ ہو اور شیئرز کا نہ لینا مقصود ہو اور نہ دینا مقصود ہو' بلکہ اصل مقصد یہ ہو کہ اس طرح سٹہ بازی کر کے آپس میں فرق کو برابر کر لینا مقصود ہو تو یہ صورت بالکل حرام ہے' اور شریعت میں اس کی گنجائش نہیں۔

شیئرز کی حوالگی سے قبل آگے فروخت کرنے کا جواز:

بعض اوقات ایک شخص شیئرز خرید لیتا ہے لیکن ابھی تک اس شیئرز پر قبضہ اور حوالگی (Delivery) نہیں ہوتی' اس سے قبل وہ ان شیئرز کو آگے فروخت کر دیتا ہے۔ اس عمل کے جائز یا ناجائز ہونے سے متعلق اصول یہ ہے کہ جس چیز کو ہم نے خریدا ہے' اس چیز پر قبضہ کرنے سے پہلے اس کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں' لیکن قبضہ کے اندر ہمیشہ حسی قبضہ (Physical Possession) ضروری نہیں ہوتا۔ بلکہ حکمی قبضہ (Constructive Possession) بھی اگر ہو جائے یعنی وہ چیز ہمارے ضمان (Risk) میں آ جائے تو اس کے بعد بھی اس چیز کو آگے فروخت کرنا جائز ہے۔

شیئرز کا قبضہ (Delivery):

شیئرز سرٹیفکیٹ کا نام "شیئر" نہیں' بلکہ "شیئر" اس ملکیت کا نام ہے جو اس کمپنی کے اندر ہے۔ اور یہ سرٹیفکیٹ اس ملکیت کی علامت' اس کا ثبوت اور اس کی شہادت ہے۔ لہٰذا اگر ایک شخص کی ملکیت تو اس کمپنی میں ثابت ہو گئی لیکن اس کو ابھی تک سرٹیفکیٹ نہیں ملا' تب بھی شرعی اعتبار سے یہ کہا جائے گا کہ وہ شخص اس کا مالک ہو گیا۔

رسک (ضمان) کی منتقلی کافی ہے:

اگر اسٹاک مارکیٹ سے شیئر خریدا جائے اور اس کی وصولیابی یا قبضہ سے پہلے ہی وہ کمپنی تباہ ہو کر بے اثاثہ ہو جائے تو سوال یہ ہے کہ یہ نقصان کس کا ہوا؟ اگر نقصان شیئر خریدنے والے کا ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شیئر کا ضمان (رسک) خریدار نے لے لیا' اس صورت میں وہ اس کو آگے فروخت کر سکتا ہے' اور اگر نقصان شیئر ہولڈر (خریدار) کے بجائے بیچنے والے کا ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس شیئر کا رسک خریدار کی طرف منتقل نہیں ہوا تھا۔ اس صورت میں خریدار کا اس شیئر کو آگے فروخت کرنا جائز نہیں' جب تک کہ وہ شیئر سرٹیفکیٹ پر قابض نہ ہو جائے۔

اصول یہ ہے کہ رسک منتقل ہونے کی صورت میں شیئر آگے فروخت کرنا جائز ہے' البتہ احتیاط کا تقاضا بہر صورت یہی ہے کہ جب تک قبضہ (ڈلیوری) نہ مل جائے اس وقت تک شیئر آگے فروخت نہ کیا جائے۔

''بدلہ'' کا سودا ناجائز ہے:

اسٹاک ایکسچینج میں شیئرز کی خرید وفروخت کی ایک صورت یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کو پیسوں کی احتیاج ہے اور اس کے پاس شیئرز موجود ہیں۔ وہ شخص دوسرے کے پاس وہ شیئرز لے کر جاتا ہے' اور اس سے کہتا ہے کہ میں یہ شیئرز آج آپ کو اتنی قیمت پر فروخت کرتا ہوں' اور ایک ہفتہ کے بعد میں قیمت بڑھا کر اتنے میں خریدلوں گا۔ گویا کہ فروخت کرتے وقت یہ شرط ہوتی ہے کہ یہ شیئرز قیمت بڑھا کر واپس کرنے ہوں گے۔ دوسرے شخص کو آپ فروخت نہیں کر سکتے۔

شرعی اعتبار سے یہ صورت جائز نہیں ہے۔ کیونکہ فقہ کا اصول ہے کہ کسی بھی بیع کے اندر ایسی شرط لگانا جو مقتضائے عقد کے خلاف ہو' جائز نہیں۔ اور خصوصاً قیمت بڑھا کر واپس لینے کی شرط لگانا حرام ہے' اور یہ شرط فاسد ہے۔ لہٰذا ''بدلہ'' کی یہ صورت خالصتاً سود ہی ہے' شرعاً اس کی اجازت نہیں۔

شیئرز پر زکوٰۃ کے مسئلے کی صراحت:

شیئرز دراصل اس حصے کی نمائندگی کرتے ہیں جو کمپنی کے اندر ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے شیئرز صرف اس غرض سے خریدے ہیں کہ انہیں فروخت کر کے نفع حاصل کرے یعنی اس کا مقصود ''کیپٹل گین'' (Capital Gain) ہو اور ان شیئرز کا سالانہ منافع وصول کرنا مقصود نہیں' تو اس صورت میں ان شیئرز کی مارکیٹ قیمت کے حساب سے اس پر زکوٰۃ واجب ہے۔ لیکن اگر خریدتے وقت اس کا مقصود کیپٹل گین (Capital Gain) نہیں تھا' بلکہ اصل مقصد سالانہ منافع (Dividend) حاصل کرنا تھا اور ساتھ میں یہ بھی خیال تھا کہ اگر اچھا منافع ملا' تو شیئرز بیچ بھی دیں گے' تو ایسی صورت میں زکوٰۃ اس شیرز کی مارکیٹ قیمت کے اس حصے پر واجب ہوگی جو قابل زکوٰۃ اثاثہ جات کے مقابل میں ہوگی۔

مثلاً شیئرز کی مارکیٹ قیمت 100 روپے ہے جس میں سے 60 روپے عمارت اور مشینری وغیرہ کے مقابل میں ہیں اور 40 روپے خام مال' تیار مال اور نقد روپے کے مقابلے میں ہے' تو اس صورت میں چونکہ ان شیئرز کے 40 روپے قابل زکوٰۃ حصوں کے مقابلے میں ہیں۔ اس لیے 40 روپے کی زکوٰۃ ڈھائی فیصد کے حساب سے واجب ہوگی۔ 60 روپے کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی۔

(فقہی مقالات: مولانا مفتی تقی عثانی' صفحہ 153 تا 156)

☆☆..........☆☆..........☆☆

حقوق مجردہ کی خرید وفروخت

سوال: حقوق مجردہ کی خرید وفروخت پر نوٹ لکھیں۔

حقوق مجردہ کی صراحت (Explanation of Personal Rights):

حقوق مجردہ دراصل شخصی حقوق ہیں۔ جو کئی انواع کے جنم لے چکے ہیں اور جو درحقیقت ''اعیان'' نہیں ہیں۔ مگر بازاروں میں خرید وفروخت کے ذریعے سے ان کا لین دین رائج ہے۔ وضعی قوانین نے ان میں سے بعض حقوق کو بیچنے کی اجازت دی ہے اور بعض کی فروختگی (Sale) ممنوع قرار دی ہے' مگر بازار اس طرح کے امور سے معمور ہیں' مثلاً مکانات اور دکانوں کی پگڑی' مخصوص تجارتی نام یا ٹریڈ مارک یا تجارتی لائسنس کا استعمال' ذہنی' ادبی' فنی ملکیت کے حقوق (Intellectual Rights) وغیرہ۔ یہ تمام حقوق موجودہ تجارتی دنیا میں ملکیت ٹھہرائے جاتے ہیں اور بالکل اعیان اور مادی اموال کی طرح ان کی بھی خرید وفروخت ہوتی ہے' انہیں کرایہ پر دیا جاتا ہے' ہدیہ کیا جاتا ہے' ان میں میراث جاری ہوتی ہے۔ اس عمل کے شرعی جواز کا مسئلہ وسیع اور ہمہ گیر شکل میں قدیم فقہاء کے دور میں موجود نہ تھا۔ لہٰذا قدیم کتب فقہ میں دورِ حاضر کی ان جزئیات کی دستیابی نہیں ہے' البتہ قدیم فقہاء نے بہت سے ان حقوق اور ان کا عوض لینے کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ بعض حضرات نے حقوق مجردہ کے عوض کو ناجائز اور بعض نے جائز قرار دیا ہے۔

حقوق مجردہ کی انواع (Kinds of Personal Rights):

فقہاء نے جن حقوق کا عوض لینے پر بحث کی ہے' ان کی دو انواع ہیں:

(1) شرعی حقوق: یہ وہ حقوق ہیں جو شارع کی طرف سے ثابت ہیں اور ان کے ثبوت میں قیاس کا کوئی دخل نہیں۔

(2) عُرفی حقوق: یہ وہ حقوق ہیں جو عُرف کی بنا پر ثابت ہیں اور شریعتِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان حقوق کو تسلیم کیا ہے۔

پھر ان دونوں کی دو دو قسمیں ہو جاتی ہیں:

اول: وہ حقوق جن کی مشروعیت (Validity) اصحاب حقوق سے ضرر دفع کرنے کے لیے ہوتی ہے۔

دوم: وہ حقوق جو اصالتاً مشروع (Valid) ہوتے ہیں۔

اصالتاً مشروع حقوق کی چند انواع ہیں:

(i) وہ حقوق جو اشیاء میں دائمی منافع سے عبارت ہیں' مثلاً حق مرور (راستہ چلنے کا حق)' حق شرب (پانی

لینے کا حق) حق تسییل (پانی بہانے کا حق) وغیرہ۔

(ii) وہ حقوق جو کسی مباح الاصل چیز پر کسی شخص کا پہلے قبضہ کرنے کے باعث حاصل ہوں' انہیں ''حق اسبقیت'' یا ''حق اختصاص'' کہا جاتا ہے۔

(iii) وہ حقوق جو کسی شخص کے ساتھ کوئی عقد کرنے یا کسی موجود عقد کو باقی رکھنے کی صورت میں حاصل ہوتے ہیں' مثلاً زمین' مکان یا دکان کو کرایہ پر دینے کا حق' یا وقف کے وظائف میں سے کسی وظیفہ کو باقی رکھنے کا حق۔

ان حقوق کا عوض لینا دو طریقوں سے ممکن ہے:

اولاً یہ کہ فروختگی کے ذریعہ عوض لیا جائے۔ جس کی صورت یہ ہوگی کہ بائع اپنی مملوکہ چیز کو اس کے تمام مقتضیات کے ساتھ مشتری (خریدار) کی طرف منتقل کردے گا۔

ثانیاً یہ کہ صلح اور دست برداری کے طور پر عوض لیا جائے۔ اس صورت میں دست بردار ہونے والے کا حق تو ختم ہوجاتا ہے لیکن محض اس کے دست بردار ہونے سے اس شخص کی طرف حق منتقل نہیں ہوتا۔ جس کے حق میں وہ دستبردار ہو' لیکن جس شخص کے حق میں دست برداری ہوئی ہے اس کے مقابلہ میں دست بردار ہونے والے کی مزاحمت ختم ہوجاتی ہے۔

حقوق شرعیہ:

حقوق شرعیہ وہ حقوق ہیں جن کا ثبوت شارع کی طرف سے ہوا ہے' قیاس کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ ان کی دو قسمیں حقوق ضروریہ اور حقوق اصلیہ ہیں۔

حقوق ضروریہ:

وہ حقوق جو اصالتاً ثابت نہیں ہوئے ہیں بلکہ اصحاب حقوق سے ضرر دور کرنے کے لیے ان کی مشروعیت ہوئی ہے' حقوق ضروریہ کہلاتے ہیں۔ ان کی ایک مثال حق شفعہ (Right of Pre-emption) ہے۔ یہ اصالتاً ثابت ہونے والا حق نہیں ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ بائع اور مشتری نے باہمی رضامندی سے جب کوئی بیع کی تو کسی تیسرے شخص کو ان دونوں کے درمیان مداخلت کا حق حاصل نہیں ہے لیکن شریعت نے شریک جائیداد' شریک حقوق جائیداد اور ہمسایہ کو دفع ضرر کے لیے حق شفعہ دیا ہے۔ اسی طرح شوہر کی باری میں بیوی کا حق بھی بیوی سے دفع ضرر کے لیے ہے ورنہ شوہر کو اختیار ہے کہ اپنی بیوی سے جب چاہے متمتع ہو۔ بچے کی پرورش کا حق' یتیم کی ولایت کا حق اور اختیار طلاق کا حق بھی حقوق ضروریہ کے زمرے میں آتے ہیں۔

حقوق ضروریہ کا حکم یہ ہے کہ کسی بھی طریقے سے ان کا عوض لینا جائز نہیں' نہ تو فروختگی کے ذریعہ' نہ صلح کے ذریعے نہ دستبرداری کے ذریعہ۔

اس کی عقلی دلیل یہ ہے کہ یہ حقوق اصحاب حقوق کے لیے اصالتاً ثابت نہیں ہوئے ہیں بلکہ دفع ضرر

کے لیے مشروع ہوئے ہیں' جب صاحب حق اپنا حق کسی دوسرے کو دینے یا دوسرے کے لیے دستبردار ہونے پر آمادہ ہوگیا تو یہ بات ظاہر ہوئی کہ اس حق کے نہ ہونے سے اسے کوئی ضرر لاحق نہیں ہوگا' لہٰذا یہ معاملہ اصل کی طرف لوٹ جائے گا اور یہاں اصل اس کے لیے حق ثابت نہ ہونا ہے۔ لہٰذا اس کے لیے عوض کا مطالبہ جائز نہیں ہے۔ مثلاً حق شفعہ میں شفیع اگر عوض لے کر حق شفعہ سے دستبردار ہوگیا تو یہ بات منکشف ہوئی کہ جو بیع اس کے لیے حق شفعہ کے ثبوت کا سبب بنی اس میں اس کا کوئی ضرر نہیں ہے' لہٰذا اس بیع کو ختم کرنے کے سلسلے میں اس کا حق ختم ہوگیا' اب اس پر مال لینا اس کے لیے جائز نہیں ہوگا۔

اسی طرح بیوی کا باری حق اس سے دفع ضرر کے لیے ہے' جب وہ بیوی اس سے دستبردار ہوگئی تو معلوم ہوا کہ باری ترک کرنے سے اسے کوئی ضرر نہیں پہنچا' لہٰذا اس کے لیے اس دستبرداری پر عوض لینا جائز نہیں ہے۔

حقوق اصلیہ: حقوق شرعیہ کی دوسری قسم وہ حقوق ہیں جو صاحب حقوق کے لیے اصالتاً ثابت ہوئے ہیں' دفع ضرر کے طور پر ان کی مشروعیت نہیں ہوئی ہے' مثلاً حق قصاص' نکاح کو باقی رکھ کر شوہر کا بیوی سے متمتع ہونے کا حق' حق میراث وغیرہ۔

اس قسم کے حقوق کا حکم یہ ہے کہ بیع کے طریقہ پر تو ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے' یعنی اس کی گنجائش نہیں کہ خریدار کی طرف وہ حق منتقل ہو جائے اور بائع کو جو استحقاق تھا وہی خریدار کی طرف منتقل ہو جائے' لہٰذا مقتول کے ولی کے لیے جائز نہیں کہ قصاص لینے کا حق کسی کے ہاتھ بیچ دے اور ولی کے بدلے اس دوسرے شخص کو قصاص لینے کا حق حاصل ہو جائے' اسی طرح یہ بھی جائز نہیں کہ شوہر اپنا حق تمتع کسی دوسرے کے ہاتھ بیچ دے اور دوسرا شخص اس کی بیوی سے متمتع ہو' اور کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنا حق میراث دوسرے شخص کے ہاتھ فروخت کردے کہ وارث حقیقی کے بدلے میں وہ دوسرا شخص میراث کا حق دار ہو جائے۔ اس لیے کہ شارع نے یہ حقوق مخصوص شخص کے لیے مخصوص صفت کے ساتھ ثابت کیے ہیں۔

دیگر الفاظ میں یہ حقوق شرعاً قابل انتقال نہیں ہوتے۔ لہٰذا نہ ان کی بیع ہوسکتی ہے نہ ہبہ' نہ میراث جاری ہوتی ہے۔ اس لیے فروختگی اور مبادلہ کے طور پر ان کا عوض لینا جائز نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ولاء کی فروختگی اور ہبہ کرنے سے منع فرمایا۔

(اخرجه البخاري في العتق' باب بيع الولاء وهبته)

البتہ صلح اور دستبرداری کے ذریعہ سے ان حقوق کا معاوضہ لینا جائز ہے۔ اس کی صورت یہ ہوگی کہ صاحب حق اپنا حق استعمال نہ کرے اور اس شخص سے مال لے لے جسے اس حق کے استعمال سے نقصان پہنچتا' مثلاً مقتول کے جس ولی کو حق قصاص حاصل ہے' اس کے لیے جائز ہے کہ قاتل سے مال لے کر صلح کرلے' یہ مال صاحب حق کے اپنا حق استعمال کرنے سے رکنے کا بدلہ ہے' اور قاتل یہ مال اپنے آپ کو موت کے ضرر سے بچانے کے لیے صرف کر رہا ہے' یہ صلح قرآن وسنت کے نصوص اور اہل علم کے اجماع کی بناء پر جائز ہے۔

اسی طرح شوہر کو یہ حق ہے کہ بیوی کے ساتھ رشتہ نکاح باقی رکھ کر اس سے متمتع ہو لیکن شوہر عورت کی

طرف سے دیئے جانے والے مال کے بدلے میں اپنے حق کو استعمال کرنے سے باز آ جاتا ہے۔ جس طرح خلع کرنے اور مال کی شرط کے ساتھ طلاق دینے میں ہوتا ہے' ایسا کرنا نص قرآنی اور اجماع امت کی رو سے جائز ہے۔

حقوق ضروریہ اور حقوق اصلیہ کے درمیان یہ فرق فقہائے احناف میں سے بیری نے شرح الشباہ والنظائر میں ذکر کیا ہے (مخطوط صفحہ 62, 63) اور ابن عابدین نے بیری کی بحث کا خلاصہ "رد المختار لابن عابدین" 16:4 میں نقل کیا ہے۔ جو کہ مندرجہ ذیل ہے:

"اس کا حاصل یہ ہے کہ شفیع کے لیے حق شفعہ کا ثبوت' بیوی کے لیے قسم (باری) کا حق' مخیرہ کا حق خیار یہ سب حقوق شفیع اور عورت کے اور مخیرہ سے ضرر دور کرنے کے لیے ہیں۔ اور جن حقوق کا ثبوت دفع ضرر کے لیے ہو' ان میں صلح صحیح نہیں ہوتی' اس لیے کہ جب صاحب حق صلح پر راضی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ اسے کوئی ضرر نہیں ہے۔ لہٰذا وہ کسی مال کا حقدار نہیں ہے' اس کے برعکس جس شخص کے لیے خدمت کی وصیت کی گئی تھی اس کا معاملہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے لیے حق خدمت کا ثبوت حسن سلوک اور صلہ رحمی کے طور پر ہوا ہے۔ لہٰذا اس کا یہ حق اصالتاً ثابت ہے۔ (نہ کہ دفع ضرر کے لیے)۔ اس بنا پر دوسرے کے لیے حق خدمت سے دستبردار ہو کر صلح کرنا درست ہوگا۔ اس کے مثل حق قصاص' حق نکاح اور حق رق کا حکم ہے کہ ان کا عوض لینا درست ہے کیونکہ یہ حقوق اصحاب حقوق کے لیے اصالتاً ثابت ہیں' دفع ضرر کے طور پر ثابت نہیں ہیں۔"

(ردالمختار لابن عابدین 16:4)

حقوق عرفیہ:

حقوق عرفیہ وہ شرعی حقوق ہیں جن کا ثبوت اصحاب حقوق کے لیے عرف و عادت کی بنا پر ہوتا ہے۔ یہ حقوق اس لحاظ سے شرعی ہیں کہ شریعت اسلامیہ نے عرف وتعامل کی بنا پر انہیں تسلیم کیا ہے' لیکن ان حقوق کا ماخذ عرف ہے' نہ کہ شریعت مثلاً راستہ میں چلنے کا حق' پانی لینے کا حق' پانی بہانے کا حق وغیرہ۔

فقہاء نے اس قسم کے جو حقوق بیان کیے ہیں' وہ یہ ہیں: (1) حق مرور۔ (2) حق تعلی (3) حق تسییل (4) حق شرب (5) دیوار پر لکڑی رکھنے کا حق (6) دروازہ کھولنے کا حق۔

فقہائے احناف کے مشہور قول کے مطابق یہ سارے حقوق' حقوق مجردہ ہیں جن کی بیع جائز نہیں۔ فقہاء مالکیہ' شافعیہ' حنابلہ رحمھم اللہ علیھم اجمعین کی کتب میں معروف یہ ہے کہ ان میں سے اکثر حقوق کا عوض لینا جائز ہے۔

اختلاف کی بنیاد بیع کی تعریف:

دراصل اس اختلاف کی بنیاد بیع کی تعریف ہے' جن لوگوں نے بیع کی تعریف اس طرح کی ہے "مال کا تبادلہ مال سے کرنا۔" اور مال کو عین (مادی محسوس چیز) کے ساتھ خاص کیا۔ انہوں نے حقوق مجردہ کی بیع کو

ناجائز کہا ہے کیونکہ حقوق مجردہ اعیان نہیں ہیں اور جن لوگوں نے بیع کی تعریف کو عام کر کے منافع کو بھی اس میں شامل کیا ہے انہوں نے حقوق مجردہ کی بیع کو جائز قرار دیا ہے۔

شوافع کا مذہب: فقہاء شافعیہ کے مطابق یہاں بیع کی تعریف میں منفعت کی دائمی بیع بھی شامل ہے۔ علامہ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ ہیثمی کے نزدیک ''بیع ایسا عقد ہے جس میں مال کا تبادلہ مال سے ہو آنے والی شرطوں کے ساتھ تاکہ متعین مادی چیز کی ملکیت یا اس سے ابدی منفعت حاصل ہو جائے۔'' علامہ شاطری کے مطابق ''لغت میں بیع ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ تبادلہ کا نام ہے لیکن اصطلاح شرع میں بیع کی تعریف یہ ہے: ''مالی معاوضہ کا عقد جس کے ذریعہ کسی چیز یا کسی منفعت پر دائمی ملکیت حاصل ہو جیسا کہ حق مرور اور دیوار پر لکڑیاں رکھنے کا حق اور سطح پر عمارت تعمیر کرنے کے حق کی بیع'' (الیاقوت النفیس فی ملھب ابن ادریس۔ صفحہ74)

ان فقہی عبارتوں سے یہ بات ظاہر ہے کہ دائمی منفعت کا حق فقہاء شافعیہ کے نزدیک مال ہے جس کی خرید و فروخت جائز ہے۔

حنابلہ کا مذہب: بہوتی کے بیان کے مطابق حنابلہ کے یہاں بیع کی تعریف یہ ہے:

> ''بیع ایک مالیت رکھنے والی چیز کا تبادلہ ہے یا مطلق مباح منفعت کا تبادلہ ہے جس کی اباحت کسی ایک حال کے ساتھ مخصوص نہ ہو (دوسری مالیت رکھنے والی چیز یا مطلق مباح منفعت سے) جیسے گھر کی گزرگاہ یا زمین کا وہ حصہ جس میں کنواں کھودا جائے۔ ان میں سے ایک کا دوسرے سے تبادلہ یعنی ایک طرف عین مالیت اور دوسری طرف منفعت مباحہ......... لہٰذا یہ تعریف ان تمام صورتوں کو شامل ہوگی۔ کتاب کا کتاب سے تبادلہ' کتاب کا حق مرور سے تبادلہ' حق مرور کا کتاب سے تبادلہ' ایک گھر کے حق مرور کا دوسرے گھر کے حق مرور سے تبادلہ''
>
> (شرح منتھی الارادات' صفحہ 140 جلد 2)

علامہ مرداوی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق ''الوجیز میں لکھا ہے کہ ''بیع'' مالیت رکھنے والی چیز یا مباح منفعت کا دائمی طور پر مالی عوض کے بدلے میں مالک بنا دینے کا نام ہے۔'' اس تعریف پر ربا اور قرض کے ذریعہ اعتراض وارد ہوتا ہے: خلاصۂ کلام یہ ہے کہ کوئی تعریف اعتراض سے خالی نہیں ہے' میں کہتا ہوں کہ اگر اس طرح تعریف کی جائے کہ بیع کسی چیز یا مطلق مباح منفعت کا ربا اور قرض کے بغیر کسی دوسری چیز یا مطلق مباح منفعت کے بدلے دائمی طور پر مالک بنا دینا ہے'' ''تو اعتراض وارد نہ ہوگا''

(الانصاف فی معرفۃ الراجح من الخلاف' للمرداوی' صفحہ 260' جلد 4)

مالکیہ کا مذہب: ابن عرفہ کے مطابق ''بیع ایسا عقد معاوضہ ہی جو منافع پر نہ کیا جائے اور نہ ہی لذت حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔'' (مواھب الجلیل للحطاب' صفحہ 225' جلد 4)۔ اس تعریف سے اجارہ داری اور کرایہ داری نکل جائے گی' کیونکہ ان دونوں میں منافع پر عقد ہوتا ہے' نکاح بھی اس تعریف سے خارج ہے' کیونکہ نکاح لذت حاصل کرنے کے لیے کیا جاتا ہے۔ اس تعریف کے ظاہری الفاظ اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مالکیہ کے نزدیک بیع مادی اشیاء ہی کی ہو سکتی ہے' منافع اور حقوق کی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس تعریف کے برخلاف

فقہا مالکیہ کے یہاں بعض ایسی بیوع کا جواز ملتا ہے جو حقوق اور منافع کی بیع پر منتہی ہوتی ہیں' چنانچہ مالکیہ کے یہاں حق تعلی کی بیع جائز ہے۔ اسی طرح دیوار پر لکڑی گاڑنے کے حق کی بیع بھی جائز ہے۔

(الدسوقی علی الشرح الکبیر صفحہ 13 جلد 3)

امام مالک کی المدونۃ الکبریٰ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے یہاں حق شرب کی بیع بھی جائز ہے۔

(المدونۃ الکبریٰ صفحہ 121, 122 جلد 10)

علامہ زرقانی رحمۃ اللہ علیہ نے منفعت کی بیع کو بھی بیع کی اقسام میں بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بیوع بیع کی جمع ہے' جمع اس واسطے لایا گیا کہ اس کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً عین کی بیع' دین کی بیع' منفعت کی بیع'' (شرح الزرقانی علی الموطا ص' صفحہ 250' جلد 3)

مختصر یہ کہ جن منافع کو ابن عرفہ نے بیع کی تعریف سے خارج کیا ہے وہ موقت منافع ہیں جن کو اجارہ یا کرایہ داری کہا جاتا ہے جہاں تک منافع موبدۃ (دائمی منافع) کا تعلق ہے تو اس کی بیع مالکیہ کے یہاں بھی جائز ہے۔

احناف کا مذہب: فقہائے احناف کے نزدیک بیع کی مشہور تعریف یہ ہے ''مال کا مال سے تبادلہ کرنا'' (البحر الرائق صفحہ 252 جلد 5)۔ بعض فقہاء نے یہ تعریف کی ہے ''ایک مرغوب چیز کا دوسری مرغوب چیز سے تبادلہ کرنا'' (بدائع الصنائع صفحہ 133' جلد 5) لیکن مرغوب شے سے مراد احناف کے یہاں مال ہی ہے کیونکہ علامہ کاسانی جنہوں نے بیع کی یہ تعریف کی ہے' دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ' بیع مال سے مال کے تبادلہ کا نام ہے'' (بدائع الصنائع' صفحہ 140 جلد 5) اسی طرح صاحب الدر المختار نے شرح ''ملتقی الابحر'' میں صراحت کی ہے کہ مرغوب چیز سے مال ہی مراد ہے۔ ابن عابدین کے نزدیک ''مال سے مراد وہ چیز ہے جس کی طرف طبیعت مائل ہو اور وقت ضرورت کے لیے اس کو ذخیرہ کرنا ممکن ہو اور مالیت تمام لوگوں یا بعض لوگوں کے مال بنانے سے ثابت ہوتی ہے اور ''تقوم'' مالیت بنانے کے ذریعہ بھی ثابت ہوتا ہے اور شرعاً اس سے انتفاع جائز ہونے سے بھی حاصل ہوتا ہے۔'' (ردالمختار' صفحہ 3' جلد 4)

الحاوی القدسی کے نزدیک ''مال اس غیر انسان کا نام ہے جو انسان کے مصالح کے لیے پیدا کیا گیا ہو اور اسے اپنی حفاظت میں لے لینا اور اس میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا ممکن ہو۔''

(ردالمختار' صفحہ 3' جلد 4)

ان دونوں تعریفوں میں سے کوئی تعریف ایسی نہیں ہے جو بیع کو اعیان میں منحصر کرتی ہو اور حقوق یا دائمی منافع کو صراحتاً بیع کی تعریف سے خارج کر دیتی ہو مگر علاء الدین حصکفیؒ کی تعریف بیع کو اعیان میں محدود کر دیتی ہے یعنی ''مال سے مراد وہ عین (مادی چیز) ہے جس کے بارے میں لوگوں کے درمیان رغبت اور حرص پائی جائے اور اس کا استعمال کیا جاتا ہو'' (الدر المنتقی' بہامش مجمع الانہر' صفحہ 3 جلد 2)

شیخ مصطفیٰ زرقائی نے ان تعریف پر تنقید کرتے ہوئے مال کی ایک دوسری تعریف کی ہے:

''مال ہر وہ عین ہے جو لوگوں کے درمیان مادی قیمت رکھتا ہو۔''

(الفقہ الاسلامی وادلتہ لوھبۃ الزحیلی' صفحہ 335' جلد 4)

ان دونوں تعریفوں کا تقاضا یہ ہے کہ مال مادی چیزوں میں محدود ہو منافع اور حقوق مجردہ کو شامل نہ ہو۔ اسی لیے فقہائے احناف نے منافع اور حقوق کی بیع جائز نہ ہونے کی صراحت کی ہے۔ فقہائے احناف نے صراحتاً لکھا ہے کہ حق تعلی کی بیع جائز نہیں۔ صاحب ہدایہ کے نزدیک "کیونکہ حق تعلی مال نہیں ہے اس لیے کہ مال وہ ہے جس کی احراز ممکن ہو۔" (فتح القدیر' صفحہ 204' جلد 5)

حق تسییل کے عدم جواز کی بھی احناف نے صراحت کی ہے۔ کسی حنفی فقیہہ کے یہاں حق تعلی اور حق تسییل کے جواز کا حکم نہیں ہے۔ (ردالمختار' صفحہ 132' جلد 4)

فقہائے احناف کے یہاں دو روایتیں حق مرور کی بیع کے بارے میں ہے۔ پہلی روایت زیادات کی ہے جس میں اس کو ناجائز اور دوسری روایت کتاب القسمة کی ہے جس میں حق مرور کی بیع کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ صاحب ہدایہ کے مطابق "راستہ کی بیع اور اس کا ہبہ جائز ہے اور پرنالے کی بیع اور ہبہ باطل ہے۔"

(فتح القدیر' صفحہ 205' جلد 5)

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "حق مرور زمین سے متعلق ہوتا ہے اور زمین ایک ایسا مال ہے جو مادی اور محسوس ہے۔ لہٰذا اس سے متعلق حق کو بھی عین کا حکم حاصل ہوگا۔ اس کے برعکس حق تعلی فضا سے تعلق رکھنے والا حق ہے اور فضا عین مال نہیں ہے۔" (فتح القدیر' صفحہ 206' جلد 5)

حق مرور کی بیع:

فقیہہ ابواللیث نے زیادات کی روایت کو صحیح قرار دیا ہے۔ جس میں حق مرور کی بیع کو ناجائز کہا گیا ہے' اس لیے کہ حقوق مجردہ کی بیع جائز نہیں ہوتی۔ لیکن "الدرالمختار" میں مذکور ہے کہ اکثر مشائخ نے جواز کی روایت کو اختیار کیا ہے۔ ابن عابدین کے مطابق "حق مرور اور حق تعلی جو ناجائز ہے ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ حق مرور ایسا حق ہے جو زمین سے متعلق ہے اور زمین عینی مال ہے' لہٰذا اس سے تعلق رکھنے والے حق کو بھی عین کا حکم حاصل ہوگا۔ اس کے برخلاف حق تعلی فضا سے متعلق ہے اور فضا عین مال نہیں ہے۔"

(درالمختار' صفحہ 132 جلد 4)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ متاخرین فقہاء احناف کے نزدیک راجح یہ ہے کہ حق مرور کی بیع جائز ہے کیونکہ حق مرور عین سے متعلق ہے۔ لہٰذا بیع کے جائز ہونے میں اسے بھی عین کا حکم حاصل ہو گیا۔

حق شرب کی بیع:

فقہائے احناف حق شرب کے بارے میں بھی مختلف آراء رکھتے ہیں۔ حنفی مسلک کی ظاہر روایت کے تحت حق شرب کی بیع ناجائز ہے۔ بہت سے مشائخ نے عرف کی بنیاد پر حق شرب کی بیع جائز قرار دی ہے۔ "رد المختار" وغیرہ میں عدم جواز پر فتویٰ ہے۔ لیکن بغور مشاہدہ سے پتہ چلتا ہے کہ جن فقہاء نے حق شرب کی بیع کا عرف قائم ہونے کے باوجود اس کے جواز سے منع کیا ہے۔ ان حضرات نے غرر اور جہالت کی وجہ سے منع کیا ہے۔ اس سبب سے نہیں کہ حق شرب مال نہیں۔ امام سرخسی رحمۃ اللہ علیہ کے مطابق حق شرب کی بیع فاسد ہے۔

(مبسوط السرخسی' صفحہ 135' جلد 1)

ابن ہمام رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک "شرب پانی کے ایک حصے کا نام ہے جس کی مقدار مجہول ہے۔ لہٰذا اس کی بیع جائز نہیں ہوگی۔ اسی لیے مشائخ بخارا نے مستقلاً اس کی بیع کو منع کیا ہے۔"

(فتح القدیر' صفحہ 205' جلد 5)

"بابرتی" کی عبارت یہ ہے "ظاہر الروایت میں تنہا "شرب" کی بیع کو جہالت کے باعث ناجائز کہا گیا ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ "شرب" مال نہیں ہے۔" (العنایۃ بہامش الفتح۔ صفحہ 204' جلد 5)

بعض متاخرین احناف (مثلاً خالد اتاسی رحمۃ اللہ علیہ) نے لکھا ہے کہ جن حقوق کی بیع جائز نہیں ہے مثلاً حق تعلو' حق تسییل' حق شرب' ان کا عوض لینا بطریق بیع تو جائز نہیں' لیکن از راہِ صلح ان کا عوض لینا جائز ہے۔

حق اسبقیت:

یہ حقوق عرفیہ کی دوسری قسم ہے اس سے مراد یہ ہے کہ مباح الاصل چیز پر سب سے قابض ہونے کے باعث انسان کو مالک بننے کا جو حق یا اس مال کے ساتھ جو خصوصیت حاصل ہوتی ہے اسی کو حق اسبقیت کہا جاتا ہے۔ مثلاً افتادہ زمین کو قابل استعمال بنانے سے مالک بننے کا حق حاصل ہو جاتا ہے۔

بعض فقہاء شافعیہ اور حنابلہ نے اس حق کی بیع کا مسئلہ بھی ذکر کیا ہے اور اس بات پر تو تمام فقہائے کرام کا اجماع ہے کہ انسان افتادہ اور بنجر زمین کو قابل استعمال بنانے سے اس کا مالک بن جاتا ہے۔ صرف افتادہ زمین میں پتھر گاڑنے سے انسان کو ملکیت حاصل نہیں ہوتی' البتہ حق تملک حاصل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ جس شخص نے کسی زمین میں پتھر وغیرہ گاڑ کر نشان لگایا وہ اس زمین کو قابل کاشت بنانے کا دوسروں کے مقابلے میں زیادہ حقدار ہے۔ فقہائے کرام شافعیہ کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ پتھر گاڑنے سے قابل کاشت بنانے کا جو حق انسان کو حاصل ہوتا ہے اس حق کی بیع جائز ہے یا نہیں؟"

حق اسبقیت کی بیع کے سلسلہ میں حکم شرعی کا خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ بعض فقہائے کرام اس بیع کو جائز کہتے ہیں لیکن فقہاء کی بڑی جماعت کی رائے اس کے عدم جواز کی ہے' البتہ حق اسبقیت سے مال لے کر صلح کے طریقہ سے دست بردار ہو جانا فقہائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔

حق عقد:

حق عقد سے مراد کسی دوسرے کے ساتھ عقد کو وجود میں لانے یا عقد کو باقی رکھنے کا حق ہے۔ مثلاً مکانات اور دوکانوں کو خالی کرنے کا حق' لہٰذا یہ مالک مکان یا مالک دکان کے ساتھ عقد اجارہ کو وجود میں لانے یا اس کو باقی رکھنے کا حق ہے' اسی طرح شاہی وظائف یا اوقاف کے وظائف کا حق' یہ حکومت یا وقف کے متولی کے ساتھ عقد اجارہ کو باقی رکھنے کا حق ہے۔ ان دونوں حقوق کا عوض لینے کے مسئلے پر فقہائے کرام نے کلام کیا ہے۔

[illegible] سے دستبرداری کا مسئلہ: اگر کسی آدمی کی اوقاف میں کوئی مستقل ملازمت ہو [illegible] تنخواہ [illegible] شرائط اوقاف کی بنیاد پر یہ ملازمت دائمی ہو' لہٰذا وہ ملازم اس ملازمت پر باقی رہنے کا [illegible] عقد اجارہ باقی [illegible] کے حق کا مالک [illegible] اس حق کا عوض لینے کے سلسلے میں فقہائے کرام نے کلام کیا

ہے۔ فرد خشکی کے ذریعہ سے اس حق کا عوض لینے کو کسی نے بھی جائز نہیں کہا ہے' لیکن دست برداری اور صلح کے ذریعہ اس کا عوض لینے کے سلسلے میں فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ بعض فقہائے کرام نے اس کے عوض لینے کو منع کیا ہے کیونکہ یہ مجرد حق ہے' جس کا عوض لینا جائز نہیں ہے اور بعض فقہاء نے اس کی اجازت دی ہے۔ متاخرین فقہاء احناف کی ایک جماعت نے مال کے بدلے میں وظائف سے دست برداری کے جواز کی صراحت کی ہے۔ علامہ ابن عابدین رحمۃ اللہ علیہ نے ذکر کیا ہے کہ حق کا عوض لینے کا عدم جواز مطلق نہیں ہے۔

(ردالمحتار' صفحہ 520' جلد 4)

متاخرین فقہاء شافعیہ نے بھی مال کے بدلہ میں وظائف سے دستبرداری کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ علامہ رملیؒ کے مطابق "والد رحمۃ اللہ علیہ نے مال کے بدلہ میں وظائف سے دست برداری کے جواز کا فتویٰ دیا تھا کیونکہ یہ بھی جعالۃ کی ایک قسم ہے۔ لہٰذا دست بردار ہونے والا شخص مال کا مستحق ہوگا اور اس کا حق ساقط ہو جائے گا۔" (نہایۃ المحتاج: 478' جلد 5)

شبراملسی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے حاشیہ میں اسے تسلیم کیا ہے بلکہ انہوں نے مال کے بدلہ میں "جوامک" سے دست بردار ہونے کا جواز بھی اسی پر متفرع کیا ہے۔ "جوامک" جامکیہ کی جمع ہے جامکیہ متعینہ رقم ہے جو کسی شخص کو بیت المال سے بطور عطیہ ملا کرتی ہے۔ احناف کے یہاں اس کی بیع جائز نہیں۔ لیکن شبراملسی" نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ حکم اوقاف کی دائمی ملازمتوں میں جاری ہوگا۔ حکومت کی ملازمتیں جن میں دوام نہیں ہوتا' ان کا عوض لینا جائز نہیں ہوگا۔ (حاشیہ الشبراملسی علیٰ نہایۃ المحتاج' صفحہ 478' جلد 6)

حنابلہ کے مطابق جس شخص نے وقف میں کوئی ملازمت حاصل کی وہ اس کا زیادہ حقدار ہے اور اسکے لیے یہ جائز ہے کہ دوسرے کے لیے اس حق سے دست بردار ہو جائے البتہ اس کے لیے اس حق کی بیع جائز نہیں۔

(الانصاف للمرداوی' صفحہ 76' جلد 6)

بہر حال اس بات میں فقہاء کے کلام کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک حق ملازمت کی بیع جائز نہیں لیکن جمہور فقہاء متاخرین اس بات کو جائز کہتے ہیں کہ صاحب ملازمت ایسے حق سے دست بردار ہو جائے اور اس شخص سے مال لے لے جس کے حق میں دست بردار ہوا ہے۔

فقہائے کرام کا اس امر پر اختلاف ہے کہ وہ شخص جس کے حق میں دست برداری ہوئی ہے وہ اس ملازمت کے لیے دست برداری ہی کی بنا پر متعین ہو جائے گا یا نہیں؟ ایک جماعت کا خیال یہ ہے کہ جس کے حق میں دست برداری ہوئی ہے وہ ملازمت کے لیے متعین نہیں ہوگا بلکہ متولی اوقاف کو اختیار ہوگا کہ اسے متعین کرے یا کسی اور کو متعین کرے۔ البتہ اگر متولی اوقاف اسے متعین نہ کرے تو اس صورت میں اس شخص نے دست بردار ہونے والے کو جو کچھ دیا تھا وہ اس سے واپس لینے کا حقدار نہیں ہوگا۔ کیونکہ دست بردار ہونے والے کے بس میں جو کچھ تھا اس نے کیا۔ یعنی وہ دست بردار ہو گیا' لہٰذا وہ مال کا حقدار ہو گیا' اسی کی صراحت شافعیہ میں سے رملی رحمۃ اللہ علیہ اور شبراملسی رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔ (نہایۃ المحتاج صفحہ 478' جلد 6)۔ اور حنفاف میں سے حموی

رحمۃ اللہ علیہ اور مفتی ابوالسعو د رحمۃ اللہ علیہ نے کی ہے۔

(شرح الاشباہ و النظائر للحموی' صفحہ 139 جلد 1)

مکانوں اور دکانوں کی پگڑی:

پگڑی کسی مکان یا دکان میں حق قرار کا نام ہے۔ بعض اوقات مالک مکان یا مالک دکان اپنا مکان یا دکان طویل مدت کے لیے کرایہ پر دیتا ہے اور کرایہ دار سے کرایہ داری طے کرتے وقت ماہانہ یا سالانہ کرایہ کے علاوہ ایک بڑی رقم یکمشت لیتا ہے۔ کرایہ دار یکمشت رقم دے کر اس بات کا حقدار ہو جاتا ہے کہ کرایہ داری طویل مدت تک یا تاحیات باقی رکھے۔ پھر بسا اوقات کرایہ دار اپنا حق کسی دوسرے کرایہ دار کی طرف منتقل کر دیتا ہے اور اس سے اس وقت کے مطابق رقم لیتے ہیں۔ مالک اگر کرایہ دار سے مکان یا دکان واپس لینا چاہیے تو اس کو بھی کرایہ دار کو اتنی رقم ادا کرنی ہوتی ہے جس پر دونوں راضی ہیں۔

اس یکمشت لیے جانے والی رقم کو پگڑی یا سلامی کہتے ہیں۔ اس کا حکم یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہ رشوت ہے کیونکہ جب ماہانہ کرایہ پر دکان لی اور اجارہ کی کوئی مدت طے نہیں کی تو مالک دکان کو اختیار اور حق ہے کہ وہ کسی بھی مہینے کرایہ دار سے دکان خالی کرنے کا مطالبہ کر دے یا اگر کسی مدت کے لیے لی ہو تو اس مدت کے پورا ہونے پر خالی کرنے کا مطالبہ کر سکتا ہے۔ اس میں کرایہ دار کا ضرر اور نقصان ہوتا ہے۔ دراصل اس ضرر اور نقصان سے بچنے کے لیے اور مالک دکان کے حق و اختیار میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے پگڑی دی جاتی ہے اور ایسا حق جو دفع ضرر کے لیے ہو اس پر کسی بھی صورت میں عوض لینا جائز نہیں ہے۔

(تجارت کے اسلامی اصول اور احکام' مرتبہ ڈاکٹر مفتی عبدالواحد'
دار الافتاء جامعہ مدنیہ' لاہور صفحہ 167 اشاعت جنوری 1999ء)

مولانا محمد تقی عثمانی کے بقول ''اس پگڑی کے بارے میں اصل حکم عدم جواز کا ہے کیونکہ یہ یا تو ''رشوت'' ہے یا ''حق مجرد'' کا عوض ہے۔ لیکن بعض فقہاء سے منقول ہے کہ انہوں نے اس کے جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ سب سے پہلے وہ فقیہہ جن کی طرف بدل خلو (پگڑی) کے جواز کی بات منسوب ہے دسویں صدی ہجری کے مالکی فقیہہ' علامہ ناصر الدین لقانی ہیں' اس کے بعد ایک بڑی جماعت نے اس مسئلہ میں ان کی اتباع کی ہے۔'' (فقہی مقالات: مفتی تقی عثمانی' صفحہ 208' مترجم مولانا محمد عبداللہ میمن' اشاعت 2012ء)

تجارتی نام اور تجارتی نشان (Trade Mark) کی بیع:

تاجروں کے عرف میں رجسٹریشن کے بعد تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں کی مادی قیمت ہوئی اور تاجران ان ناموں کو مہنگے داموں بیچنے اور خریدنے لگے کیونکہ انہیں ان سے یہ امید ہوتی ہے کہ ان کی وجہ سے لوگ ان کی مصنوعات کی خریداری کی طرف زیادہ راغب ہوں گے۔

جہاں تک ان کی بیع کے جائز یا ناجائز ہونے کا تعلق ہے تو اس ضمن میں مسئلہ یہ ہے کہ نام یا علامت مادی چیز نہیں ہے بلکہ یہ اس نام یا علامت کے استعمال کا حق ہے اور یہ حق اصالتاً صاحب حق کے لیے اسبقیت اور

حکومتی رجسٹریشن کی وجہ سے ثابت ہوا ہے۔ یہ حق فی الحال ثابت ہے مستقبل میں متوقع نہیں ہے' نیز یہ ایک ایسا حق ہے جو ایک شخص سے دوسرے شخص کی طرف منتقل ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ایسا حق نہیں ہے جو پائیدار مادی چیز کے ساتھ متعلق ہو' لہٰذا فقہاء کے کلام کی روشنی میں مناسب لگتا ہے کہ دست برداری کے طور پر اس کا عوض لینا جائز ہونا چاہیے' فروختگی کے ذریعہ جائز نہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ حق ثابت اور مادی چیز میں استقرار پانے والی منفعت نہیں ہے۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہی فتویٰ دیا ہے اور انہوں نے اس مسئلہ کو مال کے بدلہ میں وظائف سے دستبرداری کے مسئلہ پر قیاس کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "اور کارخانے کا نام بھی مشابہ حق وظائف کے ہے کہ "ثابت علیٰ وجہ الاصالۃ ہے نہ کہ دفع ضرر کے لیے' اور دونوں بالفعل امور اضافیہ سے ہیں اور مستقبل میں دونوں ذریعہ ہیں تحصیل مال کے' پس اس بناء پر اس عوض کے دینے میں گنجائش معلوم ہوتی ہے گو لینے والے کے لیے خلاف تقویٰ ہے مگر ضرورت میں اس کی بھی اجازت ہو جائے گی۔" (امداد الفتاویٰ' صفحہ 87' جلد 3)

کسی چیز میں مالیت پیدا کرنے کے لیے جو عناصر لازمی ہیں وہ سب تجارتی ناموں اور ٹریڈ مارکوں میں موجود ہیں۔ صرف اتنی بات ہے کہ ایسی مادی چیز نہیں جو قائم بالذات ہو۔ اس میں شرعاً کوئی مانع موجود نہیں ہے کہ ان کی خرید و فروخت کے جائز ہونے میں ان پر اموال کا حکم لگایا جائے لیکن اس جواز کی دو شرطیں ہیں:

1- پہلی شرط یہ ہے کہ وہ تجارتی نام یا ٹریڈ مارک حکومت کے یہاں قانونی طور پر رجسٹرڈ ہو کیونکہ جو نام ٹریڈ مارک رجسٹر نہیں ہوتا اسے تاجروں کے عرف میں مال نہیں شمار کیا جاتا۔

2- دوسری شرط یہ ہے کہ تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کی بیع سے صارفین کے حق میں التباس اور دھوکہ لازم نہ آئے۔ مثلاً اس کی صورت یہ ہو کہ خریدار کی طرف سے یہ اعلان کر دیا جائے کہ اب اس سامان کو بنانے والا وہ فرد یا وہ ادارہ نہیں ہے جو پہلے اس نام سے سامان تیار کرتا تھا۔

لہٰذا اس اعلان کے بغیر تجارتی نام یا ٹریڈ مارک کا دوسرے شخص کی طرف منتقل ہونا چونکہ صارفین کے حق میں التباس اور دھوکا کا باعث ہوگا اور التباس اور دھوکا حرام ہے' جو کسی حال میں بھی جائز نہیں۔

(فقہی مقالات' مفتی محمد تقی عثمانی' صفحہ 222' 223)

تجارتی لائسنس کی بیع (کاروباری اجازت نامہ کی فروختگی):

اس لائسنس کی حقیقت یہ ہے کہ موجودہ دور میں اکثر ممالک اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ حکومتی لائسنس کے بغیر سامان درآمد یا برآمد کیا جائے۔ ایک عمومی پابندی کی حالت میں کسی کو لائسنس مل جانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کو درآمد برآمد کرنے کا حق حاصل ہو گیا اور جو اس کو اصالتاً حاصل ہوا ہے۔ اگر لائسنس کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کے نام ہو اور قانون دوسری کمپنی کی طرف اس کی منتقلی کی اجازت نہ دیتا ہو ایسے لائسنس کی بیع جائز نہیں۔ البتہ اگر لائسنس کھلا ہو' کسی مخصوص فرد یا مخصوص کمپنی کے نام نہ ہو یا ہو تو کسی مخصوص نام پر لیکن دوسرے کو منتقل کرنے کی قانون میں اجازت ہو تو اس کو فروخت کیا جا سکتا ہے عرف و رواج کی بناء پر۔

(تجارت کے اسلامی اصول اور احکام' مرتبہ ڈاکٹر مفتی عبدالواحد' دار الافتاء جامعہ مدنیہ لاہور۔ صفحہ 66، 67)

حق ایجاد اور حق اشاعت (کاپی رائٹس Copyrights):

کسی شخص کو کسی شے کی ایجاد یا اشاعت میں پہل کرنے کی وجہ سے اس شے کی صنعت یا اشاعت کا اس طرح سے حق حاصل ہونا کہ دوسرے اس کی صنعت یا اشاعت سے روک دیے جائیں۔ ایسے حق کو کاپی رائٹ کہا جاتا ہے۔ حکومت پہل کرنے والے کو کاپی رائٹ کا حق اس لیے دیتی ہے کہ پہل کرنے والا اپنی جانب میں یہ سمجھتا ہے کہ دوسروں کی صنعت یا اشاعت سے اس کی آمدنی اور نفع میں کمی آئے گی جو اس کا نقصان ہے۔ اس موہوم نقصان کو دفع کرنے کے لیے وہ حکومت سے کاپی رائٹ کے لیے درخواست کرتا ہے۔

جس شخص نے سب سے پہلے کوئی نئی چیز ایجاد کی' خواہ وہ مادی ہو یا معنوی' بلاشبہ وہ دوسروں کے مقابلہ میں اسے اپنے انتفاع کے لیے تیار کرنے اور نفع کمانے کے لیے بازار میں لانے کا زیادہ حقدار ہے کیونکہ ابوداؤد میں حضرت اسمر رضی اللہ عنہ بن مضرس سے روایت ہے کہ میں نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر بیعت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس شخص نے اس چیز کی طرف سبقت کی جس کی طرف کسی مسلمان نے سبقت نہیں کی تو وہ چیز اسکی ہے۔

(ابوداؤد فی الخراج قبیل احیاء الموات' صفحہ 264۔ جلد 4 حدیث نمبر 2947)

1- عام حالات میں کاپی رائٹ کے تحت دوسروں پر پابندی لگوانی جائز نہیں۔ البتہ بعض خصوصی حالات میں مثلاً طباعت کی صورت میں اگر کوئی طابع پہلے کو محض نقصان پہنچانے اور تنگ کرنے کے لیے فقط خرچہ کی قیمت پر یا اپنا نقصان کر کے نرخ سے بھی کم قیمت پر کتاب بازار میں لانے کا اعلان کرتا ہے۔ جبکہ پہلا طابع اس کو واجبی نفع پر فروخت کر رہا ہے تو حکومت دوسرے پر پابندی لگا سکتی ہے اور پہلا طابع دوسرے پر پابندی لگوا سکتا ہے۔

2- کاپی رائٹ یا حق تصنیف یا حق طباعت پر کسی طرح سے بھی اجرت یا عوض لینا جائز نہیں ہے۔ یہ بیع کی صورت میں نہ صلح کی صورت میں اور نہ ہی دستبرداری کی صورت میں۔

3- مصنف اگر خود طباعت و اشاعت نہیں کر سکتا تو دیگر طریقوں سے وہ اپنی کتاب کا فائدہ حاصل کر سکتا ہے۔ مثلاً (الف) مسودہ کسی ناشر کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے (ب) مصنف کسی ناشر کے ساتھ شرکت عنان کا معاملہ کر سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ مصنف اپنا مسودہ ناشر کے ہاتھ کسی مناسب قیمت پر فروخت کر دے اور اس قیمت کو اپنی طرف سے شرکت میں اپنا راس المال بنا دے اور نفع کی باہمی تقسیم کی شرط طے کر لے۔ یہ شرکت صرف اس کتاب سے متعلق ہو سکتی ہے۔

4- طابع اول نے جس ڈیزائننگ اور خاص طرز کتابت و طباعت کو اختیار کیا ہے دوسرا کوئی طابع و ناشر اس کو نقل نہ کرے بلکہ اپنے لیے جدا طرز اختیار کرے۔ اس کے لیے اول کی نقل کرنا شرعاً منع ہوگا کیونکہ اس سے طابع اول کو نقصان پہنچ سکتا ہے اور وہ اس طرح کہ وہ پہلے طبع کی نقل اور فوٹو لے کر کم خرچ کر کے کتاب چھاپ سکتا ہے۔ اور اگر دوسرا طابع پہلے کی فوٹو تو نہیں لیتا لیکن بعینہٖ اسی طرح کی کتاب اور

ڈیزائننگ کراتا ہے تو اس طریقے سے طالع اول اور گاہک کو دھوکا دیا جا سکتا ہے۔

(تجارت کے اسلامی اصول اور احکام' ڈاکٹر مفتی عبدالواحد' صفحہ 65, 66)

علماء معاصرین کی ایک جماعت نے حق ایجاد اور حق اشاعت کی بیع کے جائز ہونے کا فتویٰ دیا ہے۔ ان میں سے برصغیر کے علماء سے مولانا فتح محمد لکھنوی' مولانا مفتی محمد کفایت اللہ' مولانا مفتی نظام الدین' مفتی دارالعلوم دیوبند' مفتی عبدالرحیم لاجپوری بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

حق ایجاد اور حق تصنیف کی بیع کو جائز کہنے والوں نے درج ذیل دلائل دیے ہیں:

(i) یہ کہ حق ایجاد مجرد حق ہے' عین نہیں ہے اور حقوق مجردہ کا عوض لینا جائز نہیں۔ لیکن فقہاء کے نزدیک حقوق کا عوض لینے کا عدم جواز بھی تو بہر حال نہیں ہے۔

(ii) یہ کہ جس شخص نے کوئی کتاب دوسرے کے ہاتھ فروخت کی اس نے خریدار کو اس کتاب کے پورے اجزاء کے ساتھ مالک بنا دیا۔ لہٰذا خریدار کے لیے جائز ہے کہ اس کتاب میں حسب خواہش تصرف کرے۔ لہٰذا اس کے لیے اس کتاب کی اشاعت بھی جائز ہونی چاہیے۔ لیکن دراصل کسی چیز کی ملکیت اس بات کو مستلزم نہیں کہ مالک کو اس جیسی دوسری چیز بنانے کا حق ہو۔ کیونکہ کسی چیز میں تصرف کرنا الگ چیز ہے اور اس جیسی دوسری چیز بنانا دوسری چیز ہے۔

(iii) یہ کہ ایجاد اور تصنیف کی تیاری اور طباعت سے موجد اور مصنف کا خسارہ نہیں ہوتا' زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ ان کا نفع کم ہو جاتا ہے۔ نفع کم ہونا الگ چیز ہے اور خسارہ ہونا بالکل دوسری چیز ہے۔ اس دلیل کا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ نفع کم ہونا اگرچہ خسارہ نہ ہو لیکن ضرر ضرور ہے' خسارہ اور ضرر میں واضح فرق ہے۔ بلاشبہ سخت محنت و مشقت سے ایجاد اور تصنیف کرنے والا نفع کے حصول کا اس شخص سے زیادہ حقدار ہے جس نے معمولی رقم خرچ کر کے ایجاد شدہ چیز یا کتاب خرید لی اور پھر موجد اور مصنف کے لیے مارکیٹ تنگ کرنے لگا۔

(iv) یہ کہ حق طباعت محفوظ کرنے سے کتاب کی اشاعت کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے۔ اگر ہر شخص کو کتاب کی طباعت کا حق ہو تو اس کی نشر و اشاعت کا دائرہ زیادہ وسیع ہو جائے گا۔ اور اس کی افادیت زیادہ عام اور ہمہ گیر ہو جائے گی۔

یہ بات بلاشبہ امر واقعہ ہے جس کے انکار کی گنجائش نہیں لیکن اگر ہم دوسرے پہلو سے دیکھیں تو یہ دلیل مانعین جواز کے خلاف پلٹ جاتی ہے۔ وہ پہلو یہ ہے کہ اگر ایجاد کرنے والوں کو اپنی ایجادات سے نفع حاصل کرنے میں اسبقیت کے حق سے محروم کر دیا جائے گا تو نئی ایجادات کے لیے بڑے منصوبوں کا خطرہ مول لینے سے ان کی ہمتیں پست ہو جائیں گی کیونکہ ان کو یہ احساس ہوگا کہ انہیں معمولی نفع ہی ملے گا اور اسی طرح کے امور جن میں دو پہلو ہوں فقہی مسائل کا فیصلہ نہیں کرتے' جب تک کہ کسی چیز میں کوئی شرعی قباحت نہ ہو۔ اس لیے کہ تمام مباح چیزوں میں ضرر و نقصان دونوں کے پہلو ہوتے ہیں۔

(فقہی مقالات' مولانا مفتی تقی عثمانی' صفحہ 225 تا 223)

☆☆..........☆☆..........☆☆

قمار کی جدید شکلیں

سوال: قمار کی جدید شکلیں پر نوٹ لکھیں۔

قمار کا مفہوم (Meaning of Gambling):

قمار عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں وہ بازی جو شرط لگا کر کھیلی جائے۔یعنی قمار کا مطلب ہے جوا جسے انگریزی میں "Gambling" کہا جاتا ہے۔ جواء کھیلنے والے کو جواری یا قمار باز کہتے ہیں اور انگریزی میں قمار باز کو "Gambler" (گیمبلر) کہا جاتا ہے۔ قرآن حکیم میں قمار کے لیے ''میسر'' کا لفظ کیا گیا ہے۔''میسر کا اطلاق ان کھیلوں اور ان کاموں پر ہوتا ہے جن میں اتفاقی امور کو کمائی اور قسمت آزمائی اور تقسیم اموال واشیاء کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔''

(سید مودودیؒ تفہیم القرآن جلد اول صفحہ 501)

''ہر وہ معاملہ جو نفع اور نقصان کے درمیان دائر اور مبہم ہو شریعت میں اسے قمار کہا جاتا ہے۔''

(انوار البیان: مفتی محمد عاشق الٰہی جلد سوم صفحہ 178)

قمار کی حرمت:

قمار (جواء) قرآن حکیم کی آیات کی روشنی میں قطعاً حرام ہے۔ارشاد ربانی ہے:

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو یہ شراب اور جوا اور یہ آستانے اور پانسے' یہ سب گندے شیطانی کام ہیں' اُن سے پرہیز کرو' امید ہے کہ تمہیں فلاح نصیب ہوگی۔'' (المائدہ:90)

''پوچھتے ہیں' شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں' ان دونوں چیزوں میں بڑی خرابی ہے۔''

(البقرہ:219)

قمار کے ذریعہ سے تقسیم مال اور فال گری کی بھی قرآن مجید میں ممانعت کی گئی۔

''یہ بھی تمہارے لیے ناجائز ہے کہ پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرو۔'' (المائدہ:3)

قرآن مجید میں قمار کے حرام ہونے کی وجہ بھی بیان فرما دی گئی ہے:

''شیطان تو یہ چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعہ سے تمہارے درمیان عداوت اور بغض ڈال دے اور تمہیں خدا کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔ پھر کیا تم ان چیزوں سے باز رہو گے۔''

(المائدۃ:91)

قمار کے ذریعے فال گیری حرام:

سورۃ المائدہ کی آیت مبارکہ نمبر 3 میں پانسوں کے ذریعہ سے اپنی قسمت معلوم کرنے کی ممانعت

فرمائی گئی ہے' یہ قمار ہی کا ذریعہ ہے۔ اس آیت میں جس چیز کو حرام کیا گیا ہے اس کی تین بڑی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں اور آیت کا حکم ان تینوں پر حاوی ہے۔

(1) مشرکانہ فال: جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا ہے' یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے' یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکین مکہ نے اس غرض کے لیے کعبہ کے اندر ہبل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوئے تھے جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا سوال ہو' یا کھوئی ہوئی چیز کا پتہ پوچھنا ہو' یا خون کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو' غرض کوئی بھی کام ہو' اس کے لیے ہبل کے پانسہ دار (صاحب القداح) کے پاس پہنچ جاتے' ان کا نذرانہ پیش کرتے اور ہبل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملے کا فیصلہ کر دے۔ پھر پانسہ دار ان تیروں کے ذریعہ سے فال نکالتا' اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا اس پر لکھے ہوئے الفاظ کو ہبل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

(2) توہم پرستانہ فال گیری: جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی و خیالی چیز یا کسی اتفاقی شے کے ذریعہ سے کیا جاتا ہے۔ یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وسیلہ علم غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رمل' نجوم' جفر' مختلف قسم کے شگون اور نچھتر' اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس صنف میں داخل ہیں۔

(3) جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص کا نام نکل آیا ہے لہٰذا ہزار ہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیہ اس شخص کی جیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک معمہ کے بہت سے حل صحیح ہیں' مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحب معمہ کے صندوق میں بند ہے۔

ان تین اقسام کو حرام کر دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں دو برابر کے جائز کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے' اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے' اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قرعہ اندازی پر فیصلہ کا مدار رکھا جا سکتا ہے۔ یا مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دونوں کے درمیان تذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جا سکتی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار فرماتے تھے جبکہ دو برابر کے حق داروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آ جاتی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔"

(تفہیم القرآن' جلد اول' صفحہ 442, 443)

قمار کی جدید شکلیں:

دور حاضر میں قمار (جوا) کی نئی نئی شکلیں در آئی ہیں، جو کہ شرعاً سراسر حرام اور ناجائز ہیں۔ ان میں سے بعض شکلیں مندرجہ ذیل ہیں:

(1) اخباری معموں کے ذریعہ قمار بازی:

اخباری معموں کے ذریعہ بھی قمار یعنی جوا کا سلسلہ جاری ہے۔ بطور اشتہار اخباروں اور ماہوار رسالوں اور ہفت روزہ جریدوں میں معمہ کی مختلف صورتوں کا اشتہار دیا جاتا ہے کہ جو شخص اس کو حل کر کے بھیجے اور اس کے ساتھ اتنی فیس مثلاً پانچ روپے بھیجے تو جن لوگوں کے حل صحیح ہوں گے ان لوگوں میں سے جس کا قرعہ اندازی میں نام نکل آئے گا اسے انعام کے عنوان سے مقررہ رقم یا کوئی قیمت کی چیز مل جائے گی۔ یہ سراسر قمار ہے یعنی جوا ہے اور حرام ہے کیونکہ جو شخص فیس کے نام سے کچھ پیسے بھیجتا ہے وہ اس موہوم نفع کے خیال سے بھیجتا ہے کہ یا تو یہ روپے گئے یا ہزاروں مل گئے۔ فیس کے نام سے روپیہ بھیجنا اور اگر اس روپے پر کچھ زائد مل جائے اس کا لینا اور معمہ شائع کر کے لوگوں کی رقمیں لے لینا یہ سب حرام ہے۔

(2) گھوڑ دوڑ (Horse Race) کے ذریعہ قمار بازی:

گھوڑوں کی دوڑ لگوا کر جوا کھیلنے کا طریقہ بھی دور جدید میں نمودار ہوا ہے۔ اس کو بڑے منظم انداز میں اور بھرپور دلچسپی سے کھیلا جاتا ہے۔ اس میں جواری (قمار باز) اپنے اپنے گھوڑوں پر جوا لگاتے ہیں اور ان گھوڑوں کو معینہ مسافت تک دوڑاتے ہیں اور جس کا گھوڑا برق رفتا ہو اور دوڑ جیت جائے وہ ہارنے والے گھوڑے کے مالک سے جوا کی طے شدہ رقم لے لیتا ہے جو کہ شرعاً حرام ہے کیونکہ اس میں ہار جیت کا تعلق اتفاقی امر پر ہوتا ہے۔

(3) پتنگ بازی اور کبوتر بازی کے ذریعہ قمار بازی:

آج کل پتنگ بازی اور کبوتر بازی کے ذریعہ بھی قمار بازی کی جاتی ہے۔ پتنگ بازی میں پیچ لڑا کر اور جوا کی رقم باندھ کر مقابلہ کیا جاتا ہے اور جیتنے والا پتنگ باز جوئے کی رقم جیت لیتا ہے۔ اسی طرح کبوتر بازی کا مقابلہ بعض شرائط اور جوئے کی رقم طے کر کے کیا جاتا ہے اور جیتنے والا کبوتر جوئے کی رقم کا حق دار قرار دیا جاتا ہے۔ شریعت کے اعتبار سے یہ دونوں شکلیں سراسر حرام اور ناجائز ہیں۔ یہ دونوں کام خود اپنی جگہ ممنوع ہیں۔ پھر ان پر ہار جیت کے طور پر جو رقم لگاتے ہیں وہ مستقل گناہ ہے اور صریح حرام ہے کیونکہ یہ قمار یعنی جوا ہے۔

4- بیمہ پالیسی کے ذریعے سے قمار بازی:

انشورنس یعنی بیمہ پالیسی کی بھی وہ سب شکلیں شرعاً حرام ہیں جن میں رقوم جمع کی جاتی ہیں اور حادثہ ہو جانے کی صورت میں جمع کردہ رقم سے زیادہ مل جاتا ہے۔ اس میں پالیسی ہولڈر کی طرف سے ادائیگی تو یقینی ہوتی ہے لیکن جنرل انشورنس کے اندر اس کے بدلے میں رقم کا ملنا یقینی نہیں ہوتا' بلکہ ایک غیر یقینی واقعہ مثلاً گاڑی

کے حادثہ وغیرہ سے متعلق ہوتا ہے' اگر وہ پیش آئے تو نقصان کے بقدر تلافی کی جاتی ہے' ورنہ اصل پریمیم بلا معاوضہ چلا جاتا ہے۔ بہر حال زندگی کا بیمہ ہو یا گاڑیوں کا یا دکانوں کا یہ سب حرام ہے اور ان میں اپنی جمع کردہ رقم سے جو مال زائد ملے وہ سب حرام ہے۔

5-لاٹری (Lottery) کے ذریعہ سے قمار بازی:

شرعاً ہر قسم کی لاٹری جوا ہے اور حرام ہے۔ اس مقابلہ میں حصہ لینے والا پہلے متعین رقم ادا کر کے ٹکٹ خریدتا ہے' اگر اس کے نام قرعہ نکل آئے تو وہ دی ہوئی رقم سے کئی گنا بڑھ کر رقم حاصل کرتا ہے اور نہ نکلے تو اپنی رقم سے بھی محروم رہتا ہے۔ اس طرح ہر قسم کی لاٹری جس میں کچھ دے کر زائد ملنے کی امید پر مال جمع کیا جاتا ہے پھر اس پر مال ملے یا نہ ملے' یہ سب حرام ہے۔

6- لکی کمیٹی کے ذریعہ سے قمار بازی:

ایک قسم کی کمیٹی "لکی کمیٹی" ہے جس کے ذریعہ سے قمار بازی کا کھیل کھیلا جاتا ہے اس طرح کی کمیٹی میں قرعہ اندازی کے ذریعے سے جس ممبر کی کمیٹی نکل آئے وہ کمیٹی کی رقم حاصل کر لیتا ہے اور باقی کمیٹیوں کی رقوم نہیں دیتا۔ اس طرح یہ قمار کی شکل بن جاتی ہے۔ یعنی ایک اتفاقی امر یا قرعہ کی جیت کے ذریعے سے وہ پوری کمیٹی لے کر باقی کمیٹیوں کی رقوم ادا کرنے سے خلاصی پالیتا ہے خواہ اس نے ابھی ایک ہی کمیٹی دی ہو۔ بس اسے یہ جُوا ہی جیتنا ہے اور تمام رقم کا حق دار بننا ہے۔ چنانچہ اس کمیٹی کے قمار ہونے میں کوئی شائبہ نہیں اور یہ شرعاً سراسر حرام ہے۔

7- سٹے بازی کے ذریعہ سے قمار بازی:

سٹے بازی کے لغوی معنی ہیں پیداوار پر شرط لگانا۔ یہ ہندی زبان کا لفظ ہے یہ بھی قمار بازی ہے اور سراسر حرام ہے۔ بعض جگہ سٹہ لگانے کا یہ طریقہ رائج ہے کہ ایک سے سو تک کے عددوں کو کاغذ کے پرزوں پر لکھ کر ایک گھڑے میں ڈال کر اسے خوب ہلاتے ہیں اور لوگوں نے کسی عدد پر شرطیں لگائی ہوتی ہیں۔ پھر ایک بچے سے کہتے ہیں کہ ان میں سے ایک پرزہ نکالے جو عدد نکل آئے اس پر شرط لگانے والا اپنی لگائی ہوئی رقم کا سو گنا وصول کرتا ہے اور باقی شرط لگانے والوں کی رقوم جن کی شرط نہیں نکلتی ضبط کر لی جاتی ہے۔

8-بانڈز (Bonds) کے ذریعے سے قمار بازی:

حکومت کی جانب سے بانڈز کے اجراء اور پھر قرعہ اندازی کے ذریعے سے ان بانڈز پر انعامی رقم کا حصول بھی قمار بازی ہے جو کہ شرعاً سراسر حرام اور ناجائز ہے۔ اسی طرح نجی افراد کی طرف سے بانڈوں کے کھیل کا اجراء بھی قمار ہی ہے جو کہ سراسر حرام ہے۔ اس کھیل میں بانڈز خریدنے والے بانڈوں کے نمبروں کے اندازے لگاتے ہیں کہ فلاں نمبر نکلے گا۔ اگر نمبر لگ جائے تو مقررہ انعامی رقم مل جاتی ہے۔ پاکستان میں تو اس طرح کا قمار وسیع پیمانے پر دیکھا جا سکتا ہے۔ پیروں اور بابوں نے جیتنے والے نمبرز بتانے کا دھندا شروع کر رکھا

ہے اور وہ اپنے ''روحانی علم'' کے ذریعے سے نمبرز بتاتے اور اس قبیح وحرام کھیل کے کھلاڑیوں یعنی قمار بازوں سے رقمیں بٹورتے ہیں۔ یہ سب قطعاً حرام ہے۔

9- کرکٹ جوا قمار بازی کا عام طریقہ:

آج کل کرکٹ میچوں پر جوا لگانے کا قبیح عمل بھی عام ہے۔ کسی ٹیم کے میچ جیتنے' کسی کھلاڑی کے سنچری مکمل کرنے یا کسی ٹیم کے انعامی کپ وغیرہ جیتنے پر شرطیں لگا کر جوا کھیلتے ہیں۔ اس طرح لاکھوں کروڑوں روپے کا کرکٹ جوا کھیلا جاتا ہے۔ یہ سراسر حرام اور قطعاً ناجائز ہے۔ یہ صریحاً قمار ہے جو آج کی دنیا میں بالعموم مذہبی احکام کو پس پشت ڈال کر کھیلا جاتا ہے اور اس میں بڑی بڑی شخصیات اور مالدار شائقین کرکٹ اور کھلاڑی ملوث ہوتے ہیں۔ کھیلنے والی ٹیمیں بھی آپس میں جوا لگا کر میچ کھیلتی ہیں اور قمار بازی کا ارتکاب کرتی ہیں۔

14- سیاسی نشیب وفراز یا حکومتی تبدیلیوں پر سٹہ بازی کے ذریعہ سے قمار بازی:

کسی حکومت کی تبدیلی' وزیراعظم کی برطرفی عدلیہ کے کسی ممکنہ فیصلے وغیرہ پر بھی سٹہ بازی کے ذریعے سے جوا کھیلا جاتا ہے اور ان واقعات اور حادثات پر شرطیں لگائی جاتی ہیں اور یہ طے کیا جاتا ہے کہ شرط جیتنے والا اتنی رقم کا حقدار ہوگا۔ چنانچہ جو سٹے باز شرط جیت جاتا ہے' وہ مذکورہ طے شدہ رقم کا حق دار قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ سارا عمل قطعاً ناجائز اور شرعاً حرام ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق محض اتفاقی امر (Contingency) پر ہوتا ہے۔ جیتنے والا رقم حاصل کرتا اور شرط ہارنے والا رقم کھو دیتا ہے۔ یہ قمار بازی' جس کی قرآن وحدیث میں مطلقاً حرمت بیان کی گئی ہے۔

اسلام اور جدید سیاسی نظریات

سیاسی نظریات کی مختصر تاریخ

سوال : نظریہ سیاسی سے کیا مراد ہے؟ اس کا مختلف علوم سے کیا تعلق ہے' نیز اس کی اہمیت اور فوائد پر روشنی ڈالیے!

جواب : نظریہ سیاسی (Political Thought) :

ریاست' ریاست کی ساخت' نوعیت اور مقصد کے بارے میں جو نظریہ قائم کیا جائے اسے "نظریہ سیاسی" کا نام دیا جاتا ہے۔ "نظریہ" کی جمع "نظریات" ہے۔ نظریات وہ بنیادی تصورات ہوتے ہیں' جن پر کسی نظام کی عمارت استوار ہوتی ہے۔

نظریہ سیاسی میں مندرجہ ذیل قسم کے اسباب کا مطالعہ کیا جاتا ہے:

1- ریاست کیا ہے؟
2- فرد اور ریاست کے مابین کیا تعلق ہے؟
3- فرد کو ریاست میں کیا اختیار حاصل ہے؟
4- ریاست کے عناصر ترکیبی کیا ہیں؟
5- ریاست اور مقتدر اعلیٰ میں کیا تعلق ہے؟
6- مقتدر اعلیٰ کو کیا اختیارات حاصل ہونے چاہئیں؟
7- افراد کو کن امور میں مملکت کی اطاعت کرنا ضروری ہے؟
8- ریاست اور ریاست کے شہریوں کے مابین اطاعت کی ترتیب
9- اختیارات کا منبع کیا ہے؟
10- ریاست کس قسم کی ہونی چاہیے؟
11- کیا افراد ریاست کی طاقت کا سرچشمہ ہیں؟
12- ریاست اور معاشرہ میں کیا تعلق ہے؟
13- ریاست کے قانون کے بنیادی مقاصد کیا ہونے چاہئیں؟
14- ماخذات قانون کون کون سے ہیں؟
15- ریاست اور افراد ریاست کی باہمی ذمہ داریاں کیا ہیں؟
16- سیاسی نظریات کے عناصر ترکیبی
17- ریاست اور ریاست میں نافذ ہونے والے قوانین کے مقاصد

مختلف قوموں کے سیاسی نظریات مختلف ہوتے ہیں اور یہ سیاسی نظریات نسل در نسل چلتے اور بدلتے رہتے ہیں۔ ایک ہی ریاست میں رہنے والے سیاسی مفکرین کے تشبیہات بھی آپس میں نہیں ملتے' کیونکہ نظریہ کسی حسابی عمل کا نام نہیں کہ سب کا جواب ایک ہی ہو۔ نظریات اذہان کی پیداوار ہوتے ہیں اور اذہان میں تفاوت کا پایا جانا ایک لازمی امر ہے۔

سیاسیات کے حصے : سیاسی نظریات علم سیاسیات سے تعلق رکھتے ہیں۔ سیاسیات کو تین

حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- تاریخی : اس میں ہر دور کے مفکرین و فلاسفہ کے نظریات اور خیالات بیان کئے جاتے ہیں۔
2- فطری : اس میں سیاسیات کے اصولوں اور معیاروں پر بحث کی جاتی ہے۔
3- عملی : اس میں مخصوص نظام کو کامیاب بنانے یا کسی مجوزہ نظام کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔

سیاسی نظام کی اہم کڑیاں : سیاسی نظریہ کی اہم کڑیاں فرد اور معاشرہ ہیں۔ افراد سے معاشرہ وجود میں آتا ہے اور معاشرہ مل کر ایک ریاست تشکیل دیتا ہے۔ سیاسی نظریات ہی معاشرہ کے افراد کے مخصوص افراد کی ذہنی عکاسی کرتے ہیں۔ یہ نظریات بالعموم معاشرہ کی ضروریات و احتیاجات کے تابع ہوتے ہیں۔ مطلب یہ کہ کسی معاشرہ کے سیاسی نظریات اس کے طرز زندگی' عقائد' مذہب اور ضروریات زندگی کی عکاسی کرتے ہیں' کسی معاشرہ کا سیاست کے ضمن میں نکتہ نظر اس کا سیاسی نظریہ کہلاتا ہے۔

کسی معاشرہ کے سیاسی نظریات کو اس کی سیاسی تاریخ سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی نظریہ کا مختلف علوم سے تعلق اور سیاسی نظریات کے ماخذات : سیاسی نظریہ کا تعلق زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف علوم سے ہوتا ہے' اس کا رشتہ عمرانیات سے بھی ہے' تاریخ سے بھی' مذہب سے بھی اور اخلاقیات سے بھی۔ چونکہ سیاسیات کا اخلاقیات سے پرانا اور بہت گہرا رشتہ ہے' اس لئے سیاسی نظریات کو اخلاقیات سے بطریق احسن اخذ کیا جا سکتا ہے۔ جب ریاست کی بنیاد پائدار ہو جاتی ہے تو سیاسی زندگی میں مذہب اور اخلاقیات کے ساتھ کسی دوسرے معیار کی ضرورت محسوس ہونے لگتی ہے اور سیاسی بحث میں تاریخ کا دخل ہو جاتا ہے۔ تاریخ اور عمرانیات کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے' اس طرح عمرانیات سے بھی سیاسی نظریات اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ معاشرتی اداروں سے افراد کا جو تعلق ہے وہ صرف عمرانیات ہی کی مدد سے پوری طرح ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ اسی طرح مختلف حالات میں افراد کا جو طرز عمل ہوتا ہے اور جس طرح ہم ایک دوسرے کے ساتھ "معمولاً" پیش آتے ہیں' یہ سب گتھیاں نفسیات کے بغیر حل نہیں ہو سکتیں۔ بالفاظ دیگر یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ سیاسی نظریات میں نفسیاتی عوامل کا بھی عمل دخل ہوتا ہے۔ کسب معاش کے ذریعے دولت کی تقسیم' تجارتی کاروبار یا مختلف پیشے ایسے مسائل ہیں کہ جنہیں انسانی زندگی کے کسی بھی پہلو کے مطالعہ میں ہم نظرانداز نہیں کر سکتے۔ یہ سارے مسائل معاشیات کا موضوع ہیں۔ چنانچہ سیاسی نظریات کا تعلق معاشیات سے بھی ہے۔ سیاسیات کو ایک فلسفہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سیاسی نظریات کا تعلق علم فلسفہ سے بھی ہے۔

نظریہ سیاسی کے مطالعہ کی اہمیت و فوائد :

1- نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے سیاسیات کے طلبہ کو مختلف زبانوں میں انسان کی ذہنی ترقی

اور نشوونما کا پتا چلتا ہے۔

2- نظریہ سیاسی سے یہ بھی پتا چلتا ہے کہ سیاسی حالات پر کن کن عوامل کا اثر پڑتا ہے۔

3- نظریہ سیاسی سے یہ پتا چلتا ہے کہ قومیں کیسے بنتی' بگڑتی اور پھر سنبھلتی ہیں۔ انقلاب کیوں اور کیسے رونما ہوتے ہیں؟ کون سی قوم محض زبانی نظریات کی وجہ سے مٹ گئی اور کس قوم نے بلند نظریات پر عمل کر کے اپنا لوہا منوایا؟

4- نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کس ریاست میں کون کون سے ادارے تھے اور ان اداروں میں سے کون کون سے ادارے اس کے لئے مفید ثابت ہوئے۔ کیا اداروں کی مضبوطی یا کمزوری میں سے کسی ریاست کے عروج و زوال کا راز پنہاں ہے؟ کون کون سے ادارے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور کون سے ادارے محض قومی ضیاع کا باعث ہیں۔

5- نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے کسی ریاست میں قائم معاشرتی اقدار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور اس کی اخلاقیات کا جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اور یہ بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ کسی معاشرہ میں سیاسی نظریات خیر پر مبنی تھے یا شر پر۔ اور شر پر مبنی نظریات کا کیا حشر ہوا؟ اور اس سے معاشرہ کو کیا نقصان پہنچا۔ خیر پر مبنی سیاسی نظریات نے معاشرہ میں کون کون سی اچھائیاں پیدا کیں جن کے بل بوتے پر وہ تادیر قائم رہا۔

6- نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے اذہان میں ذہانت پیدا ہوتی ہے اور عقل پختہ سے پختہ ہوتی چلی جاتی ہے۔

7- نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے سیاسی شعور بیدار ہوتا ہے۔ اگر نظریہ سیاسی کا طالب علم عملی طور پر سیاست میں حصہ لینا چاہے تو وہ کامیاب سیاستدان بن سکتا ہے۔

8- نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے نئے سیاسی افکار و نظریات بھی پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ پرانے سیاسی نظریات میں ضرورت کے مطابق ترمیم و اضافہ کر کے انہیں موجودہ وقت کی ضروریات سے ہم آہنگ کیا جا سکتا ہے۔

9- نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے یہ بات بھی معلوم کی جا سکتی ہے کہ آزادی اور قانون میں کس قسم کا رشتہ قائم ہونا چاہئے اور فرد اور ریاست میں کس قسم کا تعلق استوار ہونا چاہئے۔ اسی طرح نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے بہت سے اہم سوالات کا جواب حاصل کیا جا سکتا ہے۔

10- نظریہ سیاسی کے مطالعہ سے اس بات کا علم بھی حاصل ہوتا ہے کہ کس زمانے میں کس چیز کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ مثلاً قرون وسطیٰ میں جب عیسائیت کا بول بالا تھا تو سیاسی مفکرین کے نزدیک اہم ترین مسئلہ یہ تھا کہ مذہب یعنی کلیسا کو بالادستی حاصل ہو یا مملکت کو۔ پھر سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں یہ مسئلہ اہم سمجھا جانے لگا کہ بادشاہ کو زیادہ اختیار دیا جائے یا پارلیمنٹ کو؟ موجودہ زمانہ میں اہم مسئلہ یہ ہے کہ مملکت حکومتی مشین کے ذریعے حالات کو قابو میں رکھے' [illegible] معاشی ناہمواریوں کو دور کرے یا امیری و غریبی کے بعد کو ختم کرے۔

سوال : قدیم یونانی نظریہ سیاسی پر تفصیل سے روشنی ڈالیے!

جواب : قدیم یونانی نظریہ سیاسی :

بعض علمائے سیاست کا خیال ہے کہ زمانہ قدیم میں شہری ریاست (City State) کی ابتدا یونان کے شہر ایتھنز سے ہوئی لیکن محققوں کو اس امر پر اعتراض ہے کہ ایتھنز کی ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے دنیا کے بہت سے ملکوں میں ریاست کا وجود موجود تھا۔ مثلاً برصغیر پاک و ہند' چین وغیرہ ممالک میں ابتدائی ریاستوں کے نشانات ملتے ہیں۔ ہاں یہ بات قابل قبول ہے کہ قدیم یونان دوسری قوموں کی نسبت زیادہ علمی و سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا تھا جس کی بنا پر وہ علم و ادب کا گہوارہ بن چکا تھا۔ ایتھنز اور سپارٹا میں چار سو قبل مسیح میں باقاعدہ درسگاہیں موجود تھیں جہاں اعلیٰ پایہ کے مفکرین تعلیم و تدریس سے منسلک تھے۔ یونانی دوسری قوموں کی نسبت ہر چیز کو تنقیدی اور تحقیقی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہاں پر چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم تھیں اور ہر ریاست کے اپنے اپنے قوانین تھے جن پر لوگ سختی سے عمل کرتے تھے۔

یونان کی شہری ریاستوں میں تین قسم کے طبقے پائے جاتے تھے

(1) جاگیردار طبقہ' جو ریاست کا والی وارث تصور ہوتا تھا۔

(2) کاروباری طبقہ' یہ کاروبار مثلاً تجارت وغیرہ کرتا تھا۔

(3) غلام طبقہ' یہ امراء کے ہاں گھریلو کام کاج کرتا تھا۔

مندرجہ بالا تین طبقات میں سے پہلا طبقہ حاکم تھا اور بقیہ دونوں طبقے اسی کے لیے کام کاج کرتے تھے اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے تھے۔ یونان میں صرف انہی لوگوں کو شہریت حاصل تھی جو ریاست کے کام میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ یعنی جاگیردار طبقہ ہی ریاست کی شہریت کا حامل تھا۔

قدیم یونانی قانون امورِ نواہی کی ایک فہرست تھا۔ جن کاموں کے کرنے کی اجازت ہوتی تھی' اسے "رسم تحریم" (Taboo) کہتے تھے۔ امتناعات کی ابتدا خطرے کے اندیشہ سے وابستہ تھی اور یہ مظاہر قدرت سے ایک وحشی کی لاعلمی تھی جس نے اس کے عقائد پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ وہ دیوی دیوتاؤں پر یقین رکھتے تھے۔ وہ کوئی ایسا کام نہیں کرتے تھے جن سے متعلق انہیں یقین ہوتا کہ یہ دیوی دیوتاؤں کو ناپسند ہے۔ وہاں مذہب اور جادو کو اجارہ داری حاصل تھی جس کی چھاپ سیاسی افکار و نظریات پر بھی موجود تھی۔

ابتدائی دور میں سماجی وحدتیں وہ علامتی گروہ تھے جنہیں کسی قدر مقدس کے نشان کے ذریعہ ممیز رکھا جاتا تھا اور جس کی پرستش کی جاتی تھی۔ ان کے ہاں رشتہ یک جدی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ ان گروہوں میں شادی بیاہ کی ممانعت تھی۔ گروہ یا قبیلے سے باہر شادی کر کے متعین ضابطوں کے تحت باقاعدگی پیدا کر جاتی تھی اور رشتہ داری کے نظام کا تعین کیا جاتا تھا۔ حسب و نسب کا پتا ماں کے رشتہ کے ذریعہ لگایا جاتا تھا۔

یونان میں تین سو قبل مسیح تک وہ واضح اور مضبوط حکومتیں قائم ہو چکی تھیں' جو

ایتھنز (Athens) اور سپارٹا (Sparta) کے نام سے مشہور ہوئیں۔ ان دونوں ریاستوں کا اپنا اپنا سیاسی نظام تھا جو ایک دوسرے سے مختلف تھا۔ لہٰذا ایتھنز اور سپارٹا کے سیاسی و سماجی اداروں کا یونان کی سیاسی زندگی پر گہرا اثر ہوا۔

اہل یونان نے زندگی کے انفرادی اور سیاسی مسائل پر تنقیدی نظریات کا اظہار کیا۔ انہوں نے فرد اور معاشرہ کی اہمیت کو اجاگر کیا۔ ان کا خیال تھا کہ فرد معاشرہ کا ایک ضروری جزو ہے۔ یونانی مذہب اور اخلاقیات کے بیحد دلدادہ تھے۔ ان کے نزدیک بلند اخلاق ہونا ہی انسانی عظمت کی دلیل تھی۔

یونانی لوگ جمہوریت کو بہترین طرز حکومت تصور کرتے تھے۔ انہیں شخصی حکومت' ملوکیت اور امریت سے انتہائی نفرت تھی۔ وہ آزادی کو انسان کا بنیادی حق تصور کرتے تھے۔ ان کا تصور آزادی جمہوری قوانین' احساس ذمہ داری اور شرافت و شائستگی سے صورت پذیر تھا۔ ان کے اپنے قوانین ان کے اوپر حکمران تھے۔ یہ قوانین دیوتاؤں کے احکام و الہام کے مطابق تھے۔ چونکہ وہ نظری اور عملی طور پر حقیقت حسن نیکی اور عدل کے متلاشی تھے' اس لئے ان کے قوانین بھی اعلیٰ اقدار کے حامل تھے۔ ان کے قوانین سولن (Solon) اور لائی کرگس (LYCURGUS) جیسے عظیم دماغوں کی اختراع تھے۔ بعد میں افلاطون اور ارسطو جیسے عظیم سیاسی مفکرین نے ان میں ترامیم کیں۔

یونانیوں کا تصور انصاف : یونانیوں کے نزدیک انصاف صرف جائز کام کا نام تھا۔ وہ اچھائی کرنے ہی کو انصاف تسلیم کرتے تھے۔ جو لوگ ریاست کی بہتری کے لئے کام کرتے تھے اس کو انصاف کہا جاتا تھا اور جو ریاست کے لئے کام نہ کرتا تھا وہ انصاف تھی۔

سوفسطائی نظریہ سیاسی : پانچویں صدی قبل مسیح میں ایتھنز اور سپارٹا میں چپقلش پیدا ہو گئی۔ اس دوران یونان کی خود مختاری اور سپارٹا کی مطلق انسانی میں زبردست تضاد رہا۔ نظریاتی محاذ پر دو فکر متصادم تھے۔ یعنی ایک سپارٹا کی جنگجوئی اور دوسرے ایتھنز کی جمہوریت اسی دوران ایک نیا طبقہ معرض وجود میں آیا جس کو سوفسطائی کا نام دیا گیا۔ یہ لوگ سیاست اور علمی دنیا پر چھا گئے۔ ان کی تعلیم زیادہ تر مقالات (DIALOGUES) پر مشتمل ہوتی تھی۔ ان لوگوں نے یونانیوں کو "سیاست کا فن" (Art of Politics) سکھایا۔ ان کی تعلیمات یہ تھیں کہ :

1- کسی چیز کو دیکھے پرکھے بغیر قبول نہیں کرنا چاہئے' پہلے اسے عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہئے۔ اگر دل و دماغ اس چیز کو قبول کریں تو تب اس کو قبول کرنا چاہئے۔
2- ریاست سوائے فریب کے کچھ نہیں۔
3- قانون انصاف کے پاؤں کی زنجیر ہے' جس کی اطاعت سے آزادی ختم ہو جاتی ہے۔
4- سیاسی اختیارات محض ایک جیو تشدد سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔
5- انصاف اور حقوق کے مبہم اصولوں کی خلاف ورزی ضروری ہے۔
6- ریاست اور اس کے ادارے افراد کی ترقی کے خلاف ہیں۔
7- انفرادیت انسان کا سب سے بڑا حق ہے۔

8- سچائی کو ثابت کرنے والی چیز انسانی عقل ہے۔
9- ریاست کا قانون قدرت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

دو گروہ : سوفسطائیوں کی انتہا پسندی نے یونانی ترتیب و سیاست کو پارہ پارہ کر دیا۔ اسی نازک دور میں دو گروہ پیدا ہو گئے۔

(1) قدامت پسند : یہ قدیم نظریات و خیالات کے دلدادہ تھے اور سوفسطائیوں کے نظریات کے سخت مخالف تھے۔(2) ترقی پسند : یہ گروہ فرد اور معاشرہ کے درمیان توازن پیدا کرنے پر زور دیتا تھا۔ سقراط' افلاطون اور ارسطو اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

سقراط کا نظریہ سیاسی : سقراط (SOCRATES) ایتھنز سے تعلق رکھتا تھا۔ وہ ایک چلتا پھرتا معلم تھا اور لوگوں کو مفت تعلیم دیتا تھا۔ اس نے قومی جنگوں میں بھی حصہ لیا تھا۔ وہ سوفسطائیوں کے نظریات سے متاثر تھا' لیکن وہ انتہا پسندی کے بجائے اعتدال اور میانہ روی پر زور دیتا تھا۔ اس کے خیال تھا کہ حکومت کرنے کا کام صرف پڑھے لکھے فلسفی لوگوں کے ہاتھ میں ہونا چاہئے۔ بالفاظ دیگر حکومت کرنے کا اختیار صرف جاگیرداروں ہی کو حاصل نہیں بلکہ اہل علم لوگوں کو بھی کاروبار حکومت میں شریک کرنا چاہئے۔ سقراط کہتا تھا "کسی چیز کا جاننا" اس چیز کی کارکردگی سے واقف ہونا ہے۔ لیکن سقراط سے پہلے علم (جاننا) (VIRTUE) کا تصور کچھ اور ہی تھا۔ ان کے نزدیک علم سے مراد وہی ہے جو ان کے آباؤاجداد کے نزدیک متعین تھی۔ ان کا کہا ہوا پتھر پر لکیر ہے جسے مٹایا نہیں جا سکتا۔ سقراط عقل پر زور دیتا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا تھا کہ کسی چیز کو دیکھ کر قبول نہیں کر لینا چاہئے بلکہ اگر آپ کا دل نہیں مانتا تو اس چیز کو قبول نہ کریں اس کی جانچ پڑتال کریں' اگر وہ آپ کی عقل پر پوری اترے تو اس کو قبول کریں' خواہ مذہب ہی کیوں نہ ہو۔

سقراط پر حق گوئی کی پاداش میں نوجوانوں کو بگاڑنے کا الزام لگا کر گرفتار کر لیا گیا۔ جب سقراط کو اس کے دوستوں نے مشورہ دیا کہ یونانی حکومت نے تمہیں موت کی سزا سنائی ہے تم یہاں (جیل) سے بھاگ جاؤ' تو سقراط نے یہ کہہ کر فرار ہونے سے انکار کر دیا کہ : "میں اپنی ریاست کے قانون کو نہیں توڑ سکتا۔"

سقراط سیاست اور اخلاق میں گہرا تعلق سمجھتا تھا' اس نے یونانیوں کو اخلاقی تعلیم دی' تاکہ سیاست اخلاقیات کے تابع رہے۔ اس کا کہنا تھا کہ ہر شخص کو چاہئے کہ وہ صحیح اور غلط میں تمیز کرے اور اپنے انفرادی استدلال' خاص طور پر اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہے۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کا ضمیر اسے پرکھنے کی ایک بہترین کسوٹی ہے۔ اگر انسان برا کام کرتا ہے تو اس کا ضمیر اسے سکون سے نہیں بیٹھنے دیتا' لیکن انسان جب کوئی اچھا کام کرتا ہے تو اس کا ضمیر مطمئن ہو جاتا ہے اور یہی طمانیت اسے مسرت و انبساط عطا کرتا ہے۔

افلاطون کا نظریہ سیاسی : افلاطون ایک بلند سیاسی سوجھ بوجھ کا مالک تھا۔ اس نے "مثالی ریاست" کا تصور پیش کیا' جس کی بنیاد محض انصاف پر رکھی۔ اس کا کہنا تھا کہ انصاف ہر شخص کا بنیادی اور فطری حق ہے۔ اس کے نظریہ انصاف کے مطابق سوسائٹی کے ہر طبقہ منطقی' فوجی'

پیشہ ور" کے افراد کے لئے لازم ہے کہ وہ اپنے انصاف کے حصول کے لئے خود کوشاں رہیں۔ اس کوشش کا نتیجہ صرف اس وقت حاصل ہو سکتا ہے جب افراد کو اپنے اپنے فن میں کامل مہارت ہو۔ اپنے فرائض کی تکمیل نہ کرنے سے اگر کوئی شخص کوئی نقصان اٹھاتا ہے تو انصاف کے تقاضوں سے قطعی بعید نہیں ہے۔

افلاطون نے ریاست کو ایک جسم قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جس طرح انسان کے جسمانی عضا ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں اور اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ پورے جسم کے کسی ایک عضو کے کسی ایک حصہ میں ذرا سی بھی تکلیف ہو تو پورے جسم کو اس کا درد محسوس ہوتا ہے۔ اسی طرح ریاست بھی ایک جسم ہے اور افراد اس کے اعضا کی مثال ہیں۔ اگر پورے معاشرہ میں کسی ایک فرد کو بھی کوئی تکلیف لاحق ہو تو پورے معاشرہ کو اس تکلیف کا احساس ہونا چاہئے۔

افلاطون کا خیال ہے کہ انصاف کو قائم رکھنے کے لئے ملک کی جغرافیائی نوعیت کو بھی مد نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اگر ایک ریاست وسیع و عریض جغرافیائی حدود کی حامل ہے تو وہاں پوری سر زمین پر یکساں نوعیت کا انصاف قائم رکھنا بہت دشوار ہو گا۔ چنانچہ اگر کوئی ریاست زیادہ وسیع و عریض ہو تو اس کی جغرافیائی تقسیم اس طرح ہونی چاہئے کہ انتظامی امور کے لئے اسے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تاکہ لوگوں کو مقامی طور پر انصاف حاصل ہو سکے۔

افلاطون کے نزدیک بادشاہت کا حقدار صرف فلسفی ہے۔ بالفاظ دیگر بادشاہ بننے کا حقدار صرف وہی شخص ہے جو علم و فضل میں سب سے برتر ہو اور فلسفیانہ شعور رکھتا ہو۔

خلاصہ : افلاطون کے سیاسی نظریہ (مثالی ریاست) کا خلاصہ یہ ہے کہ:

(1) نظریہ انصاف کی بنیاد ان کاموں میں عدم مخالفت پر ہے جو معاشرہ کے مختلف افراد اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں سرانجام دیتے ہیں۔ ہر فرد کو صرف اپنا کام کرنا چاہئے دوسروں کے کام میں دخل نہیں دینا چاہئے۔

(2) ہر شخص کو اپنے فن میں مہارت حاصل کرنی چاہئے۔ جس شخص میں جس قدر صلاحیت پائی جائے اسے اسی قدر انعام و معاوضہ ملنا چاہئے۔ تاہم معذور افراد کو اس اصول سے مستثنیٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔

(3) ہر فرد معاشرہ پر لازم ہے کہ وہ جو کام بھی سرانجام دے اس میں خندہ پیشانی کو ہمیشہ مد نظر رکھے تاکہ معاشرہ میں باہمی اتفاق و یگانگت پیدا ہو۔

(4) ہر فرد کو دوسرے فرد کے لئے کام کرنا چاہئے۔ اگر ایک شخص دوسرے کے لئے کام کرتا ہے تو دوسرے کو بھی اس کے لئے کام کرنا چاہئے۔

(5) قانون کو فطرت سے ہم آہنگ ہونا چاہئے۔ اگر حکومت کا وضع کردہ قانون فطرت سے متصادم ہے تو ایسا قانون ناقابل عمل ہے۔

افلاطونی اشتمالیت : افلاطون کے سیاسی نظریات سے اشتمالیت (کیمونزم) کا تصور بھی اخذ کیا جاتا ہے۔ افلاطون کے نظریہ اشتمالیت کی بنیاد اس حقیقت پر ہے کہ انسانی سیرت در اصل ذہانت،

شجاعت اور خواہشات کا مرقع ہے۔ اور ان کے معاون لوگوں کو اپنی ذہانت اور شجاعت کی افراط و تفریط سے گریز کرنا چاہئے۔ افلاطون نے عوام کو اس افراط و تفریط سے بچانے کے لئے ان کے محافظوں کے لئے کہا ہے کہ انھیں کسی قسم کی نجی املاک نہیں رکھنی چاہیں۔ اس بنا پر اس نے خاندان پرستی کی بھی مخالفت کی ہے۔ افلاطون انفرادیت سے زیادہ اجتماعیت کا قائل تھا۔ اس کے نزدیک سوسائٹی کی بنیاد ہی اجتماعیت پر ہے۔ اس لئے اس کا خیال ہے کہ فرد کا مفاد جماعت کے مفاد سے منسلک ہونا چاہئے۔ اگر افراد اپنے اپنے مفاد کے لئے کام کریں گے تو اس عمل سے دوسروں کے مفادات متاثر ہوں گے۔ ہر شخص خود غرض ہو جائے گا اور دوسروں کے حقوق پامال کر کے ذخیرہ اندوز بن جائے گا۔ یوں امور سلطنت میں خرابیاں پیدا ہو جائیں گی۔ افلاطون کا نظریہ اشتمالیت ایک ایسی معاشرت ہے جو دولت اور آمدنی کی یکساں تقسیم اور مشترکہ جائداد کے تصور پر قائم ہوتی ہے۔ افلاطون نے اشتمالیت ازدواج کا نظریہ بھی پیش کیا۔ اس ضمن میں اس کا خیال ہے کہ ایک علاقہ میں سال میں ایک بار ایسا جشن منایا جانا چاہئے جس کا تمامتر اہتمام ریاست کی طرف سے ہو۔ اس جشن میں غیر شادی شدہ عورتیں اور مرد جمع ہوں اور حکومت کے نمائندے قرعہ اندازی کریں' جو عورت جس مرد کے حصہ میں آئے اس کی کفالت اسی مرد کے ذمہ ڈال دی جائے۔ اس مرد کو یہ حق ہونا چاہئے کہ وہ اپنی بیوی کو اپنے فرائض منصبی میں مدد کے لئے شامل کر سکے۔ بچوں کے بارے میں افلاطون کا خیال ہے ان کی پرورش سرکاری اخراجات پر ہونی چاہئے۔ پیدائشی طور پر کمزور بچے اگر تھوڑے سے علاج معالجہ سے تندرست نہ ہو سکیں تو انہیں ہلاک کر دینا چاہئے۔ افلاطون کی اشتمالیت کا ہدف صرف فلسفی حکمران اور فوجی طبقہ ہے۔ معاشرے کا تیسرا طبقہ یعنی غلام مزدور اور دیگر پیشہ ور افراد اس سے مستثنیٰ ہیں۔

"فلاسفر بادشاہ" کا نظریہ : افلاطون اس امر کی پابندی لگاتا ہے کہ عنان حکومت صرف ایسے افراد کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو فلسفہ کے ماہر ہوں۔ اس کے نزدیک ایک فلاسفر بادشاہ بہترین سٹیٹس مین (Statesman) ہوتا ہے اور اعلیٰ درجہ کا تاجور ہوتا ہے۔ اس کی حکومت مثالی نوعیت کی ہوتی ہے اور قانون کا سرچشمہ وہ خود ہوتا ہے۔

ارسطو کا سیاسی نظریہ : ارسطو کے نزدیک انسان کا وجود انفرادی طور پر کوئی اہمیت نہیں رکھتا بلکہ اس کی مثال اس قطرے کی سی ہے جو دریا کی لہروں کے ساتھ مل کر موجزن ہو سکتا ہے اور تلاطم برپا کر سکتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان اسی وقت صحیح انسان کہلانے کا مستحق ہے جب وہ دوسروں کے ساتھ مل کر رہنے کا عادی ہو۔ اس کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اتحاد کے بغیر انسان کی بقا ناممکن ہے۔

ارسطو کے خیال میں معاشرہ کی تشکیل کے بعد دو قسم کی انجمنیں ریاست کی ترقی کے لئے کام کرتی ہیں' یعنی اخلاقی انجمنیں اور سیاسی انجمنیں۔ اخلاقی انجمنوں کے ذریعہ عوام میں ہم آہنگی' خوش اطواری' تنظیم' اتحاد' محبت' اخوت' راست گوئی قسم کے فضائل پیدا ہوتے ہیں اور انہی صفات کی بنا پر ایک صحت مند معاشرہ تا دیر قائم رہتا ہے۔ سیاسی انجمنوں کا کام ریاست کے اندرونی معاملات کی دیکھ بھال اور سرحدت کا تحفظ ہے۔ ارسطو کے نزدیک فرد اور ریاست میں

بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں' کیونکہ جو صفات ایک فرد میں پائی جاتی ہیں' وہی صفات ایک ریاست میں بھی ملتی ہیں۔ اگر فرد ہے' تو ریاست کا وجود باقی ہے اور اگر ریاست ہے تو فرد کا احترام باقی ہے' ورنہ دونوں کچھ بھی نہیں۔ اس ریاست کو انسانی صفات سے مشابہ قرار دیا ہے اور اسے انسانی جسم کی مثال سے واضح کیا ہے۔ جس طرح ایک بچہ پرورش پا کر' تعلیم و تربیت حاصل کر کے ایک مکمل انسان بنتا ہے' اور ایک مکمل انسان بن جانے کے بعد اس سے آگے کئی اور انسان وجود پزیر ہوتے ہیں' جن کے اجتماع معاشرہ تشکیل پاتا ہے' اسی قسم کی ارتقائی منازل طے کر کے ریاست وجود میں آتی ہے۔ وہ افراد معاشرہ ریاست کے اجزائے ترکیبی قرار دیتا ہے۔

ارسطو کے نزدیک افراد معاشرہ متعدد صفات کے مالک ہوتے ہیں' بعض اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے روشن دماغ اور صحیح الفکر ہوتے ہیں۔ بعض اپنے فنون کے نشہ میں مگن رہتے ہیں اور بعض افراد کو اپنی جسمانی توانائی پر ناز ہوتا ہے۔ بعض عقل سے عاری ہوتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مشقت برداشت کر سکتے ہیں' اس لئے ایسے لوگوں کو غلام بنایا جا سکتا ہے۔ ارسطو کے نزدیک کوئی عورت یا غلام یا مزدور حصول تعلیم کا اہل نہیں۔ اس کے نزدیک ایک اعلیٰ اور مثالی طرز حکومت کے لئے لازم ہے کہ اس کے ارباب اقتیار متوسط طبقے سے منتخب کئے جائیں تاکہ نگران میں خود سے اونچے طبقہ کی دولت و ثروت دیکھ کر غصہ یا حسد پیدا ہو تو وہ اپنے سے نچلے طبقہ کی مفلسی دیکھ کر صابر و شاکر ہو جائیں۔

ارسطو کے نزدیک ریاست ایک ایسی تنظیم ہے جو مختلف الانواع افراد پر مشتمل ایک بڑے با مقصد اجتماع پر مبنی ہو' اور جس میں ہر ایک فرد فطرتاً' عادتاً اور ضرورتاً ایک دوسرے کے ساتھ منسلک ہو۔

ریاست کے فرائض :

ارسطو کے نزدیک ایک ریاست پر مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

1- تمام افراد معاشرہ کی معاشی حالت کو درست رکھنے میں اعانت
2- تمام افراد کے حقوق زندگی کا تحفظ
3- آزادی و خوشحالی کو برقرار رکھنے کے لئے ایک فعال انتظامیہ کی تشکیل
4- تمام افراد معاشرہ آزادی فکر' آزادی ارتقاء اور خود مختار زندگی کی یقین دہانی۔
5- تمام افراد معاشرہ کی شر سے حفاظت
6- تعلیم و تربیت اور فنون کی تدریس
7- ہر فرد معاشرہ کو ذہنی' اخلاقی اور سماجی نشوونما کے لئے مناسب وسائل کی فراہمی
8- افراد معاشرہ کی جبلی خواہشات کی تکمیل و تسکین
9- تمام افراد معاشرہ کی جان اور املاک کی حفاظت

نظریہ حکومت : حکمرانی کے معاملہ میں ارسطو کا خیال ہے کہ حکمران ایک فرد ہونا چاہئے' جو وقت کے تقاضوں کے مطابق پیدا شدہ مسائل کو بہر نوعیت حاصل کرنے کے لئے خادم قوم بن کر کام کرے اور ریاست کی طرف سے ودیعت کئے گئے اختیارات کو بالخصوص مفادات عوام کے

لئے استعمال کرے' نہ کی ذاتی برتری اور عظمت کا مظاہرہ کرنے کے لئے۔ وہ ریاست پر حکومت کو ترجیح دیتا ہے۔ اس کے خیال میں حکومت میں تین عناصر کار فرما ہوتے ہیں۔ اول پیدائش' دوم دولت اور سوم تعداد۔ جو حکومت پیدائش پر مبنی ہو وہ چنداں کامیاب نہیں ہوتی۔ پیدائش سے مراد سلسلہ وراثت ہے یعنی بادشاہ کا بیٹا بھی بادشاہ ہو گا۔ ارسطو کے نزدیک دولت ایک خطرناک چیز ہے اور اس کی فراوانی انسان سے دل سے رحم و کرم کے جذبات معدوم کر کے فخر و غرور بھر دیتی ہے۔ اس کے نزدیک دولت کو کامیاب حکومت چلانے کا احسن ذریعہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔ تعداد کے بارے میں ارسطو کا کہنا ہے' چونکہ حکومت افراد پر کی جاتی ہے' اور افراد متعدد ہوتے ہیں۔ پھر ہر فرد کی صلاحیت مختلف ہوتی ہے' لہٰذا مختلف افراد کے مطالبات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ ان متعدد مطالبات کو منوانے اور مختلف افراد کے نظریات پر کار بند ہونے کے لئے ضروری ہے کہ ایسی حکومت ہو جس میں ریاست میں موجود تمام قسم کے لوگوں کی نمائندگی ہو جائے۔ اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ افراد کی ایک خاص تعداد حکمرانی کے لئے منتخب کر لی جائے۔

یہی لوگ مل کر اپنے مسائل کو حل کریں۔ اس کا کہنا ہے کہ جو حکومتیں اجتماعی فیصلوں پر چلتی ہیں' وہ کامیاب رہتی ہیں۔

ارسطو نے مختلف قسم کی حکومتوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان پر تنقید بھی کی ہے۔ اس کے نزدیک حکومتیں تین قسم کی ہوتی ہیں۔ اول ملوکیت' دوم اشرافیہ سوم دستوری حکومت۔ اس نے جمہوری طرز حکومت (جمہوریت) کا تذکرہ منفی انداز میں کیا ہے۔

ارسطو کے نزدیک قانون کسی جامد شے کا نام نہیں' اس میں ہر وقت کی ضروریات کے مطابق ترمیم و اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ تبدیلی عوام کے مفاد میں ہونی چاہئے۔ ریاست کی کسی بھی شہری کو قانون پر بالا دستی حاصل نہیں ہو سکتی چنانچہ حکمران کو چاہئے کہ وہ خود بھی قانون پر سختی سے کار بند ہو اور عوام کو اس پر عمل کرنے کی سختی سے تلقین کرے۔ اس کا کہنا ہے کہ بے تحاشا افراط زر اور قوت کے یکجا جمع نہ ہونے کے لئے بر وقت کاروائی کرنی چاہئے۔ اس کا یہ بھی کہنا ہے کہ حکومت کے معاملات میں غیر ملکیوں' اجنبیوں اور دشمنوں کو یا ان کے نمائندوں کو شامل نہ ہونے دیا جائے۔

نظریہ انصاف : ارسطو کے نظریہ انصاف کی بنیاد اخلاق پر ہے۔ اس کے نزدیک قوانین بنیادی' قدرتی اور اخلاقی ہوتے ہیں۔ اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ ریاست کا ہر فرد اپنے فرائض منصبی کو بہ طریق احسن انجام دے اور قانون شکنی کی نوبت نہ آئے۔ وہ انصاف کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اول قابل تقسیم' دوم اصلاح کن۔ قابل تقسیم انصاف کے بارے میں ارسطو کا خیال ہے کہ یہ انصاف ہر ایک فرد' سیاسی جماعت اور حکومت کے ساتھ اس کی قدر و قیمت اور مقام کے مطابق کیا جاتا ہے۔ مثلاً جمہوریت میں اس کی بنیاد شرح پیدائش پہ ہو گی' چند سری نظام میں اس کی بنیاد امارت پر ہو گی اور اشرافیہ میں اس کی بنیاد کثرت نیکی پر ہو گی۔ اصلاح کن انصاف کے بارے میں ارسطو کا کہنا ہے کہ اصلاح کن (Corrective) انصاف کا تعلق زیادہ تر کاروبار سے ہے' مثلاً تجارتی لین دین' خرید و فرخت' مسائل جائداد اور انفرادی آزاردی کے مسائل میں اعتدال رکھنا اصلاح کن انصاف ہے۔

سوال : مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے :

1- ہنود کا نظریہ سیاسی

2- چین کا نظریہ سیاسی

ہنود کا نظریہ سیاسی :

ہندوستان میں ابتدائی دور میں ہمیں چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا پتا چلتا ہے۔ رگ وید کے زمانہ میں آریہ آبادی کا سب سے چھوٹا ادارہ گاؤں (گرام) تھا جس میں چند خاندان بستے تھے۔ قبیلے کا سردار "راجا" کہلاتا تھا۔ قبیلے کی راجدھانی اس کی مرکزی بستی ہوتی تھی جس کے بیچ راجا کا گھر ہوتا تھا۔ راجا کے گھر کے نزدیک اس کے خاندان کے لوگ اپنے گھر بناتے تھے اور ان کے بعد وہ لوگ جن کا تعلق حکومت سے کوئی تعلق ہوتا تھا۔

چوتھی صدی قبل مسیح سے دھرم سوتروں مذہبی کتب میں عام مذہبی قانون مرتب کرنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ چونکہ اشخاص کے حقوق و فرائض مقرر کئے جا چکے تھے اور ہر ذات کے لوگوں کو اپنا دھرم معلوم تھا اس لئے خاص ملکی قانون کا دائرہ تنگ تھا اور وہ تمام تر راجا کے فرائض کے تحت بیان کیا گیا تھا۔ راجا کے لئے ضروری تھا کہ وہ زندگی اور دھرم کا نظام قائم رکھے۔ قانون کی پابندی کرائے لوگوں کی جان و مال کی حفاظت کرے مجرموں کو سزائیں دے عالموں کی سرپرستی کرے اور حکومت کا نظام چلانے کے لئے لگان وصول کرے عام قانون کی حدود کے اندر مختلف پیشہ وروں کو اختیار تھا کہ وہ اپنے لئے مخصوص قانون بنائیں۔

ابتدا میں ہر قبیلہ کا سردار راجا کہلاتا تھا۔ ایک راجا اپنے ساتھ اپنے خاندان والوں کے علاوہ دیگر لوگوں کو ملا کر کسی علاقہ پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیتا تھا تو مفتوحہ علاقہ اس کی ریاست بن جاتا تھا۔ ہندوستان میں اسی قسم کے بے شمار چھوٹے چھوٹے راجے اور راجدھانیاں موجود تھیں۔ جو راجا کئی راجاؤں کو اپنا مطیع بنا لیتا تھا وہ "مہاراجا" کہلاتا تھا۔ بالعموم ہر راجا خاندانی ہوتا تھا یعنی راجا کے بعد اس کا بیٹا راجا بنتا تھا مگر بعض قبیلے اپنے راجا کا انتخاب بھی کرتے تھے اور کثرت رائے سے جسے چاہتے اسے اپنا راجا بنا لیتے تھے۔ جب کسی راجا کی سلطنت وسیع ہو جاتی تو وہ کاروبار حکومت چلانے کے لئے مختلف لوگوں کی معاونت حاصل کر لیتا۔ فوجوں کا سپہ سالار "سینانی" (سیناپتی)۔ دیہاتی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے والا "گرامانی" اور مذہبی سلسلہ میں راجا کو مشورے دینے والا "پروہت" کہلاتا تھا۔

منوشاستر : اسی اثناء میں ہندوؤں میں ایک مصلح "منو" پیدا ہوا جو ہندوؤں کا سب سے بڑا قانون دان تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس نے اپنے نظریات کے تحت جو قانون وضع کیا اس کا تحریری مجموعہ "منوشاستر" یا "منو سمرتی" کہلاتا ہے۔

منو شاستر میں مذکور ہے کہ :

> برہما نے دنیا کی بہبودی کے لئے اپنے منہ اور اپنے بازوؤں سے اور اپنی رانوں سے اور اپنے پیروں سے برہمن، چھتری، ویش اور شودر پیدا کیا اور ان جاتوں میں سے اس دنیا

کی حفاظت کے لئے ہر ایک کے لئے علیحدہ علیحدہ فرائض قرار دیئے۔ برہمنوں کے لئے وید کی تعلیم اور خود اپنے اور دوسروں کے لئے دیوتاؤں کو چڑھاوے دینا اور دان لینے دینے کا فرض قرار دیا گیا۔ چھتری کو اس نے حکم دیا کہ خلقت کی حفاظت کرے' دان دے' اور چڑھاوے دے' وید پڑھے اور شہوات نفسانی میں نہ پڑے۔ ویش کو اس نے حکم دیا کہ مویشی کی سیوا کرے' دان دے اور چڑھاوے دے اور تجارتی لین دین کرے اور تجارتی لین دین کرے اور زراعت کرے۔ شودر کے لئے برہما نے صرف ایک ہی فرض بنایا ہے کہ وہ ان تینوں جاتیوں کی خدمت کرے۔

منوشاستر کے مطابق برہمن قوم کو سب قوموں پر برتری حاصل ہے۔ اسے سب سے اعلیٰ مخلوق اور کل کائنات کا بادشاہ قرار دیا گیا ہے۔ کہا گیا ہے کہ برہمن چونکہ خلقت میں سب سے بڑا ہے اس لئے سب چیزیں اسی کی ہیں۔ اگر برہمن کی ضرورت ہو تو وہ اپنے غلام شودر کا مال جبریہ لے سکتا ہے' کیونکہ وہ اس کی کل ملکیت کا مالک ہے۔ بادشاہ کو کسی بھی حالت میں' خواہ وہ مرتا بھی کیوں نہ ہو' برہمن سے محصول نہیں لینا چاہیے۔ راجا برہمن کو کسی بھی جرم کی سزا کے طور پر قتل نہیں کر سکتا' ہاں سنگین جرم کی صورت میں اس کا سر مونڈا جا سکتا ہے یا ملک بدر کیا جا سکتا ہے۔

منوشاستر کے مطابق شودر کی نجات کا ذریعہ گرہست برہمنوں کی خدمت کرنا ہے۔ شودر کو مال و دولت جمع کرنے کی اجازت نہیں کیونکہ شودر کا مال جمع کرنا برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔ اگر شودر کسی عضو سے برہمن کی تنگ کرے تو اس کا وہ عضو کاٹ دینا چاہیے۔ اگر شودر برہمن کے برابر بیٹھ جائے تو اسکی کمر پر داغ لگا کر جو تڑ کٹوا کر ملک بدر کر دینا چاہیے۔ اگر برہمی وید کے الفاظ سن لے تو اس کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینا چاہیے' اور اگر وہ وید کے الفاظ زبان سے ادا کرے تو اس کی زبان کاٹ دینے کا حکم ہے۔

ہندو ریاستوں کی نوعیت : ہندو ریاستوں میں اگرچہ ذات پات کا امتیاز موجود تھا اور برہمن ان پر اثر انداز ہونے کی کوشش کرتے رہتے تھے' لیکن اس کے باوجود یہ ریاستیں مذہبی ریاستیں نہیں تھیں۔ راجاؤں کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ مذہب کو سیاست پر غالب نہ آنے دیں۔ چنانچہ ہندو ریاستیں عملی طور پر مذہب یا عبادت گاہ کے ماتحت نہیں ہوتی تھیں۔ مذہبی احکام صرف راعی اور رعایا کی اخلاق رہنمائی کے اصولوں تک محدود تھے۔ اس حالت کے پیش نظر سیاسی غور و فکر کی اجازت تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ سیاسی طور پر عظیم تصورات کو جنم دے سکے۔ تاہم وہ ان تصورات کو عملی جامہ پہنانے میں ناکام رہے' کیونکہ ذہنی طور پر اصنام پرستی ان کی ادی ترقی میں محدود معاون نہ ہو سکی۔

منو کے قانون نے اس کہاوت کو عملی جامہ پہنا دیا تھا کہ "جس کی لاٹھی اس کی بھینس"۔ یعنی جو راجا زیادہ طاقتور ہوتا تھا وہ کمزور راجاؤں کی ریاستوں کو فتح کر کے اپنی ریاست میں شامل کر لیتا تھا۔

چانکیہ : ہندوؤں میں منو کے بعد "چانکیہ" نامی شخص ایک بڑا سیاست دان بن کر ابھرا۔ وہ

قوم کا برہمن تھا اور چندر گپت کا وزیراعظم۔ مندر گپت نے اسی کی مدد سے نندا راجا کو شکست دے کر مگدھ کا تخت حاصل کیا تھا۔ چانکیہ نے اپنے سیاسی نظریات کے تحت ایک کتاب تصنیف کی' جس کا نام "ارتھ شاستر" تھا۔ اس کتاب میں حکومت کرنے کے اصول و ضوابط تحریر کئے گئے ہیں۔ چانکیہ ایک عظیم سلطنت کا وزیراعظم ہونے کے باوجود بادشاہ کے شاندار محل کے پاس ایک جھونپڑی میں رہتا تھا' جس کی دیواریں مٹی کی تھیں اور چھت کی جگہ اس پر چھپر پڑا ہوا تھا۔ چانکیہ اگرچہ برہمن تھا' لیکن اس نے ذات پات کا زور توڑنے میں بادشاہ کی معاونت کی اور مذہب کو سیاست پر غالب نہ آنے دیا۔ دوسرے بادشاہ خود موریہ خاندان سے تعلق رکھتا تھا' اور بعض مورخین کا خیال ہے کہ اس (چندر گپت) کی ماں شودر تھی' اور بادشاہ ہندو دھرم کی بجائے جین مت کا پیرو تھا ان وجوہات کی بنا پر بھی' برہمنوں کے نظریات سیاسی نظریات پر غالب نہ آ سکے۔

حکمران کی حیثیت : ہندو سیاسی نظریہ کے مطابق اقتدار کو مملکت کی ذات سے وابستہ تصور کیا گیا ہے' لیکن حکمران بحیثیت انسان ضبط نفس کا پابند تھا اور وہ بھی عام فرد کی طرح غلطی کرنے پر مستوجب سزا قرار پاتا ہے۔

رائے عامہ کی حیثیت : ہندو مفکرین نے عام طور پر من مانے اقتدار کو مملکت خلاف عملی مدافعت کا مظاہرہ کیا۔ انہوں نے انقلاب کو ہوا دی اور اس طرح اپنے نظریات کو عملی تحریک دی۔ ان کے ایک عظیم مفکر کا کہنا ہے کہ : بہت سے افراد کا اتفاق رائے بادشاہ سے زیادہ طاقتور ہے' وہ رسی جو بہت سے دھاگوں میں بل دے کر بنائی جاتی ہے' اتنی مضبوط ہوتی ہے کہ شیر کو بھی کھینچ لائے گی۔

محدود قسم کی مطلق انسانیت : ہندو نظریہ میں ایک خود پرست مطلق انسان بادشاہ کے بجائے محدود کم کی مطلق انسانیت کو جائز قرار کیا گیا ہے اور ضبط توازن کے نظریہ کی حمایت کی گئی ہے۔

چین کا نظریہ سیاسی : چین میں' ابتداء میں چھوٹی چھوٹی ریاستیں تھیں۔ کافی عرصہ بعد "چو" خاندان برسراقتدار آیا تو سیاسی نظریات کو پھلنے پھولنے کا موقعہ ملا۔ پھر وقت نے کنفیوشس' مین شیس' موہتی اور لاوزی جیسی شخصیات پیدا کیں جنہوں نے چین کو متحد ہونے کی تعلیم دی۔ انہوں نے عوام کو قانون کی ضرورت کا احساس دلایا۔ اب لوگوں نے بالخصوص عوام کو اخلاقیات کی تعلیم دی۔

کنفیوشس : کنفیوشس "انسان اعلیٰ" کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا کہ انسان اعلیٰ اپنی روح کو عزیز رکھتا ہے اور پست آدمی اپنی دولت اور جائداد کو۔ انسان اعلیٰ اپنی کوتاہی کا الزام اپنے ذمہ لیتا ہے لیکن کمتر آدمی اپنی کوتاہی کی ذمہ داری دوسروں پر تھونپتا ہے۔ انسان اعلیٰ کے کردار کی علامت بنی نوع انسان سے ہمدردی اور شفقت ہے۔ کنفیوشس کا خیال ہے کہ سارے اعمال کا دارومدار خلوص نیت پر ہے۔ بلند کردار آدمی کی یہ نشانی ہے کہ اس کے قول اور عمل

میں مطابقت ہوتی ہے۔

کنفیوشس نے نظام سلطنت کے بارے میں بہت سے اصول وضع کئے ہیں' جن میں سے چند اصول یہ ہیں۔

1- بادشاہ خود اپنے عمل سے رعایا کے لئے اچھی مثالیں قائم کرے۔
2- حکومت بغیر عوام الناس کی حمایت کے قائم نہیں رہ سکتیں اس لئے حکمران کے لئے عوام الناس کا اعتماد حاصل کرنا ضروری ہے۔ اعتماد محبت کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے اور محبت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب حکمران طبقہ عوام الناس کی بھلائی اور بہبودی کے لئے کام کرے۔
3- حکمران علم و عقل کو اپنا مشیر بنائیں۔
4- حکمران طبقہ اور رعایا اپنے اپنے فرائض خلوص دل سے سرانجام دیں۔
5- لوگوں کے ساتھ ایسا سلوک نہیں کرنا چاہئے جسے وہ خود اپنے لئے پسند نہ کریں۔
6- حکومتی عہدوں پر ایماندار اور دیانتدار آدمیوں کو مقرر کیا جائے۔ کنفیوشس سلطنت کی خرابیاں دور کرنے اور اسے درست رکھنے کا طریقہ بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ:

"قدماء جب چاہتے تھے کہ ساری سلطنت میں نیکی پھیل جائے تو وہ سب سے پہلے اپنی ریاست کو درست کرتے تھے' ریاست کو درست کرنے سے پہلے اپنے خاندان کو درست کرتے تھے۔ اپنے تئیں درست کرنے سے پہلے وہ اپنے دلوں کو درست کرتے تھے' اپنے دلوں کو درست کرنے کے لئے وہ اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرتے تھے۔ اپنے خیالات میں خلوص پیدا کرنے سے پہلے وہ اپنا علم بڑھاتے تھے اور اشیاء کے علم علم بڑھانے کے لئے اشیاء کی ماہیت کی تحقیقات میں مصروف ہو جاتے تھے۔"

کنفیوشس کا کہنا ہے کہ:

"جب اشیاء کی ماہیت معلوم ہو گئی تو پھر علم مکمل ہو جاتا ہے۔ جب علم مکمل ہو جاتا ہے تو خیالات میں خلوص پیدا ہو جاتا ہے۔ خیالات کے بعد دل میں بھی خلوص آ جاتا ہے' اور جب دل درست ہو جاتا ہے تو ہو خود درست ہو جاتے ہیں' جب وہ درست ہو جاتے ہیں تو ان کا خاندان درست ہو جاتا ہے' جب ان کے خاندان درست ہو جاتے ہیں تو ان کی ریاست درست ہو جاتی ہے' اور جب ریاستیں درست ہو جاتیں ہیں تو ساری سلطنت درست ہو جاتی ہے۔"

مین شیس (MECIOUS) : کنفیوشس کے قریباً سو سال بعد مین شیس نامی ایک عظیم مصلح پیدا ہوا' جس نے اپنی تعلیمات میں' توحید' انسان کی طبعی نیکی اور کنفیوشس کے اعلیٰ اصولوں کا درس دیا۔ مین شیس کا کہنا ہے کہ نیکی کر طرف انسان کی فطرت کا رجحان بالکل اس طرح ہے جیسے پانی (بہنے) کے رجحان نیچے کر طرف ہوتا ہے۔ اس کا قول کہ "انسان اپنی زندگی کا آغاز نیک فطرت سے کرتا ہے۔"

موہتی (MOHTI) : اس کا قول ہے کہ مملکت میں اہم ترین عناصر افراد ہیں۔ دوسرے

نمبر پر قومی دیوتاؤں کی قربان گاہیں آتی ہیں اور انتہائی کم اہمیت بادشاہ کی ہے۔ ہم افراد کی فطرت کے مشاہدہ سے خدا کی منشا یا ارادے کی بابت سیکھتے ہیں۔
چین میں موہتی کے قول کے مطابق بادشاہ کا تیسرا درجہ ہے۔ اگر بادشاہ خود کو ناکارہ ثابت کر دے تو اسے معزول کر کے عارضی طور پر قید کیا جا سکتا ہے۔

سوال : مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھئے :

(الف) یہودی نظریہ سیاسی

(ب) رومی نظریہ سیاسی

جواب : یہودی نظریہ سیاسی :

یہودیوں کا نظریہ سیاسی پر مذہب کی چھاپ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ حکومت ربانی حکم سے قائم ہوتی ہے اور تمام قوانین جو خدا تعالیٰ یہواہ (Jeh ovah) نے وحی کے ذریعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل کئے ہیں' وہی قابل پابندی ہیں۔ یہ احکام تحریری صورت میں تورات کی صورت میں موجود ہیں' جن میں ترمیم و اضافہ نہیں کیا جا سکتا۔ ان قوانین و احکام پر عمل کرنا حکمرانوں اور رعایا دونوں پر فرض ہے۔ ربانی حمایت کے لئے انہوں نے فرمانبرداری کے ایک عہد نامہ پر دستخط کئے۔ جب وہ اس عہد نامہ کی خلاف ورزی کرتے تھے تو اس عہد نامہ کی خلاف ورزی کے مرتکب ہونے کے ساتھ ساتھ خدا کے حکم کے نافرمان بھی متصور ہوتے تھے۔
یہودیوں کا عقیدہ تھا کہ روئے زمین پر صرف یہودی یہ افضل ترین قوم ہیں اور مخلوق پر حکمرانی کرنے کے حقدار' ان کے نزدیک خدا نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ انہیں روئے زمین پر حکمران بنائے گا۔
یہودیوں کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ خدا سے اہم امور میں مشورہ کیا جا سکتا ہے اور خدا اپنے منتخب بندوں (نبیوں) کے ذریعے اس کا جواب دیتا ہے۔ بنی اسرائیل میں وقتاً" فوقتاً" نبی آتے رہے۔ ان رہنماؤں کی حیثیت بہ اعتبار توارث نہ تھی اور نہ ہی وہ کسی علیحدہ جماعت کی تشکیل دیتے تھے۔ ان کے فرائض اخلاقی تھے' سیاسی نہیں اس کے باوجود کہ یہودی مملکت کی بنیاد مذہبی تھی لیکن اس پر مذہبی پروہتوں کی اجارہ داری نہیں تھی' بلکہ بیشتر بادشاہ اور منصفین اس گروہ یا جماعت کے باہر کے لوگوں سے آتے تھے۔
مطلق انسان سلطنت کے قیام کے بعد جب یہودی قبائل ایک یونین کی شکل میں منظم ہوئے اور ایک سے زیادہ مرکزی حکومت بنانے پر مجبور ہوئے تو اس کے لئے انہیں فلسطین کی طرف سے ایک مشترکہ خطرہ درپیش رہا۔ تب انہوں نے خدا سے ایک بادشاہ کے لئے درخواست کی۔ چنانچہ خدا نے ان کا پہلا بادشاہ "ساؤل" بذریعہ ساؤل منتخب ہوا جس کا کردار خدا اور پروہت کے مابین تھا۔ اور جب ساؤل نااہل ثابت ہوا تو سموئیل پادری نے اسے معزول کر دیا

اور اس کا جانشین منتخب کر لیا۔

یہودیوں میں نافذ ہونے والا پہلا قانون توریت کے خدا (یہوواہ) کی راست مرضی پر مشتمل تھا۔ اسی قانون کے تحت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس قسم کی عدالتیں قائم کیں جہاں باضابطہ مقررہ قانون کے تحت عام مقدمات کا فیصلہ کیا جاتا تھا۔

یہودیوں کی مختصر سیاسی تاریخ : سکندر اعظم کے عہد میں یہودی یونانیوں کے زیر اثر تھے۔ اس کی وفات کے بعد یہودی ایک صدی تک مصر کے بطلیموس خاندان کے زیر اثر رہے۔ اس دوران ان میں قومیت کا احساس شدت سے ابھرنے لگا۔ پھر فلسطین یونانی بادشاہ سیکولس کے زیر نگین آگیا۔ انطالیس چہارم نے یہودی مذہب مٹانے کی کوشش کی تو یہودیوں میں قومی احساس پیدا ہوا۔ انہوں نے ایک کامیاب بغاوت کی اور فلسطین میں ایک یہودی ہاسمونین خاندان کی حکومت قائم ہو گئی۔ جب اس حکومت نے مذہب کو کوئی اہمیت نہ دی تو یہودیوں کے مذہبی طبقات نے اس خاندان سے قطع تعلق کر لیا۔ یہ مذہبی طبقات "حسیدین" (Hasdean) کہلاتے تھے۔ ان کے بعد فریسیوں کا گروہ پیدا ہوا جو عزرا اور نحمیاہ نبی کا پیرو تھا۔ ان لوگوں نے حکومت کی مخالفت کی۔ آخرکار مذہبی قیادت و سیادت تسلیم کر لی گئی۔ یوں یہودیوں کے مذہبی طبقہ کے ہاتھ مذہبی اور دنیاوی قیادت کی باگ ڈور آگئی۔ اس طبقہ کو یہودیوں پر کامل اختیارات حاصل تھے۔ یہ طبقہ عشر کی آمدنی کے علاوہ، یہ فصل میں پھلوں کی پہلی کھیپ بھی حاصل کرتا تھا۔

عزرا اور نحمیاہ نبی نے تورات کے قوانین کو مدون کیا۔ فقہ کی تدوین و اشاعت کی وجہ سے یہودیوں میں کئی فرقے پیدا ہو گئے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ یونانی تہذیب سے متاثر ہونے لگے اور آخرکار اسی تہذیب کے رنگ میں رنگ گئے۔

تورات اور نظریہ سیاسی : یہودیوں نے اپنے طور پر کوئی نظریہ سیاسی وضع نہیں کیا بلکہ وہ اپنی کتاب تورات ہی کے احکام کے مطابق سیاست کرتے رہے۔ ذیل میں چند احکام کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

جنگ اور قیدیوں کے متعلق تورات (بائبل) میں مذکور ہے کہ :

1۔ "جب خداوند تیرا خدا سے (مفتوحہ ملک کو) تیرے قبضہ میں کر دے تو وہاں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر..... لیکن ان قوموں کے شہروں میں جنہیں خداوند تیرا خدا تیری میراث کر دیتا ہے، کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑنا۔" (استثنا)

2۔ "سو تم ان بچوں کو جو لڑکے ہیں، سب کو قتل کرو، اور ہر ایک عورت کو مرد کی صحبت سے واقف ہو چکی ہو، جان سے مارو، لیکن وہ لڑکیاں جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں، ان کو اپنے لئے زندہ رکھو۔" (گنتی)

3۔ "جب کہ خداوند تیرا خدا انہیں تیرے حوالے کرے تو تو انہیں ماریو اور حرم کیجیو، نہ تو ان سے کوئی عہد کریو اور نہ ان پر رحم کریو، نہ ان سے بیاہ کرنا، اس کے بیٹے کو اپنی بیٹی نہ دینا، نہ اپنے بیٹے کے لئے اس کی بیٹی لینا۔" (استثناء)

4۔ "بنی اسرائیل کو خطاب کر، اور انہیں کہہ کر جب تم یردن سے پار ہو کر زمین کنعان میں داخل ہو تو تم ان سب کو جو اس سرزمین کے باشندے ہیں، اپنے ساتھ بھگاؤ، اور

ان کی مورتیں فنا کر دو' اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو نابود کر دو' اور ان کے سب اونچے مکانوں کو ڈھا دو' اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں خارج کر دو' اور وہاں آپ بسو۔" (گنتی)

غلام اور لونڈیوں کے بارے میں مذکور ہے کہ:

1۔ "اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو لاٹھیاں مارے' اور وہ مار کھاتے ہوئے مر جائے تو اسے سزا دی جائے' لیکن اگر وہ ایک دن یا دو دن جئے تو اسے سزا نہ دی جائے کیونکہ وہ اس کا مال ہے۔" (خروج)

2۔ اگر کسی شخص نے اپنے غلام کا نکاح کر دیا ہو اور اس کی بیوی سے اولاد پیدا ہو گئی ہو' تو ساتویں برس جب وہ آزاد ہو جائے تو وہ اکیلا جائے' اس کی بیوی اور بیٹے بیٹیاں اس سے الگ ہو کر آقا کی ملکیت ہو جائیں گی۔

رومی نظریہ سیاسی : چند قبائل نے مختلف پہاڑی علاقوں میں سلطنت روما کی بنیاد رکھی' جس کی شکل شہری ریاست کی سی تھی۔ اس ریاست کی حکومت ایک حکمران اور ایک اسمبلی پر قائم تھی۔ اسمبلی کی ابتدا جاگیرداروں کی رکنیت سے ہوئی۔ یہ جاگیردار بادشاہ کے مشیر ہوتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد عام لوگوں نے اقتدار حاصل کر کے ایک مجلس شوریٰ تشکیل دی۔ اب حکومت تین عناصر یعنی بادشاہ' اسمبلی اور مجلس مشوریٰ پر مشتمل تھا۔ پھر اقتدار جاگیرداروں کے ہاتھ سے نکل کر عام لوگوں کے ہاتھ میں آگیا اور جمہوریت پنپنے لگی۔ پھر روم کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک بڑی سلطنت میں ضم ہو گئیں اور سلطنت روم کی سرحدیں اٹلی تک پھیل گئیں۔

عوامی حکومت کے برسراقتدار آنے کے بعد بہت سے نئے علاقے مفتوح ہوئے اور یہ سلطنت ایک عظیم سلطنت بن گئی۔ پھر مجلس مشوریٰ کا اقتدار ختم ہو گیا اور آخر میں جمہوری نظام بھی محو ہو گیا۔ اب اس سلطنت پر بادشاہت مسلط ہو گئی' جس نے نظریہ تخلیق ربانی کو فروغ دیا۔ بادشاہ خدا کا نمائندہ متصور ہونے لگا اور اس کی حکم عدولی خدا کی حکم عدولی قرار دیدی گئی۔ ہر شہری بادشاہ کو "مظہر خدا" سمجھ کر پوجا کرنے لگا۔

سلطنت روما نے جس سیاسی نظام کو تحریک دی وہ مغربی دنیا میں بے حد مقبول ہوا' بلکہ یہ نظام یورپ میں تمام اسٹوارٹ بادشاہوں کی سب سے بڑی ڈھال تھا۔ نظریہ تخلیق ربانی نے بادشاہت کو سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں ناقابل تسخیر قلعہ بنا دیا۔

رومی نظریہ سیاسی تنظیم' نظم و ضبط' عالمگیر قانون اور جگ نیکی کے عناصر پر مشتمل تھا۔ انہی عناصر ترکیبی کے گرد رومی افکار کا حلقہ بنا دیا گیا' جس کی وجہ سے کوئی اختراعی نظریہ ظہور پذیر نہ ہو سکا۔ رومی نظریئے نے ریاست اور فرد کو دو اکائیوں میں بانٹ دیا۔ ریاست کے قیام کا مقصد فرد کے حقوق کا تحفظ تھا۔ اس طرح ریاست کو ایک شخصیہ تصور کیا گیا جو اپنے اختیارات کو اپنی مخصوص حدود میں استعمال کرنے پر زور دیتا ہے۔ نیز ہر شہری کو ایسا قانونی شخص قرار دیا گیا جو حقوق کی نعمت سے مالا مال ہے اور ان حقوق کا غیر قانونی مداخلات کے خلاف تحفظ فراہم کرنا خود حکومت کا فرض ہے۔

رومی قانون سیدھی سادی جزئیات کا مرکب تھا جس میں متضاد و متصادم قوانین بھی موجود تھے۔ اس زمانے میں یہ خیال بھی مقبول ہو کہ آخری اختیار عوام کو حاصل ہے۔

اسی بنیاد پر یہ رائے قائم کی گئی کہ شہنشاہ عوام سے اختیار حاصل کرتے ہیں، اس لئے وہ عوام کے سامنے جوابدہ ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تسلیم کر لیا گیا کہ شہنشاہ کے زبان ہلانے سے ہو جاتا تھا۔ بادشاہ تنہا قانون ساز سمجھا جاتا تھا بالفاظ دیگر وہ مطلق انسان تھا۔

تاریخ سیاست کے مطالعہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ رومی مفکرین سیاست بہت کم اختراعی صلاحیت کے مالک تھے، وہ افلاطون اور ارسطو کے سیاسی افکار ہی کو سب کچھ سمجھتے تھے۔

قرون وسطیٰ میں رومی نظریہ سیاسی : قرون وسطیٰ میں قدیم طرز کی سلطنت روما کو زوال آگیا اور آہستہ آہستہ یہاں پر "مسیحیت" غالب آنے لگی۔ 380ء میں تھیوڈ وسیس نے اعلان کیا کہ مسیحیت سلطنت کا سرکاری اور صرف قانونی مذہب ہو گا۔ اس وقت یورپ کے ترقی یافتہ علاقے نے مسیحی کو قبول کر لیا اور اس طرح روم نے لادینی اور مذہبی دونوں قسم کی مغربی دنیا کی قیادت کو جائز قرار دیا۔ روم کا گرجا مسیحیت کا صدر مقام بن گیا اور سلطنت کی سیاسی تنظیم سے مماثل ہو گیا۔ مسیحیت کو ریاستی مذہب قرار دیئے جانے کے ساتھ ہی روم نے ایک عظیم کلیسائی اہمیت حاصل کر لی۔ اسقف روم حکومت کا تسلیم شدہ افسر اور سلطنت کا قانونی مشیر تھا۔ رومی اسقف نے روحانی اور اخلاقی امور میں اختیار کا استعمال شروع کر دیا، حتیٰ کہ اس نے اس کو شہنشاہوں پر بھی استعمال کیا اور گرجے کے پادریوں نے دعویٰ کیا کہ گرجے کو وہ اختیارات حاصل ہیں جن میں شاہی اقتدار مداخلت نہیں کر سکتا۔

پادریوں کا نظریہ سیاسی : چھٹی اور ساتویں عیسوی کے درمیانی زمانے میں پادریوں کے سیاسی زاویہ ہائے نظر کو مندرجہ ذیل عنوانات کے تحت بیان کیا جا سکتا ہے۔

ریاست : پادریوں نے قرار دیا کہ سماجی جبلت ایک فطری شے ہے، اس لئے سماج کو منظم رکھنے کے لئے ایک مقتدر اعلیٰ کا ہونا ضروری ہے۔ ریاست ایک خداداد چیز ہے، اس لئے ریاست کا انتظام بھی احکام ربانی ہی کے تحت ہونا چاہئے۔

پادریوں کے نزدیک حکومت ایک لازمی برائی کی حیثیت رکھتی تھی جو گرجے کے مقابلہ میں انتہائی کمتر تھی۔ یوں گرجے کے مقابلہ میں ریاست کی حیثیت گھٹ گئی اور پادریوں کی کوشش سے ریاست گرجے کے زیر نگرانی آگئی۔ گرجے کے پادری بنی نوع انسان کر مساوات اور آزدی کے قیام کے لئے ہمیشہ افلاطون کے "فلسفی حکمران" کے طور پر عمل کرتے رہے۔

جائداد کا مسئلہ : ابتدائی پادری نجی طور پر جائداد رکھنے کے حق کے حامی تھے۔ سینٹ آگسٹائن نے قرار دیا کہ خدا نے ہر فرد کو جائداد عطا کی ہے تاکہ اس کا جائز طریقے پر استعمال ہو سکے۔ پھر پادریوں نے یک زبان ہو کر فیصلہ دیا کہ نجی جائداد کا ادارہ قانون فطرت سے پیدا نہیں ہوا ہے، بلکہ ریاست کی بالاارادہ اور عملی کوشش کا نتیجہ ہے، اس لئے وہ تصریفات، تحدیدات اور اختیارات کے تابع ہے۔

غلامی : گرجے کے پادریوں نے قرار دیا کہ فطرت نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے، اس لئے اسے زنجیروں سے نہیں جکڑنا چاہئے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ غلامی کو بشر گناہ کی سزا کے طور پر تسلیم کیا جانا چاہئے، لیکن غلاموں کے ساتھ فیاضانہ سلوک بھی ضروری ہے۔

قیصریت اور پاپائیت : پوپ نے قیصر کے اختیارات پر قبضہ کرنے کی کوشش کی تو پوپ اور قیصریت میں جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ تیرھویں صدی عیسوی سے چودھویں صدی عیسوی تک بام عروج تک پہنچ گئی۔ چودھویں صدی عیسوی کے وسط سے پوپ کا اقتدار کم ہونا شروع ہو گیا اور قیصر کو زیادہ اختیارات حاصل ہو گئے۔ پھر پاپائیت ختم ہو گئی اور بادشاہت مکمل طور پر مذہبی چنگل سے آزاد ہو گئی۔

اسلامی ریاست کے مقاصد و خصوصیات

سوال : اسلامی ریاست کے قیام کے مقاصد اور اسکی خصوصیات پر روشنی ڈالئے!

جواب : اسلامی ریاست کا مقصد وجود :

اسلامی ریاست کے قیام کا بنیادی مقصد اس نظام کو مملکت کے تمام ذرائع سے عمل میں لانا ہے جو اسلام نے انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے پیش کیا ہے۔ بالفاظ دیگر شریعت محمدیہ کے تمامتر احکامات و قوانین پر عمل کرنا اور کروانا اسلامی ریاست کا مقصد اولین ہے۔ یہ مقصد اتنا وسیع ہے کہ پوری انسانی زندگی کے مسائل کا حل اس میں مضمر ہے۔ ذیل میں اسی مقصد سے جنم لینے والے جزوی مقاصد کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

(1) حاکمیت الٰہیہ کا قیام : اسلامی ریاست کے قیام کا اولین مقصد "حاکمیت الٰہیہ" کو تسلیم کرنا اور کروانا ہے' تاکہ تمام لوگ ایک ہی خدا کے پرستار بن کر' ایک ہی قوم بن جائیں۔ اس طرح ان میں اتحاد و یگانیت پیدا ہو جائے گی اور وہ آپس میں محسوس کریں گے کہ وہ ایک ہی ذات سے منسلک ہیں اور وہ ایک ہی مقتدر اعلیٰ کے محکوم ہیں۔ بالفاظ دیگر حاکمیت اعلیٰ کو تسلیم کر لینے سے' تمام انسان ایک ہی مرکز پر جمع ہو سکتے ہیں حاکمیت الٰہیہ کو تسلیم کر لینے سے روئے زمین پر بسنے والے انسان جغرافیائی امتیازات سے پاک ہو کر ایک ہی لڑی میں پروئے جا سکتے ہیں اور تمام روئے زمین ان کا وطن بن سکتا ہے۔

• اسلام عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ وہی بادشاہ ہے' وہی حاکم ہے' اور حکم صادر کرنے کا اختیار بھی اسی کو حاصل ہے۔ اس کی بادشاہی اور اختیارات میں کوئی شریک نہیں۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- فالکم اللہ ربکم لہ الملک (فاطر)

(وہ ہے اللہ' تمہارا رب' ملک اسی کا ہے)

2- لم یکن لہ شریک فی الملک

(بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں)

(2) قیام عدل : معاشرہ ی مختلف لوگ زندگی بسر کرتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے مفاد کو عزیز رکھتا ہے۔ جب لوگوں کے مفادات آپس میں ٹکراتے ہیں تو نزاع پیدا ہو جاتا ہے۔ طاقتور لوگ کمزوروں کی حق تلفی کرتے ہیں تو ظلم کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر اس ظلم اور ناانصافی کو نہ مٹایا جائے تہذیب میں وحشیت پیدا ہو جاتی ہے اور معاشرہ میں بد امنی کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔

اسلامی ریاست کے قیام کا مقصد معاشرہ کو ناانصافی اور حق تلفی سے نجات دلانے کے لئے عدل و انصاف قائم کرنا ہے۔ قرآن مجید ی عدل و انصاف قائم کرنے پر از حد زور دیا گیا ہے' اور فرمایا گیا ہے:

(1) لقد ارسلنا رسلنا بالبینت وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط (الحدید)

ترجمہ : ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

(2) ان اللہ یامر بالعدل والاحسان (النحل)

ترجمہ : بلاشبہ اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

(3) یا ایھا الذین امنو کونو قوامین بالقسط شھداء للہ (النساء)

ترجمہ : اے ایمان والو انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو' اللہ کے لئے گواہ بنو

(3) وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین (مائدہ)

ترجمہ : اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا' کیوں کہ اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

(3) قیام امن : اسلام ایک دین امن ہے۔ وہ امن سے رہنے اور امن قائم کرنے کا خواہاں ہے۔ قرآن ہی امن کو خلفہ زمین کی اصل قرار دیا گیا ہے اور امن کے بالمقابل "فتنہ" کو ختم کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

(4) دفاع : قیام امن کے لئے ضروری ہے کہ ریاست میں منظم انتظامیہ موجود ہے' جو اندرونی و بیرونی سازشوں اور خطرات جنگ پر قابو پانے کی صلاحیت رکھتی ہو۔ اسلام کسی سے لڑائی میں پہل نہیں کرتا' لیکن اگر کوئی زبردستی جنگ ٹھونسنے پر مجبور کرے اور سوائے جنگ کے کوئی چارہ کار نہ ہو تو دشمن سے جنگ کرنا فرض قرار دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید فرمایا گیا ہے:

و قاتلوھم حتی لا تکون فتنہ

(اور ان سے جنگ کرو' یہاں تک کہ فتنہ ختم ہو جائے۔)

(5) امر بالمعروف و نہی عن المنکر : اسلام انسان کو صرف خود ہی نیکی کرنے کا حکم نہیں دیتا بلکہ ہر مسلمان پر فرض قرار دیتا ہے کہ وہ دوسروں کو بھی نیکی کی تبلیغ کرے۔ اور اگر کوئی

برائی ہوتے دیکھے تو برائی کرنے والے کو منع کرے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وامر بالمعروف وانه عن المنکر (لقمان)

ترجمہ : اور اچھی بات کا حکم دے اور بری بات سے روک۔

ایک اسلامی ریاست کے قیام کا یہ بھی مقصد ہے کہ امر بالمعرف و نہی المنکر کے فریضہ پر خود بھی عمل کرے اور دوسروں سے بھی اس پر عمل کرائے۔

(6) قیام الصلوۃ و زکوۃ : نماز اسلام کا بنیادی اور لازمی رکن ہے۔ ہر مسلمان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں' جو تا مرگ معاف نہیں ہو سکتیں۔ قرآن مجید میں جہاں نماز کا حکم آیا ہے وہاں ساتھ ہی زکوۃ ادا کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ نماز ہر امیرو غریب پر فرض ہے' لیکن زکوۃ صرف اہل نصاب پر فرض ہے۔

اسلامی ریاست کے قیام کو یہ مقصد بھی ہے کہ قیام صلوۃ کو مضبوط بنایا جائے اور نظام زکوۃ کو سختی سے رائج کیا جائے۔

سورۃ الحج میں فرمایا گیا ہے:

الذین ان مکنهم وفی الارض .اقاموا الصلوة واتوا الزکوة و امروابالمعروف ونهوا من لمنکر

ترجمہ : یہ "مسلمان جن کو جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے" وہ لوگ ہیں' جنہیں اگر ہم زمین میں اقتدار عطا کریں تو یہ نماز قائم کریں گے' زکوۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

(7) بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ : اسلام میں بنیادی حقوق وہی ہیں جو شریعت محمدیہ کی رو سے مسلمان کو دیئے گئے ہیں۔ اسلامی ریاست کا یہ بھی فرض ہے کہ انسانوں کو شریعت محمدیہ کے مطابق پاکیزہ اور پر امن زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرے اور حقوق خدا نے انسان کو عطا کئے ہیں' وہ تمام شہریوں کو دے اور اگر کوئی کسی کا حق غصب کرے تو اس کا حق اسے دلائے۔

مواخات و اتحاد : اسلام ہر مسلمان کو دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے اور آپس میں اتحاد و یگانگت کے ساتھ رہنے کا درس دیتا ہے۔ چنانچہ زمین کے مسلمان آپس میں ایک برادری ہیں۔ اسلامی ریاست میں بسنے والے تمام مسلمان گویا ایک دوسرے کے رشتہ دار ہیں۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

(1) انما المومنون اخوة (الحجرات)
(مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں)

(2) واذ کروا نعمت الله علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمته اخوانا وکنتم علی شفا حضره من النار فانقذکم منها (آل عمران)

ترجمہ : اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا' جبکہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے' تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی

اور تم اس کے احسان سے بھائی بھائی بن گئے' اور تم لوگ آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے' پس تم کو اس سے بچا لیا۔

اسلامی ریاست کی امتیازی صفات : اسلامی ریاست کی بنیادی صفات یہ ہیں:

(1) اسلامی ریاست اللہ کے نام پر اور اللہ ہی کے لئے قائم ہوتی ہے۔

(2) اسلامی ریاست میں مقتدر اعلیٰ (مطلق الحنان) اللہ تعالیٰ کی ذات ہوتی ہے' جس کے احکام شریعت محمدیہ کی صورت میں نافذ العمل ہوتے ہیں۔ اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔

(3) اسلامی ریاست میں قرآن و سنت قوانین کا درجہ رکھتے ہیں' ان قوانین سے متضاد و متصادم قوانین نافذ نہیں کیے جا سکتے۔

(4) اسلامی ریاست اللہ تعالیٰ کے زیر سایہ قائم ہوتی ہے' اور اس کا نظام چلانے والا "خلیفہ" یا "امام" کہلاتا ہے' جو اپنی طرف سے کوئی قانون نہیں کر سکتا' بلکہ صرف قانون الٰہی ہی کو نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

(5) اسلامی ریاست میں خلیفہ یا امام کا انتخاب لوگوں کے باہمی مشورہ سے عمل میں آتا ہے۔ اس انتخاب میں عام لوگ حصہ نہیں لیتے بلکہ صرف متقی و پرہیز اور اہل الرائے حضرات ہی کی رائے لی جاتی ہے۔

(6) اسلامی ریاست قانون الٰہی (شریعت) نافذ کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

(7) اسلامی ریاست میں حزب مخالف کا وجود نہیں ہوتا' بلکہ صرف ایک ہی جماعت حکومت کا نظام چلاتی ہے۔ اگر وہ قرآن و سنت پر عمل کرے تو اس کی معاونت و اطاعت فرض ہے' لیکن اگر وہ معصیت کا حکم دے تو اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔

(8) اسلامی ریاست میں قانون الٰہی کو برتری حاصل ہے۔ کوئی بھی شہری اس قانون سے مستثنیٰ نہیں ہے' یہاں تک کہ اگر خلیفہ بھی قانون شکنی کرے یا کسی کی حق تلفی کرے تو اسے عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔

(9) اسلامی ریاست میں مقننہ کی ضرورت نہیں ہوتی' کیونکہ قانون تو پہلے ہی سے قرآن و سنت کی صورت میں موجود ہے' ہاں البتہ حکومت کے ضمن میں اہم امور پر مشوروں کی غرض سے "مجلس شوریٰ" موجود ہوتی ہے جو فروعی مسائل پر اپنی رائے پیش کر سکتی ہے' اور اگر کوئی نیا مسئلہ پیدا ہو جس کا براہ راست ذکر قرآن و سنت میں موجود نہ ہو' تو اس مسئلہ کے حل کے لئے قرآن و سنت کی روشنی میں قواعد و ضوابط مرتب کر سکتی ہے۔

(10) اسلامی ریاست میں غیر اسلامی و غیر شرعی قوانین کی کوئی وقعت نہیں ہوتی' کیونکہ اسلامی ریاست تو قائم ہی اس لئے کی جاتی ہے کہ اس میں قرآن و سنت کے احکام کو نافذ کیا جائے۔

(11) اسلامی ریاست اس لحاظ سے "مساوات" پر مبنی ہوتی ہے کہ تمام لوگوں کو مساوی حقوق دیئے جائیں' وہ قانون کی نظر میں مساوی ہوں' اور بلا لحاظ مذہب و نسل سب کو

مساوی طور پر عدل و انصاف فراہم کیا جائے۔ اسلامی ریاست میں دولت و ثروت کی بنا پر کوئی شخص اثر و رسوخ کا مالک نہیں بن سکتا اور نہ ہی دولت کے بل بوتے پر قانون شکنی سے بچ سکتا ہے۔

(12) اسلامی ریاست قیام صلوٰۃ اور نظام زکوٰۃ رائج کرنے کے لئے وجود میں آتی ہے۔

(13) اسلامی ریاست امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے کے لئے وجود میں آتی ہے۔ اچھے کاموں کی تبلیغ کرنا' نیک لوگوں کی دلجوئی کرنا اور برے لوگوں کو برائی سے روکنا' اور ان کے جرائم کے مطابق ان کو سزا دینا اسلامی ریاست کا فرض ہے۔

(14) اسلامی ریاست حقوق و فرائض کو پورا کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ لوگوں کو اسلامی نظام حیات کے مطابق زندگی گزارنے کے مواقع فراہم کرنا حکومت کا فرض ہے۔

(15) اسلامی ریاست اسلام کی ترویج و ترقی کے لئے کام کرنے کی پابند ہے۔ اس سلسلہ میں ریاست کے بچوں' بوڑھوں' عورتوں اور تمام شہریوں کو زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے انتظامات کرنا حکومت کا فرض ہے۔

(16) اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہوتی ہے' جو مخلوق خدا کی فلاح و بہبود کے لئے کام کرنے کی ذمہ دار ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست کی نوعیت

سوال : (الف) اسلامی ریاست کی نوعیت کیا ہے۔ نوعیت کے لحاظ سے اسلامی ریاست کو کیا کیا اصطلاحی نام دیئے جا سکتے ہیں؟

(ب) کیا اسلامی ریاست ایک فلاحی ریاست ہے؟ دلائل سے ثابت کیجئے!

جواب : اسلامی ریاست کی نوعیت :

الٰہی حکومت : "اسلامی ریاست" احکام الٰہی کے عین مطابق قائم ہوتی ہے' اس لحاظ سے اسے "ریاست الٰہیہ" یا "الٰہی حکومت" کہا جا سکتا ہے' لیکن "الٰہی حکومت" سے مراد تھیوکریسی (Theocracy) ہرگز نہیں کیونکہ غیر مسلم "تھیوکریسی" میں ایک مخصوص قوانین وضع کر کے خدا کے نام سے نافذ کرتا ہے' جبکہ اسلام میں قانون وضع کرنے کا اختیار کسی انسان کو حاصل نہیں۔ اسلامی طرز کی "حکومت الٰہیہ" میں خدا تعالٰی کے نازل کردہ قوانین کے عین مطابق حکومت تشکیل دی جاتی ہے اور حکومت کا تمامتر نظام انہی قوانین کے تحت چلایا جاتا ہے۔

الٰہی جمہوری حکومت : مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلامی حکومت کے لئے ایک اصطلاح "الٰہی جمہوری حکومت" (Theo-Demnocracy) وضع کی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے وہ

لکھتے ہیں کہ:

"اگر مجھے ایک نئی اصطلاح وضع کرنے کی اجازت دی جائے تو میں اس طرز حکومت کو "الٰہی جمہوری حکومت" کے نام سے موسوم کروں گا' کیونکہ اس میں خدا کے اقتدار اعلیٰ کے تحت مسلمانوں کو ایک محدود عمومی حاکمیت عطا کی گئی ہے۔ اس میں انتظامیہ اور مقننہ مسلمانوں کی رائے سے بنے گی' مسلمان ہی اس کو معزول کرنے کے مختار ہوں گے' سارے انتظامی معاملات اور تمام وہ مسائل جن کے متعلق خدا کی شریعت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہے' مسلمانوں کے اجماع ہی سے طے ہوں گے' اور الٰہی قانون جہاں تعبیر ہو گا۔ وہاں کوئی مخصوص طبقہ یا نسل نہیں بلکہ عام مسلمان میں سے ہر وہ شخص اس کی تعبیر کا مستحق ہو گا' جس نے اجتہاد کی قابلیت بہم پہنچائی ہو—— اس لحاظ سے یہ "ڈیموکریسی" (Democracy) ہے—— جہاں خدا اور اس کے رسول کا حکم موجود ہو' وہاں مسلمانوں کے کسی امیر کو' کسی مقننہ کو' کسی مجتہد اور عالم دین کو' بلکہ ساری دنیا کے مسلمانوں کو مل کر بھی اس حکم میں یک سرمو ترمیم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے' اس لحاظ سے یہ "تھیوکریسی" ہے۔

اصولی و نظریاتی ریاست : اسلامی ریاست چونکہ اسلامی نظریات پر مبنی ہوتی ہے' اس لئے اسے ایک نظریاتی ریاست بھی کہا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اسلامی چونکہ اسلام کے اصولوں پر مبنی ہے اور حکومتی نظام میں ان اصولوں سے ذرہ بھر انحراف نہیں کیا جا سکتا' چنانچہ اس لحاظ سے اسے "اصولی ریاست" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔

نیابتی ریاست : اسلامی ریاست قانون الٰہی کے تابع ہوتی ہے۔ اس ریاست کا مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے' جو اپنے نائب کی وساطت سے اپنے احکام کی تعمیل کرواتا ہے۔ اسلام میں حاکم اعلیٰ' بادشاہ یا سلطان کا کوئی وجود نہیں' بلکہ اللہ تعالیٰ کا نائب "خلیفہ" کہلاتا ہے اور وہ ایک نائب کی حیثیت سے قانون الٰہی کو من و عن نافذ کرنے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی ریاست ایک "نیابتی ریاست" ہے۔

ایجابی اور ہمہ گیر ریاست : اسلامی ریاست ایک ایجابی (Positive) ریاست ہوتی ہے' جس کا مدعا ریاست میں عدل و انصاف قائم کرنا' نیکی پھیلانا اور بدی کو مٹانا ہے۔ ریاست کی تمام تر قوت مثبت کاموں کو انجام دینے پر صرف ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ ایک "ایجابی" ریاست ہے۔ اسلام چونکہ آفاقیت اور ہمہ گیری کا داعی ہے' اس کی تعلیمات محدود نہیں ہیں' اس لئے اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست ایک ہمہ گیر ریاست ہوتی ہے۔

جماعتی ریاست : اسلام کو ماننے والے ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلامی ریاست کو یہی جماعت مل کر تشکیل دیتی ہے۔ اس جماعت میں متقی' پرہیزگار' اہل علم' اہل الرائے اور اسلامی نظریات کی تشریح و تعبیر کرنے والے افراد شامل ہوتے ہیں۔ پوری ریاست پر ایک ہی جماعت قانون الٰہی کے تحت حکومت کرتی ہے' حزب مخالف کا وجود تک نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے

اسلامی ریاست کو "نظریاتی ریاست" کہا جا سکتا ہے۔

فلاحی ریاست : اسلام انسانوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہے اور شریعت محمدیہ میں لوگوں کی بہتری اور بھلائی کا درس دیا گیا ہے۔ اس لئے اسلام کے نام پر قائم ہونے والی ریاست ایک "فلاحی ریاست" ہوتی ہے۔

اسلامی ریاست اور فلاح و بہبود عامہ :

(الف) فلاح دنیا : اسلامی ریاست میں خلق خدا کی فلاح و بہبود کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل فلاحی امور قابل ذکر ہیں:

1- غریبوں' محتاجوں' یتیموں' بیواؤں' معذوروں اور مسافروں کی مدد کے لئے اسلامی ریاست میں صدقہ' خیرات' زکوۃ اور عشر کا نظام قائم ہے۔ زکوۃ کی مد سے تعلیمی ادارے اور ہسپتال وغیرہ تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔

2- اسلامی ریاست میں ہر شخص کو سماجی' سیاسی اور معاشی عدل فراہم کیا جاتا ہے۔ عدل کے معاملہ میں امیرو غریب کا کوئی نہیں کیا جاتا۔ اس ضمن میں خلیفہ اور ایک عام شخص برابر ہیں۔

3- اسلامی ریاست میں امداد باہمی کا نظام موجود ہے۔ ایک دوسرے کی مدد کرنے کا ثواب کا درجہ حاصل ہے۔

4- اسلامی ریاست میں ناجائز منافع خوری' ذخیرہ اندوزی' رشوت' چوری' بددیانتی' جواء' دیگر سب کاروبار ناجائز ہیں' جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچانے کا سبب بنتے ہوں۔ اس سلسلہ میں اسلام نے حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی حد بندی کی ہے۔

5- اسلامی ریاست میں لوگوں کو معاشی وسائل فراہم کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ وہ ریاست کے کسی بھی حصہ میں جائز ذرائع سے اپنی روزی کما سکے۔ اسلام نے مزدور اور محنت کش کو عزت فراہم کی ہے۔ اسلام کسی بھی جائز پیشہ کو کمتر یا ناقابل عزت قرار نہیں دیتا۔ وہ محنت کشوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے اور دوسری طرف محنت کروانے والوں کو حکم دیتا ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کے پسینہ خشک ہو جانے سے پہلے ادا کردی جائے۔

6- اسلامی ریاست امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرنے کی پابند ہے' تاکہ معاشرہ برائی سے پاک ہو جائے اور لوگ نیکیاں کمانے کے خوگر ہو جائیں۔ یہ فریضہ ادا کرنے سے ظلم اور ناانصافی کے راستے بند ہو سکتے ہیں اور لوگ امن و سکون کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

7- اسلام حلال ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو جائز طریقے سے خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے' اور فضول خرچی اور تعیشات کا راستہ بند کرتا ہے۔

8- اسلامی ریاست میں ہر قسم کا نشہ ممنوع ہے' کیونکہ اسلام نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔

9- اسلامی ریاست جرائم کے مطابق مجرموں کو سزا دینے کی پابند ہے۔ اس ضمن میں حدود اور تعزیرات کی اصطلاحیں مستعمل ہیں۔ ہر ملزم کو سزا دینے سے پہلے، صفائی کا موقع دیا جاتا ہے۔ جرم ثبوت نہ ہونے پر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔

10- اسلامی ریاست میں لوگوں کی تعلیم کا بندوبست کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔ اسلام نے ہر مرد اور عورت پر تعلیم حاصل کرنا فرض قرار دیا ہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست میں اہل علم حضرات کی سرپرستی اور طالب علموں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

11- اسلامی ریاست میں ہر شخص کو بذریعہ تقریر و تحریر اپنے خیالات کے اظہار کرنے کی آزادی حاصل ہے، بشرطیکہ یہ آزادی قانون الٰہی کے خلاف استعمال نہ کی جائے۔

12- اسلامی ریاست طبقاتی کشمکش اور فرقہ بندی ممنوع ہے۔

13- اسلامی ریاست اخوت و یگانگت اور اتحاد برقرار رکھنے کے لئے بھی مناسب تدابیر اختیار کی جاتی ہیں، کیونکہ اسلام ہر مسلمان کو دوسرے کا بھائی قرار دیتا ہے۔

14- اسلامی ریاست ظلم، ناانصافی اور قانون الٰہی سے سرکشی کرنے والوں کے خلاف جہاد و قتال کر سکتی ہے، اس طرح ملکی امن کو قائم رکھا جا سکتا ہے اور بیرونی دشمنوں کا دفاع کیا جا سکتا ہے۔

15- اسلامی ریاست کے ہر شہری کے جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنے کی ذمہ دار ہے۔

16- اسلامی ریاست نہ صرف مسلمانوں کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ دار ہے، بلکہ ریاست میں بسنے والے تمام غیر مسلم افراد (ذمیوں) کی حفاظت کی بھی ذمہ دار ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی غیر مسلم (ذمی) کی حق تلفی کرے تو ذمی عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ عدل کے سلسلہ میں مسلم اور غیر مسلم کا لحاظ نہیں کیا جائے گا۔

(ب) **فلاح آخرت** : نہ صرف فلاح دنیوی کی ضامن ہے، بلکہ فلاح اخروی کی بھی ذمہ دار ہے، اس سلسلہ میں وہ مندرجہ ذیل اقدامات کرتی ہے:

1- قیام صلوٰۃ اور مساجد کا انتظام
2- نظام زکوٰۃ کا نفاذ
3- صدقہ، خیرات، فطرانہ وغیرہ ادا کرنے کی ترغیب
4- جہاد فی سبیل اللہ
5- تبلیغ دین
6- شریعت محمدیہ کا مکمل طور پر نفاذ

مندرجہ بالا امور سے ثابت ہوتا ہے کہ "اسلامی ریاست" کا تصور ایک "فلاحی ریاست" کا تصور ہے۔

اسلامی ریاست کے فرائض (ذمہ داریاں)

سوال : اسلامی ریاست کی ذمہ داریوں پر روشنی ڈالئے!

جواب : اسلامی ریاست کے اختیارات :

اسلامی ریاست' خلافت الٰہی ہوتی ہے' جس میں اللہ ہی کی قانونی حاکمیت تسلیم کی جاتی ہے۔ اس کا دائرہ اختیار انہی حدود کے اندر محدود ہوتا ہے' جو اللہ تعالیٰ نے مقرر کی ہیں۔ ریاست ان حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی' کیونکہ قرآن اسے اس بات کی قطعاً" اجازت نہیں دیتا۔ اللہ تعالیٰ بار بار احکام دے کر متنبہ کرتا ہے :

1- **تلک حدود اللہ فلا تقربوھا**
(یہ اللہ کی حدیں ہیں' ان کے پاس نہ پھٹکو)

2- **تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا**
(یہ اللہ کی حدیں ہیں' ان سے تجاوز نہ کرو)

3- **ومن یتعد حدود اللہ فاولئک ھم الظالمون**
(اور جو لوگ اللہ کی حدود سے تجاوز کریں' وہی ظالم ہیں)

اسلامی ریاست کی ذمہ داریاں : بنیادی طور پر ایک اسلامی ریاست پر دو قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں :

1- حقوق اللہ پر عملدرآمد کروانا 2- حقوق العباد کا تحفظ

حقوق اللہ : قرآن مجید میں مسلمانوں کے حق میں فرمایا گیا ہے :

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر وللہ عاقبۃ الامور (الحج)

ترجمہ : یہ وہ (مسلمان) ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں صاحب اقتدار کر دیں تو وہ نماز قائم کریں گے' ادائے زکوۃ میں سرگرم ہوں گے' نیکیوں کا حکم دیں گے' برائیوں سے روکیں گے اور تمام باتوں کا انجام کار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے۔

چنانچہ ایک اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ حقوق اللہ کو خود بھی پورا کرے اور لوگوں کو بھی اس کی بجا آوری پر قائم رکھے۔ حقوق اللہ کے سلسلہ میں اسلامی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ :

1- قیام الصلوۃ پر عمل درآمد کرائے اور اس مقصد کے لئے مساجد سے متعلقہ امور کا بہترین بندوبست کرے۔

2- احترام رمضان کے سلسلہ میں پورا پورا بندوبست کرے اور لوگوں کو روزے رکھنے کی تبلیغ کا موثر انتظام کرے۔

3- زکوٰۃ ہر اہل ثروت (صاحب نصاب) پر فرض ہے۔ زکوٰۃ کی وصولی کا انتظام اسلامی ریاست خود بھی کر سکتی ہے۔
4- حج کے سلسلہ میں بہترین انتظامات کرے۔
5- جہاد فی سبیل اللہ کی ترویج و اشاعت کرے۔

حقوق العباد : ایک اسلامی ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے بنیادی حقوق پورے کرے۔ اسلام میں حقوق العباد ہی بنیادی شہری حقوق ہیں' جنہیں کسی بھی حالت میں سلب نہیں کیا جا سکتا۔
حقوق العباد کے سلسلہ میں ایک اسلامی ریاست پر مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔

1- جان و مال اور عزت کی حفاظت : اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ہر شخص کے جان و مال اور عزت کی حفاظت کرے۔
قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:
1- "کسی جان کو جسے اللہ نے حرام کیا ہے' حق کے بغیر قتل نہ کرو۔" (بنی اسرائیل)
2- "اور جو شخص کسی مسلمان کو قصداً" قتل کرے تو اس کی سزا جہنم ہے۔" (النساء)
آنحضرت ﷺ نے فرمایا:
1- "تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں وہی حرمت رکھتی ہیں' جیسے آج کے دن (عرفہ کے دن) کی حرمت ہے۔"
2- "مسلمان کی ہر چیز ہر مسلمان پر حرام ہے' اس کا خون' اس کا مال اور اس کی آبرو بھی۔"
3- "جس نے کسی ذمی کو قتل کیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔"

2- روزگار کی ضمانت : اسلامی حکومت میں رعایا کا حق ہے کہ وہ حلال ذرائع سے روزی کمانے کے لئے کوئی بھی پیشہ استعمال کرے' اور اپنی کمائی کو اپنے استعمال میں کرے۔
قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:
"زمین میں پھیل کر خدا کا فضل تلاش کرو' یعنی روزی کماؤ۔"
اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ بیروزگاری کو دور کرنے کے لئے وسائل فراہم کرے۔

3- سکونت کی آزادی : ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ حدود مملکت میں جہاں چاہے سکونت اختیار کرے۔ آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے کہ:
"تم جہاں چاہو رہو' اور ہمارے تمہارے درمیان صرف یہ شرط ہے کہ تم خونریزی نہ کرو اور نہ تم رہزنی کرو' اور نہ تم کسی پر ظلم کرو۔"
سکونت کی آزادی صرف مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ ذمیوں کو بھی حاصل ہے۔ ریاست کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کو سکونت کے سلسلہ میں مناسب سہولیات فراہم کرے۔

4- نجی زندگی کی حفاظت : ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنی نجی زندگی میں اپنے گھر

کے اندر محفوظ و مامون رہے۔ کسی شخص یا حکومتی ادارے کو کسی بھی شخص کی نجی زندگی میں جھانکنے کی اجازت نہیں۔

سورۃ النور میں فرمایا گیا ہے:

"اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہو' جب تک کہ اجازت نہ لے لو۔"

5- **مذہبی آزادی** : اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ وہ تمام مذاہب کے پیروکاروں کو ان کے مذاہب کے مطابق عبادت کرنے کی اجازت دے اور ان کو زبردستی مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہ کرے۔

ارشاد الٰہی ہے:

لا اکراہ فی الدین (البقرہ)

(دین میں کوئی جبر نہیں)

6- **شخصی آزادی** : اسلامی ریاست میں ہر شخص کو شخصی آزادی حاصل ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:

"اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔"

چنانچہ اسلامی حکومت میں بغیر مقدمہ چلائے اور صفائی کے موقع دیئے بغیر کسی کو سزا نہیں دی جا سکتی۔

7- **آزادی اجتماع** : اسلامی ریاست کے اندر اسلامی اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اجتماع کی آزادی حاصل ہے۔ نماز جمعہ اور نماز عیدین مذہبی اجتماعات کی مثالیں ہیں۔ اس کے علاوہ ریاست میں جلسے و جلوس پر بھی کوئی پابندی عائد نہیں ہوتی۔ حکومت لوگوں کی اس آزادی کو سلب نہیں کر سکتی۔

ریاست کی ذمہ داریوں کی فہرست : علاوہ ازیں ایک اسلامی ریاست پر مندرجہ ذیل ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں:

1- ہر شہری کو خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم (ذمی) قانونی مساوات کا حق دینا۔
2- ہر شہری کے لئے معاشی ترقی اور خوشحالی کے راستے برابری کی سطح پر کھولنا۔
3- ہر شہری کو انصاف فراہم کرنا۔
4- ہر شہری کو بلا امتیاز رنگ و نسل معاشرتی مساوات عطا کرنا۔
5- رعایا کو ضروریات زندگی فراہم کرنا۔
6- معذوروں اور کمزوروں کی کفالت کرنا۔
7- تعلیم کو عام اور مفت کرنا۔
3- رفاہ عامہ کی بنیادی سہولتیں فراہم کرنا۔
9- امن عامہ قائم کرنا۔

10- صحت عامہ کے لئے مناسب بندوبست کرنا۔
11- اصلاح معاشرہ کے لئے اقدامات کرنا۔
12- عام راستوں اور شاہراہوں کی دیکھ بھال کرنا اور آمدورفت کے ذرائع کا بندوبست کرنا۔
13- نظام شریعت کو مکمل طور پر نافذ کرنا۔
14- ملکی ترقی کے لئے کوشاں رہنا اور عالم اسلام کے اتحاد کو قابل عمل بنانے میں حصہ لینا۔
15- معاہدات کی پابندی کرنا۔
16- ملکی سرحدات کا تحفظ کرنا۔
17- مذہبی اداروں اور علمائے کرام کی سرپرستی کرنا۔
18- نظام عدل کو موثر بنانا۔
19- ریاست میں موجود تمام محکموں کی نگرانی کرنا۔

ریاست کی ذمہ داری کی اہمیت : اسلامی ریاست عوام کی دنیوی و دینی فلاح کے لئے خدمات انجام دینے کی ذمہ دار ہے۔ جو ریاست قرآن و سنت کے مطابق اپنی ذمہ داریاں پوری نہ کرے وہ خاطی و گنہگار ہے۔

رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ:

1- **الا کلکم راع و کلکم مسئول عنہ رعیتہ فالامام الاعظم الذی علی الناس راع وھو مسئول عن رعیتہ** (بخاری، مسلم)

ترجمہ : خبردار رہو، تم میں سے ہر ایک راعی ہے اور ہر ایک اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے، اور مسلمانوں کا سب سے بڑا سردار جو سب پر حکمران ہو، اور اپنی رعیت کے بارے میں جواب دہ ہے۔

2- **مامن وال علی رعیتہ من المسلمین فیموت وھو غاش لھم الاحرم اللہ علیہ الجنتہ** (بخاری، مسلم)

ترجمہ : کوئی حکمران جو مسلمانوں میں سے کسی رعیت کے معاملات کا سربراہ ہو، اگر اس حالت میں مرے کہ وہ ان کے ساتھ دھوکا اور خیانت کرنے والا تھا، تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا۔

3- **مامن امیر یلی امر المسلمین ثم لایجھد لھم ولا ینصح الالم یدخل معھم فی الجنتہ** (مسلم)

ترجمہ : کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا منصب سنبھالے، پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ کرے، وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً داخل نہ ہو گا۔

اسلامی ریاست کے حقوق

سوال : اسلامی ریاست کے شہریوں پر کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں؟

یا

شہریوں پر اسلامی ریاست کے کون کون سے حقوق واجب ہیں؟

جواب : شہریوں کے فرائض :

اسلامی ریاست شہریوں کے فرائض اور حکومت کے حقوق حسب ذیل ہیں:

1۔ اطاعت اولی الامر : اسلامی ریاست کے سربراہ اور اس کے ماتحت حاکموں کے لئے قرآن میں "اولی الامر" کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ اپنے اولی الامر کی اطاعت کرو۔ چنانچہ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

یا ایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم

ترجمہ : اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔

آنحضرتﷺ کا فرمان ہے:

ان امر علیکم عبد مجدع یقود کم بکتاب اللہ فاسمعوا واطیعوا۔

ترجمہ : اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

صاحب امر جب تک قرآن و سنت پر عمل کرتا رہے اور اس کے مطابق حکم دیتا رہے' اس کی اطاعت فرض ہے۔ لیکن معصیت میں اس کی اطاعت واجب نہیں' کیونکہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ جو قانون الٰہی کے مطابق فیصلہ نہ کریں' وہ ظالم اور فاسق ہیں۔ آنحضرتﷺ کا فرمان ہے کہ : معصیت میں کوئی اطاعت نہیں ہے' اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی یاد رہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرام نے نبیﷺ سے برے حاکموں کے خلاف بغاوت کرنے کی اجازت چاہی تو آپ نے فرمایا:

لا ما اقاموا لکم الصلوۃ

(نہیں' جب تک وہ تمہارے درمیان نماز قائم کرتے رہیں)

2۔ قیام امن میں تعاون : ہر شہری کا فرض ہے کہ ریاست میں امن و امان قائم کرنے میں' وہ حکومت سے تعاون کرے۔ وہ خود بھی فتنہ و فساد پھیلانے کا موجب نہ ہو اور دوسروں کو بھی امن سے رہنے کی تلقین کرے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

انما جزالذین یحاربون اللہ ورسولہ ویسعون فی الارض فسادا ان یقتلوا اویصلبوا اوتقطع ایدیھم و ارجلھم من خلاف او ینفوامن الارض ذلک لھم خزی فی الدنیا ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم

ترجمہ : جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے جھگڑا کرتے ہیں، روئے زمین پر فساد پھیلاتے ہیں، وہ قتل کئے جائیں، یا سولی پر چڑھا دیئے جائیں، ان کے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں، اور جلا وطن کر دیئے جائیں، یہ ہے ان کے لئے بدلہ دنیا میں، اور آخرت میں بہت بڑا عذاب ہے۔

قانون کی پابندی : ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ شریعت اور ملکی قانون کی پابندی کرے اور قانون شکنی سے گریز کرے۔ مسلمان کے لئے قانون الٰہی کی خلاف ورزی بھی جرم (گناہ) ہے اور انتظامی سلسلہ میں قرآن و سنت کے تابع حکومت کے وضع کردہ قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی بھی۔

تعاون : ہر شہری کے لئے حکومت سے تعاون کرنا بھی ضروری ہے اور ریاست میں رہنے والے شہریوں کے ساتھ نیک کاموں اور امور زندگی میں تعاون کرنا بھی۔

ارشاد الٰہی ہے:

تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان

نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

حصول علم : ایک متقی مسلمان اور اچھا شہری بننے کے لئے علم حاصل کرنا ضروری ہے۔ اسلام میں ہر مرد و عورت پر علم حاصل کرنا فرض ہے۔ فرمان نبوی ہے کہ "علم حاصل کرو خواہ تمہیں چین جانا پڑے۔" قرآن مجید نے عالم کو جاہل پر فضیلت دی ہے۔

قل ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون

(کہہ دیجئے! کیا علم والے اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں)

چنانچہ حکومت کا فرض ہے کہ وہ ملک میں تعلیم و تربیت کا انتظام کرے اور شہریوں کا فرض ہے کہ وہ خود بھی تعلیم حاصل کریں اور اپنے بچوں کو بھی زیور تعلیم سے آراستہ کریں۔

مالی قربانی : ریاست اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے لوگوں پر جو ٹیکس وغیرہ عائد کرتی ہے، ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ اپنے حصہ کے واجبات بروقت ادا کرے، اور ان سے بچنے کے لئے غلط حربے استعمال نہ کرے۔ اگر ملک پر کوئی مصیبت ٹوٹ پڑے، یا دشمن کی طرف سے جنگ کا خطرہ ہو تو حکومت کی مالی مدد کرے۔

سورۃ الصف میں فرمایا گیا ہے:

تومنون باللہ رسولہ و تجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم خیرلکم ان کنتم تعلمون

ترجمہ : ایمان لاؤ اللہ پر' اور اس کے رسولؐ پر' لڑو اللہ کی راہ میں' اپنے مال سے اور اپنی جان سے' بہتر ہے تمہارے حق میں' اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

فوجی خدمات : اسلام کے مطابق ہر مسلمان بالغ پر جہاد فرض ہے اور جہاد سے بلا عذر انکار کرنے والا مسلمان کہلانے کا حقدار نہیں۔ چنانچہ بوقت ضرورت ہر مسلمان سے فوجی خدمات لی جا سکتی ہیں' صرف بچے' بوڑھے' عورتیں اور معذور افراد اس سے مستثنیٰ ہیں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے :

وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم

(اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو' جو تم سے لڑتے ہیں)

اسلامی دستور

سوال : (الف) اسلامی دستور سے کیا مراد ہے' اس کی خصوصیات بیان کیجئے اور بتایئے کہ اسلامی دستور کن بنیادوں پر استوار ہے۔

(ب) اسلامی دستور اور الٰہی دستور میں فرق واضح کیجئے!

جواب : اسلامی دستور :

اسلام کے مطابق اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ حکم اسی کا ہے' جس میں کوئی انسان شریک نہیں' اس لئے مقتدر اعلیٰ اس کی ذات ہے' اس کے نازل کردہ احکام و قوانین' جو ہر مسلمان پر بے چون و چرا واجب العمل ہیں' ہی اسلام کا دستور ہیں۔ یہ دستور' اللہ تعالیٰ کی طرف سے' نبی آخر الزمان حضرت محمد ﷺ پر' بذریعہ وحی نازل ہوا۔ جو تحریری صورت میں "قرآن مجید" کے نام سے موسوم ہے۔

اسلامی دستور کی خصوصیات اور اہمیت :

1- انسانی دستور کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ہے' اس لئے یہ تمام انسانی قوانین سے بلند و برتر ہے۔

2- اسلامی دستور چونکہ خدا تعالیٰ کا نازل کردہ ہے' اس لئے ہر قسم کی غلطیوں سے پاک ہے۔

3- اسلامی دستور کسی ایک عہد کے انسانوں کے لئے نہیں بلکہ یہ قیامت تک انسانوں کی رہنمائی کرنے والا ہے۔
4- انسانی دستور انسان کی دینی و دنیوی فلاح کا ضامن ہے۔ اس میں دنیوی زندگی میں پیش آنے والا تمام مسائل کا حل موجود ہے۔
5- اسلامی دستور ایک صحیفہ ہدایت ہے جس کی رہنمائی میں منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے۔
6- اسلامی دستور ایک استوار آئین ہے جس میں ترمیم و اضافہ کی گنجائش نہیں۔ اس کا ایک حرف تک نہیں بدلا جا سکتا۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لے رکھا ہے۔
7- اسلامی قانون علم و ادب' اور فصاحت و بلاغت کا ایسا نمونہ ہے' جس کی مثال دنیا کی کوئی ادبی کتاب بھی نہیں کر سکتی۔ اس کے باوجود یہ سمجھنے میں آسان ہے۔
8- اسلامی قانون میں کوئی ایسی دقیق بات نہیں کہ جس پر عمل نہ کیا جا سکے۔ اس میں آسانیاں پیدا کی گئی ہیں۔
9- اسلامی قانون فطرت انسانی کے عین مطابق ہے۔
10- اسلامی آئین میں حق و باطل میں امتیاز کیا گیا ہے۔
11- اسلامی آئین انصاف فراہم کرنے کی ضمانت دیتا ہے۔ یہ آئین تمام انسانوں میں قانونی مساوات کا حق دیتا ہے۔ کوئی بھی انسان اس قانون سے بالاتر نہیں۔ یہ امیر و غریب' عالم و جاہل' گورے کالے اور ہر انسان پر نافذ العمل ہے۔
12- اسلامی آئین ایک عالمگیر اور آفاقی آئین ہے۔
13- اسلامی آئین ایک معقول آئین ہے جس میں توہمات وغیرہ کا کوئی گذر نہیں۔
14- اسلامی آئین میں جامعیت اور اختصار پایا جاتا ہے۔

اسلامی دستور کی بنیادیں : اسلامی آئین (دستور) کی بنیاد مندرجہ ذیل امور پر ہے:

حاکمیت الٰہی : اسلام کے مطابق اللہ تعالیٰ تمام کائنات کا خالق ہے' اس لئے ہر شے اور ہر ذی روح کا مالک وہی ہے۔ ملک بھی اسی کا ہے اور امر بھی اسی کا۔ اس کی بادشاہی میں کوئی انسان شریک نہیں اور نہ ہی کوئی اس کے اختیار میں حصہ دار ہے۔ اسلام میں اللہ تعالیٰ کی ذات مقتدر اعلیٰ ہے' وہی حاکم الٰہی ہے۔ حاکمیت الٰہی ازل سے قائم ہے اور ابد تک دائم رہے گی۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- سورۃ یوسف میں فرمایا گیا ہے:

ان الحکم الا اللہ

(حکم نہیں مگر صرف اللہ کے لئے)

2- سورۃ بنی اسرائیل میں کہا گیا ہے:

لم یکن لہ شریک فی الملک

(بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں)

3- سورۃ الاعراف میں فرمایا گیا ہے:

الا له الخلق والامر

(خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے)

4- سورۃ آل عمران میں مذکور ہے:

یقولون هل لنا من الامر من کل شیء قل ان الامر کله لله

(وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے؟ کہو کہ اختیارات تو سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔

قرآن مجید کے مطابق:

1- حاکمیت و حکومت صرف اللہ تعالیٰ کی ہے۔ اس کے امر اور اختیارت میں کوئی شریک نہیں۔

2- حکم دینے کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے' رسول خود اس کے حکم کا پابند ہے۔

مقام رسالت : اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام اپنے منتخب بندوں یعنی نبیوں اور رسولوں کے ذریعے لوگوں تک پہنچائے۔ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے تمام نبی برحق ہیں۔ سب سے آخری نبی حضرت محمد ﷺ ہیں۔ ان کے بعد نبوت کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ مسلمان ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کے ساتھ ساتھ حضرت محمد ﷺ کی رسالت پر ایمان لایا جائے۔

اللہ تعالیٰ حضرت محمد ﷺ پر جو احکام نازل کئے' وہ قرآن مجید کی صورت میں موجود ہیں' جن پر بے چون و چرا ایمان لانا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ قرآن مجید کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ رسول کے احکام کی پیروی کی جائے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- سورۃ النساء میں مذکور ہے:

من یطع الرسول فقد اطاع الله

(جس نے رسول کی اطاعت کی' اس نے اللہ کی اطاعت کی)

2- سورۃ النساء ہی میں فرمایا گیا ہے:

انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک الله

ترجمہ : ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی میں حکم کرو' جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

3- سورۃ الحشر میں مذکور ہے:

وما اتکم الرسول فخذوہ وما نهکم عنه فانتهوا

(اور جو کچھ رسول تم کو دیں اسے لے لو' اور جس سے تم کو روک دیں'

اس سے رک جاؤ۔)

قرآن مجید کے مطابق آنحضرت رسول اللہ ﷺ مسلمانوں کے صرف مذہبی رہنما ہی نہیں بلکہ سیاسی قائد بھی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی ریاست کے سربراہ بھی ہیں، جن کا کام لوگوں کے مابین فیصلے کرنا بھی ہے۔

سورۃ اعراف میں فرمایا گیا ہے:

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء

(جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری جانب اتارا گیا ہے، اس کی پیروی کرو، اور اس کے سوا دوسرے اولیا کی پیروی نہ کرو)

سورۃ المائدہ میں حکم دیا گیا ہے:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون

(اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے جو اللہ نے اتارا ہے، تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں)

سورۃ النساء میں مومنوں کے لئے یہ بھی ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ کو ایک منصف کی حیثیت سے بھی تسلیم کریں اور آپ کے فیصلہ کو قطعی سمجھیں۔

فلا وربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لایجدوا فی انفسھم حرجا" مما قضیت ویسلموا تسلیما

ترجمہ : پس نہیں، تیرے رب کی قسم وہ ہرگز مومن نہ ہوں گے جب تک وہ اپنے اختلاف میں تجھ کو فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تو فیصلہ دے اس پر اپنے نفس میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور سربسر تسلیم کریں۔

تصور خلافت : اسلام کے مطابق اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ چنانچہ ہر وہ انسان جو احکام الٰہی پر کاربند ہے اور اللہ و رسول پر ایمان رکھتا ہے، عمومی طور پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ اللہ نے سورۃ النور میں اہل ایمان کو اپنا خلیفہ بنانے کا وعدہ فرمایا ہے:

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم

ترجمہ : اللہ نے وعدہ کیا ہے، ان لوگوں سے، جو تم میں سے ایمان لائے ہیں، اور نیک عمل کیا ہے، کہ وہ ضرور ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا، جس طرح اس نے ان سے پہلے لوگوں کو خلیفہ بنایا تھا۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول بنانے کے ساتھ ساتھ ایک اسلامی ریاست کی سربراہی بھی عطا کی۔ آپ کی وفات کے بعد جو حکومت قائم ہوئی وہ "خلافت" کہلائی۔ چنانچہ اسلامی ریاست کا صحیح مقام "خلافت" ہے نہ کہ بادشاہت و ملوکیت۔

اسلام کے نظریہ کے مطابق اسلامی ریاست کا سربراہ نائب خدا یعنی خلیفہ ہے، جو احکام الٰہی نافذ کرنے کا ذمہ دار ہے۔ وہ قرآن و سنت کے علاوہ اپنی طرف سے کوئی حکم نافذ نہیں کر سکتا اور

نہ ہی قرآن و سنت سے متضاد و متصادم کوئی قانون وضع کر سکتا ہے۔ اسے جو اختیارات دیئے گئے ہیں ان کی حدود مقرر ہیں' جن سے وہ تجاوز نہیں کر سکتا۔

اسلام کے تصور خلافت میں خلیفہ مطلق العنان نہیں۔ خلافت میں تمام مسلمان برابر کے حصہ دار اور ذمہ دار ہیں۔ خلیفہ مسلمانوں ہی کے مشورہ سے منتخب کیا جاتا ہے۔ اگر وہ منصب خلافت سنبھالنے کے بعد قرآن و سنت پر عمل کرے اور کرائے تو اس کی اطاعت فرض ہے لیکن اگر وہ قرآن و سنت کے خلاف کوئی حکم دے تو اس کی اطاعت واجب نہیں۔ امت مسلمہ اس قسم کے شخص کو منصب خلافت سے معزول کر سکتی ہے۔ اسلام میں منصب خلافت موروثی نہیں ہے' اس کا اہل صرف متقی اور پرہیزگار شخص ہے۔ امت مسلمہ اپنے مشورے سے کسی بھی متقی اور اہلیت رکھنے والے شخص کو یہ منصب سونپ سکتی ہے۔

اصول مشاورت : قرآن مجید میں مسلمانوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے کام باہمی مشورے سے کرتے ہیں' جیسا کہ سورۃ الشوریٰ میں کہا گیا ہے:

وامرهم شوری بینهم

(اور ان کا کام آپس کے مشورہ سے ہوتا ہے)

رسول اللہ ﷺ دنیاوی امور میں صحابہ کرام سے مشورہ لے لیا کرتے تھے۔ آپ نے مسلمانوں کو تمام امور میں باہمی مشورہ کرنے کی تلقین فرمائی ہے۔

ایک حدیث شریف میں مذکور ہے:

قلت یا رسول اللہ الامر ینزل بنا بعدک لم ینزل فیه قران ولم یسمع منک فیه شی ء قال اجمعو العابد من امتی واجعلوه بینکم شوری ولا تقضو برای واحد

"میں (حضرت علی) نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آ جائے جس کے متعلق نہ قرآن میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی بات سنی ہو؟ فرمایا: میری امت میں سے عبادت گذار لوگوں کو جمع کرو اور اسے آپس کے مشورے کے لئے رکھ دو' اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔"

چنانچہ نظام خلافت چلانے کے لئے بھی مشورہ کو اہمیت دی گئی ہے۔ خلفائے راشدین اپنے اپنے عہد حکومت میں اکابر صحابہ سے مشورہ لیتے رہے۔ اسی مقصد کے پیش نظر اسلامی ریاست میں ایک "مجلس شوریٰ" تشکیل دی جاتی ہے' جو کاروبار حکومت میں مشورہ دیتی ہے اور اگر سربراہ ریاست قرآن و سنت کی خلاف ورزی کرے یا معصیت کا حکم جاری کرے تو مجلس شوریٰ اسے روک سکتی ہے۔ مجلس شوریٰ ضرورت وقت کے تحت قواعد و ضوابط مرتب کرنے میں بھی مشورہ دے سکتی ہے۔

اصول انتخاب : فرمان الٰہی ہے:

ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم (الحجرات)

(بیشک اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو)

فرمان نبوی ہے:

خیار ائمتکم الذین تحبونهم ویحبونکم وتصلون علیهم ویصلون علیکم وشرار ائمتکم الذین تبغضونهم ویبغضونکم وتلعنونهم ویلعنونکم

ترجمہ : تمہارے بہترین سردار وہ ہیں جن سے تم محبت کرو اور وہ تم سے محبت کریں' اور جن کو تم دعا دو' اور وہ تمہیں دعا دیں' اور تمہارے بدترین سردار وہ ہیں جن سے تم نفرت کرو' اور وہ تم سے نفرت کریں' اور جن پر تم لعنت بھیجو اور وہ تم پر لعنت بھیجیں۔

چنانچہ امیر مملکت' وزرا' اہل شوریٰ اور حکام کے انتخاب میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ وہ متقی' پرہیز گار' امانتدار اور اس منصب پر کام کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں' جس پر وہ فائز ہونے کے لئے منتخب کئے جا رہے ہیں۔ یہ انتخاب مسلمانوں کے مشورہ سے ہونا چاہئے۔ کسی منصب کے لئے اپنے آپ کو پیش کرنے والے شخص کو اچھا تصور نہیں کیا گیا۔ چنانچہ فرمان نبوی ہے:

ان اخونکم عند من طلبه

(ہمارے نزدیک تم میں سب سے بڑا خائن وہ ہے جو اس کا خود طالب ہو۔)

چنانچہ سربراہ حکومت یا شوریٰ وغیرہ کے ارکان کو اعمال و کردار اور اہلیت کی بنا پر منتخب کرنا چاہئے۔ دستور میں اس طریقے انتخاب کی وضاحت کرنا ضروری ہے۔

مقصد حکومت : سورۃ الحج میں مقصد حکومت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

الذین ان مکنهم فی الارض اقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ وامروا بالمعروف ونهوا عن المنکر

ترجمہ : یہ وہ (مسلمان) لوگ ہیں' جن کو اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں گے تو وہ نماز قائم کریں گے' زکوۃ دیں گے' نیکی کا حکم کریں گے اور بدی سے روکیں گے۔

اسلامی ریاست کا کام صرف یہی نہیں کہ اندرونی امن اور خارجی سرحدوں کی حفاظت کی جائے اور ملک کی مادی خوشحالی کی کوشش کی جائے بلکہ اس کا اولین فرض یہ ہے کہ نماز' روزہ اور زکوۃ کا نظام قائم کرے اور ان بھلائیوں کو فروغ دے جنہیں خدا اور رسول بھلائی قرار دیتے ہیں۔ اسلامی دستور میں اس امر کی صراحت ہونی چاہئے کہ اس دستور کے تمام تر مقاصد وہی ہوں گے جو اللہ اور رسول نے متعین فرمائے ہیں۔

اولی الامر اور اصول اطاعت : فرمان الٰہی ہے کہ:

یا ایها الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

ترجمہ : اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی' اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

انا امر علیکم عبد مجدع یقود کم بکتاب اللہ فاسمعوا واطیعوا

ترجمہ : اگر تم پر نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے' جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

چنانچہ اسلامی دستور میں اولی الامر کی اطاعت فرض قرار دی جانی چاہئے اور اس کے ساتھ مسلمانوں کو یہ حق بھی دیا جانا چاہئے کہ اگر اولی الامر کوئی غلط کام کرے یا غلط حکم دے تو اس کا محاسبہ کیا جائے اور محاسبہ بذریعہ عدالت یا بذریعہ مجلس شوریٰ ہو گا۔

بنیادی حقوق اور اجتماعی عدل : اسلام میں "حقوق العباد" کو نہایت اہمیت حاصل ہے۔ حقوق العباد ہی بنیادی شہری حقوق ہیں۔ اسلامی دستور میں ان تمام حقوق کی وضاحت موجود ہونی چاہئے جو خدا تعالیٰ نے اپنے بندوں کو عطا فرمائے ہیں۔

علاوہ ازیں یہ وضاحت بھی ہونی چاہئے کہ ریاست میں نافذ شدہ آئین تمام لوگوں کے لئے ہو گا' کسی کے لئے کوئی خاص رعایت نہیں ہو گی۔ ایک عام شہری سے لے کر سربراہ حکومت تک ایک ہی قانون کے تحت ایک ہی عدالت میں حاضر ہوں گے۔ جو شخص بھی جرم کرے گا' اسے سزا دی جائے گی' کسی سے رو رعایت نہیں کی جائے گی۔

اسلامی ریاست میں کسی شہری کی آزادی کو سلب نہیں کیا جا سکتا' اس کی حرمت اور جان و مال و آبرو پر کوئی دست درازی نہیں کی جا سکتی۔

فرمان نبوی ہے:

"یقیناً" تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں' ویسی ہی محترم ہیں جیسے آج حج کا یہ دن محترم ہے۔"

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جب تیرے سامنے دو فریق اپنا معاملہ لے کر بیٹھیں تو ان کا فیصلہ نہ کر' جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لے' جس طرح پہلے کی سنی ہے۔"

چنانچہ اسلامی ریاست میں کسی شخص کو اس وقت تک سزا نہیں دی جا سکتی' جب تک اس پر مقدمہ قائم کر کے' اسے صفائی پیش کرنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔

فلاح عامہ : اسلامی حکومت کی ذمہ داریوں میں سے ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اپنی حدود کے اندر ان لوگوں کی کفیل بنے جو مدد کے محتاج ہوں اور وسائل رزق سے محروم ہوں۔ علاوہ ازیں دستور میں فلاح عامہ کے سلسلہ میں کئے جانے والے اقدامات کا ذکر بھی ہونا چاہئے۔

انسانی دستور اور الٰہی دستور میں فرق : ذیل میں انسانی دستور اور الٰہی دستور میں فرق واضح کیا جا رہا ہے:

1- انسانی دستور انسان کا وضع کردہ ہے اور الٰہی دستور اللہ کے احکام کا مجموعہ ہے۔
2- انسان ناقص العقل ہے اس لئے اس کا وضع کردہ دستور بھی ناقص اور غلطیوں کا پلندہ

ہے' جبکہ الٰہی دستور ہر قسم کے نقص اور اغلاط سے پاک ہے۔

3- انسانی دستور میں انسانوں (مقننہ) کی منظوری حاصل کی جاتی ہے' جبکہ الٰہی دستور کسی کی منظوری کا محتاج نہیں۔

4- انسانی دستور میں صرف مادی پہلو پر روشنی ڈالی جاتی ہے اور اس میں روحانیت اور تقدس کا کوئی تصور موجود نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس الٰہی دستور مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔

5- انسانی دستور میں مذہب کو افراد کا ذاتی معاملہ قرار دیا جاتا ہے' اس کے برعکس الٰہی دستور میں دین اور دنیا (سیاست) ساتھ ساتھ چلتے ہیں' اور ان میں کوئی تفاوت نہیں۔ الٰہی دستور کا مقصد دین اور دنیا دونوں کی بھلائی کے لئے طریق عمل اختیار کرتا ہے۔

6- انسانی دستور میں وحدت اور یکسانی کا فقدان ہے' جبکہ الٰہی دستور وحدت اور یکسانیت کا صفات کا حامل ہے۔

7- انسانی دستور اخلاقیات کو کوئی اہمیت نہیں دیتا جبکہ الٰہی دستور اخلاقیات پر بہت زور دیتا ہے۔

8- انسانی دستور محدود اور وقتی ضروریات و مسائل کو مدنظر رکھتا ہے' جبکہ الٰہی دستور ہمیشہ کے لئے ہے اور ہر دور کے انسانی مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔

9- انسانی قانون فطری نہیں ہے جبکہ الٰہی دستور قانون فطرت ہے۔

10- انسانی دستور میں بہت سی ناانصافیاں پائی جاتی ہیں' جبکہ الٰہی دستور ہر شخص کو عدل و انصاف فراہم کرنے کا ضامن ہے۔

حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ

(SOVEREIGNTY)

سوال : نظریہ حاکمیت و اقتدار اعلیٰ سے کیا مراد ہے۔ مغربی اور اسلامی تصور کا موازنہ کیجئے۔

جواب : حاکمیت اقتدار اعلیٰ :

1- اقتدار اعلیٰ سے مراد وہ مرکز ہے جو ریاست کی تمام قوتوں کا سرچشمہ اور سارے اختیارات کا منبع ہے۔ (بودین)

2- اقتدار اعلیٰ سے مراد ہے شہریوں اور رعایا پر ریاست کا ایسا فائق اختیار جو قانونی حدبندیوں سے آزاد ہو۔ (بودین)

3- اقتدار اعلیٰ مملکت کا وہ اصلی مطلق العنان غیر محدود اور مکمل اختیار رہے جس کے تحت ملک کا ہر فرد اور ہر جماعت ہوتی ہے۔ (برگس)

4- حاکم اعلیٰ وہ فرد یا ادارہ ہے جس کے روبرو ریاست کے تمام باشندے اپنے حقوق اور آزادی سے دست بردار ہو جاتے ہیں۔ حاکم اعلیٰ مختار کل ہے اور مکمل و اکمل ہے۔ وہ ناقابل تغیر اور تمام قوانین کو تبدیل کرنے کا حق اور قدرت رکھتا ہے' اور جو کسی بھی انسانی طاقت سے بالا ہے۔ (ہابس)

نوٹ : یاد رہے کہ اصل میں "اقتدار اعلیٰ" سے مراد "مقتدر اعلیٰ" ہے۔ اقتدار اعلیٰ وہ اقتدار ہوتا ہے جو تمام قوتوں پر حاوی و غالب ہو' اور جسے ایسا اقتدار حاصل ہو' اسے "مقتدر اعلیٰ" کہا جاتا ہے۔

مغربی مفکرین کے نزدیک حاکیت یا اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات : مغربی مفکرین کے نزدیک اقتدار اعلیٰ یا حاکیت اعلیٰ مندرجہ ذیل خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔

1- **وحدت اقتدار :** حاکیت اعلیٰ بلا شرکت غیرے اقتدار کی مالک ہوتی ہے۔ ریاست کے اندر کوئی بھی شخص یا اشخاص یا ادارہ اس کی ہمسری نہیں کر سکتا۔

2- **ابدیت :** حاکیت اعلیٰ لازوال ہے اور ہمیشہ رہنے والی ہے۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک قائم رہے گی۔

3- **ناقابل تعطل :** حاکیت اعلیٰ میں تعطل پیدا نہیں ہو سکتا۔ وہ ازل سے ابد تک مسلسل رہے گی۔

4- **لامحدود :** حاکیت اعلیٰ کو محدود نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا اقتدار ہر چیز پر محیط ہے۔

5- **ناقابل انتقال :** حاکیت اعلیٰ کو منتقل نہیں کیا جا سکتا۔ حاکیت اعلیٰ کا تصور حاکم اعلیٰ کے وجود سے ہے اور اختیارات کی تقسیم و تفویض کے باوجود اصل حاکیت حاکم اعلیٰ ہی کے پاس رہتی ہے۔

6- **بالا دستی :** حاکیت اعلیٰ کو ریاست کے اندر تمام اداروں اور تمام افراد پر بالا دستی حاصل ہوتی ہے اور اس کا کنٹرول ریاست کی ہر شے پر ہوتا ہے۔

7- **آزادی :** حاکیت اعلیٰ کو حکم اور نفاذ حکم کی مکمل آزادی ہوتی ہے۔ حاکم اعلیٰ اپنی من مرضی سے جو حکم چاہے صادر کر سکتا ہے۔

8- **قانون سازی :** حاکم اعلیٰ کو اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق قانون سازی کے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی سے کسی بھی قانون کو منسوخ کر سکتا ہے' یا اس میں ترمیم کر سکتا ہے۔

9- **اطاعت :** حاکم اعلیٰ کی ہر بات واجب الاطاعت ہوتی ہے اور اس کے ہر حکم اور قانون پر بے چون و چرا عمل کرنا لازم ہے۔

10- **ناقابل تقسیم پذیری** : حاکمیت اعلیٰ کو تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ یعنی بیک وقت دو حاکم اعلیٰ نہیں ہو سکتے۔

11- **جلالت عامہ** : حاکم اعلیٰ کے پاس ایسی قوت کا ہونا ضروری ہے جس سے مرعوب ہو کر لوگ اس کے احکام کی پابندی کریں اور اس کا ہر حکم نافذ العمل ہو۔

اسلام میں حاکمیت یا اقتدار اعلیٰ کا تصور :

دین اسلام کے مطابق حاکمیت اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے' وہی حاکم اعلیٰ ہے' ہر اقتدار اسی کو حاصل ہے۔ چنانچہ مقتدر اعلیٰ بھی وہی ہے۔ ذیل میں قرآن مجید کے حوالہ سے اقتدار اعلیٰ اور مقتدر اعلیٰ کا تصور واضح کیا جا رہا ہے۔

مقتدر اعلیٰ کی صفات

اللہ (مقتدر اعلیٰ) خالق کائنات ہے : اسلام کے مطابق اللہ تعالیٰ پوری کائنات میں موجود ہر چیز کا خالق ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- **ولئن سالتھم من خلقھم لیقولن اللہ** (الزخرف)

ترجمہ : اگر تم ان سے پوچھو کہ تم کو کس نے پیدا کیا ہے' وہ ضرور کہیں گے اللہ نے۔

2- **وھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ** (اعراف)

ترجمہ : اور اللہ تعالیٰ وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا۔

3- **ولئن سالتم من خلق السماوات والارض وسخر الشمس والقمر لیقولن اللہ** (عنکبوت)

ترجمہ : اور اگر تم ان سے پوچھو کہ کس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور کس نے سورج اور چاند کو تابع فرمان بنا رکھا ہے' تو وہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔

قرآن مجید میں تخلیق کائنات سے متعلق بے شمار آیات موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس نے یہ کائنات بنائی ہے اس کا مالک بھی وہی ہے۔ اس لئے مقتدر اعلیٰ بھی وہی ہو سکتا ہے جو خالق ہو۔

اللہ (مقتدر اعلیٰ) مالک الملک ہے : اسلام کے مطابق اقتدار اعلیٰ صرف اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو ملک (روئے زمین) کا مالک ہو۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ مالک الملک ہے اس لئے مقتدر اعلیٰ بھی وہی ہے۔

1- سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

قل اللھم مالک الملک

ترجمہ : کہہ اے اللہ مالک الملک!

2- سورۃ فاطر میں فرمایا گیا ہے:

ذٰلکم اللہ ربکم لہ الملک

ترجمہ : وہ ہے اللہ' تمہارا رب' ملک اسی کا ہے۔

اللہ (مقتدر اعلیٰ) ہی حکم دے سکتا ہے : سورۃ المومن میں فرمایا گیا ہے:

فالحکم للہ العلی الکبیر

ترجمہ : لہذا حکم اللہ بزرگ و برتر کے لئے خاص ہے۔

اللہ کے حکم میں کوئی شریک نہیں :

1- سورۃ الکہف میں فرمایا گیا ہے:

ولا یشرک فی حکمہ احدا"

ترجمہ : اور وہ اپنے حکم میں کسی کو حصہ دار نہیں بناتا۔

2- سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

یقولون ھل لنا من الامر من شی ء قل ان الامر کلہ للہ

ترجمہ : لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں ہمارا بھی حصہ ہے' کہہ دو کہ امر سارا اللہ ہی کے لئے مخصوص ہے۔

اللہ (مقتدر اعلیٰ) کی بادشاہی میں کوئی شریک نہیں :

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے

لم یکن لہ شریک فی الملک

ترجمہ : بادشاہی میں اس کا کوئی شریک نہیں۔

اللہ (مقتدر اعلیٰ) کو قانون سازی کا حق ہے : اللہ چونکہ احکم الحاکمین ہے اور اسی کو مخلوق صادر کرنے کا حق حاصل ہے' اس لئے وہ اپنے بندوں کے لئے جو کچھ بہتر چاہے اسی کے لئے قانون نازل فرمائے۔ اس کے احکام و قوانین پر بے چون و چرا عمل کرنا لازم ہے۔ کوئی بھی شخص اپنی مرضی سے کوئی قانون نہیں بنا سکتا۔

سورۃ النحل میں فرمایا گیا:

ولا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال و ھذا حرام

ترجمہ : اور تم اپنی زبانوں سے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہو ان کے متعلق جھوٹ نہ گھڑا کر یہ نہ کہہ دیا کرو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے۔

صفات الٰہی : اسلام میں مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور اسی کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ چنانچہ مقتدر اعلیٰ کی صفات اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ مثلاً

وہ خالق ہے' مالک ہے' زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے' وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا' اس کو زوال نہیں' وہ محدود نہیں اور نہ ہی مجسم' وہ کسی چیز کے ساتھ متحد نہیں اور نہ ہی کسی چیز میں حلول کرتا ہے' وہ تمام اشیاء اور موجودات کو محیط ہے اور ان کے ساتھ قرب و معیت رکھتا ہے' اس کے افعال' صفات اور ذات میں تغیر کو

راہ نہیں' وہ کسی کا محتاج نہیں' وہ قادر و قدیر ہے' زندگی اور موت کا مالک ہے' ہر جاندار و بے جان کا رازق ہے۔ اس کا کوئی ہمسر نہیں' نہ اس نے کسی کو جنا اور نہ وہ کسی سے جنا گیا' وہ جو چاہے کرے' اسے کوئی کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا' اس کا اقتدار تمام کائنات پر چھایا ہوا ہے' عالم امر اور عالم خلق میں اسی کا قانون کارفرما ہے۔

خلاصہ : اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاکم اعلیٰ (مقتدر اعلیٰ) اللہ ہی کی ذات ہے' ملک بھی اسی کا ہے اور امر بھی اسی کا' اس کے حکم یا اختیار میں کوئی شریک نہیں۔ کوئی انسان حکم جاری نہیں کر سکتا۔ قانون سازی کا حق انسان سے سلب کر لیا گیا ہے' کیونکہ انسان بندہ محکوم ہے' اس کا کام صرف قانون الٰہی کی پیروی کرنا ہے۔

دین اور سیاست

سوال: اسلام میں دین اور سیاست پر نوٹ لکھیں۔

اسلامی نظریہ سیاست کی اساس مندرجہ ذیل امور پر منحصر ہے:

1- تصور کائنات و ملک
2- حاکمیت الٰہی (اقتدار اعلیٰ)
3- رسالت (تقرر رسول)
4- نظام قانون
5- تصور خلافت
6- مقاصد ریاست
7- اطاعت ریاست
8- شوریٰ
9- اسلامی دستور کے بنیادی اصول
10- بنیادی اسلامی حقوق
11- حکومت کے حقوق
12- مساوات کا حق
13- خارجی سیاست کے اصول

تصور کائنات و ملک : اسلامی عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے زمین و آسمان کی ہر چیز پیدا کی۔ زمین و آسمان اور پوری کائنات انسان کے رہنے بسنے اور غور و فکر کرنے کے لئے ہے۔ اس لئے پوری کائنات ایک ملک کی حیثیت رکھتی ہے۔ انسان چونکہ پوری کائنات سے رشتہ و رابطہ رکھنے کا مستحق ہے اس لئے پوری کائنات یا پورا جہان اس کا وطن ہے۔ ایک مسلمان کسی جغرافیائی حد بندی میں محصور نہیں ہے بلکہ وہ پوری دنیا کا باشندہ ہے۔ خدا کی پوری زمین انسان کے لئے مسخر کر دی گئی ہے اور اس کے لئے شمس و قمر کو کام میں لگا دیا گیا ہے۔ خدا کی ہر چیز اس انسان کے لئے ہے جو خدا کا نائب ہونے کی

اہلیت رکھتا ہے۔
قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- فالکم اللہ ربکم لہ الملک (فاطر)
(وہ ہے اللہ' تمہارا رب' ملک اسی کا ہے)

2- قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء و تنزع الملک من تشاء (آل عمران)
(کہو اے اللہ مالک الملک تو جس کو چاہے ملک دے اور جس سے چاہے چھین لے۔)

قصہ مختصر یہ کہ پوری کائنات اسی کا ملک اور اسی کی ملکیت ہے۔ اس ملکیت میں کوئی اس کا حصہ دار نہیں۔ ہاں! اگر کوئی انسان اس کا ہو جائے تو پوری کائنات اور پورا ملک مجازی طور پر اس کا ہو جاتا ہے اور وہ خدا کے اس ملک میں نیابت کے فرائض انجام دینے کا اہل ہو جاتا ہے۔

حاکمیت الٰہی : اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا بلا شرکت غیرے مالک ہے' اس لئے حاکمیت بھی اسی کو زیب دیتی ہے۔ اسلامی نظریہ کے مطابق مقتدر اعلیٰ اسی کی ذات ہے اور اقتدار اعلیٰ اسی کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے حکم کے مقابل کسی کا حکم قابل قبول نہیں۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی انسانی یا غیر انسانی طاقت کو احکامات دینے یا فیصلے کرنے کا اختیار حاصل نہیں۔
قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- الا لہ الخلق والامر (اعراف)
(خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔)

2- لم یکن لہ شریک فی الملک (بنی اسرائیل)
(بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں)

3- یقولون ھل لنا من الامر من کل شیء قل ان الامر کلہ للہ (آل عمران)
(لوگ پوچھتے ہیں کیا امر میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے' کہہ دو کہ امر سارا اللہ کے لئے مخصوص ہے)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حاکم اعلیٰ (مقتدر اعلیٰ) اللہ کی ذات ہے' کوئی انسان حکم جاری نہیں کر سکتا۔ قانون سازی کا حق انسان سے سلب کر لیا گیا ہے' کیونکہ انسان بندہ اور محکوم ہے' اس کا کام صرف قانون الٰہی کی پیروی کرنا ہے' جیسا کہ سورۃ اعراف میں فرمایا گیا ہے۔

اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم
(جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے' اس کی پیروی کرو)

المختصر یہ کہ اسلام کے سیاسی نظریہ کا ایک بنیادی جزو یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ ہی کو حاصل ہے۔ وہ حاکم اعلیٰ اور احکم الحاکمین ہے اور قرآنی احکام کے مقابل کوئی قانون سازی نہیں کی جا سکتی۔

رسالت (تقرر رسول) : اللہ تعالیٰ اپنے احکامات اپنے منتخب بندوں یعنی نبیوں اور رسولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر خاتم المرسلین حضرت محمد ﷺ تک مبعوث ہونے والے تمام نبی اور رسول برحق ہیں۔ رسول ﷺ پر چونکہ نبوت ختم ہو چکی ہے اس لئے اللہ تعالیٰ کے تمام احکام بھی مکمل ہو چکے ہیں۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ آخری کتاب ہے۔ اس میں درج احکام کے علاوہ سابقہ الہامی کتب کے تمام احکام منسوخ ہو چکے ہیں' اس لئے قرآن مجید کے احکام پر عمل کرنا لازم ہے۔

اسلامی عقیدہ یہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ اللہ کے آخری رسول ہیں' ان کی اطاعت کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ (النساء)

ترجمہ : اور ہم نے جو رسول بھی بھیجا ہے اسی لئے بھیجا ہے کہ حکم الٰہی کی بنا پر اس کی اطاعت کی جائے۔

2- انا انزلنا الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ (النساء)

ترجمہ : اے نبی ہم نے تمہاری طرف کتاب برحق نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان اس روشنی کے مطابق فیصلہ کرو' جو اللہ نے تمہیں دکھائی ہے۔

3- من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

ترجمہ : جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی۔

نظام قانون : اسلامی نظریہ سیاست کے مطابق اللہ اور رسول کا حکم بالاتر قانون ہے جس پر بے چون و چرا عمل کرنا فرض ہے۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والا کافر ہے' جیسا کہ سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون

ترجمہ : اور جو اس قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرے' جو اللہ نے اتارا ہے' تو ایسے تمام لوگ کافر ہیں۔ چنانچہ قانون الٰہی سے متضاد و متصادم ہر حکم اور قانون باطل اور ناقابل عمل ہے۔

تصور خلافت : اسلام کے مطابق اللہ تعالیٰ کی ذات مقتدر اعلیٰ ہے اور اس نے انسان کو زمین پر اپنا نائب بنایا ہے' جیسا کہ سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

وانی جاعل فی الارض خلیفہ

ترجمہ : اور ہم نے (انسان کو) زمین پر اپنا خلیفہ بنایا۔

سورۃ النور میں فرمایا گیا ہے:

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی

الارض کما استخلف من قبلہم

ترجمہ : جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' ان نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا' جس طرح ان سے پہلے (نیک لوگوں کو خلیفہ بنایا گیا)۔

اسلام "حاکمیت" کے بجائے "خلافت" کی اصطلاح استعمال کرتا ہے۔ چونکہ اس کے نظریہ کے مطابق حاکمیت خدا کی ہے' لہٰذا جو کوئی اسلامی دستور کے تحت زمین پر حکمران ہو' اسے لامحالہ حاکم اعلیٰ کا خلیفہ ہونا چاہئے' جو محض تفویض کردہ اختیارات استعمال کرنے کا مجاز ہو گا۔ خلیفہ حاکم اعلیٰ کے احکامات من و عن پہنچانے کا پابند ہے' وہ اپنی صوابدید سے ان احکام میں ذرہ برابر کمی بیشی نہیں کر سکتا۔

رہی یہ بات کہ اللہ کا خلیفہ کون ہے؟------ ہر وہ انسان جو احکام الٰہی پر عمل پیرا ہو' عمومی طور پر خدا کا خلیفہ ہے۔ اور وہ مسلمان جو احکام الٰہی پر عمل درآمد کروانے کی اہلیت رکھتا ہو اور قانون الٰہی کا عالم ہو' وہ خلیفہ منتخب ہو سکتا ہے۔

مقاصد ریاست/اطاعت ریاست : انسان زمین پر اللہ کے خلیفہ کی حیثیت سے جو ریاست قائم کرتا ہے' اس کے دو بڑے مقاصد ہیں۔

1۔ انسانی زندگی میں عدل قائم کرنا اور ظلم و جور کو مٹانا۔
2۔ حکومت کے وسائل و طاقت سے امامت' صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا نظام قائم کرنا۔ یعنی احکام اسلام پر عمل درآمد کرانا۔

ان مقاصد کو پورا کرنے کے لئے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کرے۔ صحیح بخاری میں رسول اللہ ﷺ کی یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ :

"مسلمان کو لازم ہے کہ اپنے اولی الامر کی بات سنیں اور مانیں' خواہ یہ بات اسے پسند ہو یا ناپسند' تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے' اور جب اسے معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر' سے کچھ نہ سننا چاہئے اور کچھ نہ ماننا چاہئے۔"

قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے :

یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول و اولی الامر منکم (النساء)

ترجمہ : اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اطاعت کرو اللہ کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہوں۔

ایک حدیث میں مذکور ہے۔

ان امر علیم عبد مجدع یقودکم بکتاب اللہ فاسمعوا واطیعو

ترجمہ : اگر تم پر کوئی نکٹا غلام بھی امیر بنا دیا جائے' جو کتاب اللہ کے مطابق تمہاری قیادت کرے تو اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

اولی الامر یا ریاست کی اطاعت صرف احکام الٰہی کی ہے' اگر معصیت یا برائی کا حکم دیا جائے تو اطاعت لازم نہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

1۔ لا طاعۃ فی معصیۃ انما الطاعۃ فی المعروف (بخاری' مسلم)

ترجمہ : معصیت میں کوئی اطاعت نہیں' اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔

2- لا طاعۃ لمن عصی اللہ (طبرانی)
ترجمہ : اللہ کے نافرمان کی اطاعت نہیں (کرنی چاہئے)

3- لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق
ترجمہ : خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔

شوریٰ : ارشاد الٰہی ہے:

وامرھم شوریٰ بینھم (الشوریٰ)
(اور اپنے معاملات آپس میں مشورہ سے چلاتے ہیں)

حکومت و ریاست کا نظام چلانے' خلیفہ کا انتخاب کرنے اور تمام شرعی و انتظامی امور کے لئے حکم دیا گیا ہے کہ اللہ اور رسول کی ہدایت کی روشنی میں اہل ایمان باہمی مشورہ سے عمل کریں۔

یاد رہے کہ شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان نہیں ہے' بلکہ اس لئے کہ قرآن و سنت کی پابندی لازم ہے۔ اپنے طور پر کوئی فیصلہ دینا اس کے اختیار میں نہیں چنانچہ مسلمانوں شرعی معاملات میں اس امر پر تو مشورہ کر سکتے ہیں کہ کسی نص کا صحیح مفہوم کیا ہے اور اس پر عمل درآمد کس طریقے سے کیا جائے' لیکن اس غرض سے کوئی مشورہ نہیں کر سکتے کہ جس معاملہ کا فیصلہ اللہ اور اس کے رسول نے کر دیا ہے' اس ضمن میں وہ خود کوئی آزادانہ فیصلہ کریں۔

اسلامی دستور کے بنیادی اصول : قرآن مجید کے احکامات و قوانین کی روشنی میں نظام خلافت کو چلانے والی ریاست کے دستور کے بنیادی اصول یہ ہیں :

1- اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے۔
2- قانون الٰہی کے نفاذ کے لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے بعد امیر کی اطاعت لازم ہے۔
3- ریاست نافذ ہونے والے تمام قوانین قرآن و سنت کے مطابق ہوں۔
4- اسلامی ریاست میں مجلس شوریٰ مقننہ کی حیثیت رکھتی ہے' لیکن وہ قرآن و سنت سے متصادم قانون سازی نہیں کر سکتی۔
5- اسلامی ریاست میں عدلیہ' عوام اور انتظامیہ کے دباؤ سے آزاد ہوتی ہے۔
6- ہر شخص قانون کے سامنے جوابدہ ہے۔

بنیادی حقوق : اسلامی ریاست کے تمام افراد بلا لحاظ مذہب و ملت' رنگ و نسل اور نسب مساوی حقوق رکھتے ہیں۔ ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنے حصہ کی ذمہ داریاں پوری کرے اور اپنے حقوق کی پاسبانی کرے۔ اسلام میں بنیادی شہری حقوق کو بھرپور تحفظ دیا گیا ہے۔ گورے' کالے اور امیر و غریب میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔

حکومت کے حقوق : اسلام میں ہدایت کی گئی ہے کہ :

1- ریاست کے باشندے حکومت کی اطاعت کریں۔ حاکم وقت کی اطاعت فرض قرار دی گئی ہے۔
2- ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ نظم و نسق چلانے میں مدد و معاون ثابت ہو اور کسی اسلامی قانون کی خلاف ورزی نہ کرے۔
3- اسلامی ریاست کو جب کسی بیرونی جارحیت کا سامنا ہو تو ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ ریاست کے دفاع کے لئے جان و مال سے جہاد کرے۔

خارجی سیاست کے اصول : اسلام میں تعلقات خارجہ کے بارے میں رہنما اصول موجود ہیں۔ چنانچہ اسلامی نظریات کے مطابق خارجہ پالیسی کے اصول یہ ہیں۔
1- دوسری حکومتوں کے ساتھ کیے گئے معاہدوں کا احترام کیا جائے۔
2- خارجہ تعلقات میں راستبازی اور دیانت سے کام لیا جائے۔
3- بین الاقوامی عدل و انصاف کے اصولوں کو فروغ دیا جائے۔
4- دوران جنگ غیرجانبداری کا پورا احترام کیا جائے۔
5- خارجہ تعلقات میں صلح پسندی کو فروغ دیا جائے۔
6- جو تم پر زیادتی کرے تم اتنی ہی زیادتی کرو جتنی اس نے کی تھی اور اگر بدلہ تو اتنا ہی لو۔
7- جو ریاستیں مسلمانوں کے ساتھ زیادتی یا جنگ نہ کریں' ان سے دوستانہ سلوک کیا جائے۔
8- ایسے معاملات میں ملوث ہونے سے اجتناب کیا جائے جن کا تعلق زمین پر فساد پھیلانا ہو۔

مساوات کا حق : اسلام تمام انسانوں کو مساوی حقوق دیتا ہے۔ بحیثیت انسان کسی کو کسی پر فوقیت حاصل نہیں ہے۔ کوئی شخص حتیٰ کہ خلیفہ بھی تک قانون سے بالاتر نہیں۔ دنیا کے تمام انسان برابر ہیں۔ قانون الٰہی میں کسی شخص کو رعایت حاصل نہیں ہے۔

خلافت

سوال : خلافت سے کیا مراد ہے؟ مفکرین اسلام کے حوالہ سے تصور خلافت پر روشنی ڈالئے!

جواب : خلافت :

"خلافت" کے معنی ہیں : جانشینی' قائم مقامی' نیابت۔ اسلامی اصطلاح میں اس سے مراد

ہے:

نیابت الٰہی' اللہ تعالیٰ کے قانون کو کسی میں نافذ کرنے والے کا منصب' اسلامی ریاست کی (مجازی) سربراہی۔ حکومت الٰہی کی زمین پر نیابت۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو اسلامی حکومت قائم ہوئی' وہ چونکہ احکام الٰہی کو نافذ کرنے کا منصب رکھتی تھی' اس لئے اسے "خلافت" کہتے ہیں۔

قرآن کی روشنی میں : انسان کو کیسے پیدا کیا گیا ہے' اور اسے کیوں افضل المخلوقات قرار دیکر منصب خلافت سے سرفراز کیا گیا ہے' اس کا تذکرہ قرآن مجید میں یوں کیا گیا ہے:

"سورۃ ص" میں' تخلیق آدم کا قصہ بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے:

اذ قال ربک للملائکتہ انی خالق بشرا" من طین○ فاذا سویتہ و نفخت فیہ من روحی فقعوالہ ساجدین○

ترجمہ : جبکہ تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک بشر پیدا کرنے والا ہوں' پس جب میں اس کو پورا بنا لوں اور اس کے اندر اپنی روح سے کچھ پھونک دوں' تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر جانا۔

فسجد الملائکتہ کلھم اجمعون○ الا ابلیس استکبر وکان من الکافرین

پس تمام ملائکہ نے سجدہ کیا لیکن ابلیس نے نہ کیا' وہ گھمنڈ میں پڑ گیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ آدم کو سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں مردود قرار دے دیا۔

قرآن مجید میں بتایا گیا ہے کہ :

1- اللہ نے انسان کو اپنے دونوں ہاتھ سے بنایا۔
2- اللہ نے انسان کو بہترین ساخت پر پیدا کیا۔
3- اللہ نے انسان میں اپنی طرف سے روح پھونکی۔
4- اللہ نے زمین آسمان کی ساری چیزیں انسان کے حق میں مسخر کر دیں۔
5- اللہ نے انسان (آدم) کو مسجود ملائک ہونے کا شرف عطا کر اسے فرشتوں پر فوقیت دی۔
6- اللہ تعالیٰ نے انسان کو افضل المخلوقات ہونے کا شرف عطا کیا۔

اور پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ قرار دیا' جیسا کہ سورۃ بقرہ میں فرمایا گیا ہے:

واذ قال ربک للملائکتہ انی جاعل فی الارض خلیفتہ"

اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں۔

خلافت الٰہی : "خلافت الٰہی" سے کیا مراد ہے؟ ——— اس سوال کا جواب سورۃ احزاب کی اس آیت میں تلاش کیا جا سکتا ہے:

انا عرضنا الامانۃ علی السموت والارض والجبال فابین ان یحملنھا واشفقن منھا وحملھا الانسان انہ کان ظلوما" جھولا"

ترجمہ : ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا' مگر انہوں نے اس کا بارا اٹھانے سے انکار کر کیا اور اس سے ڈر گئے' اور انسان نے اس کو اٹھا لیا' بیشک وہ ظالم اور انجام سے بے خبر نکلا۔

اس آیت میں امانت (الامانۃ) سے مراد ہے : اختیار' ذمہ داری' جوابدہی۔
گویا آسمان' زمین اور پہاڑ اس بارا امانت (ذمہ داری) کو ڈرتے مارے نہ اٹھا سکے' سب نے بزدلی کا مظاہرہ کیا لیکن انسان نے اپنے دل کو ٹٹولا' اس میں یہ بوجھ اٹھانے کی سکت اور ہمت موجود پائی تو پکار اٹھا: میں اٹھاؤں گا یہ ذمہ داری۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں کہ :

"انسان پہلے زمین و آسمان میں کوئی مخلوق بار امانت کی حامل نہیں تھی۔ انسان پہلی مخلوق ہے جس نے یہ بار اٹھایا ہے لہٰذا منصب امانت میں وہ کسی مخلوق کا جانشین نہیں ہے۔"

"خلافت کے مفہوم کو "امانت" کا لفظ واضح کر دیتا ہے' اور یہ دونوں لفظ نظام عالم انسان کی صحیح حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ انسان زمین کا فرمانروا ہے' مگر اس کی فرمانروائی بالاصالت نہیں ہے' بلکہ تفویض کردہ ہے۔ لہٰذا اللہ نے اس کے اختیارات مفوضہ کو امانت سے تعبیر کیا ہے' اور اس حیثیت سے کہ جو اس کی طرف سے ان اختیارات مفوضہ کو استعمال کرتا ہے' اسے "خلیفہ" کہا ہے۔ اس تشریح کے مطابق "خلیفہ" کے معنی یہ ہوئے کہ وہ شخص جو کسی بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔"

خلیفہ کون ہے : یہ سوال کہ خلافت کا حقدار کون ہے' اور خلیفہ بننے کے لئے کن صفات کا حامل ہونا ضروری ہے؟------ ان سوالات کا جواب قرآن مجید میں موجود ہے۔ چنانچہ سورۃ النور میں فرمایا گیا ہے:

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم

ترجمہ : جو تم میں سے ایمان لائیں اور نیک عمل کریں' اللہ نے ان سے وعدہ کیا ہے کہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا' اسی طرح جس طرح ان سے پہلے اس نے دوسروں کو خلیفہ بنایا۔

اس آیت سے اس سوال کا جواب ملتا ہے کہ خلیفہ کون ہے؟------ یعنی خلیفہ وہ ہے:

1- جو ایمان لائے (مومن ہوں)
2- جو ایمان لانے کے بعد احکام الٰہی پر عمل کرے (اعمال صالح بجا لائے)

اس آیت کی روشنی میں ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ پر ایمان لاتا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار کرتا ہے' اور کتاب اللہ کے احکامات پر عمل کرتا ہے' اللہ تعالیٰ کا خ

ہے۔ بالفاظ دیگر ہر مسلمان خلیفہ الٰہی ہے' اور خلیفہ ہونے کی حیثیت سے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔

منصب خلافت : اسلامی نکتہ نظر سے تمام مسلمان ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم میں سے دو شخص بھی مل کر اکٹھے چلیں تو ایک شخص دوسرے کو اپنا امیر بنا لے۔ یعنی جماعت کا نظام چلانے کے لئے امیر کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا تمام مسلمان' اسلامی ریاست کا نظام چلانے کے لئے' کسی ایک شخص کو' باہمی مشورہ سے اپنا امیر منتخب کر لیتے ہیں' جو قرآن و سنت کے احکام کے مطابق کاروبار حکومت چلانے کا ذمہ دار ہوتا ہے' یہ شخص "خلیفہ" کہلاتا ہے اور اس کا منصب "خلافت"۔

اسلامی مفکرین کے نزدیک تصور خلافت :

الماوردی : الماوردی کے نزدیک خلافت کا مقصد دنیا میں حق و انصاف کی ترقی' نیک و بد' خیر و شر اور حق و باطل میں تمیز کرتا ہے۔ وہ مقتدر اعلیٰ کو خلیفہ کے بجائے "امام" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ نیک' صالح اور عاقل و بالغ مسلمانوں کو باہمی مشورہ سے امام کا انتخاب عمل میں لانا چاہئے۔ اس سلسلہ میں ہر کس و ناکس کی رائے قبول نہیں کی جا سکتی۔ ماوردی کا خیال ہے کہ امام دو طریقوں سے منتخب کیا جا سکتا ہے۔ پہلا طریقہ باہمی مشورہ سے انتخاب عمل میں لانا چاہئے' اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ امام اپنی طرف سے کسی شخص کو اپنا جانشین نامزد کر دے۔

ابن خلدون : عام اسلامی نظریہ کے مطابق خلیفہ زمین پر اللہ تعالیٰ کا نائب ہوتا ہے' لیکن ابن خلدون کا خیال ہے کہ خلیفہ اللہ کا نہیں بلکہ رسول کا نائب ہوتا ہے۔ ابن خلدون یہ دلیل دیتا ہے کہ جب حضرت ابوبکر خلیفہ بنے تو لوگوں نے انہیں "خلیفۃ اللہ" کہنا شروع کر دیا' لیکن حضرت ابوبکر صدیق نے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ: "میں خلیفۃ نہیں' بلکہ خلیفۃ الرسول ہوں۔" ابن خلدون یہ بھی دلیل پیش کرتے ہیں کہ نیابت ہمیشہ ایسے شخص کی ہوتی ہے جو موجود اور حاضر نہ ہو' اور اللہ تعالیٰ ہمہ وقت موجود اور حاضر ہے' اس لئے اس کا کوئی نائب نہیں ہو سکتا۔ مختصر یہ کہ ابن خلدون کے نزدیک خلیفہ نائب رسول ہوتا ہے' نائب الٰہی نہیں۔

شاہ ولی اللہ دہلوی : شاہ ولی اللہ نے معاشرہ کی چار ارتقائی منازل مقرر کی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ جب معاشرہ تیسری منزل سے ترقی کر کے چوتھی منزل میں داخل ہوتا ہے تو خلافت معرض وجود میں آتی ہے۔ ان کے نزدیک بین الاقوامی معاشرہ کا نام خلافت ہے۔ ان کے نزدیک خلیفہ ایسے حاکم اعلیٰ کو کہتے ہیں' جس کے قبضے میں اتنا زبردست لشکر اور سامان ہو کہ کسی کے لئے اسکا مغلوب کرنا ناممکن ہو۔ شاہ ولی اللہ کے نزدیک خلیفہ' خلیفۃ الرسول ہوتا ہے۔ جو شخص خلیفہ کی اطاعت کرتا ہے وہ بلاشبہ احکام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے۔

غزالی : امام غزالی "خلافت" کے بجائے "امامت" کا لفظ استعمال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

نظام دنیا کا دارومدار نظام دنیا پر ہے اور نظام دنیا امام کے بغیر محال ہے' اس لئے نظام دین ایک ایسے امام کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے' جس کی لوگ اطاعت کرتے ہوں۔

سرسید احمد خان : سرسید احمد خان خلیفہ کو نہ خلیفۃ اللہ مانتے ہیں اور نہ خلیفۃ الرسول۔ وہ خلافت کو محض ایک دنیوی سلطنت کی ایک صورت تصور کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی شخص من حیث النبوہ ان کا جانشین نہیں ہو سکتا' خلفائے اسلام نے اپنے عہد میں جو کچھ کیا' سرسید اس کو ذمہ دار اسلام نہیں ٹھہراتے' بلکہ خلفاء کی ذاتی ذمہ داری قرار دیتے ہیں۔ وہ ازروئے دین یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ کسی شخص کی خلافت کو تسلیم کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ خطبات میں خلیفہ کا نام لینا بدعت ہے' البتہ خلیفہ منصف ہو' عادل ہو تو خطبہ میں اس کا نام لئے بغیر اس کے حق میں دعا کی جا سکتی ہے۔

مولانا ابو الاعلیٰ مودودی : مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ زمین کا مالک اللہ ہے۔ اس کی زمین پر رہنے والے اور اس کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے اور اس کی ملکیت میں تصرف کرنے کا حق صرف اسی کو پہنچتا ہے' جو اس کا مطیع و فرمانبردار ہو' اور اس کے قانون فطری و شرع کا اتباع کرے۔ مولانا کا خیال ہے کہ خلافت کے حقدار بالخصوص انبیائے کرام ہیں' پھر عمومی طور پر ہر مسلمان۔ وہ سورۃ النور کی آیت (55) کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ خلیفہ بنانے کا وعدہ تمام مسلمانوں سے کیا گیا ہے' یہ نہیں کہا گیا کہ ان میں سے کسی کو خلیفہ بناؤں گا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مومن خلافت کے حامل ہیں۔ ان کے نزدیک خدا کی طرف سے جو خلافت مومنوں کو عطا ہوتی ہے وہ عمومی خلافت ہے' جو کسی شخص' خاندان' نسل یا طبقہ کے لئے مخصوص نہیں ہے۔ ہر مومن اپنی جگہ خدا کا خلیفہ ہے۔ خلیفہ ہونے کی حیثیت سے فرداً" فرداً" ہر ایک خدا کے سامنے جوابدہ ہے اور ایک خلیفہ دوسرے خلیفہ کے مقابلہ میں کسی حیثیت سے فروتر نہیں۔

مولانا مودودی کے نزدیک خلافت کا مفہوم "امانت الٰہی" یا "اختیارات مفوضہ" ہیں۔ جو شخص اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان اختیارات مفوضہ کو استعمال کرتا ہے' وہ اس کا خلیفہ ہے۔ بالفاظ دیگر خلیفہ کے معنی یہ ہیں: وہ شخص جو کسی کے بخشے ہوئے اختیارات کو استعمال کرے۔

مولانا مودودی کے نزدیک خدا تعالیٰ نے انسان کو زمین پر خلیفہ بنایا ہے' ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پیروی کرتا ہے' وہ اس کا خلیفہ ہے۔ یہ تمام عمومی خلفاء مل کر اپنے لئے ایک خاص خلیفہ چن لیں تو "خلافت" وجود میں آتی ہے۔

مولانا مودودی نے اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں "تصور خلافت" کے عنوان کے تحت رقم طراز ہیں کہ:

> "ایک اسلامی ریاست میں اس کے تمام غیر مسلم باشندوں کا بحیثیت مجموعی حامل خلافت ہونا" وہ اہم اصولی حقیقت ہے جس پر اسلام میں جمہوریت کی بنا رکھی گئی ہے۔
> جس طرح غیر اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی حاکمیت (Popular Sovereignty) کے اصول پر قائم ہوتی ہے' ٹھیک اسی طرح اسلامی جمہوریت کی بنیاد اجتماعی خلافت (Popular Vicegerency) کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ اس نظام میں "حاکمیت"

کے بجائے "خلافت" کی اصطلاح اس لئے اختیار کی گئی ہے کہ یہاں اقتدار خدا کا عطیہ ہے' اور اس عطیے کو خدا کے مقرر کئے ہوئے حدود کے اندر ہی استعمال کیا جا سکتا ہے' لیکن خلافت کا یہ محدود اقتدار' قرآن کی تصریح کی رو سے' کسی ایک شخص یا طبقے کو نہیں' بلکہ ریاست کے تمام مسلمانوں کو من حیثیت الجماعت سونپا گیا ہے' جس کا لازمی تقاضا ہے کہ حکومت مسلمانوں کی مرضی سے بنے' ان کے مشورے سے کام کرے' اور اسی وقت تک حکمران رہے' جب تک مسلمان اس سے راضی رہیں۔ اسی بنا پر حضرت ابوبکر صدیق نے "خلیفۃ اللہ" کہلانے سے انکار کیا تھا' کیونکہ خلافت دراصل امت مسلمہ کو سونپی گئی تھی' نہ کہ براہ راست ان کو۔ ان کی خلافت کی اصل حیثیت یہ تھی کہ مسلمانوں نے اپنی مرضی سے اپنے اختیارات خلافت ان کے سپرد کئے تھے۔"

خلیفہ

سوال : (الف) اسلامی ریاست میں خلیفہ کے انتخاب کے طریق کار پر روشنی ڈالئے!

(ب) خلیفہ کی اہلیت (اوصاف) قرآن و سنت اور مفکرین اسلام کے حوالہ سے بیان کریں۔

جواب : خلیفہ :

خلافت الٰہی کے منصب پر فائز ہونے والا شخص "خلیفہ" کہلاتا ہے۔ بالفاظ دیگر اسے اسلامی ریاست کا "صدر ریاست" کہا جا سکتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جو حضرات اسلامی ریاست کے سربراہ منتخب ہوئے' وہ "خلیفہ" کے لقب سے موسوم ہوئے۔ جیسے :

خلیفہ اول	:	حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
خلیفہ دوم	:	حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ
خلیفہ سوم	:	حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
خلیفہ چہارم	:	حضرت علی کرم اللہ وجہہ

خلیفہ کا انتخاب : خاتم المرسلین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد اسلامی ریاست کا نظام چلانے کے لئے مسلمانوں نے مجمع عام میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خلیفہ منتخب کیا اور ان کے دست مبارک پر بیعت کی۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اپنی وفات سے قبل اکابر صحابہ کو الگ الگ بلا کر اپنے بعد مقرر ہونے والے خلیفہ کے بارے میں رائے معلوم کی

اور حضرت عمر فاروق کے حق میں اپنی وصیت لکھوائی۔ پھر حالت مرض میں مجمع عام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا تم راضی ہو' اس شخص سے جس کو میں نے اپنا جانشین بناؤں؟ خدا کی قسم میں نے غور و فکر کر کے رائے قائم کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی' اور اپنے کسی رشتہ دار کو مقرر نہیں کیا۔ میں نے عمر بن خطاب کو جانشین بنایا ہے' پس تم ان کی سنو اور اطاعت کرو"

مجمع نے کہا کہ : ہم نے سنا اور مانا۔

یعنی خلیفہ دوم کا تقرر نامزدگی سے نہیں ہوا بلکہ اول نے مشورے سے حضرت عمر فاروق کا نام تجویز کیا جسے مجمع عام نے منظور کر لیا۔

حضرت عمر فاروق نے وفات سے قبل آنے والے خلیفہ کے انتخاب کے لئے چھ اصحاب پر مشتمل ایک مجلس مشاورت بنا دی۔ اس مجلس نے حضرت عبدالرحمان بن عوف کے خلیفہ کے انتخاب کا کام سپرد کر دیا۔ جنہوں نے چل پھر کر مردوں اور عورتوں سے مشورہ لینے کے بعد نتیجہ اخذ کیا کہ سب سے زیادہ معتمد علیہ دو شخص یعنی حضرت عثمان اور علی ہیں' اور ان دونوں میں سے لوگوں کا میلان حضرت عثمان کی جانب ہے۔ چنانچہ حضرت عثمان کو خلیفہ منتخب کر لیا گیا اور مجمع عام میں لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد معتبر لوگوں نے عرض علی کرم اللہ وجہ کو منصب خلافت سنبھالنے کی پیش کش کی۔ پہلے تو انہوں نے انکار کر دیا پھر لوگوں کے اصرار پر' فرمایا : میری بیعت خفیہ طور نہیں ہو سکتی اور مسلمانوں کی عام رضامندی کے بغیر اس کا انعقاد ممکن نہیں۔ چنانچہ آپ مسجد میں تشریف لے گئے جہاں مہاجرین و انصار نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

مفکرین اسلام کی رائے ذیل میں خلیفہ کے طریق انتخاب کے بارے میں مفکرین اسلام کی رائے پیش کی جا رہی ہے۔

شاہ ولی اللہ دہلوی : شاہ ولی اللہ دہلوی نے خلیفہ کے انتخاب کے لئے مندرجہ ذیل طریقے تجویز کئے ہیں:

1- خلیفہ سلطان سے برتر شخصیت کا مالک ہوتا ہے' اس لئے اس کے انتخاب کے لئے ارباب حل و عقد کی رائے معتبر سمجھی جاتی ہے۔
2- مسلمانوں کا سابق خلیفہ اپنی صوابدید سے پوری ریاست میں سے کسی کو خلیفہ نامزد کر سکتا ہے' البتہ اس کی تصدیق و تائید ارباب مقتدر کی طرف سے کروا لینی چاہئے۔
3- ایک خلیفہ کی مدت کے بعد دوسرے خلیفہ کے تقرر کے لئے حاضر ارباب حل و عقد کی مجلس مشوریٰ کا اجلاس طلب کر کے نئے خلیفہ کا انتخاب کیا جا سکتا ہے۔

کوئی بھی شخص جو خلیفہ بننے کی شرائط پوری کرتا ہو' اپنی قوت کے بل بوتے پر مسند خلافت پر نہیں بیٹھ سکتا۔ شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک یہ ناپسندیدہ طریقہ ہے۔

الماوردی : ماوردی "خلیفہ" کے بجائے "امام" کا لفظ استعمال کرتا ہے۔ اس کے نزدیک امام

کے انتخاب کے دو طریقے ہیں:

1- امام کو مسلمان رائے دہندگان کی اکثریت کی حمایت سے منتخب کیا جائے۔

2- امام وقت نئے امام کو نامزد کرے۔

ماوردی کا خیال ہے کہ امام پوری قوم کے مشورہ سے منتخب کیا جانا چاہئے' لیکن اس سلسلہ میں ہر کس و ناکس کی رائے نہیں لینی چاہئے۔ رائے دہندگان کا صالح' متقی' عاقل اور بالغ ہونے ضروری ہے۔ ماوردی کا کہنا ہے کہ نامزدگی پیچیدگیوں سے بچنے کے لئے بہترین اور محفوظ طریقہ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ باصلاحیت امام کبھی ناقابل اور نااہل افراد کو نامزد نہیں کرتا۔

خلیفہ کی اہمیت' قرآن کی روشنی میں : قرآن مجید کے مطابق خلیفہ یا امام اولی الامر کے لئے مندرجہ ذیل صفات کا حامل ہونا ضروری ہے۔

(1) **مرد ہونا :** خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ مرد ہو' کوئی عورت خلیفہ یا اولی الامر نہیں ہو سکتی۔ خلیفہ کے مرد ہونے کا حکم قرآن مجید اور احادیث میں موجود ہے۔

سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

الرجال قوامون علی النساء

یعنی : مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

احادیث نبوی میں فرمایا گیا ہے:

1- "وہ قوم ہرگز فلاح نہ پائے گی جس نے اپنی زمام کار ایک عورت کے سپرد کی ہو۔"

2- جب تمہارے امراء تمہارے بدترین لوگ ہوں' اور جب تمہارے دولتمند بخیل ہوں' اور جب تمہارے معاملات تمہاری عورتوں کے ہاتھ میں ہو تو زمین کا پیٹ تمہارے لئے اس کی پیٹھ سے بہتر ہے۔

(2) **عاقل و بالغ ہونا :** خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہو۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

"ولا تئوتوا السفهاء اموالکم التی جعل الله لکم قیما"

ترجمہ : اور اپنے مال جنہیں اللہ نے تمہارے لئے ہستی کا سہارا بنایا ہے نادان (بیوقوف) لوگوں کے حوالے نہ کرو۔

(3) **مسلم ہونا :** اسلامی ریاست کا خلیفہ صرف مسلمان شخص ہی ہو سکتا ہے۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

یا ایها الذین امنوا اطیعوا الله واطیعو الرسول و اولی الامر منکم

ترجمہ : اے ایمان والو! اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی' اور ان لوگوں کی جو تم میں سے اولی الامر ہوں۔

(4) **دارالسلام کا باشندہ ہونا :** خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسلامی ریاست

(دارالسلام) کا باشندہ ہو۔

اس بات کو سورۃ الانفال کی اس آیت سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

والذین امنوا ولم یھاجروا مالکم من ولا یتھم من شی حتی یھاجروا

ترجمہ : اور جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کر کے (دارالسلام میں) نہ آ گئے' تمہارا ان کی ولایت میں کوئی حصہ نہیں جب تک کہ ہجرت نہ کریں۔

(5) امانتدار ہونا : خلیفہ کی ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ امانتدار ہو۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے۔

ان اللہ یامرکم ان تودو الامانات الی اھلھا

ترجمہ : بیشک اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امانت کے سپرد کر دو۔

(6) متقی ہونا : اسلام میں رنگ و نسل اور دولت و شہرت کے بل بوتے پر کوئی شخص معزز و محترم نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں عظمت و فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ چنانچہ خلیفہ بننے کے لئے امیدوار کو متقی اور پرہیزگار ہونا چاہئے۔ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا ہے:

ان اکرمکم عنداللہ اتقاکم

ترجمہ : تم میں سب سے زیادہ معزز وہ ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے۔

(7) عالم ہونا : خلیفہ کے لئے عالم و فاضل ہونا ضروری ہے۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے۔

قال ان اللہ اصطفٰہ علیکم وزادہٗ بسطۃ فی العلم والجسم

ترجمہ : کہا (نبی نے) کہ اللہ نے حکمرانی کے لئے اس (طالوت) کو تم پر ترجیح دی۔ ہے اور اس کو علم اور جسم میں فراوانی عطا کی ہے۔

(8) حدود آشنا ہونا : خواہش نفس کی پیروی کرنے والا حدود آشنا شخص خلیفہ بننے کا مستحق نہیں۔ چنانچہ خلیفہ صرف وہی بن سکتا ہے جو حدود آشنا ہو اور نفس پرست نہ ہو۔ سورۃ الکہف میں فرمایا گیا ہے۔

ولا تطع من اغفلنا قلبہ عن ذکرنا واتبع ھواہ وکان امرہ فرطا"

ترجمہ : کسی ایسے شخص کی اطاعت نہ کرو جس کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے' اور جس نے اپنی خواہش نفس کی پیروی اختیار کر لی ہے' اور جس کا کام حدود آشنا نہیں ہے۔

(9) اہل بدعت نہ ہونا : خلیفہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن و سنت کی پیروی کرنے والا اور دین میں نئی باتیں (بدعات) داخل کرنے والا نہ ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے۔

"جس نے کسی صاحب بدعت کی توقیر کی' اس نے اسلام کو منہدم کرنے میں مدد دی۔"

(بیہقی)

(10) منصب خلافت کا خود طلبگار نہ ہونا : رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

"بخدا ہم کسی ایسے شخص کو اپنی حکومت کے کسی منصب پر مقرر نہیں کرتے، جس نے اس کی درخواست ہو، جو اس کا حریص ہو۔"

اسلامی مفکرین کے نزدیک خلیفہ کی صفات : ذیل میں مفکرین اسلام کے حوالہ سے خلیفہ کی صفات کا تذکرہ کیا جا رہا ہے:

فارابی : محمد بن محمد بن ترخان فارابی کو مقتدر اعلیٰ یا رئیس اول کے نام سے پکارتا ہے۔ اس کے نزدیک رئیس اول (خلیفہ) میں مندرجہ ذیل صفات کا پایا جانا ضروری ہے:

1- علم و فضل
2- عمدہ یادداشت
3- نفسیات سے آگاہی
4- بحث سے گریز
5- قوت برداشت
6- عدل و انصاف
7- ظلم سے پرہیز
8- صاف دلی
9- طاقت ور شخصیت
10- شجاعت
11- داخلی و خارجی امن قائم رکھنے کی اہلیت
12- دولت و ثروت میں فراوانی

الماوردی : ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی کے نزدیک خلیفہ (امام) میں مندرجہ ذیل نکات کا ہونا ضروری ہے:

1- مرد ہو (عورت امام نہیں بن سکتی)
2- مرد آزاد ہو (غلام امام نہیں بن سکتا)
3- عاقل و بالغ ہو
4- بلند کردار ہو
5- تواضع میں بے مثل ہو
6- سخی ہو
7- عادل و منصف ہو
8- شجاع، بہادر، دلیر اور طاقتور ہو
9- ثابت قدم ہو
10- صائب الرائے ہو
11- معاملہ فہم ہو
12- معتدل مزاج ہو
13- علم دین سے بہرہ ور ہو
14- شریعت پر کاربند ہو، متقی اور صالح ہو
15- عوام کی اکثریت اسے پسند کرتی ہو

امام غزالی : امام غزالی کے نزدیک مقتدر اعلیٰ (خلیفہ) کے لئے مندرجہ ذیل صفات کا حامل ہونا ضروری ہے:

1- وہ عاقل، بالغ اور دور اندیش ہو۔
2- دینی اور دنیاوی علوم سے بہرہ ور ہو اور حالات حاضرہ سے مکمل طور پر واقفیت رکھتا ہو۔
3- وہ نیک کردار، رحمدل، سخی اور حلیم الطبع ہو۔

۴۔ وہ شجاع ہو اور اعلیٰ ترین قوت ارادی رکھتا ہو۔

ابن خلدون : ابن خلدون ایک جگہ لکھتا ہے کہ خلیفہ میں چار صفات کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) **علم و فضل** : خلیفہ میں مجتہدانہ صفات ہونی چاہئیں' اسے مقلد نہیں ہونا چاہئے۔

تحفظ دین : اسلامی ریاست اسلام کے نام پر قائم کی جاتی ہے' اس خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ تحفظ دین کی بھرپور اقدام کرے۔ اسلام میں دو قسم کے حقوق ہیں۔ اول حقوق اللہ' دوم حقوق العباد۔ خلیفہ ان دونوں قسم کے حقوق کا ذمہ دار ہے۔ تحفظ دین کے سلسلہ میں خلیفہ کو چاہئے کہ وہ خود بھی اللہ کے حقوق پورے کرے اور لوگوں سے بھی کروائے۔

تحفظ دین کے سلسلہ میں خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ مندرجہ ذیل امور پر عمل کروائے۔

(الف) ارکان پنجگانہ : اسلام کے پانچ بنیادی ارکان کلمہ' نماز' روزہ' حج' زکوۃ پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جب کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر صدق دل سے مسلمان ہونے کا اقرار کرتا ہے تو اس پر دین اسلام کے تمام تر احکامات کی بے چون و چرا پابندی کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ خصوصاً اسے سب سے پہلے نماز ادا کرنے کا حکم ہے۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ "قیام الصلوۃ" کا نظام قائم کرے۔ اس سلسلہ میں مساجد کی تعمیر' مساجد میں امام اور خادم وغیرہ کا تقرر اور اس ادارہ پر اٹھنے والے اخراجات کا انتظام کرے۔ اس کے بعد رمضان المبارک کے پورے مہینے کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ رمضان المبارک کا احترام کروانے کا بندوبست کرے تاکہ لوگ سرعام روزہ کی بے حرمتی نہ کریں۔ پھر صاحب نصاب حضرات سے زکوۃ وصول کرنے کے لئے نظام زکوۃ قائم کرنا بھی ضروری ہے۔ اسلام نے صاحب استطاعت لوگوں پر زندگی میں ایک بار حج فرض کیا ہے۔ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ مسلمانوں کے لئے حج کے لئے موثر انتظامات کرے۔

(ب) تبلیغ دین : خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ دین اسلام کی ترویج و ترقی کے لئے کوشاں رہے۔ اشاعت دین کے سلسلہ میں خود بھی تبلیغ کرے اور مبلغین بھی مقرر کرے۔

تبلیغ دین کے تین مدارج ہیں:

(i) قوت و طاقت سے برائی کو روکنا : اس سلسلہ میں اسلامی حکومت سرکاری طور پر انتظامات کر سکتی ہے۔

(ii) زبان کی برائی سے روکنا : یہ ماسوائے کمزوروں کے ہر فرد ریاست پر لازم ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت مقررین سے تعاون حاصل کر سکتی ہے۔

(iii) برائی کو برا جاننا: یہ مجبور اور لاچار لوگوں کے لئے ہے۔

تبلیغ دین کے سلسلہ میں خلیفہ "تالیف قلوب" کے طریقہ کو بھی اپنا سکتا ہے' تاکہ نومسلم لوگوں کی دلجوئی ہو اور وہ صحیح معنوں میں اسلام کے وفادار بن جائیں۔

(ج) دینی تعلیم : تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں خلیفہ پر لوگوں کو دینی تعلیم دلوانے کا فریضہ بھی عاید ہوتا ہے۔ چنانچہ خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ علمائے دین کی سرپرستی کرے اور دینی تعلیم کے

نئے درسگاہیں قائم کرے۔

(2) عدل گستری : اسلامی ریاست کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ نظام عدل قائم کیا جائے' جیسا کہ سورۃ الحدید میں فرمایا گیا ہے:

لقد ارسلنا رسلنا بالبینات وانزلنا معھم الکتاب والمیزان لیقوم الناس بالقسط

یعنی : ہم نے اپنے رسول روشن دلائل کے ساتھ بھیجے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتاری تاکہ لوگ انصاف پر قائم ہوں۔

خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف قائم کرے اور ریاست میں نظام عدل کو مضبوط سے مضبوط تر بنانے کے لئے کوشاں رہے۔ عدالتوں میں تمام فیصلے قرآن و سنت کی روشنی میں ہوں' غیر اسلامی قوانین کو وقعت نہ دی جائے۔ اسلامی ریاست میں رہنے والے غیر مسلم شہریوں کے ساتھ بھی مساوی سلوک کیا جائے۔ اگر وہ اپنے مخصّص قانون پر عمل کرنا چاہیں تو انھیں اس امر کی اجازت دیدی جائے۔ جو غیر مسلم اسلامی قوانین کے مطابق اپنا فیصلہ کروانا چاہے اس کے مقابلہ میں مسلم مدعا علیہ کو ترجیح نہ دی جائے' بلکہ ان میں سے جو بھی حق پر ہو' اسے اس کا حق دلایا جائے۔ بددیانت اور رشوت خور قسم کے قاضیوں کی کڑی نگرانی کی جائے اور ثبوت ملنے پر ان کو سبکدوش کر دیا جائے۔

نظام عدل میں اسلامی قوانین مثلاً حدود و تعزیرات کی روشنی میں فیصلے کئے جائیں اور کسی کے مجرم ثابت ہونے پر اسے قانون شرعی کے مطابق سزا دی جائے۔

(3) قیام امن : خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ ریاست میں امن و امان بحال رکھے۔ اندرونی و بیرونی امن قائم رکھنے کے لئے باصلاحیت انتظامیہ کا تقرر کرے اور ملکی حالات سے ہر لحہ خبردار رہے' جونہی جہاں کسی خرابی کا علم ہو' فوری طور پر اس کا سد باب کرے۔ ملک میں فرقہ بندیاں قائم نہ ہونے دے۔ لوگوں کو فکری اور نظریاتی طور پر متحد رکھنے کے لئے موثر ادارے قائم کرے۔

(4) تحفظ سرحدات : خلیفہ کا فرض ہے کہ وہ اسلامی ریاست کی سرحدوں کو محفوظ بنانے کی بھرپور کوشش کرے' اس مقصد کے لئے دفاعی فوج بھرتی کی جا سکتی ہے۔ دشمنان اسلام کی زیادتی کی بنا پر اسے جنگ (قتال) کرنے کی بھی اجازت ہے۔ چنانچہ خلیفہ کو چاہئے کہ وہ "محکمہ فوج" کو مضبوط سے مضبوط تر بنائے۔

(5) بہبود عامہ : اسلامی ریاست کا ایک بڑا مقصد خلق خدا کی بہبود و ترقی کے لئے موثر انتظام کرنا بھی ہے۔ اس سلسلہ میں خلیفہ مندرجہ ذیل قسم کے انتظامات کر سکتا ہے:

(1) بیت المال سے لوگوں کی مالی امداد
(2) ناداروں' یتیموں' بیواؤں اور طالب علموں کے لئے وظائف
(3) شفا خانوں کا اجراء
(4) درسگاہوں کا قیام

(5) فلاحی اداروں کا قیام
(6) ذرائع آمدورفت و رسل وسائل کا بندوبست

(6) عہدیداروں کا تقرر : حکومت کا نظام چلانے کے لئے خلیفہ انتظامی امور کو مندرجہ ذیل شعبوں میں تقسیم کر سکتا ہے۔
(1) انتظامیہ (2) عدلیہ (3) مقننہ (مجلس شوریٰ)

عہدیداران کے تقرر کے لئے خلیفہ کو چاہئے کہ وہ ایماندار اور باصلاحیت افراد کا تقرر کرے۔ اس سلسلہ میں وہ مجلس مشاورت سے مشورہ بھی لے سکتا ہے۔

(7) امور خارجہ : ہمسایہ اور دوست ممالک سے تعلقات استوار رکھنا بھی خلیفہ کے فرائض میں شامل ہے۔ اس سلسلہ میں بیرونی ممالک سے معاہدات کئے جا سکتے ہیں لیکن ان معاہدات کا اسلامی ریاست کے حق میں سود مند ہونا ضروری ہے۔

(8) امور ریاست نگرانی : خلیفہ ریاست کے تمام امور کا نگران ہوتا ہے' اس لئے اس کا فرض ہے کہ وہ ملک میں موجود تمام اداروں پر کڑی نظر رکھے اور گلیوں' بازاروں' محلوں تک کے حالات سے خبردار رہے۔ وہ سرکاری شعبوں کا بھی نگران ہے اور پرائیویٹ اداروں کا بھی' لیکن وہ اندرون خانہ معاملات میں دخل نہیں دے سکتا۔

مفکرین اسلام کے نزدیک خلیفہ کے فرائض :

الماوردی : ابوالحسن علی بن محمد بن حبیب الماوردی کے نزدیک خلیفہ کے فرائض یہ ہیں :

(1) تحفظ دین — (2) عدالت
(3) امن کی بحالی — (4) مضبوط دفاع
(5) ایماندار عملہ کا تقرر — (6) غرباء کی امداد
(7) اشاعت اسلام — (8) نظام زکوٰۃ کا قیام

غزالی : امام غزالی کے نزدیک مقتدر اعلیٰ (خلیفہ) کے فرائض یہ ہیں :

(1) مقتدر اعلیٰ نماز فجر کے بعد عوام کے مختلف حلقوں میں گردش کرے اور جہاں کوئی برائی نظر آئے اس کی اصلاح کے فوری اقدامات کرے۔
(2) حاضرین دربار کی گزارشات براہ راست سنے اور ان سے مختلف مسائل پر گفتگو کرے۔
(3) وہ غیر معمولی ذہانت کے مالک کی حوصلہ افزائی کرے اور اپنے دور کے علماء و فضلاء اور ماہرین فنون سے مشورے کرتا رہے اور ان کے تجربات سے فائدہ اٹھائے۔
(4) وہ سیاسی حکمت عملی سے آگاہ ہو اور غیر ملکی سفیروں سے رابطہ قائم رکھے۔
(5) امور سلطنت میں کسی قسم کی رعایت روا نہ رکھے۔
(6) تحفظ دین اور تحفظ ریاست کے لئے بہترین بندوبست کرے۔
(7) عدل و انصاف سے کام لے۔

(8) حرم کو حرم کی چاردیواری تک محدود رکھے اور عورت کے زیر اثر نہ آئے۔
(9) بوقت ضرورت جہاد کے لئے کوشاں رہے۔
(10) شراب نوشی اور بسیار خوری سے پرہیز کرے۔

ابن خلدون : ابن خلدون خلیفہ کے مندرجہ ذیل فرائض کا تعین یوں کرتا ہے:
(1) داخلی و خارجی امن و سکون کا بندوبست کرنا۔
(2) شہریوں کے لئے خوراک کا انتظام کرنا۔
(3) تجارت کے اضافہ کے لئے خاطر خواہ انتظام کرنا۔
(4) ریاست میں انصاف کا دور دورہ کرنا اور ظلم و ستم کا انسداد کرنا۔
(5) شہریوں کی بودوباش کا خاطر خواہ انتظام کرنا۔
(6) شرعی قوانین نافذ کرنا۔
(7) عوام کے جائز مطالبات پورے کرنا۔
(8) شہریوں کو ان کی خدمات کا معقول اور بروقت معاوضہ دلانا۔
(9) تحفظ دین و تحفظ ملک اور شہریوں کی جان و مال کا تحفظ کرنا۔

شاہ ولی اللہ : شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک خلیفہ کو حسب ذیل فرائض ادا کرنے چاہئیں:
(1) قوانین کی خلاف ورزی کی روک تھام کے لئے ممکنہ ذرائع پر عمل کرے۔
(2) ملک کو خارجی جارحیت سے تحفظ دے۔
(3) مقاصد جنگ اور ضروریات پر توجہ دے۔
(4) صلح کرتے وقت قومی مفاد کو پیش نظر رکھے۔
(5) سب کے ساتھ برابر سلوک کرے۔
(6) علماء و فضلاء کا احترام کرے۔
(7) چھوٹے مقصد کے لئے بڑے مقصد قربان نہ کرے۔
(8) دینی اور دنیاوی امور میں پوری امت کی بھرپور قیادت کرے۔
(9) شرعی حدود کا قیام اور شرعی احکام کا قیام عمل میں لائے۔

خلیفہ (امام) کے فرائض بیان کرتے ہوئے شاہ ولی اللہ دہلوی رقم طراز ہیں کہ:
نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس بندہ کو اللہ تعالیٰ کسی رعیت کا مالک بنائے اور وہ اس کی خیرخواہی کے ساتھ حفاظت نہ کرے' تو وہ جنت کی بو بھی نہ پائے گا۔"

چونکہ خلیفہ کا مقرر کرنا مصلحتوں کے قائم کرنے کے لئے تھا' اس لئے ضروری ہوا کہ خلیفہ کو ان مصالح کے قائم کرنے کا تاکیدی حکم دیا جائے۔

پھر چونکہ امام تنہا صدقات اور عشور کو وصول نہیں کر سکتا اور نہ تمام اطراف کے مقدمات فیصل کر سکتا ہے اس لئے عمال اور قاضیوں کا مقرر کرنا ضروری ہوا۔ یہ لوگ چونکہ سب کام کاج کر کے مصالح عامہ میں سے ایک کام میں مشغول ہو گئے' اس لئے بیت المال میں ان کے مصارف کا مقرر ہونا ضروری ہوا۔

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب خلیفہ ہوئے تو آپ نے اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

"تحقیق میری قوم جانتی ہے کہ میری تجارت میرے گھر والوں کے لئے کچھ کم نہ تھی' اور اب میں مسلمانوں کے کام میں مشغول ہوں' پس ابوبکر کا کنبہ بیت المال سے کھائے گا اور مسلمانوں کے لئے محنت کرے گا۔"

یہ بھی ضروری ہوا کہ عامل کو نرمی کرنے کا حکم دیا جائے' خیانت اور رشوت سے منع کیا جائے اور لوگوں کو اس کی اطاعت کا حکم دیا جائے' تاکہ مصلحت مقصودہ پوری پوری پائی جائے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ان رجالا یتخوضون فی مال اللہ بغیر حق فلھم النار یوم القیامہ

(یعنی لوگ خدا تعالیٰ کے مال کو بغیر حق کے تصرف کرتے ہیں' پس قیامت کے روز ان کے لئے آگ ہے)

اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

من استعملناہ علی عمل فرزقناہ رزقا" فما اخذ بعد ذلک فھو غلول

(جس کو ہم کسی کام پر مقرر کریں اور اس کو تنخواہ بھی دیں' پھر اس کے بعد جو کچھ لے گا' وہ خیانت ہے)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے والے اور لینے والے پر لعنت کی ہے کیونکہ اس سے فساد کا دروازہ کھلتا ہے۔

اور رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

لا نستعمل من طلب العمل

(ہم اس شخص کو عامل مقرر نہیں کرتے جو خود عامل بننا چاہے)

اس کی وجہ یہ ہے کہ عامل بننے کی طلب اکثر خواہش نفسانی سے خالی نہیں ہوتا

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا : "جب تمہارے پاس کوئی عامل آئے تو مناسب ہے کہ تم سے خوش ہو کر واپس جائے۔"

یہ بھی ضروری ہے کہ عمال کو ان کے عمل کے بدلہ میں جو کچھ دیا جائے' اس کا اندازہ معین کیا جائے' تاکہ اس میں کمی و زیادتی نہ کی جا سکے۔

ارشاد نبوی ہے:

"جو شخص ہمارا عامل ہو تو اس کو چاہئے کہ بیوی نہیں ہے تو نکاح کر لے' پھر اگر اس کے پاس خادم نہ ہو تو خادم بھی مقرر کر لے اور اگر گھر نہ ہو تو گھر بھی لے لے۔"

پس جب امام عامل کو سال بھر کے صدقات وصول کرنے کو بھیجے تو اس کو چاہئے کہ اس کے لئے اس قدر مقرر کر دے' جو اس کے اخراجات کے لئے کافی ہوں اور دیگر حوائج شفقت کو گوارا نہ کرے اور نہ اس کی طرف توجہ دے۔

سوال : (الف) اطاعت فی المعروف پر نوٹ لکھیے!
(ب) خلیفہ (امام) کو کن امور کی بنا پر سبکدوش یا برطرف کیا جا سکتا ہے؟
جواب : اطاعت فی المعروف :

خلیفہ کا فرض ریاست کی تمامتر ذمہ داریاں پوری کرنا ہے۔ اگر وہ اپنی ذمہ داریاں بطریق احسن ادا نہ کرے تو وہ گنہگار ہو گا۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

مامن امیریلی امرالمسلمین ثم لا یجھد لھم ولا ینصح الالم یدخل معھم فی الجنتہ (مسلم)

ترجمہ : کوئی حاکم جو مسلمانوں کی حکومت کا کوئی منصب سنبھالے' پھر اس کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لئے جان نہ لڑائے اور خلوص کے ساتھ کام نہ کرے' وہ مسلمانوں کے ساتھ جنت میں قطعاً" داخل نہ ہو گا۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص حکمران ہو' اس کو سب سے زیادہ بھاری حساب دینا ہو گا اور وہ سب سے زیادہ سخت عذاب کے خطرے میں مبتلا ہو گا' اور جو حکمران نہ ہو اس کو ہلکا حساب دینا ہو گا' اور اس کے لئے ہلکے عذاب کا خطرہ ہے' کیونکہ حکام کے لئے سب سے بڑھ کر اس بات کے مواقع ہیں کہ ان ہاتھوں مسلمانوں پر ظلم ہو' اور جو مسلمانوں پر ظلم کرے' وہ خدا سے غداری کرتا ہے۔"

حضرت عمرفاروق رضی اللہ نے اپنے دور خلافت میں فرمایا:

"دریائے فرات کے کنارے ایک بکری کا بچہ بھی اگر ضائع ہو جائے تو مجھے ڈر لگتا ہے کہ اللہ مجھ سے باز پرس کرے گا۔"

اسلام نے اولی الامر کی اطاعت کرنے کا حکم دیا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا ہے کہ اگر اولی الامر اسلامی احکام کے خلاف کوئی حکم دے تو اس کی اطاعت نہ کی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

1- السمع والطاعتہ علی المرء المسلم فیما احب اوکرہ مالم یومر بمعصیتہ فاذا امر بمعصیتہ فلاسمع ولا طاعتہ (بخاری)

ترجمہ : ایک مسلمان پر اپنے امیر کی سمع اطاعت فرض ہے' خواہ اس کا حکم اسے پسند ہو یا ناپسند' تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے' اور جب معصیت کا حکم دیا جائے تو پھر کوئی سمع اطاعت نہیں۔

2- لاطاعتہ فی معصیتہ اللہ انما الطاعتہ فی المعروف (نسائی)

ترجمہ : اللہ کی نافرمانی میں کوئی اطاعت نہیں' اطاعت صرف معروف میں ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق فرماتے ہیں:

"جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے معاملات میں سے کسی معاملہ کا ذمہ دار

بنایا گیا ہے' اور پھر اس نے لوگوں کے درمیان کتاب اللہ کے مطابق کام نہ کیا' اس پر اللہ کی لعنت ہے۔"

انہوں نے خلیفہ بننے کے بعد فرمایا:

"میری اطاعت کرو' جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا رہوں' اور جب میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت نہیں ہے۔"

حضرت علی کرم اللہ وجہ نے فرمایا:

"میں اللہ کی فرمانبرداری کرتے ہوئے تم کو جو حکم دوں اس کی اطاعت تم پر فرض ہے' خواہ وہ حکم تم کو پسند ہو یا ناپسند' اور جو حکم میں تمہیں اللہ کی نافرمانی کرتے ہوئے دوں تو معصیت میں کسی کے لئے اطاعت نہیں' اطاعت صرف معروف میں ہے' اطاعت صرف معروف میں ہے' اطاعت صرف معروف میں ہے۔"

خلیفہ کی سبکدوشی (برطرفی) : قرآن و حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ اولی الامر (خلیفہ) کی اطاعت صرف معروف میں ہے' اگر وہ معصیت کا حکم دے تو اس کی اطاعت نہیں کرنی چاہئے۔ اس بنا پر خلیفہ کو سبکدوش یا برطرف بھی کیا جا سکتا ہے۔

فقہا نے خلیفہ (امام) کی سبکدوشی کی مندرجہ ذیل تین وجوہات بیان کی ہیں۔

(1) اخلاقی تبدیلی
(2) جسمانی تغیر
(3) دشمن کے ہاتھوں طویل اسیری

اخلاقی تبدیلی : اگر خلیفہ کے اخلاق میں ایسی تبدیلی واقع ہو جائے جس کے باعث معاشرہ کو نقصان ہوتا ہو' یا معاشرتی اقدار تباہ ہوتی ہوں' یا معاشرہ دین اسلام کے احکام سے دور ہوتا جا رہا ہو' تو ضروری ہے کہ خلیفہ کو سبکدوش کر دیا جائے۔

اخلاقی تبدیلی کی دو وجوہات ہو سکتی:

1- یہ کہ خلیفہ کسی ایسی جماعت سے وابستہ ہو جائے جو علی الاعلان شریعت کی مخالف ہو اور ، یا وہ ہوس کاریوں میں مصروف ہو۔
2- یہ کہ خلیفہ کے اپنے ایمان میں تبدیلی پیدا ہو جائے۔ یہ تبدیلی خواہ اس کے اپنے نظریات بدل جانے کے باعث ہو' یا کسی خارجی طاقت کے دباؤ کے زیر اثر ہو۔

جسمانی تغیر : جسمانی تغیر کی تین صورتیں ہیں:

1- جسمانی طور پر خلیفہ (امام) کے حواس درست نہ رہیں۔
2- کسی وجہ سے جسمانی اعضاء ناکارہ ہو جائیں' مثلاً آنکھ کا ضائع ہونا' دونوں بازوؤں کا کٹ جانا۔
3- اس کی انتظامی صلاحیتیں اور قابلیتیں معدوم ہو جائے۔

اکثر فقہاء کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا جسمانی تغیر کے باعث خلیفہ کو معزول کیا جا سکتا ہے۔

دشمن کے ہاتھوں طویل اسیری : اگر خلیفہ (امام) کسی سیاسی وجہ سے دشمن کے نرغے میں جائے اور اسے قید کر دیا جائے تو تمام مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اسے اپنا اسیری سے نجات دلوانے کی کوشش کریں۔ جب تک اس کے رہا ہونے کی توقع ہو اسے اپنا خلیفہ (امام) تسلیم کیا جائے۔ لیکن جب تمام کوششیں ناکام ہو جائیں اور تمام امیدیں مایوسی میں تبدیل ہو جائیں تو یہ تصور کر لینا چاہئے کہ امام اپنے عہدے سے سبکدوش ہو گیا ہے۔

الماوردی کا خیال ہے کہ اگر امام کسی مسلمان حاکم کے ہتھے چڑھ گیا ہو اور اسے قید کر دیا گیا ہو' تو وہ اپنے منصب سے سبکدوش نہیں ہو گا۔ اس کے تمام احکام سرکاری طور پر قابل تعمیل ہوں گے جو وہ قید خانے سے جاری کرے۔ اس صورت میں ایک قائم مقام امام کا تقرر کیا جا سکتا ہے' جو اصل امام کی رہائی کے بعد سبکدوش ہو جائے گا۔

شاہ ولی اللہ کی رائے : شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ جو شخص شرائط خلافت پوری نہ کرتا ہو' عوام کا فرض ہے کہ وہ اسے کسی نہ کسی طریقہ سے برطرف کر دیں۔ اگر وہ آسانی سے دستبردار نہ ہو تو جنگ کے ذریعہ سے برطرف کر دیں۔

اسباب معزولی : بعض علمائے کرام کے نزدیک خلیفہ کو مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر معزول کیا جا سکتا ہے :

(1) مرتد ہونا
(2) پاگل ہونا
(3) دشمن کے ہاتھوں طویل اسیری اور رہائی کی امید باقی نہ رہنا۔
(4) قانون الٰہی کی خلاف ورزی
(5) مسلمانوں کی دینی و دنیاوی حفاظت سے معذوری
(6) فاسق و فاجر ہو جانا
(7) جسمانی یا دماغی نقص
(8) ارباب علم و دانش کی پرواہ نہ کرنا۔
(9) معصیت کا حکم دینا

امامت

[illegible]

امام / امامت : "امام" (الامام) کے معنی ہیں : (1) پیشوا' وہ شخص جس کی اقتداء کی جائے' پیش امام (2) معمار کا دھاگا یا ڈوری جس سے وہ عمارت کی سیدھ قائم کرتا ہے (3) نمونہ (4) کھلا راستہ۔

"امامت" کے معنی ہیں : (1) پیشوائی' اقتداء' سرداری' رہبری (2) ریاست عامہ

شرعی اصطلاح میں "امام" وہ شخص ہے جو امت مسلمہ کی رہنمائی کرتا ہے۔ یہ لفظ اولی الامر کے معنی میں بھی مستعمل ہے۔ اکثر اسلامی مفکرین نے خلیفہ کے بجائے "امام" کا لفظ استعمال کیا ہے اور "خلافت" کو "امامت" قرار دیا ہے۔ مثلاً الماوردی نے خلافت کا جو نظریہ پیش کیا ہے' اس میں امام اور امامت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ابن خلدون کا کہنا ہے کہ:

"کبھی کبھی خلافت پر ہی امامت کا بھی اطلاق ہوتا ہے۔"

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ:

"وجوب امامت بہ اقتضائے عقل ہے' اور جو اجماع کہ استقرار خلافت پر ہوتا رہا ہے' وہ اصل میں مقتضائے عقل ہی تھا' کیونکہ اجتماع انسان کے لئے عقلاً واجب و ضرور ہے' اور اجتماع کا انتظام بدوں امام ممکن ہی نہیں' کیونکہ تمام اغراض کی وجہ سے اجتماع و تمدن میں منازعات کا واقع ہونا مسلمات سے ہے' اس لئے اگر حاکم عادل (امام) موجود نہ ہو گا تو نظام اجتماع میں خرابی واقع ہو گی' اور دین شریعت کے ساتھ انقطاع نوعی تک نوبت پہنچے گی۔"

ابن خلدون نے خلافت ہی کے لئے "امامت" کا لفظ استعمال کیا ہے۔

امامت کبریٰ : بعض مفکرین اسلام نے "خلافت" کو "امامت کبریٰ" کا نام دیا ہے۔ مولانا حامد الانصاری "امامت کبریٰ" کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

"امامت کبریٰ" ایک ایسی ریاست عامہ کا نام ہے' جو پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کی قانونی نمائندگی سے حاکمانہ بالا دستی حاصل کرتی ہے اور دین و دنیا کی اجتماعی سرگرمیوں میں اپنی عظمت و طاقت کا اس طرح اظہار کرتی ہے کہ اس میں اعلیٰ رہنمائی کے اوصاف نمایاں ہو جاتے ہیں۔"

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ:

"حکومت کا وہ منصب جو دین کی نگہبانی اور دنیا کے سیاسی فرائض پورے کرتا ہے خلافت و امام ہے۔ اس کو "خلافت عامہ" اور "امامت کبریٰ" کہا جاتا ہے۔"

اکثر علمائے امت نے "خلافت کبریٰ" کے سربراہ کو "امام کبیر" کے نام سے موسوم کیا ہے۔

امامت اور خلافت میں فرق : بعض حضرات نے امامت اور خلافت میں فرق ظاہر کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں رقم طراز ہیں کہ:

"خلافت' امامت' اور امارت کی اصلاحیں ہماری فقہ اسلام کی بعض کتابوں میں بالکل مترادف اسلامی اصطلاحات کی حیثیت سے استعمال ہو گئی ہیں' جس کے سبب بعض اوقات غلط مبحث سا ہو جاتا ہے۔ اگر قرآن و حدیث کی روشنی میں ان کے مفہوم متعین کرنے کی کوشش کی جائے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ ان اصطلاحات کے مفہوم الگ الگ ہیں۔ خلافت کی اصطلاح اسلامی اصولوں پر ایک قائم شدہ ریاست کے لئے استعمال ہوتی ہے اور امامت یا امارت سے مراد جو

گورنمنٹ ہوتی ہے جو خلافت کے لواروں کی تنفید کرتی ہے اور اس کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتی ہے۔ جو لفظوں میں اس کو یوں سمجھئے کہ "سٹیٹ" (State) اور گورنمنٹ (Government) کے درمیان ہے وہی فرق خلافت اور لامت کے درمیان ہے۔"

لامت کے بارے میں اہل شیع کا نظریہ : اہل سنت حضرت نے خلافت و لامت میں کوئی امتیاز نہیں کئے بلکہ دونوں الفاظ کو مترادف قرار دیا ہے۔ ان کے "نظریہ خلافت" کے باب میں کی جا چکی ہے' یہاں ہم اہل تشیع حضرت کے "نظریہ لامت" کے بارے میں اہم معلومات درج کرتے ہیں۔

شیعہ : لفظ (مذہب) شیعہ کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی علیہ السلام اور ان کی اولاد کو مذہبی رہنما تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک پہلے تین خلفائے راشدین یعنی حضرت ابوبکر صدیق' حضرت عمر فاروق' حضرت عثمان غنی کی خلافت باطل ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیات طیبہ ہی میں حضرت علی علیہ السلام کو اپنا خلیفہ مقرر فرمایا تھا' جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد لوگوں نے عمل نہ کیا' اور اپنے طور پر ایک علیحدہ دنیاوی بادشاہت قائم کرلی۔

تقرر امام سے متعلق : شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ امامت ایسے مصالح عامہ میں سے نہیں ہے کہ اس کا تعین و تقرر عام امت کے ہاتھ ہو اور امام امت کے مقرر کئے جانے سے مقرر ہو' بلکہ امامت دین کا رکن اور اساس اسلام ہے' اور نبی کو کسی طرح جائز نہیں کہ تعین امامت میں غفلت کرے اور اس کا اختیار امت کے ہاتھ میں دے' بلکہ نبی پر واجب ہے کہ عام امت کے لئے امام خود مقرر کرے۔

چنانچہ شیعہ حضرات کا کہنا ہے کہ آنحضرت نے تقرر امام کا فریضہ اپنی زندگی ہی میں کر دیا تھا۔ شیعہ حضرات حضرت علی علیہ السلام کی لامت سے متعلق بہت سی احادیث بطور ثبوت پیش کرتے ہیں۔

شیعہ مذہب کے فرقے : شیعہ مسلک کے کئی فرقے ہیں' مثلاً زیدیہ' کیسانیہ' واقفیہ' غالیہ' اسماعیلیہ' امامیہ یا اثنا عشریہ وغیرہ۔ ان فرقوں میں سے خود شیعہ ہی ایک دوسرے کے مخالف ہیں۔ ذیل میں اہم شیعہ فرقوں کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

زیدیہ : یہ فرقہ حضرت زید بن زین العابدین بن حضرت امام حسین علیہ السلام کی لامت کا [illegible] ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حضرت زید کے بعد خلافت اولاد فاطمہ کا حق ہے۔ خلفائے راشدین کے بارے [illegible] ان کا عقیدہ ہے کہ ان کی خلافت برحق تھی' کیونکہ ان کے ہاں افضل کی موجودگی میں [illegible] جائز ہے۔ یہ فرقہ تبراء سے اجتناب کرتا ہے۔

کیسانیہ : اس فرقہ کا کہنا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کے بعد [illegible] ان کے بھائی محمد بن الحنفیہ کو ملی' اور پھر ان کی اولاد کو منتقل ہوئی۔ یہ فرقہ کیسان

غلام محمد بن الحنفیہ کی طرف سے منسوب ہونے کی وجہ سے "کیسانیہ" کہلایا۔ آجکل یہ فرقہ معدوم ہے۔

غالیہ : یہ فرقہ آئمہ کی الوہیت کا قائل ہے۔ اس فرقہ کی دو شاخیں ہیں۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ آئمہ صفات الوہیت سے متصف ہیں اور دوسرے کا عقیدہ ہے کہ خدا تعالیٰ خود ان کی بشری ذات میں حلول کر گیا ہے۔ یہ فرقہ حضرت علی علیہ السلام کی زندگی ہی میں ظہور پزیر ہوا تھا' جب آپ کو معلوم ہوا کہ بعض لوگ میری الوہیت پر اعتقاد رکھتے ہیں تو آپ نے اکثر کو آگ میں جلوا دیا۔ حضرت محمد بن حنفیہ اور امام جعفر صادق نے ان کو لعنتی قرار دیا ہے۔

حلولیہ : اس فرقہ کا اعتقاد ہے کہ کسی امام کا کمال غیر امام کو نہیں ملتا۔ جب کسی امام کی وفات ہوتی ہے تو اس کی روح دوسرے امام میں منتقل ہو جاتی ہے' تاکہ اس کو بھی بعینہٖ وہی کا کمال حاصل ہو۔

واقفیہ : یہ فرقہ فقط ایک ہی امام کو مانتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے سوا امامت کسی دوسرے کو مل ہی نہیں سکتی۔ اس فرقہ کے بعض لوگوں کا عقیدہ ہے کہ وہ امام زندہ ہے' لیکن لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہے۔

اسماعیلیہ : ان کا عقیدہ ہے کہ امامت حضرت امام جعفر صادق کے بعد ان کے بیٹے اسماعیل کو ملی تھی۔ اس مذہب کا آغاز مصر سے ہوا۔ اس کے پیروؤں نے مصر میں فاطمی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔

اسماعیلیہ فرقہ کے دو گروہ ہیں ایک شرقی اور دوسرا غربی۔ شرقی کا مرکز برصغیر پاک و ہند ہے۔ ان کی کچھ تعداد ایران اور وسط ایشیا میں بھی ملتی ہے۔ یہ حاضر امام کے قائل ہیں۔ ان کے موجودہ امام پرنس کریم آغا خان اپنے فرقہ کے انچاسویں امام ہیں۔ ان کے پیرو اسماعیلی اور عرف عام میں "آغا خانی" کہلاتے ہیں۔ غربی اسماعیلی جنوبی طرف' خلیج فارس کے جزائر اور قرب و جوار شام وغیرہ پائے جاتے ہیں۔

اثنا عشریہ (امامیہ) : اس فرقہ کے پیروکار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بارہ اماموں کی امامت کے قائل ہیں۔ گیارہ امام وفات پا چکے ہیں جبکہ بارھویں امام حضرت مہدی قیامت کے نزدیک ظہور پزیر ہوں گے۔ یہ لوگ قرآن' حدیث اور اجماع کو فقہ کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ یہ فرقہ حضرت امام جعفر کی فقہ پر یقین رکھتے ہے' اس لئے اس فرقہ کو "جعفریہ" بھی کہا جاتا ہے۔ اماموں پر یقین رکھنے کے باعث یہ "امامیہ" کہلاتا ہے۔

فرقہ جعفریہ کے لوگ "احادیث" کے لئے "اخبار" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ وہ صرف انہی احادیث کو قبول کرتے ہیں جو کی روایت اہل بیت سے کی گئی ہے۔ ان کے نزدیک "اجماع" کا مفہوم کسی امام معصوم کے قول پر متحد ہو جاتا ہے۔ فقہ جعفریہ اور سنی فرقہ میں زمین و آسمان کا بعد ہے۔

خلافت علی : شیعہ حضرات حضرت علی علیہ السلام کی خلافت کے قائل ہیں۔ ذیل میں "تفسیر حسن عسکری" سے ایک اقتباس درج ہے' جس میں "خلافت علی" سے متعلق تذکرہ کیا گیا ہے۔ (یاد رہے کہ یہ تفسیر شیعوں کے گیارھویں امام حضرت حسن عسکری سے منسوب ہے) آپ فرماتے ہیں کہ:

"موسیٰ بن جعفر کا قول ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو غدیر کے دن مشہور تاریخی جگہ پر کھڑا کیا تو لوگوں کو مخاطب کر کے کہا:

"خدا کے بندو! بتاؤ میں کون ہوں؟"

لوگوں نے کہا:

"آپ محمد بن عبداللہ بن عبدالمطلب ہیں۔"

پھر فرمایا:

"کیا میں تم سے تمہاری جان سے قریب تر نہیں ہوں؟"

لوگوں نے عرض کی:

"بیشک یا رسول اللہ!"

پھر آپ نے آسمان کی طرف دیکھ کر کہا:

"اے اللہ! ان لوگوں کے قول پر گواہ رہ"

آپ نے یہ بات تین دفعہ دہرائی' پھر فرمایا:

"جس کا میں دوست ہوں اور قریبی ہوں' علی بھی اس کا دوست اور قریبی ہے' اے اللہ! جو اس سے دوستی رکھے' تو اس سے دوستی رکھ' جو اس کی مدد کرے' تو اس کی مدد کر' اور جو اس کو رسوا کرے' تو اس کو رسوا کر۔"

پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر کو مخاطب کر کے کہا: اٹھ کر حضرت علی کی بیعت کیجئے۔ چنانچہ آپ اٹھے اور حضرت علی کی بیعت کی۔ پھر آپ نے مہاجرین و انصار کے سرکردہ نو (9) اصحاب سے حضرت علی کی بیعت کرنے کو کہا' اور سب نے تعمیل ارشاد کر دی۔ حضرت عمر نے کھڑے ہو کر فرمایا: علی ابن طالب! آپ کو مبارک ہو' آپ میرے اور تمام اہل ایمان مردوں اور عورتوں کے شفیق اور مہربان ہیں۔ بیعت خلافت کا پختہ عہد کرنے کے بعد سب ادھر ادھر چلے گئے۔

صحابہ میں کچھ سرکش اور باغی قسم کے لوگ بھی تھے۔ انہوں نے عہد کیا کہ ہم حضرت علی سے یہ منصب چھین لیں گے۔ جب یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے تو کہتے کہ آپ نے سب سے بہتر خلیفہ مقرر کیا ہے اور ہمیں ظالموں سے بچا لیا' حالانکہ وہ دل سے آپ کے خلاف بغض و عداوت رکھتے تھے۔"

تقیہ : شیعہ مسلک میں "تقیہ" کو نہایت اہمیت حاصل ہے اور تقیہ کو دین کا ایک ضروری جزو قرار دیا گیا ہے۔ تفسیر حسن عسکری میں مذکور ہے کہ حضرت حسن بن علی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: انبیاء کو سب لوگوں کے مقابلہ میں اس لئے فضیلت دی گئی ہے [illegible] ساتھیوں کی خیرخواہی کی وجہ سے دین کے دشمنوں [illegible] سے تقیہ کی بنا پر سلوک کرتے

ہیں۔

حضرت حسن عسکری سورۃ بقرہ کی آیت:

انما حرم علیکم المیتہ والدم ولحم الخنزیر

(اللہ نے تم پر مردار' خون اور خنزیر کا گوشت حرام قرار دیا ہے)

کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ:

"امام باقر نے اپنے ایک شیعہ بھائی کو دیکھا کہ وہ ایک منافق کی اقتداء میں نماز ادا کرنے جا رہا ہے۔ شیعہ کو پتہ چل گیا کہ امام باقر نے دیکھ لیا ہے۔ نماز سے فارغ ہو کہنے لگا: اے رسول خدا کے بیٹے! میں اس منافق کے پیچھے نماز پڑھنے کے لئے معذرت خواہ ہوں' میں نے تقیہ سے کام لیا ہے' اگر تقیہ پر عمل نہ کرتا تو اکیلا نماز ادا کرتا۔ امام باقر نے کہا: میرے بھائی! معذرت کی کوئی ضرورت نہیں' ساتوں آسمانوں اور ساتوں زمینوں کے فرشتے تجھ پر سلام و رحمت اور تیرے امام "نماز کے امام" پر لعنت بھیجتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ تمہاری اس تقیہ والی نماز کو سات سو نمازوں کے برابر ٹھہرایا جائے۔"

تقیہ کے بارے میں طبری بتاتا ہے کہ:

"اگر کفار غالب اور مومن مغلوب ہوں' اور ایک مومن اس بات سے خائف ہو کہ اگر کفار کی موافقت نہیں کروں گا تو مجھے جان سے مار ڈالا جائے گا' تو اندریں صورت تقیہ کے طور پر وہ زبان کے ساتھ اس کی مخالفت کر سکتا ہے' مگر دل سے اسی بات کا اعتقاد نہیں رکھ سکتا۔"

شیعہ حضرات کا خیال ہے کہ ضرورت کے وقت تقیہ تمام حالات سے جائز ہے' بعض اوقات میں تقیہ واجب بھی ہو جاتا ہے۔

سیاست اور امامت : شیعوں میں امامت کا تصور مذہبی ہے' سیاسی نہیں۔ اسلام میں ابتدا ہی سے سنی حکومتیں قائم رہی ہیں۔ اور شیعہ حضرات انہی حکومتوں کے زیر سایہ زندگی بسر کرتے رہے۔ جب وہ کسی غیر شیعہ حکومت کی اطاعت کرتے ہیں' تو ان کے نزدیک یہ "تقیہ" کا عمل ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں صرف ایران میں شیعہ حکومت قائم ہے جس کا سربراہ "امام" کہلاتا ہے۔

خلاصہ :

(1) عام طور پر خلافت اور امامت کو ایک ہی سمجھا جاتا ہے۔

(2) سیاسی مفکرین نے "خلیفہ" اور "امام" کو مترادف قرار دیا ہے۔

(3) شیعہ حضرات خلفائے ثلاثہ کی خلافت کو باطل قرار دیتے ہیں۔

(4) شیعہ حضرات کے نزدیک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد "امامت" کا منصب قائم ہوا۔ حضرت علی علیہ السلام پہلے امام ہیں۔ امامت خاندان نبوت "اہل بیت" سے باہر نہیں جا سکتی۔

(5) امام صرف خاندان نبوت یعنی خاندان سادات ہی سے ہو سکتا ہے۔ امام معصوم ہوتا ہے' گیارھویں امام اپنے مناصب پر فائز رہ کر وفات پا چکے ہیں' بارھویں امام کا ظہور قیامت کے نزدیک ہو گا' ان کی غیبت میں قائم مقام امام فرائض انجام دے سکتا ہے۔

(6) غیر شیعہ حکومت میں "تقیہ" پر عمل کر کے بظاہر حکومت کی اطاعت کی جا سکتی ہے۔

(7) شیعوں کا تصور امامت اگرچہ سیاسی ہے لیکن عملی طور پر اس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں' کیونکہ عملی طور پر شیعوں کی حکومت قائم نہیں۔

شوریٰ

سوال : شوریٰ کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالئے!

جواب : شوریٰ :

"شوریٰ" لفظ "اشار" سے ماخوذ ہے۔ "اشار علیہ" سے مراد ہے : حکم کرنا' نصیحت کرنا' ٹھیک راہ بتانا۔ "شاورہ فی الامر" کا مطلب ہے کسی سے کسی امر میں مشورہ طلب کرنا۔ "تشاور و اشتور" کا مفہوم ہے : ایک دوسرے سے مشورہ کرنا اور "استشارہ الامر" سے مراد ہے : کسی سے مشورہ طلب کرنا۔ چنانچہ "شوریٰ" سے مراد ہے : مشورہ' مشاورت۔

مشورہ طلب کرنے یا باہمی مشاورت کو اصطلاحاً "شورائیت" کہتے ہیں اور لوگوں کے جس منتخب گروہ سے دینی و سیاسی معاملات میں مشورہ طلب کیا جائے' اسے "مجلس شوریٰ" کا نام دیا جاتا ہے۔

شوریٰ کا جواز اور اہمیت : قرآن مجید میں مسلمانوں کی ایک صفت یہ بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ اپنے اور دینی کاموں کو انجام دینے کے سلسلہ میں آپس میں مشورہ کر لیتے ہیں۔ چنانچہ "سورۃ الشوریٰ" میں مومنین کی صفت بیان کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

(1) **و امرھم شوری بینھم**
(اور ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے)

(2) **وشاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین**
(ان سے معاملات میں مشورہ کر اور جب تمہارا عزم قائم ہو جائے تو پھر صرف اللہ پر بھروسا کرو' بیشک اللہ تعالیٰ توکل کرنے والوں کو پسند کرتا ہے)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے :

(1) جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

(2) **من اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ**

(ابوداؤد)

(جس نے اپنے بھائی کو کسی ایسی بات کا مشورہ دیا جس کے متعلق وہ خود جانتا ہو کہ صحیح بات دوسری ہے' تو اس نے دراصل خیانت کی)

حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب مشورہ کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"اگرچہ اللہ اور اس کا رسول مشورے سے بے نیاز ہے' مگر مشورے کا یہ حکم اس لئے ہے تاکہ امت کے لئے رحمت ہو' اس کے بعد امت کا جو فرد رائے اور مشورہ طلب کرے گا کبھی اعلیٰ درجے کی رہنمائی سے محروم نہیں رہے گا' اور جو مشورہ کو ترک کرے گا وہ کبھی غلط راہ سے نہ نکلے گا۔"

چنانچہ رسول اللہ عملی طور پر صحابہ کرام سے مشورہ لیتے رہے۔ مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ احد اور جنگ خندق میں صحابہ کرام کے مشورہ کو قبول فرمایا۔ آپ دنیوی کاموں میں بھی صحابہ سے مشورہ لے لیا کرتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ مشورہ کرنے والا کوئی شخص نہیں دیکھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام بھی شوریٰ پر عمل کرتے رہے۔ خلفائے راشدین اکابر صحابہ کے مشورہ ہی سے منتخب ہوئے۔ وہ اپنے عہد میں سیاسی معاملات میں اکابرین سے مشورہ لیتے رہے۔

شوریٰ' عہد فاروقی میں : حضرت عمرفاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لا خلافۃ الا عن مشورۃ

(خلافت مشورہ کے بغیر جائز نہیں)

آپ نے امور ریاست میں مشورہ کے لئے اکابر صحابہ پر مشتمل "مجلس شوریٰ" تشکیل دی۔ اس مجلس میں بنواوس' بنوخزاج' اور مہاجرین کو نمایندگی دی گئی۔ آپ کے زمانہ میں حضرت علی' حضرت عثمان' حضرت عبدالرحمان بن عوف' معاذ بن جبل' ابی بن کعب' اور زید بن حارث جیسے صاحب الرائے صحابہ مجلس مشاورت میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ مہاجرین انصار کے قبائل کے شیوخ بھی شریک ہوتے تھے۔ ہر شخص کو کامل آزادی سے تنقید اور رائے دہی کا حق حاصل تھا۔

شوریٰ کی دوسری شکل مشاورت عامہ تھی۔ اہم ترین مسائل پر فیصلہ کے لئے تمام انصار و مہاجرین کو مسجد نبوی میں جمع کیا جاتا اور دو رکعت نماز کے بعد موضوع زیر بحث پر تبادلہ خیال ہوتا۔ جب کبھی نازک صورت حال پیدا ہوتی تو مشاورت عامہ کا انعقاد کیا جاتا۔ شام و عراق کے بارے میں صحابہ نے مطالبہ کیا کہ ان علاقوں کے باشندے غلام بنا لئے جائیں اور زمینیں مجاہدوں میں تقسیم کر دی جائیں' تو حضرت عمرفاروق نے اس پر اعتراض کیا' آخرکار مشاورت عامہ میں اس موضوع پر طویل بحث ہوئی اور اور حضرت عمر کی رائے کے مطابق متفقہ فیصلہ کیا گیا۔

شوریٰ کے مضمرات : اسلام میں ایک دوسرے سے مشورہ کرنے کا حکم اس لئے دیا گیا ہے کہ ہو سکتا ہے دوسرے کی رائے مشورہ لینے والے کی رائے سے بہتر ہو۔ ایک شخص اپنے کام کو مشکل سمجھتا ہے' ہو سکتا ہے اگر وہ کسی ماہر شخص سے مشورہ طلب کرے تو اس کا کوئی آسان حل

نکل آئے۔

شوریٰ کا مقصد : باہمی امور اور سیاست میں مشورت کا مقصد یہ ہے کہ جس معاملہ کا تعلق دو یا دو سے زیادہ آدمیوں سے ہو' اس میں کسی ایک شخص اپنی من مانی سے فیصلہ کر ڈالنا زیادتی ہے۔ مشترک معاملات میں کسی کو اپنی من مانی کرنے کا حق حاصل نہیں۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ایک معاملہ جتنے لوگوں سے متعلق ہو' ان سب کی رائے لی جائے۔ اس مشورت کا مقصد انصاف کو برقرار رکھنا اور کسی فریق کو نقصان سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگر پوری قوم سے متعلق معاملات درپیش ہوں تو ان کو چلانے کے لئے قوم کا سربراہ سب کی مرضی سے مقرر کیا جانا ضروری ہے۔ اور پھر سربراہ کا فرض ہے کہ وہ ان قومی معاملات کو ایسے صاحب الرائے لوگوں کے مشورہ سے چلائے جن کو قوم کا اعتماد حاصل ہو۔

شوریٰ کے فوائد : شوریٰ سے مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

(1) شوریٰ سے رائے عامہ کا اظہار ہوتا ہے۔
(2) شوریٰ کے فیصلہ سے رائے عامہ مطمئن ہو جاتی ہے۔
(3) مجلس شوریٰ کے مشورہ سے امت کے لئے واجب التعمیل قانون بن جاتا ہے۔
(4) کسی کی حق تلفی نہیں ہوتی۔
(5) شوریٰ کے ذریعے درست نتائج حاصل کرنے میں مدد ملتی ہے۔
(6) شوریٰ کے ذریعہ مشکل مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔
(7) مجلس شوریٰ کے اراکین چونکہ مختلف طبقات کے نمائندے ہوتے ہیں' اس لئے ہر طبقہ کے مسائل حکومت کے سامنے آ جاتے ہیں اور حکومت کو احساس ہو جاتا ہے کہ فلاں طبقہ کے فلاں فلاں مسائل واقعی حل طلب ہیں۔ اس طرح حکومت ان پر غور کر سکتی ہے۔
(8) مجلس شوریٰ کے ذریعہ جدید دور میں پیدا ہونے والے فروعی مسائل سے متعلق قواعد و ضوابط مرتب کئے جا سکتے ہیں۔
(9) مجلس شوریٰ حکومت کو بے رہروی اور غلط اقدامات سے روک سکتی ہے۔ حکومت کی غیرشرعی اور غلط پالیسیوں پر تنقید کر کے اس کا صحیح اور درست رخ متعین کر سکتی ہے۔

شوریٰ کی حیثیت : شوریٰ مسلمانوں کے معاملات کو چلانے میں مطلق العنان اور مختار کل نہیں ہے۔ وہ صرف انہی معاملات میں مشورہ کر سکتی ہے' جن کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی واضح حکم موجود نہ ہو۔ وہ دین کی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اگر کسی دینی معاملہ میں مجلس شوریٰ کے تمام اراکین بھی قرآن و سنت سے متضاد رائے پیش کریں' تو اس کی قطعی کوئی اہمیت نہ ہو گی۔

مجلس شوریٰ کی تشکیل : مولانا ابوالاعلیٰ مودودی اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں "اصول مشاورت" کے زیر عنوان رقم طراز ہیں کہ :

"شوریٰ کی کوئی خاص شکل معین نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے

احکام ساری دنیا کے لئے ہیں اور ہمیشہ کے لئے ہیں۔ اگر شوریٰ کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوریٰ براہ راست تمام لوگوں سے ہو' یا لوگوں کے نمائندوں سے' نمائندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں' یا خواص کے ووٹوں سے' انتخاب کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لے لئے جائیں جن کی نمائندہ حیثیت معلوم و معروف ہو' مجلس شوریٰ ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی' یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سوسائٹی اور ہر تمدن کے لئے یکساں موزوں نہیں ہو سکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں حالات کے لئے ہو سکتی ہیں' اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ اس لئے شریعت نے ان امور کو کھلا چھوڑ دیا ہے۔ نہ کسی خاص شکل کا تعین کیا ہے اور نہ کسی خاص شکل کو ممنوع قرار دیا ہے۔"

مجلس شوریٰ کے ارکان کے اوصاف : مجلس شوریٰ کے ہر رکن کے لئے ضروری ہے کہ:

(1) وہ توحید' رسالت' ختم نبوت' قرآن و سنت کے قطعی احکام پر غیرمتزلزل اعتقاد رکھتا ہے۔
(2) کتاب و سنت کا علم رکھتا ہو' فقیہہ و مجتہد بھی ہو تو زیادہ بہتر ہے۔
(3) عادل' دیانتدار اور متقی ہو۔
(4) نماز' روزہ اور دیگر احکام شرعیہ کا پابند ہو۔
(5) عاقل و بالغ ہو۔
(6) عرف عام (رسم و رواج) سے واقف ہو۔
(7) مسلمانوں کی اکثریت کا معتمد ہو۔
(8) معاملہ فہم اور اور دانشمند ہو۔
(9) صائب الرائے ہو۔
(10) انتظامی امور میں تجربہ رکھتا ہو۔

مستشیر (مشورہ لینے والے) کے لئے شرائط : وہ شخص جو کسی معاملہ پر مشورہ لینا چاہتا ہو اس کو چاہئے کہ وہ مندرجہ ذیل شرائط کو مدنظر رکھے۔

(1) جس قسم کے معاملہ میں مشورہ درکار ہو' اسی قسم کے معاملہ میں ماہر شخص سے رائے لی جائے۔
(2) مشورہ لینے والے کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ اسے مشورہ لینا ہے' نہ کہ مشورہ دینے والے کا امتحان مقصود ہو۔
(3) اگر مشورہ دینے والے کا مشورہ مستشیر کی مرضی کے خلاف ہو تو پر ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہئے۔
(4) جس معاملہ میں مشورہ لیا جائے اس کی تفصیل بیان کر دینی چاہئے۔
(5) اگر مشورہ غلط یا نقصان دہ ہو تو مشورہ دینے والے پر طعن نہ کیا جائے۔

(6) جب باہمی مشاورت سے ایک مسئلہ کے تمام پہلو طے ہو جائیں تو مستشیر طے شدہ حل پر عمل کرنے میں دیر نہ کرے۔

مشیر (مشورہ دینے والے) کے فرائض : مشیر کا فرض ہے کہ:

(1) جس معاملہ میں اس سے مشورہ طلب کیا گیا ہو' اگر وہ اس معاملہ میں علم' مہارت اور تجربہ رکھتا ہو تو وہ اپنے علم اور ایمانداری کے مطابق صحیح مشورہ دے۔

(2) اگر وہ مشورہ دینے کی اہلیت نہ رکھتا ہو تو اسے چاہئے کہ معذرت کر لے۔

(3) وہ اپنے آپ کو مشورہ لینے والے سے افضل و برتر تصور نہ کرے۔

(4) وہ مشورہ دینے سے قبل معاملہ کے ہر پہلو پر غور و خوض کرے اور مشورہ دینے میں جلدی نہ کرے۔

(5) جب ایک جماعت مشورہ لینے کے لئے جمع ہو تو اپنی رائے کے اظہار میں پیش قدمی نہ کرے' بلکہ پہلے اپنے سے زیادہ تجربہ کار لوگوں کو بولنے کا موقع دے۔

(6) کسی ہٹ دھرم اور ضدی شخص کو مشورہ نہ دے۔

(7) مشورہ آزادانہ' بے لاگ اور مخلصانہ ہونا چاہئے۔ دباؤ یا لالچ کے تحت مشورہ دینا بد دیانتی ہے۔

شوریٰ کی مختلف صورتیں : اسلام میں ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں مشاورت کی ترغیب دیتا ہے۔ گھر کے معاملات میں میاں بیوی باہم مشورہ کر سکتے ہیں' بچے جب جوان ہو جائیں تو انھیں بھی شریک کر لینا چاہئے۔ اسی طرح بچوں کو والدین سے مشورہ لینا چاہئے۔ خاندان کے معاملات میں خاندان کے سب عاقل و بالغ افراد کی رائے لی جا سکتی ہے۔ ایک قبیلے یا برادری پالیسی کے معاملات ہوں اور سب لوگوں کا شریک مشورہ ہونا ناممکن نہ ہو تو ان کا فیصلہ کوئی ایسی پنچایت یا مجلس کرے جس میں کسی متفق علیہ طریقہ کے مطابق تمام متعلقہ لوگوں کے معتمد نمائندے شامل ہوں۔ ایک پوری قوم کے معاملات ہوں تو قوم کا سربراہ سب کے مشورہ سے مقرر کیا جائے' اور وہ قومی معاملات کو ایسے صاحب رائے لوگوں کے مشورہ سے چلائے جن کو قوم قابل اعتماد سمجھتی ہو۔

ذیل میں شوریٰ کی قانونی صورتیں بیان کی جا رہی ہیں:

(1) مشورہ فرد : بعض فنی امور میں کسی ایک ماہر فن سے مشورہ لیا جا سکتا ہے' مثلاً معاملات حرب' سائنسی علوم' صنعت و حرفت وغیرہ سے متعلقہ معاملات میں کسی ایک ماہر فن کی رائے بھی کافی ہے۔

جیسا کہ غزوہ بدر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک فرد کی رائے کو قبول فرما لیا تھا۔ اس جنگ میں آنحضرت کا خیمہ ایک مخصوص جگہ پر نصب کر دیا گیا ہے تھا' لیکن حضرت خباب بن منذر نے مشورہ دیا کہ یہ خیمہ یہاں نہیں بلکہ فلاں جگہ پر نصب ہونا چاہئے' چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیمہ کو حضرت خباب کی بتائی ہوئی جگہ پر نصب کرنے کا حکم دیدیا۔

(2) مشورہ اہل حل و عقد : اہل حل و عقد کی متفقہ رائے اگر قرآن و سنت سے

متصادم نہ ہو' تو قبول کی جا سکتی ہے۔ وہ لوگ جو کسی خاص فن یا علم میں ماہر ہوں ان کی متفقہ رائے' قانون کے سلسلہ میں فقہا کی متفقہ رائے' جنگ کے سلسلہ میں فوجی ماہرین کی رائے۔

(3) عمومی اجلاس : کسی محلہ میں ہونے والے کسی عمومی اجلاس میں کیے گئے فیصلوں کو بھی شوریٰ کے فیصلے تسلیم کیا جا سکتا ہے' اور ان پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت خود بھی کسی محلہ کو طے کرنے کے لئے عمومی اجلاس منعقد کر سکتی ہے اور ان میں عوام سے مشورہ طلب کر سکتی ہے۔

(4) باضابطہ رسمی اجلاس : کسی اہم اور فوری مسئلہ پر مشورت کے لئے باضابطہ طور پر اجلاس بلایا جا سکتا ہے۔ جیسے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر' غزوہ خندق سے قبل صحابہ کو جمع کر کے جنگ سے متعلق مشورہ طلب فرمایا تھا۔

(5) عوامی مشاورت : کسی اہم مسئلہ پر پوری قوم سے رائے طلب کی جا سکتی ہے۔ اس طرح جو مشورہ قرآن و سنت سے متصادم نہ ہو' اور قوم و ملک کے حق میں بہتر ہو' اس پر عمل کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثریت کے مشورہ کو نہیں بلکہ مفاد عامہ کو عزیز رکھا جائے گا۔

(6) نمائندہ اسمبلی : عوام کے منتخب نمائندے بھی ایک قسم کی مجلس شوریٰ کے اراکین ہوتے ہیں' بشرطیکہ ان کا انتخاب صحیح طریقے سے عمل میں لایا گیا ہو۔ تاہم اسلام میں موجودہ قسم کی اسمبلی کے بجائے اسلامی طرز کی "مجلس شوریٰ" کو اہمیت دی گئی ہے۔

ایوان شوریٰ : مجلس شوریٰ کے لئے ایک ایوان کا ہونا ضروری ہے۔ مکہ میں مسلمانوں کے اجتماع کے لئے "دارالارقم" کے نام سے ایک ایوان قائم تھا جسے "ایوان تحریم برادری" کا نام بھی دیا جا سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل میں کھلے میدانوں سے بھی ایوان کا کام لیا جاتا ہے اور مسجد نبوی سے بھی۔ مسجد نبوی میں اہم مسائل پر مشاورت کے لئے مجلس شوریٰ کے اجتماعات منعقد ہوتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سقیفہ بنی ساعدہ سے ایوان شوریٰ کا کام لیا گیا ہے۔ حضرت عمر فاروق کے انتخاب کے نئے حضرت ابوبکر صدیق کی قیام گاہ ایوان شوریٰ قرار پائی۔ حضرت عثمان غنی کے متعلق "دارالمسور" کو ایوان شوریٰ کی حیثیت سے استعمال کیا گیا ہے۔ حضرت علی کے انتخاب کے لئے مسجد نبوی ایوان شوریٰ کے طور پر استعمال کی گئی۔

شوریٰ کے اجزائے ترکیبی :

(1) امام : امام یا خلیفہ شورویٰ حکومت کا منتخب رہنما اور قائد اعلیٰ ہوتا ہے۔

(2) امت : خدائے واحد کو ماننے والوں کا گروہ جو شریعت محمدیہ پر گامزن ہوتا ہے۔

(3) رائے دہندگان : مجلس شوریٰ کو منتخب کرنے والوں کی ایک اہلیت مقرر ہے۔ ہر کس و ناکس رائے دہندہ نہیں ہو سکتا۔ رائے دہندہ کا معیار یہ ہے کہ وہ مسلمان ہو' احکام الٰہی پر پوری طرح کاربند ہو' عاقل و بالغ ہو' متقی' پرہیزگار اور نیک ہو۔ امیدوار کی اہلیت و صلاحیت کا اندازہ

کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

(4) **مجلس حل و عقد** : حکومت کے مدبر مشیر اور معتمد جو اپنے اعلیٰ کردار اور بہترین خدمات کی وجہ سے پوری امت کے اعتماد کا مرکز ہوتے ہیں۔

(5) **ارکان شوریٰ** : مجلس شوریٰ کے منتخب اراکین' جن میں مجتہدین بھی شامل ہیں۔

مجلس شوریٰ کے فرائض : مجلس شوریٰ مندرجہ ذیل فرائض سرانجام دے سکتی ہے۔

1- خلیفہ کا انتخاب
2- سیاسی امور میں مشورت
3- فروعی قوانین اور اصول و ضوابط کی تدوین
4- حکومت کے غلط کاموں پر تنقید اور ریاست کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لئے مشورہ
5- امر بالمعروف و نہی عن المنکر
6- اندرونی و خارجی امور میں مشورت

بنیادی حقوق (Fundamental Rights)

سوال : بنیادی حقوق سے کیا مراد ہے۔ بنیادی حقوق کی مختصر دستور کا تاریخ بیان کیجئے اور قرآن و سنت کے حوالہ سے بیان کیجئے کہ اسلامی ریاست میں شہریوں کو کون کون سے بنیادی حقوق حاصل ہیں؟

جواب : بنیادی حقوق :

• قانونی حدود کے اندر رہ کر معاشرہ میں ایک فرد دوسرے سے جو وصول کرتا ہے' کسی چیز کا قبضہ حاصل کرتا ہے یا کچھ کرتا ہے۔ وہ اس کا "حق" ہے۔ قانونی طرز پر "حق" وہ مفاد ہے جو دستور یا عام قانون کے تحت کسی شخص کو حاصل ہو۔ دستوری حق کو صرف دستور میں ترمیم کر کے واپس لیا جا سکتا ہے۔ جبکہ دوسری قسم کے حق میں بذریعہ قانون ترمیم و اضافہ یا تنسیخ کی جا سکتی ہے۔

فطری حقوق کا تعلق براہ راست انسانوں سے ہوتا ہے اور انسان ان حقوق سے بلا کسی ایزادی فعل مستفید ہوتا ہے۔ یہ حقوق قانون کے تحت پیدا کردہ حقوق سے قطعی مختلف ہوتے ہیں اور یہ انسان کی ذات سے نمو پاتے ہیں۔

بنیادی حقوق وہ ہوتے ہیں جو ایک آزاد معاشرے میں بلا تخصیص مذہب و ملت' رنگ و نسل و جنس ہر مرد و زن' بوڑھے' جوان اور بچے کو حاصل ہوتے ہیں۔ ان حقوق کی اساس اس

فلسفیانہ نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں ایک ماورائی قانون کا وجود ہے' جو مقننہ کی خواہش پر ختم نہیں کیا جا سکتا۔

بنیادی حقوق کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ مقننہ' انتظامیہ' عدلیہ اور دیگر حکومتی و ریاستی اداروں کو ان حقوق میں مداخلت کرنے پر صریحاً" یا معنوی طور پر پابندیاں عائد کرتے ہیں۔ کسی ایسے حق کو بنیادی حق نہیں قرار دیا جا سکتا' جسے مقننہ دستور میں ترمیم کئے بغیر سلب کر سکے یا ہنگامی حالات میں ان کا سلب کیا جانا ضروری ہو' تاہم ان حقوق پر بعض حدود و قیود نافذ کی جا سکتی ہیں۔

بنیادی حقوق کا نفاذ عموماً" سرکاری اہلکاران کے خلاف ہوتا ہے۔ اگر کوئی عام شہری ان حقوق کو پامال کرے تو متاثرہ فرد کو عام قانون کے تحت داد رسی مہیا کی جاتی ہے۔

"بنیادی حقوق" کی مختصر دستوری تاریخ : سب سے پہلے انگلستان میں کنگ جان نے 1215ء میں "میگنا کارٹا" جاری کیا گیا۔ اس کو بنیادی حقوق کی طرف پیش رفت کہا جا سکتا ہے۔ اس کی حیثیت بادشاہ اور امراء کے درمیان ایک قرارداد کی سی تھی اور وہ زیادہ تر امراء ہی کے مفاد کے لئے مرتب کیا گیا تھا۔

ٹام پین (Tom Paine) نے 1791ء میں ایک پمفلٹ "حقوق انسانی" کے نام سے شائع کیا۔ جس میں انسان کے بنیادی حقوق کی بات کی گئی تھی۔ 1789ء میں انقلاب روس کے دوران "منشور حقوق انسانی" شائع ہوا' جس میں قوم کی حاکمیت' آزادی' مساوات اور ملکیت کے فطری حقوق کی بات کی گئی تھی۔ علاوہ ازیں اس میں ووٹ کے حق' قانون سازی اور ٹیکس عائد کرنے کے اختیارات پر رائع عام کے کنٹرول' تحقیق جرم روبروئے مجلس قضا کا اثبات کیا گیا تھا پھر دستور امریکہ کی دس ترامیم میں انسانی حقوق کا ذکر کیا گیا۔ 1948ء میں امریکی ریاستوں نے بگوٹا کانفرنس میں انسانی حقوق و فرائض کا ایک منشور مرتب کیا۔ دسمبر 1946ء میں اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے ایک ریزولیشن پاس کیا جس میں انسانوں کی نسل کشی کو بین الاقوامی قانون کے خلاف ایک جرم قرار دیا گیا۔ پھر دسمبر 1948ء میں نسل کشی کے انسداد اور سزا دہی کے لئے ایک قرارداد پاس ہوئی اور 1951ء میں نافذ العمل ہوئی۔ 10 دسمبر 1948ء کو جو "عالمی منشور حقوق انسانی" پاس کیا گیا' اس کے دیباچہ میں بنیادی انسانی حقوق کی بات کی گئی تھی۔

یہ تو تھا غیر مسلم اور مغربی اقوام میں حقوق انسانی کا کارنامہ۔ لیکن دوسری طرف اسلام میں بنیادی حقوق کا مطالعہ کیا جائے تو ثابت ہو گا کہ تمام غیر مسلم اقوام سے بہت پہلے یعنی چھٹی عیسوی میں اسلام نے انسان کو بنیادی حقوق دے دیئے تھے۔ یہ حقوق انسان کو اللہ تعالیٰ نے قرآنی منشور کے ذریعے عطا کئے ہیں۔

اسلام میں بنیادی حقوق : اسلام نے انسان کو زندہ رہنے اور آزادی سے زندگی بسر کرنے کے لئے وہ تمام حقوق دیئے ہیں' جو اس کو اپنی فطرت سے قریب تر رہنے کے لئے ضروری ہیں۔ ذیل میں اسلام کے مطابق بنیادی حقوق کا تذکرہ کیا جا رہا ہے۔

(1) **حرمت جان (جینے) کا حق :** اللہ تعالیٰ نے جس انسان کو پیدا کیا ہے' اسے جینا کا

حق بھی دیا ہے' اس لئے کوئی بادشاہ' حکمران' حاکم یا کوئی عام شخص کسی انسان کی زندگی چھیننے کا حق نہیں رکھتا۔

سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا۔

ترجمہ۔ "جس نے کسی متنفس کو' بغیر اس کے کہ اس نے قتل نفس کا ارتکاب کیا ہو' یا زمین میں فساد انگیزی کی ہو' قتل کر دیا' گویا اس نے تمام انسانوں کو قتل کیا' اور جس نے اسے زندہ رکھا تو اس نے گویا تمام انسانوں کو زندہ رکھا۔"

مندرجہ بالا آیت کے مطابق انسان کو صرف دو صورتوں میں قتل کیا جا سکتا ہے:

(i) وہ شخص جو قتل کا مرتکب ہو۔ اس نے چونکہ کسی انسان کی جان لی ہے' اس لئے اس کے بدلے میں اس کی جان لی جائے گی۔ لیکن کوئی شخص ازخود کسی قاتل کو قتل نہیں کر سکتا۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ملزم پر مقدمہ چلا کر' جرم ثابت ہونے پر اسے سزا دے۔

(ii) وہ شخص جو زمین پر فساد پھیلائے۔ یعنی تخریب کار' دہشت گرد یا باغی۔ ایسے شخص کو بھی جرم ثابت ہوئے بغیر قتل نہیں کیا جا سکتا۔ اسے سزا دینا بھی حکومت کی ذمہ داری ہے' ایک عام شخص اس کی جان نہیں لے سکتا۔

اسلام نے نہ صرف کسی انسان کی جان لینے کو جرم اور گناہ قرار دیا ہے' بلکہ اس کی سزا بھی مقرر کی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطبہ حجۃ الوداع میں فرمایا۔

"یقیناً تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی محترم ہیں' جیسے آج (حج) کا یہ دن محترم ہے۔"

یہ حرمت کس حال میں ٹوٹ سکتی ہے' اس کا تعین آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم ان الفاظ میں فرماتے ہیں۔

"پھر جب لوگ یہ کام (یعنی توحید و رسالت' اقامت الصلوۃ اور ایتائے زکوۃ) کرنے لگیں' تو وہ اپنی جانیں مجھ سے بچا لیں گے' الا یہ کہ اسلام کے کسی حق کی بناء پر وہ مجرم ہوں اور ان کی نیتوں کا حساب لینا اللہ کے ذمے ہے۔" (بخاری و مسلم)

ایک اور جگہ فرمایا:

"پس ان کے جان و مال ہم پر حرام ہیں' الا یہ کہ جان و مال ہی کا کوئی حق ان پر قائم ہو اور ان کے باطن کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔" (بخاری و مسلم)

قرآن و سنت کے احکام انسان کو حرمت جان کا حق دیتے ہیں اور فرمان جاری کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں کسی شہری کی آزادی نفس اور حرمت جان پر کوئی دست درازی نہیں کی جا سکتی' جب تک کہ اسلامی قانون کی رو سے اس پر یا اس کے خلاف کوئی حق ثابت نہ کر دیا جائے۔

(2) معذوروں اور کمزوروں کا تحفظ : قرآن و سنت کے مطابق بچے' بوڑھے' زخمی'

بیمار' معذور اور عورت پر دست اندازی جائز نہیں ہے۔ خواہ وہ اپنی قوم سے تعلق رکھتے ہوں یا دشمن قوم سے' الا یہ کہ جنگ کی صورت میں یہ افراد خود بر سرپیکار ہوں۔
آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین جب دشمنان دین سے جہاد (قتال) کرنے کے لئے اسلامی لشکر روانہ کرتے تو انہیں یہ ہدایات دیتے کہ دشمن پر حملہ کی صورت میں عورتوں' بچوں' بوڑھوں' زخمیوں اور بیماروں کو کوئی نقصان نہ پہنچایا جائے۔

(3) تحفظ ناموس خواتین : اسلام خواتین کو عزت و احترام کی نظر سے دیکھتا ہے اور صنف نازک ہونے کی وجہ سے اس پر معاشی بوجھ نہیں ڈالتا۔ اسے یہ حکم نہیں دیتا کہ خاندان کی کفالت کے لئے کمائی کرے۔ اسلام اسے چادر اور چار دیواری کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اس کی عزت و ناموس کا تحفظ اسلامی ریاست پر فرض ہے۔ اسلام صرف مسلمان عورتوں ہی کو یہ تحفظ نہیں دیتا بلکہ غیر مسلم عورتوں کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسلام حالت جنگ میں بھی غیر مسلم اور دشمنوں کی عورتوں پر ہاتھ ڈالنے سے منع کرتا ہے۔ اسلام میں بدکاری کو حرام قرار دیا گیا ہے خواہ یہ بدکاری کسی غیر مسلم عورت ہی سے کیوں نہ کی جائے۔
اسلام نے عورت کو مردوں پر بھی کچھ حقوق عطا کئے ہیں۔ سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وللرجال علیھن درجۃ۔

ترجمہ۔ اور عورتوں کا حق دستور کے مطابق مردوں پر ویسا ہی ہے جیسا مردوں کا عورتوں پر' اور مردوں کو ان پر ایک فضیلت حاصل ہے۔

(4) معاشی تحفظ : اسلامی نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ پوری کائنات کا خالق و مالک ہے اور وہی اپنی مخلوق کو روزی دینے والا ہے۔ سورۃ ہود میں فرمایا گیا ہے:

وما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقھا

ترجمہ۔ اور زمین پر کوئی چلنے پھرنے والا نہیں مگر اس کا رزق خدا کے ذمہ ہے

اللہ تعالیٰ نے روزی کے اسباب و وسائل فراہم کر دیئے ہیں اور بنی نوع انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنی زیست کا سامان فراہم کرے۔
چنانچہ اسلام کے نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ نے انسان کی روزی کے وسائل فراہم کر دیئے ہیں' جن پر تمام انسانوں کو مساوی حق حاصل ہے۔ ہر انسان اپنی صلاحیت' خواہش اور ضرورت کے مطابق کوئی جائز پیشہ اختیار کر کے ان وسائل سے استفادہ کر سکتا ہے چنانچہ اللہ کے منشاء کو پورا کرنے کے لئے اسلامی حکومت پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اس امر کا انتظام کرے کہ کوئی شخص بھی حق معیشت سے محروم نہ رہے۔ اسلامی حکومت کے ساتھ ساتھ اہل ثروت پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ اپنے اموال سے غرباء' محتاجوں' بیواؤں' یتیموں اور معذوروں کی معاشی ضروریات کو بدرجہ کفایت پورا کریں' بلکہ معاشرہ کا کوئی فرد بھی اپنی بنیادی ضروریات سے محروم نہ رہنے۔
حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ:
"اللہ تعالیٰ نے اہل دولت کے اموال پر ان کے غریبوں کی معاشی حاجت کو بدرجہ

کفایت پورا کرنا فرض کردیا ہے۔ پس اگر وہ بھوکے ننگے یا معاشی مصائب میں مبتلا ہوں گے' وہ محض اس لئے کہ اہل ثروت اپنا حق ادا نہیں کرتے اور اس لئے اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن اس کی بازپرس کرے گا اور اس کوتاہی پر ان کو عذاب دے گا۔"

امام ابن حزم کا کہنا ہے کہ:

"ہر ایک بستی کے ارباب دولت کا فرض ہے کہ وہ فقراء اور غرباء کی معاشی زندگی کے کفیل ہوں' اور اگر مال فئے (بیت المال کی آمدنی) ان غرباء کی معاشی کفالت کو پوری نہ ہوتی ہو' تو سلطان (امیر' خلیفہ) ان ارباب دولت کو اس کفالت کے لئے مجبور کر سکتا ہے' یعنی ان کے فاضل مال سے بہ جبر لے کر فقراء کی ضروریات میں صرف کر سکتا ہے۔ اور ان کی زندگی کے اسباب کے لئے کم از کم یہ ضروری ہے کہ ان کی ضرورت حاجت کے مطابق روٹی مہیا ہو' پہننے کے لئے گرمی اور سردی دونوں موسموں کے لحاظ سے' لباس فراہم ہو اور رہنے کے لئے ایک ایسا مکان ہو' جو ان کو بارش' گرمی' دھوپ اور سیلاب جیسے امور سے محفوظ رکھے۔"

حق معیشت میں بحیثیت انسان مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں۔ اس بات کا ثبوت حضرت عمر فاروق کی زندگی کے اس واقعہ سے ملتا ہے کہ حضرت عمر فاروق نے ایک دفعہ ایک بوڑھے شخص کو دیکھا' جو بھیک مانگ رہا تھا اور اس کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ آپ نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا' تم کس مذہب سے تعلق رکھتے ہو۔ اس نے جواب دیا۔ میں یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا۔ تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے (بھیک مانگنے) پر مجبور کیا۔ اس نے جواب دیا' میں بڑھاپے' حاجت مندی اور جزیہ کے باعث بھیک مانگ رہا ہوں۔ حضرت عمر اس یہودی کا ہاتھ پکڑ کر اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے لا کر اسے کچھ دیا۔ پھر آپ نے بیت المال کے خازن کو بلوایا اور اس سے کہا: اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو' کیونکہ یہ انصاف سے بعید ہے کہ ان کی جوانی میں ہم ان سے جزیہ وصول کر کے کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔

مولانا ابوالکلام فرماتے ہیں:

"ہر انسان جو دنیا میں پیدا ہوا ہو' دنیا کے سامان و رزق سے حصہ پانے کا یکساں طور پر حقدار ہے اور کسی فرد اور گروہ کو حق نہیں کہ اس سے اسے محروم کر دے' خواہ وہ طاقتور ہو یا کمزور' تندرست ہو یا بیمار یا ناقابل' دولت مندوں کے گھر پیدا ہوا ہو' یا فقیروں کے' لیکن اگر انسان ہے تو ماں کے پیٹ سے وہ یہ حق لے کر آیا ہے کہ وہ زندہ رہے اور زندگی کا سامان پائے۔"

(5) **حق انصاف :** اسلامی قانون سب کے لئے مساوی ہے' اس میں کسی بااثر شخصیت کے لئے کوئی علیحدہ قانون نہیں۔ اسلام میں کوئی بھی' حتیٰ کہ خلیفہ یا رئیس مملکت بھی قانون سے بالاتر نہیں۔ اگر خلیفہ بھی کسی فرد ملت پر زیادتی کرے تو اسے قاضی کی عدالت میں کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اسلام میں کسی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر اور صفائی کا موقعہ دیئے بغیر سزا نہیں دی جا سکتی ہے۔ اسلامی ریاست میں رہنے والے مسلم و غیر مسلم ہر شخص کو یہ حق حاصل ہے کہ اگر

عوام میں سے کوئی فرد یا حکومت میں سے کوئی حاکم یا ملازم اس کی حق تلفی کرے تو وہ حق طلبی کے لئے عدالت سے رجوع کرے۔ عدالت کے لئے حکم ہے کہ وہ غیر جانبداری سے فیصلہ کرے۔

سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

ولا یجرمنکم شنان قوم علی الا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوی۔

(اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اتنا مشتعل نہ کر دے کہ انصاف سے پھر جاؤ، عدل کرو، یہ خدا ترسی سے زیادہ قریب ہے)

سورۃ نحل میں فرمایا گیا ہے:

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان۔

(بلاشبہ اللہ انصاف اور نیکی کا حکم دیتا ہے)

سورۃ النسا میں فرمایا گیا ہے:

"اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو جاؤ، اللہ کے لئے گواہ بنو، اگرچہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو، یا ماں باپ کا، یا رشتہ داروں کا، اگر وہ دولت مند ہے یا محتاج ہے، تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان ملو گے یا کچھ بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔"

(6) حق مساوات : اسلام کے مطابق تمام انسان، انسان ہونے کی حیثیت سے مساوی ہیں، کیونکہ روئے زمین کے تمام لوگ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

یاایها الناس انا خلقنا کم من ذکر و انثی و جعلنا کم شعوبا و قبائل لتعارفوا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

ترجمہ۔ اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں گروہوں اور قبیلوں میں اس لئے بانٹا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سے زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔

فرمان نبوی ہے:

"کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی عجمی کو عربی پر، نہ کسی گورے کو کالے پر، اور نہ کالے کو گورے پر، ماسوا تقویٰ کے۔"

اسلام تمام انسان کو بنیادی حقوق میں بھی مساوات فراہم کرتا ہے۔ جو حقوق ایک مسلم کو حاصل ہیں، وہ غیر مسلم کو بھی حاصل ہیں۔ قانون کی نظر میں بھی اسلامی ریاست کے تمام شہری برابر ہیں۔ ہر شخص اپنی حق طلبی کے لئے عدالت سے رجوع کر سکتا ہے۔ حق معیشت میں بھی تمام انسان مساوی ہیں، ہر شخص اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ وسائل سے اپنی محنت اور ہمت کے مطابق روزی فراہم کر سکتا ہے۔

(7) نیکی میں تعاون اور بدی میں عدم تعاون کا حق : اسلام نیکی کے معاملہ میں ایک

دوسرے سے تعاون کرنے اور بدی کے معاملہ میں تعاون نہ کرنے کا حکم دیتا ہے۔
سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

تعاونوا علی البر والتقوی ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان۔
(جو کام نیکی اور خدا ترسی کے ہیں' ان میں سب سے تعاون کرو' اور جو کام گناہ کے ہیں ان میں کسی سے تعاون نہ کرو۔)

چنانچہ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ اگر فرد پر ظلم ہو رہا ہو تو اس کی مدد کرے۔ بدی کے معاملہ میں تعاون نہیں کیا جا سکتا۔

(8) **معصیت سے اجتناب اور ظالم کی اطاعت سے انکار کا حق** : اسلام اولی الامر (حاکم) کی اطاعت کو اس وقت تک فرض قرار دیتا ہے جب تک وہ معروف کا حکم دے لیکن جونہی وہ معصیت کا حکم دے اس کی اطاعت فرض نہیں رہتی
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

1- "ایک مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے' خواہ برضا و رغبت کرے یا بکراہت تاوقتیکہ اسے معصیت کا حکم نہ دیا جائے' پھر جب اس کو معصیت کا حکم دیا جائے تو سمع ہے نہ طاعت۔"

2- "معصیت میں کوئی طاعت نہیں' اطاعت تو صرف معروف میں ہے۔"

چنانچہ حکومت اگر کسی شخص کو کتاب و سنت کیخلاف کوئی حکم دے تو اسے حق حاصل ہے کہ وہ اس حکم پر عمل کرنے سے انکار کر دے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون
(اور جو فیصلہ نہ کریں اس قانون کے مطابق جو اللہ نے نازل کیا ہے' وہی کافر ہیں)

اسی طرح ایک شخص ظالم کی اطاعت سے انکار کرنے کا حق بھی رکھتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کا قول ہے کہ:

"کوئی ظالم اس امر کا مستحق نہیں ہے کہ وہ مسلمانوں کا امام ہو۔ اگر ایسا شخص امام بن جائے تو اس کی اطاعت واجب نہیں ہے' اسے صرف برداشت کیا جائے گا۔"

(9) **سیاست میں حصہ لینے کا حق** : اسلام کے مطابق خلافت میں تمام مسلمان شریک ہیں۔ اللہ نے قرآن میں صرف ایک شخص کو نہیں بلکہ پوری امت مسلمہ کو خلافت دینے کا وعدہ کیا ہے۔ پھر مسلمانوں کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ آپس میں مشورہ کرتے ہیں۔ اس طرح اسلام کی حکومت آپس کے مشورہ سے چلتی ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان کو سیاسی کارفرمائی میں شرکت کا حق حاصل ہے۔ بشرطیکہ وہ اس امر کی اہلیت رکھتا ہو۔

(9) **تحفظ آزادی** : اسلام میں ہر شخص کو شخصی آزادی حاصل ہے' یہ آزادی اس وقت تک سلب نہیں کی جا سکتی جب تک اس کے خلاف کوئی الزام عائد ہو اور اس پر مقدمہ قائم کر کے' اسے صفائی کا موقع نہ دیا جائے اور وہ مجرم ثابت نہ ہو جائے۔ کسی کو بلاوجہ قید نہیں کیا جا

سکتا

(10) تحفظ ملکیت : اسلامی ریاست میں ہر فرد اپنی ذاتی جائیداد اور ملکیت رکھنے کا حق رکھتا ہے۔ اس کی جائز ذرائع سے پیدا کردہ کمائی اور جائیداد کو بلا وجہ ضبط نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام ہر شخص کو انفرادی ملکیت کا حق دیتا ہے۔

سورۃ البقرہ میں حکم دیا گیا ہے:

ولا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل

(اور تم باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال نہ کھاؤ)

(11) تحفظ عزت : اسلام ہر شخص کی عزت و آبرو کے تحفظ کا ضامن ہے۔ اسلام میں ایک دوسرے کو برے القاب سے پکارنا، کسی کا تمسخر اڑانا اور کسی کی پیٹھ پیچھے برائی کرنا منع ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

(1) ولا تنابزوا بالالقاب

(اور تم ایک دوسرے کو برے القاب سے نہ پکارو)

(2) لا یسخر قوم من قوم

(تم میں سے کوئی گروہ کسی دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے)

(3) ولا یغتب بعضکم بعضا

(اور تم ایک دوسرے کی برائی پیٹھ پیچھے بیان نہ کرو)

چنانچہ ہر اسلامی ریاست کے ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ کوئی اس کی عزت پر ہاتھ نہ ڈالے اور ہاتھ یا زبان سے اس پر کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔

(12) نجی زندگی کا تحفظ : اسلام کسی شخص کو دوسرے شخص کی زندگی میں جھانکنے کی اجازت نہیں دیتا۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا (النور)

(اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل نہ ہو، جب تک کہ ان سے اجازت نہ لے لو)

چنانچہ ہر شخص کو حق حاصل ہے کہ وہ اپنے گھر میں دوسرے کے شور و شغب سے، دوسروں کی تاک جھانک سے، اور دوسرے کی مداخلت سے محفوظ رہے۔ اسلام انسان کی پرائیویسی کا پورا پورا تحفظ کرتا ہے۔

(13) ظلم کے خلاف احتجاج کا حق : اسلام کے مطابق ہر شخص ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق رکھتا ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

لا یحب اللہ الجھر بالسوء من القول الا من ظلم (النساء)

(اللہ اس کو پسند نہیں کرتا کہ آدمی بدگوئی پر زبان کھولے، الا یہ کہ کسی پر ظلم کیا گیا ہو)

(14) آزادی اظہار : اسلام ہر مسلمان پر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فرض عاید کرتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ برائی کے خلاف آواز بلند کر سکتا ہے اور نیکی کے معاملہ میں تبلیغ و تاکید کر سکتا ہے۔ اسلام میں ہر شخص کو اظہار رائے کا حق حاصل ہے۔ اعلیٰ سطح پر یہ حق "شوریٰ" کی صورت میں حاصل ہے۔ دینی اور علمی سطح پر ہر عالم شخص تقریر و تحریر کے ذریعہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا ہے۔

(15) مذہبی آزادی : اسلامی ریاست میں بسنے والے ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔ حکومت کسی غیر مسلم کو اسلام قبول کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ :

لا اکراہ فی الدین
(دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں)

(16) مذہبی دلآزاری سے تحفظ کا حق : اسلامی ریاست میں رہنے والے ہر شخص کو مذہبی آزادی حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ حق بھی حاصل ہے کہ اس کے مذہب کی توہین نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ (الانعام)
(اور ان کو برا بھلا نہ کہو' جنہیں یہ لوگ اللہ کے ماسوا معبود بنا کر پکارتے ہیں)

(17) آزادی اجتماع کا حق : اسلامی ریاست میں افراد کو باہم جمع ہونے یا جلسہ کرنے کی اجازت ہے۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے :

ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔
(اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے جو بھلائی کی طرف بلائے' معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے)

ایسے اجتماعات میں حکومت کے غلط اور شرعی افعال پر تنقید کی جا سکتی ہے اور زندگی سے متعلقہ دیگر مسائل پر بحث کی جا سکتی ہے۔

کیا اسلامی دستور اور منشور حقوق کے لحاظ سے مختلف اختلافی آراء رکھنے والوں کے لئے آزادی اجتماع کا حق ہے؟ یہ سوال سب سے پہلے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے سامنے خوارج کے ظہور پر پیش آیا اور آپ نے ان کے لئے آزادی اجتماع کے حق کو تسلیم کیا۔ آپ نے خوارج سے فرمایا :

"جب تک تم تلوار اٹھا کر زبردستی اپنا نظریہ دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش نہ کرو گے' تمہیں پوری آزادی حاصل رہے گی۔"

(18) عمل غیر کی ذمہ داری سے برءت : اس ہر شخص کو اس کے ذاتی اعمال کا ذمہ دار بناتا ہے' کوئی شخص دوسروں کے اعمال کا ذمہ دار نہیں۔

سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

لا تزر وازرۃ وزر اخری

(اور کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ اٹھانے پر مکلف نہیں ہے)

چنانچہ باپ کے بدلے بیٹا یا بیٹے کے بدلے باپ نہیں پکڑا جا سکتا کسی مجرم کے بدلے میں اس کے رشتہ داروں کو گرفتار کرنا اسلام میں ممنوع ہے۔ جو جرم کرے گا سزا بھی وہی پائے گا اس کے بدلے میں کسی دوسرے کو سزا نہیں دی جا سکتی۔

دستور پاکستان کے مطابق بنیادی حقوق : اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور 1973ء کے باب نمبر ا میں جو بنیادی حقوق عطا کئے گئے ہیں ان کی فہرست درج ذیل ہے:

1- بنیادی حقوق کے نقیض یا منافی قوانین کالعدم ہوں گے۔ (دفعہ 8)

2- کسی شخص کو زندگی یا آزادی سے محروم نہیں کیا جائے گا سوائے جبکہ قانون اس کی اجازت دے۔ (دفعہ 9)

3- کسی کو جسے گرفتار کیا گیا ہو، جس قدر جلد ممکن ہو آگاہ کئے بغیر نظر بند نہیں رکھا جائے گا اور اسے کسی وکیل سے مشورہ اور صفائی پیش کرنے کے حق سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ (دفعہ 10)

4- غلامی معدوم اور ممنوع ہے۔ انسانوں کی خرید و فروخت کی تمام صورتیں ممنوع ہیں۔ کسی سے بیگار نہیں لے جا سکتی۔ (دفعہ 11)

5- موثر بہ ماضی سزا سے تحفظ حاصل ہو گا۔ (دفعہ 12)

6- کسی شخص کو ایک ہی جرم کی بناء پر ایک سے زیادہ بار نہ تو مقدمہ چلایا جائے گا اور نہ سزا دی جائے گی اور کسی کو اس امر پر مجبور نہیں کیا جائے گا کہ وہ خود اپنے خلاف گواہ ہے۔ (دفعہ 13)

7- شرف انسانی وغیرہ قابل حرمت ہو گا۔ (دفعہ 14)

8- ہر شہری کو نقل و حرکت کی آزادی ہو گی۔ (دفعہ 15)

9- امن عامہ کے مفاد میں قانون کے ذریعہ عائد کردہ پابندیوں کے تابع اجتماع کی آزادی ہو گی۔ (دفعہ 16)

10- عوام کو انجمن سازی کا حق حاصل ہے۔ (دفعہ 17)

11- ہر شخص کو تجارت، کاروبار یا پیشے کی آزادی حاصل ہے۔ (دفعہ 18)

12- ہر شخص کو تقریر وغیرہ کی آزادی حاصل ہے۔ (دفعہ 19)

13- مذہب کی پیروی اور مذہبی اداروں کے انتظام کی آزادی حاصل ہے۔ (دفعہ 20)

14- کسی مذہب کی اغراض کے لئے کسی دوسرے مذہب کے افراد سے محصول وغیرہ نہیں لیا جائے گا۔ (دفعہ 21)

15- تعلیمی اداروں میں کسی شخص کو مذہبی تعلیم حاصل کرنے یا کسی مذہبی تقریب میں حصہ لینے کے لئے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ہر شخص کو بلا لحاظ مذہب تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کرنے کا حق ہو گا۔ (دفعہ 22)

16- ہر شہری کو جائیداد حاصل کرنے، قبضہ میں رکھنے اور فروخت کرنے کا حق حاصل ہو گا۔ (دفعہ 23)
17- ہر شہری کو حقوق جائیداد کا تحفظ حاصل ہو گا۔ (دفعہ 24)
18- تمام شہری قانون کی نظر میں مساوی ہیں۔ (دفعہ 25)
19- عام مقامات میں داخلہ سے متعلق کوئی امتیاز روا نہ رکھا جائے گا۔ (دفعہ 26)
20- ملازمتوں میں امتیاز روا نہیں رکھا جائے گا۔ (دفعہ 27)
21- شہریوں کو ہر طبقہ کو زبان، رسم الخط اور ثقافت کا تحفظ حاصل ہو گا۔ (دفعہ 28)

غیر مسلموں کے حقوق

سوال : اسلامی ریاست میں ذمیوں کے حقوق پر روشنی ڈالیے؟

جواب : غیر مسلم رعایا کی اقسام :

ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلم رعایا کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(i) معاہدین
(ii) مفتوحین
(iii) صلح و جنگ کے سوا کسی اور صورت میں اسلامی ریاست میں شامل ہونے والے لوگ

معاہدین : ایسے غیر مسلم لوگ جو کسی صلح نامہ یا معاہدہ کے تحت اسلامی ریاست کے تحت آتے ہوں، "معاہدین" کہلاتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو جنگ کے بغیر یا جنگ کے دوران اسلامی ریاست کی اطاعت قبول کرتے ہیں۔

معاہدین کا ساتھ تمام معاملات ان شرائط صلح یا معاہدہ کے تابع ہوں گے جو ان سے طے ہوئی ہوں۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"اگر تم کسی قوم سے لڑو اور اس پر غالب آ جاؤ اور وہ قوم اپنی اور اپنی اولاد کی جان بچانے کے لئے تم کو خراج دینا منظور کر لے (یا تم سے صلح نامہ طے کر لے) تو پھر بعد میں اس مقررہ خراج سے ایک حبہ بھی زائد نہ لینا، کیونکہ وہ تمہارے لئے ناجائز ہو گا۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے :

"خبردار! جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے گا، یا اس کے حقوق میں کمی کرے گا یا اس کی اطاعت سے زیادہ اس پر بار ڈالے گا۔ یا اس سے کوئی چیز اس کی مرضی کے خلاف وصول کرے گا، اس کے خلاف قیامت کے دن میں خود مستغیث بنوں گا۔"

معاہدین کے حقوق : معاہدین کے حقوق یہ ہیں:

1- جو خراج معاہدہ یا صلح نامہ کی رو سے مقرر ہو' اس سے زائد خراج وصول نہیں کیا جا سکتا۔
2- معاہدین کی زمینوں' جائیداد اور ملکیت پر قبضہ نہیں کیا جا سکتا۔
3- معاہدین پر سخت فوجداری قوانین نافذ نہیں کئے جا سکتے۔
4- معاہدین کو جان و مال کا تحفظ حاصل ہے۔
5- معاہدین کو مذہبی آزادی حاصل ہے۔
6- معاہدین کو عزت و آبرو کا تحفظ بھی حاصل ہے۔
7- معاہدین کے ساتھ طے پائے جانے والے معاہدہ پر حرف بحرف عمل کیا جائے گا۔

مفتوحین : وہ غیر مسلم لوگ جو آخر وقت تک مسلمانوں سے لڑتے رہے ہوں اور انہوں نے اس وقت ہتھیار ڈالے ہوں جب اسلامی فوجیں فاتحانہ حیثیت سے ان کی بستیوں میں داخل ہو گئی ہوں' "مفتوحین" کہلاتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ جب اسلامی ریاست میں آباد رہتے ہیں' تو وہ "ذمی" کہلاتے ہیں۔ یعنی ان کی ذمہ داری اسلامی حکومت پر عائد ہو جاتی ہے۔ ان لوگوں سے حفاظت جان و مال کے بدلے اسلامی حکومت جو رقم وصول کرتی ہے' اسے "جزیہ" کہا جاتا ہے۔ جزیہ ادا کرنے کے ساتھ ہی ان کی حرمت نفس و مال اسلامی ریاست پر فرض ہو جاتی ہے۔ جزیہ صرف ان لوگوں پر لگایا جاتا ہے جو اہل قتال ہوں۔ غیر اہل قتال مثلاً بچے' عورتیں' دیوانے' اندھے' اپاہج' راہب' عبادت گاہوں کے خادم' ازکار رفتہ بوڑھے' طویل عرصہ سے بیمار اشخاص' لونڈی' غلام وغیرہ جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔

جزیہ کی مقدار ان کی مالی حالت کے لحاظ سے مقرر کی جاتی ہے۔ جزیہ کی کوئی خا مقدار مقرر نہیں ہے۔ حضرت عمر فاروق نے اپنے عہد حکومت میں مالداروں پر ایک روپیہ ماہانہ' متوسط الحال لوگوں پر آٹھ آنہ ماہوار اور غریب محنت کش لوگوں پر چار آنہ مہینہ جزیہ مقرر کیا تھا۔

ذمیوں کے عام حقوق : اسلامی ریاست میں ذمیوں کو مندرجہ ذیل بنیادی حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

(1) **حفاظت جان** : اسلامی حکومت ذمیوں کی زندگی کے لئے تحفظ فراہم کرنے کی ذمہ داری ہے۔ اگر ایک مسلمان کسی ذمی کو قتل کر دے تو اس کے لئے بھی وہی سزا ہو گی۔ جو کسی مسلمان کو قتل کرنے پر دی جاتی ہے۔ ذمی کے خون کی قیمت مسلمان کے خون کے برابر ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو آپ نے اس کے بدلے میں اسے "مسلمان قاتل کو" قتل کرنے کا حکم صادر کیا اور فرمایا:

انا حق من و فی بذمتہ

(اپنے ذمہ کو وفا کرنے کا سب سے زیادہ حقدار میں ہوں)

حضرت عمر فاروق کے زمانہ میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا' تو آپ نے قاتل کو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا' جنہوں نے اسے قتل کر دیا۔

فرمان نبوی ہے :

"جو کوئی ہمارا ذمی ہو' اس کا خون ہمارے خون کی طرح اور اس کی دیت ہماری دیت کی طرح ہے۔"

تحفظ عزت : اسلامی حکومت ذمیوں کی عزت کی محافظ ہے۔ کسی ذمی کو ہاتھ یا زبان سے تکلیف دینا' یا مارنا پیٹنا اسلام میں منع ہے۔ فرمان نبوی ہے :

"اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے' جیسے مسلمان کی غیبت حرام ہے۔"

مال کا تحفظ : اسلامی ریاست ذمیوں کے مال' جائیداد اور املاک کے تحفظ کی ذمہ داری ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے :

انما قبلوا عقد الذمة لتكون اموالهم كاموالنا ودماؤهم كدمائنا

(انہوں نے عقد ذمہ قبول ہی اس لئے کیا ہے کہ ان کے مال ہمارے مال کی طرح' اور ان کے خون ہمارے خون کی طرح ہو جائیں)

قانونی مساوات : اسلامی ریاست میں ذمیوں کے لئے بھی وہی فوجداری اور دیوانی قانون ہے' جو مسلمانوں کے لئے ہے۔ جرائم کی سزا جو مسلمان کو دی جائے گی' وہی ذمی کو دی جائے گی۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ ذمیوں کے لئے صرف شراب اور سور کا استثنا ہے۔ وہ شراب بنانے' پینے اور بیچنے کا حق رکھتے ہیں اور انہیں سور پالنے' کھانے اور فروخت کرنے کے حقوق بھی حاصل ہیں۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کی شراب یا اس کے سئور کو تلف کر دے تو اس پر تاوان لازم آئے گا۔

"درمختار" میں ہے :

"مسلمان اس کی شراب اور اس کے سور کی قیمت ادا کرے گا' اگر وہ اسے تلف کر دے۔"

شخصی معاملات : ذمی اپنے مذہب قانون پر عمل کر سکتے ہیں۔ ان کے معاملات کا فیصلہ ان کے اپنے قانون کے مطابق ہو گا' ان پر زبردستی اسلامی قانون نافذ نہیں کیا جائے گا۔ اسلام میں شخصی معاملات میں اگر کوئی چیز ناجائز ہو اور ان کے قانون میں جائز ہو تو اسلامی عدالت انہی کے قانون کے مطابق فیصلہ کرے گی۔

مذہبی آزادی : ذمیوں کو اسلامی ریاست میں مذہبی آزادی حاصل ہے۔ مذہبی رسوم کے بارے میں قانون یہ ہے کہ ذمی خود اپنی بستیوں میں ان کو پوری آزادی کے ساتھ ادا کر سکتے ہیں' البتہ خالص اسلامی آبادیوں میں حکومت کو اختیار ہے کہ انہیں اس کی آزادی دے یا ان پر کسی قسم کی پابندیاں عاید کرے۔

"بدائع" میں مذکور ہے کہ :

"جو بستیاں امصار المسلمین میں سے نہیں ہیں' ان میں ذمیوں کو شراب اور خنزیر بیچنے' صلیب نکالنے اور ناقوس بجانے سے نہیں روکا جائے گا' خواہ وہاں مسلمان کی کتنی ہی کثیر تعداد آباد ہو' البتہ یہ افعال امصار المسلمین میں ناپسندیدہ ہیں۔"

(یاد رہے کہ امصار المسلمین سے مراد وہ مقامات ہیں جن کی زمین مسلمانوں کی ملکیت ہو' اور جن کو مسلمانوں نے اظہار شعائر اسلام کے لئے مخصوص کر لیا ہو۔)

ذمیوں کو امصار المسلمین کے سوا اپنی بستیوں میں نئے معابد بنانے کی اجازت ہے۔ امصار المسلمین میں وہ پرانے معابد کو قائم رکھ سکتے ہیں اور ان کی تعمیر و مرمت کر سکتے ہیں' لیکن نئے معابد تعمیر نہیں کر سکتے۔

حضرت ابن عباس کا فتویٰ ہے کہ :

"جن شہروں کو مسلمانوں نے آباد کیا ہے' ان میں ذمیوں کو یہ حق نہیں ہے کہ نئے معابد تعمیر کریں' یا ناقوس بجائیں یا اعلانیہ شراب اور سور کا گوشت بیچیں۔ باقی رہے وہ شہر جو عجمیوں کے آباد کئے ہوئے ہیں اور جن کو اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے ہاتھ پر فتح کیا اور انہوں نے مسلمانوں کے حکم کی اطاعت قبول کر لی' تو عجم کے لئے وہی حقوق ہیں جو ان کے معاہدہ میں طے ہو جائیں اور مسلمانوں پر ان حقوق کا ادا کرنا لازم ہے۔"

ذمہ کی پائیداری : اسلامی ریاست ذمی کے ذمہ کی ہر حالت میں پابند ہے۔ مولانا مودودی "بدائع" کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں :

بدائع میں ہے :

"عقد ذمہ ہمارے حق میں تو لازم ہے' یعنی ایک مرتبہ ذمی بنا لینے کے بعد ہم اس ذمہ کو کسی حال میں نہیں توڑ سکتے' لیکن ان کے لئے یہ لازم نہیں ہے۔" (یعنی اگر وہ ہمارے ذمہ سے خارج ہونا چاہیں تو ہو سکتے ہیں)

ذمی خواہ کیسے ہی بڑے جرم کا ارتکاب کرے' اس کا ذمہ نہیں ٹوٹتا' حتیٰ کہ جزیہ بند کر دینا' مسلمانوں کو قتل کرنا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا' یا کسی مسلمان عورت کی آبروریزی کرنا بھی اس کے حق میں ناقض ذمہ نہیں ہے۔ ان افعال پر اسے مجرم کی حیثیت سے سزا دی جائے گی' لیکن باغی قرار دے کر ذمہ سے خارج نہیں کر دیا جائے گا۔ البتہ صرف دو صورتیں ایسی ہیں جن میں ایک ذمی خارج الذمہ ہو جاتا ہے۔ ایک یہ کہ دارالاسلام کو چھوڑ کر دشمنوں سے جا ملے اور دوسرے یہ کہ اسلامی حکومت کے خلاف صریح بغاوت کر کے فتنہ و فساد برپا کرے۔

فوجی خدمت سے استثناء : اسلامی ریاست میں رہنے والے ذمی فوجی خدمات سے مستثنیٰ ہیں۔ دشمن سے ملک کی حفاظت کرنا تنہا مسلمانوں کے فرائض میں شامل ہے۔

فلاح عامہ

سوال : "اسلام فلاح عامہ کا ضامن ہے" دلائل سے بحث کیجئے!

جواب : فلاح :

فلاح کے لفظی معنی ہیں : (1) کامیابی' کامرانی (2) چھٹکارا' نجات (3) بہتری' بھلائی' بہبود (4) بقا (5) خیر و نیکی میں رہنا۔

اسلام بنی نوع انسان کی فلاح کا ضامن ہے۔ ہر روز تمام اسلامی ممالک کی بیشمار مساجد میں سے' موذن دن میں پانچ بار پکار پکار کر کہتا ہے :

حی علی الفلاح' حی علی الفلاح

(آؤ فلاح کی طرف' آؤ فلاح کی طرف)

اسلام مسلمانوں کی دنیوی فلاح کا بھی خواہاں ہے اور اخروی فلاح کا۔ قانون الٰہی انسانوں کی دنیاوی اور دینی فلاح کے لئے نازل ہوا ہے۔ اسلام میں دو قسم کے حقوق ہیں' حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ حقوق اللہ ادا کرنے سے انسان آخرت میں فلاح پانے کا سامان مہیا کرتا ہے' اور حقوق العباد ادا کر کے دنیا ہی میں فلاح پاتا ہے۔ اسلام کے تمامتر فقہی احکام فلاح دینے کے لئے ہیں۔

فلاح عامہ : فلاح عامہ سے مراد ہے' عام لوگوں کی بہتری' پوری قوم کی بھلائی' کسی ریاست میں لوگوں کی بہتری اور بھلائی کے لئے کیے جانے والا کام۔ اسلام لوگوں کی معاشرتی' معاشی' اور سیاسی فلاح کا داعی ہے۔ اسلام کے تمامتر احکام و قوانین کا بنیادی عنصر فلاح عامہ ہے۔

صدقات اور فلاح عامہ : اسلام میں صدقہ' خیرات' فطرانہ اور زکوٰۃ وغیرہ کا مقصد فلاح عامہ ہی ہے۔

سورۃ التوبہ میں فرمایا گیا ہے :

خذمن اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا وصل علیھم

ترجمہ : ان کے مالوں میں سے صدقہ وصول کر کے ان کو (بری صفات) سے پاک کرو' اور ان کو (اچھی صفات میں) بڑھاؤ' اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔

یہاں صدقہ سے مراد "زکوٰۃ" ہے' جو اہل ثروت (اہل نصاب) پر فرض ہے۔ قرآن مجید میں زکوٰۃ کا حکم تاکیدی ہے جسے بار بار دہرایا گیا ہے۔ زکوٰۃ زرعی اراضی پر بھی عائد ہوتی ہے' جسے عشر کہا جاتا ہے۔ زکوٰۃ کا تمامتر مصارف فلاح عامہ ہی کے لئے ہے۔ فرمان نبوی ہے :

ان اللہ قد فرض علیھم صدقۃ توخذ من اغنیاءھم فترد علی فقراء ھم

یعنی اللہ نے مسلمانوں پر ایک صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مالداروں سے لیا جائے گا اور ان کے حاجتمندوں پر لوٹا دیا جائے گا۔

مصارف زکوٰۃ : قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کئے گئے ہیں۔

1- **فقراء :** زکوٰۃ ان لوگوں پر صرف کی جا سکتی ہے جن کے پاس اپنی ضرورت سے کم مال ہو اور وہ تنگدستی میں گذارہ کرتے ہوں۔

2- **مساکین :** وہ لوگ جو اپنی حاجت بھر مال نہیں رکھتے' نہ ہی لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرتے ہیں۔

3- **عاملین زکوٰۃ :** وہ لوگ جو حکومت کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے پر مامور ہوتے ہیں۔

4- **مولفتہ القلوب :** ایسے نو مسلم جنہیں اسلام کی طرف مائل کرنا ہو اور وہ مالی طور پر کمزور ہوں۔

5- **غلاموں کی آزادی :** کسی کو غلامی سے رہائی دلوانے کے لئے زکوٰۃ کا مال خرچ کیا جا سکتا ہے۔

6- **قرض کی ادائیگی :** زکوٰۃ کے مال سے قرضداروں کی مدد کی جا سکتی ہے۔

7- **فی سبیل اللہ :** زکوٰۃ دعوت دین کے کاموں پر بھی صرف کی جا سکتی ہے۔

8- **مسافر :** حالت سفر میں اگر کوئی شخص کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو زکوٰۃ کی مد سے اس کی مدد کی جا سکتی ہے۔

مندرجہ بالا زکوٰۃ کے تمام تر مصارف فلاح عامہ ہی کے لئے ہیں۔ زکوٰۃ کی رقم سے فلاح عامہ کے لئے شفا خانے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ درسگاہیں قائم کر کے ان کا انتظام کیا جا سکتا ہے۔ پل' کنوئیں اور راستے تعمیر کئے جا سکتے ہیں۔ عشر اور خمس کی وصولی سے غرباء کا غذائی مسئلہ حل کیا جا سکتا ہے۔

لاوارثوں کی سرپرستی : اسلامی ریاست ان لوگوں کی سرپرست ہے جن کا کوئی وارث یا سرپرست نہیں۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے :

السلطان ولی من لا ولی لہ

(حکومت اس کی سرپرست ہے جس کا کوئی سرپرست نہ ہو)

متوفی مقروض کا قرض ادا کرنا : رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

من مات وعلیہ دین ولم یترک وفاء فعلی قضاء ہ ومن ترک مالا فلورثتہ

ترجمہ : جو شخص مرجائے اور اس کے ذمہ قرض ہو' اور وہ اسے ادا کرنے کے قابل مال نہ چھوڑے تو اس کا ادا کرنا میرے ذمہ ہے' اور جو مال چھوڑے تو وہ اس کے وارثوں کا حق ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر متوفی مقروض ہو اور اپنے پیچھے کوئی مال نہ چھوڑے جس سے اس کا قرض ادا ہو سکے' اس کا قرض ادا کرنا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

وراثت ودیت : ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے:

انا وارث من لا وارث له اعقل عنه وارثه

ترجمہ : جس کا کوئی وارث نہ ہو' اس کا میں وارث ہوں' اس کی طرف سے دیت ادا کروں گا اور اس کی میراث لوں گا۔

مجموعی احکام : اسلام کے تمام تر احکام فلاح عامہ ہی کے لئے ہیں۔ ذیل میں جن امور کی فہرست دی جا رہی ہے' ان کا تعلق فلاح عامہ سے ہے۔

1- **قتل** : اسلام میں قتل بدترین گناہ ہے' جس کی سخت ترین سزا مقرر کی گئی ہے۔

2- **چوری** : اسلام میں چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا مقرر کی گئی ہے۔

3- **قذف** : اسلام میں قذف کی حد مقرر ہے۔

4- **شراب نوشی** : اسلام میں شراب نوشی کی حد مقرر ہے۔

5- **جواء** : اسلام میں جواء اور قمار بازی حرام ہے۔

6- **خود کشی** : اسلام میں خود کشی کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

7- **اولاد کشی** : اسلام میں اولاد کشی کو سخت گناہ قرار دیا گیا ہے۔

8- **ناپ تول میں کمی** : قرآن مجید میں ناپ تول میں کمی نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

9- مندرجہ ذیل اخلاق کو رذائل میں شامل کیا گیا ہے اور ان کی سخت مذمت کی گئی ہے:

جھوٹ' وعدہ خلافی' خیانت' بددیانتی' غداری' دغا بازی' بہتان' غیبت' بدگوئی' بدگمانی' خوشامد' بخل' حرص و طمع' چوری' غلول' سود خوری' رشوت' بغض و کینہ' ظلم' فخر و غرور' خود بینی و خود نمائی' فضول خرچی' حسد' فحش گوئی۔

اوپر جو فہرست دی گئی ہے اس میں مذکورہ تمام تر امور فلاح عامہ کے خلاف ہیں' ان سے لوگوں کی معاشرتی زندگی کو نقصان پہنچتا ہے' اس لئے اسلام نے ان تمام تر رذائل کو ممنوع قرار دیا ہے اور ان سے پرہیز کرنے کا حکم دیا ہے۔

اسلام ہر مسلمان سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں فضائل اخلاق پیدا کرے' تاکہ معاشرہ برائیوں سے پاک ہو اور لوگ فلاح کے راستہ پر گامزن ہوں۔ اسلام کے فضائل اخلاق یہ ہیں:

صدق' سخاوت' عفت و پاکبازی' دیانتداری' شرم و حیا' رحم' عدل و انصاف' عہد کی

پابندی، عفو و درگذر، احسان، حلم و بردباری، رفق و لطف، خوش کلامی، ایثار، اعتدال و میانہ روی، عزت نفس، شجاعت، استقامت، حق گوئی، استغناء۔

عہد فاروقی میں فلاح عامہ کی مثالیں : حضرت عمر فاروق نے اپنے عہد حکومت میں فلاح عامہ کے لئے مندرجہ ذیل اصلاحات جاری کیں۔

1۔ **محکمہ پولیس کا قیام** : حضرت عمر فاروق نے امن قائم رکھنے کے لئے محکمہ پولیس قائم کیا۔

2۔ **جیل خانے** : آپ نے مجرموں کو سزائیں دینے کے لئے جیل خانے قائم کئے۔

3۔ **آبپاشی کا نظام** : آپ نے نظام آبپاشی کے فسطاط کی جانب ایک نہر کھدوائی جسے "خلیج امیر المومنین" کہا جاتا تھا۔ نہر ابو موسیٰ، نہر معقل اور نہر سعد بھی آپ ہی کے زمانہ میں کھودی گئی۔

4۔ **نئے شہر** : آپ نے کئی نئے شہر بھی آباد کئے۔

5۔ **فوجی چھاؤنیاں** : آپ نے فوجی چھاؤنیوں کی بنیاد رکھی اور پرچہ نویس مقرر کئے۔

6۔ **وظائف** : حضرت عمر فاروق نے مفلوک الحال ذمیوں اور غیر مسلموں کے وظائف اور روزینے مقرر کئے۔

7۔ **اماموں کا تقرر** : آپ نے مسجدوں کا نظام بہتر بنایا اور مساجد کے اماموں اور موذنوں کی تنخواہیں مقرر کیں۔

8۔ **مردم شماری** : آپ نے اسلام میں پہلی بار مردم شماری کروائی۔

9۔ **خراج و محصول** : آپ نے عشر و خراج کا طریقہ قائم کیا اور تجارتی مال پر محصول چونگی مقرر کی۔

10۔ **حد** : آپ نے شراب خوری کی حد اسی کوڑے مقرر کی۔ علاوہ ازیں کسی کی ہجو کہنے پر تعزیر کی سزا مقرر کی اور غزلیہ اشعار میں خواتین کا نام لینے کو جرم قرار دیا۔

11۔ **مہمان خانے** : آپ نے مختلف شہروں میں مہمان خانے تعمیر کروائے۔

12۔ **لاوارثوں کے روزینے** : آپ نے راہ میں پڑے ہوئے (لاوارث) بچوں کی پرورش اور تربیت کے لئے روزینے مقرر کئے۔

13۔ **غلامی کی ممانعت** : آپ نے حکم جاری کیا کہ اہل عرب غلام نہیں بنائے جا سکتے۔

14۔ **مکاتب** : آپ نے مکاتب قائم کئے اور معلمین کی تنخواہیں مقرر کیں۔

اسلامی ریاست اور فلاح عامہ : ایک اسلامی حکومت کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری ادارے قائم کرے اور ضروری اسباب فراہم کرے۔ مثلاً :
تعلیمی ادارے' فنی ادارے' تربیتی ادارے' فنون لطیفہ کے ادارے' ذرائع آمدورفت اور ذرائع رسل و رسائل کا بندوبست' صنعتی ادارے' کارخانے' پلوں اور راستوں کی تعمیر' منڈی' بازار' ذرائع آبپاشی' مساجد کا انتظام' اوقاف کا انتظام' حج کا انتظام' قومی و مذہبی تقریبات کا انتظام' علمائے کرام اور مصنفین کی سرپرستی' معذوروں کی سرپرستی' اجتماعی مسائل کا حل' پانی اور روشنی کا انتظام' بروزگاروں کو روزگار فراہم کرنے کا انتظام' امداد باہمی کے ادارے' یتیم خانوں کا قیام' ہسپتالوں کا قیام' دیہی پنچائتیں وغیرہ وغیرہ۔

عدل

سوال : اسلام کے "تصور عدل" پر بھرپور روشنی ڈالئے!

جواب : عدل :

"عدل" کے معنی ہیں : (1) نظیر' مانند (2) برابری' انصاف' داد' نیاؤ۔ کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں بھی کمی یا بیشی نہ ہو' تو اس عمل کو عربی زبان میں "عدل" کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر بغیر کسی کمی بیشی کے ٹھیک ٹھیک دوسرے کے حقوق کو ادا کرنے کا نام "عدل" یا انصاف ہے۔

مفکرین اسلام کے نزدیک "عدل" کی تعریف یہ ہے :

1- امام راغب اصفہانی کا کہنا ہے کہ :
"مکافات میں مساوات کا لحاظ رکھنا عدل ہے' یعنی نیکی کا صلہ نیکی اور بدی کا صلہ بدی ملنا چاہئے۔"

2- ابو البقاء حنفی کا کہنا ہے کہ :
"عدل ظلم کی ضد ہے' عدل یہ ہے کہ حقدار کو حق دلایا جائے اور جس کا حق نہیں اس سے لے لیا جائے۔"

3- علامہ عینی کے نزدیک :
"عدل واجب التعمیل احکام کی تعمیل کا نام ہے۔ عدل یہ ہے کہ حق کو تسلیم کیا جائے اور ظلم کا خاتمہ کر دیا جائے۔"

4- سید شریف کا کہنا ہے کہ :
"عدل افراط و تفریط کے درمیان ایک نقطہ مساوات ہے' جو اطراف کو برابر رکھتا ہے اور حق پر آ کر رک جاتا ہے۔

5- سید ابو الاعلیٰ مودودی کا کہنا ہے کہ :

"عدل کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے' ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو' دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقے سے دیا جائے۔"

عدل' قرآن کی روشنی میں "عدل" سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کی صفتوں میں سے ایک صفت ہے۔ اس کا ایک نام "عادل" بھی ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :

1- واللہ یقول الحق (احزاب)
(اور اللہ حق بات کہتا ہے)

2- واللہ یقضی بالحق (مومن)
(اور اللہ حق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے)

3- وتمت کلمتہ ربک صدقا و عدلا (انعام)
(اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف کے ساتھ پوری ہو گئی)

قرآن مجید میں انصاف اور عدل کا حکم دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

1- ان اللہ یا مرکم بالعدل والاحسان (نحل)
(بے شک اللہ انصاف اور نیکی کا حکم دیتا ہے)

2- واوفوا الکیل والمیزان بالقسط (انعام)
(اور انصاف کے ساتھ (پوری پوری) ناپ کرو اور (پوری پوری) تول)

3- واذا قلتم فاعدلوا ولو کان ذا قربی (انعام)
(اور (گواہی دیتے یا فیصلہ کرتے وقت) جب بات کہو تو گو (فریق مقدمہ) قرابت دار ہی ہو' انصاف کا پاس کرو)

4- یا ایہا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ ولوا علی انفسکم والوالدین والا قربین ان یکن غنیا او فقیرا فاللہ اولی بہما فلا تتبعوا الھوی ان تعدلوا وان تلوٗ او تعرضو فان اللہ کان بما تعملون خبیرا (النساء)

ترجمہ : اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو' اللہ کے لئے گواہ بنو' اگرچہ تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو' یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا' اگر وہ دولتمند ہے یا محتاج ہے' تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے' تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو' اگر تم زبان ملو گو یا کچھ بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے واقف ہے۔

5- وان حکمت فاحکم بینھم بالقسط ان اللہ یحب المقسطین (مائدہ)

ترجمہ : اور اگر فیصلہ کرو تو ان میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرنا' بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

6- واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل (النساء)
اور جب لوگوں کے درمیان جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔

سیرت نبوی اور عدل : فرمان نبوی ہے:
اذا جلس الیک الخصمان فلا تقض بینهما حتی تسمع من الاخر کما سمعت من الاول (ابو داؤد' ترمذی)
ترجمہ : جب تیرے سامنے دو فریق اپنا معاملہ لے کر بیٹھیں تو ان کا فیصلہ نہ کر' جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لے' جس طرح پہلے کی سنی ہے۔

حیات نبوی سے عدل کی بیشمار مثالیں ملتی ہیں جن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

1- ایک دفعہ بنی مخزوم میں سے ایک عورت نے چوری کی' قریش کی عزت کے لحاظ سے لوگ چاہتے تھے کہ وہ عورت سزا سے بچ جائے۔ لوگوں نے حضرت اسامہ بن زید سے سفارش کروائی تو آپ نے غضب آلود ہو کر فرمایا:
"بنی اسرائیل اسی کی بدولت تباہ ہوئے کہ وہ غربا پر تو حد جاری کرتے تھے' اور امراء سے درگذر کرتے تھے' خدا کی قسم! اگر محمد کی بیٹی بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

2- بنو ثعلبہ کے کچھ لوگ خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو ایک انصاری نے کہا کہ یا رسول! ان کے مورث نے ہمارے خاندان کے ایک فرد کو قتل کر دیا تھا' اس کے بدلہ میں ان کا ایک آدمی قتل کرا دیجئے۔
آپ نے فرمایا:
"باپ کا بدلہ بیٹے سے نہیں لیا جا سکتا۔"

3- حضرت ابو حدرد اسلمی ایک یہودی کے مقروض تھے اور ان کے پاس سوائے بدن کے کپڑوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہودی نے دربار نبوی میں استغاثہ کیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہودی کا قرض ادا کرو' انہوں نے عذر کیا۔ آپ نے پھر فرمایا' انہوں نے پھر عذر کیا کہ میرے پاس قرض ادا کرنے کے لئے کوئی چیز نہیں۔ آپ نے حکم دیا کہ ہر حال میں قرض ادا کر دیا جائے۔ آخر صحابی نے اپنا تہبند اس یہودی کو قرض کے عوض دے دیا اور سر سے عمامہ اتار کر کمر سے لپیٹ لیا۔

4- ایک بار آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے۔ لوگوں کا گردوپیش ہجوم تھا۔ ایک شخص آ کر منہ کے بل آپ پر لد گیا۔ آپ کے دست مبارک میں پتلی سی لکڑی تھی' آپ نے اس سے اسے ٹھوکا دیا۔ اتفاق سے لکڑی کا سرا اس کے منہ میں لگ گیا اور خراش آ گئی۔ آپ نے فرمایا: مجھ سے انتقام لے لو۔ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ! میں نے معاف کر دیا۔

5- آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے مرض الموت کی حالت میں اعلان کیا کہ اگر

میرے ذمہ کسی کا قرض ہو' یا میں نے کسی کی جان و مال یا آبرو کو صدمہ پہنچایا ہو تو میری جان و مال و آبرو حاضر ہے' اسی دنیا میں وہ اپنا انتقام لے لے۔ مجمع میں سناٹا تھا' صرف ایک شخص نے چند درہم کا دعویٰ کیا جو دیدیے گئے۔

6- ایک صحابی کے رشتہ دار کو یہودیوں نے قتل کر دیا۔ صحابی نے دربار نبوی میں استغاثہ کیا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے فرمایا: کیا تم قسم کھا سکتے ہو کہ یہودیوں نے ان کو قتل کیا۔ انہوں نے جواب دیا: میں نے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ آپ نے فرمایا' تو پھر یہود سے حلف لیا جائے۔ انہوں نے کہا: یہودوں کی قسم کا کیا اعتبار یہ سو دفعہ جھوٹی قسم کھا لیں گے۔

یہ بات اگرچہ یقینی تھی کہ مقتول کو یہودیوں ہی نے قتل کیا ہے' لیکن چونکہ کوئی یقینی شہادت موجود نہ تھی' اس لئے آنحضرت ﷺ نے یہودیوں سے تعرض نہ فرمایا۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

لا یوسر رجل فی الاسلام بغیر عدل
(اسلام میں کوئی شخص عدل کے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا)

ایک دفعہ حضرت عمر فاروق اور حضرت ابی بن کعب میں اختلافات و نزاع پیدا ہو گیا۔ ابی کعب نے قاضی سے رجوع کیا تو قاضی نے حضرت عمر فاروق کو طلب کیا۔ آپ جب قاضی کی عدالت میں پہنچے تو قاضی (زید بن ثابت) نے آپ کی تعظیم کی۔ آپ نے اسے ٹوکا اور کہا کہ یہ پہلی ناانصافی ہے جس کے تم مرتکب ہوئے ہو۔ آپ مقدمہ فیصل ہونے تک فریق مخالف کے ساتھ بیٹھے رہے۔

عدل کی اقسام : عدل کی دو قسمیں ہیں۔

1- عدل شخصی 2- عدل اجتماعی (جماعتی عدل)

عدل شخصی : یہ عدل کسی خاص فرد یا شخص کی صفت بنتا ہے جس کی بنا پر کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص "عادل" ہے۔ ہر صاحب حق کو اس کا حق ادا کر دینا افراد اور اشخاص کا عدل (عدل شخصی) کہلاتا ہے۔ ہر شخص جماعت کا ایک فرد ہے' اس لئے اسے حق حاصل ہے کہ وہ جماعت کی خیر و خوبی میں سے اپنے حصہ کے مطابق فائدہ اٹھائے۔

غیر جانبداری : عدل کا سب سے بڑا دشمن "تحیز" اور جانبداری ہے اور یہ انسان کے اس رجحان کا نام ہے جو دو برابر کی چیزوں میں سے کسی ایک کی جانب اس لئے ہو جاتا ہے کہ اس کے ذریعے سے وہ اپنے حق سے زیادہ حاصل کرتا اور دوسرے کو اس کے حق سے کم دیتا ہے۔

اسلام نے قاضی اور حکم پر فرض قرار دیا ہے کہ وہ مقدمات کا فیصلہ کرتے وقت غنی' فقیر' گورے' کالے' امیر' غریب اور مسلم و غیر مسلم میں سے کسی کی جانبداری نہ کرے' اور جس کا حق ثابت ہو' اس کو دلائے۔

رسول ﷺ نے فرمایا:

"تم سے پہلے ایسے لوگ ہلاک کر دیے گئے اور عذاب الٰہی کے سزاوار بنے' جنہوں ان

میں سے کوئی سربر آوردہ چوری کرتا تو وہ اس کو معاف کر دیتے تھے، اور اگر کوئی غریب و کمزور ایسا کرتا تو اس پر حد جاری کرتے تھے۔"

انسان کو محبت و عشق، منفعت ذاتی اور خارجی مظاہر (مثلاً شیریں کلامی، فصاحت و بلاغت، چرب زبانی وغیرہ) جانبداری پر مائل کرتے ہیں۔ اس لئے ان باتوں سے بچنا لازم ہے۔

قرآن مجید میں حکم دیا گیا ہے کہ:

"اے ایمان والو! انصاف کی حمایت میں کھڑے ہو، اللہ کے لئے گواہ بنو، اور تمہارا اپنا اس میں نقصان ہی ہو، یا ماں باپ کا یا رشتہ داروں کا، اگر وہ دولتمند ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے، تو تم انصاف کرنے میں اپنے نفس کی خواہش کی پیروی نہ کرو، اگر تم زبان ملو گے یا بچا جاؤ گے تو اللہ تمہارے کام سے خوب واقف ہے۔" (النساء)

اسباب عدل : حکماء کے نزدیک جانبداری کے مقابلہ میں عدل کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

1- **جذبہ داری کا عدم** : جو شخص خواہش نفس اور رجحان طبع سے الگ ہو کر کسی شے کو دیکھے گا تو وہ یقیناً عدل و انصاف کے بہت زیادہ قریب ہو گا۔

2- **وسعت نظر** : اگر کسی مسئلہ میں اختلاف ہو تو اختلاف کرنے والوں کو چاہئے کہ پہلے محل نزاع پر غور کریں اور نزاعی مسئلہ کو جس طرح ایک فریق دیکھ رہا ہے، اسی جہت سے دوسرا فریق بھی دیکھے، تاکہ محل نزاع متعین ہو جائے۔

قاضی کا فرض ہے کہ وہ مقدمہ کا فیصلہ کرتے وقت فریقین کے تمام وجوہات پر پوری طرح غور و خوض کرے۔

3- **ارتکاب عمل کے بواعث و اسباب** : حکم اور فیصلہ کا مدار ارتکاب عمل کے بواعث و اسباب پر ہونا چاہئے نہ کہ مظاہر خارجی پر۔ پس کبھی عمل کا ظاہر برا اور مکروہ ہوتا ہے لیکن اس کا صدور شریف اور نیک نیت کی جانب سے ہوتا ہے۔ مثلاً ایک باپ اپنے بچہ کی تربیت کی خاطر غصہ میں انتہائی سخت دلی کا مظاہرہ کرے تو باپ کے اس عمل پر برائی کا حکم نہ دینا چاہئے۔

شخصی عدل اور شخصی حقوق : اسلام ہر فرد ملت کو انصاف فراہم کرنے کا ضامن ہے۔ وہ اسے شخصی حقوق دینے کے ساتھ ساتھ ان حقوق کے تحفظ کا بھی ذمہ دار ہے۔ چنانچہ جس شخص کو بھی کسی دوسرے سے شکایت پیدا ہو، وہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹا سکتا ہے۔ اسے بلا لحاظ رنگ و نسل، مذہب و قوم انصاف فراہم کرنا حکومت کا فرض ہے۔ کوئی بھی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے، یہاں تک کہ سربراہ ریاست بھی زیادتی کا مرتکب ہو تو اس کے خلاف مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

جماعتی عدل : یہ جماعت یا حکومت کی صفت ہے۔ عادل جماعت وہ جماعت ہے جس کے نظم و قوانین اس قدر سہل الوصول اور آسان ہوں جو اس کے تمام افراد کے لئے اس کی اپنی اپنی

استعداد کے مطابق یکساں ترقی کا باعث بنتے ہوں۔

کسی جماعت کو اس وقت تک "عادل" نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس کے ذریعہ انسانوں کے ہر گروہ کے لئے وسائل ترقی بہتات کے ساتھ میسر نہ آتے ہوں۔ مثلاً اس قوم میں ایک گروہ تجارت پیشہ ہے اور وہ اپنی تجارت کے لئے ذرائع رسل و رسائل، ریل، تار، ڈاک خانہ وغیرہ کا محتاج، ایک گروہ طلبہ کا ہے۔ جو ہر قسم کے سکولوں، یونیورسٹیوں اور فنی اداروں کا خواہاں ہے، ایک گروہ اپنے جھگڑوں میں فیصلہ چاہنے والوں کا ہے، اور وہ قانونوں اور ججوں اور ایسے قوانین کا محتاج ہے، جو ملزموں کو سزا دے سکیں۔ پس اگر وہ قوم ان تمام ضروریات کو قائم کرنے اور بااحسن وجوہ انتظام کرنے والی ہے تو اس جماعت کو "عادل" کہا جا سکتا ہے، بصورت دیگر اسے "ظالم" کہا جائے گا۔

جماعتی عدل میں جماعت کے ہر رکن سے یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ جماعتی عدل کو قائم کرنے میں اپنا فرض ادا کرے، اور ثبوت عدل کے لئے جن اعمال کی ضرورت ہے، اپنی بہترین کوششوں کے ساتھ ان کو انجام دے۔ مثلاً اگر شفا خانوں کی ضرورت ہے تو ایک مقرر کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی تقریر کے ذریعہ ان کے قیام پر توجہ دلائے، ادیبوں اور اخبار نویسوں کا یہ فرض ہے کہ وہ اس مسئلہ کی اہمیت اجاگر کریں، شعراء کا فرض ہے کہ وہ اپنے اشعار کے ذریعہ اس مسئلہ کو عوام اور حکومت تک پہنچائیں، مالداروں کا فرض ہے کہ وہ اس سلسلہ میں اپنا مال صرف کریں اور حکومت کا فرض ہے کہ وہ حکومت کی قوت تنفیذ اس کے نفاذ کے لئے استعمال کرے۔

اگر کسی قوم کے افراد اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتے ہیں تو اس صورت میں ساری قوم گنہگار اور ظالم ٹھہرے گی، حتیٰ کہ وہ افراد بھی اس حکم کے تحت آ جائیں گے جو اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دے رہے ہیں۔

چنانچہ کوئی حکومت اس وقت تک عادل نہیں ہو سکتی جب تک وہ اپنے اس فرض کو پورا نہ کر دے۔

مولانا مودودی کی رائے : مولانا ابو الاعلیٰ مودودی کا خیال ہے کہ:

> "عدالت اجتماعیہ درحقیقت جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ افراد، خاندانوں، قبیلوں، برادریوں اور قوموں میں سے ہر ایک کو مناسب آزادی بھی حاصل ہو، اور اس کے ساتھ ظلم و تعدی کو روکنے کے لئے مختلف اجتماعی اداروں کو افراد پر اور ایک دوسرے پر اقتدار بھی حاصل رہے، اور مختلف افراد و اجتماعات سے وہ خدمت بھی لی جا سکے جو اجتماعی فلاح کے لئے درکار ہے۔"

اجتماعی عدل اور فرد کی ذمہ داری : فرد چونکہ جماعت کا ایک رکن ہے، اس لئے جماعتی عدل میں ہر فرد اپنے اپنے حصہ کی ذمہ داریاں ادا کرنے کا پابند ہوتا ہے، اگر وہ اپنے کسی فرض سے کوتاہی کرے تو وہ ظلم کا مرتکب ہو گا۔ اسلام کے مطابق تمام لوگ فرداً فرداً خدا کے سامنے جواب دہ ہیں۔ ایک خاوند اپنی بیوی اور اولاد کا ذمہ دار ہے، سردار اپنے کنبہ کا ذمہ دار ہے، اور حاکم اپنی رعایا کا ذمہ دار ہے۔

عدل اور مساوات : اسلام بحیثیت انسان تمام بنی نوع کو مساوی درجہ دیتا ہے اور ہر فرد کو قانونی مساوات' اور حقوق میں مساوات فراہم کرنے کا ذمہ لیتا ہے' چنانچہ قانون کی نظر میں غنی و فقیر' شریف و رذیل' بلند و پست اور مسلم و غیر مسلم سب برابر ہیں۔ جو کوئی شخص بھی جرم کرے وہ بغیر کسی طبقاتی امتیاز کے سزا پائے گا۔ اسی طرح ایک اسلامی ریاست کو تمام لوگوں کو یکساں حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

عدل اور احسان : اسلام میں ہر اولی الامر کو ہر حالت میں عدل و انصاف سے کام لینے کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ مسلمانوں کو غصہ ضبط کرنے اور ایک دوسرے پر احسان کرنے کی ترغیب بھی دی گئی ہے اور عدل کے ساتھ احسان کرنے کا حکم بھی دیا گیا ہے۔ احسان کرنا اس صورت میں ممکن ہے کہ ایک شخص کسی دوسرے پر زیادتی کرے تو وہ اس زیادتی کے خلاف عدالت میں مقدمہ پیش کرنے سے پہلے ہی اسے معاف کر دے۔ عفو و درگذر ایک نجی معاملہ ہے۔ جب کوئی معاملہ عدالت میں پیش ہو اور مقدمہ کا فیصلہ صادر ہو جائے تو مدعی کا یہ اختیار ختم ہو جاتا ہے۔ یعنی اس کے معاف کر دینے کا کوئی مطلب نہیں لیا جائے گا اور فیصلہ پر عمل درآمد کیا جائے گا۔

دور نبوی کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک صحابی مسجد نبوی میں سوئے ہوئے تھے کہ کسی شخص نے ان کی چادر چرا لی۔ صحابی جاگے تو آنحضرت ﷺ کے سامنے مقدمہ پیش کیا۔ آپ نے ملزم کو بلا کر اس سے پوچھا تو اس نے اعتراف جرم کر لیا۔ آپ نے اسے قطع ید کی سزا کا حکم دے دیا۔ اس پر مدعی نے عرض کیا' یا رسول اللہ! میں نے اپنے بھائی کو معاف کیا۔ اس پر آپ نے فرمایا: تم نے میرے پاس آنے سے پہلے اسے کیوں نہ معاف کر دیا' اب سزا مل کے رہے گی۔

علاوہ ازیں آپ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ مجرم کو میرے (عدالت کے) پاس لانے سے پہلے معاف کر دیا کرو۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ رحمت (احسان) انصاف سے بلند شے ہے۔ اس سے یہ مراد ہے کہ تم اپنے کسی معاملہ میں' خود سے زیادتی کرنے والے پر احسان کر کے اسے معاف کر دو' لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ کسی دوسرے شخص کے ساتھ زیادتی کرنے والے یا قانون شکنی کرنے والے کو معاف کر دیا جائے۔ اسے اس کے جرم کی سزا ملنی چاہئے' ورنہ قانون بے اثر ہو کر رہ جائے گا۔ ایک شخص ریل میں بے ٹکٹ سفر کرتا ہے' اور پکڑا جاتا ہے۔ اب اگر اسے چیک کرنے والا شخص اس کی غربت پر ترس کھا کر چھوڑ دے تو کیا یہ احسان ہو گا' نہیں بلکہ یہ حکومت کے ساتھ افسر کی بددیانتی متصور ہو گی۔ احسان تو یہ ہے کہ وہ کرایا کی رقم اپنے پلے سے دے کر مجرم کو چھوڑ دے۔

احسان کی ایک صورت یہ ہے کہ ایک شخص پر تمہارا قرض ہے' لیکن وہ بوجہ غربت ادا نہیں کرتا۔ انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم اس سے اپنا حق طلب کرو' لیکن تم نے اسے ازراہ شفقت و رحمت صاحب ثروت ہونے تک مہلت دے دی' یا بالکل معاف کر دیا۔ اس صورت میں "رحمت انصاف سے بلند ہے۔"

جہاد

سوال : جہاد سے کیا مراد ہے؟ جہاد کی اقسام بیان کیجئے اور قتال فی سبیل اللہ پر قرآن و سنت کے حوالہ سے روشنی ڈالئے؟

جواب : جہاد :

"جہاد" کے معنی ہیں: کوشش' سعی' جدوجہد۔ شرعی اصطلاح میں جہاد سے مراد ہے: ہر وہ سعی و کاوش جو جسم و جان' زبان' قلم یا مال کے ذریعہ دین کی سربلندی اور اللہ کی خوشنودی کے لئے کی جائے۔

اسلام کا تصور جہاد : جو کام بھی رضائے الٰہی کی خاطر انجام دیا جائے اور کوئی دوسرا جذبہ اس کا محرک نہ ہو' وہ جہاد ہے۔ مثلاً کسان کی زراعت' تاجر کی تجارت' مزدور کی مزدوری' طالب علم کی شبانہ روز کاوش' غرضیکہ ہر جائز کام اگر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے عمل میں آئے تو عین جہاد ہے۔ نماز' روزہ اور زکوٰۃ کے بعد جہاد کو عبادت کا درجہ حاصل ہے۔ راہ خدا میں ہر قسم کے جہاد کو "جہاد فی سبیل اللہ" کہا جاتا ہے۔

اہمیت جہاد' قرآن کی روشنی میں : اسلام میں جہاد کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- جو لوگ ایمان لائے' اور جنہوں نے اللہ کی راہ میں گھربار چھوڑے' اور جہاد کیا' اور وہ لوگ جنہوں نے پناہ دی اور مدد کی یہی لوگ سچے مومن ہیں۔ (سورۃ الانفال)
2- مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائیں اور پھر اس میں متزلزل نہ ہوں' اور خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کریں' وہی سچے لوگ ہیں۔ (الحجرات)
3- اے ایمان والو! کیا تمہیں وہ سوداگری بتاؤں' جو تمہیں آخرت کے دردناک عذاب سے بچالے' اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے راہ خدا میں جہاد کرو۔

جہاد کی اقسام : جہاد کی مختلف اقسام ہیں' جن میں سے اہم اقسام کا تذکرہ درج ذیل ہے۔

1- جہاد بالنفس
2- جہاد بالقلم (فکری جہاد)
3- جہاد بالمال
4- داخلی جہاد
5- اقدامی جہاد
6- دفاعی جہاد
7- جہاد بالسیف

جہاد بالنفس : اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی خاطر خواہشات نفس کو قربان کر دینا اور حمایت حق

پیش آنے والی تمام تکالیف کو صبر سے برداشت کرنا "جہاد بالنفس" ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

1- بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لئے اپنے نفس اور اپنے خواہش سے جہاد کرو۔

2- مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔

3- بڑا جہاد بندہ کا اپنی ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔

صوفیاء کے ہاں "نفس" سے مراد : امام ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن قشیری' اپنے "رسالہ قشیریہ" میں فرماتے ہیں:

لغت میں "نفس الشی" سے مراد' شے کا وجود ہوتا ہے۔ اور صوفیاء کے ہاں مطلق "نفس" کہنے سے وجود مراد نہیں لیا جاتا۔ اور نہ ہی وہ ڈھانچا مراد لیا جاتا ہے' جو نفس کو موضوع ہے۔ نفس سے ان کی مراد بندے کے وہ اوصاف ہیں جن میں خامی پائی جاتی ہے اور وہ اخلاق و افعال مراد لئے جاتے ہیں' جو مذموم ہیں۔ بندے کے وہ اوصاف جن میں کوئی علت (خامی) پائی جائے' دو قسم کے ہیں۔

وہ اوصاف جن کو اپنے اختیار سے حاصل کیا جائے' جیسے معصیت اور احکام شرع کی مخالفت' دوسرے اخلاق مذمومہ' یہ قسم اپنی ذات میں مذموم ہوتی ہے۔ اگر بندہ کوشش کرے اور ان سے جنگ کرے تو متواتر عادت بنا لینے اور معاہدہ کے ذریعے اخلاق مذمومہ سے نجات پا لیتا ہے۔ نفس کے احکام میں سے پہلی قسم وہ ہے جس کو قطعی طور پر حرام قرار دے کر منع کیا گیا ہے' یا تنزیکی طور پر ان سے احتراز کرنے کو کہا گیا ہے۔

دوسری قسم میں ردی اور مذموم اخلاق ہیں۔ چنانچہ کبر' غضب' کینہ' حسد' سوء' خلق اور عدم تحمل وغیرہ اخلاق مذمومہ ہیں۔ احکام نفس میں سے سخت و مشکل ترین یہ ہے کہ ان میں سے کسی خلق کو انسان اچھا سمجھے' یا قابل قدر خیال کرے' اس قسم کے خیال کو "شرک خفی" میں شمار کیا گیا ہے۔

نفس کو ترک کرنے اور اس کے خلاف کرنے کے ذریعہ نفس کا علاج کرنا زیادہ کامل ہے' بمقابلہ اس کے کہ بھوک' پیاس اور دیگر مجاہدات کا' جن سے قوت گر جاتی ہے' نفس کو خوگر بنایا جائے' حالانکہ ان امور یعنی بھوک وغیرہ کا شمار بھی ترک نفس میں کیا گیا ہے۔

جہاد بالقلم : "جہاد بالقلم" یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو علم عطا فرمایا ہے' اس کو بروئے کار لاتے ہوئے معاشرتی برائیوں کے خلاف اور دین حق کی حمایت میں اپنی تحریروں کے ذریعہ جہاد کیا جائے۔ یہ جہاد علمائے کرام' ادباء و شعراء پر فرض ہے۔ چنانچہ دین الٰہی کی ترویج و اشاعت کے لئے تصنیف و تالیف کا سلسلہ ایک جہاد ہے۔ ایک صاحب قلم شخص معاشرہ میں پھیلی ہوئی بدعات اور برائیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانے کے لئے کوئی مضمون یا مقالہ تحریر کرتا ہے' تو یہ بھی "جہاد بالقلم" ہے۔ "جہاد بالقلم" ایک مصنف' ادیب یا عالم دین کی وفات کے بعد بھی کتابی صورت میں زندہ رہتا ہے اور آنے والی نسلیں اس سے رہنمائی حاصل کر سکتی ہیں۔ ایک حدیث میں اس عالم کو بخیل قرار دیا گیا ہے' جو علم رکھتے ہوئے' اسے دوسروں کو نہ سکھائے' یا دوسروں تک نہ پہنچائے۔

جہاد باللسان : اگر اپنے علم کو بروئے کار لاتے ہوئے' حمایت حق میں زبانی طور پر جہاد کیا جائے تو اسے جہاد باللسان کہتے ہیں۔ اسی قسم کے جہاد کو "فکری جہاد" کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ "جہاد باللسان" تبلیغ دین کا موثر ذریعہ ہے کیونکہ اس طرح دین کی بات پڑھے لکھے اور ان پڑھ دونوں طبقات تک پہنچائی جا سکتی ہے۔ جہاد باللسان علمائے دین' خصوصاً" مقررین حضرات کا فریضہ ہے۔ عمومی طور پر ہر وہ شخص جو دین کی کوئی بات جانتا ہے' اس کا فرض ہے کہ وہ یہ بات دوسروں تک پہنچائے۔

رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجتہ الوداع میں فرمایا :

"دیکھو! جو لوگ موجود ہیں وہ ان کو جو موجود نہیں ہیں' یہ باتیں پہنچا دیں' ممکن ہے وہ لوگ ان باتوں کی تم سے زیادہ حفاظت کرنے والے اور یاد رکھنے والے ہوں۔"

ایک حدیث میں جہاد باللسان کو دوسرا درجہ دیتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

"تم میں سے جو شخص بری بات دیکھے' اسے چاہئے کہ اپنے ہاتھ سے بدل دے' اور اگر اس کی استطاعت نہ ہو تو زبان سے روکے' اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ ہو تو کم از کم دل سے برا جانے' اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔"

جہاد بالمال : راہ خدا میں مال و دولت خرچ کرنا' "جہاد بالمال" ہے۔ جہاد بالمال عام حالات میں صدقہ و خیرات کی صورت میں ہو سکتا ہے' لیکن جب ملک پر کوئی مصیبت پیش آئے' یا کوئی دشمن حملہ کر دے تو ہر مسلمان' خصوصاً" اہل ثروت پر واجب ہے کہ وہ اپنے مال و دولت کے ذریعہ حکومت کی مدد کرے۔

قرآن مجید میں جہاد بالمال کی تاکید کی گئی ہے۔ "سورۃ الصف" میں فرمایا گیا ہے :

یا ایها الذین امنوا اهل ادلکم تجارة تنجیکم من عذاب الیم ○ تومنون باللہ و رسولہ و تجاهدون فی سبیل اللہ باموالکم و انفسکم ذالکم خیرلکم ان کنتم تعلمون○

ترجمہ : اے ایمان والو! میں تم کو ایسی سوداگری بتاؤں' جو تم کو ایک دردناک عذاب سے بچائے۔ ایمان لاؤ اللہ پر' اور اس کے رسول پر' اور لڑو اللہ کی راہ میں' اپنے مال سے اور اپنی جان سے' یہ تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم سمجھتے ہو۔

داخلی جہاد : اندرون ملک معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کے خلاف جہاد کرنا "داخلی جہاد" ہے۔ یہ جہاد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی صورت میں کیا جا سکتا ہے۔ اگر یہ جہاد تحریر و تصنیف کے ذریعے کیا جائے تو اسے "جہاد بالقلم" کہا جائے گا اور اگر زبان (تقاریر) کے ذریعہ کیا جائے تو یہ "جہاد باللسان" کہلائے گا۔

ہر مسلمان کا فرض ہے کہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں' مثلاً رشوت ستانی' سمگلنگ' ذخیرہ اندوزی' منشیات' بدعنوانی اور دیگر برائیوں کے خلاف جہاد کرے۔

اقدامی جہاد : غیر مسلم معاشرہ میں دین اسلام کی تبلیغ کرنا "اقدامی جہاد" کہلاتا ہے۔ بالفاظ دیگر

اگر دین کی بقاء اور ارتقاء کے راستہ میں غیر مسلم رکاوٹ بنیں تو اس رکاوٹ کو دور کرنے کے لئے جو اقدامات کئے جائیں گے، وہ "اقدامی جہاد" کہلائیں گے۔

دائمی جہاد : تحفظ و فروغ اسلام کی خاطر ہمہ وقت کوشاں رہنا "دائمی جہاد" ہے۔ ایک مسلمان پیدا ہونے سے لے کر مرنے تک جہاد میں مصروف رہتا ہے، کیونکہ حمایت دین ہر مسلمان پر فرض ہے اور حمایت دین میں اٹھایا جانے والا ہر قدم جہاد ہے۔

جہاد بالسیف : اگر دشمن دین کی طرف سے مسلمانوں کی زندگی اجیرن بنا دی جائے، یا کسی غیر اسلامی ملک میں مسلمانوں کو زبردستی اسلام ترک کرنے پر مجبور کر دیا جائے، یا مذہبی فرائض کی ادائیگی میں رکاوٹ ڈالی جائے، یا غیر مسلموں کی طرف سے اسلامی ریاست پر حملہ کر دیا جائے تو اس کے دفاع میں دفاعی یا مسلح جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اس صورت میں جان کے ساتھ جہاد کرنا پڑتا ہے اور دشمنوں سے جنگ لڑنا پڑتی ہے۔ اسے "جہاد بالسیف" کہتے ہیں۔ عربی زبان میں جنگ کو "حرب" یا "قتال" کہتے ہیں۔

"جہاد" اور "قتال" میں فرق : قرآن مجید میں "جہاد فی سبیل اللہ" اور "قتال فی سبیل اللہ" کے الفاظ الگ الگ استعمال کئے گئے ہیں اور دونوں الفاظ جدا جدا معانی میں استعمال ہوئے ہیں۔ جہاد فی سبیل اللہ کا مطلب خدا تعالیٰ کی راہ میں زبان، قلم اور مال سے سعی و کاوش کرنا ہے، جبکہ "قتال فی سبیل اللہ" سے مراد ہے، خدا تعالیٰ کی راہ میں دشمنان دین سے لڑائی یا جنگ کرنا۔ جہاد پوری زندگی کے لئے جاری رہتا ہے جبکہ قتال فی سبیل دشمن کا خطرہ لاحق رہنے تک جاری رہتا ہے۔

"حرب" اور "قتال فی سبیل اللہ" میں فرق : حرب (جنگ) دنیاوی امور کے لئے ہوتی ہے جس کا مقصد کسی دوسرے ملک پر قبضہ کرنا ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں جنگ مال غنیمت حاصل کرنے کے لئے بھی لڑی جاتی ہے، لیکن قتال فی سبیل اللہ کا مقصد صرف راہ خدا میں دشمنان دین کا دفاع کرنا ہوتا ہے، اس کی غرض و غایت مال غنیمت حاصل کرنا نہیں ہوتی۔

فرضیت قتال فی سبیل اللہ : آنحضرت ﷺ نے بعثت کے بعد جب اسلام کی تبلیغ شروع کی تو قریش مکہ آپ کے خلاف ہو گئے اور آپ کو طرح طرح کی تکلیفیں دینے لگے۔ جو لوگ آپ پر ایمان لاتے ان پر بھی مظالم ڈھائے جاتے۔ بالآخر آپ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ پہنچے اور یہاں اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی۔ ابھی تک مسلمان کمزور تھے اور ان کی تعداد زیادہ نہ تھی۔ مشرکین مکہ نے یہاں بھی آپ کا پیچھا نہ چھوڑا، اور مدینہ پر حملہ آور ہوتے رہے۔

ابھی تک مسلمانوں نے پوری طرح قوت حاصل نہ کی تھی، اس لئے ان کو لڑائی کی اجازت نہ دی گئی تھی، اسی دوران ایک جگہ مسلمان جمع تھے، کہنے لگے کہ اگر ہم کو معلوم ہو جائے کہ کون سا کام اللہ کو زیادہ پسند ہے، تو ہم وہی اختیار کریں۔ اب مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے تھے۔ چنانچہ ان حالات میں سورۃ الصف نازل ہوئی، جس میں فرمایا گیا:

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص

ترجمہ : اللہ ان لوگوں کو چاہتا ہے جو اس کی راہ میں قتل کرتے (لڑتے) ہیں، قطار باندھ کر، گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

گویا اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ان لوگوں سے محبت ہے جو اللہ کی راہ میں اس کے دشمنوں کے مقابلہ پر ایک آہنی دیوار کی طرح ڈٹ جاتے ہیں' اور میدان جنگ میں اس شان سے صف آرائی کرتے ہیں کہ گویا سب مل کر ایک مضبوط دیوار ہیں' جس میں سیسہ پلا دیا گیا ہے' اور جس میں کسی جگہ کوئی رخنہ نہیں پڑ سکتا۔

جب تک قتال نازل ہوا تو بعضوں نے یہ بھی کہا:

ربنا لم کتبت علینا القتال لولا اخرتنا

سورۃ الصف کی ابتدا میں کہا گیا ہے کہ زبان سے زیادہ دعوے مت کرو' بلکہ خدا کی راہ میں قربانی پیش کرو' جس سے اعلیٰ کامیابی نصیب ہو۔

اسی سورہ مبارکہ میں فرمایا گیا ہے:

تومنون باللہ ورسولہ وتجاھدون فی سبیل اللہ باموالکم وانفسکم خیرلکم ان کنتم تعلمون

ترجمہ : ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر' لڑو اللہ کی راہ میں اپنے مال سے اور اپنی جان سے' بہتر ہے تمہارے حق میں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔

تفسیر ابن جریر میں مذکور ہے کہ قتل سے متعلق سب سے پہلے آیت نازل ہوئی' وہ یہ ہے:

قاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم

(خدا کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو' جو تم سے لڑتے ہیں)

"مواہب لدنیہ" اور "زرقانی" میں لکھا ہے کہ خدا نے 12 صفر 2 ہجری میں جہاد کی اجازت دی اور سب سے پہلے قتال کی جو آیت نازل ہوئی' وہ یہ ہے:

اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر

(جن سے لڑائی کی جاتی ہے (یعنی مسلمانوں سے) ان کو بھی لڑنے کی اجازت دی جاتی ہے' کیونکہ ان پر ظلم کیا جا رہا ہے' اور خدا ان کی مدد پر یقیناً" قادر ہے۔)

ابتدا میں مسلمانوں نے چھوٹی چھوٹی مہمیں سر کیں۔ 2 ہجری میں آنحضرت ﷺ نے ابوا کی مہم میں شرکت فرمائی۔ ارباب سیر نے تین مہموں کا ذکر کیا ہے جن کو "سریہ" کہتے ہیں' مثلاً سریہ حمزہ' سریہ عبیدہ بن حارث اور سریہ سعد بن وقاص۔ ان مہمات میں کوئی کشت خون نہیں ہوا۔ رمضان 2 ہجری میں غزوہ بدر کا واقعہ پیش آیا۔ یہ اسلام اور مشرکین مکہ کے مابین پہلی باقاعدہ جنگ تھی۔

مفسرین کا خیال ہے کہ سورۃ آل عمران کی یہ آیت اسی جنگ کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

قدکان لکم فی فئتین التقتا فئتہ تقاتل فی سبیل اللہ واخری
کافرۃ

(جو لوگ باہم لڑے' ان میں تمہارے لئے عبرت کی نشانیاں ہیں' ایک خدا
کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا منکر خدا تھا۔)

قصہ مختصر یہ کہ جب مشرکوں اور کافروں نے مسلمانوں کا ناک میں دم کر دیا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں جنگ کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے ساتھ ہی جہاد بالقتال فرض ہو گیا۔

قرآن مجید میں جہاد بالقتال کے جواز میں کچھ اور ذیل آیات بھی پیش کی جا سکتی ہیں' جن کا ترجمہ درج ذیل ہے:

1- سورۃ الحج میں فرمایا گیا ہے:
مسلمانو! تم پر لڑائی فرض کر دی گئی ہے' اگرچہ وہ تم کو ناگوار محسوس ہو رہی ہے لیکن ممکن ہے تم ایک چیز کو ناگوار محسوس کرو اور فی الواقع وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔

2- سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:
"اور ان سے لڑو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لئے ہو جائے۔"

3- سورۃ توبہ میں فرمایا گیا ہے:
"تم سب مل کر مشرکوں سے لڑو' جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں۔"

4- سورۃ الصف میں فرمایا گیا ہے:
یقیناً" اللہ ان لوگوں سے محبت رکھتا ہے جو اس کی راہ میں صفیں باندھ کر لڑتے ہیں' گویا سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔

جہاد بالسیف کے اجر و ثواب میں رسول ﷺ نے فرمایا:

1- ایک شب و روز سرحدوں کی نگرانی' ایک مہینے کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بہتر ہے۔ (مسلم)

2- ہر مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے' لیکن اس شخص کا معاملہ اس سے مختلف ہے' جو اللہ کی راہ پر میں جنگی پڑاؤ ڈالنے والا ہوتا ہے' کیونکہ اس کا یہ عمل بڑھتا رہتا ہے۔ (ترمذی)

3- اللہ تعالیٰ ایک تیر کے طفیل تین آدمیوں کو جنت میں داخل کرتا ہے' ایک وہ شخص جو ثواب کی نیت سے یہ تیر بناتا ہے' دوسرا وہ جو اسے دشمن پر چلاتا ہے' اور تیسرا وہ جو یہ تیر اسے مہیا کرتا ہے۔ (ابو داؤد)

کیا قتل فی سبیل اللہ فرض ہے؟ : اس میں شک نہیں کہ قتل فی سبیل اللہ فرض ہے' صرف بیمار اور بوڑھے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اگر دشمن اسلامی ملک پر حملہ کر دے تو اس ملک کے مسلمانوں کے لئے جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص شرعی عذر کے بغیر اس سے گریز کرے تو اس پر گناہ واجب ہے۔ اگر کسی اسلامی ملک پر کوئی دشمن حملہ کر دے تو دوسرے اسلامی ملک کے لئے اس کی مدد کرنا فرض کفایہ ہے۔

بہرحال سورۃ الحج میں واضح طور پر کہہ دیا گیا ہے کہ:

"اے مسلمانوں تم پر لڑائی فرض کر دی گئی ہے۔"

فرمان نبوی ہے:

"تم پر جہاد فرض ہے' ہر امیر کے تحت' خواہ وہ نیک ہو یا بد۔" (ابو داؤد)

قتال فی سبیل اللہ کی شرائط : قتال فی سبیل (جہاد بالسیف) میں مندرجہ ذیل امور کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

1- جنگ میں پہل نہ کی جائے۔
2- جنگ سے پہلے دشمنان دین کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی جائے۔
3- اگر کسی قوم سے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہو' اور وہ قوم معاہدہ کی خلاف ورزی کرے تو اسے مطلع کر دیا جائے کہ ایسا معاہدہ کالعدم ہو چکا ہے۔
4- اگر دشمن ہتھیار ڈال دے تو جنگ بند کر دی جائے۔
5- جن لوگوں نے قتال میں حصہ نہ لیا ہو' انہیں جنگ میں قتل نہ کیا جائے۔
6- کفار و مشرکین کے لئے قتل کا حکم ہے' جیسا کہ سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:
"جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں' اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے ہیں کہ فساد برپا کریں' ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کیے جائیں' یا سولی چڑھائے جائیں' یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ دیئے جائیں' یا وہ جلا وطن کر دیئے جائیں۔"
7- اگر دشمن شکست تسلیم کر کے دنیا دینا قبول کر لے تو جنگ بند کی جا سکتی ہے۔
8- بچوں' بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کیا جائے۔
9- دشمنوں کو آگ میں جلانا منع ہے۔
10- دشمن کی فصلیں جلانا منع ہے اور پھلدار درخت کاٹنے کی بھی ممانعت ہے۔
11- لاشوں کو مسخ نہ کیا جائے۔
12- دشمن کے سفیر کو دوران سفارت قتل نہ کیا جائے۔
13- عورتوں کی بے حرمتی نہ کی جائے۔
14- دشمن پر بے خبری میں حملہ نہ کیا جائے' تاہم مصلحت کے تحت شب خون مارنا جائز ہے۔

غازی/شہید : جہاد بالسیف میں فتح حاصل کرنے والا مجاہد "غازی" کہلاتا ہے' اور اپنی جان قربان کر دینے والا "شہید" کے نام سے مقام حاصل کرتا ہے۔ شہید کا مرتبہ اتنا بلند ہے کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

"اللہ تعالیٰ کی راہ میں قتل ہو جانے والوں کو مردہ نہ کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں۔"

جدید سیاسی افکار

جمہوریت (DEMOCRACY)

سوال : جمہوریت کی تعریف کیجئے' جمہوریت کی اقسام' بنیادی اصول و خوبیاں و خامیاں بیان کیجئے۔ نیز مغربی طرز جمہوریت اور اسلامی جمہوریت (اسلامی نظام حکومت) میں فرق واضح کیجئے؟

جواب : جمہوریت کی تعریف :

مختلف مفکرین کے نزدیک جمہوریت کی تعریف حسب ذیل ہے:

1- سیلی (Seeley) کے نزدیک :
"جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں زیادہ عوام شریک ہوں۔"

2- ابراہیم لنکن کے نزدیک :
"جمہوریت عوام کی حکومت' عوام کے ذریعہ' عوام کی فلاح و بہبود کے لئے قائم ہوتی ہے۔"

3- لارڈ برائس (Bryce) کے کہتا ہے کہ :
"جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں حکمران طبقہ قوم کا مقابلتاً" اکثریتی حصہ ہوتا ہے۔"

4- بینتھم (Bantham) کے نزدیک :
"جمہوریت وہ طرز حکومت ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود مد نظر رکھی جاتی ہے۔"

5- بعض مفکرین کا خیال ہے کہ :
"جمہوریت وہ طرز حکومت ہے' جس میں ہر شخص شریک ہو۔"

6- بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ :
"جمہوریت ایسا طرز حکومت ہے جس میں آبادی کا اکثریتی حصہ حکومت میں شرکت اور حاکمانہ قوت کے استعمال کا حق رکھتا ہے۔"

7- بعض کا کہنا ہے کہ :
"جمہوریت اس حکومت کو کہتے ہیں جس میں مستند شہریوں کی اکثریت کی رائے حکمرانی کرتی ہے۔"

مختصر یہ کہ "جمہوریت" سے مراد وہ نظام حکومت ہے جس میں عوام کے چنے ہوئے نمائندوں کی اکثریت رکھنے والی سیاسی جماعت نظام حکومت چلاتی ہے اور عوام کے سامنے جوابدہ

ہوتی ہے۔

انگریزی میں "جمہوریت" کا مترادف "ڈیموکریسی" (Democracy) ہے' جو یونانی زبان کا لفظ ہے۔

جمہوریت کی اقسام : جمہوریت کی دو قسمیں ہیں:

1- بلا واسطہ جمہوریت 2- بالواسطہ جمہوریت

بلا واسطہ جمہوریت (Direct Democracy) : اس قسم کی جمہوریت کے تمام شہری براہ راست نظم و نسق اور انتظامی امور میں حصہ دار ہوتے ہیں۔ اس میں تمام باشندگان ریاست کا قانون وضع کرنے' پالیسی مرتب کرنے اور افسروں کے تقرر کے لئے بہ نفس نفیس حاضر ہونا ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں رائے عامہ معلوم کرنے کے لئے مندرجہ ذیل طریقے اپنائے جاتے ہیں۔

(الف) ریفرنڈم (Referendum) : ریفرنڈم میں کسی بھی مسودہ قانون کو' یا کسی تقرری یا قرارداد وغیرہ کو عوامی رائے کے لئے مشتہر کیا جاتا ہے اور عوام کی رائے طلب کی جاتی ہے۔ اگر عوام اسے قبول کر لیں تو قابل عمل اور اگر مسترد کر دیں تو ناقابل عمل قرار دے دیا جاتا ہے۔

دور جدید میں پاکستان میں اس کی مثالیں جنرل محمد ایوب خاں اور جنرل ضیاء الحق کا بذریعہ ریفرنڈم صدر مملکت مقرر ہونا ہیں۔

(ب) حق ہدایت (Initative) : سابقہ طریقہ (ریفرنڈم) کی طرح یہ طریقہ بھی بالواسطہ طرز حکومت میں بنایا جاتا ہے۔ اس کی رو سے عوام کی ایک مخصوص تعداد اگر حکومت سے کسی قانون کو بنانے کی سفارش کرے تو وہ قانون ساز اسمبلی یا حکام کے ذریعہ قانون بنوا کر ریفرنڈم کے ذریعہ سے منظور کر سکتی ہے۔

(ج) حق باز طلبی (Recall) : اس طریقے کے ذریعہ عوام کسی نااہل افسر کو واپس بلا سکتے ہیں یعنی اسے سبکدوش کر سکتے ہیں۔

بالواسطہ جمہوریت (Indirect Democracy) : بالواسطہ جمہوریت میں عوام اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں' جو کاروبار حکومت میں حصہ لیتے ہیں اور قانون سازی کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں اسی قسم کی جمہوریت مروج ہے۔

بلحاظ دیگر : برائس نے چار قسم کی جمہوریتوں کا ذکر کیا ہے:

(1) القابی بادشاہت : ایسی ریاست جہاں بادشاہ کا وجود تو پایا جائے لیکن وہ برائے نام حکمران ہو' "القابی بادشاہت" کہلاتی ہے۔ اس قسم کی ریاست میں جمہوریت مروج ہوتی ہے۔ حقیقی اختیارات پارلیمان کے پاس ہوتے ہیں اور پارلیمنٹ شہریوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ اپنے اختیارات استعمال کرتے وقت عوامی خواہشات کو مدنظر رکھتی ہے۔

(2) جمہوریہ : اس قسم کی ریاست میں ریاست کا سربراہ لوگوں کا منتخب کردہ صدر ہوتا ہے' جس کے عہدہ کی میعاد مقرر ہوتی ہے۔ قومی و صوبائی اسمبلیاں بھی عوام ہی کے منتخب کردہ نمائندوں پر مشتمل ہوتی ہے۔

(3) استوار آئینی حکومت : ایسی ریاست جہاں ملک کا بنیادی قانون یعنی آئین یا دستور استوار ہوتا ہے اور اس میں باسانی کوئی ترمیم و تبدل نہیں ہو سکتا' بلکہ ایک خاص طریقے پر عمل کر کے بڑی مشکل سے اسے بدلا جا سکتا ہے' استوار آئینی حکومت کہلاتی ہے۔

(4) لچکدار آئینی حکومت : یہ ایسی حکومت ہے جہاں آئین استوار ہونے کے بجائے لچکدار ہوتا ہے اور اسے عام قوانین کی طرح مجرد پارلیمانی اکثریت تبدیل کر سکتی ہے۔

مندرجہ بالا چاروں اقسام کی بنیاد عوامی اقتدار اعلیٰ کے اصول پر قائم ہوتی ہے۔ لہذا عوام پر ٹیکس عائد کرنے اور محصولات کی رقم کو عوام کی بہتری کے لئے خرچ کرنے کا اختیار صرف لوگوں کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

جمہوریت کے بنیادی اصول : نظریہ جمہوریت کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

(1) آزادی اور مساوات : جمہوریت کے تمام افراد کی مساوی آزادی' خوشی اور اس کے لئے مناسب ماحول پیدا کرنے کی خواہاں ہے۔ جمہوریت میں مساوات سے یہ مراد نہیں کہ جمہوریت استعمال کی اشیاء اور جائیداد کو شہریوں میں مساوی طور پر تقسیم کرنے کا نظریہ رکھتی ہے' بلکہ مساوات سے مراد مواقع اور حقوق کے بجائے مساوی حقوق کے اصول پر عمل کرتی ہے۔ سیاسی طور پر جمہوریت "ایک کس ووٹ" پر عمل کرانا چاہتی ہے۔ عمرانی لحاظ سے جمہوریت معاشری انصاف اور مساوات کا ماحول پیدا کرنے کی خواہاں ہے تاکہ طبقاتی اختلافات شدت اختیار نہ کریں۔

(2) ریاست' مقصد کے حصول کا ذریعہ : جمہوریت میں ریاست کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ افراد کے لئے بہتر زندگی گذارنے کے مواقع پیدا کئے جائیں اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے مناسب ماحول فراہم کیا جائے۔ اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے جمہوری حکومت پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ عوام کو وہ تمام بنیادی حقوق فراہم کرے جو بہتر زندگی گذارنے کے لئے ضروری ہوں۔

(3) عام انسان پر اعتماد : جمہوریت کا ایک بنیادی اصول یہ بھی ہے کہ وہ عام انسان کے فہم و ادراک' قوت فیصلہ اور معیار محبت پر مکمل اعتماد کرتی ہے۔ جمہوریت کی بنیاد اس اصول پر قائم ہے کہ تمام انسانوں کی ضروریات اور ان کے حقوق مساوی ہوتے ہیں۔ جمہوری معاشرہ کے افراد آزاد' مساوی ذہن اور راعمل شہری ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک آزادانہ طور پر اپنی مرضی کے مطابق زندگی کا راستہ تلاش کرتا ہے اور دوسرے افراد کو ان کی اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ ایسا ماحول پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے جس میں ہر فرد اپنی علیحدہ شخصیت کو برقرار رکھ سکے اور اپنے ضمیر کے مطابق زندگی بسر کر سکے' اپنی خدمت انفرادیت اور نظریات کے ذریعے اپنے معاشرہ کو فائدہ پہنچا سکے

جمہوری نظام میں ہر شخص سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتے ہوئے معاشری بھلائی میں شریک ہو۔ جمہوریت کا تقاضا یہ بھی ہے کہ سیاسی اختیارات کے ذریعے معاشرہ کو فائدہ پہنچا سکے۔

(4) **جمہوریت میں ہر فرد کا حصہ :** جمہوری نظام میں ریاست کا ہر فرد حصہ دار ہوتا ہے اور یہ نظام باہمی مشورت سے چلایا جاتا ہے۔ اس میں شریک ہر فرد آزادی کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کر سکتا ہے اور پرامن طریقوں سے دوسروں کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کر سکتا ہے۔ چنانچہ ہر جمہوری ریاست شہری کو اظہار رائے' انجمن سازی اور تبادلہ خیال جیسے حقوق دیتی ہے۔ جمہوری نظام میں ہر شہری معاشرے کا جزو لاینفک ہوتا ہے جس کی جگہ اور کوئی پر نہیں کر سکتا۔

(5) **اوسط شہری کا باشعور ہونا :** جمہوریت کا انحصار اس قیاس پر ہے کہ اوسط شہری سیاسی سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ اگرچہ وہ ہر قانونی اور سیاسی مسئلہ کا ماہر نہیں ہوتا لیکن وہ ان بڑے بڑے معاملات اور ضروری امور سے پوری طرح آگاہ ہوتا ہے، جن کی روشنی میں وہ حکومت کی پالیسی پروگرام کو جانچ سکتا ہے۔ جمہوری نظریہ کا اس بات پر ایمان ہے کہ اوسط درجے کا شہری اتنی سیاسی دانائی اور ذہانت کا حامل ہے جو اسے سیاسی اقتدار کے لئے ٹھیک قسم کے افراد چننے کے قابل بنائے۔ اس طرح جمہوریت ریاست کے اختیارات اور انفرادی آزادی میں توازن قائم کرتی ہے۔

(6) **امن :** جمہوریت کا مزاج امن پسند ہے۔ جمہوریت اس بات کی قائل نہیں کہ طاقتور قومیں کمزور قوموں کو اپنا غلام بنالیں۔ جمہوریت جنگ اور ہر قسم کے تشدد کی مخالف ہے۔ جمہوری اقدار کی سربلندی کے لئے لازم ہے کہ ملک کے اندر بین الاقوامی سطح پر امن اور آزادی کا ماحول پایا جائے۔

جمہوریت کی خوبیاں : جمہوریت میں حسب ذیل خوبیاں پائی جاتی ہیں :

1- جمہوریت لوگوں کی اپنی حکومت ہوتی ہے۔
2- جمہوریت میں امیر و غریب سب برابر ہوتے ہیں۔
3- جمہوریت میں ہر شہری کو ترقی کرنے کے مواقع ملتے ہیں۔
4- جمہوری حکومت کو عوام کی تائید حاصل ہوتی ہے۔
5- اگر حکومت غلط کام کرے تو عوام اسے تبدیل کرنے کا حق رکھتے ہیں۔
6- جمہوری حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہوتی ہے' اس لئے کوئی جابرانہ اقدام کرنے سے باز رہتی ہے۔
7- حکومت کسی خاص طبقہ یا خاندان کی نہیں رہتی بلکہ عوام کی صوابدید پر اس میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔
8- جمہوری حکومت میں حزب مخالف حکومت پر تنقید کرتی رہتی ہے' اس لئے حکومت کوئی غلط پالیسی نہیں بناتی اور تنقید کا نشانہ بننے کی کوشش کرتی ہے۔

9- حکومت محدود وقت کے لئے منتخب ہوتی ہے اور پھر اپنی مدت پوری کر کے ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے حکومت کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس عرصہ میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے زیادہ سے زیادہ کام کرے تاکہ آئندہ انتخابات میں کامیابی کے مواقع حاصل ہو سکیں۔

10- جمہوری حکومت میں انتخابات منعقد ہوتے رہتے ہیں' جس سے تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ انتخابات کے موقع پر لیڈر اپنی اپنی پارٹی کے منشور پیش کرتے ہیں۔ عوام کو جس پارٹی کے منشور میں اپنا مفاد نظر آتا ہے' اسی کی حمایت کر کے اسے برسر اقتدار لانے کی کوشش کرتے ہیں۔

11- جمہوریت میں جبر و خوف کا کم سے کم امکان ہوتا ہے۔

12- جمہوری نظام میں اختیارات اوپر سے نازل نہیں ہوتے بلکہ عوام سے حاصل کئے جاتے ہیں۔ اس میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ جو مقننہ کے ذریعے اختیارات دے بھی سکتے ہیں اور واپس بھی لے سکتے ہیں۔ تمام ارباب حل و عقد عوام کے سامنے جوابدہ ہوتے ہیں' اس لئے وہ عوام کو زیدہ سے زیادہ خوش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

13- جمہوریت کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ لوگوں میں اخلاقی اقدار کو فروغ حاصل ہوتا ہے۔ بقول جان سٹوارٹ جمہوریت کی دوسری طرز حکومت کے مقابلہ میں اعلیٰ ترقوی کردار پیدا کرتی ہے۔

14- جمہوریت انسانی فطرت کے روشن پہلو کو اہمیت دیتی ہے۔ جمہوریت کو اس سے انکار نہیں کہ انسانی فطرت میں کچھ خامیاں اور کمزوریاں پائی جاتی ہیں' لیکن اس اعتراف کے ساتھ ساتھ جمہوریت کو اس کی اچھائیوں پر مکمل بھروسا ہے۔

15- جمہوریت ہر طرز حکومت کے مقابلہ میں زیادہ پائیدار ثابت ہوتی ہے' کیونکہ اس میں عوامی شرکت' عوامی ذمہ داری اور عوامی محاسبہ کے عناصر شامل ہیں۔ لوگ محسوس کرتے ہیں کہ حکومت ان کی اپنی ہے جس کو ان کے نمائندے چلاتے ہیں اور وہ نمائندے ان کے سامنے جوابدہ ہیں۔ عوام اپنی حکومت پر فخر محسوس کرتے ہیں اور خطرات میں اپنی ریاست کی مدافعت میں جان کی بازی لگانے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

16- جمہوریت وسیع پیمانے پر لوگوں کی تعلیم و تربیت کی ضامن ہے۔ یہ شہری کی ذہنی اور روحانی صلاحیتوں میں ترقی کا باعث بنتی ہیں۔

جمہوریت پر اعتراضات : جمہوریت پر مندرجہ ذیل اعتراضات کئے جاتے ہیں۔

1- افلاطون کے نزدیک جمہوریت آئینی حکومت کی بگڑی ہوئی اور ناقص شکل ہے۔ اس طرح ارسطو جمہوریت کو غریب لوگوں کی خراب حکومت قرار دیتا ہے۔

2- مینکن کا کہنا ہے کہ جمہوری نظام میں مفلس ترین اور نااہل ترین لوگوں کی حکومت قائم ہوتی ہے' اس لئے یہ طرز حکومت ناقص اور آزادی کے منافی ہے۔ اسی طرح کارلائل کا کہنا ہے کہ ہر دس انسانوں میں سے اگر ایک دانا ہے تو باقی نو بے وقوف ہیں اور جمہوریت بے وقوفوں کی حکومت ہے' کیونکہ عوام ناخواندہ اور تعلیم سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ بعضوں نے جمہوریت کو نادانوں' جاہلوں' بے وقوفوں اور مویشیوں کی حکومت قرار

دیا ہے۔

3- علامہ اقبال فرماتے ہیں:

جمہوریت وہ طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

مطلب یہ کہ جمہوری نظام میں افراد کی اہلیت کو نہیں دیکھا جاتا۔ ایک عالم و فاضل کے مقابلہ میں ایک جاہل زیادہ کامیاب رہتا ہے۔ اس میں صرف ووٹوں کی گنتی ہوتی ہے جس کے ووٹ زیادہ ہوں' وہی برسر اقتدار آ جاتا ہے۔ ووٹر کی کوئی اہلیت مقرر نہیں ہوتی۔ عوام ناخواندہ ہونے کی وجہ سے چالباز' مکار اور ہوشیار قسم کے امیدواروں کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں' اس طرح بددیانت اور مکار قسم کے لوگ کامیاب ہو جاتے ہیں۔

4- آسوالڈ شپنگلر کے نزدیک جمہوری (عوامی) حکومت ناممکنات میں سے ہے' کیونکہ اوسط درجے کا انسان عقل سے کام نہیں لیتا اور وہ اجتماعی مسائل کو نہ سمجھ پاتا ہے اور نہ ان میں دلچسپی لیتا ہے۔ انتخابات چند چالاک انسانوں کا دھوکا ہوتے ہیں۔ اگرچہ نظریاتی طور پر عوام کو اقتدار اعلیٰ کا حامل سمجھا جاتا ہے لیکن عملی طور پر اقتدار چند بڑے زمینداروں' جاگیرداروں' تاجروں' صنعت کاروں اور چالاک سیاستدانوں کے پاس ہوتا ہے۔

5- پروفیسر لاسکی عوام کو جمہوریت کا اہل قرار نہیں دیتا۔ اس کا کہنا ہے کہ جنگ یا انقلاب جیسے بعض اہم مواقع کے علاوہ افراد کی کثیر تعداد اپنی نجی زندگی میں مصروف رہتی ہے۔ انہیں اطمینان ہوتا ہے کہ پالیسی اور خیالات کی رہنمائی کرنے والے لوگ کہیں موجود ہیں۔ جب تک زندگی معمول کے مطابق رہتی ہے' لوگ تماشائیوں کی طرح اجتماعی معاملات کا ڈراما دیکھتے رہتے ہیں' جن میں ان کا اپنا کوئی کردار نہیں ہوتا۔

6- جمہوریت کے خلاف یہ دلیل بھی دی جاتی ہے کہ عوام میں شہرت کے اعلیٰ خصائص نہیں پائے جاتے' جو جمہوری نظام کی کامیابی کے لئے نہایت ضروری ہیں۔ عام لوگ شہرت کے اصولوں سے نا آشنا ہوتے ہیں یا ان اصولوں پر عمل نہیں کرتے۔ وہ مسائل سے توجہی کا برتاؤ کرتے ہیں۔ ان پر خود پسندی' خود غرضی اور کند ذہنی کا غلبہ ہوتا ہے۔ وہ اجتماعی مفادات پر ذاتی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری ریاست میں رشوت' لالچ' خیانت اور اقربا پروری جیسی بیماری پھیل جاتی ہے' جن کی وجہ سے جمہوریت کا حسین خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو پاتا۔

7- بعضوں کے نزدیک جمہوریت انفرادی آزادی کو ختم کر دیتی ہے۔ میکی کا کہنا ہے کہ جمہوریت نہ تو اچھی حکومت کی ضامن ہے اور نہ ہی زیادہ آزادی فراہم کرتی ہے۔ جمہوریت کے بعض نمایاں رجحانات آزادی کے بالکل مخالف ہیں۔ مِل اور میکی کا خیال ہے کہ عوام الناس قدامت پرستی' تنگ نظری اور حسد کا شکار ہوتے ہیں۔ وہ رسم و رواج' تعصبات اور غور و فکر کے فرسودہ انداز میں الجھے رہتے ہیں' لہٰذا انہیں ترقی اور نئے رجحانات پر اعتماد نہیں ہوتا۔ جمہوریت جب ایسے لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار دے دیتی ہے تو ان لوگوں کی آزادی اور ترقی پسند رجحانات کا خاتمہ ہو جاتا ہے' جنہیں فطرت نے اعلیٰ خصائص سے نوازا ہے۔

8- سرنہری، مین اور میکی نے جمہوری نظام کو یہ کہہ کر بھی ہدف تنقید بنایا ہے کہ اس میں علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کی ترقی رک جاتی ہے۔ نطشے کا کہنا ہے کہ عوام الناس کسی کی برتری اور انفرادیت کو برداشت نہیں کرتے' اس لئے جمہوریت یا اقلیتوں کو خود ظلم و ستم کا نشانہ بناتی ہے یا ایسے افراد کی سرپرستی اور غلبہ قبول کر لیتی ہے جو آزادی اور کامیابی کے خلاف حاسدانہ جذبات کا مظہر ہوتے ہیں۔

9- اشتراکیوں نے جمہوریت کے خلاف یہ دلیل پیش کی ہے کہ جمہوری نظام سرمایہ دارانہ اور نو آبادیاتی نظام کو تقویت دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جمہوری ممالک میں جاگیرداروں' صنعتکاروں' تاجروں اور سرمایہ کاروں کو برتری حاصل ہوتی ہے۔ وہ مفلس طبقات کو استحصال کرتے ہیں اور یوں دولت مند طبقہ محنت کش کو غلامی میں جکڑ لیتا ہے۔

عملی خامیاں : عملی طور پر جمہوریت میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی جاتی ہیں :

1- جمہوری حکومت بنانے کے لئے ملک کے ہر شخص سے ووٹ لیا جاتا ہے۔ ہر شخص خواندہ' ذی شعور اور صاحب الرائے نہیں ہوتا۔ ان پڑھوں' بیوقوفوں اور جاہلوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے' اس لئے جاہلوں کے نمائندے کامیاب ہو جاتے ہیں۔

2- امیر' نواب' چودھری' وڈیرے اور جاگیردار لوگوں کو ڈرا دھمکا کر ان سے ووٹ حاصل کر لیتے ہیں' کیونکہ عوام غریب' کسان اور مزدور ہونے کی وجہ سے ان کے زیر اثر ہوتے ہیں' اس لئے جاگیردار اور سرمایہ دار طبقہ برسراقتدار آ جاتا ہے۔

3- انتخابات پر اتنے اخراجات ہوتے ہیں کہ کوئی غریب آدمی الیکشن میں حصہ نہیں لے سکتا۔ اس طرح باصلاحیت اور ذہین لوگ اپنی غربت کے باعث پیچھے رہ جاتے ہیں۔

4- جیتنے اور ہارنے والے امیدواروں اور ان کے ووٹروں میں نزاع پیدا ہو جاتا ہے اور الیکشن کی وجہ سے لوگوں میں دشمنیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ لوگ مختلف طبقات میں بٹ جاتے ہیں اور گروہ بندی معاشرہ سے اخوت و محبت کے جذبات ختم کر دیتی ہے۔

5- نیک' متقی اور پرہیز گار لوگوں کے مقابلہ میں جاہل' بدخو' شریر اور مذہب سے سرکشی کرنے والے لوگ غالب آ جاتے ہیں' کیونکہ غلط ہتھکنڈے استعمال کرنے میں انہیں کوئی عار نہیں ہوتی' جبکہ متقی قسم کے امیدوار غلط اور ناجائز ذرائع استعمال کرنے سے پرہیز کرتے ہیں۔

6- عوام کو ووٹ کی قدروقیمت کا صحیح احساس نہیں ہوتا' اس لئے جو بھی انہیں بہلا پھسلا لے وہ اسی کو ووٹ دے دیتے ہیں۔

7- انتخابات میں حصہ لینے والے امیدوار اپنے حلقہ کے لوگوں کو خوش کرنے کے لئے طرح طرح دلکش خواب دکھاتے ہیں اور کامیاب ہونے کے بعد اپنے ووٹروں ہی کے مسائل حل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔

8- جاگیردار اور سرمایہ دار قسم کے لوگ اپنے مفادات حاصل کرنے کے لئے الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کرتے ہیں اور ان پر بے انتہا دولت صرف کرتے ہیں۔ اس طرح یہ امیدوار کامیاب ہو کر اپنے ہی آقاؤں کے مفاد کے لئے کام کرتے ہیں اور ان کے مفاد

میں قانون منظور کرواتے ہیں۔

9- جمہوری حکومت ایک پارٹی کی حکومت ہوتی ہے۔ چونکہ شخصی مجموعہ بھی شخص واحد کے حکم میں آتا ہے' اس لئے جمہوری حکومت کو بھی ایک قسم کی شخصی حکومت کہا جا سکتا ہے۔

10- انتخابات میں اقلیتوں کے حقوق پامال ہو جاتے ہیں۔

11- امیدوار جب جیت کر میدان سیاست میں آتے ہیں تو وہ وزارتیں حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب کسی کو کوئی وزارت مل جاتی ہے تو وہ اقرباء پروری' رشوت خوری اور دوسری برائیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہر وزیر کی خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنا انتخابات پر خرچ کیا ہوا روپیہ کسی نہ کسی طریقے سے پورا کر لے۔ اس کے علاوہ وہ بددیانت لوگوں کی طرح لوٹ کھسوٹ کرنے لگتا ہے اور عوامی اور ملکی دولت میں خسارہ کا باعث بنتا ہے۔

اسلامی جمہوریت : مسلمانوں میں "جمہوریت" (Democracy) کی اصطلاح مغربی افکار و علوم کی اشاعت کے بعد عام ہوئی۔ اس سلسلہ میں اسلامی ریاست کے جمہوری یا غیر جمہوری ہونے کی بحث بھی پیدا ہوئی۔ یہ سوال اٹھایا گیا کہ اسلامی ریاست کو مغربی طرز کی جمہوریت کہا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ کیا خلفائے راشدین کی حکومت جمہوری تھی' اگر جمہوری تھی تو کس حد تک؟

جدید دور کے اسلامی مفکرین میں سے بعض اسلامی نظام حکومت کو جمہوریت کا نام دینے سے کتراتے ہیں اور بعض اسے کمل طور پر جمہوری حکومت کا نام دیتے ہیں۔ جبکہ ایک تیسرا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ اسلامی نظام حکومت "جمہوریت" سے مماثلت رکھتا ہے۔ بعض حضرات اسلام کے شورائی نظام ہی کو جمہوریت کا نام دیتے ہیں۔

اسلامی ریاست کے رئیس اول آنحضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ آپ کو خلافت اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوئی تھی' تاہم اسلام قبول کرنے والے لوگوں نے آپ کی رسالت کا اقرار کر کے آپ کی خلافت کی تائید کر دی اور آپ کو مذہبی رہنما ہونے کے ساتھ ساتھ سیاسی قائد بھی تسلیم کر لیا۔ آپ کی وفات کے بعد خلیفہ اول حضرت ابوبکر صدیق کا انتخاب مجمع عام میں ہوا اور آپ اپنے عہد میں شوریٰ کے مشورہ پر عمل کرتے رہے۔ حضرت عمر فاروق کو حضرت ابوبکر صدیق نے نامزد کیا جس کی تائید و توثیق مجمع عام نے کی۔ حضرت عمر فاروق بھی کاروبار خلافت شوریٰ کے مشورہ سے چلاتے رہے۔ حضرت عثمان غنی کا انتخاب استصواب عام کے ذریعے ہوا۔ اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ بھی مقامی لوگوں کی اکثریت کی مرضی سے خلیفہ منتخب ہوئے۔ خلافت راشدہ کے عہد میں اہل حل العقد کی جماعت مجلس شوریٰ کی قائم مقام تھی اور تمام تر اہم مسائل مشاورت ہی سے طے کئے جاتے تھے۔ خلافت راشدہ نے ریاست کا جو تصور اپنے عمل و کردار سے قائم کیا۔ اس میں جمہوریت کی صفت شورائیت لازماً" موجود تھی اور وہ قرآن مجید کے حکم کے تحت تھی۔

جمہوریت و خلافت : مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ :

مغرب میں جس چیز کو جمہوری حکومت (Democracy) کہتے ہیں' وہ بنیادی تصورات کا مجموعہ ہے:

1- عوام کی قانونی اور سیاسی حاکمیت جو عوام کی اکثریت' یا ان کے منتخب کئے ہوئے نمائندوں کی اکثرت کے ذریعہ ظہور میں آئے۔

2- ریاست کا انتظام کرنے والے حکومت کا عوام کی آزادانہ خواہش سے بننا اور بدل سکنا۔

اسلام اس کے صرف دوسرے جز کو لیتا ہے۔ رہا پہلا جز' تو وہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر کے قانونی حاکیت اللہ تعالیٰ کے لئے مخصوص کرتا ہے۔ جس کے احکام خواہ وہ کتاب اللہ میں ہو یا سنت رسول اللہ میں' ریاست کے لئے ناقابل تغیر و تبدل قانون کی حیثیت رکھتے ہیں اور سیاسی حاکیت کو "حاکیت" کے بجائے "خلافت" (یعنی اللہ' حاکم حقیقی کی نیابت) قرار دے کر ریاست کے عام مسلمان باشندوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ خلافت مسلم عوام کی اکثریت یا ان کے معتمد علیہ نمائندوں کی اکثریت کے ذریعہ عملاً" ظہور میں آئے گی۔اس بنیادی فرق کو دیکھتے ہوئے اسلامی ریاست کو مغربی اصطلاح کے مطابق جمہوریت (Democracy) کہنا بھی کسی طرح صحیح نہیں۔

مولانا مودودی عمومی خلافت کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

1- "ایسی سوسائٹی جس میں ہر شخص خلیفہ ہو اور خلافت میں برابر کا شریک ہو' طبقات کی تقسیم اور پیدائشی یا معاشرتی امتیازات کو اپنے اندر رلو نہیں دے سکتی۔ اس میں تمام افراد مساوی الحیثیت اور مساوی الرتبہ ہوں گے۔ فضیلت جو کچھ بھی ہو گی شخصی قابلیت اور سیرت کے اعتبار سے ہو گی۔"

2- "ایسی سوسائٹی میں کسی فرد یا کسی گروہ افراد کے لئے اس کی پیدائش یا اس کے معاشرتی مرتبے یا اس کے پیشے کے اعتبار سے اس قسم کی رکاوٹیں نہیں ہو سکتیں جو اس کی ذاتی قابلیتوں کے نشوونما اور اس کی شخصیت کے ارتقاء میں کسی بھی طرح مانع ہوں۔"

3- "ایسی سوسائٹی میں کسی شخص یا گروہ کی ڈکٹیٹر شپ کے لئے کوئی گنجائش نہیں' اس لئے کہ یہاں ہر شخص خلیفہ ہے' کسی شخص یا گروہ کو حق حاصل نہیں ہے کہ عام مسلمانوں سے ان کی خلافت کو سلب کر کے خود حاکم مطلق بن جائے۔"

4- "ایسی سوسائٹی میں ہر عاقل و بالغ مسلمان کو خواہ وہ مرد ہو یا عورت' رائے دہی کا حق حاصل ہونا چاہئے' اس لئے کہ وہ خلافت کا حامل ہے' خدا نے اس خلافت کو کسی خاص معیار لیاقت یا کسی معیار ثروت سے مشروط نہیں کیاہے۔ بلکہ صرف ایمان و عمل صالح سے مشروط کیاہے۔ لہٰذا رائے دہی میں ہر مسلمان دوسرے مسلمان کے ساتھ ساتھ مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

"طرف اسلام نے یہ کمال درجہ کی جمہوریت قائم کی ہے۔ اور دوسری طرف ایسی

"انفرادیت" کا سدباب کر دیا ہے جو اجتماعیت کی نفی کرتی ہو۔

نظری اشتراک : مغربی جمہوری تجربوں اور اسلامی نظریہ خلافت میں نظری طور پر مندرجہ ذیل باتیں مشترک ہیں۔

1- شورائیت بذریعہ انتخابات
2- شورائیت بذریعہ منتخب ہیئت حاکمہ
3- قوم کے سامنے جوابدہی
4- انسانی مساوات
5- بنیادی انسانی حقوق
6- اکثریت کا حق فیصلہ
7- صدر یا اولی الامر کی معزولی بصورت عدم اعتماد

اسلامی جمہوریت اور مغربی جمہوریت میں فرق : اسلام کا نظام جمہوری نہیں بلکہ شورائی ہے' تاہم اگر اس شورائی نظام کو اسلامی جمہوریت کا نام دے دیا جائے تو اسلامی اور غیر اسلامی (مغربی) جمہوریت میں مندرجہ ذیل امتیازات ہیں۔

1- جمہوری طرز حکومت میں سربراہ ریاست صدر یا وزیراعظم ہوتا ہے' جبکہ اسلامی حکومت کا سربراہ خلیفہ' امام یا امیرالمومنین ہوتا ہے۔
2- جمہوری طرز حکومت میں طاقت کا سرچشمہ عوام کو تصور کیا جاتا ہے' جبکہ اسلامی طرز حکومت میں ریاست کا مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات کو تسلیم کیا جاتا ہے۔
3- مغربی طرز جمہوریت میں سربراہ حکومت عوام کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے' جبکہ اسلامی طرز حکومت میں سربراہ اللہ تعالیٰ اور خلق خدا دونوں کے سامنے جوابدہ ہوتا ہے۔
4- مغربی طرز جمہوریت میں مذہب اور سیاست دو الگ الگ چیزیں ہیں اور حکومت کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ہوتا' جبکہ اسلامی طرز حکومت میں مذہب اور سیاست دو جداگانہ چیزوں کے نام نہیں' یہ نظام حکومت خالص مذہبی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔
5- مغربی جمہوریت کی بنیاد پارٹی سسٹم پر ہے' جبکہ اسلام میں پارٹی کا کوئی تصور نہیں' تمام مسلمان ایک ہی جماعت ہیں۔
6- مغربی طرز حکومت میں انتخابات کروائے جاتے ہیں' جبکہ اسلام میں شورائی نظام مروج ہے۔ خلیفہ یا رئیس ریاست کا انتخاب مجلس شوریٰ کرتی ہے' جو دیندار' متقی اور صاحب علم افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔
7- مغربی طرز حکومت میں ہر جاہل' بدقماش اور بدکردار آدمی کو رائے دینے کا حق حاصل ہے' جبکہ اسلام میں صرف متقی اور عالم و فاضل اشخاص کی رائے کو معتبر سمجھا جاتا ہے۔
8- مغربی جمہوریت میں لوگوں کو شتر بے مہار کی سی آزادی حاصل ہوتی ہے' لیکن اسلام لوگوں پر اخلاقی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ اس لئے اسلامی نظام حکومت میں لوگوں کو بے جا آزادی دینے کے بجائے انہیں حقوق عطا کئے جاتے ہیں۔ ہر شخص پر حقوق حاصل کرنے

کے عوض کچھ ذمہ داریاں بھی عائد ہوتی ہیں جن کا پورا کرنا اس پر فرض ہوتا ہے۔

9- مغربی طرز حکومت میں عوامی نمائندوں کے بنائے ہوئے قوانین پر عمل کیا جاتا ہے' جبکہ اسلامی ریاست میں اللہ تعالیٰ کے قوانین و احکام نافذ ہوتے ہیں' جو ناقابل ترمیم و تنسیخ ہیں۔

10- مغربی طرز جمہوریت سراسر غیر اسلامی ہے جبکہ اسلامی طرز حکومت الٰہی نظام حکومت ہے یعنی اس کا منشاء اللہ تعالیٰ کی نیابت میں اس کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔

11- مغربی طرز جمہوریت صرف دنیاوی فلاح کی بات کرتا ہے جبکہ اسلامی نظام حکومت دین اور دنیا دونوں کی فلاح کا ضامن ہے۔

قومیت

(NATIONALISM)

سوال : قومیت کے مغربی (غیر مسلم) اور اسلامی تصور پر تفصیل سے روشنی ڈالیئے؟

جواب : قومیت :

عرف عام میں "قوم" انسانوں کے گروہ کا نام ہے۔ جو مل جل کر رہنے کا خواہاں ہو اور اجتماعی وحدت نے جس کی شیرازہ بندی کر دی ہو۔ اس گروہ کے افراد میں مل جل کر رہنے کا جو احساس پایا جاتا ہے۔ اسی کا نام "قومیت" ہے۔ دور حاضر کی سیاسی اصطلاح میں اسے نیشنلزم (Nationalism) کہتے ہیں۔

مختلف مفکرین کے نزدیک "قومیت" کی تعریف یوں ہے:

1- پروفیسر گارنر (Garner) کے نزدیک:
"قوم ایک ایسا معاشرہ گروہ ہے جو ثقافتی طور پر یکساں ہو اور اپنی روحانی زندگی اور اظہار کی وحدت کو شعوری طور پر سختی سے قائم رکھنا چاہتا ہو۔"

2- گلکراسٹ کے نزدیک:
"قوم سے مراد ریاست ہے' جس میں کچھ اور بھی شامل کر دیا گیا ہو' یعنی لوگوں کا ایسا اتحاد اور وحدت جو ایک ریاست میں رہ کر قائم کی گئی ہو۔"

3- پروفیسر ارنسٹ بارکر (Ernest Basker) کا کہنا ہے کہ:
"قوم سے مراد افراد کا ایسا مجموعہ ہے جو ایک خاص علاقے میں بستے ہوں' جہاں رہ کر وہ اپنے مختلف خون اور رنگ کے اختلاط سے نسلاً" ایک بن گئے ہوں اور نفسیاتی طور پر اپنے ذہن' خیالات' احساسات اور جذبات میں ہم رنگ ہو گئے ہوں اور اپنی زبان' ثقافت اور

مذہب وغیرہ میں مشترک اور سیاسی شعور اور مقاصد میں ہم خیال ہو گئے ہوں۔"

4- فرانسیسی مفکری رینان (Renan) کے خیال میں:

"قوم بننے کے لئے مشترک زبان یا نسل ضروری نہیں' بلکہ قوم ایسے لوگ ہیں جو مشترک تاریخی ورثہ کے باعث اپنے سابقہ تجربے اور روایات کی بناء پر ہمیشہ مل جل کر مشترکہ زندگی گذارنے کے جذبہ سے سرشار ہوں۔"

5- قومیت کی وضاحت یوں کی جا سکتی ہے کہ:

"قومیت ایک روحانی جذبہ یا اصول ہے جو لوگوں کی ایک ایسی تعداد کے اندر پیدا ہو جاتا ہے جو ایک خاص خطہ زمین میں رہتے ہوں اور جن میں ایک ہی زبان' ایک ہی مذہب' یکساں تاریخ و روایات' مشترک اغراض و مقاصد اور مشترک سیاسی میل جول اور مطمع نظر موجود ہوں۔

"قومیت" کی اصطلاح ان افراد جماعت کی طرف اشارہ کرتی ہے' جنہیں اتحاد کے کسی خصوصی احساس نے متحد کر دیا ہو' یا پھر یہ اس جذبہ کی طرف اشارہ کرتی ہے جو لوگوں کو باہم متحد رکھتا ہے۔ اس احساس وحدت کے دو پہلو ہیں:

(i) اول یہ کہ یہ لوگ محسوس کریں کہ ان کے مفادات حیات مشترک ہیں اور صرف باہم مل جل کر رہنے سے ہی وہ مسرتوں سے بھرپور اور خوشحال زندگی بسر کر سکتے ہیں۔

(ii) دوم یہ کہ ان کے ہاں یہ جذبہ پایا جائے کہ دوسری آبادیوں کے مقابلہ میں وہ امتیازی حیثیت کے مالک ہیں۔

قومیت کے عوامل (عناصر) : عام طور پر مندرجہ ذیل عوامل کو قوم کی بنیاد تصور کیا جاتا ہے :

(1) **مشترک وطن** : ایک معینہ ارضی حدود میں رہنے والے افراد میں اخوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں' جو اتحاد باہمی کا سبب بنتے ہیں' مشترک وطن بڑی حد تک قومیت کے جذبات کو نشوونما کا موقع دیتا ہے۔

چنانچہ ایک خاص وطن میں بودوباش رکھنے کو بھی قومیت قرار دیا جاتا ہے' مثلاً انگلستان کے باشندے انگریز اور امریکہ کے باشندے امریکی کہلاتے ہیں۔

(2) **مشترک نسل** : کسی ایک نسل سے تعلق رکھنے والے بہت سے افراد میں قدرتی طور پر اتحاد کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے اور ایک ہی نسل کے لوگ اپنے آپ کو ایک قوم سمجھتے ہیں۔ مثلاً یہودی ایک ہی نسل (بنی اسرائیل) سے تعلق رکھتے ہیں' اور وہ اپنے آپ کو تمام دنیا سے جداگانہ ایک قوم تصور کرتے ہیں۔

بعض مفکرین کا کہنا ہے کہ "قومیت" کی نشوونما کے لئے بس اتنا ہی کافی ہے کہ لوگ یہ باور کر لیں کہ ان کا کسی ایک نسل سے تعلق ہے' یہ گمان خواہ غلط ہو یا صحیح۔

بعضوں کا خیال ہے کہ نسلی یکسانی قومیت کے نشو و ارتقاء کے سلسلہ میں لازم نہیں۔

(3) **مشترک رنگ** : بعض دفعہ ایک ہی رنگ کے لوگوں کو ایک قوم قرار دیا جاتا ہے، مثلاً سیاہ رنگ کی وجہ سے حبشیوں کو ایک قوم قرار دیا جاتا ہے۔ اسی بناء پر امریکہ میں "گورے" اور "کالے" کا امتیاز روا رکھا جاتا ہے۔

(4) **مشترک زبان** : ایک ہی زبان بولنے والے افراد بہ نسبت بہت سی زبانیں بولنے والے افراد کے ایک دوسرے کے زیادہ قریب ہو سکتے ہیں۔ مشترک زبان کی بدولت ان کے ہاں تبادلہ افکار ممکن ہو جاتا ہے۔ پس قومیت کے نشوونما کے سلسلہ میں مشترک زبان ایک اہم حیثیت کی مالک ہے۔ چنانچہ ایک ہی زبان بولنے والوں کو ایک قوم قرار دے دیا جاتا ہے۔ جو لوگ یہ زبان نہیں بولتے انہیں اس سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً سندھی زبان نہ بولنے والوں کو سندھی قوم سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ سندھی بولنے والے خود کو ایک قوم (سندھی) تصور کرتے ہیں۔

(5) **مشترک مذہب** : مذہب دلوں کو جوڑنے کے لئے ایک زبردست قوت کا مالک ہے۔ مشترک مذہب اعتقادات اور رسوم کے باعث لوگ باہم قریب تر ہو جاتے ہیں اور ان میں ایک قوم ہونے کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ مذہب قومیت کے تعلق میں لازمی حیثیت نہیں رکھتا۔ مثلاً سوستانی قوم کا مذہب ایک نہیں پھر بھی ان کے ہاں ایک قومیت پائی جاتی ہے۔

(6) **مشترک تاریخ و ثقافت** : مشترک تاریخ، مشترک روایات اور مشترک ثقافتی ورثہ لوگوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح مشترک تاریخ و ثقافت اور روایات کی بناء پر بھی لوگ ایک قوم کہلاتے ہیں۔

(7) **مشترک مفادات** : مشترک اقتصادی اور دیگر مشترک مفادات بھی مشترک قومیت کے ارتقاء میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اپنے مفادات کی بدولت امریکی عوام اس قابل ہوئے کہ ان میں ایکتا کا احساس شدید تر ہو گیا۔

(8) **قومی اتحاد کا جذبہ** : مذکورہ بالا عناصر میں سے اگر ایک یا زیادہ عناصر نہ بھی موجود ہوں تو بھی قوم کی تشکیل میں کوئی دشواری نہیں ہوتی، لیکن اگر کسی ملک یا قوم میں قومی اتحاد اور تشکیل کی خواہش اور جذبہ کارفرما نہ ہو تو یہ قوم زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہ سکتی۔ مذکورہ بالا عناصر بھی موثر ثابت ہوسکتے ہیں جب وہ قومی جذبہ اور خیالات کو ابھارتے ہوں۔ اگر کوئی قوم قومی اتحاد کے جذبات سے عاری ہو تو مشترکہ زبان یا مذہب یا ثقافت یا سیاسی مقاصد یا گذشتہ تاریخ وغیرہ کوئی بھی عنصر اس کو قومی اتحاد اور تنظیم نہیں بخش سکتا۔ مختصر یہ کہ قومیت کی نشو و ارتقاء کے لئے قومی اتحاد کا ہونا لازم ہے۔

قوم پرستی (Nationalism) : قوم پرستی کا رواج ازمنہ قدیم ہی سے رہا ہے لیکن اس کا شدت سے آغاز پندرہویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کے دو ممالک فرانس اور انگلستان سے ہوا۔ یہ دونوں ملک آپس میں ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے۔ ان میں ایک دیرینہ جنگ

جاری تھی جس کو "جنگ صد سالہ" کا نام دیا جاتا ہے۔ جنگ کے نتیجے میں دونوں ملکوں میں زبان اور قومی ثقافت وغیرہ سے قومی جذبات ابھر گئے' جو قرون وسطی کے عیسائی نظریات کے مخالف تھے۔ جب یہ جذبات زور پکڑ گئے تو یہ دونوں ملک دو قومی ریاستیں بن گئے' جیسا کہ وہ آج تک ہیں۔ اس کے بعد سولہویں صدی عیسوی میں یورپ میں مذہبی جنگیں شروع ہو گئیں۔ اس دوران سپین اور ہالینڈ بھی جو باہم دیگر برسرپیکار تھے' دو قومی ریاستیں بن گئے۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں قریباً سارا مغربی اور وسطی یورپ قومی ریاستوں میں بٹ گیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں انقلاب فرانس واقع ہوا' جس کے نتیجہ میں قومیت اور قوم پرستی کی لہر مشرقی یورپ اور جنوبی یورپ میں بھی پھیل گئی' دیکھتے ہی دیکھتے سارا یورپ قومی ریاستوں میں بٹ گیا۔ انیسویں صدی کے شروع ہوتے ہی قومیت کی لہر یورپ کی حدود سے نکل کر ترکیہ' عرب' چین' جاپان' برطانوی ہند اور دیگر ممالک میں پھیل گئی۔ پہلی جنگ عظیم میں یورپ کی سامراج قوتوں کو پہلا زبردست جھٹکا لگا اور وہ قدرے کمزور پڑ گئیں' جس کی وجہ سے براعظم ایشیا اور افریقہ میں چند قومی ریاستیں وجود میں آئیں' جن میں چین' ترکیہ اور مصر قابل ذکر ہیں۔ جب دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی تو یورپ اور امریکہ کی سامراجی طاقتوں کی عالمگیر قوت بھی ختم ہونے لگی اور جن علاقوں پر انہوں نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا' وہ ایک ایک کر کے ان کے چنگل سے آزاد اور خود مختار ہو کر قومی ریاستیں بننے لگے۔

قومیت کی لہر اب بھی زوروں پر ہے اور ایشیاء' افریقہ اور دیگر براعظموں کی باقی ماندہ اقوام بھی آزاد اور خود مختار ہو کر قومی ریاستوں کی صف میں داخل ہو رہی ہیں۔

قوم پرستی (قومیت) کے فوائد (خوبیاں) :

1- قوم پرستی معاشرہ میں آزادی اور اتحاد کے جذبات پیدا کرتی ہے اور افراد معاشرہ کے لئے ایسے مواقع فراہم کرتی ہے جن میں وہ اپنی قوم کی ثقافت' ادبیات' علم و فن اور صنعت و حرفت وغیرہ کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے ہیں۔ اس طرح ہر قوم کی مخصوص تہذیب و تمدن میں ترقی کر کے دنیائے انسانی کی ترقی اور فلاح و بہبود میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔

2- قومیت جمہوریت کی ترویج میں بہت مددگار ثابت ہوتی ہے۔ مفکرین کا خیال ہے کہ قومیت کا آغاز عوام کے جمہوری جذبات و خواہشات کی وجہ سے ہوا۔ چنانچہ جہاں قومی جذبات بیدار ہوتے ہیں' وہاں لوگ بادشاہت' آمریت اور غیر ملکی سامراجیت کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں اور اپنے ملک میں قومی حکومت کے خواہاں ہوتے ہیں۔

3- قومیت کا جذبہ لوگوں کو اپنے ملک کے قدرتی وسائل کو پوری طرح ترقی دینے اور کام میں لانے کی ترغیب دیتا ہے' جس کے باعث ملک میں مکمل طور پر اقتصادی ترقی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ اس طرح لوگوں کا معیار زندگی بلند ہو جاتا ہے۔

4- قومیت کا جذبہ فرد کے کردار و خیالات کو بلند کرتا ہے' اس کو اپنے محدود گروہوں' مثلاً قرابت داری اور مقامیت کے تنگ نظریوں اور تعصبات سے بالاتر ہو کر قوم و ملک کے جذبات کو سرشار کرتا ہے اور اس طرح ایک وسیع تر معاشرہ کی بنیاد رکھتا ہے' جو

کنبہ' گاؤں اور علاقے سے باہر ملک و قوم کی اجتماعی زندگی کو اپنا مقصد اور نصب العین تصور کرتا ہے۔

5- قومیت کل بنی نوع انسان اور دنیائے انسان کی آزادی' تہذیب و تمدن اور خوشحالی کو بھی ترقی دیتی ہے۔

قومیت (قوم پرستی) کی خرابیاں (نقصانات) :

1- قومیت دنیا میں جنگ پرستی' باہمی منافرت اور تعصب کے جذبات کو فروغ دیتی ہے۔ وہ ایک قوم کو دوسری قوموں سے مخالفت' جنگ بازی اور نفرت کا سبق دیتی ہے' جس کی بناء پر تمام کرہ زمین قومی بغض اور کینہ سے بھر جاتا ہے۔

2- قومیت سامراجیت کو جنم دیتی ہے مثلاً مغربی ممالک میں قومیت نے نہایت بھیانک صورت اختیار کئے رکھی۔ انہوں نے افریقہ' ایشیا اور دیگر براعظموں کے پس ماندہ ممالک پر حملے کرکے ان کو اپنا غلام بنا لیا اور سامراجیت کی بنیاد رکھی۔ اس طرح ان قوموں نے ان ممالک میں لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم کیا کہ یہ ممالک خستہ حال ہو گئے اور سامراجی قوتیں امیر سے امیر تر ہو گئیں۔

3- قومیت انسانی تہذیب' امن اور سلامتی کے لئے خطرہ بن چکی ہے۔ قومی منافرت اور تعصب کے باعث دنیا خطرناک حد تک جنگی تیاریوں میں مشغول ہے۔ چونکہ چھوٹی چھوٹی قومیں بڑی قوموں کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔ اس لئے وہ ان بڑی قومی کی نئی غلامی میں گرفتار ہوتی جا رہی ہیں' جس کو نو استعماریت کا نام دیا جاتا ہے۔

اسلامی تصور قومیت : اسلام میں نسب' رنگ' زبان اور وطن وغیرہ قومیت کی بنیاد نہیں ہیں۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق تمام انسان ایک ہی نسل ہیں' جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

(1) خلقکم من نفس واحدۃ (النساء)

(اللہ نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے)

(2) یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکرو انثی وجعلنکم شعوبا و قبائل لتعارفو ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ (الحجرات)

(لوگو! تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تھا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ' مگر درحقیقت تم میں سے معزز وہی ہے جو زیادہ پرہیز گار ہے۔)

دین اسلام کے مطابق تمام انسان ایک باپ اور ایک ماں کے بیٹے ہونے کی وجہ سے آپس میں بھائی بھائی ہیں' اس لئے نسل کی بناء پر کسی علیحدہ قومیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ نسب کی وجہ سے "آدم" کا ہر بیٹا "آدمی" ہے۔

شعوب و قبائل کا اختلاف محض تعارف کیلئے ہے۔ آپ کے بغض' ایک دوسرے پر تفاخر اور ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے کے لئے نہیں ہے۔

اسلام میں قومیت کی بنیاد رنگوں پر بھی نہیں ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان

ہے:

1۔ "کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے۔"

2۔ "سنو ! اور اطاعت کرو' چاہے تمہارے اوپر کوئی حبشی غلام ہی امیر بنا دیا جائے جس کا سر کشمش جیسا ہو۔"

اسلام میں قومیت کی بنیاد وطن پر بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کسی عربی کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر فوقیت نہیں ہے۔"

اسلام میں قومیت کی بنیاد عصبیت پر بھی نہیں ہے۔ جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

لیس منا من مات علی العصبیۃ، لیس منا من دعا الی العصبیۃ' لیس منا من قاتل علی العصبیۃ۔

(جس نے عصبیت پر جان دی وہ ہم میں سے نہیں ہے' جس نے عصبیت کی طرف بلایا وہ ہم میں سے نہیں ہے' جس نے عصبیت پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں ہے)

اسلام میں قومیت کی بنیاد گروہ بندی پر بھی نہیں' کیونکہ گروہوں کی تفریق اور جماعتوں کا اختلاف خدا کا عذاب قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے۔:

اویلبسکم شیعا ویذیق بعضکم باس بعض (الانعام)

(یا تو تم کو گروہ بنا دے اور تمہیں ایک دوسرے کی قوت کا مزہ چکھائے)

اسلام میں قومیت کی بنیاد نہ نسب پر ہے نہ مال و دولت پر اور نہ بزرگوں کے عظمت پر۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

1۔ خوب سن رکھو' کہ فخر و ناز کا ہر سرمایہ' خون اور مال کا ہر دعوی آج میرے ان قدموں کے نیچے ہے۔

2۔ اے اہل قریش ! اللہ نے تمہاری جاہلیت کی نخوت اور باپ دادا کی بزرگی کے ناز کو دور کر دیا۔

اسلامی قومیت کی بنیاد : اسلام نے رنگ' نسل' وطن' زبان' معیشت اور سیاست کو' غیر عقلی تعریفوں کو' جن کی بنیاد پر انسان نے اپنی جہالت و نادانی کی وجہ سے انسانیت کو تقسیم کر رکھا تھا' مٹا دیا اور تمام بنی نوع انسان کو ہم مرتبہ قرار دیا۔

اسلام بذات خود ایک قومیت ہے جو خدا کی بندگی و اطاعت' طہارت' تقوی اور اعمال صالحہ کے ذریعہ انسانیت کو فلاح پانے کی دعوت دیتا ہے۔ پس جو شخص اس دعوت کو قبول کرے وہ ایک قوم ہے اور جو رد کرے وہ دوسری قوم ہے۔ چنانچہ دنیا کے تمام مسلمان خواہ وہ کسی بھی خطہ ارض میں آباد ہوں' ایک قوم ہیں اس قوم کا نام "مسلم" ہے۔

یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ دنیا میں صرف دو قومیں آباد ہیں:

(1) مسلم

(2) غیر مسلم

ان دونوں قوموں کے درمیان بنائے امتیاز نسل، نسب اور وطنیت نہیں بلکہ حق و باطل ہے، اسلام اور کفر ہے۔ اسلام نے قومیت کا جو دائرہ کھینچا ہے وہ کوئی حسی اور مادی دائرہ نہیں بلکہ ایک خالص عقلی دائرہ ہے۔ اس دائرہ کا محیط ایک کلمہ ہے، یعنی:

لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

اس کلمہ کا اقرار دنیا کے ہر انسان کو ایک دوسرے کے قریب کر دیتا ہے، اور اس کا انکار جدا کر دیتا ہے۔ جو یہ کلمہ پڑھ کر مسلمان ہونے کا اقرار کر لیتا ہے، وہ نہ چودھری رہتا ہے اور نہ کمین، نہ آقا اور نہ مولا، بلکہ وہ مسلم قوم میں داخل ہو جاتا ہے، جس میں موچی، تیلی، جولاہا، جاٹ، ملک، پٹھان اور سید میں کوئی امتیاز نہیں۔ ہر مسلمان خواہ وہ پاکستان کا باشندہ ہو یا بھارت کا یا سوڈان میں رہتا ہو یا مصر میں، گورا ہو یا کالا، عربی بولتا ہو یا فارسی، اس کی زبان پنجابی ہو یا ہندی یا انگریزی، وہ امیر ہو یا غریب، ایک حکومت کی رعیت ہو یا دوسری کی، وہ مسلمان قوم کا فرد اور اسلامی معاشرہ کا رکن ہے۔

اسلام کا طریق جمع و تفریق : مولانا مودودی اپنی کتاب "اسلامی ریاست" میں رقم طراز ہیں کہ:۔

> "یہ غلط فہمی نہ ہو کہ اسلام نے تمام انسانی اور مادی رشتوں کو قطع کر دیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ اس نے مسلمانوں کو صلہ رحمی کا حکم دیا ہے، قطع رحم سے منع کیا ہے، ماں باپ کی اطاعت و فرمانبرداری کی تاکید کی ہے، خون کے رشتوں میں وراثت جاری کی ہے، خیر و صدقات اور بذل و انفاق میں ذوی القربی کو غیر ذوی القربی پر ترجیح دی ہے، اپنے اہل و عیال، اپنے گھربار اور اپنے مال کو دشمنوں سے بچانے کا حکم دیتا ہے، ظالم کے مقابلہ میں لڑنے کا حکم دیا ہے اور ایسی لڑائی میں جان دینے والے کو شہید قرار دیا ہے، زندگی کے تمام معاملات میں بلا امتیاز مذہب ہر انسان کے ساتھ ہمدردی، حسن سلوک اور محبت سے پیش آنے کی تعلیم دی ہے۔ اس کے کسی حکم کو یہ معنی نہیں پہنائے جا سکتے کہ وہ ملک و وطن کی خدمت وحفاظت سے روکتا ہے یا غیر مسلم ہمسایہ کے ساتھ صلح و مسالمت کرنے سے روکتا ہے۔"

مولانا مزید لکھتے ہیں کہ:

> "یہ سب کچھ ان مادی رشتوں کی جائز اور فطری مراعات ہے مگر جس چیز نے قومیت کے معاملہ میں اسلام اور غیر اسلام کے اصول میں فرق کر دیا ہے، وہ یہ ہے کہ دوسروں نے انہی رشتوں پر جداگانہ قومیتیں بنا لی ہیں اور اسلام نے ان کو بنائے قومیت قرار نہیں دیا۔ وہ ایمان کے تعلق کو ان سب تعلقات پر ترجیح دیتا ہے اور وقت پڑے تو ان میں سے ہر ایک کو اس پر قربان کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔"

قوم / حزب : مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ:۔

> "لفظ (قوم) اور اس کے ہم معنی انگریزی لفظ (Nation) دونوں دراصل جاہلیت کی اصطلاحیں ہیں۔ اہل جاہلیت نے قومیت (Nationality) کو کبھی خالص بنیاد پر قائم

نہیں کیا' نہ قدیم جاہلیت کے دور میں اور نہ جدید جاہلیت کے دور میں۔ جس طرح قدیم عرب میں "قوم" کا لفظ عموماً ایک نسل یا ایک قبیلہ کے لوگوں پر بولا جاتا تھا اس طرح آج بھی لفظ "نیشن" (Nation) کے مفہوم میں مشترک جنسیت (Common Descent) کا تصور لازمی طور پر شامل ہے اور یہ چیز چونکہ بنیادی طور پر اسلامی تصور اجتماع کے خلاف ہے اس وجہ سے قرآن میں لفظ "قوم" اور اس کے ہم معنی دوسرے عربی الفاظ مثلاً شعب وغیرہ کو مسلمانوں کی جماعت کے لئے اصطلاح کے طور پر استعمال نہیں کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی اصطلاح اس جماعت کے لئے کیونکر استعمال کی جا سکتی تھی' جس کے اجتماع کی اساس میں خون اور خاک اور رنگ اور ایسی قوت کی دوسری چیزوں کو قطعاً" کوئی دخل نہ تھا' جس کی تالیف و ترکیب محض اصول اور مسلک کی بنیاد پر کی گئی تھی اور جس کا آغاز ہی ہجرت اور قطع نسب اور ترک علائق مادی سے ہوا تھا۔"

مولانا مودودی کا کہنا ہے کہ:

"قرآن نے جو لفظ مسلمانوں کی جماعت کے لئے استعمال کیا ہے' وہ "حزب" ہے۔ جس کے معنی "پارٹی" کے ہیں قومیں نسل و نسب کی بنیاد پر اٹھتی ہیں اور پارٹیاں اصول و مسلک کی بنیاد پر۔ اس لحاظ سے مسلمان حقیقت میں قوم نہیں بلکہ ایک پارٹی ہیں۔

قرآن روئے زمین کی اس پوری آبادی میں صرف دو ہی پارٹیاں (حزب) دیکھتا ہے۔ ایک اللہ کی پارٹی (حزب اللہ) اور دوسری شیطان کی پارٹی یعنی (حزب الشیطان)

ملت / امت : اسلام میں "قوم" کے بجائے "امت" اور "ملت" کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں' جیسا کہ قرآن مجید میں امت مسلمہ کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

(1) کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر وتومنون باللہ۔ (آل عمران)

(تم وہ بہترین امت ہو جسے بنی نوع انسان کے لئے نکالا گیا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو' بدی سے روکتے ہو اور خدا پر ایمان رکھتے ہو)

(2) وکذالک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونو اشهد اعلی الناس ویکون الرسول علیکم شهیدا۔ (البقرہ)

(اور اس طرح ہم نے تم کو ایک بیچ کی امت بنایا ہے تاکہ تم نوع انسانی پر نگران ہو اور رسول تم پر نگران ہو)

مولانا مودودی کے نزدیک "امۃ وسطا" یعنی بیچ کی امت سے مراد یہ ہے کہ مسلمان ایک بین الاقوامی جماعت (Internationl Party) کا نام ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں سے ان اشخاص کو چھانٹ کر نکالا گیا ہے۔ جو ایک خاص اصول کو ماننے' ایک خاص پروگرام کو عمل میں لانے اور ایک خاص مشن کو انجام دینے کے لئے تیار ہوں۔ یہ لوگ چونکہ ہر قوم میں سے نکلے ہیں اور ایک پارٹی بن جانے کے بعد کسی قوم سے ان کا تعلق نہیں رہا ہے اس لئے یہ "بیچ کی

امت" ہیں۔

ملت اسلامیہ کی صفات :

1- ملت اسلامیہ نسل انسانی کی وحدت پر زور دیتی ہے۔
قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :

(i) یا ایھا الناس انا خلقنکم من ذکر وانثی۔ (الحجرات)
(اے لوگو! بے شک ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا)

(ii) وھو الذی انشا کم من نفس واحدۃ۔ (الانعام)
(اور وہی ہے جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا)

2- ملت اسلامیہ کے افراد ایک خدا' ایک رسول اور ایک کتاب کو مانتے ہیں۔ اس طرح ان میں فکری ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔

3- ملت اسلامیہ ایک بہترین امت ہے' جسے امت وسط قرار دیا گیا ہے جو بنی نوع انسان پر نگران ہے' جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے :

وکذلک جعلنا کم امتہ وسطا لتکونو اشھد علی الناس
اور اسی طرح ہم نے تم کو بیچ کی امت بنایا تاکہ تم بنی نوع انسان پر نگران ہو

4- ملت اسلامیہ میں عالمگیر وحدت پائی جاتی ہے۔ نظریہ اسلام کے مطابق تمام بنی نوع انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

5- ملت اسلامیہ میں رکن کا مقام برابر ہے۔ اس میں رنگ و نسل کی کوئی تفریق نہیں' نہ ہی ذات پات کا کوئی امتیاز ہے اور نہ ہی امیر و غریب میں تفاوت ہے۔ اسلام میں شرف کا معیار تقوی ہے۔

6- ملت اسلامیہ خدا و رسول پر ایمان رکھتی ہے اور دینی و دنیاوی تمام کام اللہ اور رسول کی خوشنودی کے لئے انجام دیتی ہے۔

7- امت مسلمہ کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اچھائی کا درس دیتی ہے اور برائی سے روکتی ہے۔

8- امت مسلمہ اخوت' محبت' ہمدردی' غمگساری' صلہ رحمی' شفقت اور امن و سلامتی کی علمبردار ہے۔

اشتراک و اشتمالیت

سوال: اسلام میں اشتراکیت و اشتمالیت پر نوٹ لکھیں۔

اشتراکیت (Socialism) : معاشیات کی اصطلاح میں اشتراکیت یا سوشلزم کی تعریف یوں کی گئی ہے:

"وہ نظام جس میں کسی ملک کے تمام ذرائع پیداوار کسی ایک فرد یا چند افراد کی ملکیت میں ہونے کے بجائے پورے معاشرے کی ملکیت قرار دیے جائیں اور اس کا مقصد معاشرہ اور فرد دونوں کی فلاح و بہبود اور فرد کی زندگی کی بنیادی ضروریات کی فکر سے نجات دلانا ہو۔"

افلاطونی اشتراکیت : اشتراکیت کا نظریہ کافی قدیم ہے۔ افلاطون نے قریباً آج سے اڑھائی ہزار سال پہلے مثالی ریاست کا جو تصور پیش کیا تھا' اشتراکیت بھی اس کا ایک عنصر تھا۔ افلاطون نے اپنے نظریہ اشتراکیت کی بنیاد اس بات پر رکھی کہ انسانی سیرت' ذہانت' شجاعت اور خواہشات کا مرقع ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ محافظ اور ان کے معاون لوگوں کو ذہانت اور شجاعت کی افراط سے گریز کرنا چاہئے اور اعتدال کو پیش نظر رکھنا چاہئے۔ کیونکہ ہر چیز کی انتہائی افراط اور انتہائی تفریط ہمیشہ نقصان کا باعث ہوتی ہے۔ اس افراط و تفریط سے بچنے اور عوام کو بچانے کے لئے افلاطون نے لازم قرار دیا کہ محافظوں اور ان کے معاونوں کو کسی قسم کی نجی املاک نہیں رکھنا چاہئے اور اقربا پروری سے گریز کرنا چاہئے۔

اشتراکیت کا یہ نظریہ جس میں خاندان پرستی اور نجی املاک کی ممانعت کر دی جاتی ہے' افلاطون نے دراصل سپارٹا حکومت کے' سرکاری ملازمین کی شرائط ملازمت میں سے اخذ کیا تھا۔ اس کے نزدیک اشتراکیت ایک ایسی معاشرت کا نام ہے جو دولت اور آمدنی کی یکساں تقسیم اور مشترکہ جائیداد کے تصور پر قائم ہوتی ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں افلاطون نے تاجروں پر تجارت کے سلسلہ میں مالی تصرفات کی کوئی پابندی عائد نہیں کی اور تاجروں کو مناسب نفع حاصل کرنے کی اجازت دی ہے اور اس نفع سے حاصل ہونے والی رقم کا مملکت کو لاتعلق قرار دیا ہے۔

افلاطون کے نزدیک جائیداد ایک ایسی بلا ہے جو ذاتی مفادات' لالچ اور انتقام جیسے امراض کو جنم دیتی ہے۔ اس لئے اس کا خیال ہے کہ فرد کو ریاست میں ذاتی ملکیت رکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہئے تاکہ کسی فرد میں ذاتی املاک کے جمع کرنے اور ان میں وسعت پیدا کرنے کے عناصر پیدا نہ ہوں۔ افلاطونی اشتراکیت میں زن' زر اور زمین کو قومی ملکیت قرار دیا گیا ہے۔ وہ اولاد کو بھی نجی ملکیت قرار نہیں دیتا' اس کا کہنا ہے کہ اولاد کو سب سے نچلے طبقے میں بھی ملکیت تصور نہیں کرنا چاہئے۔ اس کا خیال ہے کہ بہترین بچے حاصل کرنے کے لئے کسی شادی یا رشتہ ازدواج کی رسمی ضرورت نہیں' بلکہ اچھی صحت اور باصلاحیت نسل حاصل کرنے کے لئے نہی صفات کے لوگوں کو نسل کشی کے مقاصد کے لئے استعمال کرنا چاہئے۔ افلاطون کا خیال ہے کہ عورت کو افزائش نسل کے علاوہ دیگر کاموں میں بھی استعمال کرنا چاہئے' مثلاً امور خانہ داری

کے علاوہ رزق کمانے کے لئے بھی اس کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ افلاطون کا خیال ہے کہ شادی کی بنیاد بھی اشتراکیت و اشتمالیت پر ہونی چاہئے۔ اس سلسلہ میں اس کی رائے ہے کہ ایک علاقہ میں سال میں ایک بار ایک ایسا جشن منایا جانا چاہئے جس کا تمام تر اہتمام ریاست کی طرف سے ہو۔ اس جشن میں غیر شادی شدہ عورت اور مرد جمع ہوں اور حکومت کے نمائندے قرعہ اندازی کریں' جو عورت جس مرد کے حصہ میں آئے وہ اس کی کفالت کرے۔ اس مرد کو یہ حق بھی دیا جائے کہ وہ اپنے فرائض منصبی کی ادائیگی میں اپنی بیوی کو بھی اپنی مدد کے لئے شامل کرے۔

مارکس سے قبل : اشتراکی نظریات زمانہ قدیم ہی سے پائے جاتے ہیں۔ ازمنہ وسطی میں عیسائی پادری ملکیت کو انسانی گناہوں کی سزا قرار دیتے تھے۔ ان کے ہاں اس قسم کے تصورات ملتے ہیں کہ یا تو ملکیت کا انتظام اجتماعی کنٹرول میں ہو یا اگر انفرادی ملکیت باقی بھی رہے تو اس کا مقصد اجتماعی فلاح و بہبود ہونا چاہئے۔

روسو کے یہاں بھی ملکیت اور خاندان کے وجود کو معاشرتی خرابیوں کا ذمہ دار قرار دیا گیاہے۔ اس کا کہنا ہے کہ متمدن معاشرے کے وجود میں آنے سے قبل انسان فطری حالت میں امن و سکون اور چین کی زندگی گذارتا تھا۔ جب ملکیت اور خاندان ے ادارے وجود میں آئے تو میرے اور تیرے کا تصور پیدا ہو گیا۔ اس طرح آپس میں تنازعات پیدا ہوئے اور اسی چیز نے دیگر معاشرتی خرابیوں کو جنم دیا۔

روسو کے علاوہ رابرٹ اون' سینٹ سائمن اور چارلس فوریر نے بھی اشتراکی قسم کے خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ان کے ہاں دولت کی منصفانہ تقسیم اور معاشرے میں عادلانہ نظام کے تصورات ملتے ہیں۔

مارکسزم (Marxism) : کارل مارکس کے نظریات کو "مارکسزم" کا نام دیا جاتا ہے۔ کارل مارکس نے انیسویں صدی عیسوی میں نو آبادیاتی اور سامراجی نظام کے خلاف آواز بلند کی۔ اس نے سامراجی ظلم و تشدد اور لوٹ کھسوٹ کو ختم کرنے کے لئے اخوت اور مساوات کی بنیاد پر ایک نئے نظام کا نظریہ پیش کیا۔ مارکس کا فلسفہ سرمایہ داروں کے خلاف اور مزدور کے حق میں ہے۔ مارکس کا خیال ہے کہ معاشرہ کی تشکیل سے لے کر آج تک جتنی بھی سیاسی مصیبتیں نازل ہوئی ہیں ان کے پس منظر میں بالکل واضح غربت اور سرمایہ دار کی جنگ رہی ہے۔ اور یہ جنگ آئندہ بھی جاری رہے گی۔ وہ امیرت اور غربت کی کوکھ سے جنم لینے والی طبقاتی کشمکش کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ معاشرہ میں صرف دو ہی طبقے ہیں' یعنی امیر و غریب یا سرمایہ دار و مزدور۔

اس کا کہنا ہے کہ سرمایہ داروں و مزدوروں کے مسائل مشترک نہیں ہیں' اس لئے دونوں کے مفادات بھی مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ سرمایہ دار مزدوروں سے جائز و ناجائز کام لے کر کثیر منافع حاصل کرنا چاہتا ہے اور مزدور معینہ وقت میں محدود کام کرنے کا خواہاں ہے اس لحاظ سے دونوں میں طبقاتی جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے' مارکس نے مزدور کو اس بات پر اکسایا کہ وہ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف بغاوت کر دے' تاکہ مزدور طبقہ اپنے آپ کو خوشحال بنانے کے لئے ذرائع پیداوار پر قبضہ کر کے' قوت و اختیار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس کا خیال

تھا کہ اس طرح جو معاشرہ پیدا ہو گا اس میں طبقاتی تقسیم کی لعنت نہیں ہو گی۔ مارکس کا خیال ہے کہ انگلستان' امریکہ اور ہالینڈ کے علاوہ دنیا کے مختلف ملکوں میں مزدور بغاوت کر کے ہی انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔

کارل مارکس ایک ایسی اشتراکی ریاست کا تصور دیتا ہے جس میں سرمایہ کا وجود تو ہو لیکن سرمایہ دار دکھائی نہ دے۔ مزدور تاریخ کی روایت کو توڑتے ہوئے مفلس مزدور نہ رہے' بلکہ امیر مزدور بن جائے۔ وہ امیر و غریب کا تعین کرنے کے لئے یہ کلیہ پیش کرتا ہے کہ:

(i) جس شخص کی آمدنی اس کے اخراجات سے زیادہ ہو گی' وہ امیر ہو گا۔

(ii) جس شخص کے اخراجات آمدنی سے زیادہ ہوں گے' وہ غریب ہو گا۔

کارل مارکس سرمایہ دار (امیر) طبقہ کو "بورژوا" اور مزدور طبقہ کو "پرولتاری" کا نام دیتا ہے اور پرولتاری طبقہ کو بورژوا طبقہ کے خلاف اکساتا ہے۔ اس کے دو نظریات یعنی "نظریہ طبقاتی جنگ" اور "نظریہ قدر زائد" مشہور ہیں۔ اس کا خیال ہے کہ دور حاضر کے معاشرہ کی تاریخ طبقاتی جنگ کی تاریخ ہے۔ اقتصادی طور پر خوشحال طبقہ مزدور طبقہ کے مفاد کو لوٹ کھسوٹ رہا ہے اور اسے کچلنے کے خواہاں ہے تاکہ اس میں سر اٹھانے کی ہمت ہی نہ رہے۔ یہ سب کچھ سرمایہ دارانہ نظام حکومت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ مارکس "قدر زائد" کا نظریہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے کہ' سرمایہ دارانہ نظام میں معاشرہ میں ذرائع پیداوار پر محض چند ایک افراد کا قبضہ ہوتا ہے اور مزدور اپنی مزدوری سرمایہ دار کے ہاتھ فروخت کرتا ہے۔ سرمایہ دار صرف خام مال مہیا کرتا ہے اور اس خام مال سے مزدور کی محنت کے ذریعہ اشیاء تیار کرواتا ہے اور یہ تیار شدہ اشیاء "تبادلہ" کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے مزدور کو ملنے والی مزدوری اور تیار شدہ مال کی قیمت میں تناسب درست نہیں ہوتا اور اشیاء کی قیمتوں اور مزدوری میں نمایاں فرق ہوتا ہے' جو فاضل سرمایہ یا "قدر زائد" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور یہی فاضل سرمایہ' سرمایہ دار کی تجوری کو زیادہ سے زیادہ بھرپور کرتا جاتا ہے' حالانکہ سرمایہ دار منافع میں اس نمایاں فرق کا حقدار نہیں ہے اور یہ فرق دراصل ان مزدوروں کا حق ہے جنہوں نے پیداوار میں اضافہ کر کے اس کو حاصل کیا۔ مارکس نے قدر زائد کی تعریف مختصر الفاظ میں یوں کی ہے:

"کسی شے کی قیمت فروخت اور اس کے بنانے کی قیمت (لاگت) میں جو فرق ہوتا ہے' اس کو قدر زائد (Surplus Value) کا نام دیا جاتا ہے"

مارکس کا خیال ہے کہ قدر زائد کا حقدار مزدور ہے نہ کہ سرمایہ دار۔

مارکسزم میں سرمایہ دارانہ نظام پر شدید نکتہ چینی کی گئی ہے اور اشتراکی معاشرہ کا انتہائی مفید سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ قرار دیتے ہوئے پرولتاری حکومت قائم کرنے پر زور دیا گیا ہے۔

اشتراک کے اصول : اشتراکیت یا سوشلزم مندرجہ ذیل اصولوں پر قائم ہے۔

(1) مادی نظریہ حیات : اشتراکیت کے بانی مارکس کے نظریات ڈاروِن سے ہم آہنگ ہیں۔ مارکس کا خیال ہے کہ مادہ کے اندر ہمیشہ دو قوتیں برسرِپیکار رہتی ہیں۔ پہلے مادہ کے اندر تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ بعد میں اس میں تضاد کی وجہ سے ماہیتی تبدیلی ظہور پذیر ہو جاتی ہے۔ انسان مادہ کی اسی تبدیلی کے نتیجہ میں وجود میں آیا ہے۔ بالفاظ دیگر انسان مادی جرثومے کی ترقی

یافتہ شکل ہے۔

مارکس کا خیال ہے کہ معاشرہ کے اندر دو طبقات موجود ہوتے ہیں جن میں تضاد اور ٹکراؤ ہوتا ہے۔ اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں ایک نیا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

الغرض یہ کہ اشتراکی نظریات میں مادہ ہی مادہ کارفرما ہے اور روحانیت اور مذہب کا نام ونشان نہیں۔

(2) **دہریت** : لینن کے نزدیک مذہب اور خدا کا تصور مذہبی پیشواؤں' زمینداروں اور سرمایہ داروں نے پیدا کیا ہے تاکہ وہ غریب اور نچلے طبقہ میں مذہب کی آڑ لے کر لوٹ کھسوٹ کے ذریعہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔ سوشلزم کے حامیوں کا خیال ہے کہ مذہب ایک افیون ہے' اسے ہر حالت میں ختم کر دینا چاہیے۔

(3) **طبقاتی کشمکش** : مارکس کا خیال ہے کہ جو طبقہ معاشیات پر قابض ہوتا ہے وہ ریاست پر بھی قابض ہو جاتا ہے اور دوسرے محروم طبقہ کی زندگی اجیرن کر دیتا ہے۔ پھر پسا ہوا طبقہ معاشی اور سیاسی آزادی کے لئے کوشاں ہو جاتا ہے' حتیٰ کہ وہ معاشیات پر قابض ہو کر حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے۔ یہ چکر یونہی چلتا رہتا ہے اور نئے طبقات وجود میں آتے رہتے ہیں۔ مارکس کا خیال ہے کہ جب غیر طبقاتی سماج پیدا ہو جائے گا وہ آخری سٹیج ہو گی جسے سوشلزم یا اشتراکیت کا نام دیا جائے گا۔

(4) **نظریہ قدر زائد** : مارکس کا خیال ہے کہ کوئی بھی مادی شے اپنی ماہیت مزدور اور کاریگر کے ہاتھوں تبدیل کرتی ہے' قیمت کی اس بڑھوتری کا نام "قدر زائد" ہے مارکس کا خیال ہے کہ مزدور یا کاریگر کی قدر زائد میں سے بہت زیادہ حصہ سرمایہ دار بلا معاوضہ اور بلا محنت حاصل کر لیتا ہے۔ یوں مزدوروں کا استحصال ہوتا ہے اور دولت سرمایہ دار کے پاس جمع ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ مارکس کا کہنا ہے کہ سرمایہ دار کا منافع حاصل کرنا دراصل مزدور کی محنت کا استحصال ہے۔ یوں جب دولت ایک ہاتھ میں اکٹھی ہو جاتی ہے تو ارتکاز اور افراط زر جیسی خرابیاں جنم لیتی ہیں اور ملک میں معاشی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی صورت حال سے سامراجیت ابھرتی ہے۔

(5) **خاندانی نظام سے انکار** : سوشلزم میں خاندان کو سرمایہ داری کی علامت قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ کنبہ یا خاندان کا سوشلزم میں کوئی وجود نہیں۔ لینن نے حلال اور حرامی بچوں میں کوئی فرق نہیں رکھا۔

(6) **شخصی ملکیت سے انکار** : مارکس نجی ملکیت کو سرمایہ دار طبقہ کا استحصالی حربہ قرار دیتا ہے۔ لینن کا کہنا ہے کہ آئیڈیلسٹ معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں تمام چیزیں یعنی زمین اور فیکٹریاں مشترکہ ملکیت ہوتی ہیں اور لوگ مشترکہ طور پر کام کرتے ہیں۔

(7) **پارٹی کی ڈکٹیٹرشپ** : اشتراکی نظام میں بظاہر ہر شہری انتخابات میں حصہ لے سکتا ہے لیکن دراصل تمام تر اقتدار کیونسٹ پارٹی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جو شخص اس پارٹی کا رکن

نہ ہو وہ انتخاب میں بطور امیدوار کھڑا نہیں ہو سکتا۔ امیدوار کا انتخاب کمیونسٹ پارٹی کرتی ہے۔ نامزدگی کو الیکشن اور پارٹی کی آمریت کو جمہوریت کا نام دیا جاتا ہے۔

(8) **لیڈروں کی ڈکٹیٹر شپ** : پارٹی کے اختیارات نمائشی ہیں۔ اصل اختیار پارٹی کے لیڈروں کے پاس ہوتا ہے۔ اشتراکیت اپنی اصلی نوعیت کے اعتبار سے لیڈر کی شخصی آمریت اور فرد واحد کی استبدادی بادشاہت کا دوسرا نام ہے۔

(9) **مزدوروں کی آمریت** : کارل مارکس کا خیال ہے کہ عبوری دور میں مزدوروں کی آمریت (پرولتاری ڈکٹیٹر شپ) کا قیام ضروری ہے تاکہ سرمایہ داروں کے بقیہ نشانات اور پوشیدہ اثرات سے معاشرہ کو صاف کیا جائے۔ اشتراکی لیڈروں کا خیال ہے کہ مزدوروں کی آمریت بہت تیزی اور شدت سے قائم کرنی چاہیے۔

سوشلزم کی خصوصیات : سوشلزم کی مندرجہ ذیل خصوصیات ہیں:

(1) **ملی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح** : سوشلزم میں قومی اور ملی مفاد کو انفرادی مفاد پر ترجیح دی جاتی ہے۔

(2) **معاشی مساوات** : سوشلزم معاشی ناہمواریوں کو ختم کرنے کا داعی ہے۔ سوشلزم کے حامیوں کا خیال ہے کہ اس نظام سے افراط زر' ارتکاز زر' احتکار زر اور آجر و مستاجر کی ناہمواریاں ختم ہو جائیں گی۔

(3) **سرمایہ داری کا خاتمہ** : سوشلزم کے لیڈروں کا خیال ہے کہ اشتراکی نظام کے نفاذ سے سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو جائے گا۔

(4) **جاگیردارانہ سماج کا خاتمہ** : سوشلزم کا دعوی ہے کہ اس نظام کے ذریعہ جاگیرداری نظام کا خاتمہ ہو جائے گا اور لوگوں کو جاگیرداروں کے مظالم سے نجات مل جائے گی۔

(5) **مقابلہ اور مسابقت کی نفی** : سوشلزم میں مقابلہ اور مسابقت وغیرہ کی تحریک کی نفی ہوتی ہے۔

(6) **معاشرہ کی اہمیت** : اشتراکیت فرد کے بجائے معاشرہ پر زور دیتی ہے۔ اس میں اجتماعی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دی جاتی ہے۔ تاہم فرد کی آزادی کو برقرار رکھنے کی داعی ہے۔

(7) **معاشی عنصر کی اہمیت** : اشتراکیت میں معاشی عنصر کو نہایت اہمیت حاصل ہے' بقیہ عناصر مثلاً" مذہبی' سیاسی' معاشرتی اور ثقافتی عناصر ذیلی حیثیت رکھتے ہیں۔

کمیونزم (Communism) : کمیونزم سے مراد ہے: اشتمالیت' مال و دولت کو مشترکہ بنانے کا نظریہ یا اصول۔ یہ نظریہ نجی ملکیت اور جسمانی امتیاز کے خلاف ہے۔ کمیونزم کی رو سے ملک کے تمام وسائل پیداوار پر ریاست (عوام) کا قبضہ ہونا چاہیے اور ان میں سے ہر فرد کو

ضرورت کے مطابق حصہ دینا چاہئے۔ کیمونزم کو اس کے بانی کارل مارکس کے نام پر "مارکسزم" بھی کہتے ہیں۔

کیمونزم اور سوشلزم میں فرق : کیمونزم اور سوشلزم بظاہر دو نظام ہیں' لیکن حقیقت میں ایک ہیں۔ سوشلزم کیمونزم اور سرمایہ داری کے درمیانی وقفہ کا نام ہے۔ اس حد تک دونوں متفق ہیں کہ ذرائع پیداور آزاد ہوں اور کسی طبقہ کا ان پر حق نہ ہو۔ کوئی کسی کی محنت کا استحصال نہ کرے۔

کیمونزم میں انقلاب پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ سے لانے کا پروگرام وضع کیا گیا ہے' لیکن سوشلزم میں انقلاب بذریعہ جمہوریت کی حمایت کی گئی ہے۔

کیمونزم میں ذاتی جائیداد کا حق تسلیم نہیں کیا جاتا' جبکہ سوشلزم میں محدود ذاتی جائیداد کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔

اشتراکیت و اشتمالیت کی خوبیاں :

1- اشتراکیت واشتمالیت میں ذاتی ملکیت کا تصور ختم ہو جاتا ہے اور ملک من حیث القوم تیزی سے ترقی کی جانب بڑھتا ہے۔ اس نظام میں کارخانے' زرعی زمین' باغات' تجارتی مراکز اور منڈیاں وغیرہ سرکاری کنٹرول میں ہوتی ہیں۔ ہر شخص حسب ہمت کام کرتا ہے اور مقررہ ضروریات زندگی حاصل کرتا ہے۔

2- تمام ملک کے ذرائع پیداوار ایک ہی نظر و نسق کے قبضہ میں آ جانے سے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ ایک طرف طے شدہ منصوبہ کے مطابق ان سب کو زیادہ سے زیادہ ترقی دینے کی جدوجہد کی جائے اور دوسری طرف تمام ملک کی ضروریات کو سامنے رکھ کر پورا کرنے کی منظم کوشش کی جائے۔ بالفاظ دیگر اس نظام کی موجودگی میں جامع منصوبہ بندی کی جا سکتی ہے۔

3- پیداوار میں ضرورت کے مطابق کمی بیشی کی جا سکتی ہے۔ اس طرح نہ تو بے جا مال کا ذخیرہ ہونے پاتا ہے اور نہ ہی کمی رہتی ہے' یعنی رسد اور طلب میں ایک توازن برقرار رہتا ہے

4- اجتماعی منصوبہ بندی کے ذریعے روزگار کی فراہمی حکومت کی اولین ترجیح ہوتی ہے' اس طرح زیادہ سے زیادہ لوگوں سے کام لیا جا سکتا ہے اور ان کی اہلیت سے بھرپور فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے

5- معذوروں اور کام نہ کر سکنے والے لوگوں کی مالی دستگیری حکومت خود کرتی ہے۔

6- مصنوعی قلت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اس لئے ریٹ مناسب رہتے ہیں۔

7- امیر و غریب میں بعد کم ہو جاتا ہے۔

8- بیروزگاری ختم ہو جاتی ہے۔ کوئی بھوکا اور محتاج نہیں رہتا۔

9- حکومت میں ایک ہی پارٹی ہوتی ہے' حزب مخالف کا وجود نہیں ہوتا' اس لئے حکومت مضبوط بنیادوں پر کام کرتی ہے۔

10- اجارہ داری اور ملکیتی حقوق نہ ہونے کے باعث رشوت کے مواقع بہت کم پیش آتے ہیں۔
11- نظام تعلیم بہتر ہو جاتا ہے اور تمام لوگوں کو تعلیمی اداروں سے مفاد حاصل کرنے کے یکساں مواقع حاصل ہوتے ہیں۔
12- صرف ایسی سکیمیں تیار کی جاتی ہیں جن سے پوری قوم کو فائدہ پہنچے' یوں فضول و غیر ضروری اخراجات سے چھٹکارا مل جاتا ہے۔
13- کوئی شخص نسب اور خاندان کی بناء پر معزز و برتر نہیں ہوتا۔
14- سوشلسٹ یا کمیونسٹ ملک دوسرے ملکوں سے زیادہ ترقی کرتا ہے اور دوسروں سے زیادہ طاقتور بن جاتا ہے۔

خرابیاں : سوشلزم اور کمیونزم میں مندرجہ ذیل خامیاں پائی جاتی ہیں :

1- سوشلزم اور کمیونزم دونوں مذہب کے دشمن ہیں اور لوگوں کے مذہبی عقائد کو مٹانے کے درپے رہتے ہیں۔ یوں لوگ دہریئے اور کافر ہو جاتے ہیں۔ اخلاقیات جو مذہب کا ایک حصہ ہے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ ان کے نزدیک روحانیت نام کی کوئی چیز نہیں۔
2- کمیونزم کے لئے کروڑوں لوگوں کا خون بہایا گیا اور ہزاروں لوگوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔ اس نظام کو نافذ کرنے کے لئے ظلم و ستم کے جو پہاڑ توڑے گئے ان کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی۔ گویا یہ نظام ظلم کی بنیاد پر قائم کیا گیا ہے۔
3- آزادی کے نام پر لوگوں سے ان کی حقیقی آزادی چھین لی جاتی ہے اور لوگ لیڈروں کے غلام ہو کر رہ جاتے ہیں۔
4- حلال اور جائز طور پر محنت کی کمائی سے بنائی ہوئی جائیداد پر ہر انسان کا اپنا حق ہے لیکن کمیونزم اور سوشلزم میں یہ حق سلب کر لیا گیا ہے' جو سراسر زیادتی ظلم ہے۔
5- اشتراکی نظام میں دو طبقے پیدا ہو گئے۔ ایک انتظامیہ جس نے رحم اور بے حیا انتظامیہ کا کردار ادا کیا ہے۔ اور دوسرے عوام جن کو بھیڑ بکریاں بنا کر ان سے ہر میدان میں غلاموں کی طرح کام لیا جاتا ہے۔
6- کمیونزم اور سوشلزم میں پارٹی کی ڈکٹیٹر شپ قائم ہوتی ہے۔ ایک جماعتی حکومت ہونے کی وجہ سے اس میں بہت سی قباحت پیدا ہو جاتی ہے اور جب اس پارٹی کو یقین ہو جاتا ہے کہ اسے حکومت سے الگ نہیں کیا جا سکتا تو وہ اپنی من مانی کاروائیوں پر اتر آتی ہے۔
7- حکومت کے خلاف اٹھنے والی آواز کو دبانے کے لئے انٹیلی جینس کا جال بچھایا گیا ہے' جس سے بے اطمینانی اور مسلسل اضطراب کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح جہاں لوگ اپنا سکون کھو بیٹھے وہاں حکومت پر سے اعتماد بھی ختم ہو جاتا ہے۔
8- ذاتی ملکیت کا تصور ختم ہونے سے کام نہ کرنے اور صرف فائدہ حاصل کر کے مقاصد ابھرنے لگتے ہیں اور ہر ملک زوال پذیر ہو جاتا ہے۔
9- سوشلزم اور کمیونزم خود اپنے بنائے ہوئے اصولوں پر قائم نہیں رہ سکے۔ ان کے

کتابی اصول اور ہیں اور عملی اصول اور یعنی ہاتھی کے دانت کھانے اور دکھانے کے اور۔

10- ان ہر دو نظام کی مثال "ساجھے کی ہنڈیا" ہے جو چوراہے میں پھوٹتی ہے۔ دنیا نے دیکھ لیا ہے کہ داناؤں کا کہنا جھوٹ نہیں۔ سوویت یونین کی ساجھے کی ہنڈیا چوراہے میں پھوٹ چکی ہے۔

تقابلی جائزہ

سوال : اسلام اور سوشلزم و کمیونزم کا تقابلی جائزہ پیش کیجئے؟

جواب : اسلام اور سوشلزم و کمیونزم کا تقابلی جائزہ :

سوشلزم و کمیونزم	اسلام
(1) کمیونزم اور سوشلزم سراسر ملحدانہ نظام ہیں۔	(1) اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ نظام ہے۔
(2) کمیونزم میں طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔	(2) اسلام میں طاقت کا سرچشمہ ذات الٰہی ہے۔
(3) کمیونزم کے مطابق انسان مادہ سے ترقی کر کے بنا ہے۔	(3) اسلام کے مطابق انسان کو اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے۔
(4) کمیونزم کے مطابق انسان کا طبعی جسم موت کے بعد فنا ہو جائے گا اور دوبارہ اسی شکل میں زندہ نہیں ہو سکے گا۔	(4) اسلام کے مطابق انسانوں کو قیامت کے بعد دوبارہ زندہ کر کے حساب کتاب لیا جائے گا اور اعمال کی جزا و سزا ملے گی۔
(5) کمیونزم کے مطابق تمام موضوعات اور جدوجہد معیشت کے گرد گھومتی ہے۔	(5) اسلامی عقیدہ کے مطابق اللہ تعالیٰ ہر ذی روح کا روزی رساں ہے۔ اسے روزی کمانے کے لئے محنت کرنی چاہئے۔ خدا اس محنت میں برکت ڈال دیتا ہے۔
(6) کمیونزم میں دنیا کو دو طبقات میں تقسیم کر کے اسے دو طبقات کی جنگ قرار دیتے ہوئے کہا گیا ہے کہ جب تک ایک طبقہ دوسرے کو برباد نہیں کر دیتا' امن ناممکن ہے۔	(6) اسلام میں طبقہ یا پارٹی کا کوئی تصور نہیں۔ تمام انسان حضرت آدم کی اولاد ہونے کی بناء پر آپس میں بھائی بھائی ہیں۔
(7) کمیونزم صرف مادہ ترقی پر زور دیتا ہے۔	(7) اسلام مادی اور روحانی ترقی دونوں کو اہمیت دیتا ہے اور مادہ پر روحانیت کا غلبہ حاصل کرنے پر زور دیتا ہے۔
(8) کمیونزم کی بنیاد طبقات کی باہمی منافرت پر	(8) اسلام کی بنیاد اخوت پر ہے اور وہ طبقات

کمیونزم	اسلام
ہے	کی مذمت کرتا ہے۔
(9) کمیونزم نجی ملکیت کو ختم کرتا ہے۔	(9) اسلام صرف افراط زر' ذخیرہ اندوزی اور ناجائز کمائی کی مذمت کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص حلال طریقہ سے کمائی کر کے اپنی کوئی جائیداد بنا لے تو اس کی ممانعت نہیں۔ اسلام نجی حق ملکیت کو تسلیم کرتا ہے۔
(10) کمیونزم معاشی تفاوت کو بزعم ختم کرنے کا حامی ہے۔	(10) اسلام معاشی اصلاحات کے ذریعے غربت اور بیروزگاری ختم کرنے کا حامی ہے۔ اس مقصد کے لئے زکوٰۃ کا نظام موجود ہے۔
(11) کمیونزم میں سود کاری کا نظام مروج ہے۔	(11) اسلام میں سود حرام ہے۔
(12) کمیونزم میں حلال و حرام کا تصور موجود نہیں۔	(12) اسلام میں حلال و حرام کا تصور موجود ہے۔
(13) کمیونزم میں فرد کی قطعی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ معاشرہ کا ایک مہرہ ہے' ملت کا مفاد ملت پر حاوی ہے۔	(13) اسلام میں ملت کو بہت اہمیت حاصل ہے' لیکن فرد کی قطعی نفی نہیں کی گئی۔ فرد کو معاشرہ کے بنانے سنوارنے کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے۔
(14) کمیونزم ایک ڈکٹیٹر شپ ہے۔	(14) اسلام میں قطعی امر صرف اللہ ہی کا ہے۔ انسان بحیثیت نائب امیر الٰہی پر عمل کروا سکتا ہے۔ پھر خلیفہ یا امام لوگوں کے مشورہ (شوریٰ) کا پابند بھی ہے۔
(15) کمیونزم کا بانی مارکس ہے جو ایک فانی انسان تھا۔	(15) دین اسلام اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ ہے۔ تمام انبیائے کرام اسی دین پر قائم تھے۔ اسلام کے آخری داعی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔
(16) کمیونزم اور سوشلزم کے نظریات اور قوانین انسانی قوانین ہیں جن میں بے شمار خامیاں ہیں۔	(16) اسلام صرف قوانین الٰہی کا پابند ہے۔ اللہ کے بنائے ہوئے قوانین میں کوئی غلطی یا خامی نہیں۔

اسلام اور جدید

معاشرتی نظریات و تحریکات
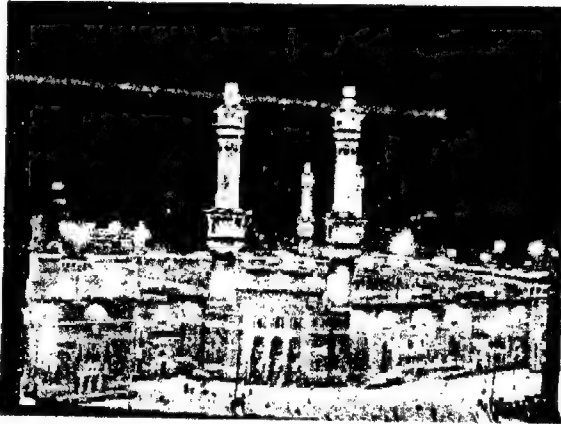
معاشرتی نظریات

معاشرہ

سوال : معاشرہ کی تعریف کیجئے' معاشرہ قائم ہونے کے اسباب بیان کیجئے اور غیر مسلم (مغربی) و مسلم مفکرین کے حوالہ سے معاشرہ کے ارتقاء پر روشنی ڈالئے؟

جواب : معاشرہ کے لفظی معنی :

"معاشرہ" عربی زبان کے لفظ "عاش" سے ماخوذ ہے۔ چنانچہ عاشق' ملیشا' معاشا' معیشا کا مطلب ہے : زندہ رہنا۔ تعیش کے معنی ہیں : اسباب زندگی کے لئے کوشش کرنا۔ اس کا مصدر "العیش" (معنی زندگی' کھانا روٹی) ہے۔ ذریعہ زندگی یا کھانے پینے کی جس چیز سے گذران ہو سکے اسے "معاش" کہتے ہیں۔ معاش سے مراد مل جل کر زندگی گذارنا ہی ہے۔ اسی سے لفظ "معاشرت" ہے جس کے معنی ہیں : کسی کے ساتھ عیش کرنا' یا آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنا۔
"معاشرت" ہی سے لفظ "معاشرہ" بنا ہے جس کے معنی ہیں : مل جل کر زندگی بسر کرنا۔

معاشرہ کی تعریف : مختلف مفکرین اور ماہرین عمرانیات کے نزدیک معاشرہ کی تعریف حسب ذیل ہے:

1- جان ایف سوبر کے نزدیک :
"معاشرہ ایک ایسا انسانی گروہ ہے جو کافی عرصہ اکٹھا رہا ہو' حتیٰ کہ منظم ہو گیا ہو اور جس کے افراد اپنے آپ کو ایک وحدت میں منظم کر لیں۔"

2- کیلر (Callar) کا کہنا ہے کہ :
"معاشرہ ایسے افراد کا مجموعہ ہے جو کہ اشتراک عمل کے ذریعے وسائل حیات کے حصول اور بقائے نسل کے لئے جدوجہد کرے۔"

3- میک لیور (Macluer) کے نزدیک :
"معاشرہ سماجی تعلقات کا وہ نظام ہے جس میں اور جس کے ذریعے ہم زندگی گذارتے ہیں۔"

4- ایف' ایچ گڈنگز (F.H.Giodings) کے نزدیک :
"معاشرہ یا سماج ایک جیسے خیالات رکھنے والے افراد کا مجموعہ ہے' جو ہم خیالی کو پسند کریں اور اس بناء پر مشترکہ مفادات کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں۔"

5- اسپنسر کے نزدیک :
"معاشرہ افراد کی ایک تعداد کا اجتماعی نام ہے اور بس"

6- گنز برگ کا کہنا ہے کہ :
"ہم معاشرہ کی اصطلاح کو اس طرح استعمال کریں گے کہ انسانوں کے درمیان تمام یا

کسی قسم کے بھی تعلقات شامل ہوں' خواہ یہ بلا واسطہ ہوں یا بالواسطہ' منظم ہوں یا غیر منظم' شعوری ہوں یا غیر شعوری۔"

7- رالف لنٹن کے نزدیک:
"معاشرہ لوگوں کا ایسا گروہ ہے جو کافی عرصہ تک اکٹھا رہا ہو اور زندگی گذارتا ہو' اس حد تک کہ اپنے آپ کو ایک وحدت میں منظم کر لیا ہو۔"

معاشرہ کی خصوصیات: "معاشرہ" کی بہت سے تعریفوں سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں:

1- معاشرہ افراد کا ایک بہت بڑا گروہ ہوتا ہے۔
2- معاشرہ افراد کا ایسا مجموعہ ہے جو مشترک مفادات کے لئے ایک دوسرے سے تعاون کرتا ہے۔
3- معاشرہ کو معرض وجود میں آنے کے لئے کافی عرصہ کی ضرورت ہوتی ہے۔
4- معاشرہ میں مختلف قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔
5- معاشرہ باہمی تعاون اور تعلق کی مستقل بنیادوں پر قائم ہوتا ہے
6- ایک معاشرہ کے لوگوں کی تہذیب و ثقافت مشترک ہوتی ہے۔
7- معاشرہ کے تمام ارکان اپنے آپ کو وحدت میں سمجھتے ہیں۔
8- معاشرہ تغیر پذیر ہوتا ہے۔
9- ضروریات زندگی پوری کرنا معاشرہ کا فرض ہے۔

معاشرہ قائم ہونے کے اسباب: معاشرہ قائم ہونے کے مندرجہ ذیل اسباب ہیں:

(i) ضروریات زندگی کی تکمیل
(ii) قرابت داری
(iii) مذہب
(iv) امن و حفاظت کی ضرورت

ضروریات زندگی کی تکمیل: ابتداء میں انسان جب جنگلوں میں رہتا تھا تو درختوں کے پھل کھا کر اور درختوں کے پتوں سے بدن ڈھانپ کر گذارہ کرتا تھا۔ پھر اسے ضروریات زندگی کی تکمیل کے لئے مختلف وسائل کا علم ہوا تو اس نے آلات اور اوزار وغیرہ بنائے۔ پھر وہ مدنی زندگی گذارنے کی طرف مائل ہوا تو ضروریات زندگی میں دوسروں کے تعاون کی ضرورت محسوس ہوئی۔ اس طرح ضروریات زندگی کی تکمیل کی غرض سے معاشرہ وجود میں آیا۔

قرابت داری: معاشرہ قرابت داری کی بناء پر بھی وجود میں آتا ہے۔ معاشرہ افراد کا مجموعہ ہے اور فرد معاشرہ کا ایک رکن ہے۔ ہر فرد کے رشتہ دار ہوتے ہیں' مثلاً" ماں' باپ' بہن' بھائی وغیرہ۔ یہ رشتہ دار مل کر ایک کنبہ تشکیل دیتے ہیں۔ کنبہ سے بڑی شکل خاندان کی ہے۔ کئی خاندان مل کر کسی ایک مقام پر رہتے ہیں تو اس مقام کو گاؤں کا نام دیا جاتا ہے۔ اس طرح بہت سے گاؤں یا شہروں میں بسنے والے لوگ ایک معاشرہ کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ یہ کہا جا

سکتا ہے کہ معاشرہ کے وجود میں آنے کا ایک بڑا سبب قرابت داری بھی ہے۔

مذہب : بہت سے ہم مذہب لوگ مل کر جب ایک گروہ کی صورت میں زندگی گذارتے ہیں تو ایک معاشرہ جنم لیتا ہے۔ ایک معاشرہ کے مذہبی عقائد قریباً" یکساں ہوتے ہیں۔ یا یہ بات یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ ہر شخص کوئی نہ کوئی عقیدہ ضرور رکھتا ہے' جس کا تعلق مذہب سے ہوتا ہے' ایک ہی قسم کے عقائد رکھنے والے لوگ جب ایک ہی جگہ یا علاقہ میں آباد ہوں تو ایک ہی قسم کا معاشرہ وجود میں آتا ہے۔ مذہب معاشرہ کی زندگی کا ضروری عنصر ہے۔

امن و حفاظت کی ضرورت : انسان جب تنہا زندگی بسر کرتا تھا تو اسے بہت سے خطرات درپیش تھے۔ انہی خطرات سے بچنے اور ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اسے دوسروں سے تعاون کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ امن و حفاظت کی ضرورت کے تحت معاشرہ وجود میں آیا۔

معاشرہ کا ارتقاء : ارسطو کا نظریہ : ارسطو کے نزدیک انسان فطری طور پر سیاسی حیوان ہے' اس کو ریاست کی اقدار کا سراغ انسان کی اقتصادی احتیاجات کی تمناؤں کی تکمیل اور افزائش نسل کی فطری خواہش میں ملتا ہے۔ اس فطری خواہش کو پورا کرنے کے لئے لازم ہے کہ مرد اور عورتیں سب مل کر شانہ بشانہ ہو کر پورے انہماک اور یوںکتی سے ایک بااتفاق خاندان کی صورت اختیار کریں۔ یہی خاندان ریاست کے آغاز کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ یہی خاندان جب ارتقاء پذیر ہوتا ہے اور ایک دوسرے کی ضروریات کی تکمیل میں مدد کرتا ہے' یا ایک خاندان دوسرے خاندان کے لئے کام کرتا ہے تو معاشرتی زندگی جنم لیتی ہے۔ یہی معاشرتی زندگی جب اور وسیع ہوتی ہے تو اس کو مکمل معاشرے کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ معاشرہ پہلے تو ایک بستی تک محدود ہوتا ہے اور پھر بڑھتے بڑھتے ایک قصبے' شہر اور ریاست کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔

تھامس ہابس کا نظریہ : تھامس ہابس (Thomas Habbes) کا کہنا ہے کہ انسان میں خود غرضی' خود پسندی اور جارحیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ یہی وہ عناصر ہیں جن سے انسان نے سب سے پہلے کام لیا اور ایک عرصہ دراز تک انہی عناصر کے سہارے زندگی بسر کرتا رہا۔ جب تک انسان میں شعور معاشرہ بندی بیدار نہ ہوا تھا' اس وقت تک انسان ایک بے علم وحشی' کم عقل حیوان اور ظالم متنفس تھا' کیونکہ اپنی زندگی کو برقرار رکھنے کے لئے اس کو دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنا پڑتا تھا اور اپنا پیٹ بھرنے کے غرض سے کئی دوسرے ہم جنس افراد کا پیٹ کاٹنا پڑتا تھا۔ وہ تہذیب و تمدن' علم و ہنر' معاشرت و اقتصادیات اور دیگر فنون وغیرہ جیسی نعمتوں سے یکسر محروم تھا۔ چاروں طرف وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا۔ اس کے علاوہ انسان کر بھی کیا سکتا تھا' کیونکہ اپنی بقا کے لئے اس کو دوسروں کی زندگیوں سے مجبوراً" کھیلنا ہی پڑتا تھا۔ اس حیوان ناطق نے ایک طویل عرصہ تک جنگلوں' ویرانوں' چٹانوں اور غاروں میں زندگی گذاری۔ لیکن جب اکٹھے ہو کر زندگی گذارنے کا شعور پیدا ہوا تو اس سے صرف اتنا فرق پڑا کہ اس کی بربریت اور وحشت پر قدرے کنٹرول ہو گیا اور اپنوں اور بیگانوں کی کچھ پہچان کرنے لگا' لیکن خود غرضی کی ہوس نہ گئی۔ ایک جگہ جمع ہونے کے باوجود' ایک ہی معاشرہ کی تشکیل کرنے کے باوجود' اور ایک ہی مقصد حیات رکھنے کے باوجود اس میں جائز و ناجائز حصول مفاد' استحصال زن و زمینا

ور تفوق بزور قوت مسلسل جاری رہا۔
تھامس ہابس کا کہنا ہے کہ :

انسان کی زندگی غربت' افلاس' تندی اور بربریت پر مبنی تھی۔ اس دور میں نہ تو کوئی حکومت کرنے والا تھا اور نہ ان کی تنظیم کو استوار کرنے والا۔ اس دور میں جس شخص کو جو عقل میں آتا تھا' اور اسی کو سب سے زیادہ جائز تصور کرتا تھا۔ تھامس اس زمانہ کو "قدرتی زمانہ" کا نام دیتا ہے۔ اس قدرتی زمانہ میں باہمی آویزش' خانہ جنگی اور عناد پرستی کو خوب ہوا ملی اور لوگ ایک دوسرے سے جنگ کر کے غالب و مغلوب ہونے ہی کو فیصلہ قرار دیتے۔ اس زمانہ میں ہونے والی حرکات کو ہابس "فطری حالت" کا نام دیتا ہے اور اسے ماقبل سماجی (Pre Social) اور ماقبل سیاسی (Pre Political) زمانہ قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس زمانہ میں انسان تحت زیست' تحفظ عزت' تحفظ جائیداد' شرمندگی' کم علمی' شرم و حیاء' ہوس زر اور حصول اقتدار کی پابندیوں سے آزاد تھا۔

اگر فطری دور میں ہونے والی حرکتوں کو انسان کی عین فطرت تصور کر لیا جائے تو انسان ارسطو کے قول کے مطابق ایک سماجی کیڑا بن کر رہ جاتا ہے۔ تھامس ہابس کے "نظریہ فطری" سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں جو بربریت' خود غرضی اور لالچ جیسے عناصر پائے جاتے ہیں وہ سب کے سب فطری طور پر اس میں موجود تھے اور وہ کسی کے سکھائے نہیں سیکھے گئے اور وہی عناصر آج تک کارفرما ہیں۔

روسو کا نظریہ : جین جیک روسو کے نزدیک انسان قبل از سیاسی ماحول اگرچہ وحشی تھا اور وحشیوں ہی کی طرح زندگی بسر کرتا تھا' لیکن درندوں' پرندوں اور انسانوں کے درمیان اتنا فرق تھا کہ درندے خوفناک وحشی تھے اور انسان ایک شریف وحشی (Noble Sevage) تھا۔ شریف وحشیوں کی آبادی میں اضافہ ہوا' تو افراد گروہوں کی صورت میں رہنے لگے اور جب گروہوں کی صورت میں آباد ہوئے تو کچھ ایسی ضروریات نے جنم لیا کہ ایک دوسرے پر بھروسا کرنا پڑا اور ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر اپنے اور دوسروں کے لئے کام کرنے لگا۔ اس کام کرنے سے ان لوگوں کو مفادات و ضروریات کی تکمیل کے علاوہ آہستہ آہستہ کچھ دولت اندوزی کا مزہ بھی محسوس ہونے لگا۔ چنانچہ دولت مندی کا عنصر جا پذیر ہوا۔ قدرتی زمانے میں انسان کی ہر چیز قدرتی تھی۔ خوراک' رہن سہن' لباس اور ضروریات تمام قدرتی انداز کی تھیں' لیکن جب انسان میں احساس معاشرت پیدا ہوا' تو اس کی قدرتی امور سے کچھ تشنگی محسوس ہونے لگی اور اس تشنگی کو مٹانے کے لئے نئے وسائل پیدا کرنے شروع کر دیئے' جس سے قدرتی وسائل کے علاوہ فنی وسائل کے ذریعے اپنے آپ کو زیادہ تزئین کا سامان مہیا کریں۔ اس تزئین میں خوراک کی نفاست کے علاوہ پوشش کے تمام سامان اور ان کے لئے باقاعدہ ایک جائیداد کا تصور عمل پیرا ہوا۔ بالفاظ دیگر جب معاشرہ میں علوم و فنون نے جگہ لے لی تو اس وقت عوام میں نظریہ جائیداد پیدا ہوا۔ ادھر انسان قدرتی زمانے سے نکل کر تہذیبی دور میں داخل ہوا' ادھر وہ خوشحالی' بے فکری' بے باکی سے ہاتھ دھو کر دنیاوی مسائل' تنازعات' خود غرضی' خود فریبی اور زندہ رہنے کے لئے لامتناہی کشش میں مصروف ہو گیا۔

روسو کا خیال ہے کہ انسان شروع ہی سے ظالم رہا ہے' لیکن بعد میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر امن کا معاہدہ کر لیا۔ اس طرح معاشرہ کی بنیاد پڑی۔

عمرانی معاہدہ : اکثر مفکرین کا خیال ہے کہ معاشرہ عمرانی معاہدہ کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ اس سلسلہ میں تھامس ہابس' جان لاک اور روسو کے نام قابل ذکر ہیں۔ تھامس ہابس کے خیال میں چونکہ فطری ریاست میں وحشت' بربریت اور درندگی کا دور دورہ تھا' چاروں طرف بدامنی اور خوف و ہراس تھا۔ اس لئے افراد نے ضرورت محسوس کی کہ ایک ایسی معاشرت تشکیل دی جائے جس میں تمام افراد اپنے لئے اور اپنے تحفظ کے لئے کچھ پابندیاں قبول کر لیں۔ چنانچہ سب نے مل کر فیصلہ کیا کہ ہر فرد معاشرہ کو حصول امن کے لئے کوشاں رہنا ہو گا اور امن میں خلل ڈالنے والے کا زبردست محاسبہ کیا جائے گا' ہر فرد ایک دوسرے کی ضروریات پوری کرنے میں معاونت کرے گا اور ہر فرد کو اتنی آزادی ہو گی جس سے وہ اپنی زندگی پرامن انداز میں گذار سکے۔

تھامس ہابس کی طرح جان لاک' روسو اور بہت سے دوسرے مفکرین بھی معاہدہ عمرانی کو تسلیم کرتے ہیں۔

اسلامی مفکرین : معاشرہ کے ارتقاء کے بارے میں اسلام کے مفکرین کی آراء درج ذیل ہیں:

فارابی : ابونصر فارابی نے انسان اور دیگر حیوانوں میں مابہ الامتیاز عقل انفعال کو قرار دیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ عقل انفعال ہی انسان کو بام عروج پر پہنچاتی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان میں دو قوتیں ایسی ہیں جو دیگر حیوانات میں نہیں پائی جاتیں۔ پہلی قوت' قوت الناطقہ ہے اور دوسری قوت النزوعیہ۔ انسان قوت ناطقہ کے ذریعے علم حاصل کرتا ہے اور خیر و شر میں تمیز کرتا ہے۔ قوت نزوعیہ انسان میں کسی چیز کی محبت یا اس سے نفرت پیدا کرتی ہے۔ اس قوت کے باعث رنج و خوشی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ فارابی کا خیال ہے کہ انسان مدنی الطبع نہیں ہے بلکہ وہ اپنی قوت نزوعیہ کے باعث جھگڑالو ہے' لیکن قوت ناطقہ اسے اپنی اس جبلت پر قابو پانے کے لئے راہ ہموار کر دیتی ہے اور وہ باہمی فوائد کے پیش نظر آپس کے جھگڑوں سے کنارہ کش ہو جاتا ہے۔

فارابی کا خیال ہے کہ انسان اگرچہ جنگ جو ہے لیکن اپنی ضروریات کی نوعیت اور سامان زندگی کی فراہمی کے پیش نظر مل جل کر کام کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جب بہت سے افراد نظریہ ضرورت کے تحت ملتے ہیں تو "اجتماع" وجود میں آتا ہے۔ یہی اجتماعی معاشرہ کہلاتا ہے۔ فارابی نے اجتماع کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اول اجتماع ناقص مثلاً گلی محلوں اور سڑکوں پر لوگوں کی بھیڑ بھاڑ۔ دوم اجتماع تام۔ شہر کو وہ اجتماع تام کا نام دیتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اجتماع خواہ کتنا ہی ناقص کیوں نہ ہو' اجتماع تام کے لئے ممد و معاون ثابت ہوتا ہے۔

فارابی ریاست کو انسانوں کے ایک معاہدہ عمرانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ انسان اپنی جنگ جو فطرت کے باعث ہر وقت خطرات میں گھرا رہتا تھا۔ ان خطرات سے بچنے کے لئے اس نے دوسروں سے معاہدہ کیا' اس طرح اجتماع وجود میں آیا اور ایک بڑے اجتماع نے مل

کر اپنے لئے ایک حکومتی نظام تشکیل دیا۔ گویا معاشرہ کا وجود میں آنا ایک ریاست یا حکومت کا وجود میں آنا ہے۔

ابن خلدون : ابن خلدون انسانی معاشرہ کو اقتضائے فطرت انسانی کا نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اور اسے "مجتمع" کے نام سے موسوم کرتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسان فطرتاً" مدنی الطبع ہے۔ اس کی ضروریات زندگی کی نوعیت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ تنہا اسے پوری نہیں کر سکتا۔ وہ الگ تھلگ رہ ہی نہیں سکتا۔ ابن خلدون بنیادی ضروریات کی مثال دیتے ہوئے کہتا ہے کہ غذا' جس کے بغیر انسان کسی طرح بھی زندہ نہیں رہ سکتا کے حصول کے لئے بھی متعدد افراد کی مشترکہ کوشش ضروری ہے' مثلاً" کسان آلات زراعت کی فراہمی کے لئے لوہار اور بڑھئی کا محتاج ہے۔ پھر غلہ کو پیسنے اور پکانے والے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ اتنے افراد جمع ہوں' تب کہیں جا کر ایک لقمہ حلق کے نیچے اترتا ہے۔

ابن خلدون کے نزدیک اجتماع انسانی کا محرک دفاع بھی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ قدرت نے حیوانات کی جسمانی ساخت کچھ اس قسم کی رکھی ہے کہ وہ اپنی مدافعت کر سکتے ہیں۔ ان کے سینگ' پنجے اور ناخن آلات حرب کا کام دیتے ہیں' لیکن انسان ان تمام چیزوں سے محروم ہے۔ اسے ان کے بدلے میں دو چیزیں عطا ہوئی ہیں۔ ایک ہاتھ اور دوسری عقل۔ ان دونوں کی مدد سے وہ نت نئے الات بناتا رہتا ہے۔ جن کے ذریعے وہ دشمنوں کا دفاع کر سکتا ہے۔ لیکن محض یہ آلات سے حملوں سے محفوظ نہیں رکھ سکتے' اس لئے وہ ایک ایسے گروہ کا محتاج ہے جس کے ساتھ مل کر وہ اپنی مدافعت کر سکے۔

ابن خلدون کا کہنا ہے کہ جب انسان کی بنیادی ضروریات پوری ہو جاتی ہیں تو اس کے دل میں سامان تعیش کی فراہمی کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اس طرح انسان محض کھیتی باڑی کرنے یا مویشیوں کو پالنے سے ایک قدم اور آگے بڑھاتا ہے۔ وہ صنعت و حرفت کو اپنا ذریعہ معاش بناتا ہے جس کے ذریعے سے عمدہ کھانا' آرام دہ اور خوشنما مکانات' بھڑکیلے اور خوبصورت لباس اسے میسر آتے ہیں اور اس طرح شہر وجود میں آتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ : شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ انسان اپنی حیوانی ضروریات' حفاظت نفس اور بقائے نسل کی خاطر اجتماع کا محتاج ہے' بلکہ دیگر حیوانات کے مقابلہ میں انسان دوسروں کا زیادہ دست نگر ہے کیونکہ اس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل اتنی آسان نہیں' جتنی دیگر جانوروں کی ہے۔ قدرت نے انسان کو اپنے ابنائے جنس سے ملنے کی خواہش عطا کی اور اسے قوت گویائی مرحمت فرما کر ایک دوسرے کے قریب تر کر دیا ہے۔ ان دونوں نعمتوں سے دیگر حیوانات محروم ہیں۔ شاہ ولی اللہ کا کہنا ہے کہ انسان ایک طرف فطرتاً" جماعت پسند ہے تو دوسری طرف اس کی بنیادی ضروریات ایک دوسرے کے قریب تر ہونے پر مجبور کرتی ہیں۔ شاہ صاحب کے نزدیک انسانوں میں حفاظت نفس اور بقائے نسل جیسی حیوانی بنیادی خواہشات کے علاوہ کچھ اس کی خصوصی ضروریات بھی ہوتی ہیں' جن سے دیگر حیوانات عاری ہوتے ہیں۔ مثلاً" کسی اصولی نظریہ پر غور و غوض کرنے کے بعد اس کے لئے جدوجہد کرنے کی قوت' تنوع پسندی اور جبلت تجسس۔ یہ خصوصیات انسانی تعاون کو اور بھی لازمی بنا دیتی ہیں۔ یہ بھی انسانی معاشرے کے وجود کا سبب

بنتی ہیں۔

ارتقائی منازل : شاہ ولی اللہ کے نزدیک معاشرہ کی چار ارتقائی منزل ہیں۔

(1) معاشرہ کی پہلی منزل : اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا اور اسے عقل ودیعت فرمائی' جس کی بناء پر وہ تمام مخلوقات سے ممتاز اور افضل قرار پایا۔ اس نے ضروریات زندگی حاصل کرنے کے لئے عقل سے تدابیر اختیار کیں اور خوراک' لباس اور رہائش کا بندوبست کیا۔ ابھی تک اس کی ضروریات محدود تھیں جنہیں وہ اکیلا ہی پوری کرتا تھا' تاہم اسے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ یہ انسانی معاشرہ کی ابتدائی منزل تھی۔

(2) معاشرہ کی دوسری منزل : انسان کی اولاد' کنبہ' قبیلہ اور خاندان بڑھنے لگا۔ ایک خاندان سے کئی خاندان پیدا ہو گئے۔ اس طرح آبادی بڑھنے لگی۔ انسان نے ضروریات زندگی پوری کرنے اور خطرات سے بچنے کے لئے دوسرے انسانوں سے مدد و معاونت کا معاہدہ کیا۔ کئی خاندان مل کر ایک مقام پر زندگی بسر کرنے لگے تاکہ وہ ایک دوسرے کی مدد سے ضروریات زندگی پوری کر سکیں۔ اب انسان کی زندگی میں تنوع پیدا ہو گیا' جس نے باہمی معاملات میں اضافہ کر دیا۔ چھوٹے گاؤں قصبوں اور شہروں میں تبدیل ہو گئے تو انسان نے دوسری منزل میں قدم رکھا۔

دوسری منزل میں انسان نے اپنی خواہشات اور ضروریات زندگی میں اضافہ کر لیا اور خوب سے خوب تر کا متلاشی ہوا۔ اس منزل میں اس نے مندرجہ ذیل علوم کی بنیاد رکھی:

(i) حکمت معاشیہ (ii) حکمت منزلیہ
(iii) حکمت اکتسابیہ (iv) حکمت تعالیہ
(v) حکمت تعاونیہ

حکمت معاشیہ : انسان نے معاش و معاشرت سے متعلق معلومات حاصل کیں اور ان سے متعلق قواعد و ضوابط اور آداب کا تعین کیا۔ حکمت معاشیہ میں مندرجہ ذیل امور شامل تھے۔

(i) طعام و شراب : یعنی کھانے پینے کی چیزوں کے حصول کے طریقے' ذرائع اور آداب' مثلاً فلاں چیز کھائی جائے یا نہ کھائی جائے' کھانے کے آداب کیا ہیں؟ کھانے کیسے کھایا جائے' کھانا کیسا ہونا چاہئے؟ کھانا کب کھانا چاہئے۔ اسی طرح پینے کی اشیاء سے متعلق آداب۔

(ii) لباس : انسان کو احساس ہوا کہ عریانی بری چیز ہے تو اس نے ستر ڈھانپنے کے لئے لباس ایجاد کیا اور یہ تعین کیا کہ کون کون سے اعضاء کو مستور کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح لباس سے متعلق دوسرے امور متعین کئے۔

(iii) رہائش : انسان نے زندگی بسر کرنے کے لئے مکانات' جھونپڑیاں' چھپر وغیرہ تعمیر کئے اس طرح وہ گرمی اور سردی سے محفوظ ہو گیا۔ انسان نے تعمیرات سے متعلق مختلف امور طے کئے' مثلاً یہ کہ مکان ہوا دار ہو۔ اس کا مواد آسانی سے مل سکتا ہو' وہ اوسط درجہ کا اونچا ہو' اس کی تعمیر میں عیاشانہ تکلف سے کام نہ لیا جائے۔

(iv) **نشست و برخاست** : انسان نے بیٹھنے اٹھنے کے طریقوں کو تعین کیا اور اچھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کو احسن قرر دیا۔ لوگوں سے ملنے جلنے کے آداب متعین کئے۔ عام گذر گاہوں پر جہاں سے عورتیں گذرتی ہیں' بیٹھنے کو معیوب قرار دیا۔

(v) **خفتن** : انسان نے آرام کرنے' سونے اور نیند سے بیدار ہونے کے اوقات کا تعین کیا۔

(vi) **مرض** : انسان نے بیماریوں کا علاج معالجہ دریافت کیا اور بیماری میں دانا لوگوں سے مشورہ لینے اور مجرب ادویہ استعمال کرنے پر توجہ دی۔

(vii) **تسکین جذبہ جنسی** : انسان نے ایک شوہر ایک بیوی کا اصول اپنایا اور عورت کی عصمت کو غیرت کا معیار بنایا۔ شادی بیاہ کے طریقے اور رسوم ایجاد کیں۔ قرار پایا کہ خاوند اور بیوی کے جنسی تعلقات خفیہ ہوں۔ مرد کی بیوی معین ہو تاکہ کوئی دوسرا مرد اس سے ناجائز تعلقات پیدا نہ کر سکے۔

(viii) **سفر** : ضروریات زندگی پوری کرنے اور رشتہ داروں کو ملنے ملانے کے لئے سفر کرنا ضروری تھا۔ اس لئے انسان نے سفر کے آداب متعین کئے' سفر میں کسی ساتھی اور زاد راہ کا ہمراہ ہونا مناسب قرار پایا۔

(ix) **مصائب** : انسان نے مصائب سے نبرد آزما ہونے کے طریقے سیکھے اور مصائب میں ہمت نہ ہارنے اور اللہ (نادیدہ ہستی) پر بھروسہ سیکھا۔ اسی حالت میں وہ شکر و رضا سے بھی آشنا ہوا۔

(x) **مسرت** : انسان نئی نئی مسرتوں سے آشنا ہوا۔ اسے یہ بھی احساس پیدا ہوا کہ جو مسرت اسے حاصل ہے وہ دوسروں کو بھی حاصل ہونی چاہئے۔ چنانچہ اس مین خوشیاں بانٹنے کی صفت پیدا ہوئی۔ اس نے خوشیوں کو اللہ کا فضل قرار دیا۔

حکمت منزلیہ : انسان نے خانگی زندگی گذرنے کے قوعد و ضوابط متعین کئے۔ حکمت منزلیہ کے ضمن میں اس نے مندرجہ ذیل افراد کے حقوق و فرائض متعین کئے:

(i) حقوق الزوجین' یعنی خاوند اور بیوی کے باہمی حقوق و فرائض۔
(ii) اولاد کے حقوق و فرائض یعنی والدین کے اولاد پر اور اولاد کے والدین پر کیا حقوق و فرائض ہیں۔
(iii) آقا اور خادم کے حقوق و فرائض۔
(iv) انسان کے باہمی حقوق و فرائض۔

حکمت اکتسابیہ : بقول شاہ ولی اللہ : انسان اپنی معاش میں رفاہیت اور ذوق حسن یا ظرافت کا خیال رکھے اور کوشش کرے کہ انسان اپنی تمام ضرورتیں اوسط درجہ کی رفاہیت سے پوری کرے۔ اگر یہ کوشش نہ کی جائے تو انسان سخت تکلیف اور رنج و غم میں مبتلا ہو جاتا ہے اور

اتنی حاجتیں جمع ہو جاتی ہیں کہ ایک شخص انہیں بطریق احسن پورا نہیں کر سکتا۔

جب معاشرہ کی ضروریات بڑھ گئیں تو ظاہر ہے کہ ایک شخص تمام کام خود نہیں کر سکتا تھا' اس لئے افراد نے کام آپس میں بانٹ لئے۔ ہر شخص جو کام کرنے لگا' وہی اس کا پیشہ قرار پایا' اس طرح بہت سے پیشہ ور لوگ پیدا ہو گئے' مثلاً "کسان' لوہار' ترکھان' جولاہا' تیلی' موچی وغیرہ۔

جب معاشرہ میں تخصیص پیشہ عمل میں آ گئی تو ان پیشوں کو ضابطہ میں رکھنے کے لئے ایک سیاسی نظام کی ضرورت پیش آئی۔ چنانچہ افراد معاشرہ نے مل کر حکومت کی تشکیل کی۔ یوں ریاست اور حکومت کا آغاز ہوا۔

حکمت تعاملیہ : انسان نے باہمی معاملات طے کرنے کے جو اصول متعین کئے وہ "حکمت تعاملیہ" کہلاتے ہیں۔ لین دین کے معاملات میں خرید و فروخت (بیع)' ہبہ' اعارہ اور قرض وغیرہ کے اصول و ضوابط شامل ہیں۔

حکمت تعاونیہ : امداد باہمی سے متعلقہ اصول و ضوابط "حکمت تعاونیہ" کہلاتے ہیں۔ معاشرہ میں زندگی گزارنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک دوسرے سے تعاون کیا جائے۔ معاشرہ میں رہنے والے تمام افراد کا حق ہے کہ ان کی تمام طبعی ضروریات پوری ہوں' کوئی بھوکا نہ رہے' اس کے پاس کپڑے ہوں اور رہائش کے لئے مکان ہو' صحت اور تعلیم کی عام ضرورتیں پوری ہوں۔ معذور' غریب' یتیم اور بیوہ کی ضروریات کا خیال رکھنا بھی معاشرہ کا فرض ہے۔

حکمت تعاونیہ میں مفاوضت' مزارعت' شرکت صنائع اور مزارعت وغیرہ کے طریقے اور اصول شامل ہیں۔

معاشرہ کی تیسری منزل : جب معاشرہ کے مختلف گروہوں کے مابین ربط قائم کرنے' اجتماعی مفاد کی حفاظت کرنے کے لئے ایک سیاسی نظام قائم ہو جاتا ہے تو معاشرہ تیسری منزل میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس منزل میں حکومت پر بہت سے فرائض عائد ہوتے ہیں۔

معاشرہ کی چوتھی منزل : جب سیاسی نظام مستحکم ہو جاتا ہے تو معاشرہ چوتھی منزل میں قدم رکھتا ہے۔ اس منزل میں بہت سی سیاسی الجھنیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ مثلاً "سیاسی وحدتیں باہم دست و گریبان ہو جاتی ہیں' ایک ریاست ہوس گیری میں مبتلا ہو کر دوسری ریاست پر حملہ کر دیتی ہے۔ پھر بین الاقوامی امن قائم کرنے کا احساس پیدا ہوتا ہے جس کے لئے ایک ایسے نظام کی ضرورت ہوتی ہے جو مختلف وحدتوں کے درمیان نظم قائم رکھ سکے۔

اسلامی معاشرہ

سوال : اسلامی معاشرہ کی خصوصیات پر بھرپور روشنی ڈالئے؟

یا

اسلامی معاشرہ کن خصوصیات کی بناء پر غیر اسلامی معاشروں پر فوقیت رکھتا ہے؟

جواب : اسلامی معاشرہ :

اسلامی معاشرہ کی بنیاد قرآن و سنت پر ہے۔ اسلام لوگوں کو مل جل کر رہنے' آپس میں اچھا برتاؤ کرنے اور ایک دوسرے کی مدد کرنے کا درس دیتا ہے۔ اسلام کے نزدیک روئے زمین کے کل انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ کر توحید و رسالت کا اقرار کر لیتا ہے وہ اسلامی معاشرہ کا ایک رکن بن جاتا ہے اور اس پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی طرز معاشرت کے مطابق زندگی بسر کرے اور معاشرہ کی فلاح و بہبود میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے۔ اسلام ہر فرد معاشرہ کو معاشرہ کا ایک قابل عزت رکن تصور کرتا ہے۔

معاشرہ کا پہلا ادارہ خاندان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو پیدا کرنے کے بعد اس کے لئے ایک بیوی (عورت) بھی پیدا فرمائی تاکہ نسل انسانی پھلے پھولے' ایک کنبہ' خاندان اور پھر معاشرہ کی شکل وجود میں آئے۔ چنانچہ سورۃ الروم میں فرمایا گیا ہے:

> **ومن ایاتہ ان خلق لکم من انفسکم ازواجا لتسکنوا الیھا وجعل بینکم مودۃ و رحمتہ**
>
> (اور یہ بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے تمہی میں سے تمہارے لئے بیویاں پیدا کیں' تاکہ تمہارے لئے راحت اور تسکین کا سامان ہو اور تمہارے درمیان محبت و شفقت پیدا ہو)

سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے۔

> **یا ایھا الناس اتقوا ربکم التی خلقکم من نفس واحدۃ وخلق منھا وبث منھما رجالا کثیرا ونساء۔**
>
> (اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو کہ اس نے تمہیں ایک سے پیدا کیا اور اسی سے اس کو جوڑا پیدا کیا' اور ان دونوں سے بہت سے مرد و عورت پیدا کئے)

جب اللہ تعالیٰ نے ایک مرد اور ایک عورت کو پیدا کیا تو ان کے اختلاط سے بہت سے مرد اور عورتیں پیدا ہوئیں' یوں معاشرہ کا پہلا ادارہ "خاندان" وجود میں آیا۔ پھر کئی خاندان مل کر ایک معاشرہ وجود میں آیا' جسے قرآن پاک ایک ہی گروہ قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ سورۃ یونس میں فرمایا گیا۔

"لوگ ایک ہی گروہ ہیں۔"

اس گروہ کا ہر فرد ایک دوسرے کا بھائی ہے۔ جیسا کہ سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے۔

انما المومنون اخوۃ

(بے شک مومن بھائی بھائی ہیں)

فرمان نبوی ہے:

1- تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

2- جماعت رحمت ہے اور متفرق ہونا عذاب ہے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ تمام مسلمانوں کا مجموعہ ایک جماعت ہے۔ یہی جماعت عرف عام میں معاشرہ کہلاتی ہے۔ اسلام اتحاد و یگانگت کا درس دیتا ہے۔ اس کا مقصد ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہے جس کے افراد آپس میں شیر و شکر ہوں' ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں کام آئیں' کوئی دوسرے کی حق تلفی نہ کرے اور تمام لوگ اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کر کے امن و سکون کی زندگی بسر کریں۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو ایک ہی قوم' ایک ہی جماعت' ایک ہی پارٹی (حزب) اور ایک ہی معاشرہ کے افراد تصور کرتا ہے۔ یہ معاشرہ جغرافیائی حدود میں محدود نہیں' بلکہ روئے زمین پر پھیلا ہوا ہے۔ مسلمان جہاں کہیں' جس ملک میں بھی آباد ہیں' وہ اسلامی معاشرہ کے رکن ہیں۔ یہ امر ثابت کرتا ہے کہ اسلامی معاشرہ ایک عالمگیر اور آفاقی معاشرہ ہے۔

اسلامی معاشرہ کی خصوصیات : ذیل میں اسلامی معاشرہ کی خصوصیات بیان کی جا رہی ہیں۔

فرد : اسلام کے مطابق ہر مسلمان عمومی طور پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور اس پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ خود بھی احکام الٰہی پر سختی سے عمل کرے اور دوسروں کو بھی عمل کرنے کی تلقین کرے۔ اس پر فرض ہے کہ وہ نیکی اور اچھے کاموں کی تبلیغ کرنے کے ساتھ ساتھ جہاں کوئی برائی دیکھے اسے روک دے۔

اسلام میں ہر شخص کو بنیادی انسانی حقوق عطا کیے گئے ہیں' جو "حقوق العباد" کی صورت میں اسلامی معاشرہ کے لئے قانون کا درجہ رکھتے ہیں' مثلاً حرمت جان' جینے کا حق' چادر اور چار دیواری میں نجی زندگی کے تحفظ کا حق' حقوق الزوجین' حقوق الوالدین' ہمسایہ کے حقوق وغیرہ وغیرہ۔

ہر فرد کو حقوق حاصل کرنے کے عوض اپنی ذمہ داریاں پوری کرنا لازم ہے' کیونکہ جو شخص اپنے لئے کوئی چیز پسند کرتا ہے۔ اسے دوسروں کے لئے بھی وہی یا ویسی ہی چیز پسند کرنی چاہئے۔ جو آدمی کسی سے کچھ سیکھ لیتا ہے' اسے کچھ دینا بھی چاہئے۔ اگر تم کسی سے اچھا سلوک کرو گے تو وہ بھی تم سے نیک سلوک کرے گا۔

اسلام میں ہر فرد اپنے اعمال کا ذاتی طور پر جوابدہ ہے۔ جو کرے گا وہی بھرے گا۔ کوئی کسی کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ میرے جرم کی سزا تمہیں نہیں دی جائے گی اور تمہارے گناہوں کی پرسش مجھ سے نہیں ہو گی۔ باپ کے جرم میں بیٹا نہیں پکڑا جائے گا اور باپ بیٹے کے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہو گا۔ چنانچہ کہا جا سکتا ہے کہ فرد مجبور محض نہیں ہے' اس پر جو پابندیاں لگائی گئی ہیں' اسی کی بہتری کے لئے ہیں۔ اسے اس حد تک آزادی دی گئی ہے کہ وہ شریعت کی متعینہ

حدود میں رہتے ہوئے امن و سکون سے زندگی بسر کرے۔

شرف و احترام انسانیت : انسان کو اللہ تعالیٰ نے عقل عطا فرمائی ہے' جس کی بناء پر وہ تمام مخلوقات سے افضل و برتر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک مخصوص مقصد کے لئے پیدا فرمایا۔ وہ مخصوص مقصد یہ تھا کہ اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنائے۔ اللہ تعالیٰ جب انسان کو بنا چکا تو اس نے فرشتوں سے کہا:

انی جاعل فی الارض خلیفہ
(میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں)

فرشتوں کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ جس انسان کو زمین پر خلیفہ بنانے والا ہے وہ زمین کو فتنہ و فساد سے بھر دے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

(جو کچھ میں جانتا ہوں تم نہیں جانتے)

پھر اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد فرشتوں کو حکم دیا کہ وہ انسان اول (آدم) کو تعظیماً" سجدہ کریں۔ سوائے ابلیس کے تمام فرشتے آدم کے آگے جھک گئے۔ چنانچہ انسان مجازی طور پر مسجود ملائک ٹھہرا۔ ظاہر ہے کہ مسجود' ساجد سے افضل و برتر ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان فرشتوں سے افضل قرار پایا۔

اس طرح انسان کے پاس دو فضیلتیں ہو گئیں۔ حیوانات پر فضیلت اور ملائکہ پر فضیلت۔ تیسری فضیلت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کرنے سے پہلے ہی اس کے لئے متعین کر دی تھی' یعنی "خلافت" جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے

انا عرضنا الا مانته علی السماوات والارض والجبال فابین ان یحملنها واشفقنا منها وحَمَلَهَا الانسان انه کان ظلوما جهولا۔ (احزاب)

(ہم نے اس امانت کو آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں پر پیش کیا تھا' مگر انہوں نے اس کا بار اٹھانے سے انکار کیا اور اسی سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اٹھا لیا' بے شک وہ ظالم اور انجام سے بے خبر نکلا)

جس انسان کو اتنی فضیلتیں دی جا رہی ہیں اس کا شکل و صورت میں دوسری مخلوق سے بہتر اور خوبصورت ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام خلق سے بہترین صورت میں تخلیق فرمایا۔

لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم
(ہم نے انسان کو بہتر صورت میں پیدا کیا)

ان تمام اختیارات و صفات کی بناء پر انسان کو عظمت و بزرگی حاصل ہے اور وہ واجب التعظیم ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

ولقد کرمنا بنی ادم
(اور ہم نے آدم کے بیٹوں کو عزت کے قابل بنایا ہے)

اور پھر ہر فرد کا درجہ مقرر کیا' جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

ولکل درجات مما عملوا

(ہر فرد کا درجہ اس کے عمل کا مطابق متعین کیا)

اور معزز و سرفراز کرتے ہوئے اس پر نعمات کی بارش کر دی۔

حملنهم فی البر والبحر ورزقناهم من الطیبات وفضلناهم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا۔ (بنی اسرائیل)

(ہم نے ان کو خشکی اور تری میں سواری دی اور ان کو اچھی چیزوں سے رزق دیا اور ہم نے ان کو بہتوں پر' جنہیں ہم نے پیدا کیا ہے' فضیلت دی ہے)

اور

خلق لکم ما فی الارض جمیعا

(جو کچھ زمین میں ہے اس نے سب کچھ تمہرے (انسانوں کے) لئے پیدا کیا ہے)

اور

سخر لکم فی الارض والفلک تجری بامره

(تمہارے کام میں لگا رکھا ہے' جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمان میں ہے اور (کشتی کو بھی کہ) دریا میں اس کے حکم پر چلتی ہے)

اور

وسخرلکم الشمس والقمر دائبین وسخرلکم اللیل والنهار

(اور تمہارے لئے سورج اور چاند اور دن اور رات مسخر کر دیئے)

چنانچہ قرآن مجید کی مذکورہ بالا آیات سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں انسان کو شرف و احترام حاصل ہے۔

وحدت فکر انسانی : اسلامی معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت وحدت فکر انسانی بھی ہے۔ اسلام بنی نوع انسان کو وحدت فکر پر قائم رہنے کا درس دیتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

واعتصموا بحبل الله جمیعا ولا تفرقوا

(اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوط سے پکڑے رکھو اور ٹکڑے نہ ہو جاؤ)

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ:

"سب لوگ ایک ہی جماعت تھے' پس اللہ نے نبیوں کو بھیجا' خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے اور ان کے ساتھ حق کے ساتھ ایک کتاب اتاری تاکہ لوگوں میں ان باتوں کا فیصلہ کرے جن میں باہم اختلاف کرتے ہیں۔"

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے وحدت فکر انسانی کے اصول نازل کر دیئے ہیں۔ اگر لوگوں کی عقلیں اختلافات اور انتشار کی دلدل میں پھنس جائیں تو وہ ان خدائی اصولوں سے کام لے کر وحدت فکر کی سلک میں منسلک ہو جائیں۔

معاشرہ میں وحدت فکر تبھی برقرار رہ سکتی ہے جب تمام لوگ اللہ کی متعین کردہ حدود میں رہتے ہوئے غور و فکر کریں۔ اسلام کا ہر حکم انسانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ہے' اس لئے ہر شخص کی وہ سوچ بچار جو بنی نوع انسان کی بہتری کے لئے ہو1 وہ قابل ستائش ہے اور اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کا اجر ہے۔ ہر شیطانی سوچ قابل مذمت ہے۔ اسلام عقل کی رہنمائی کے لئے جو اصول متعین کرتا ہے انہی اصولوں کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے غور و فکر کیا جائے تو انسانیت کے حق میں بہترین نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان اصولوں سے تجاوز کرنے پر وحدت فکر قائم نہیں رہ سکتی۔

سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے:

ومن یتبع غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو من الاخرۃ من الخاسرین

(اور جو کوئی اسلام کے سوا کوئی دین چاہتا ہے' تو اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو گا)

اسلامی معاشرہ ایک خدا' ایک رسول اور ایک ہی کتاب (قانون) کا حامل ہے' اس لئے اس کے افکار و نظریات میں ایک وحدت قائم ہے۔

مساوات : اسلامی معاشرہ کی ایک نمایاں خصوصیات مساوات ہے۔ اسلام کی نظر میں تمام انسان ایک ہی باپ کی اولاد ہونے کی حیثیت سے آپس میں بھائی بھائی ہیں:

انما المومنون اخوۃ

(مومن ایک دوسرے کے بھائی ہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

"مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں' کسی کو کسی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنیاد پر۔"

اسلامی معاشرہ میں مساوات کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں' مثلاً:

1- مسجد میں تمام مسلمان مساوی درجہ رکھتے ہیں' ہر امیر و غریب ایک ہی صف میں شانہ سے شانہ ملا کر کھڑا ہوتا۔
2- حج کے موقع پر ہر رنگ' نسل اور وطن کے لوگ ایک ہی جگہ جمع ہوتے ہیں اور ان میں کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔
3- ہر شخص بلا لحاظ رنگ و نسل اور بلا لحاظ مذہب اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔

اسلامی قانون میں ہر شخص کا درجہ مساوی ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم ایک مسلمان کے خلاف دعویٰ دائر کر دے تو جرم ثابت ہونے پر مسلمان شخص کو وہی سزا دی جائے گی جو اسلامی قانون متعین کرتا ہے۔

اسلامی قانون کے مطابق ایک غریب سے غریب آدمی بھی اپنی حق تلفی ہونے پر بڑے سے بڑے اثر و رسوخ رکھنے والے شخص کے خلاف دعویٰ دائر کر سکتا ہے۔ سربراہ ریاست کے خلاف بھی اگر شکایت پیدا ہو تو اسے عدالت میں طلب کیا جا سکتا ہے۔ قانون اسلام سب پر یکساں طور پر

واجب العمل ہے' کوئی شخص قانون سے بالاتر نہیں۔

اسلام میں ہر شخص کو حلال ذرائع سے روزی کمانے کے یکساں مواقع حاصل ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ وسائل پیداوار میں ہر شخص مساوی طور پر حصہ دار ہے۔ ایک اسلامی ریاست میں اگر ملازمت حاصل کرنے کی بات آئے تو ہر شخص کو اہلیت کی بناء پر ملازمت مل سکتی ہے۔

اسلام میں ہر انسان کو وہ تمام حقوق مساوی طور پر حاصل ہیں' جنہیں حقوق العباد کا نام دیا جاتا ہے۔

اجتماعی زندگی : اسلام اجتماعی (معاشرتی) زندگی کو بہت اہمیت دیتا ہے۔ اس کا مقصد ہے کہ تمام لوگ باہم متحد ہو کر ایک خوشگوار زندگی بسر کریں۔ چنانچہ قرآن مسلمانوں کو اجتماعی زندگی گذارنے کے لئے اصول و ضوابط اور قوانین فراہم کرتا ہے' جن پر عمل کرنے سے کسی کی حق تلفی نہیں ہوتی۔

قرآن کا پیغام تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام قرآن مجید کی صورت میں لوگوں تک پہنچا دیئے ہیں۔ سورۃ آل عمران میں فرمایا گیا ہے :

> **ولتکن منکم امتہ یدعون الی الخیر ویامرون بالمعروف وینھون عن المنکر**
>
> (اور تم میں سے ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے جو بھلائی کی طرف بلائے' معروف کا حکم دے اور منکر سے روکے)

مطلب یہ کہ قانون نافذ ہونے کے بعد یہ دیکھنا ضروری ہے کہ آیا اس قانون پر عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی شخص اس قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے روک دینا فرض ہے۔ یہ فرض اجتماع میں سے سرکردہ افراد کا بھی ہے۔ اور اجتماع میں شامل ہر فرد کا بھی۔

عملی اتحاد : ظاہر ہے کہ اجتماع افراد کے اتحاد ہی سے وجود میں آتا ہے۔ اگر اتحاد نہ ہو تو اجتماع کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسلام اتحاد کا عملی درس دیتا ہے۔ مثلاً لوگوں کو متحد کرنے کے لئے اسلام میں پہلا ٹریننگ سنٹر مسجد ہے' جہاں مسلمان پانچ وقت جمع ہو کر خدا تعالیٰ کے حضور سجدہ ریز ہوتے ہیں اور اپنے اتحاد کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں' خدا تعالیٰ کے حضور میں تمام مسلمان برابر ہیں' امیر و غریب' آقا و مولا' گورا' کالا' عربی' عجمی' ہر ایک مساوی حیثیت رکھتا ہے۔ پھر ہر آٹھویں روز نماز جمعہ کے لئے اکٹھے ہوتے ہیں۔ اسی طرح عیدین اور حج کے موقعہ پر عملی اتحاد کا منظر دیکھنے میں آتا ہے۔

عالمگیر معاشرہ : اسلامی معاشرہ ایک عالمگیر معاشرہ ہے۔ اس میں جغرافیائی حدود کا کوئی تعین نہیں۔ کوئی مسلمان دنیا کے جس خطہ میں بھی بستا ہے' وہ اسلامی معاشرہ کا رکن ہے۔ اسلام اپنا پیغام تمام روئے زمین پر رہنے والے انسانوں کے لئے پیش کرتا ہے۔ جو شخص بھی کلمہ طیبہ پڑھ کر توحید و رسالت کا اقرار کرلیتا ہے وہ اسلامی معاشرہ کا ایک رکن بن جاتا ہے۔

اسلامی تصور کے مطابق اللہ تعالیٰ کسی خاص قوم یا گروہ کا رب نہیں' بلکہ وہ "رب الناس" اور "رب العالمین" ہے۔ جیساکہ فرمایا گیا ہے:

(1) الحمد للہ رب العالمین
(تمام تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں (قوموں) کا پروردگار ہے)
(2) قل اعوذ برب الناس
(کہہ' میں پناہ مانگتا ہوں لوگوں کے رب سے)
اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف مسلمانوں ہی کا رب نہیں بلکہ تمام مخلوقات' تمام اقوام اور تمام روئے زمین پر بسنے والے انسانوں کا رب ہے۔
قرآن مجید نے جہاں اللہ کو پوری کائنات کا رب قرار دیا ہے' وہاں نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی پوری انسانیت کے لئے رحمت قرار دیا ہے۔
وما ارسلناک الا رحمتہ اللعالمین
(اور نہیں بھیجا تجھے ہم نے مگر تمام جہانوں کے لئے رحمت بنا کر)
قرآن مجید کے مطابق زمین' آسمان' چاند' سورج' دریا' پانی' پہاڑ' ہوا' آگ' روشنی' دن' رات' بادل' بارش' موسم' جمادات' نباتات' دیگر مظاہر فطرت اور وسائل پیداوار یہاں تک کہ تمام چیزیں انسان کے استفادہ کے لئے پیدا کی گئی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ چیزوں پر کسی ایک فرد کو حق ملکیت حاصل نہیں' بلکہ بلا تخصیص مذہب و ملت ہر انسان ان میں مساوی طور پر حصہ دار ہے۔ اللہ کی نعمتیں دنیا کے تمام انسانوں کے لئے ہیں۔
ان تمام دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسے معاشرہ کا علمبردار ہے جس میں عالمگیر وسعت ہو۔

فطرت سے ہم آہنگی : دین اسلام انسانی فطرت سے ہم آہنگ ہے' اس لئے کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کا نظام فطری نظام پر منطبق ہے۔ اس سے انسانوں کے ان اجتماعی اداروں اور قدرتی تنظیموں کی نفی نہیں ہوتی' جو مختلف قدرتی اسباب و عوامل کے تحت وجود میں آتے ہیں۔ ان قدرتی اداروں اور تنظیموں سے مراد قوموں' قبیلوں اور خاندانوں کے اداب ہیں جو رنگ و نسل' جنس' وطن' زبان اور نسب وغیرہ کے قدرتی رشتوں کی بناء پر وجود میں آتے ہیں اور نظام فطرت کا جزو بنتے ہیں۔ اسلام ان اداروں اور تنظیموں میں سے نہ صرف یہ کہ کسی ادارے اور تنظیم کو ختم کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان میں سے ہر ایک کو مضبوط اور اپنے علا کیر معاشرہ میں ہمیشہ قائم رکھنا چاہتا ہے' کیونکہ یہ ادارے نظام فطرت کے تحت ہیں اور ان کے ساتھ انسانوں کی گونا گوں مصلحتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ چونکہ یہ اجتماعی ادارے انسانوں کی مرضی سے وجود میں نہیں آتے اور انسان اپنے اختیار سے ان کے ساتھ منسلک اور وابستہ نہیں ہوتے' مثلاً ایک انسان پیدائش کے وقت ہی ایک خاندان' ایک قبیلے' ایک قوم اور ایک وطن سے تعلق رکھتا ہے۔ گویا وہ پیدائشی طور پر مختلف چھوٹی بڑی تنظیموں کا رکن ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ ادارے انسان کے اختیار سے باہر اور اٹل اور ناقابل زوال ہیں۔
مرد اور عورت کا باہمی اختلاط ایک فطری عمل ہے۔ اسی لئے اسلام نے مرد اور عورت کو رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کا حکم دیا ہے' اور مجردانہ یا راہبانہ زندگی بسر کرنے کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اسلام نے فطری ضروریات کے پیش نظر نکاح کے باقاعدہ قوانین متعین کئے ہیں۔ اس

نکاح کا مقصد نسل انسانی کی ترویج و ارتقاء بھی ہے۔

سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا ہے:

"ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں مختلف قومیں اور قبیلے بنایا تاکہ تم آپس میں ایک دوسرے کو پہچانو"

اس آیت میں اللہ تعالٰی نے انسانوں کو قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کرنے کی نسبت اپنی طرف کی ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انسانوں کا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہونا منشائے الٰہی کے مطابق اور ایک درست چیز ہے، جسے قائم رہنا چاہئے اور پھر اس آیت میں جو فرمایا گیا ہے کہ مختلف قوموں اور قبیلوں کی تقسیم اس غرض سے ہے کہ انسان آپس میں ایک دوسرے کو پہچان سکیں۔ یعنی یہ تقسیم خود انسانوں ہی کی ایک ضرورت اور مصلحت کی خاطر کی گئی ہے۔

المختصر یہ کہ دین اسلام کے تمام احکام فطرت انسانی کے عین مطابق ہیں اور اسلامی معاشرہ فطرت کے اصولوں سے ہم آہنگ ہے۔

عدل اجتماعی یا آزادی: عدل اجتماعی سے مراد یہ ہے کہ معاشرہ کے ہر فرد کے تمام حقوق پوری طرح محفوظ ہوں، عدل اجتماعی کے معرض وجود میں آنے کے لئے تین باتوں کا ہونا ضروری ہے:

(i) معاشرہ کے ہر فرد کے حقوق محفوظ ہوں

(ii) ہر قسم کے حقوق محفوظ ہوں

(iii) کامل طور پر محفوظ ہوں

چنانچہ جس معاشرہ میں بعض افراد کے حقوق محفوظ اور بعض کے غیر محفوظ ہوں، یا یہ کہ بعض قسم کے حقوق محفوظ اور دوسری قسم کے محفوظ نہ ہوں، یا یہ کہ سب کے ہر قسم کے حقوق محفوظ نہ ہوں، لیکن ناقص ہوں کامل طور پر نہ ہوں تو ان تینوں صورتوں میں معاشرہ کے اندر جو حالت رونما ہوتی ہے، اسے عدل اجتماعی کا مظہر قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسلام معاشرہ میں عدل و انصاف کے قیام پر جو غیر معمولی زور دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اجتماعی امن و امان کا دارومدار عدل پر ہے۔ عدل اجتماعی کے قیام کے لئے دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک ایسا مجموعہ قوانین جو انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق اور انسان کے لئے قابل ہو۔ دوسری چیز ایک ایسا نظام تعلیم و تربیت ہے جو اس قانون کو بروئے کار لانے کے لئے راہ ہموار کرے اور اسے نافذ العمل کرنے کے لئے موثر زمین تیار کرے۔ اسلام اس مقصد کو پورا کرنے کے لئے دونوں چیزیں فراہم کرتا ہے۔ اس کا قانون قرآن مجید کی صورت میں موجود ہے اور اس پر عمل کرنے والے لوگوں کے لئے اس کا علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔

اسلام تمام انسانوں کو مساوی حقوق دیتا ہے اور تمام انسانوں کے لئے ایک ہی قانون نافذ کرتا ہے، جس سے کوئی بھی انسان بالاتر نہیں۔ اس قانون میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں۔ اسلام تمام لوگوں کو عدل و انصاف فراہم کرنے کا ضامن ہے۔

اسلام کا عدل اجتماعیہ قرآن و سنت پر مشتمل ہے۔ انسانوں کے درمیان عدل قائم کرنا اور یہ طے کرنا کہ ان کے لئے کیا چیز عدل ہے، اور کیا عدل نہیں ہے، انسانوں کے خالق ہی کا کام ہے۔

دوسرا کوئی شخص اس امر کا مجاز نہیں کہ وہ عدل و ظلم کا معیار مقرر کرے۔ چنانچہ معیار عدل صرف اور صرف وہی ہے جو کتاب الٰہی (قرآن) نے مقرر فرمایا۔ اسلامی معاشرہ عدل کے معاملہ میں اسی معیار کا پابند ہے

سورۃ الحدید میں فرمایا گیا ہے:

"ہم نے اپنے رسولوں کو روشن نشانیوں کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی تاکہ انسان انصاف پر قائم ہو۔"

سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

"اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں اہل امتنے کے سپرد کرو اور جب لوگوں کے درمیان حکم کرو تو عدل کے ساتھ کرو۔"

سورۃ المائدہ میں فرمایا گیا ہے:

"اور کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کر دے کہ تم عدل نہ کرو' عدل کرو' یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔"

اسلام ہر قسم کے عدل کا علمبردار ہے اور وہ کسی امر میں بھی عدل کو اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔

عادل جماعت وہ جماعت ہے جس کے نظم و قوانین اس قدر سہل الوصول اور آسان ہوں جو اس کے تمام افراد کے لئے ان کی اپنی اپنی استعداد کے مطابق یکساں ترقی کا باعث بنتے ہوں۔ کسی جماعت کو اس وقت تک "عادل" نہیں کہا جا سکتا' جب تک کہ اس کے ذریعہ انسانوں کے ہر ایک گروہ کے لئے وسائل ترقی بہتات کے ساتھ میسر نہ آتے ہوں' چنانچہ اسلام انسانوں کے ہر گروہ کے لئے وسائل ترقی فراہم کرنے کا ضامن ہے۔

جماعتی عدل میں جماعت کے ہر فرد یہ مطالبہ ہوتا ہے کہ وہ جماعتی عدل کو قائم کرنے میں اپنا فرض ادا کرے۔ چنانچہ اسلام میں ہر شخص انفرادی طور پر اپنے فرائض کے لئے جوابدہ ہے۔ اسلامی عقیدہ کے مطابق ہر ایک کو اس دنیا میں ایک خاص مدت امتحان گزارنے کے بعد اپنے خدا کے حضور جا کر حساب دینا ہے' جس کے نتیجہ میں اسے جزا یا سزا ملے گی۔ خدا کے حضور یہ جوابدہی اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہے۔ چنانچہ نظریہ اسلام کے مطابق اسلامی معاشرہ کے ہر فرد پر انفرادی طور پر بہت سے ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں جن کے لئے وہ جوابدہ ہے۔ مثلاً حاکم کا فرض ہے کہ وہ حکومت کا بہترین نظام قائم کرے اور ملک میں امن و امان قائم رکھے اور قانون نافذ کرنے کا بندوبست کرے' عوام کا کام ہے کہ وہ قانون کی حدود میں رہ کر اپنے لئے رزق کمائیں۔ ایک عالم کا کام ہے کہ وہ تبلیغ دین کرے' شاعر کا کام ہے کہ وہ اپنے شعروں کے ذریعہ اسلامی شعائر کی ترویج و اشاعت کرے اور فلاح عامہ کے موضوعات کو اپنائے' مزدور کا کام ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریاں پوری کرے۔ اگر کسی قوم کے افراد اپنے فرائض کی انجام دہی میں کوتاہی کرتے ہیں تو اس صورت میں ساری قوم گنہگار اور ظالم ٹھہرے گی' حتی کہ وہ افراد بھی اس حکم کے تحت آ جائیں گے جو اپنے فرائض صحیح طور پر انجام دے رہے ہیں کیونکہ ان کا فرض ہے کہ جب کوئی شخص اپنے فرائض سے کوتاہی کرے یا غلطی کرے تو اسے راہ راست پر لائیں۔

اجتماعی عدل میں معاشرہ کے اجتماعی ادارے بھی اپنے فرائض اور ذمہ داریاں پوری کرنے کے پابند ہیں۔

اخلاقیات : اخلاقیات بھی اسلامی معاشرہ کا ایک اہم وصف ہے۔ اسلام میں اخلاق حسنہ کو نہایت اہمیت دی گئی ہے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی مذمت کی ہے جو بداخلاق ہے۔ ایک بہترین اور مہذب معاشرہ وہی ہے جس کے طرزِ معاشرت میں اخلاق حسنہ کا حسن و لطافت موجود ہو۔

دعائے نبوی ہے :

واهدني لا حسن الاخلاق لا يهدي لا حسنها الا انت

(اور اے اللہ ! تو مجھ کو بہتر سے بہتر اخلاق کی رہنمائی کر' تیرے سوا کوئی بہتر سے بہتر اخلاق کی راہ نہیں دکھا سکتا)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

1- قیامت کے ترازو میں حسن خلق سے زیادہ بھاری کوئی چیز نہ ہو گی۔ بے شک حسن اخلاق والا اپنے حسن خلق سے ہمیشہ کے روزہ دار اور نمازی کا درجہ حاصل کر سکتا ہے۔
2- مسلمان میں کامل ایمان اس کا ہے جس کا اخلاق سب سے اچھا ہے۔
3- تم میں سے میرا سب سے پیارا اور نشست میں مجھ سے سب سے زیادہ نزدیک وہ ہے جو تم میں سے خوش خلق ہیں اور مجھے ناپسند اور قیامت میں مجھ سے دور وہ ہوں گے جو تم میں سے بد اخلاق ہوں گے۔

اسلام اخلاق حسنہ کو فضائل انسانی قرار دیتا ہے۔ یہ فضائل معاشرہ کی زینت ہیں' اسلام ہر فرد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنے آپ میں تمام فضائل پیدا کریں تاکہ پورا اسلامی معاشرہ نمونہ فضیلت ہو۔

آداب معاشرت : اسلام انسانوں کو رہنے سہنے' اٹھنے بیٹھنے اور کھانے پینے کے آداب سکھاتا ہے' تاکہ ایک مہذب معاشرہ تشکیل پائے۔ یہ باتیں کسی بھی مذہب میں اتنی تفصیل سے نہیں بتائی گئیں اور نہ ہی اسلام کے علاوہ ان باتوں پر کسی نے توجہ دی ہے۔ اسلام میں مندرجہ ذیل آداب سکھائے گئے ہیں :

1- طہارت اور پاکیزگی کے آداب
2- کھانے پینے کے آداب
3- آداب مجلس
4- آداب ملاقات
5- آداب گفتگو
6- گھر میں داخل ہونے اور باہر چلنے پھرنے کے آداب
7- آداب سفر
8- آداب لباس

9- آداب مسرت
10- آداب ماتم
11- جمائی لینے اور چھینکنے کے آداب

المختصر : یہ کہ اسلام ایک فلاح اور مثالی معاشرہ قائم کرنے کے لئے بہترین اصول و ضوابط مہیا کرتا ہے۔ اسلامی معاشرہ کسی محدود سوسائٹی کا نام نہیں بلکہ روئے زمین پر بسنے والے مسلمانوں کو اس طرز زندگی کا نام ہے جو قرآنی اصولوں کے مطابق ہو۔ دنیا کا ہر وہ انسان جس نے ایک بار صدق دل سے کلمہ پڑھ لیا' وہ اسلامی معاشرہ کا رکن بن گیا۔ اس کے بعد ہر رکن پر فرض ہو جاتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات پر عمل پیرا ہو کر اسلامی معاشرہ کی سربلندی میں حصہ دار رہے۔

اسلامی معاشرتی اقدار

تعاون: ''تعاون'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں ایک دوسرے کی مدد کرنا' اور امداد باہمی' مدد' اعانت۔ اصطلاحاً اس کے معنی مشکل وقت میں یا ضرورت کے وقت دوسرے لوگوں کے کام آنا ہے۔ اسلام میں اہل ایمان کو تاکید و نصیحت کی گئی ہے کہ وہ معاشرہ میں تعاون کا ماحول قائم کریں اور ایک دوسرے کے لیت و لعل یا حیل و حجت سے کام نہ لیں۔ تاہم تعاون کی بنیادی شرط بھی قرآن حکیم نے بیان فرمادی ہے کہ:

''اور نیکی اور تقویٰ میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ اور زیادتی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو اور اللہ سے ڈرا کرو۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے۔'' (المائدہ: 2)

اس آیت کی شرح کرتے ہوئے مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنی لکھتے ہیں:

''(آپس میں نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے کی مدد کرو) اس عمومی حکم میں سینکڑوں مسائل داخل ہیں۔ تعاون یعنی آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کی بہت سی صورتیں تو ایسی ہیں جو لوگوں نے اپنی دنیاوی ضروریات کے لیے اختیار کر رکھی ہیں' کسی نے کپڑے کا کارخانہ جاری کر رکھا ہے اور کسی نے نقشوں کے مطابق مکانات تعمیر کرنے کا کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ اسی طرح سے مل ملا کر دنیاوی حاجات اور ضروریات پوری ہو رہی ہیں.......... جو بھی کوئی شخص کوئی بھی نیکی کرنے کا ارادہ کرے' کسی بھی گناہ سے بچنا چاہے' ہر شخص بقدر اپنی قوت و طاقت کے اس کی مدد کرے' جو لوگ علم دین حاصل کرنا چاہیں ان سب کی مدد کریں۔ مدرسے بنانے والوں کی' مسجد تعمیر کرنے والوں کی' مبلغین کی' مصنفین کی' مجاہدین کی اور ہر نیک کام کرنے والوں کی مدد کی جائے۔ یہ مومن کی زندگی کا بہت بڑا اصول ہے.......... یہ جو آج کل فضا بنی ہوئی ہے کہ جو شخص خیر کی دعوت لے کر کھڑا ہو خیر کے کام کرنے کے لیے فکر مند ہو اس کی مدد کی طرف توجہ نہیں کی جاتی' یہ اہل ایمان کی شان کے خلاف ہے۔''

مولانا مفتی محمد عاشق الٰہی صاحب آگے لکھتے ہیں:

''پھر فرمایا (اور نہ مدد کرو گناہ پر اور ظلم پر اور اللہ سے ڈرو! بے شک اللہ سخت عذاب دینے والا ہے) ان الفاظ میں دوسرے رخ پر تنبیہ فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بر (نیکی) اور تقویٰ پر تو آپس میں تعاون کرو لیکن گناہ' ظلم اور زیادتی پر ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہ کرو..........

قرآن کریم کی یہ نصیحت بھی بہت اہم ہی۔ آج کل جہاں بر اور تقویٰ پر مدد کرنے کے جذبات سے مسلمان خالی ہیں وہاں دوسرے رخ کے جذبات ان میں موجود ہیں اور گناہ اور ظلم و زیادتی پر کھلے دل سے مدد کی جاتی ہی۔ آپس میں ایک دوسرے کی مدد کرنے کا معیار دنیاداری کے اصول

پر رہ گیا ہے۔ عموماً اپنوں کی مدد کی جاتی ہے' اپنوں میں اپنے رشتہ دار' اپنے ہم زبان' اپنے ہم وطن' اپنی جماعت کا فرد' اپنی پارٹی کا ممبر دیکھا جاتا ہے' حق اور ناحق کو نہیں دیکھا جاتا.......... اگر دو آدمیوں میں کسی قسم کا جھگڑا ہو تو جو بھی کوئی شخص اپنا ہو بس اس کی مدد کی جاتی ہے' اس کا دعویٰ ناحق ہو اور فریق ثانی پر ظلم کر رہا ہو تب بھی اس کا ساتھ دیں گے اور اسی کی طرف سے بولیں گے' یہ نہ دیکھیں گے کہ اس شخص کی زیادتی ہے جسے ہم اپنا سمجھ رہے ہیں' ہم ظالم کے ساتھ کیوں ہو.......... یہ ایک ایسی وبا ہے جس میں بہت سے دینداری کے دعویدار بھی ملوث ہو جاتے ہیں۔ گناہ اور ظلم پر مدد کرنا حرام ہے۔ ظالم اپنا ہو یا پرایا اس کی مدد کرنے کا شرعاً کوئی جواز نہیں۔"

(انوار البیان' جلد سوم' صفحہ 9 تا 11' ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

حضرت اوس بن شرجیل رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جو شخص کسی ظالم کے ساتھ اس لیے گیا کہ اسے تقویت پہنچائے حالانکہ وہ جانتا ہے کہ وہ ظالم ہے تو یہ شخص اسلام سے نکل گیا۔ (مشکوۃ المصابیح' صفحہ 436 از شعب الایمان)

بہت سے لوگ دوسروں کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت تباہ کر لیتے ہیں یعنی ظلم اور گناہ پر مدد کرتے ہیں تا کہ کسی دوسرے کو نوکری یا عہدہ مل جائے یا کوئی فاسق' فاجر اور بدعنوان بھی ہو تو وہ قومی یا صوبائی اسمبلی کا رکن بن جائے۔ یہ کتنی بڑی حماقت ہے کہ دنیا دوسرے کی بنے اور آخرت کی بربادی اپنے سر تھوپ لی جائے۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد اطہر ہے "قیامت کے دن بدترین لوگوں میں سے وہ شخص بھی ہوگا جس نے دوسرے کی دنیا کی وجہ سے اپنی آخرت برباد کر دی۔"

(رواہ ابن ماجہ باب اذا التقی المسلمان بسیفیھما)

دین اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے جس نے زندگی کے ہر شعبے میں ہماری رہنمائی فرمائی ہے۔ اسلام ہمیں اخوت اور بھائی چارے کا درس دیتا ہے۔ چونکہ انسان فطری طور پر معاشرتی زندگی گزارتا ہے اور معاشرے کے ایک اہم رکن ہونے کی حیثیت سے بہت سی ذمہ داریاں قبول کرتا ہے' لہٰذا دین اسلام نے ان ذمہ داریوں کو احسن طریقے سے انجام دینے کے لیے بہت سے اصول وضوابط مقرر کیے ہیں تا کہ ایک ایسا پرامن' فلاحی اور اسلامی معاشرہ وجود میں آئے جس میں ہر کسی کے حقوق کی ضمانت مہیا کی گئی ہے۔ خلق خدا کو فائدہ پہنچانا' ان کے کام آنا اور تعاون کرنا انسان کی حقیقی عظمت ہے۔ درحقیقت وہی انسان عظمت پاتا ہے جو دوسروں سے تعاون کرتا ہے اور ہر مشکل میں ان کے کام آتا ہے کیونکہ ہم ہر روز یہ مشاہدہ کرتے ہیں کہ دنیا میں جو شخص بھی آیا وہ اپنی عمر پوری کر کے دنیا سے چلا گیا۔ لیکن وہ لوگ جو انسانوں کی خدمت کر گئے خلق خدا کو فائدہ پہنچا گئے ان لوگوں کا ذکر باقی رہتا ہے اور لوگ انہیں ہمیشہ اچھے نام سے یاد رکھتے ہیں۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہوگا عرش بریں پر

انسانوں میں سب سے بہترین شخص بھی وہی ہے جو دوسروں کے لیے اچھا ہو اور دوسروں کو فائدہ پہنچائے۔ مخلوق خدا کے ساتھ بدسلوکی و ایذا رسانی حرام و گناہ کبیرہ اور جہنم میں لے جانے والا کام ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور جو لوگوں کے کام آئے' زمین (یعنی دنیا) میں (نفع رسانی کے ساتھ) رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسی طرح (ہر ضروری مضمون میں) مثالیں بیان کیا کرتے ہیں۔'' (الرعد: 17)

اس دنیا میں عزت اور کامیابی انہی لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو خلق خدا کی خدمت اور اس کو فائدہ پہنچاتے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک ہے ''خیر الناس من ینفع الناس'' یعنی ''لوگوں میں سے اچھا وہ ہے جو لوگوں کو نفع دیتا ہے۔''

لوگوں میں اچھا بننے کا بہترین طریقہ بھی یہی ہے کہ ہم مخلوق خدا سے تعاون کریں کیونکہ اسی میں ہماری دنیاوی کامیابی اور اخروی نجات کا راز مخفی ہے۔ پیارے آقا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص نے ایک مومن کی دنیاوی تکالیف میں سے ایک تکلیف کو دور کیا' اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کی تکالیف میں سے اس کی ایک تکلیف کو دور کردے گا۔''

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے' نہ وہ اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑتا ہے۔ جو شخص اپنے کسی (مسلمان) بھائی کی حاجت روائی کرتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کی حاجت روائی فرماتا ہے اور جو شخص کسی مسلمان کی دنیاوی مشکل حل کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کی مشکلات میں سے کوئی مشکل حل فرمائے گا اور جو شخص کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرتا ہے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کی ستر پوشی کرے گا۔'' (متفق علیہ)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی مخلوق ہے جنہیں اس نے لوگوں کی حاجت روائی (یعنی لوگوں کی مدد کرنے) کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ لوگ اپنی حاجات (کے سلسلے میں) دوڑے دوڑے ان کے پاس آتے ہیں۔ یہ (وہ لوگ ہیں جو) اللہ تعالیٰ کے عذاب سے محفوظ رہیں گے۔'' (طبرانی)

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کو ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی غزوہ پر بھیجا۔ خباب بن ارت رضی اللہ عنہ کے گھر میں کوئی مرد نہ تھا اور عورتوں کو دودھ دوھنا نہیں آتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر روز ان کے گھر جاتے اور دودھ دوھ آیا کرتے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''جو شخص کسی مسلمان کی کوئی دنیاوی تکلیف دور کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی قیامت کے دن کی مشکلات میں سے کوئی مشکل حل کرے گا' جو شخص دنیا میں کسی تنگدست کے لیے آسانی پیدا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کے لیے آسانی پیدا فرمائے گا اور جو شخص دنیا میں کسی مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ دنیا و آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ (اس وقت تک) اپنے بندے کی مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں لگا

رہتا ہے۔" (مسلم، ابوداؤد، ترمذی)

مسلمانوں نے ابتداء میں حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی تو وہاں کے بادشاہ جناب نجاشی نے مسلمانوں کا بہت خیال رکھا تھا۔ ایک دفعہ حبشہ سے مہمان آئے تو صحابہ کرام رضی اللہ عنھم نے چاہا کہ وہ ان کی خدمت کریں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روک دیا اور فرمایا "انہوں نے میرے دوستوں کی خدمت کی ہے۔ اس لیے میں خود ان کی خدمت کا فرض انجام دوں گا۔" ایک دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہو چکے تھے۔ ایک بدو آیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دامن پکڑ کر بولا' اللہ کے پیارے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا ذرا سا کام رہ گیا' ایسا نہ ہو کہ میں بھول جاؤں پہلے اس کو کر دو۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے ساتھ مسجد سے باہر نکل آئے اور اس کا کام کر کے واپس آ کر نماز ادا کی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ دونوں روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جو شخص اپنے (کسی مسلمان) بھائی کے کام کے سلسلہ میں چل پڑا یہاں تک کہ اسے پورا کر دے' اللہ تعالیٰ اس پر پانچ ہزار' ایک روایت میں ہے کہ پچھتر ہزار فرشتوں کا سایہ فرما دیتا ہے۔ وہ اس کے لیے اگر دن ہو تو رات ہونے تک اور رات ہو تو دن ہونے تک دعائیں کرتے رہتے ہیں اور اس پر رحمت بھیجتے ہیں اور اس کے اٹھنے والے ہر قدم کے بدلے اس کے لیے نیکی لکھ دی جاتی ہے اور اس کے اٹھائے والے ہر قدم کے بدلے اللہ تعالیٰ اس کا ایک گناہ مٹا دیتا ہے" (بیہقی فی شعب الایمان' طبرانی' ابن حبان)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ اس وقت تک اپنے بندے کے کام میں مدد کرتا رہتا ہے جب تک بندہ اپنے مسلمان بھائی کے کام میں مدد کرتا رہتا ہے۔"

ثقیف کے کفار جنہوں نے سفر طائف کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پتھر برسائے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لہولہان کر دیا تھا۔ سن 9 ہجری میں جب وفد لے کر مدینہ منورہ آئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں اتارا اور خود ان کی مہمانی کے فرائض انجام دیئے۔ مدینہ منورہ کی لونڈیاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں آتیں اور کہتیں کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیک وسلم! میرا یہ کام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کا کام کر دیتے۔

ان آثار و روایات سے اسلام میں ایک دوسرے سے تعاون کا رویہ اختیار کرنے کا درس ملتا ہے اور یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلامی معاشرت میں تعاون بے حد اہمیت کا حامل ہے۔

خیر خواہی:

دین اسلام اپنے ماننے والوں میں جو رویہ پیدا کرنا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ بندۂ مومن ہر جگہ اور ہر معاملے میں سراپا خیر بن کر رہے۔ وہ اپنے مسلمان بھائیوں اور دوسروں کے لیے ایسی شخصیت ہو کہ وہ اس سے ہمیشہ بھلائی کی توقع رکھیں اور دین و دنیا' غرض یہ کہ کسی بھی اعتبار سے جب بھی اور جہاں کہیں دوسروں کی بھلائی کا

موقع ہو وہ اسے خیر خواہی کے جذبے کے تحت وہاں موجود پائیں۔ خیر خواہی کے معاملات میں وہ اپنے سے زیادہ دوسروں کے مفادات کا خیال رکھے۔ قرآن حکیم میں ہے:

''مومن تو ایک دوسرے کے بھائی ہیں' لہٰذا اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست کرو اور اللہ سے ڈرو امید ہے کہ تم پر رحم کیا جائے گا۔'' (الحجرات: 10)

یہ آیت قرآنی دنیا کے تمام مسلمانوں کی ایک عالمگیر برادری قائم کرتی ہے اور یہ اسی کی برکت ہے کہ کسی دوسرے دین یا مسلک کے پیروؤں میں وہ اُخوت نہیں پائی گئی جو مسلمانوں کے درمیان پائی جاتی ہے۔ اس حکم کی اہمیت اور اس کے تقاضوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بکثرت ارشادات میں بیان ہے: جن سے اس کی پوری روح سمجھ میں آسکتی ہے۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے تین باتوں پر بیعت لی تھی۔ ایک یہ کہ نماز قائم کروں گا دوسرے یہ کہ زکوٰۃ دیتا رہوں گا' تیسرے یہ کہ ہر مسلمان کا خیر خواہ رہوں گا۔ (بخاری' کتاب الایمان)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر ہے۔'' (بخاری' کتاب الایمان' مسند احمد میں اسی مضمون کی روایت حضرت سعید بن مالک رضی اللہ عنہ نے ابھی اپنے والد سے نقل کی ہے)۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان' مال اور عزت حرام ہے۔'' (مسلم' کتاب البر والصلہ' ترمذی۔ ابواب البر والصلہ)

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''مسلمان' مسلمان کا بھائی ہے' وہ اس پر ظلم نہیں کرتا' اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔'' (مسند احمد)

حضرت سہل بن سعد ساعدی رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد روایت کرتے ہیں کہ ''گروہ اہل ایمان کے ساتھ ایک مومن کا تعلق ویسا ہی ہے جیسا سر کے ساتھ جسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ اہل ایمان کی ہر تکلیف کو اسی طرح محسوس کرتا ہے جس طرح سر جسم کے ہر حصے کا درد محسوس کرتا ہے۔'' (مسند احمد)

اسی سے ملتا جلتا مضمون ایک اور حدیث میں ہے' جس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے ''مومنوں کی مثال آپس کی محبت' وابستگی اور ایک دوسرے پر رحم و شفقت کے معاملہ میں ایسی ہے جیسے ایک جسم کی حالت ہوتی ہے کہ اس کے کسی عضو کو بھی تکلیف ہو تو سارا جسم اس پر بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد منقول ہوا ہے کہ ''مومن ایک دوسرے کے لیے ایک دیوار کی اینٹوں کی طرح ہوتے ہیں کہ ہر ایک دوسرے سے تقویت پاتا ہے۔''

(بخاری' کتاب الادب' ترمذی' ابواب

قرآن کریم میں ہے: ''اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی بغض نہ رکھ، اے ہمارے رب! تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔'' (الحشر: 10)

سید مودودیؒ اس آیت مبارکہ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں ایک اہم اخلاقی درس بھی مسلمانوں کو دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ کسی مسلمان کے دل میں کسی دوسرے مسلمان کے لیے بغض نہ ہونا چاہیے...... مسلمانوں کو جس رشتے نے ایک دوسرے کے ساتھ جوڑا ہے وہ دراصل ایمان کا رشتہ ہے۔ اگر کسی شخص کے دل میں ایمان کی اہمیت دوسری تمام چیزوں سے بڑھ کر ہو تو لامحالہ وہ ان سب لوگوں کا خیر خواہ ہوگا جو ایمان کے رشتہ سے اس کے بھائی ہیں۔ ان کے لیے بدخواہی اور بغض اور نفرت اس کے دل میں اسی وقت جگہ پا سکتی ہے جبکہ ایمان کی قدر اس کی نگاہ میں گھٹ جائے اور کسی دوسری چیز کو وہ اس سے زیادہ اہمیت دینے لگے۔ لہٰذا یہ عین ایمان کا تقاضا ہے کہ ایک مومن کا دل کسی دوسرے مومن کے خلاف نفرت و بغض سے خالی ہو۔ اس معاملہ میں بہترین سبق ایک حدیث سے ملتا ہے جو نسائی نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ تین دن مسلسل یہ ہوتا رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی مجلس میں یہ فرماتے کہ اب تمہارے سامنے ایک ایسا شخص آنے والا جو اہل جنت میں سے ہے، اور ہر بار وہ آنے والے شخص انصار میں سے ایک صاحب ہی ہوتے۔ یہ دیکھ کر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کو جستجو پیدا ہوئی کہ آخر یہ کیا عمل آیا کرتے ہیں جس کی بنا پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں بار بار یہ بشارت سنائی ہے۔ چنانچہ وہ ایک بہانہ کر کے تین روز مسلسل ان کے ہاں جا کر رات گزارتے رہے تاکہ ان کی عبادت کا حال دیکھیں۔ مگر ان کی شب گزاری میں کوئی غیر معمولی چیز انہیں نظر نہ آئی۔ ناچار انہوں نے خود ہی ان سے پوچھ لیا کہ بھائی! آپ کیا عمل ایسا کرتے ہیں جس کی بناء پر ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے بارے میں یہ عظیم بشارت سنی ہے؟ انہوں نے کہا میری عبادت کا حال تو آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ البتہ ایک بات ہے جو شاید اس کی موجب بنی ہو، اور وہ یہ ہے کہ ''میں اپنے دل میں کسی مسلمان کے خلاف کپٹ نہیں رکھتا اور نہ کسی ایسی بھلائی پر جو اللہ نے اسے عطا کی ہو، اس سے حسد کرتا ہوں۔''

(تفہیم القرآن۔ سید مودودی، جلد پنجم، صفحہ 403-404)

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلام کی تعریف ہی یہ کی ہے کہ دین خیر خواہی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین کہتے ہیں کہ ہم نے پوچھا: یہ خیر خواہی کس کے لیے ہے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے لیے، اس کی کتاب کے لیے، اس کے رسول کے لیے، مسلمانوں کے حکمرانوں کے لیے اور ان کے عوام کے لیے۔ (مسلم، رقم 55)

اللہ، اس کی کتاب (قرآن حکیم) اور اس کے رسول (حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے خیر خواہی

کا تقاضا اصلاً ان لوگوں سے ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان میں وہ سچے مومن بھی تھے جو ایمان لانے کے بعد زندگی بھر اپنے خلوص کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے۔ ان کی خیر خواہی کی صورت یہ تھی کہ وہ ایمان اور اس کے تقاضوں پر جمے رہیں تو اللہ کی راہ میں پیش آنے والی ہر مشکل کا صبر و ثبات کے ساتھ مقابلہ کریں۔ وہ مسلمان جو ابھی ایمان میں صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اجمعین کی طرح پختہ تو نہ ہوئے تھے' لیکن انہوں نے بہر حال اسلام قبول کر لیا تھا' ان کی طرف سے خیر خواہی کا تقاضا یہ تھا کہ وہ دینی ذمہ داریوں کے حوالے سے گریز کا رویہ اختیار نہ کریں۔ ان کے دل میں اگر کہیں نفاق موجود ہو تو اسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن مجید کی طرف سے عائد کردہ ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے دل کی آمدگی کے ساتھ ہر وقت تیار رہیں۔

اس حدیث میں خیر خواہی سے مراد وہ رویہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور میں اسلام لانے کے بعد اس عہد کے ہر صاحب ایمان سے مطلوب تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کے ادوار میں خیر خواہی سے مراد وہ طرز عمل ہے جو دنیا کے انسانوں کو اختیار کرنا چاہیے۔ اللہ سے خیر خواہی یہ ہے کہ اسے اس دنیا کا خالق و مالک مانا جائے' اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے' اسی سے مانگا جائے' اسی کے سامنے ہاتھ پھیلایا جائے' ہر پریشانی' تکلیف' مصیبت اور ضرورت کے وقت اسی کے دروازے پر دستک دی جائے۔ اس کائنات کے چلانے میں کسی کو اس کا مددگار اور شریک نہ سمجھا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ ایک دن یہ کائنات ختم ہو جائے گی اور ازل سے ابد تک کے سارے انسان اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے اور خدا اپنے بندوں کے ساتھ معاملہ صرف اور صرف عمل صالح کی بنیاد پر کرے گا۔

اس کتاب (قرآن مجید) سے خیر خواہی یہ ہے کہ اسے روزانہ سمجھ کر پڑھا جائے' اس کی تعلیمات پر عمل کیا جائے' اسی کے عقائد اور نظریات کو اپنایا جائے' اسے ہر قسم کی تحریف' تبدیلی اور کمی بیشی سے پاک سمجھا جائے اور اسے دین و دنیا کے ہر معاملے میں حق و باطل کے معیار کی حیثیت دی جائے۔

رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خیر خواہی یہ ہے کہ ان پر اعتماد کیا جائے' ان کی اطاعت کی جائے' جس چیز کو وہ دین قرار دیں اسی کو دین سمجھا جائے' جس چیز پر ان کی گواہی موجود نہ ہو اسے ہرگز دین نہ بنایا جائے (بخاری' رقم 2697)۔ ان سے محبت کی جائے اور دین پر عمل پیرا ہونے میں انہیں نمونہ بنایا جائے۔ کیونکہ اہل ایمان کے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ (اسوۂ حسنہ) قابل تقلید نمونہ ہے۔ (الاحزاب: 21)

مسلمانوں کے حکمرانوں کی خیر خواہی یہ ہے کہ (اگر وہ اللہ کی معصیت اور نافرمانی کا حکم نہ دیں تو) ان کی بات مانی جائے' ان کی اطاعت کی جائے' ان کے حقوق ادا کیے جائیں' ان کے خلاف سازش نہ کی جائے اور نہ ہی سازش کا حصہ بنا جائے' وہ اگر بحیثیت حکمران اللہ کے دین کے تقاضوں کو پورا نہ کر رہے ہوں تو قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے تقریر و تحریر اور دیگر دستیاب ذرائع سے شائستہ اور مہذب انداز میں انہیں انحراف کی طرف توجہ دلا کر اسے دور کرنے پر اصرار کیا جائے۔ اس سلسلے میں ضرورت پڑنے پر قانون کو ہاتھ میں لیے بغیر پر امن احتجاج کا طریقہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ عوام کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہے کہ انہیں دین کی طرف راغب کیا

جائے۔ انہیں آپس میں ایک دوسرے کو حق اور حق پر ثابت قدمی کی ذمہ داری ادا کرنے کی ترغیب دی جائے۔ علماء دانش ور سیاست دان اور حکمران کی اس طرح تربیت کریں کہ ایک جانب وہ اپنی اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے قابل ہوں اور دوسری طرف ملک کے قانون پسند اور پرامن شہری اور تیسری جانب مفاد پرستوں کا آلۂ کار بننے سے بچے رہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں خدا کا دین پہنچایا ہے۔ اس کے باعث ہمیں ہدایت ملی اور ہم دوزخ سے بچنے اور جنت میں جانے کے قابل ہوئے۔ ہمیں چاہیے کہ دل و جان سے اس ہدایت کی قدر کریں اور اپنے محسن اعظم محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے رحمتوں اور برکتوں کی دعا کرتے رہیں۔ قرآن مجید میں یہ ترغیب اس طرح دلائی گئی ہے کہ بے شک اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں۔ اے اہل ایمان تم بھی ان پر (دل کی گہرائیوں سے) درود و سلام بھیجو۔ (الاحزاب۔ 56)

ہماری طرف سے اس دعا کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہماری دعاؤں کے محتاج ہیں اور یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے، جس ہستی پر اللہ اپنی رحمتیں نازل فرماتے ہوں اور فرشتے بھی رحمت کی دعائیں کرتے ہوں اسے ہماری دعاؤں کی حاجت نہیں رہتی۔ درود و سلام کی صورت میں ہماری دعا دراصل نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعے سے ملنے والی ہدایت کے احسان کا اعتراف ہے۔ یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خیر خواہی میں ان جذبات کا اظہار ہے جو سچے اہل ایمان کے دلوں میں سمندر کی لہروں کی طرح ہمیشہ موجزن رہتے ہیں۔

ایثار:

''ایثار'' عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں قربانی، دوسروں کے مفاد کے لیے خود نقصان اٹھانا، تحفہ دینا۔ اصطلاحاً اس سے مراد اپنی ضرورت پر کسی دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا ہے۔ اسلام نے اہل ایمان کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنی معاشرتی زندگی میں ایثار کا رویہ اختیار کریں اور اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کی ضروریات اور احتیاجات کا خیال رکھیں۔ قرآن مجید میں ہے:

> ''یہ (انصاری لوگ) ان لوگوں سے محبت کرتے ہیں جو ہجرت کر کے ان کے پاس آئے ہیں اور جو کچھ ان کو دے دیا جائے، اس کی کوئی حاجت تک یہ اپنے دلوں میں محسوس نہیں کرتے اور اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں۔'' (الحشر۔ 9)

اس آیت مبارکہ میں انصار مدینہ کے فقید المثال ایثار کا ذکر ہے جو انہوں نے مہاجرین کے لیے پیش کیا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ ''مہاجرین کو اللہ تعالیٰ نے جو فضل و شرف عطا فرمائے یا اموال فئی وغیرہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ عنایت کریں اسے دیکھ کر انصار تنگ دل نہیں ہوتے نہ حسد کرتے ہیں۔ بلکہ خوش ہوتے ہیں اور ہر اچھی چیز میں ان کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں۔ خود سختیاں اور فاقے اٹھا کر بھی اگر ان کو بھلائی پہنچا سکیں تو دریغ نہیں کرتے۔ ایسا بے مثال ایثار آج تک دنیا کی کس قوم نے کس قوم کے

لیے دکھلایا...... بڑے کامیاب اور بامراد ہیں وہ لوگ جن کو اللہ کی توفیق ودستگیری نے ان کے دل کے لالچ اور حرص وبخل سے محفوظ رکھا۔ لالچی اور بخیل آدمی اپنے بھائیوں کے لیے کہاں ایثار کرسکتا ہے اور دوسروں کو پھلتا پھولتا دیکھ کر کب خوش ہوتا ہے؟

(تفسیر عثمانی' مولانا شبیر احمد عثمانیؒ مترجم مولانا محمود حسنؒ شیخ الہند نفیس پبلشرز لاہور' صفحہ 715)

حدیث شریف کی کتابوں میں حضرات انصار (رضی اللہ تعالیٰ عنھم) کے حب المہاجرین اور ایثار و قربانی کے متعدد واقعات لکھے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ انصار نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمارے اور ان مہاجرین کے درمیان ہمارے کھجوروں کے باغوں کو تقسیم فرمادیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا نہیں (میں ایسا نہیں کرسکتا)۔ اس پر انصار رضی اللہ عنہ نے مہاجرین رضی اللہ عنھم سے کہا اچھا آپ لوگ پیداوار کی محنت میں مدد کریں اور ہم آپ لوگوں کو پھلوں میں شریک کرلیں گے۔ اس پر مہاجرین نے کہا یہ ہمیں منظور ہے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاضرین سے فرمایا کہ ایسا کون شخص ہے جو اس شخص کی مہمانی کرے' یہ سن کر ایک انصاری صحابی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں ان کو ساتھ لے جاتا ہوں۔ چنانچہ انہیں ساتھ لے گئے اور اپنی بیوی سے کہا کہ دیکھو یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مہمان ہے' اس کا اکرام کرنا ہے۔ بیوی نے کہا کہ ہمارے پاس تو بجز بچوں کی خوراک کے کچھ بھی نہیں ہے۔ شوہر نے کہا کھانا تیار کرو اور بچوں کو سلا دو۔ چنانچہ اس نے کھانا پکایا اور بچوں کو سلا دیا۔ پھر جب کھانے بیٹھے تو عورت اس انداز سے اٹھی کہ گویا چراغ کی بتی درست کرنی ہے لیکن درست کرنے کے بجائے اس نے چراغ بجھا دیا' مہمان کھانا کھارتا رہا اور یہ سمجھتا رہا کہ یہ دونوں بھی میرے ساتھ کھارہے ہیں۔ حالانکہ انہوں نے اس کے ساتھ کھانا نہیں کھایا اور رات بھر بھوکے رہے' صبح کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اللہ کو تمہارا عمل پسند آیا کہ تم بھوکے رہے اور مہمان کو کھلا دیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آیت مبارکہ **"ویوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ"** نازل فرمائی۔ (صحیح بخاری' صفحہ 536' جلد 1)

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ انصار کے عظیم الشان اور عدیم النظیر ایثار سے متعلق لکھتے ہیں:

''مہاجرین جب مکہ اور دوسرے مقامات سے ہجرت کرکے ان کے شہر میں آئے (یعنی مدینہ میں) تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ پیش کش کی کہ ہمارے باغ اور نخلستان حاضر ہیں' آپ انہیں ہمارے اور ان مہاجر بھائیوں کے درمیان بانٹ دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ لوگ تو باغبانی نہیں جانتے' یہ اس علاقے سے آئے ہیں جہاں باغات نہیں ہیں' کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ اپنے ان باغوں اور نخلستانوں میں کام تم کرو اور پیداوار میں سے حصہ ان کو دو؟ انہوں نے کہا سمعنا واطعنا (بخاری۔ ابن جریر)۔ اس پر مہاجرین نے عرض کیا ہم نے کبھی ایسے لوگ نہیں دیکھے جو اس درجہ ایثار کرنے والے ہوں۔ یہ کام خود کریں گے اور حصہ ہم کو دیں گے۔ ہم تو سمجھتے ہیں کہ سارا اجر یہی لوٹ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہیں' جب تک تم ان کی تعریف کرتے رہو گے اور ان کے حق میں دعائے خیر کرتے رہو گے' تم کو بھی اجر ملتا رہے

گا (مسند احمد)۔ پھر جب بنی نضیر کا علاقہ فتح ہوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب بندوبست کی ایک شکل یہ ہے کہ تمہاری املاک اور یہودیوں کے چھوڑے ہوئے باغات اور نخلستانوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے اور پھر اس پورے مجموعے کو تمہارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے۔ اور دوسری شکل یہ ہے کہ تم اپنی جائیدادیں اپنے پاس رکھو اور یہ متروکہ اراضی مہاجرین میں بانٹ دی جائیں۔ انصار رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یہ جائیدادیں آپ ان میں بانٹ دیں اور ہماری جائیدادوں میں سے بھی جو کچھ آپ چاہیں ان کو دے سکتے ہیں۔ اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہم پکار اٹھے جزاکم اللہ یا معشر الانصار خیرا

(یحییٰ بن آدم۔ بلاذری)

اس طرح انصار کی رضامندی سے یہودیوں کے چھوڑے ہوئے اموال مہاجرین ہی میں تقسیم کیے گئے اور انصار رضی اللہ عنہم میں سے صرف حضرت ابودجانہ حضرت سہل بن حنیف اور (بروایت بعض) حضرت حارث بن الصمہ رضی اللہ عنہم کو حصہ دیا گیا کیونکہ یہ حضرات بہت غریب تھے۔ (بلاذری۔ ابن ہشام۔ روح المعانی) اسی ایثار کا ثبوت انصار رضی اللہ عنہم نے اس وقت دیا جب بحرین کا علاقہ اسلامی حکومت میں شامل ہوا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چاہتے تھے کہ اس علاقے کی مفتوحہ اراضی انصار کو دی جائیں مگر انہوں نے عرض کیا کہ ہم اس میں سے کوئی حصہ نہ لیں گے جب تک اتنا ہی ہمارے مہاجر بھائیوں کو نہ دیا جائے۔ (یحییٰ بن آدم)۔ انصار کا یہی وہ ایثار جس پر اللہ تعالیٰ نے ان کی تعریف فرمائی ہے۔"

(تفہیم القرآن۔ جلد پنجم۔ صفحہ 395, 396 شرح سورۃ الحشر آیت نمبر 9)

جب مسجد نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی تعمیر مکمل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار رضی اللہ عنہم کو طلب فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ بن مالک کے مکان میں لوگ جمع ہوئے۔ مہاجرین کی تعداد 455 تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار کی طرف خطاب کر کے فرمایا کہ "یہ تمہارے بھائی ہیں" پھر مہاجرین اور انصار سے دو دو اشخاص کو بلا کر فرماتے گئے کہ یہ اور تم بھائی بھائی ہو اور اب وہ حقیقت میں بھائی بھائی تھے۔ انہوں نے اس روحانی رشتے کو خونی رشتے سے بڑھ کر جانا۔ انصار نے مہاجرین کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا کہ آدھا آپ کا اور آدھا ہمارا ہے۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ربیع نے جو حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کے بھائی قرار پائے ان کی دو بیویاں تھیں۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے کہا کہ ایک کو میں طلاق دیتا ہوں آپ اس سے نکاح کر لیجیے۔ لیکن انہوں نے احسان مندی کے ساتھ انکار کر دیا۔

جب حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ربیع نے حضرت عبدالرحمٰن رضی اللہ عنہ بن عوف کو اپنے نصف مال کی پیش کش کی تو انہوں نے کہا "خدا یہ سب آپ کو مبارک کرے" مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے۔ انہوں نے قینقاع کے مشہور بازار کا راستہ بتا دیا۔ انہوں نے کچھ گھی اور پنیر خریدا اور شام تک خرید و فروخت کی۔ چند روز میں اتنا سرمایہ ہو گیا کہ شادی کر لی۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت کو اتنی ترقی ہوئی کہ خود ان کا قول تھا کہ خاک ہاتھ میں ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے۔ اس سے مہاجرین کی خودداری اور جدوجہد کسب کا پتہ چلتا ہے۔

انصار کے جذبہ ایثار سے مہاجرین کے لیے مکانات کا یہ انتظام ہوا کہ انصار نے اپنے گھروں کے آس پاس افتادہ زمینیں ان کو دے دیں اور جن کے پاس زمین نہ تھی انہوں نے اپنے رہائشی مکانات دے دیئے۔

دین اہل ایمان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ وہ اپنے مومن بھائیوں کی خیر خواہی کرے' ان کی اعانت کرے اور دل کی گہرائیوں سے ایسا ایثار کرے کہ جیسا ایثار انصار مدینہ نے مہاجرین کے ساتھ کیا تھا۔ انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے' کوئی بندہ اس وقت تک ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔'' (متفق علیہ)

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ ایمان کا اصل مقام حاصل کرنے کے لیے اور اس کی خاص برکتیں پانے کے لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان لا کر نیک عمل کرنا ہی کافی نہیں بلکہ چاہیے کہ آدمی خود غرضی سے پاک ہو اور اس کے دل میں وہ اپنے دوسرں بھائیوں کے لیے بھی جذبہ ایثار اتنا ہو کہ جو نعمت اور بھلائی وہ اپنے لیے چاہے وہی دوسرے بھائیوں کے لیے بھی چاہے اور جو بات اور چیز وہ اپنے لیے پسند نہ کرے اس کو کسی دوسرے کے لیے بھی پسند نہ کرے۔ ایک سچا مومن جو اپنے لیے پسند کرتا ہے وہی اپنے بھائیوں کے لیے بھی پسند کرتا ہے بلکہ وہ اس پسند میں ایثار اور قربانی سے کام لیتا ہے اور خود کتنا بھی ضرورت مند ہو اپنی محبوب اور ضرورت کی چیز دوسروں کو دے دیتا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جذبہ ایثار ہی کو فروغ دینے کے لیے اور باہمی نفرتوں کو ختم کرنے کے لیے اہل ایمان کو فرمایا: ''تم ایک دوسرے کو تحائف دیا کرو تم میں باہمی محبت پیدا ہوگی اور دشمنی جاتی رہے گی۔'' (بخاری)

احسان:

احسان عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی مندرجہ ذیل ہیں: (1) نیکی۔ اچھا سلوک۔ مہربانی کا برتاؤ (2) اچھے سلوک کا بار' جسے سلوک کرنے والا یا جس سے سلوک کیا گیا ہو محسوس کرے (3) نیکی۔ عمل خیر (4) اچھے سلوک کا اعتراف۔ ممنونیت (5) (تصوف) نور بصیرت سے حق کا مشاہدہ۔ صفات کے پردے میں ذات باری تعالیٰ کا دیدار۔ مشاہدۂ صفاتیہ جس کو عین الیقین کہتے ہیں۔

قرآن حکیم میں ہے: ''احسان کا طریقہ اختیار کرو۔ بے شک اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔'' (البقرۃ: 195)۔ احسان کا لفظ دراصل حُسن سے نکلا ہے' جس کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سپرد جو خدمت ہو' اسے بس کر دے۔ اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے۔ اپنی پوری قابلیت اور تمام وسائل اس میں صرف کر دے اور دل و جان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض اطاعت کا درجہ ہے' جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف کافی ہوتا ہے۔ اور دوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے' جس کے لیے محبت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔

قرآن حکیم میں انفاق فی سبیل اللہ کر کے پھر احسان جتلانے کی ممنوعیت ہے اور جو لوگ انفاق کے

بعد احسان نہیں جتلاتے انہیں بے پناہ اجر کی نوید سنائی گئی ہے۔فرمایا ''جو لوگ اپنے مال اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کر کے پھر احسان نہیں جتلاتے' نہ دکھ دیتے ہیں' ان کا اجر ان کے رب کے پاس ہے۔اور ان کے لیے کسی رنج اور خوف کا موقع نہیں۔'' (البقرۃ:262)

اس ضمن میں مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ لکھتے ہیں:

''جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ کیے پر نہ زبان سے احسان رکھتے ہیں اور نہ ستاتے ہیں طعن سے اور نہ خدمت لینے سے اور نہ تحقیر کرنے سے۔انہی کے لیے ہے ثواب کامل اور نہ ڈر ہے ان کو ثواب کم ہونے کا اور نہ غمگین ہوں گے ثواب کے نقصان سے۔''

(تفسیر عثمانی' صفحہ 56 مترجم مولانا محمود حسن ؒ)

ایک اور جگہ قرآن حکیم میں فرمایا:

''اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش اپناتے ہیں۔'' (المائدہ:13)

اس آیت مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے احسان کرنے والوں کے لیے پسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے۔

قرآن کریم میں ہے:

''اللہ عدل اور احسان اور صلۂ رحمی کا حکم دیتا ہے۔'' (النحل:90)

اس آیت کی تفسیر میں سید ابوالاعلیٰ مودودی ؒ لکھتے ہیں:

''اس مختصر سے فقرے میں تین ایسی چیزوں کا حکم دیا گیا ہے جن پر پورے انسانی معاشرے کی درستگی کا انحصار ہے۔پہلی چیز عدل ہے جس کا تصور دو مستقل حقیقتوں سے مرکب ہے۔ایک یہ کہ لوگوں کے درمیان حقوق میں توازن اور تناسب قائم ہو۔دوسرے یہ کہ ہر ایک کو اس کا حق بے لاگ طریقہ سے دیا جائے.......... دوسری چیز احسان ہے جس سے مراد ہے نیک برتاؤ' فیاضانہ معاملہ' ہمدردانہ رویہ' رواداری' خوش خلقی' درگزر' باہمی مراعات' ایک دوسرے کا پاس ولحاظ' دوسرے کو اس کے حق سے کچھ زیادہ دینا' اور خود اپنے حق سے کچھ کم پر راضی ہو جانا۔یہ عدل سے زائد ایک چیز ہے جس کی اہمیت اجتماعی زندگی میں عدل سے بھی زیادہ ہے۔عدل اگر معاشرے کی اساس ہے تو احسان اس کا جمال اور اس کا کمال ہے۔عدل اگر معاشرے کو ناگواریوں اور تلخیوں سے بچاتا ہے تو احسان اس میں خوشگواریاں اور شیرینیاں پیدا کرتا ہے۔کوئی معاشرہ صرف اس بنیاد پر کھڑا نہیں رہ سکتا کہ اس کا ہر فرد ہر وقت ناپ تول کر کے دیکھتا رہے کہ اس کا کیا حق ہے اور اسے وصول کر کے چھوڑے' اور دوسرے کا کتنا حق ہے اور اسے بس اتنا ہی دے دے۔ایسے ایک ٹھنڈے اور کھرے معاشرے میں کشمکش تو نہ ہوگی مگر محبت اور شکر گزاری اور عالی ظرفی اور ایثار اور اخلاص و خیر خواہی کی قدروں سے وہ محروم رہے گا جو در اصل زندگی میں لطف و حلاوت پیدا کرنے والی اور اجتماعی محاسن کو نشوونما دینے والی قدریں ہیں.......... تیسری چیز جس کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے' صلۂ رحمی ہے جو رشتہ داروں کے معاملے میں احسان کی ایک خاص

صورت متعین کرتی ہے۔ اس کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ آدمی اپنے رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے اور خوشی و غمی میں ان کا شریک حال ہو اور جائز حدود کے اندر ان کا حامی و مددگار بنے۔ بلکہ اس کے معنی یہ بھی ہے کہ ہر صاحب استطاعت شخص اپنے مال پر صرف اپنی ذاتی اور اپنے بال بچوں ہی کے حقوق نہ سمجھے بلکہ اپنے رشتہ داروں کے حقوق بھی تسلیم کرے۔''

(تفہیم القرآن۔ جلد دوم۔ صفحہ 564 - 556)

قرآن مجید میں ایک مقام پر ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''بے شک اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔''
(النحل: 128)

اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ محسنین کو اللہ تعالیٰ کی معیت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی ان لوگوں کو اللہ کا ساتھ نصیب ہوتا ہے جو احسان کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ محسنین وہ لوگ ہیں جو دوسروں کے ساتھ بھلائی ہی کرتے جاتے ہیں خواہ ان کے ساتھ وہ لوگ کتنی ہی برائی کریں۔ اسی لیے ایک اور جگہ پر ارشاد فرمایا کہ اللہ کی رحمت محسنین کے قریب ہوتی ہے۔

''یقیناً اللہ کی رحمت احسان کرنے والوں (محسنین) کے قریب ہے۔'' (الاعراف: 56)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں پر اپنا مزید فضل یعنی انعامات نازل فرمائیں گے:

''ہم تمہاری خطائیں معاف کریں گے اور احسان کا رویہ رکھنے والوں کو مزید فضل سے نوازیں گے۔'' (الاعراف: 161)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک محسنین (احسان کرنے والے لوگ) کون ہیں؟ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں دیا ہے کہ:

''ضعیف اور بیمار لوگ اور وہ لوگ جو شرکت جہاد کے لیے راہ نہیں پاتے' اگر پیچھے رہ جائیں تو کوئی حرج نہیں جبکہ وہ خلوص دل کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے وفادار ہوں۔ ایسے محسنین پر اعتراض کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اللہ درگزر کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔''
(التوبہ: 91)

آگے فرمایا:

''اسی طرح ان لوگوں پر بھی کوئی اعتراض نہیں جنہوں نے خود آ کر تم سے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے سواریاں بہم پہنچائی جائیں' اور جب تم نے کہا کہ میں تمہارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ مجبوراً واپس گئے اور حال یہ تھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور انہیں اس بات کا بڑا رنج تھا کہ وہ اپنے خرچ پر شریک جہاد ہونے کی قدرت نہیں رکھتے۔'' (التوبہ: 92)

ان آیات میں محسنین ان لوگوں کو کہا گیا ہے جو خدمتِ دین کے لیے بے تاب ہوں' اور اگر کسی حقیقی

مجبوری کے سبب سے یا ذرائع نہ پانے کی وجہ سے عملاً خدمت نہ کر سکیں تو ان کے دل کو اتنا ہی سخت صدمہ ہو جتنا کسی دنیا پرست کو روزگار چھوٹ جانے یا کسی بڑے نفع کے موقع سے محروم رہ جانے کا ہوا کرتا ہے' ان کا شمار خدا کے ہاں خدمت انجام دینے والوں ہی میں ہوگا اگرچہ انہوں نے عملاً کوئی خدمت انجام نہ دی ہو۔ اس لیے کہ وہ چاہے ہاتھ پاؤں سے کام نہ کر سکے ہوں لیکن دل سے تو وہ برسر خدمت ہی رہے ہیں۔ یہی بات ہے جو غزوۂ تبوک سے واپسی پر اثنائے سفر میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رفقاء کو خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی کہ "مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے کوئی وادی طے نہیں کی اور کوئی کوچ نہیں کیا جس میں وہ تمہارے ساتھ ساتھ نہ رہے ہوں۔" صحابہ رضی اللہ عنہ نے تعجب سے کہا "کیا مدینہ میں رہتے ہوئے؟" فرمایا "ہاں' مدینے ہی میں رہتے ہوئے۔ کیونکہ مجبوری نے انہیں روک لیا تھا ورنہ وہ خود رکنے والے نہیں تھے۔"

ایک اور مقام پر اللہ تعالیٰ نے وضاحت فرمائی ہے کہ محسنین کون لوگ ہیں؟ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"مدینے کے باشندوں اور گردونواح کے بدویوں کو یہ ہرگز زیبا نہ تھا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر گھر بیٹھے رہتے اور اس کی طرف سے بے پروا ہو کر اپنے اپنے نفس کی فکر میں لگ جاتے۔ اس لیے کہ ایسا کبھی نہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں بھوک پیاس اور جسمانی مشقت کی کوئی تکلیف وہ جھیلیں' اور منکرین حق کو جو راہ ناگوار ہے اس پر کوئی قدم وہ اٹھائیں' اور کسی دشمن سے (عداوت حق کا) کوئی انتقام وہ لیں اور اس کے بدلے ان کے حق میں ایک عمل صالح نہ لکھا جائے۔ یقیناً اللہ کے محسنوں کا حق الخدمت مارا نہیں جاتا ہے۔" (التوبہ: 120)

اس آیت مبارکہ میں ان لوگوں کو محسنین کہا گیا ہے جنہوں نے اللہ کی راہ میں مشقتیں جھیلیں اور منکرین حق کے خلاف جہاد کیا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے محسنین کے لیے بے پناہ اجر وثواب رکھا ہے۔

"تم میں سے جو محسنین (نیکوکار) ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔"

(الاحزاب: 29)

"اور محسنین (نیک روش اختیار کرنے والوں) کو خوشخبری دے دیجیے۔" (الاحقاف: 12)

"انہیں اپنے رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے محسنین (نیکوکاروں) کی جزاء۔" (الزمر: 34)

"جو کوئی بھلائی (احسان) کمائے گا ہم اس کے لیے اس بھلائی میں خوب کا اضافہ کر دیں گے۔"

(الشوریٰ: 23)

اللہ تعالیٰ محسنین (نیک لوگوں) کی صفات بیان فرماتا ہے:

"جو لوگ ایمان لائے اور نیک عمل کرنے لگے' انہوں نے پہلے جو کچھ کھایا پیا تھا اس پر کوئی گرفت نہ ہوگی بشرطیکہ وہ آئندہ ان چیزوں سے بچے رہیں جو حرام کی گئی ہیں اور ایمان پر ثابت قدم رہیں اور اچھے کام کریں' پھر جس جس چیز سے روکا جائے اس سے رکیں اور جو فرمان الٰہی ہو اسے مانیں' پھر خدا ترسی کے ساتھ نیک رویہ (احسان) رکھیں اللہ محسنین (باکردار لوگوں) کو پسند کرتا ہے۔"

(المائدہ:93)

اللہ تعالیٰ محسنین کو نیک اولاد عطا فرماتا ہے اور راہ راست دکھاتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے محسنین کے لیے دنیوی جزا ہے اور راہ راست دکھا کر وہ اخروی فلاح کا راستہ دکھاتا ہے۔ فرمایا:

"پھر ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق علیہ السلام اور یعقوب علیہ السلام جیسی اولاد دی اور ہر ایک کو راہ راست دکھائی۔ (وہی راہ راست جو) اس سے پہلے نوح علیہ السلام کو دکھائی ہے اور اسی کی نسل سے ہم نے داؤد علیہ السلام' سلیمان علیہ السلام' ایوب علیہ السلام' یوسف علیہ السلام' موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو (ہدایت بخشی)۔ اس طرح ہم محسنین (نیکوکاروں) کو ان کی نیکی کا بدلہ دیتے ہیں۔" (الانعام:84)

احسان ایک ایسی نیکی ہے جس میں کوئی غرض نہیں ہوتی۔ یہ ایک بے غرضانہ عمل ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر علیہ السلام سے فرمایا:

"اور احسان نہ کرو زیادہ حاصل کرنے کے لیے" (المدثر:6)

قرآن مجید کی اس آیت میں گہرا مفہوم مخفی ہے۔ سید مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

'ان کا ایک مفہوم یہ ہے کہ جس پر بھی احسان کرو بے غرضانہ کرو۔ تمہاری عطا اور بخشش اور سخاوت اور حسن سلوک محض اللہ کے لیے ہو اس میں کوئی شائبہ اس خواہش کا نہ ہو کہ احسان کے بدلے میں تمہیں کسی قسم کے دنیوی فوائد حاصل ہوں۔ بالفاظ دیگر اللہ کے لیے احسان کرو' فائدہ حاصل کرنے کے لیے کوئی احسان نہ کرو.......... دوسرا مفہوم یہ ہے کہ نبوت کا جو کام تم کر رہے ہو یہ اگرچہ اپنی جگہ ایک بہت بڑا احسان ہے کہ تمہاری بدولت خلق خدا کو ہدایت نصیب ہو رہی ہے' مگر اس کا کوئی احسان لوگوں پر نہ جتاؤ اور اس کا کوئی فائدہ اپنی ذات کے لیے حاصل نہ کرو..........

تیسرا مفہوم یہ ہے کہ تم اگرچہ ایک بہت بڑی خدمت انجام دے رہے ہو' مگر اپنی نگاہ میں اپنے عمل کو کبھی بڑا عمل نہ سمجھو اور کبھی یہ خیال تمہارے دل میں نہ آئے کہ نبوت کا یہ فریضہ انجام دے کر' اور اس کام میں جان لڑا کر تم اپنے رب پر کوئی احسان کر رہے ہو۔"

(تفہیم القرآن۔ جلد ششم صفحہ 145)

قرآن مجید میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟" (الرحمٰن:60)

یعنی آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی خاطر دنیا میں عمر بھر اپنے نفس پر پابندیاں لگاتے رہے ہوں' حرام سے بچتے رہے ہوں' حق کو حق مان کر تمام حق داروں کے حقوق ادا کرتے رہے ہوں' اور شر کے مقابلے میں ہر طرح کی تکلیفیں اور مشقتیں برداشت کر کے خیر کی حمایت کرتے رہے ہوں' اللہ ان کی یہ ساری قربانیاں ضائع کر دے اور انہیں کبھی ان کا اجر نہ دے؟

اللہ تعالیٰ نے ایمان لا کر احسان جتانے والوں کی شدید سرزنش کی ہے۔ اور فرمایا ہے کہ اگر تم لوگ

ایمان لائے ہو تو دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا تم پر احسان ہے۔

اللہ رب العزت نے فرمایا:

"اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان (مدعیان ایمان) سے کہو' کیا تم اللہ کو اپنے دین کی اطلاع دے رہے ہو؟ حالانکہ اللہ زمین اور آسمانوں کی ہر چیز کو جانتا ہے اور وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ یہ لوگ تم پر احسان جتاتے ہیں کہ انہوں نے اسلام قبول کرلیا۔ ان سے کہو اپنے اسلام کا احسان مجھ پر نہ رکھو' بلکہ اللہ تم پر اپنا احسان رکھتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کی ہدایت دی اگر تم واقعی اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہو۔" (الحجرات:17)

نصیحت:

"نصیحت" عربی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں اچھی صلاح' نیک مشورہ' پند' تنبیہ' گوشمالی' فہمائش' عبرت۔

اسلامی معاشرتی اقدار میں اہم قدر یہ بھی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں افرادِ معاشرہ کے مابین نصیحت و تلقین کا پاکیزہ عمل جاری وساری رہتا ہے۔ یہ عمل غیر اسلامی معاشرہ میں نہیں ہوتا ہے۔ یہ ایک صالح عمل ہے' یہ خیر اور نیکی کی طرف بلانے کا عمل ہے۔ یہ پیغمبرانہ عمل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں لوگوں کی ہدایت وراہنمائی کے لیے یہ انتظام فرمایا کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کے لگ بھگ اپنے جلیل القدر پیغمبر مبعوث فرمائے جن کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ لوگوں کو تبلیغ و نصیحت کے ذریعے سے اللہ کی طرف بلائیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کے ذریعے سے انسانی نسل کی ہدایت کے واسطے الہامی کتب اور صحائف بھی نازل فرمائے اور کلام اللہ کے ذریعے سے نسل انسانی کو نصیحت فرمائی کہ وہ روزِ آخرت میں کامیابی کے لیے اور دائمی خسران سے بچنے کے لیے اعمال صالح کریں اور اللہ کے احکامات پر چلیں۔

اللہ تعالیٰ نے پند و نصائح کے اعلیٰ وارفع پیغمبرانہ عمل کو امتِ محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جاری وساری رکھنے کا حکم قرآن مجید میں بیان فرمایا:

"اور تم میں سے ایک ایسا گروہ ہونا ضروری ہے جو دعوت دیتے ہوں خیر کی طرف' اور حکم کرتے ہوں اچھے کاموں کا اور منع کرتے ہوں برے کاموں سے' اور یہ لوگ پورے پورے کامیاب ہیں۔" (آل عمران:104)

مولانا مفتی عاشق الٰہی مہاجر مدنی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"مسلمان کی اولین ذمہ داری یہ ہے کہ وہ خود اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات پر عمل کرے' نیکیاں کرتا رہے' گناہوں سے بچتا رہے اور دوسری ذمہ داری یہ ہے کہ دوسروں کو خیر کی دعوت دیتا رہے اور برائیوں سے روکتا رہے۔ خود نیک بن جانا اسلامی معاشرہ باقی رکھنے کے لیے کافی نہیں ہے' دوسروں کو بھی خیر کی دعوت دیتے رہیں اور نیکیوں کا حکم کرتے

رہیں اور برائیوں سے روکیں' تب اسلامی معاشرہ باقی رہے گا۔ چونکہ انسان کے اندر بہیمت کے جذبات بھی ہیں اور اس کے پیچھے شیطان بھی لگا ہوا ہے' اس لیے بہت سے لوگ فرائض اور واجبات چھوڑ بیٹھتے ہیں اور گناہوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو صحیح راہ پر باقی رکھنے کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ضرورت ہے۔ آیت بالا میں حکم فرمایا ہے کہ مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہو جو خیر کی دعوت دیتی ہو' امر بالمعروف کرتی ہو اور نہی عن المنکر کرتی ہو' جو کام اللہ کی رضامندی کے ہیں ان کو معروف اور جو کام اللہ کی ناراضگی کے ہیں ان کو منکر کہا جاتا ہے۔"

(انوار البیان' جلد دوم صفحہ 126' 127 ادارہ تالیفات اشرفیہ لاہور)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے اس سبب سے مسلمانوں کو سب سے بہتر امت قرار دیا کہ وہ لوگوں کو بھلائی کی دعوت اور برائی سے روکتے ہیں۔ اس وجہ سے اللہ نے امت مسلمہ کو "خیر امۃ" کہہ کر پکارا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"تم سب امتوں سے بہتر امت ہو جو نکالی گئی لوگوں کے لیے' بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔" (آل عمران: 110)

سنن ترمذی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت مبارکہ کی تلاوت فرمائی اور پھر فرمایا کہ تم سترہویں امت [illegible] امتوں سے بہتر ہو اور اللہ کے نزدیک سب امتوں سے بڑھ کر اکرم ہو (قال الترمذی ھذا حدیث حسن)۔

[illegible] کے اوصاف بھی بتا دیئے اور وہ یہ کہ تم بھلائیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے [illegible] رکھتے ہو' معلوم ہوا کہ اس امت کا طرہ امتیاز امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یعنی اس [illegible] کا عمل جاری رہتا ہے۔

سورۃ توبہ میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اور مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں آپس میں ایک دوسرے کے (دینی) رفیق ہیں۔ یہ لوگ نیک باتوں کی تعلیم دیتے ہیں اور بری باتوں سے منع کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔ عنقریب اللہ تعالیٰ ان پر رحم فرمائے گا۔" (التوبہ: 71)

ایک اور جگہ فرمایا:

"یہ لوگ ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو حکومت دے دیں تو نماز قائم کریں گے اور زکوٰۃ ادا کریں گے اور اچھے کاموں کا حکم دیں گے اور برائیوں سے روکیں گے اور سب کاموں کا انجام اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔" (الحج: 41)

احادیث شریفہ میں بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر (نصیحت کا عمل) کی بہت زیادہ اہمیت اور ضرورت بیان کی گئی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"تم میں سے جو شخص کوئی برائی دیکھے تو اس کو اپنے ہاتھ سے بدل دے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے بدل دے اگر اس کی طاقت نہ ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔" (صحیح مسلم جلد 1 صفحہ 51)

قدرت ہوتے ہوئے بھی نصیحت نہ کرنا (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) سخت وبال کی چیز ہے۔ ہر مسلمان امر بالمعروف ونہی عن المنکر کا پابند ہے اور اس فریضہ کو چھوڑ دینا آخرت سے پہلے دنیا میں بھی عذاب آنے کا ذریعہ ہے۔ اگر اس فریضہ سے پہلو تہی کی جائے تو دعائیں تک قبول نہیں ہوتیں۔

حضرت جریر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا ہے کہ جس قوم میں کوئی ایک شخص گناہ کرتا ہو جسے روکنے پر قدرت رکھے ہوئے وہ لوگ نہ روکیں تو مرنے سے پہلے ان لوگوں پر عذاب آئے گا۔ (رواہ ابوداؤد جلد 1 صفحہ 240)

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں فلاں بستی کا تختہ اس کے رہنے والوں کے ساتھ الٹ دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے پروردگار! ان میں آپ کا فلاں بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے بقدر بھی آپ کی نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ اس بستی کو اس شخص پر اور باقی لوگوں پر الٹ دو کیونکہ اس کے چہرہ پر میرے احکام کے بارے میں کبھی کسی وقت شکن بھی نہیں پڑی۔" (مشکوٰۃ المصابیح باب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے تم ضرور ضرور امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو ورنہ قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہارے اوپر اپنے پاس سے عذاب بھیج دے گا۔ پھر تم اس سے دعا کرو گے تو وہ دعا قبول نہ فرمائے گا۔ (جامع ترمذی)

نصیحت کا عمل فلاح ابدی اور دائمی نجات کا سبب بنے گا۔ قرآن حکیم میں سورۃ عصر میں ارشاد فرمایا:

"زمانے کی قسم کہ انسان خسارہ میں ہے مگر وہ لوگ نہیں جو ایمان لائے اور نیک اعمال کرتے رہے اور آپس میں حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے رہے۔" (العصر: 1 تا 3)

اس سورۃ مبارکہ میں بھی اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ نجات اور کامیابی صرف ان لوگوں کو حاصل ہوگی جو ایمان لائیں گے، صالح اعمال کریں گے اور اپنے معاشرہ میں حق وصبر کی نصیحت اور تلقین کرتے رہیں گے۔ سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"حق کی نصیحت کے ساتھ دوسری چیز جو اہل ایمان اور ان کے معاشرے کو خسارے سے بچانے کے لیے شرط لازم قرار دی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اس معاشرے کے افراد ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کرتے رہیں۔ یعنی حق کی پیروی اور اس کی حمایت میں جو مشکلات پیش آتی ہیں اور اس راہ میں جن تکالیف سے، جن مشقتوں سے، جن مصائب سے اور جن نقصانات اور محرومیوں سے انسان

کو سابقہ پیش آتا ہے ان کے مقابلے میں وہ ایک دوسرے کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کرتے رہیں۔ ان کا ہر فرد دوسرے کی ہمت بندھاتا رہے کہ وہ ان حالات کو صبر کے ساتھ برداشت کرے۔" (تفہیم القرآن' جلد ششم' صفحہ 454)

نصیحت کرنے والے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود بھی اس نصیحت پر عمل کرتا ہو۔ وہ محض دوسروں کو نصیحت نہ کرتا پھرے بلکہ خود بھی باعمل ہو۔ قرآن حکیم میں ہے:

"کیا تم دوسروں کو نیکی کی نصیحت کرتے ہو' اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو' حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو۔ کیا تم عقل سے بالکل ہی کام نہیں لیتے؟" (البقرۃ:44)

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ کیا تم دوسروں کو نصیحت کرتے ہو' اور خود کو بھول جاتے ہو' حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو' یعنی تم تورات کے عالم ہو' جس کی وجہ سے لوگ تمہاری طرف رجوع کرتے ہیں۔ یہ حکم اگرچہ یہودیوں کے لیے تھا' لیکن مسلمانوں کے لیے بطریق اولیٰ ہوگا کہ جو شخص دوسروں کو نصیحت کر رہا ہے اس کو چاہیے کہ وہ اس نصیحت کو پہلے خود پر لاگو کرے۔

حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ بن زید بن حارثہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا کہ قیامت کے دن ایک شخص کو لایا جائے گا اور آگ میں ڈال دیا جائے گا' آگ میں گرتے ہی گرمی کی شدت سے اس کی آنتیں پیٹ سے باہر نکل آئیں گی' اور وہ شخص اپنی آنتوں کے گرد اس طرح گھومے گا جس طرح گدھا چکی کے گرد گھومتا ہے۔ جب اہل جہنم یہ دیکھیں گے تو اس سے پوچھیں گے کہ یہ قصہ کیا ہے؟ تمہیں ایسی سزا کیوں دی جا رہی ہے؟ کیا تم وہ شخص نہیں ہو جو لوگوں کو نصیحت کیا کرتے تھے؟ اس وقت وہ شخص جواب میں کہے گا کہ ہاں! میں اصل میں لوگوں کو تو نصیحت کرتا تھا' لیکن خود نیکی نہیں کرتا تھا۔ (البدایہ' جلد اول صفحہ 187)

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ نصیحت کا آسان ذریعہ قرآن مجید ہے۔ یعنی اسلامی معاشرہ میں جو لوگ پند و نصائح یا وعظ و نصیحت کا کام کریں ان کی دعوت کی بنیاد قرآن مجید ہوگی۔ ارشاد فرمایا:

"یہ قرآن سنا کر نصیحت اور تنبیہ کرتے رہو کہ کہیں کوئی شخص اپنے کیے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے۔" (الانعام:70)

"جب کافر لوگ کلام نصیحت (قرآن) سنتے ہیں تو تمہیں ایسی نظروں سے دیکھتے ہیں کہ گویا تمہارے قدم اکھاڑ دیں گے' اور کہتے ہیں کہ یہ ضرور دیوانہ ہے' حالانکہ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔" (القلم:51, 52)

"اور یہ کسی شیطان مردود کا قول نہیں ہے۔ پھر تم لوگ کدھر چلے جا رہے ہو؟ یہ تو سارے جہان والوں کے لیے ایک نصیحت ہے۔" (التکویر:25, 26, 27)

"درحقیقت یہ پرہیزگاروں کے لیے ایک نصیحت ہے۔" (الحاقۃ: 48)

"بس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اس شخص کو نصیحت کرو جو میری تنبیہ سے ڈرے۔" (ق:45)

"پھر کوئی ہے نصیحت قبول کرنے والا؟ دیکھ لو کیسا تھا میرا عذاب اور کیسی تھیں میری تنبیہات۔ ہم نے اس قرآن کو نصیحت کے لیے آسان ذریعہ بنا دیا ہے۔ پھر کیا ہے کوئی نصیحت قبول کرنے والا؟
(القمر:15, 16, 17)

سورۃ القمر کی آیات مذکورہ بالا کی تفسیر میں سید مودودیؒ نے لکھا ہے:

"جس سیاق و سباق میں یہ الفاظ آئے ہیں اس کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس ارشاد کا مدعا لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ نصیحت کا ایک ذریعہ تو ہیں وہ عبرت ناک عذاب جو سرکش قوموں پر نازل ہوئے اور دوسرا ذریعہ ہے یہ قرآن جو دلائل اور وعظ و تلقین سے تم کو سیدھا راستہ بتا رہا ہے۔ اس ذریعہ کے مقابلے میں نصیحت کا یہ ذریعہ زیادہ آسان ہے۔ پھر کیوں تم اس سے فائدہ نہیں اٹھاتے اور عذاب ہی دیکھنے پر اصرار کیے جاتے ہو؟ یہ تو سراسر اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے یہ کتاب بھیج کر وہ تمہیں خبردار کر رہا ہے کہ جن راہوں پر تم لوگ جا رہے ہو وہ کس تباہی کی طرف جاتی ہیں اور تمہاری خیر کس راہ میں ہے۔ نصیحت کا یہ طریقہ اسی لیے تو اختیار کیا گیا ہے کہ تباہی کے گڑھے میں گرنے سے پہلے تمہیں اس سے بچا لیا جائے۔"
(تفہیم القرآن۔ جلد پنجم صفحہ 235)

باہمی معاملات میں اصلاح بین الناس:

اسلامی معاشرتی اقدار میں سے ایک اہم قدر باہمی معاملات میں اصلاح بین الناس یعنی لوگوں کے درمیان صلح کرا دینا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں نفرتوں، کدورتوں، رنجشوں اور تنازعات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ تاہم انسانی معاشرہ میں اختلافِ رائے اور مفادات کے ٹکراؤ کا پیدا ہونا فطری امر ہے۔ اس سے جھگڑا جنم لے سکتا ہے اور مسلمانوں کے مابین چپقلش اور کشمکش پیدا ہو سکتی ہے۔ اسلام ایک دینِ فطرت ہے اور چونکہ فطرت انسانی سے کماحقہٗ آگاہ و آشنا ہے لہٰذا نزاعی صورتحال سے نپٹنے کے لیے اور افراد اور گروہوں کے مابین جنم لینے والے اختلاف کے تدارک کے لیے احکام و ہدایات نازل فرماتا ہے اور قرآن و سنت کے ذریعے سے اصلاح بین الناس کا عمل جاری کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

"اور اگر ایمان والوں کی دو جماعتیں آپس میں قتال کرنے لگیں تو ان کے درمیان صلح کرا دو، پھر اگر ان میں سے ایک گروہ دوسرے گروہ پر زیادتی کرے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کر رہا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، سو اگر وہ رجوع کرے تو ان دونوں کے درمیان انصاف کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو، بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں، سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو، اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔" (الحجرات:9, 10)

اس آیت مبارکہ میں مسلمانوں کی دو جماعتوں میں صلح کرا دینے کا اور اگر صلح ہو جانے کے بعد دونوں

جماعتوں میں سے کوئی جماعت زیادتی کرے تو اس سے جنگ کا حکم دیا گیا ہے' یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے یعنی لڑائی کو چھوڑ دے اور اللہ کے دین کے مطابق جینے کا فیصلہ کر لے اور صلح کرانے والوں کو بتا دے اور یقین دلا دے کہ اب ہمیں امن ہی پسند ہے۔

بغاوت کو دبانے کے لیے جو جنگ لڑی جائے اس میں جو فریق زیادتی پر اُتر آیا تھا وہ اپنے ارادہ سے باز آ گیا تو یہ صلح کرانے والے ان رجوع کرنے اور لڑائی چھوڑ دینے والوں کو نہ دبائیں' حق اور ناحق کو دیکھیں اور عدل وانصاف کے ساتھ دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرا دیں' انصاف کرنے والے کو اللہ پسند فرماتا ہے۔ محض جنگ رکوانا کافی نہیں ہے بلکہ آپس میں صلح ومفاہمت بھی کرا دی جائے اور متنازعہ مسئلہ کو بھی ختم کر دیا جائے۔ ورنہ آئندہ پھر لڑائی کا امکان رہے گا۔ اگر مسلمانوں کی دو جماعتوں میں محاذ آرائی ہونے لگے تو امام المسلمین پر واجب ہے کہ ان کے درمیان صلح کرا دے اور دونوں فریقوں کو کتاب وسنت کے احکام قبول کرنے پر آمادہ کرے۔ اگر کوئی جماعت امام المسلمین سے ہی باغی ہو جائے تو امام ان سے گفتگو کرے' ان کی شکایت سنے اور اس کا تدارک کرے۔ اگر یہ باغی جماعت امام اور امیر کی مخالفت کی ایسی وجوہ پیش کرے جن سے امام کا ظالم ہونا یقینی طور پر ثابت ہوتا ہو تو عامۃ المسلمین اس جماعت کی مدد کریں جو امام کی اطاعت سے منحرف ہو گئی تا کہ امام اپنے ظلم سے باز آ جائے' اگر باغی فرقہ ایسی وجوہ نہ بتا سکے جن سے امام المسلمین کا ظالم ہونا ثابت ہوتا ہو اور یہ باغی جماعت سمجھانے سے بھی باز نہ آئے اور امام سے جنگ کرنے ہی پر تلی رہے تو امام المسلمین اور عامۃ المسلمین اس جماعت سے قتال کریں تا کہ امام المسلمین کے باغی لوگ اطاعت میں آ جائیں...... آخر میں فرمایا انما المومنون اخوۃ (تمام مومنین آپس میں بھائی بھائی ہیں) یعنی ایمانی رشتہ کی وجہ سے تمام مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ اول تو انہیں خود ہی بھائی بھائی ہونے کا لحاظ رکھنا چاہیے اور آپس میں لڑائی سے احتراز کرنا چاہیے' اور وہ میل محبت کے ساتھ رہیں اور اگر کسی کی طرف سے کوئی غلطی سرزد ہو جائے' حقوق کی ادائیگی میں کوئی بھول چوک ہو جائے تو درگزر کرتے رہیں۔ اگر دو جماعتوں میں کوئی بگاڑ پیدا ہو جائے اور کوئی فریق عفو ودرگزر سے کام لینے پر تیار نہ ہو تو دوسرے مسلمان اس وقت کے اہم تقاضے پورا کریں یعنی دونوں فریقوں کے درمیان صلح کرانے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اصلاح بین الناس یعنی لوگوں کے درمیان اصلاح کر دینا' ان کی رنجشیں دور کر دینا اور ان کے دلوں کو جوڑنے کی کوشش کرنا' روٹھے ہوئے دوستوں کو منا دینا' میاں بیوی کے درمیان موافقت پیدا کرا دینا بہت بڑی ثواب کی چیزیں ہیں۔

حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے بیان فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کیا میں تم کو نفلی روزوں اور صدقہ دینے اور نفلی نماز پڑھنے کے درجے سے بھی افضل چیز بتاؤں؟ ہم نے عرض کیا ضرور ارشاد فرمائیے' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ چیز آپس میں صلح کرا دینا ہے۔ پھر فرمایا کہ بغض (یعنی آپس کا بگاڑ) مونڈ دینے والا ہے۔ (رواہ ابوداؤد والترمذی وقال ہذا حدیث صحیح)۔ دوسری روایت میں ہے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ بغض بالوں کو مونڈتا ہے' بلکہ وہ دین کو مونڈ دیتا ہے۔ (مشکوٰۃ المصابیح۔ صفحہ 428 از احمد وترمذی)

میاں اور بیوی کے درمیان سردمہری پیدا ہو جائے اور ان کے تعلقات بگڑ جائیں تو اللہ تعالیٰ نے ان

کے درمیان صلح کرانے کا حکم فرمایا اور اس صلح و مفاہمت کے لیے طریق کار بیان کر کے بھی راہنمائی فرمائی تا کہ مسلم معاشرہ میں خاندان کے معاملات خوش اسلوبی سے چلتے رہیں اور میاں بیوی کے جھگڑے کے نتیجے میں خاندان کی تباہی تک نوبت نہ پہنچ سکے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"اور اگر تم لوگوں کو کہیں میاں اور بیوی کے تعلقات بگڑ جانے کا اندیشہ ہو تو ایک حکم (ثالث) مرد کے رشتہ داروں میں سے ایک اور عورت کے رشتہ داروں میں سے مقرر کرو وہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں گے تو اللہ ان کے درمیان موافقت کی صورت نکال دے گا' اللہ سب کچھ جانتا ہے اور باخبر ہے۔" (النساء: 35)

سید مودودی" اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس آیت میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ جہاں میاں اور بیوی میں ناموافقت ہو جائے وہاں نزاع سے انقطاع تک نوبت پہنچنے یا عدالت میں معاملہ جانے سے پہلے گھر کے گھر ہی اصلاح کی کوشش کر لینی چاہیے' اور اس کی تدبیر یہ ہے کہ میاں اور بیوی میں سے ہر ایک کے خاندان کا ایک ایک آدمی اس غرض کے لیے مقرر کیا جائے کہ دونوں مل کر اسباب اختلاف کی تحقیق کریں اور پھر آپس میں سر جوڑ کر بیٹھیں اور تصفیہ کی کوئی صورت نکالیں۔ یہ پنچ یا ثالث مقرر کرنے والا کون ہو؟ اس سوال کو اللہ تعالیٰ نے مبہم رکھا ہے تا کہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کریں' ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کر کے پنچ مقرر کریں' اور اگر مقدمہ عدالت میں پہنچ ہی جائے تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی پنچ مقرر کر کے اصلاح کی کوشش کرے۔"

(تفہیم القرآن' جلد اول' صفحہ 350, 351)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو صلح کرنے اور دوسروں کو معاف کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"اور برائی کا بدلہ برائی ہے' اسی جیسی سو جو شخص معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔ بلاشبہ وہ ظالموں کو پسند نہیں فرماتا' اور البتہ جو شخص مظلوم ہو جانے کے بعد بدلہ لے لے سو یہ ایسے لوگ ہیں جن پر کوئی الزام نہیں' الزام ان پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور دنیا میں ناحق سرکشی کرتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے' اور البتہ جس نے صبر کیا اور معاف کر دیا' بلاشبہ یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔"

(الشوریٰ: 40 تا 43)

اوپر جو آیات مذکور ہوئیں ان میں سے آخری آیت میں نیک بندوں کی صفات میں یہ بتایا تھا کہ جب ان پر ظلم ہوتا ہے تو بدلہ لے لیتے ہیں' اس میں چونکہ کی بیشی کا ذکر نہیں ہے اور یہ بھی ذکر نہیں ہے کہ معاف کر دینا اور بدلہ نہ لینا افضل ہے۔ اس لیے بطور استدراک ان آیات میں اولاً تو یہ بتایا کہ برائی کا بدلہ بس اس قدر لینا جائز ہے جتنی زیادتی دوسرے فریق نے کی ہو اگر کسی نے اس سے زیادہ بدلہ لے لیا جو اس پر زیادتی کی گئی تھی تو اب وہ اسی قدر ظلم کرنے والا ہو جائے گا۔ ثانیاً یہ فرمایا کہ بدلہ لینا جائز تو ہے لیکن افضل یہ ہے کہ بدلہ نہ لیا جائے'

معاف کر دیا جائے' جو شخص معاف کر دے گا اس کا یہ معاف کر دینا ضائع نہ جائے گا' اللہ تعالیٰ اپنے پاس سے اس کا اجر عطا فرمائے گا۔ معاف نہ کرے تو زیادتی بھی نہ کرے' کیونکہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ ثالثاً یہ فرمایا کہ جس شخص پر کوئی ظلم کیا گیا اور اس نے اسی قدر بدلہ لے لیا جتنا اس پر ظلم ہوا تھا تو اب اس کا مواخذہ کرنا جائز نہیں کیونکہ اس نے اپنا حق لیا ہے۔ ظالم یا ظالم کی مدد کرنے والے دوست احباب کنبہ وقبیلہ کے لوگ اب اگر اس سے بدلہ کا بدلہ لیں گے تو یہ لوگ ظالم ہو جائیں گے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ دنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جگہ ان کی گرفت ہوگی' یہ لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق سرکشی کرتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ رابعاً ایک عام اعلان فرما دیا کہ صبر کرنا اور معاف کرنا بڑی ہمت اور صبر کے کاموں میں سے ہے' ہر شخص اس پر عمل کرنے کو تیار نہیں ہوتا حالانکہ اس کا اجر و ثواب بہت بڑا ہے۔

(انوار البیان' جلد ہشتم' مفتی محمد عاشق الٰہی مہاجر مدنی' صفحہ 212, 213 ادارہ تالیفات اشرفیہ ملتان)

اسلام میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ عفو و درگزر سے کام لیا جائے اور انتقام لینے کے بجائے صبر کا مظاہرہ کیا جائے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ موسیٰ ابن عمران علیہ السلام نے بارگاہِ خداوندی میں عرض کیا کہ اے میرے رب! آپ کے بندوں میں آپ کے نزدیک سب سے زیادہ باعزت کون ہے؟ اللہ نے فرمایا کہ جو شخص (بدلہ لینے کی) قدرت رکھتے ہوئے معاف کر دے۔ (مشکوٰۃ المصابیح' صفحہ 434)

لوگوں کے درمیان صلح کرا دینا بے حد باعث اجر عمل ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر و بیشتر کوئی بھلائی نہیں ہوتی۔ ہاں اگر کوئی پوشیدہ طور پر صدقہ و خیرات کی تلقین کرے یا کسی نیک کام کے لیے یا لوگوں کے معاملات میں اصلاح کرنے کے لیے کسی سے کچھ کہے تو یہ البتہ بھلی بات ہے' اور جو کوئی اللہ کی رضا جوئی کے لیے ایسا کرے گا اسے ہم بڑا اجر عطا کریں گے۔" (النساء: 114)

آیت مذکورہ بالا کا مفہوم یہ ہے کہ لوگ باہم مشاورت کرتے ہیں اور ان کے بہت سے مشوروں میں کوئی خیر نہیں کیونکہ یہ مشورے اللہ کی رضا کے خلاف بھی ہوتے ہیں اور ان مشوروں میں اسلامی احکام کے منافی بھی باتیں سوچی جاتی ہیں' ہاں ان مشوروں میں اگر کوئی ایسی بات ہو کہ ایک دوسرے کو آپس میں صدقہ دینے کے لیے کہا جائے یا کوئی صالح عمل کرنے کا حکم ہو یا لوگوں کے درمیان صلح کرا دینے کی بات ہو تو یہ مشورے خیر اور بھلائی کے مشورے ہوں گے۔ اللہ کی رضا کے لیے جو شخص یہ کام کرے گا اسے اللہ تعالیٰ بہت بڑا اجر عطا فرمائے گا۔ اسی لیے ایک اور مقام پر فرمایا:

"اے ایمان والو! جب تم آپس میں خفیہ طور پر مشورے کرو تو گناہ اور زیادتی اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی نافرمانی کے مشورے نہ کرو۔ اور بھلائی کے اور تقویٰ کے مشورے کرو اور اللہ سے ڈرو جس کی طرف تم سب جمع کیے جاؤ گے۔" (المجادلۃ: 9)

اللہ تعالیٰ نے مومنین کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنے معاشرہ میں صلح و امن سے رہیں اور اس مقصد کے لیے

ضروری ہے کہ وہ آپس کے معاملات درست رکھیں۔ یعنی آپس کے تعلقات میں دھوکہ دہی' فریب اور ناانصافی و استحصال کا معاملہ نہ کریں بلکہ ایماندارانہ اور برادرانہ تعلقات رکھیں۔ اگر وہ تعلقات میں شفافیت رکھیں گے تو یہ عین اللہ کے احکام کی اطاعت وفرماں برداری ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے۔

''سو تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں تعلقات کو درست کرو۔'' (الانفال:1)

ایک اور جگہ مسلمانوں کو جھگڑنے سے روکا اور فرمایا کہ اگر تم آپس میں لڑنے لگو گے تو تم کمزور پڑ جاؤ گے۔

''اور آپس میں نہ جھگڑو ورنہ تم کمزور پڑ جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔'' (الانفال:46)

اس آیت میں فرمایا کہ آپس میں جھگڑنے کی وجہ سے ساکھ ختم ہو جاتی ہے' اور مسلمانوں کے باہمی اختلاف اور انتشار کو دیکھ کر دشمن بے خوف ہو جاتے ہیں اور ان کے دلوں سے مسلمانوں کی ہیبت جاتی رہتی ہے۔ باہمی اختلاف سے کمزوری جنم لیتی ہے اور اتحاد اور اتفاق جاتا رہتا ہے۔ جس سے امت مسلمہ کی یکجہتی کو نقصان پہنچتا ہے اور دشمن با آسانی مسلمانوں کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ اس لیے اسلامی معاشرہ کے لیے یہ ضروری ٹھہرا کہ وہ باہم متحد و متفق ہیں۔ خاندانی معاملات سے لے کر معاشرہ کے اجتماعی معاملات تک یعنی انفرادی امور سے اجتماعی امور تک اختلافات اور تنازعات سے گریز کرنا مسلمانوں کے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے۔ اسلامی معاشرہ کو پرامن اور صالح رکھنے کے لیے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو ہدایت دی ہے کہ وہ اپنے معاشرہ میں مسلمانوں کے باہمی معاملات میں اصلاح بین الناس کا فریضہ انجام دیتے رہیں اور انہیں انتشار و افتراق اور لڑائی جھگڑوں سے بچائیں۔ اصلاح بین الناس ایک ایسا صالح عمل ہے جس میں خیر اور بھلائی ہے اور جس کا بے پناہ اجر قرآن مجید کی روشنی میں دینے کا وعدہ کیا گیا ہے۔

☆☆..........☆☆..........☆☆

حسن اخلاق

سوال: اسلام میں حسن اخلاق پر نوٹ لکھیں۔

معاشرہ کی زندگی اور ہر قوم کے تکامل میں اخلاق شرط اساسی ہے۔ انسانی پیدائش کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی بھی تخلیق ہوئی ہے۔ اخلاقیات کی عمر انسانی عمر کے برابر ہے۔ دنیا کا کوئی عقلمند ایسا نہیں ہے جس کو انسانی روح کی آسائش و سلامتی کے لئے اخلاقیات کے ضروری ہونے میں ذرہ برابر بھی شک ہو، یا رشد اجتماعی کی بنیاد پر تقویت دینے اور عمومی اصلاحات میں اس کے سودبخش ہونے میں کسی قسم کا شبہ ہو۔

مشہور انگریزی دانشمند سامویئل اسمایلز کہتا ہے:

> ''اس کائنات کی محرک قوتوں میں سے ایک قوت کا نام اخلاق ہے اور اس کے بہترین کارناموں میں انسانی طبیعت کو بلند ترین شکل میں مجسم کرنا ہے کیونکہ واقعی انسانیت کا معرف بھی اخلاق ہے۔ جو لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں تفوق و امتیاز رکھتے ہیں ان کی پوری کوشش یہی ہوتی ہے کہ نوع بشر کا احترام و اکرام اپنے لئے حاصل کرلیں۔''

اسلامی اخلاق اور خاندان و معاشرہ

دین اسلام نے جو ضابطہ اخلاق پیش کیا ہے اس میں خاندان اور معاشرے کو بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ سچائی کوئی تصور یا نظریہ نہیں جس کی تبلیغ و تلقین کی جاتی ہو۔ یہ تو ایک عادت اور معمول کی بات ہے جس سے ذہن تاثر پکڑتا ہے اور زبان کو اس کی مشق و تمرین کرنا پڑتی ہے اور پھر بھی عادت اور معمول لاشعور کے باطن میں جڑ پکڑ لیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خاندانی تربیت کو اور معاشرتی روایات و تقالید کی صحت و صفائی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ یہاں سے رسالت اسلامیہ کی ذمہ داری اٹھانے کے لئے عرب معاشرے کے انتخاب کی اہمیت بھی سامنے آجاتی ہے کیونکہ یہ معاشرہ بہت سے اخلاق فاضلہ (مروت، سخاوت، ایفائے عہد وغیرہ) کا ایک گہوارہ تھا۔ قرآن مجید حضرت لقمان کی زبانی فرزندان اسلام کو حکم دیتا ہے:

> ''اے میرے بیٹے! نماز قائم کر، نیکی کا حکم دے، بری بات سے رک جا، مصیبت پر صبر کر، بلاشبہ یہ عزم و ہمت کے معاملات میں سے ہے''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے قرآن مجید کہتا ہے:

> ''اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم دیجئے اور خود بھی اس پر مضبوطی سے کاربند رہئے''۔

جمہور اہل اسلام کو حکم دیا جاتا ہے:

"خود کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ"۔

اور حدیث نبوی ﷺ میں ہے:

كلكم راع وكلكم مسئول عن رعيته.

"تم میں سے ہر ایک محافظ رعیت ہے اور ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا"۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ اور وَلْتَكُن مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ کے ذریعے معاشرے کے لئے عمومی طور پر بھلائی کی اشاعت اور حق و صبر قائم رکھنے کی وصیت کا حکم دیتا ہے۔

خندہ پیشانی سے ملنا اور سلام سے گفتگو کا آغاز کرنا

اسلام کی اخلاقی تعلیمات میں یہ چیز ایک اصولی اہمیت رکھتی ہے کہ نیکی کا کوئی کام حقیر نہیں ہے، خواہ بظاہر وہ کیسا ہی معمولی کیوں نہ ہو، اور بدی کا کوئی کام معمولی نہیں ہے، خواہ بظاہر وہ کتنا ہی چھوٹا کیوں نہ ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

لَا تَحْقِرَنَّ مِنَ الْمَعْرُوفِ شَيْئًا وَلَوْ أَنْ تَلْقَى أَخَاكَ بِوَجْهٍ طَلِيقٍ (مسلم)

یعنی "کسی نیکی کے کام کو حقیر مت سمجھو، خواہ وہ بھی کیوں نہ ہو کہ تم اپنے بھائی کو ہنستے ہوئے چہرے کے ساتھ ملو"۔

اسی طرح سلام سے آغاز ملاقات و گفتگو کا حکم دیا گیا اور فرمایا گیا کہ:

أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ

"اپنے درمیان سلام کو عام کرو"۔ (مسلم)

مراد یہ ہے کہ اہل ایمان جب بھی آپس میں ملیں باہمی سلامتی اور ایک دوسرے کے حق میں اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور برکتوں کی دعا کرتے ہوئے ملیں۔

یہ خوش اخلاقی حسن معاشرت کا نقطۂ آغاز ہے۔ بہت سے تعلقات اس وجہ سے کشیدہ یا ختم ہو جاتے ہیں۔

نرم خوئی، تحمل مزاجی، بردباری، عفو و درگزر اور ایثار و قربانی

قرآن مجید اور احادیث نبوی ﷺ میں بے شمار مقامات پر مندرجہ بالا صفات کی تحسین کی گئی ہے اور اپنی شخصیتوں میں ان کو پروان چڑھانے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ یہ صفات، مشتعل مزاجی، غصہ طبیعت، بدخوئی و درشتی طبع، جلد بازی، عدم تدبر اور بخل و تنگدلی کی ضد ہیں اور ان سے اسلامی معاشرے کے انفرادی اور اجتماعی مزاج کا آب و رنگ متعین ہوتا ہے۔

ارشاد ہوا: إِنَّ فِيكَ خَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللهُ: الْحِلْمُ وَالْأَنَاةُ (مسلم)

یعنی ''تیرے اندر دو خصلتیں ایسی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے: بردباری اور وقار و سنجیدگی۔''

حدیث قدسی ہے کہ:

مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ كُلَّهُ (مسلم)

''جو نرمی سے محروم ہوتا ہے وہ ہر طرح کی بھلائی سے محروم ہو جاتا ہے۔''

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ:

وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا أَلَا تُحِبُّونَ أَنْ يَغْفِرَ اللَّهُ لَكُمْ (النور: 22)

''اور انہیں معاف کر دینا چاہئے اور درگزر کرنا چاہئے۔ کیا تم نہیں چاہتے کہ اللہ تمہیں معاف کرے؟''

اُخوت اور باہمی خیر خواہی

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ:

''مسلمان، مسلمان کے لئے عمارت کی طرح ہوتا ہے جس کا ایک حصہ دوسرے کو قوت پہنچاتا ہے۔'' پھر آپ ﷺ نے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں پیوست کر کے بتایا۔ (متفق علیہ)

آپ ﷺ نے فرمایا:

''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، کوئی شخص ایمان دار نہیں ہو سکتا جب تک اپنے بھائی کے لئے وہی کچھ پسند نہ کرے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے۔'' (متفق علیہ)

اخوت اور نصیحت (خیر خواہی) دو ایسی بنیادیں ہیں جن پر اسلامی معاشرے کے اندر افراد کے باہمی تعلق کی عمارت استوار کی گئی ہے۔ حقیقی بھائی چارے اور باہمی ہمدردی و خیر خواہی کا جو مفہوم بھی کسی معاشرے کے اندر ممکن ہو سکتا ہے وہ سب اسلامی معاشرے کے اندر مطلوب ہے، لیکن اس امتیاز کے ساتھ کہ اسلامی معاشرے میں یہ رشتہ اخوت اللہ، اس کی کتاب اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان کے ساتھ وابستہ اور انہی آداب و مقاصد کا پابند ہے جو اس کے لئے متعین فرما دیے گئے ہیں۔ اس رشتۂ اخوت کو مضبوط و مستحکم بنانے والی ہر چیز پسندیدہ اور مستحسن ہے اور اس کو نقصان پہنچانے والی ہر چیز قابل نفرت اور لائق باز پرس ہے۔

صداقت شعاری، دیانت و امانت اور پاس عہد

نبی ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

إِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ (متفق علیہ)

''بے شک سچائی نیکی کی طرف رہنمائی کرتی ہے اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔''

مزید ارشاد فرمایا:

دَعْ مَا يُرِيبُكَ إِلَى مَا لَا يُرِيبُكَ فَإِنَّ الصِّدْقَ طُمَأْنِينَةٌ وَالْكِذْبَ رِيبَةٌ

(ترمذی)

"جو چیز تجھے شک میں ڈالتی ہے اسے چھوڑ کر اس کو اختیار کر جو شک میں ڈالنے والی نہیں ہے۔ کیونکہ سچ قلبی طمانیت (کا نام) ہے۔ اور جھوٹ شک و اضطراب (پیدا کرنے والی چیز) ہے۔"

قرآن و حدیث میں صداقت شعاری کی تاکید بے شمار مقامات پر آئی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ یہ صفت اسلام کی تعلیم کردہ صفات میں ایک بڑا اونچا مقام رکھتی ہے۔ اس صفت کو صحیح معنوں میں لینا چاہئے۔ دین میں سچائی دراصل قول و فعل میں مقصود ہے۔ صداقت شعاری کا تعلق صرف زبان کے ساتھ سچ بولنے سے نہیں ہے بلکہ پوری عملی زندگی سے ہے۔ ایک چیز پر ایمان لانا اور پھر اس کے عملی تقاضوں کو نظر انداز کر دینا یا اس کے برعکس طرز عمل اختیار کرنا راست بازی اور صداقت شعاری کے خلاف ہے۔ اسی لئے روزے جیسی اہم عبادت کے مقصود حقیقی کو ذہن نشین کرنے کے لئے ارشاد فرمایا کہ اللہ کو اس شخص کے روزے کی کوئی حاجت نہیں ہے جس نے جھوٹ اور اس پر عمل کرنا نہ چھوڑا۔

سورہ الصف میں فرمایا گیا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِمَ تَقُولُونَ مَا لَا تَفْعَلُونَ. كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ أَن تَقُولُوا مَا لَا تَفْعَلُونَ.

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو؟ اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم وہ بات کہو جو کرتے نہیں۔"

صبر و استقامت

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

وَمَا أُعْطِيَ أَحَدٌ عَطَاءً خَيْرًا وَأَوْسَعَ مِنَ الصَّبْرِ (متفق علیہ)

"اور کسی شخص کو صبر سے بڑھ کر اچھا اور ہمہ گیر عطیہ نہیں دیا گیا۔"

ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے:

اَلصَّبْرُ ضِيَاءٌ۔ "صبر روشنی ہے۔" (مسلم)

اسی طرح ارشاد فرمایا:

اَلصَّبْرُ نِصْفُ الْإِيمَانِ

"صبر نصف ایمان ہے۔" (بیہقی)

ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ صبر ایک ایسی صفت ہے جو ظلمت کدۂ حیات میں انسان کے لئے روشنی کا کام دیتی ہے اور ایک مومن کے لئے دنیا اور آخرت کا سرمایہ ہے۔ صبر کی یہ اہمیت اور

فضیلت کیوں ہے؟ اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

ہم جس دنیا میں سانس لے رہے ہیں وہاں انسان کو دو حالتوں سے لازماً سابقہ پیش آتا ہے ایک تو یہ ہے کہ یہاں ہر چیز ہماری مرضی اور پسند کے مطابق نہیں ہے۔ بلکہ ان گنت حالات اور معاملات ہماری مرضی اور پسند کے خلاف ظہور میں آتے ہیں اور ان کو بدل ڈالنا ہمارے بس میں نہیں ہوتا۔ مثلاً بیماری، رنج وغم، مصائب ومشکلات اور پریشانیاں۔

امر بالمعروف، نہی عن المنکر اور جہاد

اعمال صالحہ کی طرف پیش قدمی اور نیکی کے لئے ترغیب وتعاون سے اگلا درجہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہے جس کا ایک مرحلہ جہاد بھی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (آل عمران: 104)

"تم میں کچھ لوگ تو ایسے ضرور ہی رہنے چاہئیں جو نیکی کی طرف بلائیں، بھلائی کا حکم دیں، اور برائیوں سے روکتے رہیں۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہی فلاح پائیں گے۔"

اس ضمن میں ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ:

"تم میں سے جو شخص برائی کو (ہوتا) دیکھے اسے چاہئے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ سے روک دے اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے منع کرے۔ اگر اس کی استطاعت بھی نہ رکھتا ہو تو دل میں اس کو برا جانے، اور یہ کمزور ترین ایمان ہے۔"

(مسلم۔ روایت حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ)

حضرت طارق بن شہاب ؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ کون سا جہاد افضل ہے، تو آپ ﷺ نے فرمایا:

كَلِمَةُ حَقٍّ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ (نسائی)

یعنی "ظالم حکمران کے سامنے کلمۂ حق کہنا۔"

مومن کا یہ مقام جس قسم کی اخلاقی عظمت اور صلابت کردار کا طالب ہے وہ محض وعظ ونصیحت یا نیک خواہشات سے پیدا نہیں ہو سکتے بلکہ ان کے لئے مہم ریاضت، مسلسل سعی وجہد اور مستقبل محاسبہ نفس کی ضرورت ہے۔ بندۂ مومن کو صرف اپنے نفس کے غلط داعیات ورجحانات ہی کے خلاف جنگ نہیں کرنی ہے بلکہ خارج میں پھیلی ہوئی برائی اور بغاوت وسرکشی کے خلاف بھی نبرد آزما ہونا ہے، چنانچہ مسلسل مشق وتمرین، پیہم سعی وجہد اور مستقل حرکت وعمل ہی اس کو اس قابل بنا سکتے ہیں کہ وہ کردار کی اس عظمت کو پہنچے جو ایک مجاہد کا حصہ ہوتی ہے۔ اسلام درحقیقت ایسے مجاہدین فی سبیل اللہ کی ایک جماعت تیار کرنا چاہتا ہے جو نیکیوں کے فروغ اور غلبے اور برائیوں کی بیخ کنی اور خاتمے کے لئے اپنی اجتماعی جدوجہد کو بروئے کار

لائیں اور اقامت دین کی منزل کی طرف مسلسل پیش قدمی کرتے ہوئے توفیق ربانی سے اس کو حاصل کر لیں۔

عفو/درگزر

سوال : "عفو" سے کیا مراد ہے، اس کی اہمیت و افادیت قرآن و سنت کی روشنی میں بیان کیجئے؟

جواب : عفو :

"عفو" کے معنی ہیں: ڈھانپنا، مٹانا، درگزر کرنا، معاف کرنا، بدلہ نہ لینا۔ قرآن مجید میں یہ لفظ مغفرت کے معنی میں آیا ہے، یعنی اللہ کا بندہ کے گناہوں پر پردہ ڈالنا اور اسے بخش دینا۔
شرعی اصطلاح میں عفو سے مراد ہے: کسی کی زیادتی اور برائی کو انتقام لینے کی قدرت رکھنے کے باوجود معاف کر دینا اور انتقام نہ لینا۔

اہمت : (1) عفو معاشرہ کے امن و سکون کا باعث ہے : عفو کسی معاشرہ کے امن و سکون کا ضامن ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے خطاکار انسان سے عفو و درگزر کا سلوک روا نہ رکھے اور ہر چھوٹی چھوٹی خطا پر انتقام لینے کے لئے آمادہ ہو جائے تو یہ دنیا فتنہ و فساد سے بھر جائے اور انسانی زندگی جہنم کا نمونہ بن جائے۔ یہ صفت اگر انسانوں میں موجود نہ ہو تو باہمی الفت و محبت، یگانگت، رحمت و شفقت، ہمدردی، رحم، اور اتحاد و یگانگت کا وجود باقی نہ رہے۔

(2) عفو سے وسعت قلبی پیدا ہوتی ہے : انتقام لینے کے جذبہ سے انسان میں تنگ دلی پیدا ہوتی ہے اور یہ ایک ایسی برائی ہے جو دوسرے انسانوں کے ساتھ بھلائی کے سلوک سے باز رکھنے والی ہے۔ اس کے مقابلہ میں عفو و درگزر سے وسعت قلبی پیدا ہوتی ہے اور انسان کے دل میں ایثار و قربانی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ گویا عفو فیاضانہ سلوک کا سرچشمہ ہے جو کہ حسن معاشرت کی روح ہے۔

(3) تبلیغ میں اہم کردار : مبلغ کو تبلیغ اسلام میں بڑے ناخوشگوار حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لوگوں کی طرف سے ایذائیں بھی پہنچائی جاتی ہیں۔ اگر وہ عفو و درگزر سے کام نہ لے تو اپنے مشن میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کا عملی نمونہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ کی اس کریمانہ صفت سے متاثر ہو کر لاکھوں لوگ حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

(4) عفو اللہ کی صفت ہے : عفو درگزر اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی صفت ہے۔ قرآن مجید میں ستر سے زیادہ آیات مبارکہ میں "غفور" (بخشنے والا) اور پانچ بار "عفو" (معاف کرنے والا) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صفت اس کی تمام صفتوں پر غالب ہے۔

اللہ نے یہ صفت پیدا کرنے کی دعوت اپنے بندوں کو بھی دی ہے' جیسا کہ فرمایا گیا ہے:

او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا

(یا کسی برائی کو معاف کرو تو بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا قدرت والا ہے)

(5) عفو آنحضور کی بھی صفت ہے : حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیکر عفو تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عفو کا حکم قرآن مجید میں متعدد بار دیا ہے' مثلاً فرمایا ہے:

فاعف عنہم واستغفرلہم

(پس لوگوں سے درگذر کیجئے اور ان کے لئے بخشش مانگئے)

آپ کی حیات مبارکہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ نے کبھی بھی کسی سے ذاتی معاملہ میں انتقام نہیں لیا' بلکہ بددعا سے بھی احتراز کیا۔ آپ نے اپنے بدترین سے بدترین دشمن کو بھی معاف کر دیا۔

(6) عفو مومنوں کی صفت ہے : قرآن مجید نے مومنوں کی ایک اہم صفت عفو و درگذر بھی بیان کی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد مبارک ہے:

(1) والکاظمین الغیظ والعافین عن الناس

(اور (مومنین) غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہوتے ہیں)

(2) واذا ما غضبوا ہم یغفرون

(جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ معاف کر دیتے ہیں)

عفو' قرآن کی روشنی میں : قرآن مجید میں متعدد بار عفو و درگذر کی تعلیم دی گئی ہے' ذیل میں مختلف پہلوؤں سے "عفو" اختیار کرنے کا تذکرہ قرآنی آیات کے حوالہ سے کیا جا رہا ہے۔

کسی کی زیادتی سے درگذر : قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

(1) ادفع بالتی ہیَ احسن

(برائی کا بدلہ اچھائی سے دیجئے)

(2) ان تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفوا قدیرا

(یا کسی کی برائی کو معاف کر دو تو بے شک اللہ معاف کرنے والا اور قدرت والا ہے)

(3) فاعفوا واصفحوا

(پس معاف کر دو اور درگذر کرتے رہا کرو)

(4) ولیعفوا ولیصفحوا الا تحبون ان یغفر اللہ لکم

(اور چاہئے کہ وہ معاف کر دیں اور درگذر کیا کریں' کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ خدا تم کو معاف کرے)

قاتل کو بھی معاف کرنے کی اجازت : قانون قصاص کی رو سے قاتل کی سزا موت ہے مگر اگر مقتول کے لواحقین قاتل کو معاف کر دیں یا خون بہا لے کر اس کی جاں بخشی کر دیں تو قرآن نے اس امر کی اجازت دی ہے' قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

"جو کوئی معاف کر دیا جائے کچھ بھی اپنے بھائی کی طرف سے تو مطالبہ کرنا چاہئے' خون بہا کا دستور کے مطابق اور قاتل کو ادا کرنا چاہئے' بھلے انداز میں' یہ ایک رعایت اور رحمت ہے' تمہارے پروردگار کی طرف سے۔"

غیر مسلموں سے عفو و درگذر : قرآن نے غیر مسلموں سے بھی عفو و درگذر کرنے کا حکم دیا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

(1) **قل للذین آمنوا یغفروا واللذین لا یرجون ایام اللہ** (جاثیہ)

(ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ ان کو جو اللہ کے جزا و سزا کے واقعات پر یقین نہیں رکھتے' معاف کر دیا کریں)

(2) **خذ العفو وامر بالمعروف واعرض عن الجاھلین**

((اے نبی!) عفو اختیار کیجئے' نیکی کا حکم دیجئے اور جاہلوں سے اعراض کیجئے)

عفو' احادیث کی روشنی میں : فرمان نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے:

1- ایک دوسرے کو معاف کرو' تمہارے باہمی کینے رفع ہو جائیں گے۔

2- مسلمانوں کا افضل ترین اخلاق عفو ہے۔

3- پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ دے' بلکہ پہلوان تو وہ ہے جو غصہ کی حالت میں اپنے اوپر قابو رکھے۔

4- ایک مرتبہ ایک صحابی نے آپ سے پوچھا' یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں اپنے خادم کا قصور کتنی بار معاف کروں' آپ تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے اور پھر فرمایا: ہر روز ستر بار۔

5- جس طرح ایلوے کا رس شہد کو بگاڑ دیتا ہے' اسی طرح غصہ ایمان کو بگاڑ دیتا ہے۔

عفو کی مثالیں : آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سراپا عفو تھے۔ آپ کی زندگی سے عفو کی چند مثالیں پیش کی جا رہی ہیں۔

(1) ابتدائے اسلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعوت دین کی غرض سے طائف تشریف لے گئے اور وہاں کے امراء کو دین کی دعوت دی' لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا' انہوں نے الٹا شہر کے بدمعاشوں کو آپ کے پیچھے لگا دیا۔ بدمعاشوں نے آپ پر پتھر برسائے' یہاں تک کہ آپ لہولہان ہو گئے۔ اس حالت میں جبریل امین حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اگر آپ حکم دیں تو میں ان پر پہاڑ گرا دوں۔ مگر آپ اس امید پر کہ یہ نہ سہی ان کی اولاد ہی مسلمان ہو جائے گی' دعا فرمانے لگے:

اللھم اھدی قومی فانھم لا یعلمون

(اے اللہ ! میری قوم کو ہدایت دے کیونکہ یہ لوگ مجھے نہیں جانتے)

(2) اہل مکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن رہے۔ تین سال آپ کے خاندان کو شعب ابی طالب میں محصور رکھا' آپ کے قتل کی سازشیں کیں' ہجرت پر مجبور کیا اور ہجرت میں بھی تنگ کرتے رہے۔ ان تمام سختیوں اور ایذا رسانیوں کے باوجود آپ نے فتح مکہ کے روز اہل مکہ کے لئے عام معافی کا اعلان کر دیا۔ یہ معافی مجبوری اور بے بسی کی معافی نہیں بلکہ ایک فاتح کی معافی تھی۔

(3) ابو سفیان کی بیوی ہندہ نے جنگ احد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کا کلیجہ چبایا تھا۔ فتح مکہ کے دن وہ نقاب پوش ہو کر خدمت اقدس میں حاضر ہوئی تاکہ بے خبری میں بیعت کرے اور امان مل جائے' لیکن آپ نے اسے پہچان لیا اور اسے معاف کر دیا' صرف اتنا فرمایا : میرے سامنے نہ آیا کرو' تمہیں دیکھ کر چچا کی یاد آتی ہے۔

(4) ابوسفیان فتح مکہ کے دن گرفتار کر کے لائے گئے۔ بعض کی رائے تھی کہ ان کے جرائم کے پیش نظر انہیں قتل کر دیا جائے' لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف انہیں معاف کر دیا بلکہ یہ اعزاز بھی بخش دیا کہ جو ان کے گھر میں داخل ہو جائے گا وہ امن میں رہے گا۔

(5) ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تلوار درخت پر لٹکا کر اس کے نیچے سو گئے۔ اتنے میں ایک کافر آیا اور آپ کی تلوار نکال کر آپ جو جگایا اور کہنے لگا کہ بتاؤ تم کو میرے ہاتھ سے کون بچائے گا۔ آپ نے فرمایا : اللہ۔ یہ سن کر اس کے ہاتھ سے تلوار گر پڑی۔ آپ نے تلوار اٹھا لی اور فرمایا کہ اب تجھے کون بچائے گا؟ وہ حیران رہ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تلوار نیام میں ڈال لی اور فرمایا : "جا تجھے معاف کیا محمد انتقام نہیں لیا کرتا۔"

(6) جنگ خیبر کے بعد زینب نامی ایک یہودیہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کھانے میں زہر ملا دیا' لیکن آپ نے انتقام کی قدرت رکھنے کے باوجود اسے معاف کر دیا۔

عفو کی حد : عفو کی تاکید سے ایک غلط فہمی پیدا ہونے کا خدشہ ہے کہ شاید اسلام ہر حالت میں عفو کا حکم دیتا ہے۔ یہ بات درست نہیں۔ اسلام جہاں عفو کی تعلیم دیتا ہے وہاں یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ غیرت و خودداری اور عزت نفس کو ہر قیمت پر قائم رکھا جائے۔ ذیل میں چند امور بیان کئے جا رہے ہیں جن سے واضح ہوتا ہے کہ عفو سے کہاں تک کام لینا چاہئے۔

اعتدال : اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں دفاع کا جذبہ رکھا ہے۔ اگر یہ جذبہ حد سے بڑھ جائے تو انسان متکبر اور خودپرست ہو جاتا ہے اور اگر یہ قوت بالکل ختم ہو جائے تو آدمی بزدل ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسلام اعتدال اختیار کرنے کی ہدایت دیتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا فرمان ہے کہ :

"اگر کوئی تمہارے دائیں گال پر تھپڑ مارے تو بایاں گال بھی اس کے سامنے کر دو۔"

لیکن یہ فرمان ہر وقت اور ہر حالت میں قابل عمل نہیں۔ چنانچہ اس کے برعکس اسلام حکم دیتا ہے۔

وجزاء سیئة سیئة مثلها
(اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے)

ہاں! برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی سے لینا جائز ہے' لیکن اگر انسان برائی کرنے والے کو معاف کر دے تو یہ اس کی اپنی مرضی ہے' جس کا اللہ کے ہاں اجر ہے۔ اسلام انتقام لینے کی اجازت دیتا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ قصور وار کو اس سے زیادہ تکلیف نہ پہنچائی جائے۔ جتنی اس کی طرف سے پہنچی ہے۔

معافی بغرض اصلاح : عفو کا اصل مقصد یہ ہے کہ مجرم اور قصور وار کے دل میں ندامت اور شرمندگی کا احساس پیدا ہو اور وہ آئندہ کے لئے اپنی اصلاح کر لے۔ اگر یہ مدعا پورا ہوتا دکھائی دے تو معاف کیا جائے' ورنہ معاف کرنے کی اجازت نہیں۔ بعض لوگوں پر نرمی کے سلوک کا الٹا اثر ہوتا ہے اور وہ پہلے سے زیادہ دلیر ہو جاتے ہیں۔ وہ معاف کرنے کو کمزوری اور بزدلی خیال کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو معاف کرنا اپنے اوپر ظلم ہے۔ ایسے لوگوں کے سامنے ڈٹ جانا چاہئے۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

التکبر مع المتکبر صدقہ
(متکبر کے ساتھ تکبر سے پیش آنا نیکی ہے)

عفو' صرف انفرادی معاملات میں : عفو و درگزر کا حکم صرف ان امور میں ہے جو کسی کے ذاتی معاملات سے متعلق ہوں' اجتماعی معاملات میں کسی ایک شخص کو معاف کر دینے کا حق نہیں ہے۔

حدود شکنی میں معافی کی اجازت نہیں : اللہ کی حدود کو توڑنے والوں کے لئے معافی کی گنجائش نہیں' بلکہ ان پر ترس کھانے کی بھی ممانعت ہے۔ اس طرح وہ لوگ جو مسلمانوں کو اجتماعی طور پر نقصان پہنچائیں' نرمی کے مستحق ہیں۔ اس قسم کے لوگوں سے سختی اور جنگ کرنے کا حکم ہے۔

عفو کے فوائد و ثمرات :

1- عفو سے معاشرہ میں امن و سکون کی فضا پیدا ہوتی ہے اور حسد و بغض کے جذبات مٹ جاتے ہیں۔
2- عفو کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ افراد معاشرہ کے دل میں ایثار و قربانی' محبت اور رحمدلی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔
3- عفو سے بلند حوصلگی کی تربیت ہوتی ہے اور انسان وسیع القلب ہو جاتا ہے۔
4- عفو سے انسان غصہ سے مغلوب ہو کر اعصابی مرضی میں مبتلا ہونے سے بچ جاتا ہے۔
5- معاف کرنے والے کو ایک قسم کی روحانی خوشی محسوس ہوتی ہے' جو ایک بڑی نعمت ہے۔
6- عفو کی اخلاقی صفت کی وجہ سے لوگ متاثر ہو کر حلقہ بگوش اسلام ہو جاتے ہیں۔
7- عفو و درگزر سے کام لینے والوں کو قرآن مجید میں یہ خوشخبری دی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ

ان کے گناہ معاف کر دے گا۔

8- عفو سے عزت و وقار میں اضافہ ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد الہٰی ہے کہ : "اللہ تعالیٰ عفو و درگذر کرنے والے کی عزت میں اضافہ کر دیتا ہے۔"

9- اگر کسی کو معاف کر دیا جائے تو پھر وہ بھی اپنے محسن کا ہمیشہ کے لئے غلام ہوتا ہے۔ اور اسے اپنے قلبی دوست تصور کرتا ہے۔

صلہ رحمی

سوال : صلہ رحمی کی اہمیت بیان کریں اور اسلام میں قرابتداروں کے حقوق پر روشنی ڈالئے۔ نیز صلہ رحمی کے فوائد بیان کیجئے؟

جواب : اہل قرابت :

اہل قرابت یا قرابتدار نزدیکی رشتہ داروں کو کہتے ہیں۔ ان کا درجہ والدین' اولاد اور زوجین کے بعد ہے۔

صلہ رحمی : عربی زبان میں رشتہ داروں کے حقوق کو "صلہ رحمی" کا نام دیا گیا ہے۔

صلہ رحمی کی اہمیت : اسلام میں صلہ رحمی کو کافی اہمیت دی گئی ہے۔ قرآن مجید میں متعدد بار "صلہ رحمی" کی ہدایت کی گئی ہے' ذیل میں چند آیات پیش کی جا رہی ہیں :

1- وات ذا القربی حقہ
(اور تو قرابتدار کو اس کا حق ادا کر)

2- وبالوالدین احسانا و بذی القربی
(اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ بھی)

3- واتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتامی والمساکین و ابن السبیل
(اور خدا کی محبت میں قریبی رشتہ داروں' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں کو مال دیتے ہیں)

4- قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والا قربین والیتمی والمساکین و ابن السبیل
(کہہ دیجئے! تم جو مال بھی خرچ کرو' تو والدین پر' رشتہ داروں پر' یتیموں پر' مسکینوں پر اور مسافروں پر خرچ کرو۔)

صلہ رحمی کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

1- جو یہ پسند کرتا ہے کہ اس کی عمر زیادہ ہو اور اس کے رزق میں فراخی ہو' اسے چاہئے کہ خدا سے ڈرتا رہے اور صلہ رحمی کرے۔ (بخاری)
2- کسی مسکین کو خیرات دینے کا ایک گنا ثواب ہوتا ہے اور کسی قریبی رشتہ دار مسکین کو خیرات دینے کا دوگنا ثواب ہوتا ہے۔
3- جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہئے کہ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرے۔
4- جس اطاعت خداوندی کا ثواب سب سے جلدی ملتا ہے' وہ صلہ رحمی ہے۔
5- رشتہ داروں کے حقوق پوری طرح ادا کرو' خواہ وہ تم سے بدسلوکی سے پیش آئیں۔
6- جو صلہ رحمی کا حق ادا نہ کرے' وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔

مندرجہ بالا حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ دنیا و آخرت کی کامیابی کا انحصار رشتہ داروں کے حقوق کی پاسداری پر ہے۔

قرابتداروں کے حقوق : قرآن و حدیث کی رو سے ایک مسلمان پر قرابتداروں کے مندرجہ ذیل حقوق ہیں۔

1- حسن سلوک
2- مالی اعانت
3- خوشی و غمی میں شرکت
4- عفو و درگزر
5- جسمانی خدمت
6- روحانی و دینی خدمت
7- صلہ رحمی

حسن سلوک : ایک مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں سے حسن سلوک' محبت اور شفقت سے پیش آئے۔ بزرگ رشتہ داروں کا احترام کرے۔ مصیبت اور پریشانی کے وقت ان کی دلجوئی کرے۔ اگر ان پر کوئی احسان کرے تو اسے نہ جتائے کیونکہ ان کے ساتھ احسان کرنا اس کا فرض ہے۔ جیسا کہ فرمان الٰہی ہے:

وبالوالدین احسانا وذی القربی
(اور والدین اور قریبی رشتہ داروں کے ساتھ احسان کرو)

مالی اعانت : ایک مسلمان کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے غریب رشتہ داروں کی مالی اعانت کرتا رہے۔ کسی کو کھانے کی حاجت ہو تو اسے کھانا کھلائے' کپڑے کی ضرورت ہو تو کپڑا پہنائے' روپے پیسے کی ضرورت ہو تو حتی الوسع پوری کرے۔ اگر کوئی رشتہ دار فوت ہو جائے تو اس کے اہل و عیال کی پرورش و تربیت کرے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

"اے نبی کہہ دیجئے جو کچھ مال بھی خرچ کرو' والدین پر' رشتہ داروں پر' یتیموں' مسکینوں اور مسافروں پر خرچ کرو"

زکوۃ کے بارے میں حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے اپنے قریبی رشتہ داروں میں [illegible] رشتہ داروں [illegible] سے دوگنا ثواب ملتا

ہے۔

خوشی و غمی میں شرکت : رشتہ داروں کی خوشی اور غمی میں شرکت کرنا بھی ہر مسلمان پر فرض ہے' کیونکہ خوشی میں شرکت کرنے سے رشتہ دار کی خوشی دوبالا ہو جاتی ہے اور غمی میں شرکت کرنے سے اس کے غم کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ رشتہ داروں کے ساتھ ملتے ملاتے رہنے سے ہمدردی اور محبت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور مشکل وقت میں ایک دوسرے کی مدد بھی کی جا سکتی ہے۔

عفو و درگذر : ایک مسلمان کا یہ بھی فرض ہے کہ اگر اس کے رشتہ دار اس کے ساتھ برائی کا معاملہ کریں یا اسے جانی و مالی نقصان پہنچائیں تو اسے چاہئے کہ انھیں معاف کر دے اور صبر سے کام لے۔ اور ان سے کوئی انتقام نہ لے۔ اس کے برعکس ان پر احسان کرے' کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔

چنانچہ اگر کسی قرابتدار سے کوئی قصور ہو جائے تو اہل دولت کو زیبا نہیں کہ وہ اس کی سزا میں اپنی امداد کا ہاتھ اس سے روک لیں۔ چنانچہ سورۃ النور میں فرمایا گیا ہے:

ولا یاتل اولو الفضل منکم والسعۃ ان یوتوا اولی القربی والمساکین

(اور جو لوگ تم میں بڑائی اور کشائش والے ہوں' وہ قرابت داروں اور محتاجوں کو دینے کی قسم نہ کھا بیٹھیں۔

جسمانی خدمت : رشتہ داروں کی جسمانی خدمت بھی فرض ہے۔ جو آدمی خود غریب ہے اور مال سے اپنے رشتہ داروں کی خدمت نہیں کر سکتا اسے چاہئے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کو جسمانی خدمت کے ذریعے فائدہ پہنچائے۔ مثلاً رشتہ داروں کے لئے جسمانی طور پر محنت و مشقت کی جا سکتی ہے' کسی کا کام سنوارا جا سکتا ہے' کسی مریض کی تیمارداری کی جا سکتی ہے۔

روحانی و دینی خدمت : رشتہ داروں کی روحانی و دینی خدمت امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے ذریعہ کی جا سکتی ہے۔ اگر اس کا کوئی رشتہ دار خدا و رسول کے احکام کی نافرمانی کرتا ہے تو اسے راہ راست پر لانے کے لئے اسے اسلامی تعلیمات کا درس دیا جا سکتا ہے۔ کسی رشتہ دار کو تعلیم دینا یا دلوانا بھی روحانی اور دینی خدمت ہے۔

صلہ رحمی : مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات قائم رکھے اور معمولی معمولی باتوں پر قطع تعلق نہ کرے۔ آنحضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص یہ پسند کرے کہ اس کی عمر میں زیادتی ہو اور اس کے رزق میں فراخی ہو' اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے' یعنی رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات جوڑے رکھے۔

صلہ رحمی کے فوائد : صلہ رحمی یعنی رشتہ داریاں قائم رکھنے سے درج ذیل فوائد حاصل ہوتے ہیں:

1۔ **خیر و برکت** : صلہ رحمی باعث خیر و برکت ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جو

شخص یہ پسند کرے کہ اس کی عمر میں برکت و زیادتی ہو اور رزق میں فراخی ہو اسے چاہئے کہ صلہ رحمی کرے۔

2- نسل انسانی کی بقا و ترقی : نسل انسانی کی بقا اور ترقی کا انحصار رشتہ داروں کے حقوق و فرائض کی نگہداشت پر ہے۔ اگر رشتہ داروں سے قطع تعلق کر لیا جائے تو خاندان کی ترقی رک جاتی ہے اور معاشرتی ترقی کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔

3- اصلاح معاشرہ : رشتہ داروں کے اتحاد و تعاون سے بہت سی برائیوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ رشتہ داریوں کے اثر و رسوخ اور دباؤ سے شرارت پسند عناصر سر نہیں اٹھاتے۔ اگر کوئی کسی اخلاقی یا قانونی جرم کا ارتکاب کرے تو اسے رشتہ داروں کے تعاون سے سزا دینا آسان ہو جاتا ہے۔ اس طرح اصلاح معاشرہ میں رشتہ داریاں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔

4- تعمیری منصوبوں کی کامیابی : رشتہ داریوں کے تعاون سے تعمیری منصوبوں پر آسانی سے عمل کر کے کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے۔

5- اتحاد : رشتہ داریاں اتحاد و یگانگت قائم رکھنے کا ذریعہ ہیں' اور باہمی اتحاد سے ہر مشکل کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

6- اقتصادی و معاشرتی خوشحالی : صلہ رحمی سے معاشرہ کی اقتصادی و معاشرتی خوشحالی خود بخود وجود میں آ جاتی ہے۔ جب ایک امیر شخص اپنے غریب رشتہ داروں کی مالی مدد کرتا ہے تو اس کی حالت سنبھل جاتی ہے۔ خاندان خوشحال ہوتے ہیں تو ملک بھی خوشحال ہو جاتا ہے۔

7- اخروی زندگی میں کامیابی : صلہ رحمی سے اللہ اور رسول کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک توحید کے بعد محبوب ترین عمل رشتہ قرابت کا جوڑنا ہے۔ اس کے برعکس فرمایا گیا ہے کہ جو قطع رحمی کرے گا جنت میں داخل نہیں ہو گا۔

8- مشکلات کا حل : رشتہ داریوں سے زندگی کی مشکلات جلد حل ہو جاتی ہیں۔ رشتہ دار ایک دوسرے کے دکھ سکھ' شادی و غمی میں شریک ہوتے ہیں تو باہمی تعاون کی فضا قائم ہوتی ہے۔ ہر شخص رشتہ داروں کی مدد سے اپنی مشکلات پر قابو پا سکتا ہے۔

9- صلہ رحمی سرچشمہ محبت : صلہ رحمی محبت کا سرچشمہ ہے۔ رشتہ داریوں کی وجہ سے غیر بھی اپنے بن جاتے ہیں اور دشمنوں کو دوست بنایا جا سکتا ہے۔ ہر رشتہ دار کے اپنے دوست ہوتے ہیں' ایک رشتہ دار کی وساطت سے اس کے دوستوں سے تعلقات قائم کر کے اپنے تعلقات کو وسیع کیا جا سکتا ہے۔

عظمت انسانی

سوال: اسلام میں انسان کی عظمت بیان کریں۔

اسلام کا تصور انسان : انسان کو ابتدا سے ہی کائنات کی طرح اپنے متعلق بھی بڑی غلط فہمی رہی ہے اور اب تک اس کی یہ غلط فہمی باقی ہے۔ کبھی وہ افراط پر اترتا تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے بلند ہستی سمجھ لیتا ہے۔ غرور و تکبر اور سرکشی کی ہوا اس کے دماغ میں بھر جاتی ہے۔ کسی طاقت کو اپنے سے بالاتر کیا اپنے مد مقابل بھی نہیں سمجھتا۔ اپنے آپ کو غیر ذمہ دار اور غیر جواب دہ سمجھ کر جبرو قہر کا دیوتا' ظلم و جور اور شرو فساد کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ کبھی تفریط کی طرف مائل ہوتا ہے تو اپنے آپ کو دنیا کی سب سے ذلیل ہستی سمجھ لیتا ہے۔ درخت' پتھر' دریا' پہاڑ' ہوا' آگ' بادل' بجلی' چاند' سورج' تارے' غرض ہر اس چیز کے سامنے گردن جھکا دیتا ہے جس کے اندر کسی قسم کی طاقت یا مضرت یا منفعت نظر آتی ہے۔ اور خود اپنے جیسے آدمیوں میں بھی کوئی قوت دیکھتا ہے تو ان کو بھی دیوتا' معبود اور حاکم مطلق مان لینے میں تامل نہیں کرتا۔

اسلام نے ان دونوں انتہائی تصورات کو باطل کر کے انسان کی اصل حقیقت اس کے سامنے پیش کی ہے۔

یایھا الانسان ماغرک بربک الکریم ○ الذی خلقک فسوىک فعدلک ○ فی ای صورۃ ماشاء رکبک ○

ترجمہ : اے انسان کس چیز نے تجھے اپنے رب کریم سے مغرور کر دیا؟ اس رب سے جس نے تجھے پیدا کیا۔ تیرے اعضا درست کیے۔ تیرے قویٰ میں اعتدال پیدا کیا اور جس صورت میں چاہا تیرے عناصر کو ترکیب دی۔ (الانفطار)

اس اور اسی قسم کی دوسری آیات میں انسان کے غرور و تکبر کے بتوں کو توڑا گیا ہے۔ اسے اس طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ ذرا اپنی حقیقت تو دیکھ! خدا تجھے کن حقیر اجزاء سے پیدا کرتا ہے۔ پہلے رحم مادر میں ایک گوشت کا لوتھڑا بناتا ہے' پھر اپنی قدرت سے اس لوتھڑے میں جان ڈالتا

ہے' اس میں حواس پیدا کرتا ہے اور ان آلات اور ان قوتوں سے اس کو مسلح کرتا ہے جن کی انسان کو دنیوی زندگی میں ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح تو دنیا میں آتا ہے مگر تیری ابتدائی حالت یہ ہوتی ہے کہ تو ایک بے بس بچہ ہوتا ہے جس کو اپنی قدرت سے ایسا سامان کیا ہے کہ تیری پرورش ہوتی ہے۔ تو بڑھتا ہے' جوان ہوتا ہے' طاقت ور اور قادر ہوتا ہے۔ پھر تیری قوتوں میں انحطاط شروع ہوتا ہے۔ تو جوانی سے بڑھاپے کی طرف جاتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک وقت میں تجھ پر پھر وہی بے بسی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جو بچپن میں تھی۔ تیرے حواس جواب دے دیتے ہیں۔ تیری قوتیں ضعیف ہو جاتی ہیں۔ مال املاک' عزیز' دوست' اقارب سب کو چھوڑ کر قبر میں جا پہنچتا ہے۔ اس مختصر عرصہ حیات میں تو ایک لمحہ کے لئے اپنے آپ کو زندہ رکھنے پر قادر نہیں۔ تجھ سے بالاتر ایک اور قوت ہے جو تجھ کو زندہ رکھتی ہے اور جب چاہتی ہے تجھ کو دنیا چھوڑنے پر مجبور کر دیتی ہے۔ پھر جتنی مدت تو زندہ رہتا ہے قوانین قدرت سے جکڑا رہتا ہے۔ یہ ہوا' یہ پانی' یہ روشنی' یہ حرارت' یہ زمین کی پیداوار' یہ قدرتی ساز و سامان جن پر تیری زندگی کا انحصار ہے ان میں سے کوئی بھی تیرے بس میں نہیں۔ نہ تو ان کو پیدا کرتا ہے نہ یہ تیرے احکام کے تابع ہیں۔ یہی چیزیں جب تیرے خلاف آمادہ پیکار ہو جاتی ہیں تو تو اپنے آپ کو ان کے مقابلے میں بے بس پاتا ہے۔ ایک ہوا کا جھکڑ تیری بستیوں کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ ایک پانی کا طوفان تجھے غرقاب کر دیتا ہے۔ ایک زلزلے کا جھٹکا تجھے پیوند خاک کر دیتا ہے۔ تو خواہ کتنے ہی آلات سے مسلح ہو' اپنے علم سے (جو خود بھی تیرا اپنا پیدا کیا ہوا نہیں ہے۔) کیسی ہی تدبیریں ایجاد کر لے' اپنی عقل سے (جو خود بھی تیری حاصل کردہ نہیں ہے) کیسے ہی سامان مہیا کر لے' قدرت کی طاقتوں کے سامنے یہ سب دھری کی دھری رہ جاتی ہیں۔ اس بل بوتے پر اکڑتا ہے' پھولا نہیں سماتا' کسی طاقت کو خاطر میں نہیں لاتا فرعونیت اور نمرودیت کا دم بھرتا ہے۔ جبار و قہار بنتا ہے' ظالم و سرکش بنتا ہے' خدا کے مقابلے میں بغاوت کرتا ہے۔ خدا کے بندوں کا معبود بنتا ہے اور خدا کی زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔

اس تکبر شکنی کے بعد اسلام وہ اعلیٰ مقام بھی متعین کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں انسان کو عطا فرمایا ہے۔ وہ نوع بشر کو بتاتا ہے کہ وہ اتنا ذلیل بھی نہیں ہے جتنا اس نے اپنے آپ کو سمجھ لیا ہے۔ وہ کہتا ہے:

> **ولقد کرمنا بنی ادم و حملنھم فی البر و البحر ورزقنھم الطیبت وفضلنھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا ○**
>
> "ہم نے بنی آدم کو عزت بخشی اور ان کو خشکی اور تری میں سواریاں دیں اور ان کو پاک چیزوں سے رزق عطا کیا اور بہت سی ان چیزوں پر جو ہم نے پیدا کی ہیں ان کو ایک طرح کی فضیلت عطا کی ہے۔ (بنی اسرائیل: ۷)

الم تر ان اللہ سخر لکم ما فی الارض

"اے انسان! کیا تو دیکھتا نہیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو جو زمین میں ہیں تیرے لئے مطیع بنا دیا ہے۔ (الحج: 9)

ان آیات میں اور ایسی ہی بہت سی دوسری آیات میں انسان کو یہ بتلایا گیا ہے کہ زمین میں جتنی چیزیں ہیں وہ سب تمہارے فائدے اور خدمت کے لئے مسخر کر دی گئی ہیں۔ اور آسمان کی بھی بہت سی چیزوں کا یہی حال ہے۔ یہ درخت' یہ دریا' یہ سمندر' یہ پہاڑ' یہ جانور' یہ رات اور دن' یہ تاریکی اور یہ روشنی' یہ چاند' یہ سورج' یہ تارے غرض یہ سب چیزیں جن کو تم دیکھ رہے ہو تمہاری خادم ہیں اور دراصل تمہاری منفعت کے لئے ہیں۔ تمہارے لئے انہیں کار آمد بنایا گیا ہے۔ تم ان سب پر فضیلت رکھتے ہو۔ تم کو ان سب سے زیادہ عزت دی گئی ہے تم کو ان کا مخدوم بنایا گیا ہے۔ پھر کیا تم اپنے خادموں کے آگے سر جھکاتے ہو؟ ان کو اپنا حاجت روا سمجھتے ہو؟ ان کے آگے دست سوال دراز کرتے ہو؟ ان سے اپنی مدد کی التجائیں کرتے ہو؟ ان سے ڈرتے اور خوف کھاتے ہو؟ ان کی عظمت و بزرگی کے گیت گاتے ہو؟ اس طرح تو تم اپنے آپ کو ذلیل کرتے ہو۔ آپ اپنا مرتبہ گراتے ہو' خادموں کے خادم' غلاموں کے غلام خود بنتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان نہ اتنا عالی مرتبہ ہے جتنا وہ بزعم خود اپنے آپ کو سمجھتا ہے اور نہ اتنا پست و ذلیل ہے جتنا اس نے خود اپنے آپ کو بنا لیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ انسان کا صحیح مرتبہ کیا ہے؟

خلیفۃ اللہ فی الارض : اس کا جواب اسلام یہ دیتا ہے کہ وہ اس زمین پر خدا کا خلیفہ (نائب) ہے۔

"اور جب تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں تو انہوں نے عرض کیا' کیا تو زمین میں اس کو نائب بناتا ہے جو وہاں فساد پھیلائے گا اور خوں ریزیاں کرے گا۔ حالاں کہ ہم تیری حمد کے ساتھ تیری تسبیح اور تیری تقدیس کرتے ہیں۔ اللہ نے فرمایا میں وہ باتیں جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے اور اس نے آدم کو سب چیزوں کے نام سکھا دیئے۔ پھر ان کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا اگر سچے ہو تو ان چیزوں کے نام مجھے بتاؤ انہوں نے کہا پاک ذات ہے تیری ہم اس کے سوا کچھ نہیں جانتے جو تو نے ہم کو سکھا دیا ہے۔ تو ہی علم رکھنے والا ہے اور تو ہی حکمت کا مالک۔ خدا نے کہا "اے آدم ان فرشتوں کو ان چیزوں کے نام بتاؤ۔" پس جب آدم نے ان کو اشیاء کے نام بتائے تو خدا نے کہا۔ "کیا میں تم سے نہ کہتا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کی سب مخفی باتیں جانتا

ہوں اور جو کچھ تم چھپاتے ہو اور ظاہر کرتے ہو اس سب کا علم رکھتا ہوں۔" اور جب ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو ان سب نے سجدہ کیا بجز ابلیس کے کہ اس نے انکار اور تکبر کیا اور نافرمانوں میں سے ہو گیا اور ہم نے آدم سے کہا کہ "اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور اس میں جہاں چاہو بہ فراغت کھاؤ مگر اس درخت کے پاس بھی نہ پھٹکو کہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے۔" مگر شیطان نے ان کو جنت سے اکھاڑ دیا اور وہ جس خوشحالی میں تھے ان کو وہاں سے نکلوا دیا۔" (البقرہ: 4)

اس مضمون کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ انسان کو خدا نے زمین میں اپنا نائب بنایا' اس کو فرشتوں سے بڑھ کر علم دیا' اس کے علم کو فرشتوں کی تسبیح و تقدیس پر ترجیح دی' فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو سجدہ کریں۔ فرشتوں نے اس کو سجدہ کر لیا اور اس طرح ملکوتیت اس کے آگے جھک گئی۔ مگر ابلیس نے انکار کیا اور اس طرح شیطانی قوتیں انسان کے آگے نہ جھک سکیں۔ حقیقت میں تو وہ مٹی کا ایک حقیر پتلا تھا مگر خدا نے اس میں جو روح پھونکی تھی اور اس کو جو علم بخشا تھا اس نے اس کو نیابت خداوندی کا اہل بنا دیا۔ فرشتوں نے اس کی فضیلت کو تسلیم کیا اور اس کے آگے جھک گئے لیکن شیطان نے اس کو تسلیم نہ کیا۔ اس جرم میں شیطان پر لعنت بھیجی گئی مگر اس نے قیامت تک کے لئے مہلت مانگ لی کہ انسان کو بہکانے کی کوشش کرے۔ چنانچہ شیطان نے انسان کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا۔ اور اس وقت سے انسان اور شیطان میں کشمکش برپا ہے۔ خدا نے انسان سے کہہ دیا کہ جو ہدایت میں تجھے بھیجوں اس کو مانے گا تو جنت میں جائے گا اور اپنے ازلی دشمن شیطان کا حکم مانے گا تو دوزخ تیرا ٹھکانا ہو گا۔

منصب نیابت کی حقیقت : اس بیان سے چند امور معلوم ہوتے ہیں۔

اولاً" یہ کہ انسان خلیفہ ہونے کی حیثیت سے صرف خدا ہی کا ماتحت ہے۔ اس کا درجہ تمام چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے۔ دنیا کی تمام چیزیں اس کی خادم ہیں اور اس لئے ہیں کہ وہ ان کو استعمال کرے اور اپنے آقا کے بتائے ہوئے طریقہ پر ان سے خدمت لے۔ ان ماتحتوں کے آگے جھکنا اس کے لئے ذلت ہے۔ اگر جھکے گا تو اپنے اوپر ظلم کرے گا اور گویا نیابت الٰہی کے منصب سے خود دستبردار ہو گا۔

دوسرے یہ کہ نائب کا کام یہ ہے کہ وہ جس کا نائب ہے اس کی اطاعت کرے۔ اسے اس بات کا اختیار نہیں کہ اپنے آقا کی رعیت اور اس کے نوکروں اور خادموں کو خود اپنی رعیت' اپنا نوکر اور اپنا خادم بنا لے کہ ایسا کرے گا تو باغی قرار پائے گا۔ اس کو جس جگہ نائب بنایا گیا ہے وہاں اپنے آقا کی املاک کو استعمال کر سکتا ہے۔ اس کی رعیت پر حکومت کر سکتا ہے۔ اس سے خدمت

لے سکتا ہے۔ ان کی نگرانی کر سکتا ہے۔ مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ خود آقا ہے بلکہ اس حیثیت سے کہ وہ اپنے آقا کا نمائندہ ہے۔ اور جتنی چیزیں اس کے زیر حکم ہیں ان پر اپنے آقا کا امین ہے۔ اس بنا پر وہ سچا اور پسندیدہ اور مستحق انعام نائب اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ وہ اپنے آقا کی امانت میں خیانت نہ کرے۔

اس امانت میں نہ صرف دنیا کی ہر چیز شامل ہے بلکہ خود انسان کا اپنا نفس بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ لہٰذا جس طرح بقیہ اشیاء کا وہی تصرف مناسب ہے جو آقا کی مرضی کے مطابق ہو اسی طرح خود انسان کا جسم اور اس کی جان بھی خدا کی ہدایات کے مطابق استعمال ہونی چاہئیں۔ خدا نے اپنی مرضی وحی و الہام کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دی اور خدا کا مربوط اور مفصل قانون کتاب و سنت میں محفوظ ہے۔ انسان کا کام یہ ہے کہ وہ اس کو سمجھ کر اپنے اعمال و افعال خدا کی مرضی کے مطابق ڈھالے۔

تیسرے یہ کہ نہ صرف انسان کا عمل خدا کے دیے ہوئے قانون کے مطابق ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مطابقت اتفاقی نہ ہو۔ نائب کا کام یہی نہیں کہ وہ ایسے افعال انجام دے جو آقا کی نظر میں پسندیدہ ہوں بلکہ یہ بھی ہے کہ نائب یہ افعال آقا کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم کر کے اس کی رضا کی خاطر کرے۔ اگر ایسا نہ کرے گا تو نہ اپنے نائب ہونے کی حیثیت کو سمجھ سکے گا نہ اپنے امین ہونے کے منصب کا کوئی صحیح تصور اس کے ذہن میں پیدا ہو گا۔ نہ اپنے ذمہ دار اور جوابدہ ہونے کا احساس کر سکے گا اور نہ اس امانت میں جو اس کے سپرد کی گئی ہے اپنی ذمہ داریاں اور اپنے فرائض صحیح صحیح طور پر ادا کرنے کے قابل ہو گا۔ اول تو یہ ممکن نہیں کہ کسی دوسرے تخیل کے ماتحت انسان وہ طرز عمل اختیار کر سکے جو نیابت و امانت کے تحت وہ اختیار کرے گا اور اگر بفرض محال اس کا طرز عمل ویسا ہو بھی تو اس کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ آقا کی فرمانروائی تسلیم کرنے سے انکار کر کے تو وہ پہلے ہی باغی ہو چکا ہے۔ اب اگر اس نے اپنے نفس یا کسی اور کے اتباع میں اچھے عمل کئے بھی تو اس کا اجر اس سے طلب کرے جس کا اس نے اتباع کیا ہے۔ اس کے آقا کے ہاں اس کے وہ اعمال بے کار اور بے وزن ہیں۔

چوتھے اسی لفظ خلافت و نیابت سے ایک اہم نکتہ یہ بھی نکلتا ہے کہ نائب کا اصل کمال یہ ہے کہ وہ اپنے آقا کی املاک میں اس کی جانشینی کا حق ادا کرنے کی کوشش کرے اور جہاں تک ممکن ہو ان میں اسی شان کا تصرف کرے جس شان کا وہ حقیقی مالک کرتا ہے۔ بادشاہ اگر اپنی رعیت پر کسی شخص کو اپنا نائب بنائے تو اس کے لئے اپنے منصب نیابت کے استعمال کا بہترین طریقہ یہ ہو گا کہ رعیت کی خبر گیری' شفقت' مہربانی' حفاظت' عدل اور حسب موقع سختی کرنے میں وہی سیرت اختیار کرے جو خود بادشاہ کی سیرت ہے۔ اور بادشاہ کی املاک اور اس کے اموال میں ویسی ہی حکمت' تدبر' دانائی اور احتیاط سے تصرف کرے جس سے خود بادشاہ ان میں تصرف کرتا ہے۔ پس انسان کو بھی نائب خدا ہونے کی حیثیت سے وہی روش اختیار کرنی چاہئے جو خود خدا کی روش ہے۔

مخلوق کی ویسی ہی خیر گری' وہی رحمانی و رحیمی' وہی عدل' وہی رحم و کرم' ویسا ہی قہر و جبر جو خود خدا کے اخلاق میں شامل ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اپنے کردار میں بھی راسخ کرے۔ یہی مفہوم ہے جو " تخلقوا باخلاق اللہ " کے حکیمانہ جملہ میں ادا کیا گیا ہے۔ اگرچہ یہ صحیح ہے کہ انسان اپنے میں یہ صفات اس حد تک پیدا نہیں کر سکتا جس حد تک خدا کی ہیں کہ درجہ نیابت' خداوندی کے آگے ہیچ ہے لیکن اپنی حد تک ان صفات میں زیادہ سے زیادہ ملکہ پیدا کرنا ہی صحیح اسلامی زندگی ہے۔

پانچویں یہ کہ انسان جب تک زمین میں ہے اور جب تک مٹی کے پتلے (جسم انسانی) اور خدا کی پھونکی ہوئی روح میں تعلق باقی ہے اس وقت تک وہ خدا کا نائب ہے۔ یہ تعلق منقطع ہوتے ہی وہ خلافت ارضی کے منصب سے علیحدہ ہو جاتا ہے۔ اس کے زمانہ نیابت کے افعال و اعمال کی جانچ پڑتال ہونی چاہیے۔ اس کے سپرد جو امانت کی گئی تھی اس کا حساب کتاب ہونا چاہیے۔ اس پر نائب ہونے کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں عائد کی گئی تھیں ان کی تحقیقات ہونی چاہیے کہ اس نے کس طرح انجام دیں۔ اگر اس نے غبن' خیانت' نافرمانی' بغاوت اور فرض ناشناسی کی ہے تو اس کو سزا ملنی چاہیے۔ اور اگر ایمان داری' فرض شناسی اور اطاعت کوشی سے کام کیا ہے تو اس کا انعام بھی ملنا ضروری ہے۔

چھٹے یہ کہ ہر انسان نائب ہونے کی حیثیت سے اپنے اچھے برے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ نہ یہ امید باقی رہنے دی گئی ہے کہ کوئی ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کرے گا نہ اس توقع کی کوئی گنجائش چھوڑی گئی ہے کہ کسی کے تعلق اور کسی کے واسطہ سے ہم اپنے جرائم کے نتائج اور ان کی سزا سے بچ جائیں گے۔ اور نہ اس کا کوئی خطرہ باقی رکھا گیا ہے۔ کہ کسی کا جرم ہمارے حسن عمل پر اثر انداز ہو گا۔ یا خدا کے سوا کسی کی خوشی کو ہمارے اعمال کی مقبولیت و نا مقبولیت میں کوئی دخل ہے۔ لہٰذا دنیا برتنے میں ہر شخص کو اپنی پوری ذمہ داری کا احساس ہونا چاہیے اور دنیا و مافیہا سے قطع نظر کر کے یہ سمجھتے ہوئے زندگی بسر کرنی چاہیے کہ اپنے ہر عمل کا ذمہ دار میں خود ہوں۔

فرد اور معاشرے کا تعلق

سوال: اسلام میں فرد اور معاشرے کا تعلق بیان کریں۔

"معاشرہ" کے لغوی معنی ہیں: ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنا۔ اصطلاح میں معاشرہ سے مراد وہ انسانی اجتماع ہے جو کسی خاص عقیدے اور مسلک پر قائم ہو اور اس کا نظام فکر و عمل ایک خاص اسلوب پر ہو۔ چنانچہ انسانوں کے ایسے گروہ کو جو بلا مقصد و ارادہ کسی جگہ جمع ہو جائے' معاشرہ نہیں کہا جا سکتا۔

انگریزی میں "معاشرہ" کا مترادف "سوسائٹی" ہے۔

معاشرہ کی اہمیت و ضرورت :

(1) **معاشرت فطرت انسانی ہے :** انسان فطری طور پر اپنے ہم جنسوں سے مل کر زندگی گزارنا پسند کرتا ہے۔ تنہائی اور کنارہ کشی کی زندگی اس کی فطرت کے مطابق نہیں۔ ایک فلسفی کا قول ہے کہ:

"جو تنہا زندگی بسر کرتا ہے وہ دیوتا ہے یا وحشی"

دیوتا بننے سے تو رہا؟ یہ تنہائی کی زندگی انسان کو وحشی بنا دیتی ہے۔ رہبانیت اور ترک دنیا سے انسان کی خداداد صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں۔ اس سے نہ صرف روحانی ترقی کے امکانات باقی رہتے ہیں اور نہ مادی ترقی کے۔

(2) **معاشرت ضرورت انسانی ہے :** انسان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کا مظاہرہ معاشرہ میں رہ کر ہی کیا جا سکتا ہے' خواہ وہ کتنا ہی نیک یا کتنا ہی صاحب دانش کیوں نہ ہو' معاشرہ سے الگ تھلگ رہ کر اس کی کوئی خوبی یا صلاحیت بروئے کار نہیں آ سکتی۔ انسانی عظمت کا راز معاشرہ کے اندر باعظمت زندگی بسر کرنے میں ہے اور معاشرہ کے لئے سودمند اور مفید ثابت ہونے کے اندر ہے۔ اپنے ہم جنسوں کی خدمت اور ان سے میل جول بڑھانے کے اندر ہے۔

اسلام ایک دوسرے سے مل جل کر رہنے اور ایک دوسرے کی مدد و معاونت کرنے کا درس دیتا ہے۔

بقول اقبال:

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

علامہ اقبال نے فرد اور ملت کو ہم آہنگ رہنے کا درس دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں
موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں

اسی طرح ایک شاعر کا کہنا ہے کہ:

غیر کے درد پہ بھی اشک بداماں ہونا
یہی معراج بشر ہے' یہی انساں ہونا

اسلام میں معاشرت کی تاکید : رہبانیت اور ترک دنیا چونکہ ایک غیر فطری اور انسان کی صلاحیتوں کو برباد کرنے والا فعل ہے اس لئے اسلام کی تعلیمات میں رہبانیت کی کوئی گنجائش نہیں۔

قرآن مجید میں عیسائیوں کی رہبانیت کے بارے میں فرمایا گیا ہے:

ورھبانیتہ ابتدعوھا ما کتبناھا علیھم (الحدید)

(اور ترک دنیا جو انہوں نے خود ایجاد کی ہم نے وہ ان پر فرض نہیں کی تھی)

ارشاد نبوی ہے:

لا رھبانیتہ فی الاسلام

(اسلام میں رہبانیت نہیں)

بعض اوقات معاشرہ کی طرف سے تکلیفیں پہنچتی ہیں مگر اسلام اس صورت میں بھی معاشرہ سے کنارہ کشی کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس سے جماعت کی قوت کمزور پڑ جاتی ہے۔

آنحضورﷺ کا فرمان ہے:

"وہ مسلمان جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کو ایذائیں اٹھاتا ہے' اس شخص سے بہتر ہے' جو لوگوں سے ملاپ نہیں رکھتا اور ان کی ایذائیں نہیں اٹھاتا۔"

فرد اور معاشرے کے مقاصد

(1) **انفرادی ترقی :** معاشرہ کے قیام کا سب سے ضروری مقصد یہ ہے کہ فرد کی زندگی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بہتر ہو۔ انفرادی حیثیت سے فرد کو ایسی سہولتیں میسر ہوں جن سے اس کی تمام صلاحیتیں پوری طرح نشوونما پا سکیں اور ان کو اجاگر ہونے کا پورا موقع مل سکے۔ فرد کی شخصیت کی تکمیل کا انحصار بھی معاشرے پر ہے۔ معاشرہ فرد کی ذہنی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے اور اسے ترقی سے ہم کنار ہونے کے مواقع فراہم کرتا ہے۔ معاشرہ میں رہ کر انسان میں سوجھ بوجھ اور فہم و فراست کی خاصیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کو صحیح اصولوں پر منظم کیا جائے تاکہ فرد اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح بروئے کار لا سکے۔

(2) **اجتماعی ترقی :** اجتماعی حیثیت سے معاشرہ کا نصب العین یہ ہے کہ تمام افراد قومی ترقی کے حصول کی کوشش کریں۔ پھر قومی اور تہذیب کی ترقی کے ساتھ ساتھ دنیا کی دوسری اقوام سے اپنے رشتے استوار کریں' جس سے تمام بنی نوع انسان ایک ہی برادری کے رکن معلوم ہوں۔ اس

طرح وہ اجتماعی طور پر کامیاب زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور دنیا میں اپنا مخصوص مقام حاصل کر لیں گے۔

ہر ملک کے افراد کو ایک دوسرے کے ساتھ باہمی تعاون اور اشتراک کے جذبے کو تقویت دینی چاہئے۔ پھر معاشرے کو قوموں کی علیحدہ علیحدہ تربیت کرنی چاہئے' جس سے اقوام میں باہمی تعاون اور ایثار کی روح پیدا ہو سکے۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے انسانیت کو عالمگیر جنگوں کی تباہی سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔ اس طرح تمام اقوام اجتماعی طور پر ایک عالمگیر برادری میں منسلک ہو جائیں گے اور یہی معاشرے کا حقیقی مقصد ہے۔

(3) اخلاقی ترقی : معاشرے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ افراد کی اخلاقی ترقی کا ضامن ہو' ان میں جذبہ خدمت کو اجاگر کرنے کی کوشش کرے' معاشرہ کے تمام افراد میں ہمدردی' باہمی تعاون اور اخوت کے جذبات پیدا کرے' تاکہ خودغرضی اور طبقاتی منافرت کا خاتمہ ہو سکے اور باہمی اتحاد و تعاون سے افراد کو ترقی سے روشناس کرایا جائے۔

(4) معاشی ضروریات کی فراہمی : معاشرے کا فرض ہے کہ وہ افراد کی معاشی ضروریات کی اشیاء بہم پہنچائے' ان کے بغیر فرد نہ تو انفرادی حیثیت سے کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ ہی اجتماعی حیثیت سے معاشرے کی کوئی خدمت کر سکتا ہے۔ اگر معاشرہ ایسی سہولتیں بہم پہنچائے جس سے فرد باسانی بنیادی ضروریات کی اشیاء فراہم کر سکے تو پھر وہ اپنی ذہنی ترقی کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ مادی آسائشیں مہیا ہوتے ہی فرد کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ وہ ذہنی تربیت کی طرف زیادہ توجہ دے سکتا ہے اور علوم و فنون اور ادب کے لئے زیادہ سے زیادہ وقت نکال سکتا ہے۔ اس سے فرد کا ذہن ترقی پاتا ہے اور افراد کی ذہنی ترقی ہی میں معاشرہ کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

(5) یکساں مواقع : معاشرہ کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ وہ ہر فرد کو ترقی کے مواقع فراہم کرے۔ اس کی جسمانی اور ذہنی بہتری کے لئے سہولتیں پہنچائے۔ لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ یہ سہولتیں عام افراد کو بلاتمیز میسر آئیں۔ یہ نہ ہو کہ چند افراد اس سے مستفید ہو جائیں اور دوسرے محروم رہ جائیں۔ ایک اچھے معاشرہ میں تمام افراد کو اپنی شخصیت اجاگر کرنے اور صلاحیتوں کی نشوونما کے یکساں مواقع نصیب ہونے چاہئیں۔ اس سے افراد میں احساس خودی پیدا ہوتا ہے اور ان کی خود غرضی کے جذبے کا بھی خاتمہ ہوتا ہے۔ ایک اچھے معاشرہ میں ایک فرد کی شخصیت کی نشوونما کسی کے حقوق کو نقصان پہنچا کر نہیں کی جاتی بلکہ تمام افراد کو ترقی کے پورے اسباب یکساں مہیا کئے جاتے ہیں۔

اسلامی معاشرہ میں فرد اور جماعت کا باہمی تعاون : معاشرہ افراد کے مجموعہ کا نام ہے' جس قسم کے افراد ہوں گے ان سے مرکب ہونے والی جماعت بھی اسی قسم کی ہو گی' اس لئے اسلام نے فرد کی اصلاح پر بڑا زور دیا ہے تاکہ وہ معاشرتی ذمہ داریوں کو نبھانے کے قابل ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ افراد کی فطری آزادی کا پورا احترام ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اسلام نے اگر فرد کو یہ اجازت نہیں دی کہ وہ جماعت کے نظم و ضبط میں خرابی پیدا کرے' تو جماعت کو بھی یہ حق نہیں دیا کہ وہ فرد کے حقوق کو سلب کرے یا اس پر بے جا دباؤ ڈالے۔ اسلامی نظام معاشرت میں

جماعت اگر اس لئے اہم ہے کہ انسانی زندگی اس کی بہتر اور صحت مند تشکیل کے بغیر اچھی طرح بسر نہیں ہو سکتی تو فرد بھی اتنا ہی اہم ہے' کیونکہ اس کے وجود کے بغیر جماعت کے وجود کا تصور ہی بے معنی ہے۔ غرض اس نظام میں فرد اور جماعت دونوں کی حیثیت برابر ہے' اور دونوں کی اصلاح مد نظر ہے۔

اصل میں فرد ہی معاشرہ بنانے والا اور تاریخ ساز ہے۔ جماعت کا عضو ہونے کی وجہ سے اس کی انفرادی حیثیت ختم نہیں ہوتی بلکہ مزید اجاگر ہوتی ہے' کیونکہ افراد کے اعمال و افعال ہی معاشرہ میں اصل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ جماعت کو یہ حق نہیں دیا گیا کہ وہ فرد کی فطری آزادی سلب یا محدود کرے' بلکہ جماعت پر فرد کی آزادی کا تحفظ فرض قرار دیا گیا ہے۔ اگر فرد کی آزادی خطرہ میں ہو تو جماعت کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

اسلامی معاشرے میں فرد کو ترقی اور نشوونما کے پورے پورے مواقع حاصل ہیں۔ اسلام نے ایک طرف تو فرد کو اس کا جائز مقام دیا ہے اور اس کی اصلاح اور فلاح و بہبود کا جامع منصوبہ پیش کیا ہے' دوسری طرف معاشرہ کی اہمیت اور اجتماعی زندگی کے مقاصد کو بھی ان کا پورا پورا حق دیا ہے۔ اس نے قانون عدل کو ہاتھ میں لے کر فرد اور جماعت میں فطری توازن و تناسب قائم کیا ہے۔

خصائص :

(1) **وحدت فکر و عمل** : اسلامی معاشرہ کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا ہر فرد فکر و عمل کی وحدت میں کھڑا ہوا ہے۔ ہر مسلمان اللہ تعالیٰ' اس کے فرشتوں' اس کی کتابوں' اس کے رسولوں اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ ایک خدا' ایک رسول اور ایک ہی کتاب نے مسلمانوں میں فکر و عمل کی وحدت پیدا کر دی ہے۔ تمام مسلمان ایک ہی نہج پر سوچتے ہیں۔ پھر نماز' زکوۃ' روزہ اور حج کی ادائیگی سے بھی مسلمانوں میں وحدت عمل پیدا ہوتی ہے۔ اس وحدت فکر و عمل سے معاشرہ میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

(2) **ایثار و قربانی** : اسلامی معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت ایثار و قربانی ہے۔ اس کا ہر فرد دوسرے افراد ملت کے لئے ہر قسم کی قربانی دینے کے لئے ہمہ وقت مستعد رہتا ہے۔ زکوۃ اس ایثار کی عملی صورت ہے۔

(3) **مساوات** : اسلامی معاشرہ کی بنیاد انسانی مساوات کے عقیدہ پر ہے۔ اسلام نے بڑائی یا پستی کا معیار انسان کے ذاتی اخلاق اور اچھے یا برے اعمال کو قرار دیا ہے۔ اسلام میں فضیلت کا معیار تقوٰی ہے۔ اسلامی معاشرہ بناوٹی اختلافات و امتیازات سے مبرا ہے۔ یہاں قبیلے اور خاندان صرف تعارف کے لئے ہیں۔ اسلام میں ذات پات' اونچ نیچ اور چھوت چھات کا کوئی تصور نہیں۔ ابن آدم ہونے کی حیثیت سے تمام انسان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور رتبہ میں برابر ہیں۔

اسلامی معاشرہ تمام انسانوں کے حقوق میں مساوات کا داعی ہے۔ ہر انسان کو انسانی بنیادی حقوق مساوی طور پر حاصل ہیں۔ کوئی بھی شخص قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ بادشاہ اور رعایا' حاکم اور محکوم دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ ایک عام شخص اپنی حق تلفی ہونے پر حاکم' خلیفہ یا

سلطان کے خلاف عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔

اسلامی معاشرہ میں ہر فرد کو خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ وسائل رزق سے استفادہ کرنے کا حق حاصل ہے اور وہ اپنی صلاحیت و قابلیت کے مطابق کوئی بھی جائز پیشہ اختیار کر کے روزی کما سکتا ہے۔

(4) اخوت و ہمدردی : اسلامی معاشرہ کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس معاشرہ کے تمام افراد رشتہ اخوت میں منسلک ہیں۔

ارشاد خداوندی ہے:

انما المومنون اخوة

(بلاشبہ سب مومن بھائی بھائی ہیں)

اسلام اخوت کی یہ دلیل دیتا ہے کہ تمام انسان ایک ہی باپ یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ ایک باپ کی اولاد آپس میں بھائی بھائی ہوتی ہے۔ اس بھائی چارہ کا ایک لازمی نتیجہ ہمدردی اور شفقت ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ:

"باہمی شفقت اور مہربانی میں تم اہل ایمان کو ایک جسم کی طرح پاؤ گے' اگر جسم کا ایک عضو دکھنے لگے' تو سارا جسم بیداری اور بخار میں اس کا ساتھ دیتا ہے۔"

(5) سادگی : اسلامی معاشرہ سادگی اور پاکیزگی کا علمبردار ہے۔ اسلام نے مردوں کے لئے سونے کے زیورات اور ریشمی لباس ممنوع قرار دیا ہے اور کھانے پینے اور روز مرہ کے اخراجات میں فضول خرچی کو حرام قرار دیا ہے۔ قرآن نے فضول خرچی کرنے والے کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔ اسلام میں عیش و عشرت اور لہو و لعب کی زندگی اختیار کرنے کی ممانعت ہے۔

(6) صفائی اور طہارت : اسلام پاکیزگی اور طہارت کا حامی ہے اور ظاہری و باطنی دونوں قسم کی صفائی پر زور دیتا ہے۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

الطهور شطر الايمان

(طہارت ایمان کا حصہ ہے)

چنانچہ روزانہ پانچ وقت کی نماز کے لئے بدن' کپڑے اور جگہ کے پاک ہونے کی شرط مقرر ہے' گویا کہ یہ پاکیزگی عبادات سے مقدم ہے' جس کے بغیر نماز جیسی عبادت قبول نہیں ہوتی۔

(7) آداب اور اطوار کی پابندی : اسلامی معاشرہ اسلامی آداب و اطوار کو اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ اسلام نے کھانے پینے' اٹھنے بیٹھنے' سونے جاگنے' چلنے پھرنے اور گفتگو کے آداب سکھائے ہیں' ہر مسلمان پر ان کی پابندی لازم ہے۔ ان آداب سے مسلمانوں کی انفرادیت وجود میں آتی ہے۔

(8) بیکار مشاغل سے اجتناب : اسلامی معاشرہ اس بات کا حامی ہے کہ اس کے افراد کا

تمام وقت انفرادی یا اجتماعی تعمیری کاموں میں صرف ہو۔ اسلام تضیع اوقات کی مذمت کرتا ہے اور فضول و بے فائدہ کاموں سے منع کرتا ہے' مثلاً تاش بازی' شطرنج' کبوتر بازی' جوا بازی' شراب خوری' رقص و سرود وغیرہ۔

(9) آفاقیت : اسلامی معاشرہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جغرافیائی حدود کا پابند نہیں۔ وہ اپنے اندر ایک عالمگیر وسعت رکھتا ہے۔ رنگ و نسل کے امتیاز اور ملکوں کی تقسیم اسلامی معاشرہ میں خلیج بن کر حائل نہیں ہو سکتی۔

(10) نیکی کی اشاعت اور برائی کا انسداد : اسلامی معاشرہ میں ہر مسلمان پر یہ فرض عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ جہاں برائی دیکھے حتی الوسع اسے ختم کرنے کی کوشش کرے اور لوگوں کو نیکی کی تلقین کرے۔ یہ اصلاح معاشرہ کا بنیادی اصول ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

> "جو تم میں سے کسی برائی کو دیکھے اسے چاہیے کہ ہاتھ سے روک دے۔ اگر اس کی طاقت نہ ہو تو زبان سے منع کرے' اگر اس کی بھی ہمت نہ ہو تو دل سے برا جانے' یہ کمزور ترین علامت ہے۔"

(11) دولت کے منصفانہ تقسیم : اسلامی معاشرہ دولت کی منصفانہ تقسیم کا علمبردار ہے۔ قرآن مجید نے حق معیشت کو سب کے لئے مساویانہ طور پر تسلیم کیا ہے۔ اسلام نے زکوۃ اور میراث کے ذریعہ اس منصفانہ تقسیم کا اہتمام کیا ہے۔

(12) حقوق کی پاسداری : اسلامی معاشرہ کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں ہر شخص کے حقوق و فرائض واضح اور متعین ہیں۔ اسلام ان حقوق کی پاسداری کے لئے ترغیب دیتا ہے کہ ان اخلاقی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔ انسان معاشرتی دباؤ کے ذریعہ بھی برائی سے رک جاتا ہے اور اپنے حقوق پورے کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ اگر کوئی خلاف ورزی کرے تو قانون حرکت میں آ جاتا ہے اور اسے اس کے جرم کی سزا دیتا ہے۔

(13) روحانیت اور مادیت کا امتزاج : اسلامی معاشرہ کے افراد نہ تو مادہ پرست ہوں گے اور نہ ہی توہم پرست۔ وہ مادیت اور روحانیت کے درمیان اعتدال قائم کریں گے۔ ان کی شخصیت میں روحانیت اور مادیت کا امتزاج ہو گا۔ اسلام دین اور دنیا دونوں کی فلاح کا علمبردار ہے۔

اسلامی معاشرہ کو مستحکم اور غیر مستحکم کرنے والے عوامل

سوال: اسلامی معاشرے کو مستحکم اور غیر مستحکم کرنے والے عوامل کون سے ہیں تبصرہ کریں۔

اسلامی معاشرہ کو مستحکم کرنے والے عوامل:

بہت سے عوامل ایسے ہیں جو اسلامی معاشرہ کو تقویت دیتے اور اسے مستحکم کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ان عوامل میں سے بعض اہم عوامل مندرجہ ذیل ہیں:

1- عقیدۂ توحید و رسالت:

توحید اللہ تعالیٰ کو وحدہٗ لاشریک ماننا ہے یعنی اپنی ذات اور صفات میں وہ اکیلا اور بے نیاز ہے اور وہی کائنات کا مالک و خالق اور سب کا رازق ہے۔عقیدۂ توحید کی پختگی ہی حقیقی ایمان و ایقان ہے جو پروردگار عالم کو ایک بندۂ مومن سے مطلوب ہے۔اللہ کی وحدانیت پر غیر متزلزل ایقان کے بعد ایک بندۂ مومن کو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خدائے واحد کا آخری پیغمبر ماننا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر پختہ یقین رکھتے ہوئے آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کو قابل تقلید تسلیم کرتے ہوئے سنت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو راہ ہدایت ماننا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر بھر اطاعت کرنا ہے۔قرآن مجید میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دیا گیا ہے۔فرمایا: جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کی گویا اس نے اللہ کی اطاعت کی۔" (النساء:80)

"اگر تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو گے تو ہدایت پا جاؤ گے۔" (النور:54)

ایک جگہ فرمایا:

"اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔"
(آل عمران:132)

ایک ایسا معاشرہ جس میں اللہ کی وحدانیت پر پختہ ایمان ہو اور جہاں بسنے والے تمام افراد رسول خدا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہوں وہاں ظلم و استحصال' بے انصافی' بداخلاقی اور بے راہ روی نہیں ہو سکتی اور وہ لوگ باہم محبت کرنے والے ہوں گے اور کفار کے لیے سخت طاقتور ہوں گے۔جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا:

"محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھی کافروں کے مقابلے میں شدید طاقت ور ہیں جبکہ آپس میں رحم دل ہیں۔" (الفتح:29)

علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کے بقول:

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزم حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

پھر اس حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے کہ اللہ کو ایک ماننے والے اور ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے اور قرآن وسنت کے پیروکار جس معاشرہ میں رہتے ہوں وہ معاشرہ استحکام وقوت سے محروم ہو؟ بلاشبہ عقیدۂ توحید ورسالت اسلامی معاشرہ کو مستحکم بنانے میں معاون ثابت ہوتا ہے۔

2-اصلاحی وتبلیغی عمل:

اسلامی معاشرہ کا استحکام اس عمل خیر پر بھی منحصر ہے جس میں اصلاح معاشرہ کے لیے جدوجہد کی جاتی ہے۔ یہ اصلاحی وتبلیغی عمل ہے جسے امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم میں ہمیشہ کے لیے جاری کر دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اور تم میں سے ایک ایسا گروہ ہونا ضروری ہے جو نیکی کی طرف بلائیں اور برائی سے روکیں اور یہ لوگ پورے کامیاب ہیں۔" (آل عمران:104)۔

اسی طرح ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ:

"تم سب امتوں سے بہتر امت ہو جو نکالی گئی ہو لوگوں کے لیے' بھلائی کا حکم کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔" (آل عمران:110)

ایک ایسا معاشرہ جس میں نیکی وخیر کی جدوجہد کی جاتی ہو اور منکرات اور مفاسد سے روکا جاتا ہو' اس معاشرہ میں اللہ کی طرف سے فیوض وبرکات نازل ہوتی ہیں اور ایسا معاشرہ کامیاب اور مستحکم ہوتا ہے۔ اس کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں اور اس کے افراد میں کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع وتقلید کا جذبہ موجود ہوتا ہے۔ اس سبب سے یہ معاشرہ ناقابل تسخیر بن جاتا ہے کیونکہ اس معاشرے کے افراد اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مضبوط تعلق میں بندھے ہوتے ہیں اور ایسے معاشرہ میں جس کے اوپر اللہ کی رحمت و فضل کا سایہ ہو' کس طرح غیر مستحکم اور ناپائیدار ہو سکتا ہے؟

3-اصلاح بین الناس:

اسلامی معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لوگوں میں باہمی معاملات میں اختلافات یا تنازعات کو ختم کرنے کے لیے اصلاح یعنی صلح کی کوشش کی جاتی ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ "ایمان والے آپس میں بھائی بھائی ہیں' سو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو' اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ (الحجرات:10)

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے مابین برادرانہ تعلق قائم رکھنے کا حکم دیا ہے اور انہیں جھگڑے کی صورت میں صلح وامن کا راستہ اختیار کرنے اور عفو ودرگزر سے کام لینے کی ہدایت دی ہے۔ فرمایا "سو جو شخص معاف کر دے اور صلح کر لے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔" (الشوریٰ:40)

معاشرہ میں صلح ومفاہمت سے اور پرامن ماحول میں رہنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمانوں کے تعلقات درست ہوں۔ اس لیے قرآن مجید میں فرمایا گیا:

"سو تم اللہ سے ڈرو اور آپس میں تعلقات کو درست کرو۔" (الانفال:1)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو ہدایت دی ہے کہ اگر وہ باہمی طور پر جھگڑ پڑیں گے تو کمزور پڑ جائیں گے اور ان کی ہوا اکھڑ جائے گی۔(الانفال:46)

اس لیے اسلامی معاشرہ کے افراد میں باہمی محبت اور قربت موجود ہونا اس کے استحکام کے لیے بہت ضروری ہے ورنہ اللہ کا ارشاد ہے کہ مسلمان کمزور پڑ جائیں گے۔ اس وجہ سے امت مسلمہ میں اصلاح بین الناس بہت زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔ جس میں مسلمان بھائی دوسرے مسلمان بھائیوں میں صلح و مفاہمت پیدا کرنے اور ان کے درمیان برادرانہ تعلقات قائم اور برقرار رکھنے کے لیے سرگرم عمل رہتے ہیں اور جس کے نتیجے میں معاشرہ مستحکم بنیادوں پر قائم رہتا ہے۔

4۔ دین اسلام کی نصرت:

اسلامی معاشرہ میں دینی ماحول اور خیر و فلاح کی فضا قائم رہے تو اللہ کی طرف سے خاص مہربانی اور فضل و عنایت کا نزول ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ ایسے صالحین کو مغلوب نہیں ہونے دیتا۔ ارشاد ربانی ہے:

''اگر تم مومن ہو تو تم ہی غالب آؤ گے۔'' (آل عمران:139)

صالح معاشرہ یقیناً مستحکم اور غالب رہتا ہے کیونکہ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ وہ اہل ایمان کی مدد کرتا ہے کیونکہ وہ اللہ کے دین کی مدد و نصرت کے لیے ہر لحظہ محو عمل ہوتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

''اے ایمان والو! اگر تم اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا اور تمہیں ثابت قدمی عنایت فرمائے گا۔'' (سورۃ محمد:7)

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے:

''یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد کرے بے شک اللہ تعالیٰ بڑی قوت والا اور غیر فانی عزت و تکریم والا ہے۔'' (الحج:40)

یہ مدد اور فتح اور نعمت و جنت ان لوگوں کے حصے میں ہے جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت و اتباع میں لگے رہیں اور خدا اور دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں جان و مال سے مصروف رہیں اور کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہ کریں۔ ایک اور جگہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں کا ذکر فرماتے ہوئے اہل ایمان سے فرمایا گیا:

''اے اہل ایمان' تم اللہ تعالیٰ کے مددگار بن جاؤ جیسا کہ کہا تھا عیسیٰ ابن مریم نے حواریوں سے کہ میرا اللہ تعالیٰ کی طرف کون مددگار ہوگا۔ حواریوں نے کہا ہم اللہ تعالیٰ کی مدد کریں گے۔ پس ایمان لایا ایک گروہ بنی اسرائیل میں سے اور ایک گروہ نے انکار کر دیا۔ پس ہم نے مدد کی ان لوگوں کی جو ایمان لائے تھے ان دشمنوں کے مقابلے میں' پس صبح تک وہ (اہل ایمان) غالب آ گئے تھے۔'' (الصف:14)

اللہ کے دین کی نصرت کرنا اللہ کا مددگار ہونا ہے۔ چنانچہ جس معاشرہ میں نصرت دین کا عمل خیر جاری

رہے گا اسے اللہ کی مدد اور طاقت حاصل رہے گی اور ایسا معاشرہ غلبہ و استحکام سے متصف رہے گا۔

5۔اخوت:

اسلامی معاشرہ تمام افراد کو ایک لڑی میں پروتا ہے اور ایک کنبہ کی سی شکل اختیار کر لیتا ہے' جس کا ہر فرد دوسرے کے لیے وہی احساسات رکھتا ہے جو اپنے حقیقی بھائی کے لیے ہوتے ہیں۔قرآن حکیم میں ہے:

"بے شک مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں۔"(الحجرات:10)

اس آیت کی تشریح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں فرمائی کہ "مسلمان' مسلمان کا بھائی ہے۔ نہ خود اس پر ظلم کرتا ہے اور نہ اسے ظلم کے حوالے کرتا ہے۔"

ایک اور حدیث میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسلامی معاشرے کی مثال ایک جسم سے دی ہے۔آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:"تو مومنوں کو دیکھے گا کہ وہ آپس میں رحم کرنے' آپس میں محبت کرنے اور آپس میں مہربانی کرنے میں ایک جسم کی طرح ہوتے ہیں کہ جب اس میں سے کسی عضو کو بھی شکایت ہو جائے تو سارا جسم اس کی خاطر شب بیداری اور بخار کو دعوت دے لیتا ہے۔"(مسلم)۔

مسلمان چونکہ آپس میں رشتۂ اخوت میں بندھے ہوئے ہیں اس لیے بھائیوں میں اتحاد اور اجتماعیت کی فضا ہونی چاہیے۔یہ اتحاد کس درجہ کا ہونا چاہیے' اس کی وضاحت مندرجہ ذیل آیت سے ہوتی ہے۔

"یقیناً اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو محبوب رکھتا ہے جو اس کی راہ میں جنگ کرتے ہیں' اس طرح گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔"(الصف:4)

یعنی انتہائی نازک اور پر خطر حالات میں بھی اہل ایمان کی صفوں میں کوئی انتشار نہیں ہوتا' وہ اللہ تعالیٰ کی رضا اور دین کے اعلاء کے لیے سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح متحد و مستحکم ہوتے ہیں۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

"مومن' مومن کے لیے دیوار کی طرح ہوتا ہے جس کا ایک حصہ دوسرے حصے کو تقویت پہنچاتا ہے۔"

پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈال کر فرمایا کہ ایسے۔(بخاری' مسلم)

اسلامی معاشرہ کی اہم ترین اور بنیادی خصوصیت اخوت ہے۔اخوت کا یہ رشتہ مومنین کو باہم مضبوط تعلق میں باندھے رکھتا ہے۔اور یہ جذبۂ اخوت ہی ہے جس کی بدولت ایک اسلامی معاشرہ استحکام کی صفت سے آراستہ ہوتا ہے اور اتحاد و اتفاق' یگانگت اور یکجہتی کا شاندار منظر پیش کرتا ہے۔

6عدل اجتماعی:

عدل اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔عادل اللہ تعالیٰ کے 99 اسمائے مبارک میں سے ایک ہے۔قرآن حکیم میں ہے:

"اللہ تعالیٰ حق کے ساتھ فیصلہ کرنے والے ہیں۔"(المومن:20)۔

ایک اور مقام پر فرمایا:

"اللہ تعالیٰ حق فرماتا ہے۔" (الاحزاب:4)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ "اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ' جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم فیصلہ دیں تو ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ صادر کریں۔" (المائدہ:43)

ایک اور مقام پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک سے یہ الفاظ انصاف کے بارے میں ہیں کہ:

"مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان انصاف کروں۔" (الشوریٰ:15)

قرآن حکیم میں ہے:

"اللہ کے لیے قائم ہونے والے انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم سے تمہاری دشمنی تمہیں اس بات پر نہ ابھارے کہ تم انصاف نہ کرو' انصاف کرو کہ یہ بات تقویٰ سے زیادہ قریب ہے۔" (المائدہ:8)

اس آیت قرآنی میں حکم دیا گیا ہے کہ دشمنوں سے بھی عدل کیا جائے۔ قرآن مجید میں یہ تعلیم بھی دی گئی ہے کہ جب ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ انسان کی اپنی ہی ذات یا اس کا بہت ہی عزیز رشتہ دار فریقین میں سے ایک ہو تو بھی انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہیے۔ ارشاد ربانی ہے:

"اور تم جب بھی بات کرو تو عدل سے کرو خواہ وہ بات (گواہی) تمہارے رشتہ داروں کے بارے میں ہی کیوں نہ ہو۔" (الانعام:152)

"اے ایمان والو! انصاف کرنے والے اللہ کے گواہ بن جاؤ' خواہ وہ گواہی تمہاری اپنی ذات' والدین اور قریبی رشتہ داروں کے خلاف ہی کیوں نہ جاتی ہو۔" (النساء:135)

"اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلے کرو تو عدل سے کیا کرو۔" (النساء:58)

"بے شک اللہ تعالیٰ تم کو عدل و احسان کا حکم دیتا ہے۔" (النحل:90)

یتیموں سے متعلق فرمایا:

"اور تم ان یتیموں کے لیے انصاف پر قائم ہو جاؤ۔" (النساء:127)

انصاف کرنے والے کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتے ہیں۔ ارشاد ربانی ہے:

"بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔" (الحجرات:9)

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد پاک ہے کہ "جب قیامت کے دن اللہ کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہ ہوگا تو سات قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے سائے میں جگہ دیں گے۔ ان میں سے ایک منصف (عادل) حکمران ہوگا۔" (مشکوٰۃ)

الغرض عدل و انصاف (عدل اجتماعی) اسلامی معاشرہ کے لیے ناگزیر ہے۔ جس معاشرہ میں عدل و انصاف کی بالادستی ہوگی اور کسی بھی سطح پر ناانصافی نہ ہوگی' اس معاشرہ کی بنیادیں مستحکم ہوں گی اور ایسے معاشرہ کا نظام مضبوط اور پائیدار ہوگا۔ ناانصافی اور ظلم کے نتیجے میں معاشرہ کی بنیادیں ہل جاتی ہیں اور اجتماعیت اور استحکام

جاتا رہتا ہے۔

7-باہمی تعلقات کی درستگی:

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو آداب معاشرت سکھائے ہیں اور انہیں تاکید کی ہے کہ وہ باہمی تعلقات درست رکھیں۔ فرمایا:

"اپنے بھائیوں کے درمیان تعلقات کو درست رکھو اور اللہ سے ڈرو" (الحجرات:10)

اس آیت میں مسلمانوں کو برادرانہ طور پر رہنے اور آپس کے معاملات میں بگاڑ پیدا کرنے سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان' مال اور عزت حرام ہے۔" (مسلم' ترمذی)۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے جنگ کرنا کفر" (بخاری' کتاب الایمان)۔ ایک اور حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مسلمان' مسلمان کا بھائی ہے' وہ اس پر ظلم نہیں کرتا' اس کا ساتھ نہیں چھوڑتا اور اس کی تذلیل نہیں کرتا۔ ایک آدمی کے لیے یہی شر بہت ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کی تحقیر کرے۔" (مسند احمد)

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ان بڑی بڑی برائیوں کے سدباب کا بھی حکم دیا ہے جو بالعموم ایک معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔

ارشاد ربانی ہے:

"اے لوگو! جو ایمان لائے ہو نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں' اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ آپس میں ایک دوسرے پر طعن نہ کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب سے یاد کرو۔ ایمان لانے کے بعد فسق میں نام پیدا کرنا بہت بری بات ہے۔ جو لوگ اس روش سے باز نہ آئیں وہی ظالم ہیں۔ اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' بہت گمان کرنے سے پرہیز کرو کہ بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔ تجسس نہ کرو اور تم میں سے کوئی کسی کی غیبت نہ کرے' کیا تمہارے اندر کوئی ایسا ہے جو اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھانا پسند کرے گا؟ دیکھو' تم خود اس سے گھن کھاتے ہو' اللہ سے ڈرو' اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحیم ہے۔"

(الحجرات:12,11)

سید مودودیؒ کے بقول:

"پچھلی دو آیتوں میں مسلمانوں کی باہمی لڑائی کے متعلق ضروری ہدایات دینے کے بعد اہل ایمان کو یہ احساس دلایا گیا تھا کہ دین کے مقدس ترین رشتے کی بنا پر وہ ایک دوسرے کے بھائی ہیں اور ان کو خدا سے ڈرتے ہوئے اپنے آپس کے تعلقات کو درست رکھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اب

آگے کی دو آیتوں میں ان بڑی بڑی برائیوں کے سد باب کا حکم دیا جا رہا ہے جو بالعموم ایک معاشرے میں لوگوں کے باہمی تعلقات کو خراب کرتی ہیں۔ ایک دوسرے کی عزت پر حملہ' ایک دوسرے کی دل آزاری' ایک دوسرے سے بدگمانی' اور ایک دوسرے کے عیوب کا تجسس' درحقیقت یہی وہ اسباب ہیں جن سے آپس کی عداوتیں پیدا ہوتی ہیں اور پھر دوسرے اسباب کے ساتھ مل کر ان سے بڑے بڑے فتنے رونما ہوتے ہیں۔" (تفہیم القرآن' جلد پنجم' صفحہ 84)

پس اسلامی معاشرے کا استحکام اس امر پر منحصر ہے کہ افراد ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات رکھیں اور ان برائیوں کو معاشرہ میں پیدا نہ ہونے دیں جو اہل ایمان کے باہمی تعلقات میں بگاڑ پیدا کریں اور غیر مستحکم حالات پیدا ہوں اور نت نئے فتنے اور تنازعات جنم لینے لگیں۔

8- اخلاقیات کی پاسداری:

اسلامی معاشرہ میں اخلاقیات کی حتی الوسع پاسداری کی جاتی ہے۔ ناپ تول میں کمی' ذخیرہ اندوزی' ملاوٹ' دھوکہ دہی' ناجائز منافع خوری اور ظلم و استحصال کے بجائے اسلامی اخلاقی اصولوں کے تحت ایمان داری' دیانت داری اور عدل و انصاف کے تقاضوں کے تحت تمام شعبہ ہائے زندگی کو چلایا جاتا ہے۔ فحاشی' عریانیت' شراب نوشی' قمار بازی اور زنا کاری جیسے قبیح جرائم اور گناہوں سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ اس طرح اسلامی معاشرہ دراصل اخلاقیات کی عملی تصویر ہوتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ میں بداخلاقی' بددیانتی' چور بازاری اور جنسی جرائم معدوم ہو جاتے ہیں اور معاشرہ مستحکم اور پائیدار اساسات پر قائم ہوتا ہے۔

9- بنیادی حقوق اور آزادیاں:

اسلام میں مسلم و غیر مسلم تمام افراد کو انسانی بنیادی حقوق اور آزادیوں کی ضمانت دی گئی ہے۔ نیز سب کو معاشی تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جس میں موجود تمام افراد کو یکساں حقوق اور آزادیاں حاصل ہوں اور انہیں معاش کی سہولیات بھی فراہم کی جاتی ہوں' وہ کبھی غیر مستحکم اور زوال پذیر نہیں ہو سکتا کیونکہ اس معاشرہ کے افراد اپنے احکام سے مطمئن ہوتے ہیں اور ان کی اطاعت کرتے اور قانون کا احترام کرتے ہیں۔ جس سے معاشرہ میں بغاوت' لاقانونیت' انتشار اور بدنظمی پیدا نہیں ہوتی اور افراد معاشرہ پرسکون زندگی گزارتے ہیں۔

10- حکمرانوں کا بے جا اسراف اور تعیش پرستی:

اسلام میں حکمران سادہ طرز زندگی اختیار کرتے ہیں اور بے جا اسراف اور تعیش پرستی کا شکار نہیں ہوتے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں قومی دولت کی لوٹ کھسوٹ اور حکومتی شاہ خرچیاں معدوم ہوتی ہیں اور لوگوں (رعایا) کے حقوق اور سہولیات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ نتیجتاً معاشرہ مضبوط اور مستحکم ہوتا ہے اور اس کی سالمیت کو کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عہد مبارک اور خلفائے راشدین رضوان اللہ

علیہم اجمعین کا عہد اس ضمن میں فقید المثال روشن باب ہے۔

اسلامی معاشرہ کو غیر مستحکم کرنے والے عوامل

اسلامی معاشرہ کو غیر مستحکم کرنے والے عوامل مندرجہ ذیل ہیں:

1- تشدد پسندی:

اسلام سلامتی کا مذہب ہے' یہ امن کا داعی دین ہے۔ اس میں غصہ واشتعال' جھگڑے' قتل وغارت اور تشدد پسندی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ تشدد کی راہ اختیار کرنے کے بجائے صلح ومفاہمت اور حلیمی کا راستہ اپنایا جائے اور تنازعہ کو بڑھانے سے اجتناب کیا جائے۔

قرآن حکیم میں ہے:

"اور نیکی اور بدی یکساں نہیں ہیں۔ تم بدی کو اس نیکی سے دفع کرو جو بہترین ہو' تم دیکھو گے کہ تمہارے ساتھ جس کی عداوت پڑی ہوئی تھی وہ جگری دوست بن گیا۔" (حم السجدہ: 34)

اس آیت مبارکہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ:

بدی کا مقابلہ محض نیکی سے نہیں بلکہ اس نیکی سے کرو جو بہت اعلیٰ درجے کی ہو۔ یعنی کوئی شخص تمہارے ساتھ برائی کرے اور تم اس کو معاف کر دو تو یہ محض نیکی ہے۔ اعلیٰ درجے کی نیکی یہ ہے کہ جو تم سے برا سلوک کرے تم موقع آنے پر اس کے ساتھ احسان کرو۔"

(تفہیم القرآن' سید مودودیؒ' جلد چہارم' صفحہ 457)

تشدد پسندی دراصل غصہ اور اشتعال سے جنم لیتی ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے غصے کو ناپسند فرماتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو بہتر اور پائیدار اجر کی نوید دی ہے جو "اگر غصہ آ جائے تو درگزر کر جاتے ہیں۔" (الشوریٰ: 37)

یعنی وہ غصیلے نہیں ہوتے بلکہ نرم خو اور دھیمے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی سرشت انتقامی نہیں بلکہ وہ بندگان خدا سے درگزر اور چشم پوشی کا معاملہ کرتے ہیں' اور کسی بات پر غصہ آ بھی جاتا ہے تو وہ تشدد پر نہیں اترتے بلکہ اپنا غصہ پی جاتے ہیں۔ یہ وصف انسان کی بہترین صفات میں سے ہے جسے قرآن مجید میں نہایت قابل تعریف قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"جو غصے کو پی جاتے ہیں اور دوسروں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ ایسے نیک لوگ اللہ کو پسند ہیں۔" (آل عمران: 134)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کامیابی کے بڑے اسباب میں ایک یہ بھی سبب تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ غصہ سے اجتناب کیا اور ہمیشہ نرم خو رہے۔ قرآن حکیم میں ارشاد فرمایا گیا:

"(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے بہت نرم مزاج

واقع ہوئے ہو۔ ورنہ اگر کہیں تم تند خو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش سے چھٹ جاتے۔ ان کے قصور معاف کر دو ان کے حق میں دعائے مغفرت کرو۔"

(آل عمران: 159)

اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو تشدد کا راستہ اختیار کرنے سے روکا ہے اور اس مقصد کے لیے ہدایت فرمائی ہے کہ وہ صلح کا راستہ اپنائیں اور اگر بدلہ لینا چاہیں تو اس کی بھی حدود اللہ نے مقرر فرما دیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے' پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے' اللہ ظالموں کو پسند نہیں کرتا' اور جو لوگ ظلم ہونے کے بعد بدلہ لیں ان کو ملامت نہیں کی جا سکتی' ملامت کے مستحق تو وہ ہیں جو دوسروں پر ظلم کرتے ہیں اور زمین میں ناحق زیادتیاں کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے لیے دردناک عذاب ہے' البتہ جو شخص صبر سے کام لے اور درگزر کرے' تو یہ بڑی اولوالعزمی کے کاموں میں سے ہے۔" (الشوریٰ 40-43)

ان آیات میں بدلہ لینے کے تین قاعدے بیان کیے گئے ہیں:

1- پہلا قاعدہ یہ ہے کہ بدلے کی جائز حد یہ ہے کہ جتنی برائی کسی کے ساتھ کی گئی ہو' اتنی ہی برائی وہ اس کے ساتھ کر لے' اس سے زیادہ برائی کرنے کا وہ حق نہیں رکھتا۔

2- دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ زیادتی کرنے والے سے بدلہ لے لینا اگرچہ جائز ہے' لیکن جہاں معاف کر دینا اصلاح کا موجب ہو سکتا ہو وہاں اصلاح کی خاطر بدلہ لینے کے بجائے معاف کر دینا زیادہ بہتر ہے۔ اور چونکہ یہ معافی انسان اپنے نفس پر جبر کر کے دیتا ہے' اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کا اجر ہمارے ذمہ ہے' کیونکہ تم نے بگڑے ہوئے لوگوں کی اصلاح کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پیا ہے۔

3- تیسرا قاعدہ یہ ہے کہ کسی شخص کو دوسرے کے ظلم کا انتقام لیتے لیتے خود ظالم نہیں بن جانا چاہیے۔ ایک برائی کے بدلے میں اس سے بڑھ کر برائی کر گزرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص کسی کو ایک تھپڑ مارے تو وہ اسے ایک ہی تھپڑ مار سکتا ہے۔ لات اور گھونسوں کی اس پر بارش نہیں کر سکتا۔ اسی طرح گناہ کا بدلہ گناہ کی صورت میں لینا درست نہیں ہے۔ مثلاً کسی شخص کے بیٹے کو اگر کسی ظالم نے قتل کیا ہے تو اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ جا کر اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔ یا کسی شخص کی بہن یا بیٹی کو اگر کسی کمینہ انسان نے خراب کیا ہے تو اس کے لیے یہ حلال نہیں ہو جائے گا کہ وہ اس کی بیٹی یا بہن سے زنا کرے۔"

(تفہیم القرآن' جلد چہارم' صفحہ 512,511)

اسلام صلح و مفاہمت کا داعی ہے اور اس کی تعلیم یہ ہے کہ تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں اور اگر ان کے درمیان کسی وجہ سے جھگڑا ہو جائے تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے دونوں فریقین تنازعہ میں صلح کرا دیں۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اور اگر اہل ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ پھر ان میں سے ایک گروہ دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف پلٹ آئے۔ پھر اگر وہ پلٹ آئے تو ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف کرو۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی ہیں پس اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

(الحجرات: 9-10)

سورۃ الحجرات کی ان آیات کے مطابق اسلام ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس کے دباؤ اور زور سے ہر شخص سیدھی راہ پر گامزن رہے اور معاشرہ میں کوئی متشددانہ کارروائیاں اور دنگا فساد نہ کرے۔ چنانچہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر تم میں سے دو گروہ لڑ پڑیں تو معاشرہ کے بااثر افراد کو آگے بڑھ کر دونوں گروہوں کو سمجھا بجھا کر اس لڑائی کو ختم کرا دینا چاہیے۔ اگر سمجھانے بجھانے پر بھی معاملہ رفع دفع نہیں ہوتا تو معاشرہ کو کمزور مظلوم گروہ کی حمایت میں ظالم اور جابر گروہ سے لڑنا چاہیے۔ اور جب وہ باغی اور ظالم گروہ حق کی طرف پلٹ آئے یعنی اپنی تشدد پسندی کی روش چھوڑ دے اور زیادتی ختم کر دے تو اس کے خلاف قوت کا استعمال بند کر دیا جائے اور دونوں کے درمیان اس انداز سے صلح کرا دینی چاہیے کہ کوئی گروہ بھی اس میں اپنی ہزیمت اور بے عزتی محسوس نہ کرے۔

اسلام نے معاشرہ کو طاقت ور بنانے کے لیے امن اور صلح کا راستہ دکھایا ہے۔ کیونکہ تنازعات، اشتعال انگیزی اور تشدد پسندی اسلامی معاشرہ کو کمزور کر دینے والے عوامل ہیں۔ ان سے اسلامی معاشرہ فتنہ و فساد کی آماجگاہ بن جاتا ہے۔ لہٰذا تشدد پسندی کی قرآن حکیم میں شدید مذمت کی گئی ہے اور اس سے بچنے کی ہدایت کی گئی ہے کیونکہ اس سے مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد باقی نہیں رہتا اور باہمی کدورتیں اور نفرتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اسلام میں تشدد کے بجائے صلہ رحمی کا حکم دیا گیا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو "رحمت للعالمین" کہا گیا ہے کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ شدت پسندی سے پاک تھی اور نرم خوئی اور رحمتوں سے معمور تھی۔ فتح مکہ کے موقع پر طاقت و اختیار کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دشمنان اسلام کے لیے "عفو عام" (Amnesty) کا اعلان فرمایا۔ لہٰذا اسلام میں تشدد پسندی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

2۔ تعصبات:

تعصبات، تعصب کی جمع ہے۔ تعصب عربی زبان سے نکلا ہے اس کے معنی حمایت، طرفداری، ضد، ہٹ، بے جا حمایت اور جانبداری کے ہیں۔ اصطلاحاً اس سے مراد مذہب، نسل یا وطن ایک ہونے کی وجہ سے طرفداری ہے۔

اسلام تعصبات کا حامی نہیں ہے۔ ایک بندہ مومن اپنی زندگی میں قول و عمل کے ذریعے سے تعصبات کا اظہار نہیں کرتا اور غیر متعصبانہ طرز عمل اپناتا ہے۔ یہی دین متین کی تعلیم ہے۔ قرآن حکیم میں اس حوالہ سے

سے صریح نقطہ نظر موثر کیا گیا، ارشاد ربانی ہے:

"لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے۔" (الحجرات: 13)

اس آیت مبارکہ میں پوری نوع انسانی کو خطاب کر کے اس عظیم گمراہی کی اصلاح کی گئی ہے۔ جو دنیا میں ہمیشہ عالمگیر فساد کی موجب بنی رہی ہے یعنی نسل' رنگ' زبان' وطن اور قومیت کا تعصب۔ قدیم ترین زمانے سے آج تک ہر دور میں انسان بالعموم انسانیت کو نظر انداز کر کے اپنے گرد کچھ چھوٹے چھوٹے دائرے کھینچتا رہا ہے جن کے اندر پیدا ہونے والوں کو اس نے اپنا اور باہر پیدا ہونے والوں کو غیر قرار دیا ہے۔ یہ دائرے کسی عقلی اور اخلاقی بنیاد پر نہیں بلکہ اتفاقی پیدائش کی بنیاد پر کھینچے گئے ہیں۔ کہیں ان کی بنا ایک خاندان' قبیلے یا نسل میں پیدا ہونا ہے اور کہیں ایک جغرافیائی خطے میں یا ایک خاص رنگ والی یا ایک خاص زبان بولنے والی قوم میں پیدا ہو جانا۔ پھر ان بنیادوں پر اپنے اور غیر کی جو تمیز قائم کی گئی ہے وہ صرف اس حد تک محدود نہیں رہی ہے کہ جنہیں اس لحاظ سے اپنا قرار دیا گیا ہو کہ ان کے ساتھ غیروں کی بہ نسبت زیادہ محبت اور زیادہ تعاون ہو' بلکہ اس تمیز نے نفرت' عداوت' تحقیر و تذلیل اور ظلم و ستم کی بدترین شکلیں اختیار کی ہیں۔ اس کے لیے فلسفے گھڑے گئے ہیں' مذہب ایجاد کیے گئے ہیں' قوانین بنائے گئے ہیں' اخلاقی اصول وضع کیے گئے ہیں۔ قوموں اور سلطنتوں نے اس کو اپنا مستقل مسلک بنا کر صدیوں اس پر عمل درآمد کیا ہے۔ یہودیوں نے اسی بنا پر بنی اسرائیل کو خدا کی چیدہ مخلوق ٹھہرایا اور اپنے مذہبی احکام تک غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا۔ جس کی رو سے برہموں کی برتری قائم کی گئی' اونچی ذات والوں کے مقابلے میں تمام انسان نیچ اور ناپاک ٹھہرائے گئے' اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ آج اس بیسویں صدی ہی میں ہر شخص اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھ سکتا ہے۔ یورپ کے لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ جو سلوک کیا اور ایشیاء اور افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کر کے جو برتاؤ ان کے ساتھ کیا اس کی تہہ میں بھی یہی تصور کارفرما رہا کہ اپنے وطن اور اپنی قوم کے حدود سے باہر پیدا ہونے والوں کی جان' مال اور آبرو ان پر مباح ہے اور انہیں حق پہنچتا ہے کہ ان کو لوٹیں' غلام بنائیں' اور ضرورت پڑے تو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ مغربی اقوام کی قوم پرستی نے ایک قوم کو دوسری قوموں کے لیے جس طرح درندہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ اس کی بدترین مثالیں زمانہ قریب کی لڑائیوں میں دیکھی جا چکی ہیں اور آج دیکھی جا رہی ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ نازی جرمنی کا فلسفہ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصور پچھلی جنگ عظیم میں جو کرشمے دکھا چکا ہے انہیں نگاہ میں رکھا جائے تو آدمی بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ وہ کتنی عظیم اور تباہ کن گمراہی ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اسی مختصر سی آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو مخاطب کر کے تین نہایت اہم اصولی حقیقتیں بیان فرمائی ہیں:

ایک یہ کہ تم سب کی اصل ایک ہے' ایک مرد اور ایک عورت سے تمہاری پوری نوع وجود میں آئی ہے۔ اور آج تمہاری جتنی نسلیں بھی دنیا میں پائی جاتی ہیں وہ در حقیقت ایک ابتدائی نسل کی شاخیں ہیں جو ایک ماں اور ایک باپ سے شروع ہوئی تھی۔ اس سلسلۂ تخلیق میں کسی جگہ بھی اس تفرقے اور اونچ نیچ کے لیے کوئی بنیاد موجود نہیں ہے' جس کے زعم باطل میں تم مبتلا ہو۔ ایک ہی خدا تمہارا خالق ہے' ایسا نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کو مختلف خداؤں نے پیدا کیا ہو۔ ایک ہی مادۂ تخلیق سے تم بنے ہو' ایسا بھی نہیں ہے کہ کچھ انسان کسی پاک یا بڑھیا مادے سے بنے ہوں اور کچھ دوسرے انسان کسی ناپاک یا گھٹیا مادے سے بن گئے ہوں۔ ایک ہی طریقے سے تم پیدا ہوئے ہو' یہ بھی نہیں ہے کہ مختلف انسانوں کے طریق پیدائش الگ الگ ہوں اور ایک ہی ماں باپ کی تم اولاد ہو' یہ بھی نہیں ہوا ہے کہ ابتدائی انسانی جوڑے بہت سے رہے ہوں جن سے دنیا کے مختلف خطوں کی آبادیاں الگ الگ پیدا ہوئی ہوں۔

دوسرے یہ کہ اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہونے کے باوجود تمہارا قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو جانا ایک فطری امر تھا۔ ظاہر ہے کہ پوری روئے زمین پر سارے انسانوں کا ایک ہی خاندان تو نہیں ہو سکتا تھا۔ نسل بڑھنے کے ساتھ ناگزیر تھا کہ بے شمار خاندان بنیں اور پھر خاندانوں سے قبائل اور اقوام وجود میں آئیں۔ اسی طرح زمین کے مختلف خطوں میں آباد ہونے کے بعد رنگ' خدوخال' زبانیں اور طرز بود و ماند بھی لامحالہ مختلف ہی ہو جاتے تھے' اور ایک خطے کے رہنے والوں کو باہم قریب تر اور دور دراز خطوں کے رہنے والوں کو بعید تر ہی ہونا تھا۔ مگر اس فطری فرق و اختلاف کا تقاضا یہ ہرگز نہ تھا کہ اس کی بنیاد پر اونچ اور نیچ' شریف اور کمین' برتر اور کمتر کے امتیازات قائم کیے جائیں' ایک نسل دوسری نسل پر اپنی فضیلت جتائے' ایک رنگ کے لوگ دوسرے رنگ کے لوگوں کو ذلیل و حقیر جانیں' ایک قوم دوسری قوم پر اپنا تفوق جمائے' اور انسانی حقوق میں ایک گروہ کو دوسرے گروہ پر ترجیح حاصل ہو۔ خالق نے جس وجہ سے انسانی گروہوں کو اقوام اور قبائل کی شکل میں مرتب کیا تھا وہ صرف یہ تھی کہ ان کے درمیان باہمی تعارف اور تعاون کی فطری صورت یہی تھی......... مگر یہ محض شیطانی جہالت تھی کہ جس چیز کو اللہ کی بنائی ہوئی فطرت نے تعارف کا ذریعہ بنایا تھا۔ اسے تفاخر اور تنافر کا ذریعہ بنا لیا گیا اور پھر ظلم و عدوان تک نوبت پہنچا دی گئی۔

تیسرے یہ کہ انسان اور انسان کے درمیان فضیلت اور برتری کی بنیاد اگر کوئی ہے اور ہو سکتی ہے تو وہ صرف اخلاقی فضیلت ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں' کیونکہ ان کے پیدا کرنے والا ایک ہے.......... اصل چیز جس کی بنا پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا' برائیوں سے بچنے والا اور نیکی و پاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل' کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو' اپنی ذاتی خوبی کی بناء پر قابل قدر ہے۔ اور جس کا حال اس کے برعکس ہو وہ بہرحال ایک کمتر درجے کا انسان ہے چاہے وہ کالا ہو یا گورا' مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔

(تفہیم القرآن' سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ' جلد پنجم' صفحہ 95, 96, 97)

یہی حقائق جو قرآن حکیم کی مذکورہ مختصر سی آیت میں بیان کیے گئے ہیں' رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم نے ان کو اپنے مختلف خطبات اور ارشادات میں زیادہ کھول کر بیان فرمایا ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر طواف کعبہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا: "شکر ہے اس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبر دور کر دیا۔ لوگو! تم انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیز گار جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی' جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔ (بیہقی فی شعب الایمان۔ ترمذی)

حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تقریر میں فرمایا:

"لوگو' خبردار رہو تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔"
(بیہقی)

حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے:

"تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ اللہ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔" (بزار)

"اللہ قیامت کے روز تمہارا حسب نسب نہیں پوچھے گا۔ اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہے۔" (ابن جریر)

"اللہ تمہاری صورتیں اور تمہارے اموال نہیں دیکھتا بلکہ وہ تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کی طرف دیکھتا ہے۔" (مسلم۔ ابن ماجہ)

یہ تعلیمات صرف الفاظ کی حد تک ہی محدود نہیں رہی ہیں بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہل ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کر کے دکھائی ہے جس میں رنگ' نسل' زبان' وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں' جس میں اونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق و تعصب کا کوئی تصور نہیں' جس میں شریک ہونے والے تمام انسان خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کیساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے اس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی دین اور کسی نظام میں نہیں پائی جاتی نہ کبھی پائی گئی ہے۔ صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے روئے زمین کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی بے شمار نسلوں اور قوموں کو ملا کر ایک امت بنا دیا ہے۔

اسلام میں صرف اعمال صالح کو نجات کی بنیاد بنایا گیا ہے نہ کہ حسب نسب کو۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ صفا پر چڑھ کر قریش سے خطاب فرمایا اور فرمایا کہ اپنی جان کو دوزخ سے بچالو میں قیامت کے دن تمہیں کچھ فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر تم دین اسلام قبول نہ کرو بنی کعب' بنی مرۃ' بنی عبد شمس' بنی عبد مناف بن ہاشم' بنی عبدالمطلب' اے جماعت قریش' بنی قریش' سب سے الگ الگ خطاب فرمایا اور ان سے بھی فرمایا کہ اپنی

جانوں کو دوزخ سے بچاؤ۔ (رواہ البخاری ومسلم کمافی مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 460)

سید مودودیؒ نے تعصب کے ضمن میں اسلام کے قانون کفو کے سلسلے میں پیدا ہونے والی ایک غلط فہمی کو استدلال سے دور کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''شادی بیاہ کے معاملہ میں اسلامی قانون کفو کو جو اہمیت دیتا ہے اس کو بعض لوگ اس معنی میں لیتے ہیں کہ کچھ برادریاں شریف اور کچھ کمین ہیں اور ان کے درمیان مناکحت قابل اعتراض ہے۔ لیکن دراصل یہ ایک غلط خیال ہے۔ اسلامی قانون کی رو سے ہر مسلمان مرد کا ہر مسلمان عورت سے نکاح ہو سکتا ہے' مگر ازدواجی زندگی کی کامیابی کا انحصار اس پر ہے کہ زوجین کے درمیان عادات' خصائل' طرز زندگی' خاندانی روایات اور معاشی ومعاشرتی حالات میں زیادہ سے زیادہ مطابقت ہوتا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھی طرح نباہ کر سکیں۔ یہی کفاءت کا اصل مقصد ہے۔ جہاں مرد اور عورت کے درمیان اس لحاظ سے بہت زیادہ بُعد ہو وہاں عمر بھر کی رفاقت نبھ جانے کی کم ہی توقع ہو سکتی ہے' اس لیے اسلامی قانون ایسے جوڑ لگانے کو ناپسند کرتا ہے' نہ اس بنا پر کہ فریقین میں سے ایک شریف اور دوسرا کمین ہے' بلکہ اس بنا پر کہ حالات میں زیادہ بین فرق و اختلاف ہو تو شادی بیاہ کا تعلق قائم کرنے میں ازدواجی زندگیوں کے ناکام ہو جانے کا زیادہ امکان ہوتا ہے۔''

(تفہیم القرآن' جلد پنجم' صفحہ 99)

قرآن حکیم میں ہدایت فرمائی گئی ہے کہ عدل وانصاف کے معاملے میں تعصب سے کام لینے کے بجائے غیر جانبداری سے پورا پورا انصاف کیا جائے۔ یہ حکم قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

''اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ہم نے یہ کتاب حق کے ساتھ تمہاری طرف نازل کی ہے تاکہ جو راہ راست اللہ نے تمہیں دکھائی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ تم بددیانت لوگوں کی طرف سے جھگڑے والے نہ بنو۔'' (النساء: 105)

سورۃ النساء کے اس رکوع اور اس کے بعد والے رکوع میں ایک اہم معاملہ سے بحث کی گئی ہے جو اسی زمانہ میں پیش آیا تھا۔ قصہ یہ ہے کہ انصار کے قبیلہ بنی ظفر میں ایک شخص طعمہ یا بشیر بن ابیرق تھا۔ اس نے ایک انصاری کی زرہ چرالی اور جب اس کا تجسس شروع ہوا تو مال مسروقہ ایک یہودی کے ہاں رکھ دیا۔ زرہ کے مالک نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے استغاثہ کیا اور طعمہ پر اپنا شبہ ظاہر کیا۔ مگر طعمہ اور اس کے بھائی بندوں اور بنی ظفر کے بہت سے لوگوں نے آپس میں اتفاق کر کے اس یہودی پر الزام تھوپ دیا۔ یہودی سے پوچھا گیا تو اس نے اپنی برأت ظاہر کی۔ لیکن یہ لوگ طعمہ کی حمایت میں زور شور سے وکالت کرتے رہے اور کہا کہ یہ یہودی خبیث' جو حق کا انکار اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کفر کرنے والا ہے' اس کی بات کا کیا اعتبار' بات ہماری تسلیم کی جانی چاہیے کیونکہ ہم مسلمان ہیں۔ قریب تھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مقدمہ کی ظاہری روداد

سے متاثر ہو کر اس یہودی کے خلاف فیصلہ صادر فرما دیتے اور مستغیث کو بھی بنی اُبیرق پر الزام عائد کرنے پر تنبیہ فرماتے۔ اتنے میں وحی آئی اور معاملہ کی ساری حقیقت کھول دی گئی۔ ان رکوعوں میں ایک طرف ان مسلمانوں کو سختی کے ساتھ ملامت کی گئی ہے جنہوں نے محض خاندان اور قبیلہ کی عصبیت میں مجرموں کی حمایت کی تھی۔ دوسری طرف عام مسلمانوں کو یہ سبق دیا گیا ہے کہ انصاف کے معاملے میں کسی تعصب کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ یہ ہرگز دیانت نہیں ہے کہ اپنے گروہ کا آدمی اگر برسر باطل ہو تو اس کی بے جا حمایت کی جائے اور اور دوسرے گروہ کا آدمی اگر برسر حق ہو تو اس کے ساتھ بےانصافی کی جائے۔ (تفہیم القرآن جلد اول صفحہ 393, 394)

پس تعصبات کی اسلامی معاشرہ میں کوئی جگہ نہیں۔ اسلام تعصب کے بجائے غیر جانبداری سے حق و انصاف کی بات کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ تعصب اسلامی معاشرہ کو کمزور کرنے والا عنصر ہے جو ایک طرف نسلی و مذہبی منافرت اور امتیازات کو جنم دیتا ہے تو دوسری طرف متعصبانہ طرز عمل اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ جس سے انسان بلاوجہ اپنے گروہ کے افراد کی اندھی حمایت پر اتر آتا ہے خواہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو۔

3- تنگ نظری:

تنگ نظری کے معنی سخت مزاجی' کم ظرفی' تعصب اور عدم برداشت کے ہیں۔ تنگ نظری سے مراد انسان کا اپنے خیالات و نظریات دوسروں پر زبردستی ٹھونسنا ہے۔ تنگ نظری دوسروں کی آراء یا اختلافی مؤقف کو برداشت نہ کرنا ہے۔ تنگ نظری دوسروں کو رائے اور عقیدہ کا حق نہ دینا ہے۔ اسلام میں تنگ نظری (Narrow Mindedness) کی کوئی جگہ نہیں۔ دین محمدی صلی اللہ علیہ وسلم تنگ نظری اور تعصب کے بجائے رواداری (Tolerance) کا رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ رواداری یہ ہے کہ آپ اپنے نظریات اور خیالات دوسروں تک پہنچا تو سکتے ہیں لیکن انہیں ماننے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ رواداری تہذیب انسانی کی سب سے بڑی خوبی بلکہ جان ہے۔ اسلام میں رواداری کی اہمیت کا اندازہ لگا کر ہی تنگ نظری اور کم ظرفی کی ممنوعیت کو سمجھا جا سکتا ہے۔

(i) وسیع النظری اور رواداری اللہ تعالیٰ کی صفت ہے: رواداری کی اہمیت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خود سب سے بڑے روادار ہیں اور وسیع النظر ہیں۔ قرآن حکیم میں ہے: ''تمہیں جان لینا چاہیے کہ اللہ بے نیاز ہے اور بہترین صفات سے متصف ہے۔'' (البقرۃ:267)

ظاہر ہے کہ جو خود اعلیٰ درجہ کی صفات سے متصف ہو وہ برے اوصاف رکھنے والوں کو پسند نہیں کر سکتا۔ اللہ تعالیٰ خود فیاض ہے اور اپنی مخلوق پر ہر آن بخشش و عطا کے دریا بہا رہا ہے۔ کس طرح ممکن ہے کہ وہ تنگ نظر' کم حوصلہ اور پست اخلاق لوگوں سے محبت کرے۔

اللہ تعالیٰ نے نیکی اور بدی دونوں ہی انسان کو سمجھا دیں اور اس کے بعد ان پر چھوڑ دیا کہ وہ کون سا راستہ اختیار کریں۔ ارشاد ربانی ہے:

''ہم نے انسان کو (نیکی اور بدی کی) دونوں راہیں سمجھا دیں۔'' (البلد:10)

"ہم نے اس کو (بھلائی برائی پر مطلع کر کے) راستہ بتا دیا۔ اب خواہ وہ نیکی کی راہ اختیار کرے اور چاہے تو ناشکری کرتے ہوئے بدی کی راہ اختیار کرے۔" (الدھر: 3)

"اللہ تعالیٰ نے نفس انسانی کو نافرمانی اور تقویٰ و اطاعت کے امور سمجھا دیئے۔" (الشمس: 8)

"پس جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے انکار کر دے۔" (الکہف: 29)

پھر یہ بھی صاف کہہ دیا کہ اگر میں نے جبراً اپنا وجود منوانا ہوتا تو انبیاء و مرسلین بھیجنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ میں سب اختیار رکھتا ہوں اور سب کو منوا سکتا تھا۔ میرے لیے کوئی مشکل نہیں لیکن یہ جبراً نہیں کرانا چاہتا تھا۔ میں نے دلیل و حجت سامنے رکھ کر گمراہی و ضلالت اور خیر و ہدایت کا فرق واضح کر دیا ہے اور انسان کو آزادی دے دی کہ وہ جو چاہے اپنا راستہ اختیار کرے۔ ارشاد فرمایا:

"اور اگر تیرا پروردگار چاہتا تو جو کوئی بھی روئے زمین پر ہے سب ایمان لے آتے۔ کیا تو بنی نوع انسان سے اس وقت تک جبر کرتا رہے گا جب تک کہ وہ ایمان نہ لے آئیں۔" (یونس: 99)

<u>رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وسیع النظر اور روادار تھے</u>: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں سب سے بڑے روادار اور وسیع النظری کا پیکر تھے۔ قرآن حکیم میں ہے: تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت کر دیا کیجئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نصیحت کرنے والے ہیں۔ آپ ان پر مسلط نہیں ہیں۔" (الغاشیہ: 22)

ایک اور مقام پر فرمایا: "اور ہم پر صاف صاف پیغام حق پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔" (یٰسین: 17)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دشمنوں سے بھی رواداری کا برتاؤ کرتے تھے۔ اگر کوئی دشمن بھی آ جاتا تو اس سے اچھی طرح ملتے تھے اور اس کی ضرورت پوری کر دیتے تھے۔ ایک دفعہ مکہ میں اتنا قحط پڑا کہ لوگ مردار اور ہڈیاں بھی کھانے پر مجبور ہو گئے۔ ابوسفیان دشمنی کے باوجود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں کو قریبی رشتہ داروں سے نیک سلوک کی تعلیم دیا کرتے ہیں۔ دیکھئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم ہلاک ہو رہی ہے خدا سے دعا کیجئے۔ یہ سن کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا فرمائی اور خوب بارش ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سب دنیا کے لیے رحمت بن کر تشریف لاتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم دشمنان اسلام سے بھی حتی الامکان درگزر کا معاملہ فرماتے تھے۔ مکہ کے لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین پر سخت مظالم ڈھائے لیکن ان میں سے بڑی مثال فتح مکہ کی ہے۔ جب بڑے سے بڑے مخالفین بھی کانپ رہے تھے کہ اب معلوم نہیں کہ ان کے ساتھ کیا حشر کیا جائیگا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی فراخدلی سے فرمایا: "آج کے دن تم پر کوئی مواخذہ نہیں۔" (یوسف: 92)

<u>عامۃ المسلمین کو تنگ نظری کے بجائے رواداری کی تلقین کی گئی ہے</u>: تمام مسلمانوں کو بھی کفار کے معاملے میں تنگ نظری، تعصب، کم ظرفی کے بجائے وسیع النظری اور رواداری کا سبق دیا گیا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"ایمان والوں سے کہہ دیجئے کہ وہ ان لوگوں کو معاف کر دیا کریں، جو مواخذہ کے دنوں پر ایمان نہیں رکھتے۔" (الجاثیہ: 14)

ایک اور مقام پر ارشاد فرمایا:

''وہ اللہ کے سوا جن معبودوں کو پکارتے ہیں' انہیں گالی نہ دو' مبادا کہ وہ بغیر علم کے اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینے لگیں۔'' (الانعام:108)

ایک اور مقام پر فرمایا:

''دین کو منوانے میں کوئی جبر نہیں۔ بے شک ہدایت اور گمراہی دونوں واضح ہو چکی ہیں۔''

(البقرۃ:256)

وسیع النظری اور رواداری ایک کٹھن کام ہے: وسیع النظری' عفو ودرگزر اور رواداری کوئی آسان چیزیں نہیں ہیں۔ جب دوسروں کے سامنے اپنے نظریات وعقائد رکھے جائیں تو پھر ناروا اور ناپسندیدہ قسم کے اعتراضات و سوالات بھی مخالفین کی طرف سے سننے پڑتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں عفو ودرگزر اور رواداری سے کام لینا پڑتا ہے اور یہ بلاشبہ ایک صبر آزما اور دشوار کام ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''جس نے صبر سے کام لیا اور دوسروں سے درگزر کیا تو بے شک یہ بات ہمت کے کاموں میں سے ہے۔'' (الشوریٰ:43)

اسی چیز کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یوں بیان فرمایا:

''میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کروں' جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں' جو مجھے حق سے محروم کرے میں اسے حق دوں' جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اسے معاف کروں۔'' (مشکوٰۃ شریف)

اسلام کی تاریخ میں صلح حدیبیہ رواداری اور وسیع النظری کی عظیم مثال ہے۔ اس موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام مسلمانوں کی خواہش کے خلاف ابو جندل رضی اللہ عنہ کو واپس کفار کے پاس بھیج دیا اور فرمایا ''صبر اور ضبط سے کام لو۔ خدا تمہارے لیے دیگر مظلوموں کے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکالے گا۔ ہم معاہدہ کر چکے ہیں لہٰذا وعدہ خلافی نہیں کر سکتے۔''

یوں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رواداری سے صلح نامہ تحریر پایا ورنہ ممکن تھا کہ تحریر سے پہلے ہی معاہدہ ٹوٹ جاتا۔

وسیع النظری اور رواداری کا غلط تصور: رواداری اور وسیع النظری کا مطلب یہ نہیں کہ مخالفین اسلام کے ساتھ دوستیاں بنائی جائیں اور اپنی رازکی محفلوں میں انہیں شامل کیا جائے۔ کفار سے موالات یعنی قلبی دوستی حرام ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

''بے شک تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے رفقاء کے رویہ میں ایک نمونہ ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے بھی بیزار ہیں اور جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سے بھی بیزار ہیں۔ ہم تمہارا انکار کرتے ہیں' ہمارے اور تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے دشمنی اور عداوت کا آغاز ہو چکا ہے۔ جب تک کہ تم ایک اللہ پر ایمان نہ لے آؤ۔'' (الممتحنہ:4)

یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ رواداری دراصل تبلیغ و دعوت ہی کا ایک حصہ ہے۔لیکن جب اس سے مطلوبہ ہدف حاصل نہ ہو بلکہ مخالفین اسے الٹا بزدلی اور کمزوری پر محمول کریں تو پھر یہ رواداری مفید ہونے کے بجائے نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔اسی لیے قرآن مجید میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے کہ: ''اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے مقابلہ بھی نہیں کیا اور تمہیں (جبراً) تمہارے گھروں سے بھی نہیں نکالا۔ بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتے ہیں۔اللہ تو صرف تمہیں ان لوگوں سے دوستی بنانے کو منع کرتا ہے جنھوں نے دین کے معاملہ میں تم سے مقابلہ بھی کیا اور تمہیں تمہارے گھروں سے بھی نکالا اور تمہیں نکالنے میں ایک دوسرے کا ساتھ دیا اور جو بھی انہیں دوست بنائیں گے پس وہی ظالم ہیں۔'' (الممتحنۃ:8-9)

الغرض اسلام تنگ نظری کی مذمت کرتا اور وسیع نظری اور رواداری کا درس دیتا ہے۔ یہ نہ صرف مسلمانوں میں باہم رواداری اور وسیع النظری کی تلقین کرتا ہے بلکہ دشمنوں سے بھی رواداری کا درس دیتا ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ ''اور تم اہل کتاب کے ساتھ بجز مہذب (احسن) طریقہ کے مباحثہ مت کرو۔'' (العنکبوت:46)

مسلمانوں کی باہمی رواداری اور عالمی ظرفی اسلامی معاشرت کی نمایاں خصوصیت ہے۔ مسلمان ایک دوسرے سے تنگ نظری کا رویہ نہیں اپناتے اور باہمی اختلاف رائے کی صورت میں بالغ نظری' وسیع القلبی' وسیع النظری اور رواداری کا مظاہرہ کرتے ہیں اور عدم برداشت سے گریز کرتے ہیں۔تنگ نظری چونکہ اسلامی معاشرہ کو کمزور کرنے والا عنصر ہے'اس لیے اہل اسلام کو اس بات کی تلقین و نصیحت کی گئی ہے کہ وہ تمام فکری و عملی معاملات میں تنگ نظری سے اجتناب کریں اور کھلے دل' کھلی نظر اور کھلے ذہن سے اپنی وحدت اور اجتماعیت کو مضبوط اور مستحکم کریں۔

4-انتشارِ فکری:

انتشار کے معنی ہیں بے ترتیبی' تتر بتر ہونا۔انتشار فکری ذہنی خلفشار کو کہتے ہیں۔فکری اعتبار سے جب معاشرہ کے افراد میں وحدت اور یگانگت معدوم ہو جائے تو کہا جاتا ہے کہ معاشرہ میں فکری انتشار نے جنم لے لیا ہے۔فکری انتشار معاشرہ کو کمزور کر دیتا ہے کیونکہ اس کے نتیجے میں اتحاد و یکجہتی اور وحدت فکر و عمل غائب ہو جاتے ہیں اور اختلافات' چپقلش' کدورتیں اور تنازعات ظاہر ہو جاتے ہیں۔فکری انتشار اور باہمی جھگڑے معاشرہ کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے مابین اتحاد' اتفاق' وحدتِ فکر و عمل اور صلح و مفاہمت قائم رکھنے کا حکم دیا ہے۔ارشاد ربانی ہے:

> ''اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں ورنہ تمہارے اندر کمزوری پیدا ہو جائے گی اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔'' (الانفال:46)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرقہ بندی یا انتشار فکری کے آغاز کا سبب بیان فرمایا ہے۔قرآن حکیم

میں ہے:

"لوگوں میں جو تفرقہ رونما ہوا وہ اس کے بعد ہوا کہ ان کے پاس علم آ چکا تھا' اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔" (الشوریٰ:14)

یعنی تفرقہ کا سبب یہ نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام نہیں بھیجے تھے اور کتابیں نازل نہیں کی تھیں' اس وجہ سے لوگ راہ راست نہ جاننے کے باعث اپنے اپنے الگ مذاہب اور مدارس فکر اور نظام زندگی خود ایجاد کر بیٹھے۔ بلکہ یہ تفرقہ ان میں اللہ کی طرف سے علم آ جانے کے بعد رونما ہوا۔ اس لیے اللہ اس کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ وہ لوگ خود اس کے ذمہ دار ہیں جنہوں نے دین کے صاف صاف اصول اور شریعت کے واضح احکام سے ہٹ کر نئے نئے مذاہب و مسالک بنائے۔

اس تفرقہ بازی کا محرک کوئی نیک جذبہ نہیں تھا' بلکہ یہ اپنی الگ فکر پھیلانے اور ایک دوسرے کو زک دینے کی کوشش اور مال و جاہ کی طلب کا نتیجہ تھی۔

یہی بات ایک اور جگہ پر قرآن پاک میں ارشاد فرمائی گئی:

"پھر جو اختلاف ان کے درمیان رونما ہوا وہ (ناواقفیت کی وجہ سے نہیں بلکہ) علم آ جانے کے بعد ہوا اور اس بنا پر ہوا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے پر زیادتی کرنا چاہتے تھے۔" (الجاثیۃ:17)

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے تفرقہ بازی کو ظلم قرار دیا ہے اور تفرقے برپا کرنے والوں کے لیے دردناک عذاب کی خبر دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"لہٰذا تم اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ اسی کی تم عبادت کرو' یہی سیدھا راستہ ہے۔ مگر اس (صاف تعلیم کے باوجود) گروہوں نے آپس میں اختلاف کیا' پس تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جنہوں نے ظلم کیا ایک دردناک دن کے عذاب سے۔" (الزخرف:63-65)

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے کہ وہ تمام اختلافات کا فیصلہ روز قیامت کر دے گا۔ ارشاد ربانی ہے:

"اللہ قیامت کے روز ان معاملات کا فیصلہ فرما دے گا جن میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں۔" (الجاثیۃ:17)

اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کو فرقہ بندی اور انتشار سے بچانے کے لیے تدابیر و ہدایات جاری فرمائیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

"اس کے بعد اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم" ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دین کے معاملہ میں ایک صاف شاہراہ (شریعت) پر قائم کیا ہے۔ لہٰذا تم اسی پر چلو اور ان لوگوں کی خواہشات کا اتباع نہ کرو جو علم نہیں رکھتے۔" (الجاثیۃ:18)

یعنی جو کام پہلے بنی اسرائیل کے سپرد کیا گیا تھا وہ اب تمہارے سپرد کیا گیا ہے۔ انہوں نے علم پانے

کے باوجود اپنی نفسانفسی سے دین میں ایسے اختلافات برپا کیے اور آپس میں ایسی گروہ بندیاں کر ڈالیں جن سے وہ اس قابل نہ رہے کہ دنیا کو خدا کے رستے پر بلاسکیں۔ اب اسی دنیا کی صاف شاہراہ پر تمہیں کھڑا کیا گیا ہے تا کہ تم وہ خدمت انجام دو جسے بنی اسرائیل چھوڑ بھی چکے ہیں اور ادا کرنے کے بھی اہل نہیں رہے ہیں۔ قرآن مجید اور یہ شریعت دنیا کے تمام انسانوں کے لیے وہ روشنی پیش کرتی ہے جو حق اور باطل کا فرق نمایاں کرنے والی (الفرقان) ہے مگر اس سے ہدایت وہی لوگ پاتے ہیں جو اس کی صداقت پر یقین لائیں اور انہی کے حق میں یہ رحمت ہے۔

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ تفرقہ بازی سے گریز کرو۔ فرمایا:

"(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کو دے چکے ہیں اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔" (الشوریٰ:13)

اس آیت کی شرح میں سید مودودی" لکھتے ہیں کہ "اقامت دین کا حکم دینے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ "دین میں تفرقہ نہ برپا کرو۔" اس کے اندر متفرق نہ ہو جاؤ۔" دین میں تفرقہ سے مراد یہ ہے کہ آدمی دین کے اندر اپنی طرف سے کوئی نرالی بات ایسی نکالے جس کی کوئی معقول گنجائش اس میں نہ ہو اور اصرار کرے کہ اس کی نکالی ہوئی بات کے ماننے پر ہی کفر و ایمان کا مدار ہے پھر جو ماننے والے ہوں انہیں لے کر نہ ماننے والوں سے جدا ہو جائے۔ یہ نرالی بات کئی طرح کی ہوسکتی ہے۔ وہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دین میں جو چیز نہ تھی وہ اس میں لا کر شامل کر دی جائے۔ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دین میں جو بات شامل تھی اسے نکال باہر کیا جائے۔ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دین کی نصوص میں تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی تاویلات کر کے نرالے عقائد اور انوکھے اعمال ایجاد کیے جائیں۔ اور یہ بھی ہوسکتی ہے کہ دین کی باتوں میں رد و بدل کر کے اس کا حلیہ بگاڑا جائے۔ مثلاً جو چیز اہم تھی اسے غیر اہم بنا دیا جائے اور جو چیز حد سے مباح کے درجے میں تھی اسے فرض و واجب بلکہ اس سے بھی بڑھا کر اسلام کا رکن رکین بنا ڈالا جائے........ اس تفرقے کا اس جائز اور معقول اختلاف رائے سے کوئی تعلق نہیں ہے جو دین کے احکام کو سمجھنے اور نصوص پر غور کر کے ان سے مسائل مستنبط کرنے میں فطری طور پر اہل علم کے درمیان واقع ہوتا ہے اور جس کے لیے خود کتاب اللہ کے الفاظ میں لغت اور محاورے اور قواعد زبان کے لحاظ سے گنجائش ہوتی ہے۔" (تفہیم القرآن۔ جلد چہارم' صفحہ 492)

انتشار فکری یعنی تفرقہ بندی سے بچنے اور اتحاد امت کے فروغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ پر حکم فرمایا کہ: "اور تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں نہ پڑو۔" (آل عمران:103)

اللہ کی رسی سے مراد اس کا دین ہے اور اس کو رسی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہل ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ اس رسی کو "مضبوط پکڑنے" کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت "دین" کی ہو' اسی سے ان کو دلچسپی ہو' اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں اور اسی کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کرتے رہیں۔ جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور

دلچسپیاں جزئیات وفروع کی طرف منعطف ہوئیں' پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ واختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی امتوں کو ان کے اصل مقصد حیات سے منحرف کر کے دنیا اور آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے۔" (تفہیم القران۔ جلد اول صفحہ 276-277)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ کی کتاب ہی وہ رسی (حبل اللہ) ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے۔" **"كتاب الله حبل الله الممدود من السماء الى الارض"** (ابن کثیر)

عربی محاورے میں حبل سے مراد عہد بھی ہوتا ہے اور ہر وہ چیز جو ذریعہ یا وسیلہ کا کام دے سکے۔ قرآن مجید کو اللہ کی رسی سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ یہ ایک طرف مومنین کا تعلق اللہ سے جوڑتا ہے اور دوسری طرف ایمان لانے والوں کو ملا کر ایک جماعت بناتا ہے۔ مرکز اتحاد کے بارے میں دنیا کی اقوام کی راہیں مختلف ہیں۔ کہیں نسل اور نسب کے رشتوں کو مرکز وحدت سمجھا گیا' کہیں رنگ کا تفاوت وحدت کا مرکز بن گیا اور کہیں زبان مرکز وحدت قرار پائی۔ قرآن مجید نے مومنوں کو ایک قوم بنا کر حبل اللہ (اللہ کی رسی) سے وابستہ کیا۔ لہٰذا ملت اسلامیہ کا مرکز نظریہ اور عقیدہ ہی جو ان کے پاس قرآن کریم اور دین اسلام کی شکل میں ہے۔ اس مرکز سے وابستہ رہتے ہوئے مسلمانوں کو انتشار اور فرقہ بندی سے روکا گیا ہے۔ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مسلمانوں کے انتشار اور فرقہ بندی کی مذمت اس طرح کی ہے:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

مذکورہ بالا مباحث سے معلوم ہوتا ہے کہ انتشار وافتراق سے اسلامی معاشرہ میں ضعف پیدا ہوتا ہے اور اتحاد واتفاق اسلامی معاشرہ کو مستحکم کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں انتشار فکری کی ممنوعیت پائی جاتی ہے اور تفرقہ بازی کی مذمت کی گئی ہے۔ مسلمانوں میں اتحاد واخوت کے قیام کی تعلیم دی گئی ہے اور اس حقیقت کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ مومنین کے درمیان قلبی محبت دراصل اللہ ہی کی پیدا کردہ ہے:

> "(وہی تو ہے) جس نے مومنین کے دل ایک دوسرے سے جوڑ دیئے۔ تم روئے زمین کی تمام دولت بھی اگر خرچ کر ڈالتے تو ان لوگوں کے دلوں کو نہ جوڑ سکتے تھے مگر وہ اللہ ہے جس نے ان لوگوں کے دل جوڑ دیے۔" (الانفال:63)

> "اور اللہ کے اس احسان کو یاد کرو جو اس نے تم پر کیا کہ جب تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ پھر اس نے تمہارے قلوب کو جوڑ دیا۔ پھر تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر تھے تو اسی نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔" (آل عمران:103)

5- خودغرضی:

خودغرضی فارسی زبان سے لیا گیا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں آپا دھاپی، نفسانفسی، خود مطلبی، خودکامی وغیرہ۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک بندہ مومن خودغرض اور نفس پرست نہیں ہوتا بلکہ وہ ایثار، اخوت، ہمدردی اور خیر خواہی واحسان کا نمونہ ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو ایک دوسرے کا بھائی قرار دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ''مومن، مومن کے لیے دیوار کی طرح ہوتا ہے، جس کا ایک حصہ دوسرے حصہ کو تقویت دیتا ہے۔'' پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں کو ایک دوسرے میں ڈال کر فرمایا کہ ایسے (بخاری، مسلم)۔ اسلام میں خودغرضی کے بجائے قربانی وایثار کی تعلیم دی گئی ہے اور اس سلسلے میں تاریخ اسلامی میں انصار مدینہ کی فقید المثال قربانی وایثار کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے:

''وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، خواہ اپنی جگہ خود محتاج ہوں'' (الحشر:9)

اسلام خودغرضی کے تحت دوسروں کو نقصان پہنچانے اور اپنے مفادات پورے کرنے کی شدید مذمت کرتا ہے۔ اسلام نے یہ تعلیم دی ہے کہ دوسروں کے لیے بھی وہی چیز پسند کی جائے جو اپنے لیے پسند ہو (حدیث متفق علیہ) حضور علیہ السلام نے ایک دوسرے کو تحائف دینا ضروری قرار دیا اور فرمایا: ''تم ایک دوسرے کو تحائف دیا کرو، تم میں باہمی محبت پیدا ہوگی اور دشمنی جاتی رہے گی۔'' (بخاری شریف)

حضور علیہ السلام نے یہ تعلیم فرمائی ہے کہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خیر الناس من ینفع الناس'' یعنی لوگوں میں اچھا وہ ہے جو لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔'' گویا اسلام کی بنیادی تعلیم ہی یہی ہے کہ خودغرضی کا مظاہرہ نہ کیا جائے بلکہ اپنی غرض کی قربانی دیتے ہوئے دوسروں کی اغراض اور فوائد کا خیال رکھا جائے اور اپنے عارضی فائدہ کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانے سے گریز کیا جائے اور مخلوق خدا سے تعاون اور ہمدردی کا معاملہ کیا جائے۔ آقا ومولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

''جس شخص نے ایک مومن کی دنیاوی تکالیف میں سے ایک تکلیف کو دور کیا، اللہ روز محشر اس کی تکالیف میں سے ایک تکلیف کو دور کردے گا۔''

اللہ تعالیٰ مفاد پرستی اور خودغرضی کو انتہائی ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے اور دوسروں کے ساتھ نیکی کا اور احسان کا رویہ اختیار کرنے کا حکم فرماتا ہے۔''

''احسان کا طریقہ اختیار کرو۔ بے شک اللہ محسنوں کو پسند کرتا ہے۔'' (البقرۃ:195)

ایک اور جگہ ارشاد ربانی ہے:

''اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو احسان کی روش اپناتے ہیں۔'' (المائدہ:13)

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے:

''اللہ عدل اور احسان اور صلہ رحمی کا حکم دیتا ہے۔'' (النحل:90)

الغرض اسلام میں خودغرضی کی گنجائش نہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"ہر مسلمان پر دوسرے مسلمان کی جان، مال اور عزت حرام ہے۔ (مسلم، ترمذی) اس حدیث مبارکہ کی رو سے اپنی غرض پوری کرنے کے لیے دوسروں کو نقصان پہنچانا سخت گناہ ٹھہرایا گیا۔ ایک خود غرض معاشرہ میں لوگ ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے میں لگے رہتے ہیں اور موقع پرستی، مفاد پرستی اور مطلب پرستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دوسروں کو جانی و مالی نقصان پہنچانے کے مواقع ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ ایسا معاشرہ مال و جاہ کی ہوس میں ڈوبا ہوتا ہے اور کبھی بھی اسلامی معاشرہ نہیں کہلا سکتا۔ اسلامی معاشرہ ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا نام ہے۔ یہ ایثار و قربانی کی زندہ و جاوید مثال کا نام ہے۔ یہ خیر خواہی سے معمور جذبات و احساسات کا نام ہے۔ اسلامی معاشرہ اسی لیے طاقتور ہوتا ہے کہ اس میں خود غرضی و مطلب پرستی کا نشان تک نہیں ہوتا۔ خود غرضی معاشرہ کی اجتماعیت اور قوت کو ختم کر ڈالتی ہے اور ہوس پرست اجتماع کو جنم دیتی ہے۔ جس کے وجود کی بقا و سلامتی کی کوئی ضمانت نہیں ہوتی۔

10-استحصال:

استحصال کے معنی کسی کی کمزوری کا ناجائز فائدہ اٹھانا ہے۔ استحصال ناجائز انتفاع حاصل کرنا یا لوٹ کھسوٹ کرنا ہے۔ استحصال دراصل اپنا کام نکالنا اور دوسرے کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا ہے۔

استحصال (Exploitation) کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(i) حکومت عوام کا استحصال کرتی ہے۔

(ii) صنعت کار ملازمین (گاہکوں) کا استحصال کرتے ہیں۔

(iii) تاجران خریداروں (گاہکوں) کا استحصال کرتے ہیں۔

(iv) سرمایہ دار غرباء اور زیر دستوں کا استحصال کرتے ہیں۔

اسلام ہر طرح کے استحصال کے خلاف ہے اور کسی طرح کے استحصالی نظام کی حمایت نہیں کرتا۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ کسی حق دار کا حق نہ چھینا جائے اور ناحق کسی کا مال نہ کھایا جائے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقوں سے نہ کھایا کرو۔ بجز اس کے لین دین آپس کی رضامندی سے ہو۔" (النساء:29)

اسلام میں یہ حکم ہے کہ استحصال کے بجائے جائز طریقوں سے دولت کمائی جائے اور کمائی ہوئی دولت کو ہوسِ زر میں مبتلا ہو کر جمع نہ کیا جائے کیونکہ دولت سمیٹ سمیٹ کر جمع کرنے والا نہ صرف خود بدترین اخلاقی امراض میں مبتلا ہوتا ہے بلکہ درحقیقت وہ پوری جماعت کے خلاف ایک شدید جرم کا ارتکاب کرتا ہے۔

قرآن حکیم میں ہے:

"اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دو۔" (التوبہ:34)

"جو لوگ اللہ کے دیے ہوئے فضل میں بخل کرتے ہیں وہ یہ گمان نہ کریں کہ یہ فعل ان کے لیے

اچھا ہے بلکہ درحقیقت یہ ان کے لیے برا ہے۔'' (آل عمران:180)

اسلام دوسروں کا استحصال کر کے مال جمع کرنے کی ممانعت کرتا ہے اور جائز ذرائع سے مال کمانے کی تلقین کرتے ہوئے بھلائی کے کاموں میں خرچ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''اور نیک سلوک کرو اور اپنے ماں باپ کے ساتھ اور اپنے رشتہ داروں اور یتیموں اور نادار مسکینوں اور قرابت دار پڑوسیوں اور اجنبی ہمسایوں اور اپنے ملنے جلنے والے دوستوں اور مسافروں اور لونڈی غلاموں کے ساتھ'' (النساء:36)

''اور ان کے مالوں میں سائل اور نادار کا حق ہے۔'' (الذاریات:19)

استحصال کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ اس نے اگر فی سبیل اللہ خرچ کیا تو اس کا مال ضائع ہو جائے گا کیونکہ وہ ہوس زر میں مبتلا ہوتا ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ نہیں وہ مال ضائع نہیں گیا بلکہ اس کا بہتر فائدہ تمہاری طرف پھر پلٹ کر آئے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور تم نیک کاموں میں جو کچھ خرچ کرو گے وہ تم کو پورا پورا ملے گا اور تم پر ہرگز ظلم نہ ہوگا۔'' (البقرۃ:272)

''اور جن لوگوں نے ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے کھلے اور چھپے طریقہ سے خرچ کیا وہ ایک ایسی تجارت کی امید رکھتے ہیں جس میں گھاٹا ہرگز نہیں ہے۔ اللہ ان کے بدلے ان کو پورا اجر دے گا بلکہ اپنے فضل سے کچھ زیادہ ہی عنایت کرے گا۔'' (فاطر:29 - 30)

سرمایہ دار سمجھتا ہے کہ دولت جمع کر کے اس کو سود پر چلانے سے دولت بڑھتی ہے' اسلام کہتا ہے کہ نہیں سُود سے تو دولت گھٹ جاتی ہے۔ دولت بڑھانے کا ذریعہ نیک کاموں میں اسے خرچ کرنا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

''اللہ سود کو ہلاک کرتا ہے اور صدقات کو نشو و نما دیتا ہے۔'' (البقرۃ:276)

''اور یہ جو تم سود دیتے ہو تا کہ لوگوں کے اموال میں اضافہ ہو تو اللہ کے نزدیک وہ ہرگز نہیں بڑھتا' بڑھوتری تو ان اموال کو نصیب ہوتی ہے جو تم اللہ کے لیے زکوۃ میں دیتے ہو۔'' (الروم:39)

اسلام سود کو حرام قرار دیتا ہے اور یہ تعلیم دیتا ہے کہ ضرورت مند کو صرف قرض ہی نہ دو بلکہ اگر وہ تنگ دست ہو تو اس پر تقاضے میں سختی بھی نہ کرو' حتیٰ کہ اگر اس میں دینے کی استطاعت نہ ہو تو معاف کر دو۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اگر قرض دار تنگ دست ہو تو اس کی حالت درست ہونے تک اسے مہلت دے دو' اگر معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ اس کا فائدہ تم سمجھ سکتے ہو اگر کچھ علم رکھتے ہو۔'' (البقرۃ:28)

اسلام میں رشوت اور غصب کے ذریعے سے اکتساب مال اور استحصال کی شدید ممانعت کی گئی ہے۔

''اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناروا طریقہ سے کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے

ان کو اس غرض کے لیے پیش کرو کہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع مل جائے۔" (البقرۃ:188)

خیانت کے ذریعے سے مال کمانے کی شدید ممانعت کی گئی ہے۔

"اگر تم میں سے کوئی شخص دوسرے پر بھروسا کر کے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کرے تو جس پر بھروسا کیا گیا ہے اسے چاہیے کہ امانت ادا کرے اور اپنے رب سے ڈرے۔" (البقرۃ:283)

"اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہو جائے گا' پھر ہر متنفس کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔" (آل عمران:161)

استحصال کرتے ہوئے یتیم کا مال کھانے والے کو سخت عذاب کی خبر دی گئی ہے:

"جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کے مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔" (النساء:10)

حدیث میں آیا ہے کہ جنگ اُحد کے بعد حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی بیوی اپنی دو بچیوں کو لیے ہوئے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور انہوں نے عرض کیا کہ "یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! یہ سعد کی بچیاں ہیں جو آپ کے ساتھ اُحد میں شہید ہوئے ہیں۔ ان کے چچا نے پوری جائیداد پر قبضہ کر لیا ہے اور ان کے لیے ایک حصہ تک نہیں چھوڑا ہے۔ بھلا ان بچیوں سے کون نکاح کرے گا۔" مذکورہ بالا آیت اس موقع پر نازل ہوئی۔

تجارت کے میدان میں ناپ تول میں کمی کر کے لوگوں کا استحصال کرنے والوں کے لیے شدید عذاب کی خبر دی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

"تباہی ہے ڈنڈی مارنے والوں کے لیے۔ جن کا حال یہ ہے کہ جب لوگوں سے لیتے ہیں تو پورا پورا لیتے ہیں' اور جب ان کو ناپ کر یا تول کر دیتے ہیں تو انہیں گھاٹا دیتے ہیں۔ کیا یہ لوگ نہیں سمجھتے کہ ایک بڑے دن یہ اٹھا کر لائے جانے والے ہیں؟ اس دن جبکہ سب لوگ رب العالمین کے سامنے کھڑے ہوں گے۔" (المطففین:1-6)

قرآن مجید میں جگہ جگہ ناپ تول میں کمی کرنے کی سخت مذمت اور صحیح ناپنے اور تولنے کی سخت تاکید کی گئی ہے تاکہ لوگوں کے استحصال کی راہ روکی جا سکے۔

"انصاف کے ساتھ پورا ناپو اور تولو' ہم کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلف نہیں ٹھہراتے۔" (الانعام:152)

"جب ناپو تو پورا ناپو اور صحیح ترازو سے تولو۔" (بنی اسرائیل:35)

"تولنے میں زیادتی نہ کرو' ٹھیک ٹھیک انصاف کے ساتھ وزن کرو اور ترازو میں گھاٹا نہ دو۔" (الرحمان:8-9)

قوم شعیب پر جس جرم کی وجہ سے عذاب نازل ہوا وہ یہی تھا کہ اس کے اندر ناپ تول میں کمی

کا مرض عام طور پر پھیلا ہوا تھا اور حضرت شعیب علیہ السلام کی پے در پے نصیحتوں کے باوجود یہ قوم اس جرم سے باز نہ آتی تھی۔

اسلام میں فرد کو اپنی ملکیت اس طرح استعمال کرنے کا کوئی حق نہیں جس سے دوسرے اشخاص یا بحیثیت مجموعی پورے معاشرہ کو نقصان اور ضرر پہنچے۔ صرف دانستہ نقصان پہنچانے ہی کا ذکر نہیں بلکہ وہ دوسروں کو مضرت رسانی کا ارادہ نہ بھی رکھتا ہو تو بھی اگر اس کے کسی مالکانہ تصرف سے دوسروں پر مضر اثرات مرتب ہوتے ہوں تو اس کے ذمہ واجب ہے کہ وہ اپنے تصرف میں اس طرح ترمیم کرے کہ دوسرے اس کے مضر اثرات سے محفوظ رہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اسی مضرت رسانی سے گریز کی تاکید کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ "اسلام میں مضرت رسانی کی کوئی گنجائش نہیں نہ ابتداءً نہ جوابی کارروائی کے طور پر۔"

(یحییٰ ابن آدم القرشی کتاب الخراج' صفحہ 68)

ایک اور موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ

"جو کسی دوسرے کو نقصان پہنچائے گا اس کو اللہ نقصان پہنچائے گا اور جو کسی دوسرے کو فائدہ پہنچائے گا اس کو اللہ تکلیف دے گا۔" (ترمذی باب ما جاء فی الخیانۃ والغش)

اسلام میں استحصال کی غرض سے ذخیرہ اندوزی کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو مسلمانوں کے لیے نرخ گراں کرنے کی نیت سے ذخیرہ اندوزی کرے وہ غلط کار ہے اور اللہ اس سے بری ہے۔" (حاکم مستدرک: جلد 2 صفحہ 2)

دراصل اسلام کی نظر میں ہر ایسی کوشش مذموم ہے جو بازار کے نرخ کے فطری عمل میں دخل دینے کے مترادف ہو اور جس کا مقصود اشیائے تجارت کو گراں کرنا ہو' حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "جو شخص مسلمانوں کے بازار کے نرخ میں اس لیے دخل دے کہ اسے گراں کرے تو اللہ تعالیٰ کے لیے ضروری ہو جاتا ہے کہ قیامت کے دن اسے زبردست آگ میں جھونک دے۔" (مسند ابو داؤد الطیالسی: صفحہ 25 طبع حیدرآباد)

اسلام میں احتکار' اتلاف مال' چور بازاری اور ملاوٹ کے ذریعے سے عوام کے استحصال کی شدید مذمت کی گئی ہے اور بازار تجارت میں بے جا لوٹ مار سے سختی سے روکا گیا ہے۔ اسی طرح ناقص اور ملاوٹی اشیاء کی فروخت سے روکا گیا ہے۔

عقبہ بن جہنی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ مسلمان' مسلمان کا بھائی ہے اور کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ اس نے اپنے بھائی کے ہاتھ کوئی ایسی چیز فروخت کی ہو جس میں کوئی نقص ہو اور وہ اس کو اس نقص سے آگاہ نہ کر دے۔" (حاکم: مستدرک' جلد 2 صفحہ 8)

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

"من غش فلیس منا" (جس نے ملاوٹ کی وہ ہم میں سے نہیں)

اسلام سرمایہ داروں اور صنعت کاروں کی لوٹ...

کے حقوق کی آواز اٹھاتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "مزدور تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارا ماتحت بنا دیا ہے۔ پھر جس کا بھائی کسی کے ماتحت ہو تو چاہیے کہ جو خود کھاتا ہو اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو انہیں مغلوب کر دے اور اگر ان پر بار ڈالو تو ان کی اعانت کرو۔" (بخاری)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "مزدور کو اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے اجرت دو۔" آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے کہ عطا و بخشش کے راستہ سے مزدور کو پیداوار کے منافع میں سے بھی کچھ نہ کچھ ملتے رہنا چاہیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"مزدور کو اس کے کام سے بھی حصہ دو کیونکہ اللہ کا مزدور نامراد نہیں کیا جا سکتا۔" (مسند احمد)

مذکورہ بالا مباحث سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام میں استحصال خواہ وہ کسی بھی طریقے سے کیا جائے بہرصورت ناجائز اور حرام ہے اور شدید طریقے سے قابل مذمت ہے۔ اسلامی معاشرہ ہر طرح کے استحصالی نظام سے پاک ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ میں استحصال پرورش پا جائے تو معاشرہ بددیانتی' لوٹ کھسوٹ اور ظلم و ناانصافی کی آماجگاہ بن جاتا ہے اور اس کی بنیادیں ہل جاتی ہیں۔

اسلامی معاشرہ اسی لیے قوی اساسات پر استوار ہوتا ہے کہ اس میں استحصال کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔

7- تفاخر:

تفاخر عربی زبان کا لفظ ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں' فخر' غرور' تکبر' فخر جتانا' فخر کرنا۔ انگریزی میں اس کے لیے پرائڈ "Pride" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ تفاخر کے کئی اسباب ہو سکتے ہیں۔ مثلاً امارت' خوبصورتی یا حسن و جمال' حسب و نسب' قوت و اختیار وغیرہ۔ تفاخر دراصل خود کو اعلیٰ و برتر اور دوسروں کو کمتر سمجھنا ہے۔ اسلام میں ہر طرح کے تفاخر کی مذمت کرتا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

"یقین جانو اللہ کسی ایسے شخص کو پسند نہیں کرتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔" (النساء:36)

"اللہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو اپنے آپ کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور فخر جتاتے ہیں۔" (الحدید:23)

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ نے تکبر کے مظاہر بیان فرمائے ہیں:

"اور لوگوں سے منہ پھیر کر بات نہ کر نہ زمین میں اکڑ کر چل' اللہ کسی خود پسند اور فخر جتانے والے شخص کو پسند نہیں کرتا۔" (لقمن:18)

اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

"بعض مفسرین نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ "تیز بھی نہ چل اور آہستہ بھی نہ چل' بلکہ میانہ روی اختیار کر۔" لیکن سیاق کلام سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں رفتار کی تیزی و سستی زیر بحث نہیں ہے۔ آہستہ چلنا یا تیز چلنا' اپنے اندر کوئی اخلاقی حسن و قبح نہیں رکھتا اور نہ اس کے لیے کوئی ضابطہ مقرر کیا جا سکتا ہے۔ آدمی کو جلدی کا کوئی کام ہو تو تیز کیوں نہ چلے۔ اور اگر وہ محض تفریحاً

چل رہا ہو تو آخر آہستہ چلنے میں کیا قباحت ہے۔ میانہ روی کا اگر کوئی معیار بھی ہو تو ہر حالت میں ہر شخص کے لیے اسے ایک قاعدہ کلیہ کیسے بنایا جا سکتا ہے۔ دراصل جو چیز یہاں مقصود ہے وہ تو نفس کی اس کیفیت کا اصلاح ہے جس کے اثر سے چال میں تبختر اور مسکینی کا ظہور ہوتا ہے۔ بڑائی کا گھمنڈ اندر موجود ہو تو وہ لازماً ایک خاص طرز کی چال میں ڈھل کر ظاہر ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر نہ صرف یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ آدمی کسی گھمنڈ میں مبتلا ہے بلکہ چال کی شان یہ تک بتا دیتی ہے کہ کس گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ دولت' اقتدار' حسن' علم' طاقت اور ایسی ہی دوسری جتنی چیزیں بھی انسان کے اندر تکبر پیدا کرتی ہیں ان میں سے ہر ایک کا گھمنڈ اس کی چال کا ایک مخصوص ٹائپ پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے برعکس چال میں مسکینی کا ظہور بھی کسی نہ کسی مذموم نفسی کیفیت کے اثر سے ہوتا ہے۔ کبھی انسان کے نفس کا مخفی تکبر ایک نمائشی تواضع اور دکھاوے کی درویشی و خدا رسیدگی کا روپ دھارتا ہے اور یہ چیز اس کی چال میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اور کبھی انسان واقعی دنیا اور اس کے حالات سے شکست کھا کر اور اپنی نگاہ میں آپ حقیر ہو کر مریل چال چلنے لگتا ہے۔ لقمان کی نصیحت کا منشا یہ ہے کہ اپنے نفس کی ان کیفیات کو دور کرو اور ایک سیدھے سادھے معقول اور شریف آدمی کی سی چال چلو جس میں نہ کوئی اینٹھ اور اکڑ ہو نہ مریل پن' اور نہ ریاکارانہ زہد و انکسار۔'' (تفہیم القرآن۔ جلد 4' صفحہ 18-19)

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''زمین میں اکڑ کر نہ چلو تم نہ زمین کو پھاڑ سکتے ہو نہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکتے ہو۔''

(بنی اسرائیل: 37)

مطلب یہ ہے کہ جباروں اور متکبروں کی روش سے بچو۔ یہ ہدایت بھی انفرادی طرز عمل اور قومی رویے' دونوں پر یکساں حاوی ہے اور یہ اسی ہدایت کا فیض تھا کہ مدینہ طیبہ میں جو حکومت اس منشور پر قائم ہوئی اس کے فرماں رواؤں' گورنروں اور سپہ سالاروں کی زندگی میں جباری اور کبریائی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ عین حالت جنگ میں بھی کبھی ان کی زبان سے فخر و غرور کی کوئی بات نہ نکلی۔ ان کی نشست و برخاست' چال ڈھال' لباس' مکان' سواری اور عام برتاؤ میں انکسار و تواضع' بلکہ فقیری و درویشی کی شان پائی جاتی تھی' اور جب وہ فاتح کی حیثیت سے کسی شہر میں داخل ہوتے تھے اس وقت بھی اکڑ اور تبختر سے کبھی اپنا رعب بٹھانے کی کوشش نہ کرتے تھے۔ (تفہیم القرآن۔ جلد دوم' صفحہ 617)

قرآن حکیم میں ہے:

''پھر ان کے بعد ہم نے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف بھیجا' مگر انہوں نے اپنی بڑائی کا گھمنڈ کیا' اور وہ مجرم لوگ تھے۔'' (یونس: 75)

قرآن مجید کی اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے تکبر و استکبار کی حقیقت بیان کی ہے کہ انسان اپنی دولت و حکومت اور شوکت و حشمت کے نشے میں مدہوش ہو کر اپنے آپ کو بندگی کے مقام سے بالاتر سمجھ لیتا ہے اور

اطاعت میں سر جھکانے کے بجائے اکڑ دکھانے لگتا ہے۔ جس طرح فرعون اور اس کے سرداروں نے موسیٰ و ہارون کو دکھائی تھی۔

متکبرین کے لیے اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے:

''وہ (اللہ) ان لوگوں کو ہرگز پسند نہیں کرتا جو غرور نفس میں مبتلا ہوں۔'' (النحل:23)

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ بندے کو تکبر کا کوئی حق نہیں ہے۔

''تجھے حق نہیں ہے کہ یہاں بڑائی کا گھمنڈ کرے۔'' (الاعراف:13)

''میں اپنی نشانیوں سے ان لوگوں کی نگاہیں پھیر دوں گا جو بغیر کسی حق کے زمین میں بڑے بنتے ہیں۔'' (الاعراف:146)

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے:

''جو فرشتے تمہارے رب کے حضور تقرب کا مقام رکھتے ہیں وہ کبھی اپنی بڑائی کے گھمنڈ میں آ کر اس کی عبادت سے منہ نہیں موڑتے اور اس کی تسبیح کرتے ہیں' اور اس کے آگے جھکے رہتے ہیں۔'' (الاعراف:206)

مطلب یہ ہے کہ بڑائی اور گھمنڈ اور بندگی سے منہ موڑنا شیاطین کا کام ہے اور اس کا نتیجہ پستی و تنزلی ہے۔

متکبرین کی سزا ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ڈالے جانا ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

''اللہ تمہارے کرتوتوں سے خوب واقف ہے۔ اب جاؤ' جہنم کے دروازوں میں گھس جاؤ۔ وہیں تم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ بڑا ہی برا ٹھکانہ ہے متکبروں کے لیے۔'' (النحل:28-29)

اگر کوئی شخص اپنی ذات' برادری' اور رنگ و نسل پر تفاخر کرے اور اس بنا پر دوسروں کو حقیر سمجھے تو اس کا جواب خود قرآن کریم کی سورۃ الحجرات میں اللہ تعالیٰ نے دے دیا ہے۔ فرمایا:

''اے لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کر سکو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے بڑا شریف وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ اللہ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے۔'' (آیت نمبر 13)

یعنی سب انسان ایک ہی طریق پیدائش کے تحت ایک عورت اور ایک مرد سے پیدا ہوئے ہیں۔ یہ خاندان اور برادریاں محض ایک دوسرے کی شناخت اور تعارف کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنائیں اور ان سے وابستگیاں بھی افضل ہونے کا سبب نہیں ہو سکتیں۔ لہٰذا کوئی بھی حسب نسب کی بنا پر تفاخر و استکبار نہیں کر سکتا۔ اور اصل حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر کوئی فضیلت کا حقدار ہے تو وہ صرف پرہیزگاری اور تقویٰ سے متصف انسان ہے۔

چونکہ تفاخر اور استکبار معاشرہ کے افراد میں فاصلے اور کدورتیں بڑھاتے ہیں اور معاشرہ میں منافرت' عدم استحکام اور غیر یقینی صورت حال پیدا کرتے ہیں' اس لیے اسلامی معاشرہ میں تفاخر اور استکبار کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

معاشرتی ادارے

خاندان

سوال : خاندان سے کیا مراد ہے؟ خاندان کے ارتقاء کے بارے میں نظریات بیان کرتے ہوئے خاندان کی اقسام بیان کیجئے اور اسلامی خاندان کی خصوصیات پر روشنی ڈالئے؟

یا

ماہرین عمرانیات کے حوالہ سے خاندان اور اس کی اقسام پر روشنی ڈالئے اور اسلامی خاندان کی خصوصیات بیان کیجئے۔

جواب : خاندان : "خاندان" فارسی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی ہیں: گھرانا، کنبہ، قبیلہ، نسل، گوت، ایک ہی نسل کے قریبی رشتہ داروں کا مجموعہ۔

خاندان کی تعریف : ماہرین عمرانیات و سیاسیات کے نزدیک خاندان کی تعریف حسب ذیل ہے :

1۔ ارسطو کا کہنا ہے کہ:
"خاندان ایک قدرتی ادارہ ہے جس کی ابتداء انسانی ضروریات کی وجہ سے ہوئی۔ انسان کو اپنی مختلف ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے ساتھیوں کی ضرورت رہی۔ ابتدا ہی میں عورت اس کی زندگی کی بہترین ساتھی ثابت ہوئی اور مرد و عورت دونوں کی رفاقت کی وجہ سے خاندان وجود میں آیا۔"

2۔ "مین" کا کہنا ہے کہ:
"خاندان ایک سربراہ کی موجودگی میں ایک چھوٹی سی ریاست ہوتا ہے۔"

3۔ طر کے نزدیک:
"خاندان صرف افراد کے مجموعہ کا نام نہیں، بلکہ ایک نسل سے تعلق رکھنے والے ان افراد کو خاندان کہتے ہیں جو مل جل کر کسی ایک گھر میں رہتے ہیں۔"

4۔ بیکوکیس کا کہنا ہے کہ:
"قدیم دور میں خاندان کی بنیاد اس وقت پڑی جب آزاد جنسی میل جول کے بجائے منظم طریقہ اختیار کیا گیا اور شادی کا رواج پڑا۔"

5۔ مارگن کے نزدیک:
"خاندان تمام معاشرتی اداروں کی بنیاد ہے۔ درحقیقت خاندان ہی دوسرے اداروں کو

جنم دینے کا باعث بنتا ہے۔"

6- ابن خلدون کا کہنا ہے کہ:

"خاندان معاشرہ کا ایک عنصر لازم ہے۔ خاندان کے بغیر شادی ممکن ہے لیکن شادی کے نتیجہ میں خاندان ضروری امر ہے۔ خاندان در خاندان معاشرہ کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔"

7- ینگ کے نزدیک:

"خاندان دو یا دو سے زیادہ افراد کا وہ گروہ ہے جو خونی' ازدواجی یا متبنی کے رشتہ میں جڑا ہوا ہو اور سب اکٹھے رہتے ہیں۔"

8- شاہ ولی اللہ کا خیال ہے کہ:

"خاندان نکاح سے وجود پذیر ہوتا ہے اور نکاح کا جو تصور اسلام پیش کرتا ہے اس سے مضبوط خاندان کی بنیاد پڑتی ہے۔"

خاندان کے بنیادی ارکان : ایک خاندان میں مندرجہ ذیل افراد بنیادی ارکان کی حیثیت رکھتے ہیں:

1- شوہر۔

2- بیوی۔

3- اولاد۔

یہ تینوں رشتے افزائش کے بعد والد' والدہ' بیٹی بیٹا' بہن' بھائی میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو بعد ازاں دیگر عزیز و اقارب میں تقسیم ہو جاتے ہیں۔

خاندان کا ارتقاء : مفکرین نے خاندان کے ارتقاء سے متعلق مختلف نظریات بیان کیے ہیں۔ چند اہم نظریات درج ذیل ہیں:

1- ابتداء میں انسان تنہا زندگی گذارتا تھا۔ اس میں مل جل کر رہنے کا جذبہ موجود نہ تھا لیکن انسان بیرونی ماحول کی ہیبت ناکیوں سے محفوظ رہنے کے لیے مل جل کر رہنے پر مجبور ہو گیا۔ چنانچہ جو لوگ نسلی' مذہبی یا لسانی طور پر ایک تھے وہ اکٹھے مل کر رہنے لگے۔ پھر ان میں لسانی اور مذہبی قید اٹھ گئی اور صرف ایک نسل سے تعلق رکھنے والے افراد نے خاندان کو تشکیل دیا۔

2- جو افراد شادی کے بندھن میں بندھتے تھے وہ جن بچوں کو جنم دیتے تھے وہ مکمل خاندان کی بنیاد رکھتے تھے۔

3- ابتدائی زمانہ میں عورت خاندان میں اہم حیثیت رکھتی تھی۔ وہ گھریلو ذمہ داریاں پوری کرنے کی پابند تھی اور خاندان کی کفالت بھی وہی کرتی تھی۔

خاندان کی اقسام : ماہرین عمرانیات نے خاندان کی مندرجہ ذیل قسمیں بیان کی ہیں:

(1) **پدر سری خاندان :** خاندان کی اس قسم میں باپ خاندان کا سربراہ یا حاکم اعلیٰ تصور کیا جاتا ہے۔ خاندان کے جملہ وسائل آدمی (باپ) کے ہاتھوں میں جمع رہتے ہیں اور خاندان کے

تمام افراد اسی کے حکم اور مرضی کے تابع رہتے ہیں۔ اس قسم کا خاندان مضبوط اور منظم ہوتا ہے۔

(2) مادر سری خاندان : اس قسم کے خاندان میں خاندان کی سربراہ عورت (ماں) ہوتی ہے اور خاندان کے تمام امور میں اس کی رائے فیصلہ کن ہوتی ہے۔ جائیداد یا جاگیر کی مالک بھی عورت (ماں) ہی ہوتی ہے۔ مرد بیرونی فرائض ادا کرتے اور سیر و شکار سے دل بہلاتے ہیں۔

(3) جمہوری خاندان : اس قسم کے خاندان میں تمام امور افراد خاندان کے باہمی مشورہ سے طے کیے جاتے ہیں۔ بزرگوں کے مشوروں کو اہمیت دی جاتی ہے۔

(4) مشترکہ خاندان : مشترکہ خاندان میں میاں بیوی کے علاوہ ان کے والدین' بچے' پوتے' پوتیاں' نواسے' نواسیاں اور بھائی وغیرہ سب مل کر زندگی بسر کرتے ہیں۔ مشترکہ خاندان میں بیٹے بیٹیوں کی شادیاں کر کے انہیں اپنے پاس ہی رکھتے ہیں اور پھر بیٹے بیٹیوں کی اولاد مل کر ایک مشترکہ خاندان کی بنیاد رکھتے ہیں۔ مشترکہ خاندان میں کم از کم دو خاندان ہوتے ہیں۔ اگر لڑکی شادی کے بعد اپنے سسرال میں رہے تو وہ علیحدہ خاندان تشکیل دیتی ہے۔

(5) سادہ خاندان : سادہ خاندان بہت مختصر ہوتا ہے۔ خاوند' بیوی اور ان کے غیر شادی شدہ بچے اس خاندان کی تشکیل کرتے ہیں۔ بیٹوں کی شادیوں کے بعد انہیں علیحدہ کر دیا جاتا ہے اور وہ ایک علیحدہ خاندان تشکیل دیتے ہیں۔

دیگر تقسیم : فریڈرک اینگلس نے مارگن کے حوالہ سے خاندان کی مندرجہ ذیل اقسام بیان کی ہیں۔

(1) سگوتر یا یک جدی خاندان : یہ خاندان کی پہلی منزل ہے۔ یہاں شادی پیڑھیوں کے مطابق گروہوں میں ہوتی ہے۔ خاندان کے دائرہ کے اندر سبھی دادا اور دادیاں ایک دوسرے کے شوہر اور بیوی ہوتے ہیں۔ ان کے بچوں کی یعنی ماؤں اور باپوں کی بھی یہی حیثیت ہوتی ہے اور ان کے بچوں سے پھر مشترک شوہروں اور بیویوں کا ایک تیسرا دائرہ تیار ہو جاتا ہے۔ ان کے بچے یعنی پہلی پیڑھی کی پرپوتے اور پرپوتیاں چوتھے دائرہ کے شوہر اور بیویاں بن جاتے ہیں۔ خاندان کی اس شکل میں صرف سلف اور خلف' ماں باپ اور ان کے بچے ایک دوسرے کے ساتھ شادی کے حقوق اور ذمہ داریاں قبول نہیں کر سکتے۔ بھائی' بہن' دور اور نزدیک کے چچیرے' ممیرے' پھوپھیرے بھائی بہن سب ایک دوسرے کے بھائی بہن ہوتے ہیں۔ اس منزل پر بھائی بہن کے رشتے میں یہ بات شامل ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ جنسی تعلق رکھتے ہیں۔ نتیجہ صورت میں ایسے خاندان میں ایک جوڑے کی اولاد ہو گی اور پھر ان میں ہر پیڑھی کی اولاد' سب کی سب ایک دوسرے کے بھائی بہن ہو گی اور ٹھیک اسی وجہ سے وہ سب کے سب ایک دوسرے کے شوہر بیوی ہوں گے۔

(یاد رہے کہ سگوتر خاندان آج کل مٹ چکا ہے۔)

(2) پونالوان خاندان : جب ایک ماں کی اولاد میں جنسی تعلق معیوب سمجھا جانے لگا تو لازم تھا کہ پرانی خاندانی برادریوں کی تقسیم پر ایک اور نئی خاندانی برادری کی بنیاد پر اس نئے تصور کا اثر پڑے۔ اس منزل میں بہنوں کا ایک یا ایک سے زیادہ گروہ ایک گھرانے کے بنیادی مرکز بن جاتے تھے اور ان کے سگے بھائی دوسرے گروہ کے اس طریقے سے یا اس سے ملتے جلتے کسی اور طریقے سے سگوتری یعنی یک جدی خاندان سے ترقی کر کے خاندان کی وہ شکل پیدا ہوئی جس کو مارگن نے "پونالواں خاندان" کا نام دیا ہے۔ اس کی مثال دیتے ہوئے مارگن بتاتا ہے کہ جزیرہ ہوائی کے رواج کے مطابق بہت سی بہنوں کے خواہ وہ حقیقی بہنیں ہوں یا دو تین درجوں تک ہم جدی بہنیں' مشترک شوہر ہوتے تھے جن کی وہ مشترک بیویاں ہوتی تھیں لیکن ان کے بھائیوں کو اس رشتے سے الگ رکھا جاتا تھا۔ وہ اب ان کے شوہر نہیں ہو سکتے تھے۔ یہ شوہر لوگ ایک دوسرے کو بھائی نہیں بلکہ "پونالوا" کہتے تھے۔ جس کا مطلب ہے: یارغار یا ساجھے دار۔ اسی طرح سگے یا رشتہ کے بھائیوں کے ایک گروہ کی شادی مشترکہ طور پر عورتوں کے ایک گروہ سے ہوتی تھی لیکن یہ عورتیں ان کی بہنیں نہیں ہوتی تھیں اور یہ عورتیں ایک دوسری کو "پونالوا" یعنی "سکھی" (سہیلی) کہا کرتی تھیں۔

پونالوان خاندان کی نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ خاندان کے ایک مخصوص دائرے کے اندر سبھی شوہر اور سبھی بیویاں مشترک ہوتی تھیں لیکن بیویوں کے بھائی (ابتداء میں سگے بھائی اور آگے چل کر جدی بھائی) اس دائرے سے الگ رکھے جاتے تھے اور اسی طرح دوسری طرف شوہروں کی بہنیں بھی اس دائرے سے الگ رکھی جاتی تھیں۔

پونالوان خاندان میں نسل ماں سے چلتی ہے۔

(3) جوڑا خاندان : کم یا زیادہ عرصہ کے لیے جوڑا بنا کر رہنے کا رواج گروہ وار شادی کے دنوں میں ہی یا اس سے کچھ عرصہ پہلے شروع ہو چکا تھا۔ مرد کی کئی کئی بیویاں ہوتی تھیں جن میں ایک خاص بیوی ہوتی تھی اور عورت کے متعدد شوہروں میں وہ اس کا خاص شوہر ہوتا تھا۔ پھر اس رواج کو مٹا دیا گیا اور خون کے رشتوں میں شادی کرنے کو ممنوع قرار دیدیا گیا۔

جوڑا خاندان میں ایک مرد اور ایک عورت ایک ساتھ رہتے ہیں تاہم مرد کو کئی بیویاں رکھنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ عورت جب تک مرد کے ساتھ رہتی ہے اس سے پوری وفاداری کا مطالبہ کیا جاتا ہے اور اسے زنا کاری کی سخت سزا دی جاتی ہے۔ مرد عورت جب چاہیں رشتہ ازدواج توڑ سکتے ہیں۔ اس صورت میں بچے ماں کے تصور ہوں گے۔

اینگلس کا خیال ہے کہ جوڑا خاندان کی ابتدا اس زمانے میں ہوئی جب عہد وحشت اور عہد بربریت مل رہے تھے۔ یعنی اس کی ابتداء عہد وحشت کے آخری دور میں اور کہیں کہیں بربریت کے پہلے دور میں ہوئی۔ خاندان کی یہ شکل عہد بربریت کی خصوصیت ہے۔

(4) یک زوجگی کا خاندان : جوڑا خاندان کے بعد ایک زوجگی خاندان وجود میں آیا۔ جو عہد تمدن کی ایک اہم خصوصیت ہے۔ یک زوجگی خاندان میں مرد صرف ایک ہی عورت سے شادی کرتا ہے اور مرد کو عورت پر فوقیت حاصل ہوتی ہے۔ اس کا علانیہ مقصد ایسے بچے پیدا کرنا

ہے جن کی ولدیت کے بارے میں کوئی شبہ نہ ہو۔ اس کی ضرورت اس لیے ہوتی ہے کہ وقت آنے پر بچے اپنے باپ کے اصلی وارث کی حیثیت سے اس کی دولت کا ترکہ پائیں۔

خاندان کا اسلامی تصور : اسلام کے مطابق اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کے بعد ان کے لیے ایک شریکہ حیات یعنی حضرت حوا کو پیدا فرمایا۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

هو الذی خلقکم من نفس واحدة و جعل منها زوجها لیسکن الیها

(وہی ہے جس نے تم کو ایک نفس سے پیدا کیا اور اس کے لیے خود اس کی جنس سے ایک جوڑا بنایا گیا تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔)

حضرت آدم اور حوا کے رشتہ زوجیت میں منسلک ہونے سے جو اولاد پیدا ہوئی وہ آہستہ آہستہ نسل در نسل بڑھتی چلی گئی اور پھر روئے زمین پر پھیل گئی۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- خلقکم من نفس واحدة و خلق منها زوجها و بث منهما رجالا کثیر ونساء(النساء)

(خدا نے تم کو ایک ہی جان سے پیدا کیا' پھر اس سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور دونوں سے بہت سے مردوں اور عورتوں کو دنیا میں پھیلا دیا)۔

2- **ومن آیاته ان خلق لکم من انفسکم ازواجا" لتسکنوا الیهاو جعل بینکم مودة رحمته**

(اور اس کی نشانیوں میں سے (ایک نشانی یہ بھی ہے) کہ اس نے تمہارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو اور اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کی)۔

آدم کی اولاد بڑھتی چلی گئی۔ لوگ خاندان اور قبیلوں میں مل جل کر رہنے لگے۔ قبائل کا ذکر اور مقصد قرآن مجید میں یوں بیان کیا گیا ہے:

و جعلناکم شعوبا و قبائل لتعارفوا (الحجرات)

(اور تم کو گروہ اور قبائل بنا دیا تاکہ تم آپس میں پہچانے جاؤ)۔

اسلامی خاندان کی خصوصیات :

1- اسلامی خاندان میاں بیوی کے قانونی تعلق (نکاح) سے وجود میں آتا ہے۔
2- میاں بیوی میں ایک گہرا ربط' محبت و انس اور باہمی وفاداری ہوتی ہے۔
3- میاں بیوی خاندان کے دو اہم رکن ہوتے ہیں اور دونوں ارکان پر اپنی اپنی ذمہ داریاں ہوتی ہیں جن کو پورا کرنا ان کا فرض ہوتا ہے۔
خاندان کا بڑا مقصد افزائش نسل ہے۔
میاں بیوی کے باہمی اختلاط سے بیٹے بیٹیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ اولاد آپس میں بہن

بھائی کے رشتہ میں منسلک ہوتی ہے۔ بہن بھائی کا رشتہ بے حد مقدس ہوتا ہے۔ اولاد پیدا ہونے کے ساتھ ہی عورت ماں بن جاتی ہے اور ماں کا رشتہ ازحد قابل احترام ہے۔ اولاد کے لیے ماں کی خدمت فرض ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

6- خاندان میں پرورش پانے والے بچوں کی تربیت والدین پر فرض ہے۔ اولاد کو کھلانا پلانا' پوشاک پہنانا اور ان کے لیے رزق حلال کمانا عبادت میں داخل ہے۔ ان کی بہتر تربیت کرنا' تعلیم دلوانا کار ثواب ہے۔ اولاد کی شادیاں کرنا بھی والدین پر فرض ہے۔

7- خاندان میں مل کر رہنے سے محبت و اخوت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

8- اولاد دو خاندانوں کو آپس میں متحد کرتی ہے۔ ایک طرف دادا دادی' چچا اور دوسری طرف نانا نانی اور ماموں کے رشتے بچوں کے لیے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں یعنی ایک طرف باپ کے رشتہ دار ہوتے ہیں تو دوسری طرف ماں کے رشتہ دار۔

9- خاندان میں چھوٹے بڑے کا ادب کرتے ہیں اور بڑے چھوٹوں پر دست شفقت رکھتے ہیں۔

10- خاندان کا ہر فرد اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کا پابند ہوتا ہے۔

11- خاندان کا سربراہ مرد ہوتا ہے کیونکہ اسلام نے مرد کو عورت پر سردار (قوام) مقرر کیا ہے۔ عورت چونکہ صنف نازک ہے اس لیے اس پر زیادہ ذمہ داریاں عاید نہیں کی گئیں۔ وہ صرف امور خانہ داری کی ذمہ دار ہے۔ روزی کمانا اس پر فرض نہیں ہے۔ بیوی بچوں اور خاندان کے لیے روزی کمانا مرد پر فرض ہے۔

12- خاندان کے افراد جنسی بے رہروی اور فحاشی سے محفوظ رہتے ہیں۔ ایک خاندان میں خصوصی طور پر ماں' بچی' بیٹا' باپ' دادا' دادی' چچا' بھتیجی' پھوپھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ تمام رشتے مقدس ہیں اور ان میں سے کسی کے ساتھ بھی نکاح جائز نہیں۔

13- خاندان کے افراد ذاتی اغراض کے بجائے اجتماعی مفادات کا خیال رکھتے ہیں۔ اس طرح ان میں ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔

14- اولاد والدین کی بہتر طور پر خدمت کرتی ہے۔ بیٹے جب جوان ہو جاتے ہیں تو وہ باپ کا ہاتھ بٹاتے اور خود کمائی کر کے خاندان کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔

15- خاندان میں عورتوں کو ہر طرح کا تحفظ حاصل ہوتا ہے۔ عورت کی عزت و ناموس کا تحفظ مردوں پر فرض ہے۔ عورت ماں' باپ کی "عزت" اور خاوند کی "غیرت" قرار دی جاتی ہے۔ چنانچہ اپنی عزت اور غیرت کو برقرار رکھنے کے لیے عورت کے لیے ایک قلعہ ثابت ہوتے ہیں۔

16- پورا خاندان ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک ہوتا ہے اور مصائب کا مقابلہ مل کر کیا جاتا ہے۔

17- دینی امور میں ایک دوسرے کو نصیحت کی جاتی ہے' عبادات کا درس دیا جاتا ہے' اولاد کو اسلامی طور طریقے سکھائے جاتے ہیں اور انہیں دینی تعلیم دلوائی جاتی ہے۔ بچے کا پہلا

مدرسہ اس کی ماں کی گود اور پھر اس کا گھر ہوتا ہے جہاں اسے ابتدائی تربیت دی جاتی ہے۔ خاندان میں کسی فرد کے غلط کام کرنے یا بے رہروی اختیار کرنے پر اس کو ابتداء ہی میں ٹوک کر صحیح راستہ اختیار کرنے کا درس دیا جاتا ہے۔ گھر کے بزرگ چھوٹوں کے نگران ہوتے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔

18- گھر کے سربراہ کے احکام پر عمل کرنے سے اطاعت اور فرمانبرداری کی عادت پیدا ہوتی ہے۔ یہی عادت احکام الٰہی اور حکومت کے قوانین پر عمل کرنے میں ممد معاون ثابت ہوتی ہے۔

19- ایک اسلامی خاندان معاشرہ کی تشکیل کے لیے بہترین اکائی ثابت ہوتا ہے۔ مہذب خاندانوں کے اجتماع سے ایک مہذب معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

20- اسلام میں دین و سیاست دو چیزوں کے نام نہیں۔ ایک اسلامی خاندان میں چونکہ دینی احکام پر عمل کی تربیت دی جاتی ہے اس لیے خاندان کے افراد بہترین شہری اور بہترین سیاستدان بن سکتے ہیں۔

21- اسلامی خاندان میں حقوق و فرائض کی ادائیگی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی امور سماجی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے کار آمد ہوتے ہیں۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ خاندان شہریت کی پہلی درسگاہ ہے۔

حقوق الزوجین

سوال : میاں بیوی خاندان کے دو اہم رکن ہیں۔ اسلام کی روشنی میں میاں بیوی کے تعلقات اور حقوق و فرائض پر روشنی ڈالیے۔

جواب : مرد عورت (تزویج) : مرد اور عورت خاندان کے دو اہم رکن ہیں۔ ان دونوں کے اختلاط سے خاندان پیدا ہوتا ہے۔ خاندان کی تشکیل کے لیے ایک مرد اور ایک عورت کا ہونا ضروری ہے۔ اسی لیے اسلام میں نکاح کو نہایت اہمیت دی گئی ہے۔

ارشاد خداوندی ہے:

1- خلق لکم من انفسکم ازواجا" لتسکنوا الیھا
(اس نے تمہارے لیے خود تم ہی میں سے جوڑے پیدا کر دیئے تاکہ تم ان کے پاس سکون حاصل کرو۔)

2- وانکحوا الایامی منکم و الصالحین من عبادکم و امائکم ان یکونوا فقرا یغنھم من فضلہ (النور)

(اور اپنے میں سے بن شوہروں کی عورتوں کا (خواہ وہ کنواری ہوں یا رانڈ) اور اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے صالحوں کا نکاح کر دیا کرو اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ ان کو اپنی مہربانی سے غنی کر دے گا)۔

-3 ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات المومنات فمن ما ملکت ایمانکم من فتیاتکم المومنات واللہ اعلم بایمانکم بعضکم من بعض (النساء)

(اور جو تم میں سے اس کی قدرت نہ رکھتا ہو کہ شریف مومن عورتوں سے نکاح کر سکے تو تمہاری ان مومن باندیوں میں سے کسی سے نکاح کر لے جو تمہارے قبضہ میں ہو اور اللہ تمہارا ایمان زیادہ جانتا ہے۔ تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو)۔

نکاح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا:

"میں تو عورتوں سے نکاح کرتا ہوں تو جس نے میرے طریقہ سے روگردانی کی پس وہ مجھ سے نہیں۔"

میاں بیوی کے باہمی تعلقات : نکاح کا مقصد صرف فرض ادا کرنا ہی نہیں بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی فطرت کی تسکین بھی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے میاں بیوی کے باہمی اخلاص و محبت کو اپنی نشانی قرار دیتے ہوئے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ:

"اور اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ اس نے تمہاری جنس سے تمہاری بیویاں پیدا کیں' تاکہ تم ان کے پاس سکون پاؤ اور تمہارے آپس میں پیار اور محبت پیدا کر دی۔"

میاں بیوی کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ان دونوں کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے گئے ہیں' تاکہ دونوں میاں بیوی حدود اللہ کو قائم رکھیں۔

ان یقیما حدود اللہ (البقرہ)

"(یہ کہ میاں بیوی) دونوں اللہ کی حدود کو قائم رکھیں۔"

حقوق الزوجین : "زوج" کے معنی ہیں جوڑا۔ اس کی جمع "ازواج" ہے۔ یہ مذکر و مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ "زوجین" سے مراد ہے۔ میاں اور بیوی' حقوق الزوجین سے مراد وہ حقوق ہیں جو میاں بیوی دونوں پر ایک دوسرے کے لیے عائد ہوتے ہیں۔ قرآن نے میاں بیوی پر علیحدہ علیحدہ حقوق و فرائض متعین کیے ہیں اور عورت کے حقوق کو وسعت قلبی سے تسلیم کیا ہے۔

ولھن مثل الذی علیھن (البقرہ)

(اور عورتوں کے بھی حقوق ہیں جیسے مردوں کے۔)

مگر انتظامی اعتبار سے مرد عورت میں مساوات مشکل امر ہے۔ جس طرح ایک ملک میں دو بادشاہ حکمران نہیں ہو سکتے اسی طرح گھر کی محدود ریاست میں میاں بیوی دونوں کا برابر سکہ نہیں

چل سکتا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انتظامی امور کی سرداری مرد کو تفویض کر دی ہے اور اسے عورت پر حاکم قرار دیا ہے۔

> **الرجال قوامون علی النساء بما فضل اللہ بعضھم علی بعض وبما انفقوا من اموالھم فالصالحات قانتت حافظات للغیب بما حفظ اللہ** (النساء)
>
> ترجمہ: مرد عورتوں پر قوام ہیں' بوجہ اس فضیلت کے جو اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر دی ہے اور بوجہ اس کے کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ پس صالح عورتیں اطاعت شعار اور غیب کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں۔ اللہ کی حفاظت کے تحت۔

بیوی کے حقوق اور شوہر کے فرائض : بیوی کے مندرجہ ذیل حقوق اس کے شوہر پر فرض ہیں:

1- نان و نفقہ۔
2- مہر۔
3- عدل و انصاف۔
4- حسن سلوک۔
5- محبت۔
6- نازبرداری۔
7- بے تکلفی۔
8- امداد و رہنمائی۔
9- رازداری۔
10- طلاق دینے سے پرہیز۔
11- بیوی کے رشتہ داروں اور سہیلیوں سے اچھا سلوک۔

نان و نفقہ : بیوی کا سب سے پہلا حق یہ ہے کہ شوہر اس کی ضروریات زندگی کو پورا کرے۔ ایک حدیث میں مذکور ہے کہ:

> "ایک شخص نے آ کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیوی کا حق شوہر پر کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: جیسا کھائے ویسا اسے کھلائے' جیسا خود پہنے ویسا اس کو پہنائے' نہ اس کے منہ پر تھپڑ مارے اور نہ اس کو برا بھلا کہے اور نہ سزا کے طور پر اسے گھر سے نکالے۔"

"نفقہ" کے لفظی معنی خرچ کرنے اور نکالنے کے ہیں۔ فقہ کی اصطلاح میں نفقہ سے مراد اس خرچ کی ذمہ داری ہے جو شوہر پر عائد ہوتی ہے۔ نفقہ میں بالعموم تین چیزوں کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہوتی ہے۔

1- خوراک۔ 2- لباس۔ 3- مسکن۔

لیکن نفقہ میں دیگر ضروری اشیاء مثلاً صابن' تیل' پانی' دوا وغیرہ اور وہ اشیاء جو عورت کے گذارہ اور آرام و آسائش کے لیے ضروری ہوں بھی شامل ہیں۔

نفقہ کے جواز کے لیے قرآن مجید کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے :

و علی المولود لہ رزقھن و کسو تھن بالمعروف (البقرہ)

(بچے کے باپ کو اس کو معروف طریقے سے انہیں کھانا اور کپڑا دینا ہو گا)۔

حدیث نبوی ہے کہ :

"تم پر ان کا لباس اور کھانا پینا رواج کے مطابق لازم ہے۔)

نفقہ کے وقت وجوب کے بارے میں امام مالک کی رائے ہے کہ یہ اس وقت سے لازم ہے جب شوہر اس سے دخول کر چکا ہو' یا دخول کا دعوئی ہو۔

امام ابو حنیفہ اور امام شافعی کا قول ہے کہ اگر عورت بالغ اور نابالغ مرد پر بھی نفقہ لازم ہے اور اگر شوہر بالغ اور بیوی نابالغ ہو تو امام شافعی کے دو اقوال ہیں ایک یہ کہ جو امام مالک کا قول ہے اور دوسرا یہ کہ اسے مطلقاً" نفقہ ملے گا۔ بعض فقہاء کا کہنا ہے کہ نفقہ کے لیے عمر کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ بیوی جماع کی مشقت برداشت کر سکتی ہے یا نہیں؟ اگر برداشت کر سکتی ہے تو نفقہ واجب ہو گا خواہ مرد نابالغ ہو اور اس سے صحبت پر قادر نہ ہو۔

مقدار نفقہ کے بارے میں امام مالک کی رائے یہ ہے کہ شرعاً" مقدار نفقہ متعین نہیں ہے اور مقدار نفقہ میں فرق ہے۔ امام شافعی کے نزدیک نفقہ کی مقدار مقرر ہے یعنی فراخ دست پر دو مد' متوسط پر ڈیڑھ مد اور تنگ دست پر ایک مد لازم ہے۔ حنفیوں کے نزدیک نفقہ میں عورت کے مرتبہ و حیثیت کا خیال رکھا جاتا ہے اور شافعیہ میں مرد کے رتبہ اور حیثیت کا لحاظ۔ اگر عورت مالدار ہو اور مرد تنگ دست ہو تو حنفیہ کے نزدیک اس پر متوسط درجہ کا نفقہ واجب ہو گا اور شافعیہ کے مطابق اس پر تنگ دست کا نفقہ واجب ہو گا۔

بعض فقہاء کے نزدیک بیوی کے خادم کا نفقہ بھی لازم ہے۔ بعضوں نے باندی کا نفقہ بھی واجب قرار دیا ہے۔

مندرجہ ذیل صورتوں میں مرد پر عورت کا نفقہ واجب نہیں۔

1- جب زوجہ اتنی کم عمر ہو کہ جماع کی مشقت برداشت نہ کر سکے۔

2- جبکہ زوجہ اس قدر بیمار ہو کہ بعد عقد رخصت ہو کر خاوند کے گھر نہ آ سکتی ہو لیکن اگر شوہر کے گھر میں بیمار ہو تو نفقہ واجب ہو گا۔

3- جب عورت کہیں ملازمت اختیار کر لے اور شوہر کے منع کرنے کے باوجود گھر سے باہر رہتی ہو۔

4- جبکہ عورت ناشزہ (نافرمان) ہو۔ بیوی کی نافرمانی یہ ہے کہ وہ شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے چلی جائے یا اگر مکان عورت کا ہو تو شوہر کو اس مکان میں نہ آنے دے لیکن اگر شوہر کے گھر میں رہتے ہوئے شوہر کو ہمبستری سے منع کرے تو نشوز (نافرمانی) نہیں ہے۔

5- جب کہ عورت بلاوجہ جائز شوہر سے علیحدہ رہے یا اس کے ساتھ دوسرے شہر جانے سے انکار کرے۔
6- جبکہ عورت مرتد ہو گئی ہو۔
7- جبکہ تفریق عورت کی معصیت کے سبب واقع ہوئی ہو۔
8- جب کہ کوئی غیر مرد عورت کو غصب کر کے لے جائے۔

نفقہ عورت کا حق ہے اور جب کوئی شخص استطاعت کے باوجود اپنی بیوی کو نفقہ نہ دے تو اس صورت میں عورت کا زبردستی ایسے مرد کے ساتھ رشتہ ازدواج میں بندھا رہنا لازم نہیں۔ وہ قانونی طور پر شوہر سے علیحدگی کا مطالبہ کر سکتی ہے۔

ایک موقعہ پر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عورت کو جائز ضروریات پوری کرنے کے لیے اپنے شوہر کے مال میں سے اس کی اجازت کے بغیر خرچ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مہر: "مہر" اس رقم کو کہتے ہیں جو حق زوجیت کے عوض بیوی کو دی جاتی ہے۔ مہر کو عربی زبان میں "صداق" "اجر" اور "نحلہ" بھی کہتے ہیں۔

وجوب مہر کے بارے میں سورۃ النساء کی یہ آیات بیان کی جاتی ہیں:

1- **واتوا النساء صدقتهن نحلة**
(اور عورتوں کے مہر خوشدلی سے ادا کرو۔)

2- **فانكحوا هن باذن اهلهن واتوهن أجورهن**
(ان کے سرپرستوں کی اجازت سے ان سے نکاح کر لو اور معروف طریقے سے ان کے مہر ادا کرو۔)

3- مہر میں مال کا تصور بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے۔

واحل لكم ماوراء ذلكم ان تبتغوا اموالكم
(حلال کیں تمہارے واسطے علاوہ ان عورتوں کے کہ تم خواہش کرو ان کی مال کے بدلے میں)

حنفی فقہ میں کم از کم مہر کا تعین کر دیا گیا ہے لیکن زیادہ کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ شیعہ مسلک میں کم از کم مہر کا تعین نہیں کیا گیا۔ حنفی اور شافعی فقہ کے مطابق مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے۔ امام مالک کے نزدیک کم از کم مقدار تین اور بقول بعض پانچ درہم ہے۔

مہر ہر وہ شے بن سکتی ہے جسے ملک بنایا جا سکتا ہو اور جو کسی شے کا عوض بن سکتی ہو۔ بالفاظ دیگر مہر ایسی جائز شے قرار پا سکتا ہے جو اپنے اندر مالیت رکھتا ہو اور اس پر قبضہ اور تصرف ممکن ہو۔

مہر یا تو بوقت دخول ہے یا بوقت موت۔ مہر کے وقت دخول واجب نہ ہونے کے بارے میں سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

وان اردتم استبدال زوج مكان زوج و اتيتم احدا هن قنطارا فلا تاخذوا منه شيئا

(اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لے آنے ہی کا ارادہ کر لو تو خواہ تم اسے ڈھیر سا مال ہی کیوں نہ دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لینا۔)

جو فقہاء دخول کے وقت مہر کو واجب قرار دیتے ہیں' وہ اپنی دلیل میں یہ آیت پیش کرتے ہیں:

وکیف تاخذونہ وقد افضی بعضکم الی بعض (النساء)

(اور آخر تم اسے کس طرح لے لو گے جب کہ تم ایک دوسرے سے لطف اندوز ہو چکے ہو۔)

حنفیوں کے نزدیک مہر نکاح کے جواز کی ایک شرط ہے اور مہر کے بغیر نکاح جائز نہیں لیکن امام شافعی کے نزدیک مہر نکاح کی شرط نہیں اور نکاح بغیر مہر کے جائز ہے۔

مہر کی ادائیگی کی ذمہ داری براہ راست شوہر پر عائد ہوتی ہے لیکن اگر یہ نکاح بحالت صغیر سنی اس کے ولی نے کیا ہو تو اس صورت میں مہر کی ذمہ داری ولی پر ہو گی اور شوہر کے بالغ ہو جانے پر نکاح قائم رکھنے کی صورت میں مہر کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہو جائے گی۔

معاہدہ نکاح میں مہر کی ادائیگی کے بارے میں کوئی صراحت نہ ہونے کی صورت میں پورا مہر معجل متصور ہو گا۔

خلوت صحیحہ کے بغیر طلاق یا تنسیخ نکاح کی صورت میں مرد کے ذمہ نصف مہر واجب الادا ہو گا۔ خلوت صحیحہ کے بعد اگر طلاق دی جائے یا نکاح فسخ ہو جائے تو کل مہر فی الفور واجب الادا ہو گا۔

مہر وصول کرنے کا اختیار بالغہ عورت کو بذات خود حاصل ہے۔ اگر نابالغہ ہو تو اس کا باپ یا ولی مہر وصول کر سکتا ہے۔ زوجہ بالغہ اپنے مہر کا کل یا جزو ہبہ کر سکتی ہے۔

جب تک عورت اپنے نفس کو شوہر کے سپرد نہیں کرتی اس وقت تک اسے اختیار ہے کہ مہر معجل کی عدم ادائیگی کے سبب شوہر کے ساتھ رہنے اور اسے مجامعت کا موقع دینے سے انکار کر دے۔

مہر ایک قرض کی نوعیت ہے جو عدم ادائی کی صورت میں شوہر کی وفات سے ساقط نہیں ہوتا بیوہ کو حق ہے کہ وہ اپنا مہر متوفی کی جائیداد سے وصول کرے۔

زوجین میں سے کسی ایک کے مر جانے کی صورت میں مرد کے ذمہ پورا مہر واجب ہو گا۔ خواہ خلوت صحیحہ ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو۔ البتہ نکاح فاسد کی صورت میں اگر خلوت صحیحہ نہ ہوئی ہو اور زوجین میں سے کسی ایک کی موت واقع ہو جائے تو کوئی مہر واجب نہ ہو گا۔

عدل و انصاف : مرد کا فرض بیوی کے ساتھ عدل و انصاف کرنا بھی ہے۔ ایک بیوی کے سلسلے میں بھی پورے حقوق کی ادائیگی کا حکم ہے۔ اگر ایک سے زائد بیویاں ہو تو ان میں باہمی عدل و انصاف قائم کرنے کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ بیویوں کے درمیان عدل و انصاف کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کے ساتھ یکساں سلوک کرے۔ رہنے سہنے' کھانے پینے اور تقسیم اوقات میں برابری کرے اور کسی کے ساتھ کوئی امتیازی سلوک نہ کرے۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ:

فان خفتم الا تعدلوا فواحدة (النساء)
(اگر تمہیں خوف ہو کہ (زیادہ بیویوں کے درمیان) انصاف نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کرو۔)

سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے:

فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقہ
(پس تم ایک ہی طرف نہ جھک جاؤ کہ دوسری کو لٹکی (ہوئی چھوڑ دو)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"جو شخص بیویوں میں امتیاز رکھے گا' اس کا نصف بدن قیامت کے دن ٹیڑھا ہو گا۔"

حسن سلوک : قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

وعاشروھن بالمعروف
(اور ان (عورتوں) کے ساتھ حسن سلوک سے رہو۔)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

خیر کم خیر کم لاھلہ (ترمذی' ابن ماجہ)
(تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنی بیوی کے حق میں بہتر ہے۔)

اسلام نے عورت کے معاملہ میں نرمی' تحمل اور احتیاط سے کام لینے کا حکم دیا ہے۔ بعض اوقات مرد ستانے اور تنگ کرنے کے لیے بیوی کو روک رکھتے ہیں۔ یہ امر "تعدی" کہلاتا ہے۔ قرآن مجید میں اس امر سے منع کیا گیا ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ:

"ان کو محض ستانے کے لیے نہ روک رکھو' یہ زیادتی ہو گی اور جو ایسا کرے گا وہ اپنے اوپر ظلم کرے گا۔"

محبت : شوہر کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ بیوی سے محبت کا اظہار کرے۔ شوہر کی محبت بیوی کا حق ہے۔ جو اسے ملنا چاہیے۔ اس سے ایک فائدہ یہ ہے کہ گھر کے ماحول میں خوشگواری پیدا ہوتی ہے اور عورت میں وفاداری اور عفت و پاکدامنی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ عورت کو اگر خاوند سے بھرپور محبت ملے تو وہ کسی غیر مرد کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتی۔

نازبرداری : عورت کی فطرت ہے کہ وہ کبھی کبھی ناز و انداز دکھا کر اپنی اہمیت کو جتانا چاہتی ہے۔ اس کے اس فطری تقاضا کو دبانا نہیں چاہیے۔ شوہر کا فرض ہے کہ وہ بیوی کی جائز ناجائز نازبرداری کرے تاکہ ازدواجی زندگی میں حسن پیدا ہو۔

بے تکلفی : خاوند کا یہ بھی فرض ہے کہ بیوی کے ساتھ بے تکلفی کی زندگی بسر کرے۔ اس بے تکلفی کے بغیر گھر کے ماحول میں رعنائی پیدا نہیں ہو سکتی۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات سے بڑی بے تکلفی اور شگفتہ مزاجی کے ساتھ پیش آتے تھے۔

امداد اور رہنمائی : مرد کو چاہیے کہ گھر کے کاموں میں بیوی کا ہاتھ بٹائے اور اس کی رہنمائی کرے۔

رازداری : شوہر کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ بیوی کے رازوں کو پوشیدہ رکھے کیونکہ ان رازوں کا افشاء مرد کے لیے بے عزتی کا باعث بن سکتا ہے۔ قرآن مجید میں مرد اور عورت کو ایک دوسرے کا لباس قرار دیا گیا ہے۔

هن لباس لكم و انتم لباس لهن
(عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم عورتوں کے لیے لباس ہو۔)

یعنی میاں بیوی ایک دوسرے کے پردہ پوش ہیں۔

طلاق سے پرہیز : عورت کو طلاق دینا اسلام کی نگاہ میں ایک مذموم فعل ہے جس کی اجازت صرف انتہائی ناسامد حالات اور انتہائی مجبوری کے عالم میں ہے۔

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے۔

"طلاق حلال چیزوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز ہے۔"

چنانچہ مرد کو چاہیے کہ وہ معمولی معمولی باتوں پر عورت کو طلاق کی دھمکیاں نہ دے۔ اسے صبرو تحمل سے کام لینا چاہیے۔

رشتہ داروں اور سہیلوں سے اچھا سلوک : خاوند کو چاہیے کہ بیوی کے رشتہ دار اور اس کی سہیلیوں سے اچھا سلوک کرے۔

بیوی کے مخصوص قانونی و شرعی حقوق : عورت (بیوی) کو قانونی اور شرعی طور پر مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہیں:

1- خلع
2- خیار بلوغ۔
3- لعان۔
4- میراث۔

خلع : عورت ظالم اور بداخلاق شوہر سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے "خلع" کے طریقہ پر عمل کر سکتی ہے۔ خلع سے مراد ہے زوجہ کی مرضی اور خواہش پر حاکم کا زوجہ کو اس کے خاوند کی زوجیت سے آزاد کرنا۔ بعضوں کے نزدیک خلع کا مفہوم یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے مال لے کر ملک نکاح سے دستبردار ہو جائے۔

خلع میں عام طور پر بیوی اپنے مالی حقوق سے جو اسے خاوند کی طرف سے حاصل ہوتے ہیں دستبردار ہو جاتی ہے۔ مثلاً حق مہر، ہبہ وغیرہ اور بعض اوقات اسے خاوند کے مالی نقصان کے ازالہ کے لیے کچھ بدل دینا پڑتا ہے۔

خلع کے جواز میں سورۃ البقرہ کی یہ آیت پیش کی جاتی ہے۔

فلا جناح علیکم فیما افتدت به
(مضائقہ نہیں کہ عورت اپنے شوہر کو کچھ معاوضہ دے کر علیحدگی حاصل کر لے۔)

خیار بلوغ : اگر کسی لڑکی کا نکاح باپ اور دادا کے علاوہ کسی اور سرپرست نے بالغ ہونے سے پہلے کر دیا ہو تو اس کو بالغ ہونے پر یہ اختیار حاصل ہو گا کہ اگر وہ چاہے تو اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر کے نکاح کو فسخ کر دے۔

لعان : فقہی اصطلاح میں زوجین میں سے ہر ایک کی جانب سے قسم کے ساتھ اللہ کی لعنت اور غضب کی شہادت دینا "لعان" کہلاتا ہے۔ لعان شوہر کے حق میں جھوٹی تہمت اور عورت کے حق میں زنا کی حد کا قائم مقام ہوتا ہے۔ چنانچہ اگر شوہر اپنی بیوی پر زنا کی تہمت لگائے اور چار چشم دید گواہ پیش نہ کر سکے تو اس پر لازم ہو گا کہ یا تو وہ اپنے الزام کے جھوٹا ہونے کا اقرار کرے (اس صورت میں اس پر جھوٹا الزام لگانے کی شرعی حد 80 درے نافذ ہو گی)۔ یا پھر لعان کرے۔

شوہر اگر بیوی پر زنا کا الزام لگائے اور گواہ پیش نہ کر سکے تو عورت کو لعان کا حق ملتا ہے۔ یہ گویا اس الزام کی تردید کا طریقہ ہے۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شوہر چار بار قسم کھاتا ہے کہ اس نے جو الزام لگایا ہے وہ درست ہے اور پانچویں مرتبہ کہتا ہے کہ اگر وہ جھوٹا ہو تو اس پر اللہ کی لعنت۔ اسی طرح عورت بھی قسمیں کھا کر اپنی سچائی کا اظہار کرتی ہے۔ اس کے بعد میاں بیوی میں تفریق واقع ہو جاتی ہے۔

میراث : شوہر کی وفات پر بیوی کو اس کے ترکہ میں سے وراثت ملتی ہے۔ اگر شوہر کی اولاد ہو تو اس کو آٹھواں حصہ ملے گا اور اگر اولاد نہ ہو تو اس کو ترکہ کا چوتھا حصہ ملے گا۔

شوہر کے حقوق اور بیوی کے فرائض : شوہر کو بیوی پر مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہیں:

(1) اطاعت و فرمانبرداری
(2) محبت
(3) تحفظ عصمت
(4) صبر و قناعت
(5) تحفظ مال و مکان
(6) آرائش و زیبائش
(7) سلیقہ شعاری
(8) خدمت
(9) عزت و احترام
(10) گھر میں دلچسپی کا سامان پیدا کرنا
(11) تربیت اولاد
(12) امداد شوہر
(13) رشتہ داروں اور دوستوں سے حسن سلوک

اطاعت و فرمانبرداری : بیوی پر فرض ہے کہ وہ خاوند کے احکام کی متابعت کرے کیونکہ وہ گھر کا حاکم و سردار ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

فالصالحات قانتات
(نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں۔)

آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ :

1- "اگر غیر اللہ کے آگے سجدہ جائز ہوتا تو میں حکم دیتا کہ بیوی اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔"

2- اگر بیوی اس حالت میں مرے کہ اس کا خاوند اس سے راضی ہو تو وہ جنت میں جائے گی۔

3- کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عورتوں میں سے افضل عورت کونسی ہے؟ آپ نے فرمایا "وہ کہ جب مرد اس کو دیکھے تو خوش ہو جائے' مرد کوئی حکم دے تو اسے فوراً" بجا لائے اور اپنے جان و مال میں خاوند کی ایسی مخالفت نہ کرے جو اس پر ناگوار گذرے۔"

محبت : شوہر کا ایک حق بیوی پر یہ بھی ہے کہ وہ اس سے محبت کرنے والی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں رشتہ زوجین کا ایک مقصد محبت و شفقت کو قرار دیا ہے۔ سورۃ الروم میں فرمایا گیا ہے :

"اس نے تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی۔"

تحفظ عصمت : عورت مرد کی عزت و آبرو ہے۔ عفت و پاکدامنی اور عزت و ناموس عورت کا سب سے بڑا جوہر ہے' جس کی حفاظت کرنا اس کا فرض ہے۔

سورۃ النساء میں فرمایا گیا ہے :

فالصالحات قانتات حافظات للغیب بما حفظ اللہ

(نیک بیبیاں فرمانبردار ہوتی ہیں اور خاوند کی غیر حاضری میں ان چیزوں کی حفاظت کرتی ہیں جن کی حفاظت اللہ نے ان کے سپرد کی ہے۔"

فرمان نبوی ہے کہ :

1- "بہترین عورت وہ ہے کہ جب اس کا خاوند غائب ہو تو وہ اپنے نفس کی حفاظت کرے۔"

2- "مرد کا عورت پر ایک حق یہ ہے کہ وہ شوہر کی عدم موجودگی میں اس کے بستر کو پامال نہ کرائے۔"

صبر و قناعت : عورت کو اپنے شوہر سے جائز ضروریات کا مطالبہ کرنا چاہیے اور ناشکرے پن کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اسے خاوند کی کمائی میں گذر بسر کرنی چاہیے اور خاوند کو رزق حلال کمانے کی ترغیب دینی چاہیے۔

تحفظ مال و مکان : عورت کا فرض ہے کہ وہ شوہر کے گھر اور اس کے مال و متاع کی حفاظت کرے اور شوہر کی اجازت کے بغیر کچھ خرچ نہ کرے اور نہ دوسروں کو کوئی چیز دے۔

حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ :

"عورت مرد کے گھر کی نگران ہے' اس سے اس کی باز پرس ہو گی۔"

آرائش و زیبائش : عورت کا ایک اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے خاوند کے لیے اپنی زیبائش میں کوتاہی نہ کرے۔ اسلام نے عورت کو اپنے شوہر کو خوش رکھنے کے لیے بناؤ سنگھار کی اجازت دی ہے لیکن یہ زیبائش فضول خرچی میں داخل نہیں ہونی چاہیے۔ اسلام نے اس زیبائش کو نامحرموں سے چھپانے کا حکم بھی دیا ہے۔

سلیقہ شعاری : سلیقہ شعاری عورت کا زیور ہے۔ اسے تمام امور میں سلیقہ شعاری سے کام لینا چاہیے۔ اس مقصد کے لیے اسے تمام گھریلو کام سیکھنے چاہئیں اور ان میں مہارت حاصل کرنی چاہیے۔

خدمت : بیوی کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے خاوند کی ہر طرح سے خدمت کرے۔ اس کے آرام و سکون کا بیحد خیال رکھے۔

عزت و احترام : بیوی کو اپنے شوہر کی عزت اور احترام میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھنی چاہیے۔ شوہر کے ساتھ بدکلامی اور بد مزاجی سے جہاں تک ہو سکے پرہیز کرنا چاہیے۔

گھر میں دلچسپی کا سامان پیدا کرنا : بیوی کو اپنی شخصیت میں اتنی کشش پیدا کرنی چاہیے کہ اس کا شوہر بجائے باہر آوارہ گردی کرنے کے گھر میں بیٹھ کر گھر کے کاموں میں اس کا ہاتھ بٹائے اور بچوں کی تربیت میں اپنا کردار ادا کرے۔

ایک حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے:

"اپنے گھروں کو وسعت دو یعنی گھر میں بیٹھو۔"

اولاد کی تربیت : بچوں کی تربیت ماں کا فرض ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے "حضانت" کا مسئلہ پیش آتا ہے۔ شرعی اصطلاح میں ماں یا شرعی مستحق کے کسی چھوٹے بچے کی پرورش کرنے کو "حضانت" کہتے ہیں۔

بعض فقہاء کی رائے ہے کہ بیوی پر شوہر کے بچوں کو دودھ پلانا واجب ہے اور بعض کے نزدیک بالکل واجب نہیں ہے۔ بعض کے نزدیک معمولی عورت پر لازم ہے اور شریف و معزز پر واجب نہیں۔ الا یہ کہ بچہ صرف اسی کا دودھ پیئے۔ مطلقہ عورت پر بچے کو دودھ پلانا لازم نہیں الا یہ کہ بچہ اس کے سوا کسی کا دودھ نہ پیئے۔ لیکن اس صورت میں شوہر اس کو دودھ پلانے کی اجرت ادا کرے گا جیسا کہ سورۃ الطلاق میں فرمایا گیا ہے:

فان ارضعن لکم فاتو ھن اجورھن

(پھر اگر وہ تمہارے لیے (بچہ کو) دودھ پلائیں تو ان کی اجرت انہیں دو۔)

بہر حال بچوں کی پرورش کرنا ماں کا اہم فریضہ ہے۔

امداد شوہر : بیوی کو شوہر کے کاموں میں کچھ مدد کر دینی چاہیے تاکہ اس کا بوجھ ہلکا ہو اور شوہر محسوس کرے کہ میرا ایک معاون موجود ہے۔

رشتہ داروں اور دوستوں سے حسن سلوک : بیوی کا فرض ہے کہ وہ شوہر کے رشتہ داروں اور دوستوں سے حسن سلوک سے پیش آئے۔ اسے خصوصاً ساس' سسر' نند اور دیور سے اچھا برتاؤ کرنا چاہیے تاکہ ان میں نزاع پیدا ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔

شوہر کے مخصوص شرعی و قانونی حقوق : شوہر کو بیوی پر مندرجہ ذیل شرعی و قانونی حقوق حاصل ہیں:

1- طلاق۔
2- میراث۔

طلاق : طلاق کو اسلام میں مذموم فعل قرار دیا گیا ہے لیکن اگر کوئی چارہ کار نہ ہو اور بیوی سمجھانے بجھانے کے باوجود راہ راست پر نہ آئے تو خاوند کو حق حاصل ہے کہ وہ اسے طلاق دے کر رخصت کر دے۔ اسلام میں طلاق دینے کا حق صرف مرد کو حاصل ہے' عورت کو یہ حق حاصل نہیں۔

میراث : بیوی کی وفات پر شوہر کو بیوی کے ترکہ میں سے وراثت کا حق بھی ملتا ہے۔ اگر اس کی بیوی کی اولاد نہ ہو تو اسے ترکہ کا آدھا حصہ ملتا ہے' اگر اس کی اولاد ہو تو مرد کو چوتھا حصہ ملتا ہے۔

والدین کے حقوق و فرائض

سوال : والدین کے حقوق و فرائض پر قرآن و سنت کے حوالہ سے روشنی ڈالئے؟

یا

مندرجہ ذیل پر نوٹ لکھیے:

(الف) والدین کے حقوق

(ب) اولاد کے حقوق

جواب : حقوق الوالدین کی اہمیت :

بچوں کی نشوونما میں والدین کی جسمانی اور دماغی قوتیں کارفرما ہوتی ہیں' اس لئے وہ ان کے سب سے بڑے محسن ہوتے ہیں۔ اسلام میں خدا اور رسول کے بعد انسانی رشتوں میں والدین کا رتبہ سب سے بڑا ہے' اور خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ ان کی اطاعت کو بھی ضروری قرار دیا گیا ہے۔

سورۃ الاحقاف میں فرمایا گیا ہے:

ووصينا الانسان بوالديه احسانا حملته امه كرها ووضعته كرها

(اور ہم نے انسان کو حکم دیا ہے کہ وہ اپنے والدین کے ساتھ احسان کرے۔ اس کو اس کی ماں نے بڑی تکلیف سے اٹھایا اور جنا)

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

وبالوالدین احسانا

(اور والدین سے حسن سلوک سے پیش آنا)

سورۃ لقمان میں اللہ تعالیٰ نے ادائے شکر کے حکم میں والدین کو اپنے ساتھ شامل کرتے ہوئے فرمایا ہے:

انا اشکرلی ولوالدیک

(تو میرا اور اپنے والدین کا شکر ادا کر)۔

والدین کے اولاد پر اس قدر احسانات ہیں کہ انہیں شمار کرنا مشکل ہے۔ اگر اولاد تمام عمر ان کی خدمت میں صرف کر دے تو بھی وہ حق ادا نہیں ہو سکتا۔ والدین عمر بھر آرزوؤں اور تمناؤں سے طرح طرح کی قربانیاں دے کر اولاد کو پروان چڑھاتے ہیں۔ بچوں کی ہلکی سی مسکراہٹ سے کھل اٹھتے ہیں اور ان کی ذرا سی تکلیف سے ان پر مردگی طاری ہو جاتی ہے۔ والدین کی یہی تمنا ہوتی ہے کہ ان کی اولاد پھولے پھلے اور ضعیفی میں ان کا سہارا بنے۔

اسلام نے والدین کے حقوق متعین کئے ہیں اور انہیں پورا کرنے کی تاکید کی ہے۔

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

"والدین کی رضا مندی میں خدا کی رضا مندی اور والدین کی ناراضگی میں خدا کی ناراضگی ہے۔"

ایک حدیث میں مذکور ہے کہ ایک شخص نے حضرت محمد ﷺ سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ ﷺ والدین کا اولاد پر کیا حق ہے؟ آپ نے فرمایا:

"وہ تیرے لئے جنت بھی ہیں اور دوزخ بھی۔"

اس حدیث سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ والدین کے ساتھ حسن سلوک جنت کا مستحق ٹھہراتا ہے اور ان سے بدسلوکی جنت میں لے جاتی ہے۔

ایک دفعہ آنحضرت ﷺ صحابہ کی مجلس میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے فرمایا "کیا تم کو بتاؤں کہ دنیا میں سب سے بڑے گناہ کیا ہیں" انہوں نے عرض کی' یا رسول اللہ ضرور ارشاد فرمائیے۔ آپ نے فرمایا: خدا کے ساتھ شرک کرنا' ماں باپ کی نافرمانی کرنا۔ آپ تکیہ لگائے بیٹھے تھے' سیدھے ہو کر برابر ہو گئے اور فرمانے لگے' اور جھوٹی گواہی اور ہاں جھوٹی گواہی۔

اسلام میں جہاد کی بہت اہمیت ہے' لیکن والدین کی خدمت گذاری کا درجہ اس سے بھی زیادہ ہے۔ والدین کی اجازت کے بغیر جہاد بھی جائز نہیں۔ ایک دفعہ ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر شرکت جہاد کی اجازت طلب کی۔ آپ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تمہارے والدین موجود ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہاں یا رسول اللہ میرے والدین موجود ہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا: پھر انہی کی خدمت کا فریضہ جہاد ادا کرو۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ والدین کی خدمت بھی ایک جہاد ہے۔

ایک حدیث میں مذکور ہے کہ:

"رب کی خوشنودی باپ کی خوشنودی میں ہے۔"

اسلام میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں' لیکن اگر کسی کے والدین مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت فرض قرار دی گئی ہے۔ اسلام نے والدین کی صرف اس بات کو نہ ماننے کا حکم دیا ہے' جس میں کفر یا شرک لازم آتا ہو۔ چنانچہ سورۃ عنکبوت میں فرمایا گیا ہے:

"اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو' اور اگر وہ تجھ کو مجبور کریں کہ تو خدا کے ساتھ اس کو شریک کر جس کا تجھ کو علم نہیں' تو ان کا کہا نہ مان۔"

ماں کا مقام : چونکہ ماں فطری طور پر اولاد کے سلسلہ میں حمل اور وضع حمل کی تکلیف برداشت کرتی ہے اور بچے کی تربیت کے سلسلہ میں مسلسل محنت' شب بیداری اور بے آرامی کو حوصلہ سے برداشت کرتی ہے' اس لئے باپ کے مقابلہ میں اس کا درجہ بلند کیا گیا ہے۔

سورۃ لقمان میں فرمایا گیا ہے:

و وصینا الانسان بوالدیه حملته امه وهنا علی وهن و فصله فی عامین ان اشکرلی ولو الدیک

ترجمہ : اور ہم نے انسان کو جتا دیا کہ اپنے ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو' اس کی ماں نے اس کو تھک تھک کر پیٹ میں رکھا' اور دو سال میں اس کا دودھ چھڑایا کہ وہ میرا اور اپنے ماں باپ کا احسان مانے۔

سورۃ احقاف میں فرمایا گیا ہے:

حملته امه کرها و وضعته کرها و حملهٗ و فصلهٗ ثلثون شهراً حتی اذا بلغ اشده

(اس کی ماں نے اس کو تکلیف برداشت کر کے پیٹ میں اٹھایا اور تکلیف اٹھا کر جنا' اور تیس مہینوں تک اس کو پیٹ میں رکھا اور دودھ چھڑایا' یہاں تک کہ وہ بچہ سے بڑھ کر جوان ہوا۔)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

1- نیک سلوک اور عمدہ برتاؤ کی سب سے زیادہ حقدار ماں ہے۔
2- اگر ماں زندہ ہے تو اس کی خدمت کر اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ماں کے ساتھ نیک سلوک کر' یہ نیکی حج اور جہاد سے بھی بڑی ہے۔
3- تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔

ایک صحابی نے عرض کیا' یا رسول اللہ ﷺ مجھے جہاد میں شرکت کی اجازت دیجئے۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تیری ماں زندہ ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں زندہ ہے۔ آپ نے فرمایا: تو اسی سے چمٹے رہو کہ جنت اس کے پاؤں سے نیچے ہے۔

ایک شخص نے آنحضرت ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ میرے حسن سلوک کا سب سے زیادہ حقدار کون ہے؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے پوچھا' پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ اس نے عرض کی پھر کون؟ آپ نے فرمایا: تیری ماں۔ تین دفعہ آپ نے یہی جواب دیا۔ چوتھی دفعہ پوچھنے پر ارشاد فرمایا: تیرا باپ۔

ایک دن آنحضرت ﷺ نے چار بڑے بڑے گناہوں کا ذکر کیا اور سرفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا۔

والدین کے حقوق : اسلام نے والدین کے مندرجہ ذیل حقوق متعین کئے ہیں:

1- عزت و احترام
2- اطاعت و فرمانبرداری
3- حسن سلوک
4- محبت و شفقت
5- خدمت
6- والدین کے رشتہ داروں اور دوستوں سے حسن سلوک
7- دعائے مغفرت
8- میراث

عزت و احترام : اولاد کا پہلا فرض یہ ہے کہ وہ والدین کا احترام اور عزت کرے۔ بات چیت کے دوران ادب کو ملحوظ رکھے۔ اگر وہ کوئی بھی سخت بات کہہ دیں تب بھی ان کے احترام کا تقاضا یہ ہے کہ جواب ادب کے ساتھ ہی دیا جائے۔

قرآن حکیم میں فرمایا گیا ہے:

فلا تقل لهما اف ولا تنهرهما وقل لهما قولا كريما (بنی اسرائیل)

(تم ان کے سامنے اف تک بھی نہ کرو' اور نہ ہی ان کو جھڑکو' اور ان کے ساتھ ادب سے بات کرو)

اطاعت و فرمانبرداری : اولاد کا دوسرا اہم فرض یہ ہے کہ وہ اپنے والدین کا ہر حکم بجا لائے اور ہر بات میں ان کی اطاعت کرے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

"تم ان (والدین) کے سامنے شفقت اور عاجزی سے جھکے رہو۔"

اگر والدین مشرک اور بت پرست بھی ہوں تو ان کی اطاعت و فرمانبرداری لازم ہے۔ اسلام کا حکم ہے کہ اگر تمہارے بت پرست والدین تم کو بت پرستی کی دعوت دیں تو صرف ان کی اس دعوت کو قبول نہ کرو' لیکن ان کی دنیاوی خدمت اور حسن سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

حسن سلوک : والدین کا ایک اہم حق یہ ہے کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔ قرآن مجید میں بار بار والدین کے ساتھ نیکی' احسان اور اچھا سلوک کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔ "**وبالوالدین احسانا**" کا حکم کئی بار دوہرایا گیا ہے اور والدین سے حسن سلوک کو جہاد سے بھی زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔

محبت و شفقت : اولاد کا فرض ہے کہ وہ والدین سے محبت اور شفقت کا اظہار کرے۔

بڑھاپے میں والدین کمزور ہو جاتے ہیں اور ان کے جذبات و احساسات عمر کے ساتھ ساتھ بڑے نازک اور لطیف ہو جاتے ہیں۔ اولاد کا فرض ہے کہ وہ اس بڑھاپے میں والدین کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش آئے۔

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

احدھما او کلھما فلا تقل لھما اف ولا تنھرھما وقل لھما قولا کریما واخفض لھما جناح الذل من الرحمۃ

(ان (والدین) میں سے ایک یا دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اف بھی نہ کہو اور ان پر خفا نہ ہو' اور ان سے ادب سے بولو اور ان کے لئے اطاعت کا بازو محبت سے جھکاؤ۔)

آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ:

"جب بیٹا اپنے ماں باپ کو محبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ہر مرتبہ دیکھنے کے بدلہ میں ایک مقبول حج کا ثواب لکھتا ہے۔"

صحابہ کرام نے عرض کیا اگر کوئی دن میں سو مرتبہ دیکھے؟ ------ آپ نے فرمایا:

"ہاں! خدا بزرگ و برتر اور پاک ہے۔"

خدمت: اولاد کا فرض ہے کہ وہ والدین کی بھرپور خدمت کرے۔ خدمت کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک مالی خدمت اور دوسری جسمانی خدمت۔ قرآن و سنت والدین کو ان دونوں خدمات کا مستحق قرار دیتے ہیں۔

سورۃ البقرہ میں فرمایا گیا ہے:

قل ما انفقتم من خیر فللوالدین والا قربین

(کہہ دیجئے! تم نیکی میں جو مال خرچ کرو' والدین اور قریبی رشتہ داروں کے لئے)

اس آیت کی رو سے مالی خدمت کے سب سے پہلے حقدار والدین ہیں۔ بڑھاپے میں والدین کی ضروریات زندگی کے لئے مال صرف کرنا اور ان کی جسمانی دیکھ بھال کرنا اولاد پر فرض ہے۔

ایک روز آنحضرت ﷺ مجلس میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے فرمایا: "خوار ہوا' خوار ہوا' خوار ہوا۔" صحابہ نے پوچھا' یا رسول اللہ کون خوار ہوا؟ آپ نے فرمایا:

"جس نے اپنے والدین کی یا ان میں سے کسی ایک کو بڑھاپے کی حالت میں پایا' اور پھر ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کی۔"

والدین کے رشتہ داروں اور دوستوں سے حسن سلوک: والدین کے اقارب اولاد کے بھی رشتہ دار ہوتے ہیں۔ مثلاً چچا' تایا' پھوپھی' نانی' ماموں' خالہ وغیرہ سے حسن سلوک روا رکھنا ماں باپ کے ساتھ ادب و احترام کو ظاہر کرتا ہے۔

سورۃ البقرہ میں ماں باپ کے بعد مالی خدمت کے حقدار والدین کے قریبی رشتہ داروں کو قرار دیا گیا ہے' ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

وبالوالدین احسانا و ذی القربی
(اور ماں باپ اور رشتہ داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو)

ایک مرتبہ آپ نے اپنے چچا حضرت عباس کے بارے میں ارشاد فرمایا:
"جس نے میرے چچا کو ایذا دی' اس نے مجھے ایذا دی' کیونکہ چچا باپ کے مثل ہوتا ہے۔"

ایک صحابی نے آنحضرت ﷺ سے عرض کیا کہ مجھ سے ایک بڑا گناہ سرزد ہو گیا ہے' توبہ کی کیا صورت ہے؟ آپ نے جواب دیا: کیا تیری ماں موجود ہے؟ صحابی نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپ نے دریافت فرمایا: کیا تیری ماں کی بہن (خالہ) موجو ہے؟ اس نے جواب دیا: جی ہاں۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: "جا اس کے ساتھ نیکی کر!"

اسی طرح باپ کے دوستوں اور ماں کی سہیلیوں سے حسن سلوک کی تاکید بھی کی گئی ہے۔

دعائے مغفرت : والدین کا اولاد پر یہ بھی حق ہے کہ ان کی زندگی میں اور ان کی وفات کے بعد اولاد ان کے حق میں مغفرت و رحمت کی دعا کرتی رہے۔ قرآن مجید میں انبیائے کرام کی دعاؤں کا ذکر کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۃ ابراہیم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے والدین کے لئے یہ دعا مانگتے تھے:

ربنا اغفرلی والوالدی
(اے ہمارے پروردگار مجھے اور میرے والدین کو بخش دے)

اسی طرح حضرت نوح بھی یہی دعا کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ہر مسلمان ہر نماز میں اپنے والدین کے لئے یہی دعا کرتا ہے۔

حضرت ابی سعید ساعدی سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس قبیلہ بنو سلمہ کا ایک شخص حاضر ہوا اور عرض کیا' یا رسول ﷺ کیا ماں باپ کے ساتھ ان کے مرنے کے بعد بھی میں کوئی نیکی کر سکتا ہوں؟ آپ نے جواب دیا: ہاں ان کے لئے دعا اور استغفار کر اور ان کے بعد ان کے عہد و پیمان پورے کرنا اور ان کے رشتہ داروں سے انہی کی رضا مندی اور خوشی کے لئے صلہ رحمی کرنا اور ان کے دوستوں کی عزت کرنا بھی نیکی میں شامل ہے۔

میراث : اگر خدانخواستہ والدین کی زندگی میں' ان کی اولاد میں سے کوئی وفات پا جائے اور وہ کچھ مال یا جائداد چھوڑے تو اس میں والدین کا بھی حق ہوتا ہے۔ اگر متوفی کی اولاد ہے تو والدین میں سے ہر ایک کو مال کا چھٹا حصہ ملے گا اور اگر اولاد نہیں ہے اور صرف والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو ایک تہائی حصہ ملے گا' بقیہ حصہ باپ کی ملکیت ہو گا۔

اولاد کے حقوق اور والدین کے فرائض : والدین پر اولاد کے مندرجہ ذیل حقوق ادا کرنا فرض ہیں:

1- تحفظ زندگی
2- پرورش
3- تربیت اخلاق
4- تعلیم
5- محبت و شفقت
6- اولاد کے درمیان عدل و مساوات

7- نکاح 8- میراث

تحفظ زندگی : اسلام سے قبل اولاد کو جینے کا حق بھی حاصل نہ تھا۔ کبھی انہیں دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھا دیا جاتا تھا' کبھی فقرو فاقہ کے خوف سے انہیں قتل کر دیا جاتا تھا اور کبھی غیرت کے غلط تصور سے مجبور ہو کر لڑکیوں کو زندہ درگور کر دیا جاتا تھا۔ اسلام نے اولاد کشی کے تمام طریقوں کا انسداد کیا اور اولاد کو زندگی کا حق دلایا۔

سورۃ بنی اسرائیل میں فرمایا گیا ہے:

ولا تقتلوا اولاد کم خشیۃ املاق نحن نرز قھم وایاکم ان قتلھم کان خطا کبیرا

(اور اپنی اولاد کو فقرو فاقہ کے خوف سے نہ مار ڈالو' ہم ان کو بھی اور تم کو بھی روزی دیتے ہیں' ان کا مار ڈالنا بڑا گناہ ہے)

سورۃ الانعام میں فرمایا گیا ہے:

"وہ لوگ خسارے میں ہیں جنہوں نے اپنی اولاد کو بے وقوفی اور نادانی کی وجہ سے قتل کیا۔"

پرورش : والدین کا اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ بچے کی صحیح پرورش کا اہتمام کریں تاکہ بچہ کی نشوونما صحیح طور پر ہو سکے اور جسمانی طور پر وہ ناقص نہ رہ جائے۔

اسلام نے بچے کی پرورش پر بہت زور دیا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

ولو الدات یرضعن اولادھن حولین کاملین

(اور مائیں دودھ پلائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال)

قرآن مجید میں بچے کی شیر خوارگی کی مدت دو سال مقرر کی گئی ہے۔ اگر بچہ کسی وجہ سے ماں کے دودھ سے محروم ہو جائے تو باپ پر یہ فریضہ عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کے دودھ پلانے کا انتظام کرے۔ اگر بچہ کے ماں اور باپ دونوں فوت ہو جائیں تو یہ فریضہ ادا کرنا ورثاء کی ذمہ داری ہے۔

لڑکی لڑکے کی نسبت کمزور ہوتی ہے' اس لئے اس کی پرورش کی خاص طور پر تاکید کی گئی ہے اور اسے اجر و ثواب کا باعث قرار دیا گیا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

1- جس کی دو یا تین بیٹیاں یا بہنیں ہوں' وہ ان کے ساتھ حسن سلوک کرے تو جنت میں داخل ہو گا۔

2- لڑکی کی پرورش والدین اور دوزخ کے درمیان پردہ ہے۔

3- جو شخص دو لڑکیوں کو پال کر جوان کرے' اس کا اور میرا رتبہ جنت میں یوں (آپ نے دو انگلیاں اٹھا کر فرمایا) ہو گا۔

تربیت اخلاق : ماں کی گود بچے کے لئے پہلی تربیت گاہ ہے۔ اخلاق کی جو تربیت ماں کی گود میں ہوتی ہے' اسی پر بچے کی شخصیت پروان چڑھتی ہے۔ اسی تربیت پر کسی بچہ کی سیرت کے بننے

یا بگڑنے کا انحصار ہوتا ہے۔ اس لئے ماں کا یہ اہم فریضہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اسلامی اخلاق کی تربیت دے۔ ماں اور باپ دونوں بچے کے سامنے حسن اخلاق کا عملی نمونہ پیش کریں تاکہ ان کی اولاد عمدہ اخلاق کی حامل ہو۔

رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ:

1- "کوئی باپ اپنے بچے کو حسن ادب سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا۔"

2- "اولاد کا باپ پر یہ بھی حق ہے کہ وہ اس کی صحیح تربیت کرے اور اچھا سا نام رکھے۔"

اولاد کی تربیت ایک دینی فریضہ بھی ہے۔ حدیث نبوی کی رو سے بچہ والدین پر خرچ کرے تو صرف بچے ہی کو نہیں بلکہ والدین کو بھی ثواب ملتا ہے۔ والدین کو اس امر کا ثواب ملے گا کہ بچے کو نیک تربیت دی کہ والدین کی خدمت بجا رہا ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ والدین نے اسے دولت کمانے کا طریقہ سکھایا اور دین کی خدمت کرنے کے قابل بنایا۔

اسلام میں نیک اولاد کو صدقہ جاری قرار دیا گیا ہے۔

تعلیم : والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو زیور تعلیم سے آراستہ کرے۔ اسلام میں علم حاصل کرنا ہر مرد اور عورت پر فرض ہے۔ چنانچہ لڑکوں کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کو تعلیم دلوانا بھی ضروری ہے۔ آنحضرت ﷺ نے تعلیم کو بڑی اہمیت دی ہے۔ آپ نے بدر کے قیدیوں کا فدیہ یہ مقرر فرمایا تھا کہ وہ مسلمانوں کے دس دس بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں۔

محبت و شفقت : والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ محبت و شفقت سے پیش آئیں۔ آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے:

من لم یرحم صغیرنا ولم یوقر کبیرنا فلیس منا

(جو ہمارے چھوٹوں پر شفقت نہ کرے اور ہمارے بڑوں کا ادب نہ کرے، وہ ہم میں سے نہیں)

آنحضرت ﷺ بچوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ ایک دن ایک دیہاتی حاضر خدمت ہوا، آپ بچوں سے پیار کر رہے تھے اس نے آپ کو بچوں سے پیار کرتے دیکھ کر پوچھا، کیا آپ بچوں کو چومتے اور پیار کرتے ہیں، ہم تو ایسا نہیں کرتے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا میں اس پر قادر ہوں کہ تیرے دل سے خدا نے جو رحم نکال لیا ہے، پھر تیرے دل میں رکھ دوں۔

ایک صحابی کا بیان ہے کہ میں نے ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ کو حالت نماز میں دیکھا، آپ کی نواسی امامہ آپ کے کندھے پر تھیں، آپ جس وقت رکوع اور سجدہ میں جاتے تو انہیں زمین پر بٹھا دیتے، اور جب کھڑے ہوتے پھر کندھے پر اٹھا لیتے۔

اولاد کی محبت میں اعتدال : اولاد سے محبت ایک فطری امر ہے، مگر اس میں اعتدال سے گذر جانا تباہ کن چیز ہے۔ انسان کو یہ محبت راہ ہدایت سے گمراہ بھی کر دیتی ہے۔ بسا اوقات انسان اولاد کی ناجائز اور بے جا ضروریات پوری کرنے کے لئے اس کی محبت میں مبتلا ہو کر راہ راست سے بھٹک جاتا ہے اور رزق حلال کمانے کے بجائے حرام ذرائع سے مال حاصل کرنے کی کوشش

کرتا ہے' اسی لئے قرآن میں اولاد کی محبت کو ایک فتنہ اور آزمائش قرار دیا گیا ہے:

انما اموالکم واولادکم فتنۃ

(تمہارے اموال اور تمہاری اولاد تمہارے لئے ایک فتنہ (آزمائش) ہے۔)

چنانچہ اسلام اولاد کی محبت میں اعتدال اور میانہ روی کا راستہ اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق' قیامت کے روز حرام روزی کمانے والے آدمی کے ساتھ سب سے پہلے اس کے اہل و عیال جھگڑا کریں گے اور گناہوں کی تمام تر ذمہ داری اس پر ڈال دیں گے۔

اولاد کے مابین عدل و مساوات : والدین کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام بچوں سے یکساں اور منصفانہ سلوک کریں۔ لڑکے اور لڑکیوں کو برابر درجہ دیں۔ لڑکیوں کے مقابلہ میں لڑکوں کو ترجیح نہ دیں۔ اسلام میں کسی ایک کو کوئی چیز دے دینا اور دوسروں کو اس سے محروم رکھنا جائز نہیں۔

ایک مرتبہ ایک صحابی نے اپنے بیٹے کو ایک غلام دیا اور آنحضرتﷺ سے آ کر عرض کی کہ آپ اس کی گواہی دے دیجئے۔ آپ نے پوچھا' کیا تم نے اپنے دوسروں بچوں کو بھی ایک ایک غلام دیا ہے؟ اس نے عرض کیا' نہیں۔ آپ نے فرمایا: "میں اس ظلم کا گواہ نہیں بننا چاہتا۔"

نکاح : والدین کا فرض ہے کہ جب بچے جوان ہو جائیں تو ان کی شادی کر دیں' نکاح کے لئے ایک شرط ضروری قرار دی گئی ہے کہ شادی ان کی رضامندی سے ہو اور اس ضمن میں ان پر کوئی جبر نہ کیا جائے۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

"بیوہ عورت کا نکاح نہ کیا جائے' جب تک کہ اس کی اجازت حاصل نہ کر لی جائے' اور اسی طرح کنواری عورت کا نکاح نہ کیا جائے' جب تک اس سے دریافت نہ کر لیا جائے۔"

اسلام میں شادی سے پہلے منگیتر (ہونے والی دلہن) کو دیکھنے کی اجازت ہے۔

میراث : اسلام نے اولاد کو والدین کے ترکہ میں سے وراثت کا حق بھی دیا ہے۔ تمام بچوں کے درمیان ترکہ اسلامی قانون کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ یہ حق ماں باپ کی وفات کے بعد ملتا ہے۔ ترکہ کی تقسیم کا اصول یہ ہے کہ اگر والدین پر کوئی قرض ہو' تو قرض اتار کر اور وصیت پوری کرنے کے بعد باقی مال ورثاء میں تقسیم ہو گا۔ اگر مال میں سے کچھ بچے تو غیر وارث قرابتداروں کا بھی اس میں حصہ ہے۔ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ مرد کو اس لئے دگنا دیا جاتا ہے کہ عورت نہ صرف باپ کی جائداد میں بھائی کے مقابلہ میں نصف کی حصہ دار ہے' بلکہ خاوند کی جائداد میں بھی اس کا حصہ شامل ہوتا ہے۔

مسجد

سوال : "مسجد" سے کیا مراد ہے؟ قرآن و حدیث کی روشنی میں مسجد کے مقام' آداب اور مقاصد پر روشنی ڈالئے!

یا

مسجد شعائر اسلام میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟ اس کی عظمت و افادیت پر روشنی ڈالئے!

جواب : مسجد :

مسجد کے معنی ہیں: سجدہ کرنے کی جگہ' سجدہ گاہ۔ اسلامی اصطلاح میں "مسجد" سے مراد وہ عمارت جس میں مسلمان نماز ادا کرتے ہیں۔ یہ جگہ یا عمارت نماز کے لئے "مستقلاً" وقف ہوتی ہے' اور کسی شخص کی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی ملکیت متصور ہوتی ہے۔ "مسجد" کا لفظ صرف مسلمانوں ہی کی عبادت گاہ کے لئے مخصوص ہے۔ غیر مسلم اقوام کی عبادت گاہ کو مسجد کا نام نہیں دیا جا سکتا۔

اسلام کے مطابق انسان کی تخلیق کا اولین مقصد اللہ تعالیٰ کی عبادت ہے۔ عبادت کے لئے نماز کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ نماز ہر مسلمان پر شب و روز میں پانچ بار فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک نماز سب سے محبوب اور سب سے اہم عمل ہے۔ قرآن مجید میں نماز ادا کرنے کا سختی سے حکم دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے نماز کو دین اسلام کا ستون اور مومن کی معراج قرار دیا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق جس نے جان بوجھ کر کوئی نماز قضا کی وہ کافر ہوا۔ اسی طرح آپ کا فرمان ہے کہ جس کے پاس نماز نہیں اس کا دین اسلام میں کوئی حصہ نہیں۔ اسلامی روایات و کتب سے ثابت ہوتا ہے کہ نماز روز اول ہی سے فرض کر دی گئی تھی۔ حضرت آدم اور حوا جدائی کے بعد اکٹھے ہوئے تو حضرت آدم نے سب سے پہلے عبادت خداوندی کے لئے مسجد ہی تعمیر فرمائی۔ اسلامی روایات کے مطابق حضرت آدم نے یہ مسجد (بیت اللہ) مکہ مکرمہ میں تعمیر فرمائی تھی۔

مسجد کی بنیاد اور اجرائے تعمیر : اسلام میں سب سے پہلی مسجد کا نام "مسجد قبا" ہے۔ جب آنحضرت ﷺ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے گئے تو آپ نے سب سے پہلے مسجد قبا کی بنیاد رکھی اور اس کی تعمیر کے سلسلے میں اپنے ہاتھوں سے کام کرتے رہے۔

مسجد قبا کے بعد رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام کے ساتھ مل کر جو مسجد تعمیر فرمائی اس کا نام مسجد نبوی ہے۔ جو آپ کے دور حیات سے لے کر آج تک مدینہ منورہ میں موجود ہے۔

نماز چونکہ دین کا ستون ہے' اس لئے مسلمانوں کی ہر بستی میں مسجد کا ہونا ضروری ہے۔

مسلمانوں نے ہر دور میں تعمیر مساجد کے سلسلہ میں بڑھ چڑھ کر خدمات انجام دیں۔ مسجد اس بات کی علامت بھی ہے کہ جہاں مسجد موجود ہو' سمجھ لیا جاتا ہے کہ یہ مسلمانوں کی بستی ہے۔ چنانچہ ایک چھوٹے سے چھوٹے گاؤں سے لے کر شہروں تک میں مساجد موجود ہیں۔ دیہات میں لوگ اپنی مدد آپ کے تحت مساجد تعمیر کر لیتے ہیں۔ بعض مخیر حضرات مسجد کے لئے جگہ اور رقم مہیا کر دیتے ہیں۔ مسلمان خلفاء اور سلاطین نے اپنے عہد حکومت میں سرکاری طور پر بھی مساجد تعمیر کروائیں۔ بعض مساجد امیروں' وزیروں اور حاکموں نے اپنے خرچ پر تعمیر کروائیں۔ اسلامی ممالک میں بڑی بڑی اور عظیم الشان مساجد موجود ہیں۔ ان میں سے بعض مساجد کو تاریخی یادگار ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ دنیا کی چند بڑی بڑی مساجد کے نام درج ہیں۔

1- مسجد الحرام (بیت اللہ) : مکہ مکرمہ (سعودی عرب)
2- مسجد نبوی : مدینہ منورہ (سعودی عرب)
3- جامع المنصور : سعودی عرب
4- جامع دمشق : شام
5- جامع قرطبہ : سپین
6- جامع استنبول : ترکی
7- جامع نجف اشرف : عراق
8- جامع امامیہ : قم (ایران)
9- بادشاہی مسجد : لاہور (پاکستان)
10- فیصل مسجد : اسلام آباد (پاکستان)
11- جامع مسجد : دہلی (بھارت)

مسجد کی اہمیت : اسلام میں ہر مسلمان پر پانچ وقت کی نماز فرض ہے۔ نماز گھر میں یا باہر کسی جگہ بھی ادا کی جا سکتی ہے۔ فرمان نبوی ہے:

جعلت لی الارض مسجدا وطهورا

(میرے لئے زمین مسجد اور طاہر بنا دی گئی ہے)

یعنی ہر مسلمان کے لئے پوری زمین مسجد کے مانند ہے اور وہ ہر جگہ نماز ادا کر سکتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں میں اتحاد و یگانگت پیدا کرنے کے لئے نماز باجماعت ادا کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز باجماعت مسجد ہی میں ادا کی جا سکتی ہے۔ حکم ہے کہ اذان کی آواز سنتے ہی دوڑو' جیسے سپاہی بگل بجتے ہی سمجھ لیتا ہے کہ کمانڈر نے اسے طلب کیا ہے۔ مسجد میں نماز ادا کرنے کا ثواب گھر میں نماز ادا کرنے سے کئی گنا زیادہ ہے۔ لوگ مسجد میں جمع ہوتے ہیں' ایک دوسرے کو دیکھتے اور پہچانتے ہیں اور اس حیثیت سے متعارف ہوتے ہیں کہ سب لوگ ایک ہی منزل کے مسافر ہیں۔ پھر ایک دوسرے کی شکل و صورت دیکھ کر اس کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص پھٹے پرانے کپڑوں میں ہے' پریشان صورت ہے یا فاقہ زدہ دکھائی دیتا ہے تو آپ کے دل میں ہمدردی کا جذبہ پیدا ہو گا اور آپ اس کی مدد کر سکیں گے۔

مسجد میں مساوات اور اتحاد کا عملی نمونہ سامنے آتا ہے۔ تمام مسلمان مساوی درجہ رکھتے ہیں۔ اگر کوئی غریب و نادار شخص مسجد میں پہلے آیا ہے تو وہ اگلی صف میں کھڑا ہو گا۔ کوئی بڑے

سے بڑا آدمی بھی اس کی جگہ نہیں لے سکتا' اور نہ ہی کوئی پہلے سے اپنی نشست مخصوص کروا سکتا ہے۔ تمام مسلمان' خواہ امیر ہوں' خواہ غریب' بلا لحاظ نسب و نسل ایک ہی صف میں کندھے سے کندھا ملا کر نماز ادا کرتے ہیں۔ اس سے فخر و غرور مٹ جاتا ہے اور صفوں میں اتحاد پیدا ہوتا ہے۔

پھر مسجد میں مسلمانوں کے مشترکہ مسائل بھی حل کئے جا سکتے ہیں۔ مسلمان مسجد میں جمع ہو کر باہمی مشورہ سے کسی بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ اپنے دور حیات میں ضروری مسائل کا تصفیہ مسجد ہی میں فرمایا کرتے تھے۔ باہر کے ممالک سے جو وفود آتے تھے' انہیں بھی مسجد ہی میں ٹھہرا کر ملاقات کیا کرتے تھے۔ بعض دفعہ جنگی قیدیوں کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا جاتا تھا۔ مسجد میں اجتماع ہوتا تو آپ کی طرف سے اجازت تھی کہ وہ پاکیزہ تفریح کا سامان بھی وہاں مہیا کر سکتا تھا۔ حضرت حسان بن ثابت مسجد میں نعت رسول پیش کیا کرتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد کو اچھے خیالات کی اشاعت کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔

خلفائے راشدین کے عہد میں جنگی منصوبہ بندی اور میدان جنگ میں اسلامی افواج کی کارکردگی کے اعلانات مسجد ہی میں کئے جاتے تھے اور مسلمانوں میں جذبہ جہاد کو مستحکم کرنے کے لئے مسجد کے پلیٹ فارم کو استعمال کیا جاتا تھا۔ اس عہد میں خلفائے راشدین کی طرف سے لوگوں کی بیعت کے اعلانات بھی مسجد ہی سے جاری کئے جاتے تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مسجد مسلمانوں کے لئے معاشرتی' سیاسی اور عمومی مرکز کی حیثیت رکھتی ہے۔

مسجد ایک درس گاہ بھی ہے۔ نماز جمعہ میں لوگوں کو وعظ و نصیحت کی جاتی ہے اور اسلامی تعلیم سے روشناس کرایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے بھی مسجد کو استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسلام کے ابتدائی مکاتیب مساجد ہی میں قائم ہوئے۔ موجودہ دور میں بھی مساجد میں "مسجد مکتب سکول" قائم ہیں۔

مسجد' قرآن و حدیث کی روشنی میں . اسلام میں مسجد کو بہت زیادہ عظمت و احترام حاصل ہے' یہی وجہ ہے کہ مساجد کو "بیت اللہ" یعنی "اللہ کا گھر" کہا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

1- **فی بیوت اذن اللہ ان ترفع ویذکر فیہا اسمہ**
(انہی گھروں میں اللہ نے ذکر کرنے کا حکم دیا ہے اور یہ کہ ان کی تعظیم کی جائے۔)

2- **ان المساجد للہ فلا تدعوا مع اللہ احدا** (جن)
(بے شک مسجدیں ..... اللہ کے لئے ہیں' ان میں اللہ کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کرو۔)

3- **یا بنی آدم خذوا زینتکم عند کل مسجد** (اعراف)
(اے بنی آدم! ہر مسجد میں خوشنما لباس پہن کر جایا کرو۔)

فرمان نبوی ہے:

1- **احب البلاد الی اللہ مساجد و ابغض البلاد الی اللہ اسواقہا**

(خدا کے نزدیک تمام آبادیوں میں محبوب ترین مقامات مساجد ہیں اور بدترین بازار ہیں)

2- من بنی للہ مسجداً بنی اللہ لہ بیتاً فی الجنتہ
(جو شخص اللہ کے لئے مسجد بنائے اللہ تعالیٰ اس کے لئے جنت میں ایک گھر بنائے گا)

3- من غدا الی المسجد او راح اعد اللہ نزلہ الجنتہ کلما غدا اوراح
(جو شخص دن کے اول حصہ میں آیا یا آخری حصہ میں مسجد کی طرف جائے' اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی مہمانی کا سامان کرتا ہے' خواہ وہ صبح کو جائے یا شام کو)

آداب مسجد : ہر مسجد کو اللہ کا گھر قرار دیا گیا ہے' اس لیئے ہر مسلمان پر فرض ہے کہ وہ مسجد کا تقدس قائم رکھنے کے لئے آداب مسجد کو ملحوظ رکھے۔ آداب مسجد درج ذیل ہیں :

1- مسجد میں داخل ہوتے وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرنی چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ جب تم میں سے کوئی مسجد میں داخل ہو تو اس کو یہ دعا کرنی چاہئے :
اللھم افتح لی ابواب رحمتک
(اے اللہ! میرے لئے اپنی رحمت کے دروازے کھول)
اور جب مسجد سے باہر نکلے تو یہ دعا پڑھے :
اللھم انی اسئلک من فضلک
(اے اللہ! میں تجھ سے تیرا فضل چاہتا ہوں)

2- مسجد میں عبادت کی نیت سے باوضو ہو کر داخل ہونا چاہئے۔ اسلام میں وضو طہارت کی علامت ہے۔ چنانچہ خدا کے حضور پیش ہونے سے پہلے پاک و صاف ہونا ضروری ہے۔ وضو کے علاوہ مسجد میں جانے سے پہلے لباس کی صفائی بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ مسجد میں خوشنما لباس پہن کر جایا کرو۔

3- پیاز یا کوئی بدبودار چیز کھا کر مسجد میں نہیں جانا چاہئے۔ کیونکہ بدبو کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی طبیعت پر برا اثر پڑتا ہے۔
حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :
من اکل ھذہ الشجرہ الخبیثہ فلا یقرب مسجدنا فان الملائکہ تتاذی منہ مما یتاذی منہ الانس
(جو شخص اس بدبودار درخت (لہسن اور پیاز) میں سے کھائے تو ہماری مسجدوں کے قریب نہ آئے' اس لئے کہ فرشتے بھی اس چیز سے اذیت پاتے ہیں' جس سے انسان اذیت پاتے ہیں۔)

4- مسجد میں تھوکنا منع ہے۔
حضرت [illegible] سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا :
عرضت علی اعمال امتی حسنھا وسیئھا فوجدت فی محاسن

اعمالها الاذی یماط عن الطریق و وجدت فی مساوی اعمالها النخاعه تکون فی المسجد لا تدفن

(میری امت کے نیک و بد اعمال میرے سامنے پیش کئے گئے' میں نے اس کے نیک اعمال میں تو راستہ سے تکلیف دینے والی چیز کو دور کر دینا پایا اور بداعمال میں مسجد کے اندر تھوکنا' جس کو دفن نہ کیا گیا ہو۔

چنانچہ مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ اگر غلطی یا مجبوری سے تھوک دیا جائے تو اس گناہ کا کفارہ یہ ہے کہ اس تھوک کو دفن کر دیا جائے یا بالکل صاف کر دیا جائے۔

5- مسجد میں خرید و فروخت اور دنیاوی کاروبار کرنا منع ہے۔

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن تناشد الاشعار فی المسجد و عن البیع والشراء

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسجد میں اشعار پڑھنے سے منع فرمایا ہے اور خرید و فروخت سے بھی)

حضرت حسن سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

یاتی علی الناس زمان یکون حدیثھم فی مساجدھم فی امر دنیاھم فلا تجالسوھم فلیس للہ فیھم حاجته

(عنقریب زمانہ آنے والا ہے کہ لوگ دنیا کی باتیں مسجدوں کے اندر کریں گے تو اس وقت تم ان لوگوں میں نہ بیٹھنا' خدا کو ایسے لوگوں کی ضرورت نہیں ہے۔)

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

من سمع رجلا ینشد ضالته فی المسجد فلیقل فلا ردھا اللہ علیک فان المساجد لم تبن لھذا

(جو شخص یہ سنے کہ کوئی آدمی اپنی گمشدہ چیز کو مسجد میں ڈھونڈ رہا ہے' تو اس کو چاہئے کہ یہ کہے خدا اس کی چیز کو واپس نہ دے' اس لئے کہ مسجدیں اس کام کے لئے نہیں بنائی گئیں۔)

6- مسجد میں قصاص لینا اور حدود قائم کرنا منع ہے۔

حضرت حکیم بن حزم سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

ان یستقاد فی المسجد وان ینشد فیه الاشعار وان تقام فیه الحدود

(کہ مسجد میں قصاص لینا' اشعار پڑھنا اور حدود قائم کرنا منع ہے۔)

7- مسجد میں چھوٹے بچوں کو لانا منع ہے' کیونکہ ہو سکتا ہے کوئی بچہ مسجد میں پیشاب یا پاخانہ کر دے۔

8- حائضہ عورت اور جنبی مرد کا پاک ہونے سے پہلے مسجد میں داخلہ ممنوع ہے۔

9- مسجد میں بلند آواز سے گفتگو نہیں کرنی چاہئے' بلکہ آہستگی اور نرمی سے بولنا چاہئے۔

10- مسجد سے متعلقہ کوئی چیز ذاتی مصرف میں نہیں لانی چاہئے۔

11- مسجد میں ہنسی مذاق، تمسخر اور لہو و لعب سے مکمل طور پر پرہیز کرنا چاہئے۔ بہتر ہے کہ مسجد میں خاموشی اختیار کی جائے۔

12- مسجد کو خواب گاہ نہیں بنانا چاہئے۔ اگر کسی مسافر کا کوئی ٹھکانا نہ ہو تو وہ مسجد سے ملحقہ حجرہ میں رات بسر کر سکتا ہے۔

13- مسجد میں مساوات و اخوت کے طریقہ پر عمل کرنا چاہئے۔ مسجد میں کسی کو کوئی امتیازی حیثیت نہیں دینی چاہئے۔ جو پہلے آئے وہ اگلی صف میں بیٹھے اور جو بعد میں آئے وہ پچھلی صف میں بیٹھے۔ چنانچہ مسجد میں جہاں جگہ مل جائے وہیں بیٹھنا چاہئے، کسی کو اس کی جگہ سے اٹھا کر خود بیٹھنا گناہ ہے۔

مسجد کے مقاصد اور حیثیت : مسجد کا اولین اور اہم ترین مقصد عبادت الٰہی کے لئے مسلمانوں کو ایک مشترکہ جگہ فراہم کرنا ہے۔

مسجد کے عمومی مقاصد درج ذیل ہیں :

1- **عبادت و تذکیر الٰہی** : مسجد دارالذکر اور دارالعبادت ہے۔ یہاں نماز کے علاوہ وعظ و نصیحت بھی کی جا سکتی ہے۔ اور جمعہ و عیدین کا خطبہ بھی دیا جا سکتا ہے۔ خصوصی طور پر محافل ذکر بھی منعقد کی جا سکتی ہیں۔

مسجد میں اجتماعی طور پر عبادت کی جاتی ہے جس سے عبادت میں گہراؤ پیدا ہوتا ہے۔ جماعت کی پابندی سے نماز میں باقاعدگی پیدا ہو جاتی ہے۔ مسجد میں ایک نماز پڑھنے سے ستائیس نمازوں کا ثواب ملتا ہے۔

2- **اجتماعیت** : مسجد کا دوسرا اہم مقصد مسلمانوں میں مجتمع اور متحد رہنے کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ مسجد میں جمع ہونے سے مسلمانوں کی ایک متحد قوت سامنے آتی ہے۔ تمام مسلمانوں کا اکٹھا ہو کر نماز ادا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمانوں میں دلی اتحاد اور اتفاق ہے۔ باجماعت نماز ادا کرنے سے دلوں کی کدورتیں خود بخود ختم ہو جاتی ہیں۔ یہ اجتماع ایک بہترین اور متحد معاشرہ کی تشکیل کا باعث بنتا ہے۔

3- **شوریٰ** : مسجد ایک مقام مشورہ بھی ہے۔ یہاں مقامی، ملکی، دینی، معاشرتی اور سیاسی مسائل باہم مشورہ سے حل کئے جا سکتے ہیں۔ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام کے عہد میں اہم دینی و سیاسی معاملات کے لئے مجلس شوریٰ مسجد ہی میں منعقد ہوتی تھی۔

4- **اطاعت امیر** : مسجد میں اجتماعی عبادت کرنے سے تمام مسلمانوں میں تنظیم کا اعلیٰ جوہر پیدا ہو جاتا ہے اور اطاعت امیر کی مشق بھی ہو جاتی ہے۔ مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے کے لئے مقتدیوں کا ایک امام ہونا ضروری ہے۔ امام مقتدیوں کے لئے ایک سردار اور لیڈر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے سے اطاعت امیر کا جذبہ مستحکم ہوتا ہے۔

5- **اشاعت تعلیم** : مسجد ایک درسگاہ بھی ہے۔ اسلامی مکاتیب ابتدا میں مساجد ہی میں قائم ہوئے۔ اسلام کے نامور فقہا و علما انہی مکاتیب کے تربیت یافتہ تھے۔ آج بھی مساجد میں

بچوں کو قرآنی تعلیم دی جاتی ہے۔

6- **عدالت** : رسول اللہ ﷺ اپنے عہد مبارک میں لوگوں کے مسائل کا فیصلہ مسجد ہی میں فرمایا کرتے تھے۔ پھر ایک عرصہ تک مسجدوں میں قاضیوں کی عدالتیں بھی قائم رہیں۔

7- **تزکیہ نفس** : مسجد میں نماز ادا کرنے سے نماز میں تزکیہ نفس پیدا ہوتا ہے۔ ایمان کی سلامتی اور تصور بندگی کے لئے مسجد سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔

8- **پابندی وقت کی تربیت** : مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے سے پابندی وقت کی تربیت خود بخود ہو جاتی ہے۔ مسلمان اذان کی آواز سنتے ہی فوراً مسجد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ پابندی وقت کے ساتھ ساتھ مسجد میں نماز ادا کرنے سے مستعدی اور چستی بھی پیدا ہو جاتی ہے۔

مساوات، اخوت و ہمدردی : مسجد میں باجماعت نماز ادا کرنے سے مسلمانوں میں مساوات، اخوت اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ مسجد میں آ کر محلّے کے لوگوں سے ملاقات ہوتی ہے، جس سے پتا چلتا ہے کہ کون غریب ہے، اور کون امداد کا مستحق ہے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کا احساس ہوتا ہے اور دل میں دوسروں کے دکھ درد ختم کرنے کے احساسات ابھرتے ہیں۔ یہاں امیر و غریب برابر ہوتے ہیں اور ایک ہی صف میں شانہ بشانہ خدا کے حضور کھڑے ہوتے ہیں۔

اسلامی ثقافت کا مرکز : مسجد اسلامی ثقافت کا مرکز ہے۔ یہاں محبت، شفقت، ایثار، ہمدردی، اور اخوت و مساوات کے اعلیٰ جوہر خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں اس طرح اسلامی تہذیب پروان چڑھتی ہے۔ مسجد اسلامی تہذیب پیدا کرنے کا بہترین ادارہ ہے۔

آداب مجلس و آداب معاشرت : مسجد میں آ کر مسلمانوں کو آداب مجلس اور آداب معاشرت کے اصول اور طریقوں کی عملی تربیت حاصل ہوتی ہے۔ اٹھنے بیٹھنے کے تمام طریقے مسجدی زندگی سے حاصل ہوتے ہیں۔ بڑوں کا ادب اور چھوٹوں سے محبت کا برتاؤ کرنا یہیں سے سیکھا جاتا ہے۔

اتحاد ملی کی علامت : مسجد اتحاد ملی کی علامت ہے۔ تمام مسلمانوں کا اکٹھا ہو کر نماز ادا کرنا اس بات کا ثبوت ہے کہ مسلمان قوم ایک متحد قوم ہے۔

سادگی، صفائی اور پاکیزگی کی تعلیم : مسجد مسلمانوں کو سادگی، صفائی اور پاکیزگی کی تعلیم دیتی ہے کیونکہ ہر نمازی جب مسجد میں آتا ہے تو بدن اور کپڑوں کو صاف کر کے آتا ہے۔

اصلاح معاشرہ کا ذریعہ : مسجد میں روزانہ کی وعظ و نصیحت سے عوام کے اخلاق و عادات کو درست کیا جاتا ہے۔ برائیوں کے مٹانے اور نیکیوں کے پھیلانے میں مسجد نہایت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اصلاح معاشرہ کے لئے مسجد بہترین اور موثر ذریعہ ہے۔ مسجد کے ذریعہ عوام کے شعور کو بیدار کیا جا سکتا ہے۔ قانون کا احترام اور معاشرتی ذمہ داریوں کا احساس دلا کر لوگوں کو ذمہ دار

شرعی بنایا جا سکتا ہے۔

مسجدوں کی اقسام : ہر مسجد اللہ تعالیٰ کا گھر ہے اور اس پر کسی شخص کو ملکیت حاصل نہیں، تاہم حالت و نوعیت کے اعتبار سے مسجدوں کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے :

1- **بنیادی مساجد :** مسجد الحرام، مسجد اقصیٰ اور مسجد نبوی کا شمار بنیادی مساجد میں ہوتا ہے۔ ان میں سے مسجد الحرام مکہ مکرمہ میں اور مسجد نبوی مدینہ منورہ میں موجود ہے۔ مسجد اقصیٰ یہودیوں کے قبضہ میں ہے۔

2- **قبیلوی مساجد :** ایسی مساجد جو مختلف مسلم قبیلوں نے تعمیر کروائیں انہیں "قبیلوی مساجد" کا نام دیا جاتا ہے لیکن یاد رہے کہ مسجد تعمیر کروانے کے بعد کوئی شخص یا قبیلہ اس کا مالک نہیں رہتا، وہ اللہ کے نام پر وقف ہو جاتا ہے اور ہر مسلمان وہاں نماز ادا کر سکتا ہے۔ قبیلوی مساجد کا صرف اتنا ہی تصور ہے کہ یہ مسجد فلاں قبیلہ نے تعمیر کروائی تھی اور یہ فلاں قبیلہ نے۔

3- **مصلّٰی :** شہر یا آبادی سے باہر کھلے میدان میں مخصوص کی گئی جگہ "مصلّٰی" کہلاتی ہے، جہاں عیدین کی نماز یا نماز استسقاء ادا کی جاتی ہے۔ ایسی مساجد کی عموماً کوئی عمارت نہیں ہوتی۔

4- **یادگار مساجد :** ایسی مساجد جو تعمیر و تزئین اور مضبوط کے اعتبار سے دنیا میں یادگار حیثیت رکھتی ہیں، یا آثار قدیمہ کا درجہ رکھتی ہیں، تاریخی طور پر قابل دید عمارات میں شمار ہوتی ہیں، مثلاً شاہی مسجد، وزیر خان کی مسجد، مسجد قرطبہ وغیرہ۔

5- **مقابر اولیاء سے ملحقہ مساجد :** بعض صوفیائے کرام کے مقابر کے ساتھ مساجد بھی تعمیر کی گئی ہیں، جیسے مسجد حضرت داتا گنج بخش۔

6- **علاقائی مسجدیں :** ایسی مساجد ہر گاؤں اور ہر شہر میں موجود ہیں۔ ایسی مسجدیں عموماً اہل محلہ یا اہل دہ اپنی مدد آپ کے تحت چندہ جمع کر کے تعمیر کرتے ہیں۔ بعض مخیر حضرات اپنے خرچ پر بھی کوئی مسجد تعمیر کر کے وقف کر دیتے ہیں۔

مکتب / مدرسہ

سوال : "مکتب" سے کیا مراد ہے؟ اسلامی مکاتب کی ضرورت و اہمیت، خصوصیات اور مقاصد پر روشنی ڈالئے!

جواب : مکتب :

"مکتب" کے معنی ہیں: لکھنے کی جگہ، لکھنا پڑھنا سکھانے کی جگہ، مدرسہ، درسگاہ، سکول۔ عرف عام میں دینی درسگاہ کو "مکتب" اور دنیاوی علوم کی درسگاہ کو "سکول" کہا جاتا ہے۔ لیکن درحقیقت ہر قسم کے علمی و فنی تعلیمی اداروں کو بھی علمی اصطلاح میں "مکتب" کا نام دیا جاتا ہے۔ چنانچہ سکول، کالج اور یونیورسٹی بھی "مکتب" کی اصطلاح میں شامل ہے۔

مکتب کے عناصر : مکتب کے عناصر ترکیبی درج ذیل ہیں:

1۔ عمارت : ایک مکتب کے لئے ایسی عمارت کا ہونا ضروری ہے، جہاں طلباء دوسرے لوگوں کی مداخلت سے بے نیاز ہو کر تعلیم حاصل کریں۔ بعض دفعہ مکتب کے لئے کوئی عمارت موجود نہیں ہوتی لیکن اس کے لئے کوئی جگہ مخصوص ہوتی ہے۔

2۔ طلباء و طالبات : ایک مکتب طلباء کی تعلیم و تربیت کے لئے قائم کیا جاتا ہے، اس لئے اس میں طلباء یا طالبات کا ہونا ضروری ہے۔

3۔ اساتذہ : طلباء کو تعلیم دینے کے لئے اساتذہ کا ہونا ضروری ہے۔ بعض جگہوں پر کسی مکتب میں صرف ایک ہی استاد ہوتا ہے اور بعض مکاتب میں کئی کئی اساتذہ ہوتے ہیں۔ جہاں ایک سے زیادہ اساتذہ ہوتے ہیں، وہاں ان میں سے ایک استاد صدر معلم کے فرائض انجام دیتا ہے۔ اعلیٰ سطح کے مکاتب میں ہر مضمون کے علیحدہ علیحدہ معلم ہوتے ہیں۔

4۔ نصاب تعلیم : ایک مکتب کے مقاصد تعلیم متعین ہوتے ہیں، جن کے تحت پڑھایا جانے والا نصاب مرتب کیا جاتا ہے۔ ابتدائی مکتب کا مقصد صرف قرآن خوانی اور بچوں کو عام دینی تعلیم دینا ہوتا ہے۔ بعض ابتدائی مدارس میں دینی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنا پڑھنا بھی سکھایا جاتا ہے۔ بعض مکتب کا مقصد حدیث و فقہ کی تعلیم ہوتا ہے اور بعض کا مقصد علمائے دین پیدا کرنا ہوتا ہے۔ بہرحال ایک مکتب کے لئے مقاصد کا متعین ہونا ضروری ہے۔

5۔ سامان : ایک مکتب میں سامان نوشت و خواند اور دیگر متعلقہ سامان کا ہونا ضروری ہے۔ مثلاً طلباء کے بیٹھنے کے لئے دریاں، ٹاٹ، صفیں یا ڈیسک وغیرہ۔ اساتذہ کے لئے کرسیاں اور میز،

سامان نوشت و خواند' رجسٹرات' سٹیشنری وغیرہ۔

6- مالی وسائل : مکتب چلانے کے لئے مالی وسائل کا ہونا ضروری ہے' مثلاً اساتذہ کی تنخواہوں اور سامان مدرسہ کی خریداری کے لئے رقوم کا بندوبست ہونا ضروری ہے۔

7- پرسکون ماحول : مکتب کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ اس میں بیرونی عناصر کا کوئی عمل دخل نہ ہو' اور وہ سیاست سے پاک ہو۔

مکتب کی اہمیت : مکتب تعلیم دینے کی جگہ ہے۔ اسلام میں ہر مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا فرض قرار دیا گیا ہے۔ پڑھنے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی اس میں پڑھنے ہی کا حکم دیا گیا ہے۔ پہلی وحی کے پہلے الفاظ یہ ہیں:

اقرا باسم ربک الذی خلق (العلق)
(پڑھ اپنے رب کے حکم سے جس نے پیدا کیا)

قرآنی تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ سب سے پہلا معلم اللہ تعالیٰ خود ہے' جس نے انسان کو پیدا کرنے کے بعد اسے تعلیم دی:

وعلم آدم الأسما کلھا (البقرہ)
(اور اس (اللہ) نے آدم کو تمام چیزوں کے نام سکھا دیئے)

اور پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب بندوں یعنی رسولوں اور نبیوں کے ذریعہ انسانوں کو تعلیم دینے کا بندوبست فرمایا۔ تمام انبیاء کرام نے معلمین کے فرائض انجام دیئے۔ خاتم المرسلیم حضرت محمد ﷺ نے تو لکھنا پڑھنا سکھانے کے لئے مدارس کا باقاعدہ انتظام بھی فرمایا۔
آنحضرت ﷺ نے علم حاصل کرنے کی ازحد تاکید فرمائی ہے۔ چنانچہ مختلف احادیث میں فرمایا گیا ہے:

1- طلب العلم فریضتہ علی کل مسلم و مسلمات
(علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے)

2- العلم افضل من العبادۃ
(علم عبادت سے افضل ہے)

3- من خرج فی طلب العلم فھو فی سبیل اللہ حتی یرجع
(جو شخص علم حاصل کرنے کے لئے (گھر سے) نکلے' وہ جب تک کہ (گھر) واپس نہ آ جائے خدا کی راہ میں ہے)

4- خیرکم من تعلم القران وعلمہ
(تم میں سے بہتر وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے)

5- جو شخص طلب علم کے لئے سفر اختیار کرے' اللہ اس کو بہشت کے راستہ پر چلاتا ہے اور فرشتے طالب علم کی رضا مندی کے لئے اپنے پروں کا اس پر سایہ ڈالتے ہیں۔

6- علماء پیغمبروں کے وارث ہیں۔

7- پیغمبروں کے بعد علماء اور مجاہدین کا درجہ ہے۔
8- تلاش علم ایسا ہی مقدس کام ہے جیسے عبادت اور اس کے حصول میں جو مصیبت اٹھائی جائے وہ جہاد ہے۔
9- قیامت کے دن علماء کی روشنائی اور شہدا کا خون ایک ہی درجہ میں ہوں گے۔
10- اس مسلمان کی کوئی قدر و منزلت نہیں جو نہ استاد ہے اور نہ طالب علم۔
11- علم و حکمت کی بات حکیم (مومن) کی گمشدہ پونجی ہے' جہاں کہیں اس کو پائے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔
12- عالم کا مرتبہ ایک عبادت گزار پر ایسا ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی فضیلت دوسرے ستاروں پر۔
13- ~~مہد سے لحد تک تلاش علم جاری رکھو خواہ اس کے لئے تمہیں چین جانا پڑے۔~~

مذکورہ بالا احادیث سے علم کی فضیلت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ ظاہر ہے کہ علم حاصل کرنے کے لئے استاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ استاد جہاں بیٹھ کر طالب علم کو درس دیتا ہے' اسی جگہ کا نام مکتب ہے۔ علم کی اہمیت مکتب کی اہمیت ہے۔

گھر کے بعد مکتب وہ پہلا مقام ہے جہاں بچے کی تربیت ہوتی ہے اور اس کے اخلاق کو سنوارا جاتا ہے۔ بچہ اپنے ماں باپ کے بعد اساتذہ کو مثالی شخصیت قرار دیتا ہے اور شعوری و لاشعوری طور پر اساتذہ سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی لئے معلم کو معمار قوم قرار دیا گیا ہے۔ آنے والی نسل کا معیار زندگی اور نظریات و اعمال مکتب ہی کی تربیت سے جلا پاتے ہیں۔ اگر مکتب میں طلباء کی تربیت پر اچھی توجہ نہ دی گئی ہو تو آنے والی نسل بھی اچھی نہیں ہو گی اور اس میں بھی بازاری لوگوں کی سی برائیاں پیدا ہو جائیں گی۔ اس طرح آئندہ نسلیں انتشار و خلفشار اور بے رہروی کا شکار ہو جائیں گی اور معاشرہ میں ابتری پھیل جائے گی۔

مقاصد مکتب : اسلام میں مکتب کا خاص مقصد قرآن و سنت کے مطابق تعلیم دینا اور طلباء کو اسلامی سیرت و کردار کا عملی نمونہ پیش کرنا ہے۔ علم حاصل کرنے کا اولین مقصد اللہ تعالیٰ کی مرضی طلب کرنا ہے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ:

1- "جس نے کسی ایسے علم کو حاصل کیا جس سے اللہ کی مرضی طلب کی جاتی ہے' مگر اس نے اس علم کو دنیا کی خاطر حاصل کیا تو قیامت کے دن جنت کی خوشبو بھی اس کو حاصل نہیں ہو گی۔"
2- جس شخص نے علم کو اس غرض سے حاصل کیا کہ وہ اس سے علماء پر فخر کرے یا جاہلوں سے جھگڑا کرے' یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرے تو اللہ تعالیٰ اس کو آگ میں داخل کرے گا۔

تاہم علمائے کرام اور مفکرین نے ایک مکتب کے مندرجہ ذیل مقاصد متعین کئے ہیں:

1- **اشاعت علم :** مکتب کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ استاد کو جو علم اپنے اساتذہ اور کتابوں سے حاصل ہوا ہے اسے دوسروں تک منتقل کر دے اور یہ علم حاصل کرنے والے اسے اپنے

عزیزوں، رشتہ داروں اور عام لوگوں تک پہنچا دیں۔ مکتب کا سب سے اہم کردار یہ ہے کہ یہاں قوم کے نونہالوں کو زیور تعلیم سے مزین کیا جاتا ہے اور جہالت کو دور کیا جاتا ہے۔ اصلاح معاشرہ کے لئے جہالت دور کرنا اور علم کی اشاعت کرنا بنیادی ضرورت ہے۔

2- سیرت و کردار کی تشکیل : بچے کی نشست و برخاست، طرز تخاطب، اخلاقی شائستگی، تہذیب، اخلاق، معاملات کی درستی، معاشرہ سے صحیح تعلق، بلند مقاصد کی لگن اور فرائض کا شعور اور ان کی ادائیگی کے صحیح اسلوب کی تربیت مکتب میں ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں ایک بچے کی سیرت کی تعمیر میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ مکتب کا اہم فریضہ یہی ہے کہ وہ قوم کے نونہالوں کی سیرت کو خالص اسلامی سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔ وہی مکاتب قابل تعریف ہیں جو بچوں میں عزت نفس، عزم ارادہ، استقامت، دیانت، شرافت، محنت، راست گروری اور بلند مقاصد کی لگن پیدا کرتے ہیں۔ اس خصوصیت کے بغیر مکتب کا وجود بیکار ہے۔

3- اخلاقی تربیت : مکتب میں طالب علم کے داخل ہونے کا مقصد صرف کتابیں پڑھ لینا اور لکھنا سیکھ لینا ہی نہیں، بلکہ استاد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس کی اخلاقی تربیت کرے۔ استاد کی شخصیت طالب علم کے لئے عملی نمونہ ہوتی ہے، اس لئے استاد کو خود بھی ہر قسم کے رذائل سے پاک ہونا چاہئے۔

بچے مکتب میں آکر بری باتوں سے آگاہ ہو جاتے ہیں اور اپنے اساتذہ کی نگرانی میں اچھے اخلاق اور پسندیدہ آداب کے خوگر ہو جاتے ہیں۔ مثلاً وقت کی پابندی، آداب مجلس، آداب نشست و برخاست، آداب شرب و طعام وغیرہ بچوں میں مکتب کے ذریعہ سے خود بخود آ جاتے ہیں۔ جو بچے مکتب کے بجائے گھر پر تعلیم حاصل کرتے ہیں وہ ان صفات سے محروم رہتے ہیں۔ بہرحال اخلاقی تربیت میں مکتب کا ماحول بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔

4- روحانی تربیت : مکتب طلباء کے لئے ایک روحانی تربیت گاہ بھی ہے، اس لئے مادیت پر زور دینے کے بجائے طلباء کی روحانی تربیت پر زور دینا چاہئے۔ روحانیت کے بغیر علم ایک ایسا خیمہ ہے جس پر بارش برستی ہے تو خیمہ کے اندر بیٹھا ہوا شخص بھیگتا نہیں۔ طالب علم کے لئے روحانیت کی بارش میں بھیگنا ضروری ہے۔

5- حکمت و فلسفہ کی تربیت : ایک طالب علم کو دینی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اسے عقلی دلائل اور رموز فلسفہ سے آگاہ کرنا ضروری ہے، تاکہ وہ ایسے لوگوں کو قائل کر سکے جو عقلی دلائل کے بغیر کسی چیز کو قبول نہیں کرتے۔

6- جمہوری اقدار کی تربیت : مدرسہ میں رہ کر بچہ اپنے اندر جمہوری اقدار پیدا کر سکتا ہے۔ اسے دوسروں کے ساتھ مل جل کر کام کرنے کی عادت باسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ حقوق و فرائض کی ادائیگی کی اہمیت بچوں کے دل میں مکتب کے ماحول میں خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔ ایثار و قربانی کا جذبہ بھی مکتب میں پیدا ہوتا ہے، کیونکہ وہاں ہر قسم کے بچوں کے ساتھ رہنا پڑتا ہے۔ نیز اچھے اور برے انسانوں کی پہچان بھی مکتب کے ماحول میں ہوتی رہتی ہے۔

7- احساس ذمہ داری : احساس ذمہ داری کا جذبہ بھی مکتب ہی میں پیدا ہوتا ہے' کیونکہ یہاں بچے کا اپنے ہم مکتب بچوں سے ہمیشہ مقابلہ رہتا ہے۔ اگر وہ کسی کام میں سستی کرے تو اسے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ استاد کا فرض ہے کہ وہ بچوں میں احساس ذمہ داری پیدا کرنے کے لئے موثر تدابیر اختیار کرے۔

8- درس مساوات : اسلام میں سب انسان برابر ہیں۔ مکتب میں امیر و غریب کا امتیاز ختم کرنے پر زور دیا جانا چاہئے۔ کسی امیر طالب علم کو غریب طالب علم پر ترجیح نہیں دینی چاہئے۔ استاد کو سب طلباء سے یکساں سلوک کرنا چاہئے۔ فرقہ واریت' متعصبانہ نظریات کی حوصلہ شکنی کرنی چاہئے۔

مکتب میں بچوں کو اخوت و مساوات کی عملی تربیت دی جاتی ہے۔ تمام امیر و غریب والدین کے بچے ایک جیسی وردی پہنتے ہیں' ایک ہی جگہ' ایک ہی جیسی نشستوں پر بیٹھتے ہیں۔ اہل مکتب سے کسی قسم کا ترجیحی سلوک نہیں کیا جاتا۔ چنانچہ مکتب میں اخوت و مساوات کا عملی نمونہ سامنے آتا ہے۔

9- تربیت نظم و ضبط : طلباء کو منظم زندگی گذارنے کی تعلیم دینی چاہئے۔ ان کو نشست و برخاست' آدب گفتگو' آدب ملاقات' آداب مجلس' آداب خوردو نوش وغیرہ سے روشناس کرانا ضروری ہے' تاکہ ان کی روز مرہ زندگی میں نظم و ضبط پیدا ہو اور آنے والا معاشرہ ایک منظم اور مہذب معاشرہ بن سکے۔

10- بزرگوں کی تعظیم و توقیر : مکتب میں رہ کر بچے بزرگوں کی تعظیم و توقیر کرنا سیکھ جاتے ہیں۔ چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا بھی مکتب ہی میں سیکھا جاتا ہے۔ استاد کو چاہئے کہ وہ بچوں کو بزرگوں کی عزت و توقیر کرنے کی تلقین کرے اور انہیں بزرگان دین کے نقش قدم پر چلنے پر آمادہ کرے۔

11- شریعت کی پابندی : استاد کو چاہئے کہ وہ خود بھی احکام شریعت پر سختی سے عمل کرے اور طالب علموں کو بھی شریعت پر عمل کرنے کی تلقین کرے۔ چنانچہ مکتب میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی موجود ہونی چاہئے جہاں نماز کے وقت باجماعت نماز ادا کرنے کا انتظام ہو۔ اسلام میں علم کا سب سے بڑا مقصد لوگوں کو تعلیم دے کر اس پر عمل کرنا اور کرانا ہے۔

مکتب کے ماحول میں رہ کر بچہ بہت سے شرعی اعمال کا پابند ہو جاتا ہے' جو آئندہ چل کر اس کی عادت اور فطرت بن جاتے ہیں۔

12- فکر و نظر کی پختگی : ہر مکتب اپنے طلبہ میں خاص انداز فکر پیدا کرتا ہے۔ نیز شعور کی پختگی اور ذہن کی ساخت کو ایک خاص سانچہ میں ڈھالتا ہے۔ آخر وہ غیر شعوری طور پر بالکل غیر محسوس طریقے سے ایک زاویہ نگاہ کے علمبر بن جاتے ہیں۔ طالب علم جب درسگاہ سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو ان کے سوچنے کا انداز بھی عام لوگوں سے مختلف ہوتا ہے۔ ایک اسلامی مکتب میں طلباء کو اسلامی انداز فکر کی جانب راغب کرنے کے لئے بہترین مواد فراہم کرنا چاہئے۔

13- اصول جہانبانی : طلباء کو علم تاریخ سے روشناس کروانے کے ساتھ ساتھ مشاہیر اسلام کے متعین کردہ اصول' اطاعت اولی الامر اور اصول جہانبانی سے بھی روشناس کرنا چاہئے۔ طلباء کو یہ بتا دینا چاہئے کہ اسلام میں دین اور سیاست دو چیزوں کا نام نہیں۔ مقتدر اعلیٰ صرف ذات الٰہی ہے اور اس کے حکم کے سوا کسی کا حکم قابل عمل نہیں۔ انسان صرف خدا کا خلیفہ ہو سکتا ہے' مطلق العنان بادشاہ نہیں بن سکتا۔

14- قوم کی ترقی میں اہم کردار : مکتب کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ وہاں سے تعلیم حاصل کرنے والے افراد قوم کی تعمیر و ترقی میں موثر کردار ادا کر سکیں۔ کسی قوم کی ترقی کا انحصار اس کے افراد کے تعلیم یافتہ ہونے پر ہے۔ مکتب ہی وہ جگہ ہے جہاں پر نہ صرف تعلیم کا اہتمام ہوتا ہے بلکہ ان کی مختلف صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے پورا پورا اہتمام کیا جاتا ہے تاکہ وہ اچھے شہری ثابت ہو سکیں اور ان کا وجود ملک کے لئے مفید ثابت ہو۔ یہ تعلیمی ادارے ہی تو ہیں جہاں سائنس دان' طبیب' ڈاکٹر' انجینئر' ماہرین قانون' ماہرین تعلیم اور اعلیٰ منتظم پیدا ہوتے ہیں' جو قوم کی کشتی کے ناخدا بنتے ہیں۔

15- معاشرتی علوم کی تعلیم : مکتب میں معاشرتی علوم کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے تاکہ آئندہ نسلیں ایک بہتر معاشرہ کی تشکیل کر سکیں۔

16- جدید علوم اور سائنسی علوم کی تعلیم : مکتب میں مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ سائنس کی تعلیم دینا بھی ضروری ہے' تاکہ مسلمان قوم سائنسی میدان میں دوسری قوموں سے پیچھے نہ رہے۔

17- فنی تعلیم : طلباء کو عملی طور پر مختلف فنون و ہنر کی تعلیم بھی دینی چاہئے تاکہ وہ اپنی عملی زندگی میں اس سے فائدہ اٹھا کر روزی کما سکیں۔ ہمارے ہاں فنی (ٹیکنیکل) تعلیم کے لئے عام مکاتب سے علیحدہ ادارے قائم کئے گئے ہیں۔

اسلامی مکتب کا ارتقاء

سوال : اسلامی مکتب کے ارتقاء پر روشنی ڈالئے!

جواب : ابتدائی اسلامی مکتب :

اسلام میں پہلا مکتب مسجد نبوی میں ایک چبوترہ پر قائم ہوا۔ جسے "صفہ" کہا جاتا تھا۔ اس "صفہ" پر بہت سے صحابہ قیام پذیر تھے' جو "اصحاب صفہ" کہلاتے تھے۔ اصحاب صفہ کی تعداد بالعموم ڈیڑھ سو افراد تک رہا کرتی تھی۔ یہ لوگ تعلیم دین حاصل کرنے کی غرض سے یہاں قیام پذیر

تھے۔ گویا یہ مدرسہ ایک بورڈنگ ہاؤس بھی تھا ان کے قیام و طعام کا بندوبست حکومت (یعنی آنحضرت ﷺ' جو اسلامی ریاست کے سربراہ تھے) کے ذمہ تھا۔ جب کوئی ہدیہ یا صدقہ آتا تو آپ سب سے پہلے اصحاب صفہ کی ضروریات پوری کرتے تھے۔ اس مکتب کے معلوم حضرت ﷺ بذات خود تھے۔ صحابہ کرام مسجد نبوی میں جمع ہو کر رسول اللہ ﷺ سے دین کی باتیں سیکھا کرتے تھے۔ اس مدرسہ سے بڑے بڑے عالم دین پیدا ہوئے۔ ان میں حضرت ابو ہریرہ کا نام سرفہرست ہے۔ اصحاب صفہ میں سے جو حضرات لکھنا پڑھنا جانتے تھے وہ دوسروں کو بھی سکھاتے تھے۔

مکتب' عہد صحابہ میں : رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد دور صحابہ میں قرآن حفظ کرنے اور حدیث لکھنے پر زیادہ زور دیا گیا۔ درس حدیث کے سلسلہ میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ کے مکتب نے نمایاں خدمات سرانجام دیں۔

مکتب عائشہ صدیقہ : حضرت عائشہ صدیقہ کا مکتب ان کا گھر تھا' جو مسجد نبوی سے ملحق تھا۔ لڑکے' عورتیں' بچے اور وہ مرد جن سے پردہ نہ تھا' ان کے حجرے میں آ جاتے تھے' باقی مسجد نبوی میں بیٹھتے تھے۔ سامنے پردہ ہوتا تھا۔ حضرت عائشہ اکثر بچوں کو حدیث سکھانے کے لئے اپنی تربیت میں لے لیتی تھیں اور ان کے مصارف خود برداشت کرتی تھیں۔ حضرت عائشہ صدیقہ کے شاگردوں کی تعداد دو سو سے زائد تھی۔ ان میں ۶۸ عورتیں تھیں۔ جلیل القدر اصحاب مثلاً ابو موسیٰ اشعری' ابو ہریرہ' عبداللہ بن عمر' عبداللہ بن عباس اور عمرو بن العاص بھی شامل تھے۔

عہد فاروقی : حضرت عمر فاروق نے تعلیم دین (حدیث و فقہ) کے لئے تمام ممالک محروسہ میں مدارس قائم کیے۔ حبان بن ابی جبلہ کو مصر میں معلم مقرر کر کے بھیجا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کو کوفہ میں معلم مقرر کیا۔ کوفہ میں ابن مسعود کے درس میں ۴۰۰ طلباء شریک درس ہوتے تھے۔

دیگر مکتب : عہد صحابہ میں اسلامی مکاتب متعدد مقامات پر قائم تھے۔ کوفہ میں ابن مسعود اور حذیفہ بن یمان کا درس جاری تھا۔ حضرت ابو درداء کا درس دمشق میں تھا۔ حضرت جابر بن عبداللہ مسجد نبوی میں درس دیا کرتے تھے۔ مکہ میں حضرت عباس کا درس اور مدینہ میں حضرت ابن عمر کا درس مشہور تھا۔

مکتب' صحابہ کے بعد : خلفائے راشدین کے بعد آنے والے دور میں قرآن خوانی' حفظ قرآن اور تحریر حدیث پر زیادہ زور دیا گیا۔ تابعین اور تبع تابعین کے دور میں مندرجہ ذیل مکاتب میں دینی تعلیم دی جاتی تھی' ان مکاتب میں حدیث پر خصوصی توجہ دی جاتی تھی۔

1- محدث بن عاصم کی درس گاہ میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے تھے۔
2- بغداد میں یزید بن ہارون کی درس گاہ تھی جس میں بے شمار لوگ شریک ہوتے تھے۔
3- شیخ عاصم ابن علی کی درس گاہ بھی یکتائی اہمیت کی حامل تھی۔
4- ابو مسلم نے جب بغداد میں درس دینا شروع کیا تو اس میں چالیس ہزار لکھنے والوں کا شمار ہوا اور سامعین اس کے علاوہ تھے۔
5- شیخ سلیمان بن حرب محدث کی درس گاہ بغداد میں قصر خلافت کے قریب تھی جس میں

خلفاء و امراء جمع ہوتے تھے۔

6- بغدلو میں علامہ فریابی کی درس گاہ بھی بہت مشہور ہوئی۔

7- امام ابو حنیفہ کی درس گاہ میں ہزاروں آدمی شریک ہوتے تھے۔

8- امام ابراہیم نخعی کے درس میں بھی بے شمار حضرات شریک ہوتے تھے۔

مسجد مکتب : ابتدائی طور پر اسلامی مکاتب مساجد میں قائم ہوئے۔ مندرجہ ذیل مسجد مکتب قابل ذکر ہیں:

1- **جامع عمر** : یہ مسجد 21ھ میں تعمیر ہوئی۔ اس مسجد میں قریباً چالیس حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ اس مسجد میں مختلف اوقات میں مختلف معلمین اسلامی علوم کا درس دیتے رہے۔ امام شافعی بھی اسی مسجد میں درس دیتے رہے۔

2- **جامع دمشق** : یہ مسجد الولید بن عبدالملک (متوفی 96ھ) نے تعمیر کرائی تھی۔ اس میں متعدد حلقہ ہائے درس قائم تھے۔ اساتذہ کے لئے معقول مشاہرہ کے علاوہ خورد و نوش کا بھی انتظام تھا۔ اس مسجد میں مالکی اور شافعی مسلک کے علیحدہ علیحدہ حلقے منعقد ہوتے تھے۔

3- **جامع منصور** : یہ مسجد 145ھ میں تعمیر ہوئی۔ اس میں الکسائی کا درس قائم ہوا۔ ان کے علاوہ مختلف معلمین طلباء کو تعلیم و تربیت دیتے رہے۔ مسجد کے مختلف حصوں میں مالک اور شافعی مسلک کے علیحدہ علیحدہ حلقے قائم تھے۔ اساتذہ کے لئے معقول مشاہرے کا انتظام تھا۔

4- **جامع کوفہ** : یہاں دوسری صدی ہجری میں مختلف معلمین درس دیتے رہے۔

5- **جامع الازہر** : یہاں فاطمی دور میں ایک درس گاہ قائم ہوئی۔ اس جامعہ میں مختلف ادوار میں مختلف علمائے کرام بطور معلوم تعلیمی خدمات انجام دیتے رہے۔

علیحدہ مکاتب : اسلامی تعلیم کا نظام کافی عرصہ تک مساجد ہی میں چلتا رہا۔ پھر کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے جن کی بنا پر مستقل مکاتب معرض وجود میں آئے۔ مساجد میں صرف قرآن و حدیث اور فقہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اب مکاتب میں قرآن و حدیث کی تعلیم کے علاوہ دیگر دنیاوی علوم کی تعلیم بھی دی جانے لگی۔ مثلاً ہیئت' فلکیات' فلسفہ' منطق' ریاضی وغیرہ۔

اہم مکاتب کے نام :

1- بعض مورخین کا خیال ہے کہ پہلا باقاعدہ مدرسہ' مصر میں' الحاکم نے 395ھ میں قائم کیا' جسے "دار لحکمت" کا نام دیا گیا۔

2- مصر میں "جامعہ الازہر" فاطمی دور میں قائم ہوا۔

3- نیشا پور میں ایک مکتب "مدرسہ سعیدیہ" کا ذکر بھی ملتا ہے' جس کا بانی نصر بن سبکتگین بتایا جاتا ہے۔ بعضوں کا خیال ہے کہ یہ مکتب 289ھ میں جاری ہوا۔ اگر اس تاریخ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو یہ حاکم کے قائم کردہ مدرسہ سے پہلے قائم ہو چکا تھا۔

4- مدرسہ ابو سعد اسماعیلی نیشا پور میں ابو سعد اسماعیل بن علی الواعظ استر آبادی نے قائم

کیا۔

5- امام بیہقی نے 384ھ میں نیشا پور میں ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی تھی۔
6- مدرسہ اصفہانیہ کے بانی ابو اسحاق اصفہانی تھے' جنہوں نے چوتھی صدی ہجری میں نیشا پور کے مقام پر یہ مدرسہ قائم کیا۔
7- مدرسہ نظامیہ' چوتھی صدی ہجری میں بغداد میں قائم ہوا' جس کے بانی نظام الملک طوسی تھے۔ اس مدرسہ کے ساتھ طلباء کے لئے دارالاقامت بھی موجود تھا۔ نظام الملک نے بغداد کے علاوہ بلخ' ہرات' نیشا پور' اصفہان' بصرہ' مرو' موصل اور عراق کے مختلف شہروں میں بھی مدارس قائم کئے۔
8- چھٹی صدی ہجری میں دمشق میں ایک مکتب قائم ہوا' جس کا نام "مدرسہ النوریہ الکبریٰ" تھا۔
9- دارالسعداء السعداء نامی مدرسہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے 569ھ میں قائم کیا۔
10- مدرسہ عمادیہ' عماد الدین (کاتب نورالدین زنگی) نے 568ھ میں قائم کیا۔
11- مدرسہ تقیہ' ملک العادل کی بیٹی مونسہ خاتون نے چھٹی صدی ہجری میں مصر میں قائم کیا۔
12- ملک العادل کی دوسری بیٹی صفہ خاتون نے بھی ایک مدرسہ کی بنیاد رکھی جو "مدرسہ فردوسیہ" کہلاتا تھا۔
13- مستنصریہ : یہ مدرسہ مستنصر باللہ (623ھ-640ھ) نے بغداد میں تعمیر کرایا۔ اس مدرسہ میں مذاہب اربعہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔ طلباء کو سامان نوشت و خواند حکومت کی طرف سے فراہم کیا جاتا تھا۔

مکاتب برصغیر میں : برصغیر پاک و ہند میں اسلام کی آمد کے بعد مندرجہ ذیل مدارس کے قیام کا پتا چلتا ہے۔

1- سلطان محمود غزنوی نے متعدد مدارس قائم کئے۔
2- سلطان شہاب الدین نے اپنے عہد حکومت میں کئی مدارس قائم کئے۔
3- ناصر الدین قباچہ نے ملتان میں ایک عظیم الشان مدرسہ تعمیر کروایا۔
4- حضرت بہاؤ الدین زکریا ملتانی نے اپنی خانقاہ کے ساتھ اعلیٰ پایہ کی اسلامی درس گاہ قائم کی۔
5- اچ شریف میں بھی ایک بڑا مکتب موجود تھا۔
6- سلطان التمش نے دہلی میں متعدد مدرسے قائم کئے۔
7- علاؤ الدین خلجی نے مسجد قوت الاسلام کے نام سے ایک مسجد تعمیر کی جس میں اعلیٰ درجہ کا مدرسہ قائم ہوا۔
8- شیر شاہ سوری نے نارنول ضلع پٹیالہ میں ایک مدرسہ بنوایا جو "مدرسہ شیر شاہ" کہلاتا تھا۔
9- مغل بادشاہوں نے اپنی عہد حکومت میں متعدد مکاتب کا اجراء کیا۔ مثلاً دہلی' لاہور'

گجرات' احمد آباد' جونپور' قنوج' ٹھٹھہ' فرخ آباد' خیر آباد' سرہند' آگرہ اور تونسہ وغیرہ میں مدارس قائم کیے۔

موجودہ دور میں' پاکستان میں اسلامی تعلیم کے لئے مخصوص مدارس "درس" (درس گاہ) کہلاتے ہیں۔ ان مدارس میں قرات' حفظ' تفسیر اور حدیث پر خصوصی توجہ دی جاتی ہے' پرانے زمانے میں ان درس گاہوں میں فلسفہ' طب' ریاضی' منطق' کلام' نجوم' فلکیات اور دیگر علوم کی تعلیم بھی دی جاتی تھی' لیکن موجودہ دور میں ان علوم پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

موجودہ دور میں پاکستان کے قریباً ہر شہر میں اسلامی درسگاہیں موجود ہیں۔ ان میں سے مندرجہ ذیل درس گاہوں کے نام قابل ذکر ہیں:

1- جامعہ اشرفیہ: لاہور
2- جامعہ نعمانیہ: لاہور
3- دارالعلوم جامعہ حنیفہ حزب الاحناف: قصور
4- مدرسہ عربیہ اسلامیہ: کراچی
5- الجامعہ الاسلامیہ (اسلامی یونیورسٹی): بہاولپور
6- مدرسہ خیر المدارس: ملتان
7- دارالعلوم حقانیہ: اکوڑہ خٹک ضلع پشاور
8- جامعہ اشرفیہ: لاہور

طرز تعلیم : ابتدائے اسلام میں مکاتب کے دو شعبے تھے. ایک شعبہ میں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی تھی اور دوسرے شعبہ میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ دینی مدارس قائم ہوئے اور طلباء کو نوشت و خواند کی تعلیم دی جانے لگی۔ طلباء ابتدائی طور پر کسی مسجد یا ابتدائی مکتب سے عربی کی ابتدائی تعلیم حاصل کرتے۔ ثانوی لیول پر نوشت و خواند کی باقاعدہ تعلیم دی جاتی تھی پھر علوم عقلیہ میں مہارت حاصل کرنے کے لئے کسی اور مدرسہ کا رخ کیا جاتا تھا۔

مدارس کی اقسام : مکتب کو بلحاظ نوعیت دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1- سرکاری مدارس : یہ مدارس حکومت کی طرف سے قائم کئے جاتے تھے اور ان کے تمام تر اخراجات حکومت ہی برداشت کرتی تھی۔ ان مدارس میں تعلیم بالکل مفت دی جاتی تھی اور ان میں ہر طبقہ کے طالب علم تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اساتذہ کا تقرر خود حکومت کرتی تھی اور انہیں معقول تنخواہ دیتی تھی۔

2- اوقاف کے مدارس : مذکورہ مدارس کے نام پر بالعموم کوئی نہ کوئی جاگیر وقف ہوتی تھی۔ ایسے مدارس کو "وقف مدارس" یا "اوقاف کے مدارس" بھی کہا جا سکتا ہے۔ بعض دفعہ ایسا ہوتا تھا کہ کسی مدرسہ کے لئے حکومت کی طرف سے کوئی جاگیر وقف کی جاتی تھی اور بعض دفعہ کوئی رئیس ایک مدرسہ قائم کر کے اس کے اخراجات کے لئے کوئی جاگیر وقف کر دیتا تھا۔ بعض دفعہ "موقوف" کا نگران عملہ علیحدہ ہوتا تھا اور بعض دفعہ اساتذہ ہی اوقاف کے نگران ہوتے تھے۔ اوقاف کے مدارس میں پڑھانے والے اساتذہ کی تنخواہیں کہیں کم اور کہیں زیادہ ہوتی تھیں۔

بہرحال معاوضہ اس قدر ہوتا تھا کہ ایک مدرس اس سے نہایت آرام کی زندگی بسر کر سکے۔ تدریس کی تنخواہ معاشی ضروریات کی کفالت کے علاوہ ہوتی تھی جو مدرس کے لئے فراہم کی جاتی تھیں۔ شیخ نجم الدین جوشانی کو جنہیں سلطان صلاح الدین نے اپنے مدرسہ صلاحیہ کا ناظم مقرر کیا تھا' ماہوار تدریس کی تنخواہ دس پونڈ' مدرسہ کے اوقاف کی نگرانی کا معاوضہ روزانہ ساٹھ رطل مصری دیا جاتا تھا۔ اس کے علاوہ کھانے پینے کے الگ اخراجات دیئے جاتے تھے۔ شیخ الازہر کے الاؤنسوں میں "سواری الاؤنس" بھی شامل تھا۔

خانقاہی مدارس : بعض صوفیائے کرام جو اپنی خانقاہوں میں زندگی بسر کرتے تھے نے اپنی خانقاہوں کے ساتھ مدارس بھی قائم کئے ہوئے تھے۔ ان مدارس میں قرآن و سنت کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس تعلیم میں تصوف کا عنصر غالب ہوتا تھا۔ ان مدارس کے طلباء بالغ ہوتے تھے۔ اور شریعت و طریقت کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ سلطان صلاح الدین ایوبی نے 569ھ میں "دارالسعد السعدا" کے نام سے ایک خانقاہ بنوائی تھی جس میں کم و بیش چار سو صوفی اقامت پذیر ہو کر دین و تصوف کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔

مدارج مدارس : مدارج کے لحاظ سے مدارس کو مندرجہ ذیل درجوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

ابتدائی مدارس : ابتدائی مدارس کے دو شعبے تھے۔ ایک شعبہ میں قرآن مجید پڑھایا اور حفظ کرایا جاتا تھا۔ دوسرے شعبے میں لکھنا پڑھنا سکھایا جاتا تھا۔

جب آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو لکھنے پڑھنے کی سختی سے تاکید کی تو مسلمان اپنے بچوں کو تعلیم دلانے لگے۔ ابتدا میں اکثر معلم یہودی تھے' مگر جلد ہی مسلمانوں نے یہ کام سنبھال لیا۔ پھر آہستہ آہستہ بچوں کو قرآنی تعلیم کے ساتھ ساتھ لکھنے کی تربیت بھی دی جانے لگی اور درجہ بدرجہ دوسرے علوم کی کتابیں بھی پڑھائی جانے لگیں۔ پھر ابتدائی مدارس میں علم ریاضی کو بھی شامل کر لیا گیا۔

ثانوی مدارس : ان مدارس میں علوم متداولہ کی تدریس کا اہتمام ہوتا تھا۔ ان مدارس میں علوم عقلیہ اور علوم نقلیہ کی تعلیم دی جاتی تھی۔

فنی مدارس : ایسے مدارس میں طب' ہندسہ اور تعمیرات وغیرہ کی تعلیم دی جاتی تھی' لیکن دینی تعلیم کو نظر انداز نہیں کیا جاتا تھا۔ ان مدارس میں نصاب تعلیم ایسا تھا کہ بیک وقت دینی اور دنیوی دونوں ضروریات کو پورا کرتا تھا۔

تخصص کے مدارس : ان مدارس کا نصاب تعلیم مخصوص ہوتا تھا۔ ہر مضمون کے علیحدہ علیحدہ شعبے ہوتے تھے۔ مثلاً شعبہ حدیث و رجال' شعبہ لغت و زبان' شعبہ طب' شعبہ فلکیات وغیرہ وغیرہ۔ ہر شعبہ میں پڑھانے والے اساتذہ اپنے اپنے فن میں ماہر ہوتے تھے۔

معیار تدریس : تدریس کے فرائض صرف وہی اساتذہ سرانجام دے سکتے تھے جن کے متعلق

ماہرین یہ تصدیق کرتے کہ وہ اس کے لئے مکمل طور پر اہلیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے ابتدائی دور میں تو یہ طریقہ تھا کہ استاد خود قابل شاگرد کو اجازت دے دیتے تھے کہ وہ اگر چاہے تو استاد کے حلقہ سے علیحدہ ہو جائے اور خود اپنا مستقل علمی حلقہ درس شروع کر دے' یا پھر استاد کی وفات کے بعد اس کے شاگردوں میں سے سب سے قابل ترین شخص کو مسند درس کے لئے منتخب کیا جاتا تھا۔ اگر استاد غلط روی اختیار کرتا تو اس پر شدید اعتراضات کئے جاتے تھے۔ اساتذہ اپنے طلباء کو نہایت محنت جانفشانی اور شفقت سے تعلیم دیتے تھے اور اپنے فرائض منصبی سے کوتاہی کو گناہ تصور کرتے تھے۔ مدارس کی تعلیم مکمل کر لینے والے طلباء کو سندیں دی جاتی تھی۔ طب کے طلباء کو اس وقت تک پریکٹس کی اجازت نہ ہوتی تھی' جب تک انہیں باقاعدہ سند نہ مل جاتی۔

برصغیر میں مدارس : برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کی آمد کے بعد دینی ضرورت کے تحت چھوٹے چھوٹے مدارس قائم ہوئے۔ ہر امام مسجد بچوں کو قرآن مجید پڑھانے کا فریضہ انجام دیتا تھا۔ بچیاں مسجد میں یا امام مسجد کے گھر پر ان کی بیوی سے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کرتی تھیں۔ بڑے شہروں میں اسلامی مکاتب کا اجراء ہوا تو دور دراز کے طالب علم اپنے گاؤں کی مسجد سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کسی نزدیکی شہر کی "درس گاہ" میں داخل ہو جاتے۔ یہ دینی درس گاہیں عرف عام میں "درس" کہلاتی تھیں۔ ان درس گاہوں میں طلبا کی رہائش کا انتظام بھی ہوتا تھا۔ بعض درس گاہوں میں صرف ابتدائی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد طلباء تحصیل علم کے لئے کسی اعلیٰ درس گاہ میں داخل ہو جاتے تھے۔ ایسے مدارس کا نصاب تعلیم متعین ہوتا تھا۔ یہاں عموماً عربی اور فارسی دونوں زبانوں کا سمجھنا ضروری تھا کیونکہ دینی علوم انہی دو زبانوں میں تھے۔ ان درس گاہوں میں تفسیر' حدیث' فقہ' صرف' نحو' منطق' کلام وغیرہ کی خصوصی تعلیم دی جاتی تھی۔

جب یہاں اردو زبان مروج ہوئی تو قرآن و حدیث اور دیگر علوم پر مشتمل دینی کتابوں کے اردو تراجم وجود میں آنے لگے۔ اب اردو زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا۔ ایسے مدارس میں "دورہ حدیث" اور نصاب تعلیم مکمل کرنے کے بعد "سند فضیلت" دی جاتی تھی۔

برصغیر میں انگریزوں کی آمد کے بعد جب سکولوں کا اجراء ہوا اور پھر کالج اور یونیورسٹیاں وجود میں آئیں تو تعلیم دو حصوں میں بٹ گئی :

1- دنیاوی تعلیم : جس کا مرکز سکول' کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔
2- دینی تعلیم : دینی تعلیم دنیاوی تعلیم سے ایک الگ شعبہ ہے۔ خالص دینی تعلیم حاصل کرنے کے خواہشمند طلباء اسلامی مکاتب (درس' دارالعلوم) میں داخل ہو کر مروجہ نصاب تعلیم کی تکمیل کرتے ہیں۔ موجودہ دور میں دینی درس گاہیں' سکولوں اور یونیورسٹیوں سے الگ رہ کر تعلیمی خدمات انجام دے رہی ہیں۔ ایسی درس گاہیں "درس نظامیہ" کہلاتی ہیں۔ صدر ضیاء الحق کے دور اقتدار میں درس نظامیہ کا امتحان پاس کرنے والے کو ایم اے اسلامیات کے برابر درجہ دے دیا گیا۔

موجودہ دور میں بیشتر اسلامی ممالک میں ایسی یونیورسٹیاں موجود ہیں جہاں دین سے متعلقہ علوم کی اعلیٰ پیمانہ پر تعلیم دی جاتی ہے۔ مثلاً جامعہ ازہر (قاہرہ' مصر) جامعہ اسلامیہ

(مدینہ منورہ) شریعت کالج (مکہ معظمہ)' کلیۃ الدراسات الاسلامیہ (بغداد' عراق) حوزہ علمیہ (قم' ایران)۔

استاد اور شاگرد کے حقوق

سوال : استاد اور شاگرد کے حقوق و فرائض پر روشنی ڈالئے!

جواب : استاد اور شاگرد کے تعلقات :

ایک معیاری مکتب کی کامیابی کا دارومدار استاد اور شاگرد کے خوشگوار تعلقات پر مبنی ہے۔ تعلیم کے خاطر خواہ نتائج کے لئے متوازن نصاب' اچھی عمارت اور پاکیزہ ماحول کی ضرورت ہوتی ہے' مگر یہ تین عناصر اسی وقت مفید نتائج پیدا کر سکتے ہیں جبکہ استاد اور شاگرد اپنے اپنے حقوق و فرائض پہچانیں اور ان پر عمل پیرا ہوں۔ ایک استاد اور شاگرد کا رشتہ ایک باپ اور بیٹے کے برابر ہوتا ہے۔

استاد کے فرائض (یعنی شاگرد کے حقوق) : علمائے دین نے قرآن و حدیث کی روشنی میں استاد و شاگرد کے مندرجہ ذیل حقوق و فرائض متعین کئے ہیں۔

طلب علم کا شوق پیدا کرنا : معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے زیر تعلیم طلبہ میں طلب علم کا شوق پیدا کرے۔ اگر یہ خصوصیت کسی استاد میں موجود نہیں تو اس کی تدریس سے خاطر خواہ نتائج مرتب نہیں ہو سکتے۔ یہ چیز استاد کے انداز تدریس پر منحصر ہے۔ استاد کو چاہئے کہ وہ طلباء کو حصول علم کے فوائد بتا کر ترغیب دے اور ان میں طلب علم کا شوق پیدا کرے اور بلند مقاصد کی لگن ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھر دے تاکہ طلباء اپنے مستقبل کو روشن کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر سکیں اور بڑی سے بڑی تکلیف کو اس بلند مقصد کے حصول میں برداشت کر سکیں۔

شفقت و محبت : معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے طلباء سے شفقت و محبت سے پیش آئے اور انہیں اپنی اولاد کے قائم مقام سمجھے۔ استاد طالب علم کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ اگر کسی طالب علم سے کوئی غلطی ہو تو استاد کو چاہئے کہ اسے مشفقانہ انداز میں درست کرے۔ اسے جسمانی طور پر سخت سزا نہ دے۔ شریر بچوں کو اپنی حکمت عملی سے خیر کی جانب راغب کرے۔ استاد کو ہر حال میں ہمدرد اور رحم دل ہونا چاہئے۔

خوش اخلاقی : معلم کو چاہئے کہ اپنے متعلمین سے خوش اخلاقی سے پیش آئے' کیونکہ ایک تند خو اور ترش رو انسان کامیاب مدرس نہیں بن سکتا۔ ایسے استاد سے طلباء نہ تو مانوس ہوتے ہیں

اور نہ ہی پوری طرح استفادہ کر سکتے ہیں۔ چنانچہ ضروری ہے کہ استاد اپنے طلباء کے مابین معمولی بے تکلفی رکھے تاکہ طلباء بے جھجک علمی فائدہ حاصل کر سکیں۔ استاد کو نرم مزاج ہونا چاہئے تاکہ طلباء اس کی موجودگی میں خوفزدہ نہ رہیں۔ استاد کی ناراضگی مصنوعی ہونی چاہئے' اسے اشتعال میں نہیں آنا چاہئے۔ اس کے ناراضگی جتلانے یا غصہ دکھانے کا مقصد طلباء کی خیر خواہی ہونا چاہئے۔ اس کی سختی اور ناراضگی میں حسد و انتقام کا جذبہ پنہاں نہیں ہونا چاہئے۔

نرم رویہ : استاد کو جماعت میں ہمیشہ نرم رویہ اختیار کرنا ہے۔ مبتدی اور محدود قابلیت کے طلباء کے لئے سہل انداز اختیار کرنا چاہئے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے :

"جو شخص اپنے مخاطب کے معیار سے بلند زبان میں نصیحت کرتا ہے اس کی گفتگو سے بعض لوگوں کے گمراہ ہونے کے احتمال ہوتا ہے۔"

بچوں کی نفسیات سے آگاہی : معلم کو متعلمین کی نفسیات سے باخبر ہونا چاہئے تاکہ وہ تدریس کا کام کامیابی سے کر سکے۔ جو استاد بچوں کی نفسیات کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے وہ اپنے مقصد میں ناکام رہتے ہیں اور بچوں کا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں۔ بعض بچے "طبعاً" شریف ہوتے ہیں اور بعض شریر۔ بعض ہوشیار ہوتے ہیں اور بعض غبی۔ استاد کو چاہئے کہ وہ ان کی نفسیات اور مزاج کو سمجھے اور حکمت عملی سے کام لے کر ان کی برائیاں' شرارتیں اور کمزوریاں دور کرنے کی کوشش کرے۔

ایثار و قربانی کا جذبہ : ایک استاد میں ایثار و قربانی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہونا چاہئے۔ اسے اپنے مفادات پر طلباء کے مفادات پر ترجیح دینی چاہئے۔ اس ضمن میں استاد کو چاہئے کہ اشد ضرورت کے سوا کبھی مدرسہ سے غیر حاضری نہ کرے' کیونکہ اس سے طلباء کی پڑھائی کا ہرج ہوتا ہے۔

اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس : معلم کا فرض ہے کہ وہ نصابی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے شاگردوں کی اخلاقی تربیت پر بھی زور دے۔ انہیں بری باتوں سے روکے اور اچھی باتوں کی تلقین کرے۔ یہ بات تبھی ممکن ہے کہ معلم خود بھی باعمل ہو اور اسلامی اخلاق سے مزین ہو۔ جہاں خدائے آنحضورﷺ کی بعثت کا مقصد بیان فرمایا وہاں یہ بتایا کہ آپ تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنے صحابہ کی اخلاقی تربیت اور تزکیہ نفس بھی کرتے ہیں اور دانائی کی باتیں سکھاتے ہیں۔ تزکیہ نفس کے بغیر تعلیم بجائے نفع کے نقصان کا باعث ہوتی ہے۔

استاد کو چاہئے کہ وہ اپنے قول و فعل میں توافق پیدا کرے ورنہ صحیح افادہ ممکن نہ ہو گا' کیونکہ اقوال دل میں اترتے ہیں لیکن اعمال کو آنکھیں دیکھتی ہیں۔

قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ "تم ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر خود عمل نہیں کرتے۔" چنانچہ اسلام میں عالم بے عمل کی کوئی وقعت نہیں۔ ایک استاد بچوں کو جو کچھ پڑھاتا اور سکھاتا ہے' اسے اس پر خود بھی عمل کرنا چاہئے' تاکہ بچے اس کی تقلید کر سکیں۔

مساوی سلوک : معلم کا فرض ہے کہ وہ اپنے تمام شاگردوں کے ساتھ مساوی سلوک کرے' کسی کو کسی پر ترجیح نہ دے' امیر و غریب' کالے اور گورے کی مصنوعی تفریق سے بالاتر ہو کر کام

کرے اور تمام طلباء کو یکساں مراعات کا مستحق سمجھے۔ اس کا فرض ہے کہ وہ طلباء کے عمومی معاملات میں غیر جانبدار رہے' ہمیشہ حق پر قائم رہے اور مظلوم کا ساتھ دے۔ کسی بیرونی دباؤ یا اثر کے تحت کوئی کام نہ کرے۔

مذہبی اعمال کی پابندی : معلوم کو چاہئے کہ وہ اپنے مذہبی اعمال کی پوری پوری پابندی کرے' کیونکہ طلباء کے سامنے استاد ایک عملی نمونہ ہوتا ہے۔ جو کچھ استاد کرے گا طلباء اس کی نقل کریں گے۔ اگر استاد نیک اعمال کا پابند ہے تو شاگرد بھی نیک اعمال کے پابند ہو جائیں گے۔ استاد کو کسی بھی مذہبی کام کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہئے۔ اسے ہر کام اور فعل مذہب کی روشنی میں کرنا چاہئے۔ مدرسہ میں قیام الصلواۃ کا انتظام ہونا چاہئے۔ طلباء میں نماز کی ادائیگی کو باقاعدہ بنانا بھی استاد کا فرض ہے۔ رمضان المبارک کے مہینا میں استاد کو خود بھی روزہ دار رہنا چاہئے اور طلباء کو بھی روزے رکھنے کی تلقین کرنی چاہئے۔

خوش پوشی اور وقار : استاد کی شخصیت پر کشش ہونی چاہئے۔ اس مقصد کے لئے معلم کو ہمیشہ خوش پوش رہنا چاہئے۔ لباس کے لئے قیمتی ہونا ضروری نہیں' مگر صاف ستھرا اور مہذبانہ ہونا ضروری ہے۔ اسے کھانے پینے' رہنے سہنے' اٹھنے بیٹھنے اور گفتگو کرنے میں اپنے وقار کو قائم رکھنا چاہئے اور عزت و خود داری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔

ایک دفعہ خلیفہ ہارون الرشید نے امام مالک سے درخواست کی کہ آپ میرے گھر آ کر مجھے حدیث پڑھا دیا کیجئے۔ امام مالک نے صاف انکار کر دیا اور فرمایا کہ علم کو پست نہ کرو ورنہ اللہ تعالیٰ تمہیں پست کر دے گا۔ تمہیں اگر پڑھنا ہے تو میرے حلقہ درس میں آ جایا کرو۔

فنی مہارت : استاد کو چاہئے کہ وہ اپنے فن کا ماہر ہو اور اپنے مضمون پر اسے عبور حاصل ہو۔ اگر وہ اپنے فن کا ماہر ہو گا تو شاگرد خود بخود اس کی دل سے عزت کریں گے۔

پرانے زمانے میں تدریس کے فرائض صرف وہی انجام دے سکتے تھے جن کے متعلق ماہرین یہ تصدیق کر دیتے تھے کہ وہ اس کے لئے مکمل طور پر اہلیت رکھتے ہیں' اگر کوئی استاد اپنے فن میں نااہل ثابت ہوتا تو اس کی شدید مذمت کی جاتی تھی۔ اس صورت میں اگر استاد کو خود احساس ہو جاتا کہ وہ اپنے فن میں ابھی تک نامکمل یا نااہل ہے تو وہ اپنے فن میں مہارت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ اس ضمن میں قاضی ابو یوسف کی زندگی کا واقعہ مشہور ہے۔ وہ امام ابو حنیفہ کے شاگرد تھے اور ہارون الرشید کے دور میں قاضی القضاۃ تھے۔ انہوں نے اپنے استاد کی زندگی میں اپنا علیحدہ حلقہ درس قائم کر لیا۔ امام ابو حنیفہ کو معلوم تھا کہ وہ اپنی پوری طرح پختگی کو نہیں پہنچے۔ چنانچہ پانچ ایسے دقیق سوال کسی کے ہاتھ ان کے پاس بھیجے کہ وہ ان کا جواب دیں۔ جب امام یوسف نے جواب غلط دیا اور محسوس کیا کہ استاد سے علیحدہ ہو کر انہوں نے غلطی کی ہے تو فوراً دوبارہ استاد کے حلقہ درس میں شامل ہو کر مزید علم حاصل کرنے لگے۔

ترویج علم : معلم کو چاہئے کہ وہ علم پھیلانے میں وسعت قلبی اختیار کرے اور بخل سے کام نہ لے۔ حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص سے علم کی کوئی ایسی بات پوچھی جائے جس کو وہ جانتا ہے اور وہ اس کو چھپا لے (یعنی نہ بتائے) تو قیامت

کے دن (اس کے منہ میں) آگ کی لگام دی جائے گی۔

صبر و استقلال : استاد کو چاہئے کہ وہ صابر اور مستقل مزاج ہو' کسی حالت میں بھی ہمت و حوصلہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑے۔ معلم کو اپنے مشن کی کامیابی کے لئے کسی بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہئے۔

تقویٰ اور خوف خدا : استاد کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ وہ متقی ہو اور اس کے دل میں خوف خدا جاگزیں ہو' کیونکہ تقویٰ ہی ایسی صفت ہے جو انسان کو حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی پر مجبور کرتی ہے۔ نیز نیکی کی رغبت اور بدی سے نفرت بھی تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں۔

ایک دفعہ امام ابو حنیفہ کا پاؤں ایک بچے کے پاؤں پر پڑ گیا۔ بچے نے چیخ کر کہا کہ : "خدا سے نہیں ڈرتا؟" امام ابو حنیفہ یہ سنتے ہی غش کھا گئے۔ اسلام کی تعلیم اساتذہ سے اسی قسم کے خوف خدا کی طالب ہے۔

اصول کی پابندی : معلم کو چاہئے کہ وہ اپنے عادات اور اخلاق میں پختہ ہو اور ایک بااصول زندگی کا علمبردار ہو۔ اپنے اصولوں سے کسی حالت میں بھی انحراف نہ کرے' خواہ اسے کتنا ہی نقصان اٹھانا پڑے' کسی لالچ' دباؤ اور دھونس وغیرہ سے متاثر نہ ہو' کفایت شعاری' سادگی' سچائی اور خدمت خلق کو اپنا شعار سمجھے۔ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلائے۔ اپنے اخراجات کو اپنی آمدنی کی حد سے نہ بڑھنے دے۔ مخلوق سے اپنی خدمات کا معاوضہ طلب نہ کرے' کیونکہ انبیاء جو معلم اعظم ہوتے ہیں کبھی مخلوق سے اپنا معاوضہ طلب نہیں کرتے۔ نیز معلم کو چاہئے کہ وہ تبلیغی اور اصلاحی جذبہ سے سرشار ہو۔ اسے ہر وقت اصلاح امت کا فکر دامن گیر ہو۔ نیز امور مدرسہ میں وقت کی پابندی کا خیال رکھے تاکہ طلباء اس سے ان تمام باتوں کا سبق سیکھیں۔

شاگرد کے فرائض (یعنی استاد کے حقوق) :

احترام استاد : شاگرد کا سب سے پہلا فرض یہ ہے کہ وہ دل سے اپنے اساتذہ کا ادب و احترام کرے۔ اس کی ہر جائز بات کو تسلیم کرے اور اس پر حتی الامکان عمل کرنے کی کوشش کرے۔ استاد کسی حیثیت کا بھی ہو اسے حقیر تصور نہ کرے۔ اسلامی تعلیمات میں استاد کو روحانی باپ کا درجہ دیا گیا ہے۔ اس لئے استاد باپ سے بھی زیادہ عزت کا مستحق ہے۔

اطاعت و پیروی : شاگرد کا فرض ہے کہ وہ اپنے استاد کی پوری اطاعت اور فرمانبرداری کرے' جان اور مال سے جو خدمت بآسانی ہو سکتی ہو کرتا رہے۔ اسلام میں شاگرد استاد کا دل سے احترام کرتے رہے ہیں۔ اساتذہ کی خدمت کرتے ہوئے اپنی جان کی پروا بھی نہیں کی جاتی تھی۔ شاگرد کو چاہئے کہ وہ اپنے استاد کے نقش قدم پر چلے۔ استاد جس کام کے کرنے کا حکم دے' اسے خوش اسلوبی سے انجام دے اور استاد جس کام کر کرنے سے منع کرے' اس کام سے رک جائے' کیونکہ استاد صرف اچھے کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور برے کاموں سے منع کرتا ہے۔

محنت و مشقت : شاگرد کو چاہئے کہ وہ ہمہ وقت اپنے تعلیمی کاموں میں مشغول رہے اور خود

کو محنت و مشقت کا عادی بنائے۔ اسے مشکل سے مشکل کام سے بھی نہیں گھبرانا چاہئے۔

وقت کی قدر : شاگرد کو چاہئے کہ تمام تعلیمی امور میں وقت کی پابندی کرے یعنی وقت پر مدرسہ آئے' وقت پر جائے' وقت پر کھائے پئے اور وقت پر جاگے اور سوئے تاکہ تعلیمی سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا نہ ہو اور اس کا قیمتی وقت ضائع نہ ہو۔

عجز و انکساری : شاگرد کو چاہئے کہ عجز و انکساری کو اپنا شیوہ بنائے' کبھی فخر و غرور نہ کرے۔ استاد سے ادب سے پیش آئے۔ امام غزالی کا قول ہے کہ : "طالب علم کو استاد کے سامنے اس طرح ہونا چاہئے جس طرح کہ مردہ زمین' جس پر بارش ہوتی ہے تو وہ زندہ ہو جاتی ہے۔"

استاد سے بحث و تمحیص سے پرہیز : متعلم کو چاہئے کہ وہ اپنے استاد سے بحث و تمحیص سے پرہیز کرے' کیونکہ اس سے بعض اوقات فریقین میں رنجش پیدا ہو جاتی ہے جس سے شاگرد کو نقصان پہنچتا ہے۔ نیز اخلاقی مسائل کی طرف بھی متوجہ ہو کیونکہ اس سے متعلم کے دل میں خلجان پیدا ہو جاتا ہے۔

عمل کے ارادہ سے علم سیکھے : شاگرد کو چاہئے کہ جو بات بھی سیکھے' اس پر عمل کرے۔ کیونکہ علم بغیر عمل کے وبال جان کا سبب ہوتا ہے۔ نیز علم کے فوائد عمل کے بغیر دستیاب نہیں ہوتے۔

ہم مکتب طلبہ سے حسن سلوک : شاگرد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے ہم مکتب طلبہ سے عموماً" اور اپنے ہم جماعت طلباء سے خصوصاً" خوش اخلاقی' ادب و احترام اور الفت و محبت سے پیش آئے' کسی کو زبان اور ہاتھ سے کوئی تکلیف نہ پہنچائے۔ اپنے ہم سبق طلباء کو اپنا بھائی تصور کرے اور ان سے برادرانہ سلوک کرے۔

اعتدال پسندی : شاگرد کو چاہئے کہ وہ کھانے پینے' لکھنے پڑھنے' کھیلنے کودنے اور سونے جاگنے میں اعتدال سے کام لے' کیونکہ آنحضورﷺ کا فرمان ہے کہ : "بہترین عمل میانہ روی کے ہوتے ہیں۔"

اخلاقی پاکیزگی : شاگرد کو چاہئے کہ وہ اخلاقی مہارت حاصل کرے۔ تمام لوگوں سے شائستہ طرز کلام اختیار کرے۔ فحش گوئی' جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے پرہیز کرے' صدق و دیانت کو اپنا شعار بنائے اور مذہب کی بتائی ہوئی تمام باتوں پر عمل کرے۔

جسمانی صحت : تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ شاگرد کا فرض ہے کہ وہ کھیل کود' جسمانی ورزش اور سیر و تفریح سے اپنی جسمانی صحت کی حفاظت کرے۔

استاد سے حسن ظن : شاگرد کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اپنے استاد سے حسن ظن رکھے اور کسی حالت میں بھی اس سے بدظن نہ ہو' اگر استاد زیادتی کرے تو بھی صبر و تحمل سے کام لے اور حرف شکایت زبان پر نہ لائے کیونکہ استاد کی سختی بھی خیر خواہی کے جذبہ سے ہوتی ہے۔

بری صحبت سے اجتناب : طلباء کا یہ اخلاقی فرض ہے کہ وہ بری صحبت سے اجتناب کریں کیونکہ یہ چیز ان کے لئے تباہ کن ہوتی ہے۔ خصوصاً" ذہن کی پختگی سے پہلے بری صحبت کے اثرات زیادہ مضر اور مہلک ہوتے ہیں۔

طالب علم کے اوصاف : نواب صدیق خاں نے اپنی کتاب ابجد العلوم میں کہا ہے کہ ایک متعلم کو مندرجہ ذیل اوصاف کا حامل ہونا چاہئے:

1- متعلم کے لئے سب سے زیادہ ضروری پاکیزگی نفس ہے۔
2- وہ دنیاوی اور مادی اغراض کو زیادہ مد نظر نہ رکھے۔
3- اپنے علم پر متکبر اور مغرور نہ ہو۔
4- تحصیل علم میں دلچسپی قائم رکھے' اختلافی مسائل میں الجھنے کی کوشش نہ کرے۔
5- جتنے بھی عمدہ علوم ہیں' سب کو حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اسے چاہئے کہ کسی ایک ہی علم کی تحصیل میں زندگی ختم نہ کر دے کہ اس سے فارغ ہو کر ہی کوئی دوسرا علم حاصل کرے گا' بلکہ اسے تمام علوم کی طرف توجہ دینی چاہئے۔
6- جب تک کسی ایک فن کے متعلق کچھ نہ کچھ معلومات حاصل نہ کر لے کسی دوسرے فن کی طرف توجہ نہ دے۔
7- تمام علوم کی تحصیل کا مقصد خوشنودی خدا ہونا چاہئے۔

بعض علمائے کرام نے طلباء کے لئے حسب ذیل اوصاف متعین کئے ہیں۔ یہ ہی اوصاف مقصد تعلیم ہیں:

1- خوف خدا
2- حضرت محمد ﷺ سے محبت
3- دین و شریعت کی پابندی
4- قوم سے محبت
5- حکومت کی اطاعت
6- اسلامی تہذیب کا عملی نمونہ

مارکیٹ / بازار (سوق)

سوال : "بازار" (سوق) یا "منڈی" سے کیا مراد ہے؟ منڈی کی اقسام اور لوازمات پر نوٹ لکھئے!

جواب : بازار :

"بازار" یا "منڈی" کو عربی زبان میں "سوق" کہا جاتا ہے۔ "منڈی" بالعموم ایسی جگہ کو

کہتے ہیں جہاں خرید و فروخت ہوتی ہو' مثلاً غلہ منڈی' سبزی منڈی وغیرہ۔ لیکن اصطلاحاً " منڈی" سے مراد کوئی خاص علاقہ نہیں' جہاں اشیاء کی خرید و فروخت ہوتی ہو' بلکہ منڈی یا بازار سے مراد وہ علاقہ ہے جہاں اشیاء کی خرید و فروخت کے لئے فروخت کرنے اور خریدنے والے آپس میں براہ راست یا بالواسطہ رابطہ قائم کر کے قیمت کا تعین کرنے کے لئے مقابلہ کر سکیں۔ اگر مقابلہ مکمل ہو تو شے کی قیمت ایک وقت میں یکساں ہو گی۔ مگر جب مقابلہ غیر مکمل ہو تو ایک شے کی کئی قیمتیں رائج ہوں گی۔

منڈی کے لئے ضروری نہیں کہ وہ کسی عمارت میں محدود ہو یا چند گز رقبہ تک محدود ہو۔ اگر دور دراز مقامات پر بیٹھے ہوئے کاروباری افراد براہ راست یا بالواسطہ رابطہ قائم کرنے کے قابل ہو سکیں تو ایسا تمام علاقہ منڈی کے زمرے میں آ جائے گا۔

منڈی کے لوازمات : منڈی یا بازار کے مندرجہ ذیل لوازم ہیں:

(1) **شے یا جنس** : شے ایسی ہو جسے دیکھا یا چھوا جا سکتا ہو اور وہ افادہ کمیابی اور انتقال پذیری کے عناصر کی حامل ہو۔ مثلاً چاول' گندم وغیرہ۔ ان میں افادہ کمیابی اور انتقال پذیرہ کے بنیادی عناصر موجود ہیں۔

شے کے مادی اور حقیقی وجود کا ضروری لین دین کے وقت منڈی میں موجود ہونا ضروری نہیں' البتہ خریدار کے ذہن میں شے کے متعلق واضح تصور کی موجودگی ضروری شرط ہے۔ تھوک منڈیوں میں اشیاء دکانوں پر موجود نہیں ہوتیں' البتہ ان کے نمونے ضرور موجود ہوتے ہیں' جنہیں دیکھ کر مال کی کوالٹی کا اندزہ لگایا جا سکتا ہے۔ آج کل بہت سی اشیاء ٹریڈ مارک کی بنا پر فروخت ہوتی ہیں۔ مثلاً لپٹن چائے' صوفی سوپ' ڈالڈا' کسان گھی' سٹیٹ سیمنٹ وغیرہ۔ ایسی اشیاء اگر سودا کرتے وقت موجود نہ بھی ہوں تو ان اشیاء کا تصور فوراً" ذہن میں آ جاتا ہے۔

(2) **فروخت کنندہ** : منڈی کے لئے مال فروخت کرنے والے کا ہونا ضروری ہے۔ فروخت کنندہ کے بغیر منڈی کا تصور محال ہے۔

(3) **گاہک یا خریدار** : اشیاء خریدنے کے لئے خریدر کا ہونا ضروری ہے' ورنہ اشیاء دھری کی دھری رہ جائیں گی۔

اسلامی نکتہ نظر سے منڈی میں جنس یا شے کا موجود ہونا ضروری ہے اور یہ بھی ضروری ہے کہ فروخت کنندہ اپنی چیز کی کوالٹی سے متعلق صحیح صحیح معلومات خریدار کے گوش گذار کر دے اور اگر شے میں کوئی نقص ہو تو اسے چھپانے کے بجائے خریدار کو سودا طے کرنے سے پہلے آگاہ کرے۔

منڈی کی اقسام : منڈی کی مندرجہ ذیل اقسام ہیں:

(1) یومیہ منڈی (2) قلیل المیعاد منڈی (3) طویل المیعاد منڈی

(1) **یومیہ منڈی** : یومیہ منڈی میں عموماً" ایسی اشیاء فروخت ہوتی ہیں' جن کا ذخیرہ کرنا

ممکن نہیں ہوتا اور یہ اشیاء ضیاع پذیر (ضیاع ہو جانے والی) ہوتی ہیں۔ مثلاً دودھ' سبزیاں' پھل' گوشت' مچھلی وغیرہ۔ ایسی اشیاء کی ایک قلیل مقدار ہی فروخت کے لئے لائی جاتی ہے اور ان کی رسد عموماً" غیر لچکدار ہوتی ہے۔ یعنی ان اشیاء پیداوار میں فی الفور اضافہ نہیں ہو تا۔ مثلاً کسی روز شہر میں کسی خاص تقریب کے لئے دودھ کی زیادہ ضرورت ہو تو بھینس بڑھتی ہوئی طلب کو پورا نہیں کر سکے گی' وہ اتنا ہی دودھ دے گی جتنا ہر روز دیتی ہے۔ ایسی اشیاء میں چونکہ رسد میں فی الفور اضافہ ممکن نہیں ہوتا اس لئے طلب میں اضافہ کی وجہ سے قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ جب طلب کم ہو جائے تو قیمت بھی کم ہو جاتی ہے۔

(2) قلیل المیعاد منڈی : ایسی منڈی میں فروخت ہونے والی اشیاء کو قلیل عرصہ کے لئے ذخیرہ کیا جا سکتا ہے۔ اگر طلب بڑھ جائے تو قیمت بھی بڑھ جاتی ہے اور طلب کم ہو جائے تو قیمت گر جاتی ہے۔

(3) طویل عرصہ کی منڈی : طویل عرصہ میں کاروبار میں توسیع کے باعث رسد میں اضافہ ممکن ہوتا ہے۔ اس لئے طلب میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ ایسی منڈی میں قیمت کا تعین شے کی طلب اور رسد کے باہمی مطابقت سے ہوتا ہے۔ طلب کے اثرات کو زائل کرنے کے لئے رسد میں کمی بیشی کی جاسکتی ہے۔

منڈی بلحاظ محل وقوع : محل وقوع کے لحاظ سے منڈی کی تین قسمیں ہیں :

(1) مقامی منڈی (2) ملکی منڈی (3) بین الاقوامی منڈی

(1) مقامی منڈی : اگر کوئی چیز کسی مخصوص علاقہ میں بنائی جائے اور اس کے گرد و نواح ہی میں فروخت ہو جائے تو ایسی منڈی کو "مقامی منڈی" کہتے ہیں۔ ایسی منڈی میں ضیاع پذیر اشیاء مثلاً دودھ' سبزیاں' پھل وغیرہ اور مقامی ضرورت کی اشیاء مثلاً ریت' بھوسہ' برف' آئس کریم وغیرہ اور علاقہ کے رسم و رواج سے متعلقہ اشیاء شامل ہوتی ہیں۔

(2) ملکی منڈی : اگر کسی شے کی خرید و فروخت ملک کے تمام حصوں میں ہوتی ہو تو اس شے کی منڈی ملکی یا قومی منڈی کہلاتی ہے۔

(3) بین الاقوامی منڈی : جن چیزوں کی خرید و فروخت دنیا کے تمام ممالک میں ہوتی ہے ان کی منڈی عالمی یا بین الاقوامی منڈی کہلاتی ہے۔ ایسی منڈی میں مقابلہ کی نوعیت عالمی ہوتی ہے۔ اشیاء پائدار ہوتی ہیں اور ان کی طلب بھی عالمی نوعیت کی ہوتی ہے۔ مثلاً سونا' چاندی وغیرہ۔ ایسی منڈیاں قائم کرنے کے لئے مختلف ممالک تجارتی تعلقات سے منسلک ہوتے ہیں اور اپنی فاضل پیداوار کو عالمی منڈیوں میں فروخت کرتے ہیں۔ عالمی تجارت عالمی امن کو مستحکم کرنے میں بھی مدد دیتی ہے اور تہذیبی ثقافتی ترقی کا ذریعہ بھی ثابت ہوتی ہے۔

منڈی بالحاظ جنس : جنس کے لحاظ سے منڈی کی چار قسمیں ہیں :

(1) عام منڈی (2) مخصوص منڈی

(3) نمونے کی منڈی (4) درجہ بندی کی منڈی

(1) عام منڈی : ایسی منڈی میں ہر قسم کی اشیاء پرچون نرخوں پر فروخت ہوتی ہیں۔ گردو نواح کے لوگ عام دکانداروں سے اپنی طلب کی اشیاء خرید کر لے جاتے ہیں۔

(2) مخصوص منڈی : ایسی منڈی میں مخصوص اور ایک ہی جنس کی اشیاء فروخت ہوتی ہیں۔ مثلاً سبزی منڈی' غلہ منڈی' کلاتھ مارکیٹ وغیرہ وغیرہ۔

(3) نمونے کی منڈی : ایسی منڈی عموماً مصنوعات پر مشتمل ہوتی ہے۔ ایسی منڈی میں اشیاء کی خرید و فروخت ان کے نمونوں سے طے کی جاتی ہے۔

(4) درجہ بندی کی منڈی : ایسی منڈی میں پیٹنٹ اور ٹریڈ مارک اشیاء فروخت ہوتی ہیں' مثلاً سپریم چائے' ڈالڈا گھی' کیپٹل آٹا' لپٹن چائے' صوفی سوپ وغیرہ۔

منڈی بلحاظ مقابلہ : مقابلہ کے لحاظ سے منڈی کی تین قسمیں ہیں:

(1) مکمل منڈی (2) نامکمل منڈی (3) اجارہ دارانہ منڈی

(1) مکمل منڈی : اگر کسی شے کی تمام اکائیاں اپنے معیار کے لحاظ سے یکساں ہوں اور ان کی خرید و فروخت کرنے والے افراد کی تعداد اس قدر زیادہ ہو کر ان میں سے کوئی بھی اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے اشیاء کی قیمت پر اثر انداز نہ ہو سکے تو ایسی اشیاء کی منڈی خالص منڈی کہلاتی ہے۔ اور اگر لوازمات کے علاوہ کسی صنعت میں نیا کام شروع کرنے اور پرانا کام بند کرنے پر کوئی پابندی نہ ہو اور اشیاء پیدا کرنے والے عاملین کی رسد لچکدار اور مکمل طور پر حرکت پذیر ہو اور خریدار اور فروخت کار منڈی کے حالات سے مکمل طور پر آگاہ ہوتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ تجارتی رابطہ سے منسلک ہوں تو ایسی منڈی "مکمل منڈی" کہلاتی ہے۔

(2) نامکمل منڈی : ایسی منڈی میں کسی شے کی تمام اکائیاں اپنے معیار کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتیں۔ گاہکوں کو منڈی کے حالات سے مکمل طور پر واقفیت نہیں ہوتی۔ کسی ایک شے کی قیمت دو دکانوں میں یکساں نہیں ہوتی۔ ایک بازار میں اس کی قیمت زیادہ ہوتی ہے تو دوسرے بازار میں کم۔ ایک گاہک ایک دکاندار سے کوئی چیز پانچ روپے میں خرید لے جاتا ہے تو دکاندار دوسرے گاہک سے اسی چیز کی قیمت آٹھ یا دس روپے وصول کر لیتا ہے۔

(3) اجارہ دارانہ منڈی : ایسی منڈی میں شے کا فروخت کار ایک فرد' فرم یا ادارہ ہوتا ہے۔ شے کوئی قریبی نعم البدل نہیں ہوتا۔ اجارہ داری قدرتی اسباب کی بنا پر بھی ہوتی ہے' مگر وہ ان دونوں اختیارات کو بیک وقت استعمال نہیں کر سکتا۔ مثلاً پاکستان کو پٹ سن' چین کو قدرتی ریشم' انڈونیشیا ربڑ حاصل کرنے اور بنانے میں قدرتی اجارہ داری حاصل ہے اور سٹیٹ بنک کو کرنسی کے اجراء اور زر مبادلہ کے لین دین کے لئے قانونی اجارہ داری حاصل ہے۔

اجارہ داری میں اجارہ دار صارفین سے مکمل مقابلے کی نسبت زیادہ قیمت وصول کرتا ہے اور اسے رسد پر کنٹرول کرنے اور قیمت کا تعین کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے مگر وہ ان دونوں

اختیارات بیک وقت استعمال نہیں کر سکتا۔ اگر وہ رسد متعین کرے تو اسے وہی قیمت وصول کرنا پڑے گی جس پر صارفین اس کی پیدا کردہ اشیاء کو خریدنے پر آمادہ ہوں۔ اس کے برعکس اگر وہ قیمت متعین کرے تو اسے اتنی مقدار میں ہی رسد فراہم کرنا پڑتی ہے جو اس کی مقرر کردہ قیمت پر صارفین خریدنے کے لئے تیار ہوں۔

منڈی کا ارتقاء : پرانے زمانہ میں جب انسانی ضروریات نہایت محدود تھیں اور وہ جنگلوں میں زندگی بسر کرتا تھا' منڈی کا وجود نہیں تھا۔ پھر انسان نے معاشرہ میں رہنا شروع کیا اور اپنی ضرورت کی اشیاء پیدا کرنا شروع کیں تو وہ ایک دوسرے سے اشیاء کا تبادلہ کرنے لگے۔ پھر انسان نے ایک آلہ مبادلہ اور پیمانہ تلاش کر لیا جسے "زر" کا نام دیا گیا۔ زر کی دریافت کے بعد لین دین میں آسانی ہو گئی اور یوں منڈی وجود میں آ گئی۔

منڈی کی اہمیت : منڈی ایک ایسا مرکز ہے جہاں صارفین اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے قریباً' ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ منڈی اخلاق کی تربیت کر کے انھیں راست گوئی' سچائی' دیانت داری اور اخوت کی تعلیم دیتی ہے۔ آپس میں میل جول اور کاروباری تعلقات پیدا ہونے سے مساوات' اتحاد اور ہمدردی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ تہذیب' تمدن اور ثقافت میں ترقی ہوتی ہے اور دوسرے علاقوں کے اہم رسم و رواج سے آگہی ہوتی ہے۔

اسلام میں تجارت اور کاروبار میں لین دین کے اصول متعین ہیں۔ اسلام میں اشیاء کی قیمتوں سے متعلق ہدایت کی گئی ہے کہ اشیاء کی قیمتیں اتنی زیادہ نہ ہوں' جو معاشرے کی اکثریت کی قوت خرید سے زیادہ ہوں۔ اسلامی معاشرہ میں مناسب قیمت ایک رعایت نہیں بلکہ بنیادی حق ہے' جسے نافذ کرنا ریاست کا فرض ہے۔ قیمتوں کا اسلامی نظریہ پیدا کاروں اور صارفین کو استحصال کی اجازت نہیں دیتا۔ پھر اسلام ناجائز منافع خوری' سود خوری' ملاوٹ اور ذخیرہ اندوزوں کی بھرپور مذمت کرتا ہے۔ اسلام میں کاروبار شراکت' معاہدہ جات اور خرید و فروخت کے دیانتدارانہ اصول انسانی معاشرہ میں عدل و انصاف فراہم کرنے کے لئے مد و معاون ثابت ہوتے ہیں' اس لئے منڈی کا تمام تر نظام اسلامی اصولوں کے مطابق ہونا ضروری ہے۔

سوال : اسلامی بازار کے ارتقاء پر مختصر نوٹ لکھئے اور اسلامی معیشت میں بازار کی خصوصیات پر روشنی ڈالئے!

جواب : اسلام اور بازار :

اسلام کے ابتدائی عہد میں بازار کا تصور موجود تھا۔ عربوں میں تجارت کا عام رواج تھا۔ آنحضرت ﷺ کے دادا حضرت عبدالمطلب اپنے وقت کے ایک بڑے تاجر تھے جن کی تجارت کا سلسلہ وسط ایشیا تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر آپ کے والد بھی اسی پیشہ سے منسلک تھے۔ آپ کے چچا

حضرت ابو طالب بھی تجارت کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ بھی اپنے چچا حضرت ابو طالب کے ہمراہ تجارتی سفر پر گئے تھے۔ جوانی میں آپ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا مال تجارت مختلف علاقوں میں فروخت کرتے رہے۔ عرب میں منڈی (سوق) بھی موجود تھی۔ بعض منڈیاں میلوں کے موقعوں پر منعقد ہوتی تھیں اور بعض لوگ اپنا مال تجارت اپنے ہمسایہ ملکوں میں فروخت کرنے کے لئے جاتے تھے۔ حضرت ابو بکر صدیق' حضرت عثمان غنی اور حضرت عباس بھی تجارت کے پیشہ سے منسلک تھے۔

اسلامی دور میں بازار کی تین واضح صورتیں تھیں۔ ایک مقامی بازار' دوسرے ملکی بازار اور تیسرے بین الاقوامی بازار۔ بین الاقوامی بازار میں مصر کا بازار' شام کا بازار اور بصرہ کا بازار مشہور تھا۔ پھر جب یہ علاقے اسلام کے زیر نگین آ گئے تو یہ ملکی بازار بن گئے۔ بین الاقوامی تجارت کے لئے عرب بالعموم کشتیاں یا جہاز استعمال کرتے تھے۔ خلافت بنو امیہ اور خلافت بنی عباس میں یہ بازار بہت وسیع ہو گیا۔ عرب تاجر برصغیر پاک و ہند' سری لنکا' ملایا اور جاپان تک پہنچ گیا۔ بعض لوگ وسط ایشیا کے ملکوں میں تجارت کرنے لگے۔

اسلام میں بازار کی خصوصیات : اسلامی معیشت میں بازار کی خصوصیات حسب ذیل ہیں:

1۔ دکانداروں یا بیچنے پر پابندی عائد ہے کہ وہ اپنے مال کی اصلیت خریدار پر واضح کر دیں۔ خریدار کو فریب دینا قانونی نکتہ نظر اور احکام الٰہی کے تحت جرم اور گناہ ہے۔ رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ جب کوئی چیز بیچنے لگو تو اگر اس میں کوئی عیب ہو تو وہ عیب خریدار پر ظاہر کر دو' ورنہ یہ فریب ہو گا' اور خریدار کو حق ہے کہ وہ عیب ظاہر ہونے پر سودا واپس کر دے۔

2۔ اسلام میں ناپ تول کر بیچی جانے والی چیز کے بارے میں حکم ہے کہ اس کے ناپ یا تول میں ذرہ بھر کمی نہ کی جائے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

واوفوا الکیل والمیزان بالقسط (انعام)

(اور انصاف کے ساتھ پورا پورا ناپ کرو' اور پورا پورا تولو)

چنانچہ ناپ اور تول میں صحیح معیار برقرار رکھنا قانونی اور شرعی اعتبار سے لازم ہے۔

3۔ اکتناز زر اسلام میں گناہ اور جرم ہے۔ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے:

والذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم

(اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو راہ خدا میں صرف نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کی خبر سنا دو۔)

فرمان نبوی ہے:

"جو کوئی سونا اور چاندی جمع کرتا ہے' پھر اس سے اس کا حق ادا نہیں کرتا' قیامت کے دن اس کے لئے آگ کی تختیاں بنائی جائیں گی' انہیں جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا اور اس کے پہلو' پیشانی اور پیٹھ کو داغ دیا جائے گا۔"

4۔ اسلام میں احتکار (ذخیرہ اندوزی) گناہ اور جرم ہے۔ فرمان نبوی ہے:

من احتکر فهو خاطی

(ذخیرہ اندوزی (احتکار) کرنے والا گنہگار ہے)

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:

الجالب مرزوق والمحتکر ملعون

(بازار میں مال درآمد کرنے والو کو رزق دیا جاتا ہے اور ذخیرہ اندوزی کرنے والے پر لعنت بھیجی جاتی ہے۔)

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا کہ:

"جو شخص چالیس دن تک غلہ روک کر رکھتا ہے اور اس کے مہنگا ہونے کا انتظار کرتا ہے' وہ اللہ سے بیزار اور اللہ اس سے بیزار ہوا۔"

5- اسلام میں اجارہ داری کی ممانعت ہے۔ امام ابو حنیفہ اور ان کے رفقاء نے ان بٹوارہ کرنے والوں کو باہم اشتراک کر کے انجمن بنا لینے سے منع کیا ہے' جو عوام کی غیر منقولہ املاک وغیرہ کے بٹوارہ کا کام اجرت لے کر کرتے ہیں' کیونکہ جب یہ اشتراک کر لیں گے تو چونکہ عوام ان کی خدمات کے محتاج ہوں گے یہ ان سے زیادہ اجرت طلب کریں گے۔

آنحضرت ﷺ کے دور میں بعض تاجر اس طرح کرتے کہ دیہات سے شہر کی طرف آنے والے قافلوں کو راستے ہی میں جا کر مل لیتے اور ان سے سودا کر لیتے۔ دیہات سے مال لانے والے چونکہ شہر کی موجودہ قیمتوں سے ناواقف ہوتے تھے اس لئے وہ کچھ منافع لے کر سستے داموں ان کے پاس مال فروخت کر دیتے تھے۔ چنانچہ جب یہ مال بازار میں آتا تو وہ لوگ زیادہ منافع لے کر اس کو فروخت کرتے اور عام لوگوں کو وہ اشیاء مہنگے داموں میں ملتیں۔ آپ نے اس طریقہ کی ممانعت فرمائی' کیونکہ اس سے اشیاء پیدا کرنے والوں کی بھی حق تلفی ہوتی اور صارفین کو بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا۔

حضرت ابو ہریرہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

"مال خریدنے کے لئے قافلہ والوں کو آگے جا کر نہ ملو' جو آگے جا کر ملا اور اس سے کوئی چیز خریدی' اس کا مالک بازار آئے تو اس کا اختیار ہے۔"

ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے:

"سامان کو آگے جا کر نہ ملو' یہاں تک کہ اس کو بازار میں لا کر اتارا جائے۔"

6- بازار میں بیچنے اور خریدنے والے کے مابین اتفاق رائے سے سودا طے پانے کے باوجود اگر بعد میں کسی کو بھی اس کا علم ہوتا ہے کہ دوسرے فریق نے اس کے ساتھ فریب کیا ہے تو مجرم سے باز پرس کی جاتی ہے اور جس فریق کو نقصان پہنچا ہے' اس کی تلافی کرائی جاتی ہے۔

7- اسلام میں سٹہ بازی (Speculation) ممنوع ہے۔ جدید دور میں سٹہ بازی کی بہت سی صورتیں ہیں' اور یہ سب کی سب حرام ہیں۔

سٹہ بازی کی ایک شکل یہ ہے کہ کچھ تاجر دیہات میں جا کر کھیتوں' پھلوں وغیرہ کے تیار ہونے سے پہلے ہی سودا کر لیتے ہیں۔ اس صورت میں بائع یا مشتری دونوں میں سے ایک کی حق تلفی ضروری ہوتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پختگی ظاہر ہونے سے پہلے پھل بیچنے کی ممانعت فرمائی ہے۔

8- اسلام میں کسی شے یا جنس کا سودا کرنے سے پہلے اس شے یا جنس کا موقع پر موجود ہونا ضروری ہے۔ کسی شے کو قبضہ میں لینے سے پہلے اس کا سودا کر لینا اور پھر اسے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر دینا ممنوع ہے۔

9- اسلامی بازار میں یہ بات مستحسن ہے کہ قیمتوں کا تعین مصنوعی طریقوں کے بجائے آزادانہ طلب و رسد کے فطری عوامل کے ذریعے ہو۔ عام حالات میں حکومت کو نرخ میں مداخلت کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے' کیونکہ قیمتوں پر کنٹرول سے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اس سے اشیاء پیدا کرنے والوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ خسارہ سے بچنے کے لئے تاجر اپنا مال بازار سے غائب کر دیتے ہیں' جس کے نتیجہ میں عام صارفین کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ جب صحابہ کرام نے آنحضرت ﷺ سے درخواست کی کہ آپ غلہ کے نرخ مقرر فرما دیں تو آپ نے فرمایا:

> "اللہ ہی نرخ مقرر کرنے والا' تنگی پیدا کرنے والا' فراخی پیدا کرنے والا اور رزق دینے والا ہے اور میں یہ چاہتا ہوں کہ اپنے رب کو اس حال میں ملوں کہ تم میں سے کوئی بھی مجھ سے کسی خون یا مال کا مطالبہ کرنے والا نہ ہو۔"

چنانچہ بعض فقہاء کا خیال ہے کہ:

> "امام کو یہ اختیار نہیں کہ لوگوں کے لئے اشیاء کے نرخ مقرر کر دے' بلکہ لوگ اپنے مال جس طرح چاہیں فروخت کر سکتے ہیں۔"

بعض علمائے کرام نے "تسعیر" (اجرت یا منافع کی شرح مقرر کر دینا) کو ناجائز قرار دیا ہے' اور بعض نے کہا ہے کہ بوقت ضرورت مثلاً غلہ وغیرہ کی کمی یا قحط کے موقع پر سربراہ حکومت قیمتوں کا تعین کر سکتا ہے۔

10- اسلام میں اشیاء کو بہت زیادہ منافع لے کر بیچنا منع ہے۔ صرف معقول منافع کی اجازت ہے۔

11- اشیاء میں ملاوٹ یا خراب اشیاء کو اچھی اشیاء بتا کر بیچنا ممنوع ہے۔

12- اسلام کے بازار میں حلال و حرام کا تصور موجود ہے۔ صرف انہی اشیاء کی تجارت کی جا سکتی ہے' جنہیں اسلام نے حلال قرار دیا ہے۔ حرام اشیاء کی تجارت ممنوع ہے' مثلاً شراب' منشیات' سامان موسیقی وغیرہ۔

13- کسی فرد کو' خواہ وہ خریدار ہو یا بیچنے والا' بازار کو متاثر کرنے کا حق نہیں ہے۔

اسلام میں قیمت کے تعین کا طریق کار: اسلامی معیشت میں قیمت کے تعین کا طریقہ کار موجود نظام سے ذرا مختلف ہے۔ موجودہ نظام معیشت میں قیمت کا تعین اول تو پیدا کرنے والا اپنی لاگت اور منافع کی شرح کے اعتبار سے طے کرتا ہے۔ لیکن بازاری قیمت ماہرین معاشیات کی نگاہ میں طلب کے تناسب سے طے ہوتی ہے۔ اگر کسی چیز کی طلب رسد کے مقابلہ میں زیادہ

ہوتی ہے تو قیمت کم ہو جاتی ہے اور جب طلب رسد کے مقابلہ میں زیادہ ہوتی ہے تو قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لیکن رسد اور طلب کے متوازن یا غیر متوازن ہونے کی صورت میں بیچنے والا مشکل ہی سے اپنی چیز بغیر منافع کے بیچتا ہے۔ ایسا بہت کم دیکھا گیا ہے کہ کوئی صنعت کار اپنی بنائی ہوئی اشیاء کو لاگت یا لاگت سے کم قیمت پر فروخت کرنے پر آمادہ ہوا ہو۔ ماہرین معاشیات نے یہ بھی خیال ظاہر کیا ہے کہ خریدار ہمیشہ کسی چیز کی قیمت اس چیز کی افادیت یا ضرورت کے اعتبار سے ادا کرتا ہے۔ صارفین کا یہ طریق کار طلب کی مقدار متعین کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ جدید معیشت میں صنعت کار ہی اپنی اشیاء کی قیمت طے کرتا ہے۔ بعد ازاں صارفین کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے قیمت میں تبدیلی کرتا ہے۔ اس کے لئے اس کا مقصد چیزوں کو بازار میں بیچنا ہوتا ہے۔

اسلامی معیشت میں بھی قیمت متعین کرنے کا حق صنعت کار کو دیا گیا ہے' لیکن اسے یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنی من مانی کرے۔ صنعت کار پر قانونی' اخلاقی اور مذہبی دباؤ اس طرح پڑتا ہے کہ وہ جائز منافع حاصل کرنے کے لئے مناسب قیمت طے کرتا ہے۔ اسلامی عہد حکومت میں زرعی معیشت تھی' لہٰذا زرعی اشیاء کی قیمت کاشتکار اپنی لاگت اور محنت کے اعتبار سے طے کرتے تھے۔ اشیاء کی قیمت عموماً" پائدار ہوا کرتی تھی' اس لئے لاگت آفات سماوی و ارضی کے سبب فصل کے تباہ و برباد ہونے کے خطرہ کم رہتا تھا۔ اس قسم کی قیمت کو موجودہ معیشت دان "عمومی قیمت" کا نام دیتے ہیں اور عمومی قیمت اور بازاری قیمت میں فرق پیدا کرنے کے لئے یہ کہا جاتا ہے کہ بازاری قیمت عمومی قیمت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اسلامی معیشت میں عمومی قیمت اور بازاری قیمت میں کوئی قابل توجہ فرق نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ موجودہ نظام معیشت کی طرح اسلامی نظام معیشت میں قیمتیں حکومتی ٹیکس عائد کرنے سے تبدیل نہیں ہوتیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کو قیمت میں شامل نہیں کیا جاتا۔ تیسری بات یہ ہے کہ موجودہ دور کی طرح حکومت اسلامی ریاست میں سکہ سازی کے ذریعے معیشت کو افراط زر یا تفریط زر کا شکار نہیں ہونے دیتی۔ موجود دور میں شرح منافع کا تصور ہی نہیں پایا جاتا۔ لہٰذا اسلامی معیشت میں عمومی یا معیار قیمت متعین ہوتی ہے۔ بازار قیمت معیاری قیمت کے تابع ہوتی ہے اور اس میں فرق بہت کم پیدا ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اسلامی معیشت میں معاشی ٹھہراؤ پایا جاتا ہے اور معاشی ترقی میں تعطل پیدا ہو جاتا ہے۔ اس تعطل کو اسلام کا نظام زکوٰۃ و صدقات دور کر دیتا ہے اور دولت ہمہ وقت معاشرے میں گردش کرتی رہتی ہے۔ دولتمند حضرات کو ہمہ وقت یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ وہ اپنا جمع شدہ سرمایہ کسی کاروبار میں لگائیں' ورنہ ان پر زکوٰۃ ادا کرنے کی صورت میں سرمایہ کے ختم ہو جانے اور دولتمند حضرات کے صاحب نصاب نہ رہنے کا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ دولت کی ہمہ وقت گردش قیمت کو متعین رکھتی ہے اور اسے تبدیلی کا شکار نہیں ہونے دیتی۔

اسلامی معیشت میں قیمت کے تعین میں حکومت کبھی اپنا اثر نہیں ڈالتی بلکہ تاجر' صنعت کار یا پیدا کنندہ کو اختیار ہے کہ وہ اپنی اشیاء کی قیمت خود مقرر کرے۔

کمیونٹی سنٹرز

سوال: اسلام میں کمیونٹی سنٹرز کی اہمیت بیان کریں۔

کمیونٹی سنٹرز کی وضاحت سے قبل ''کمیونٹی'' کی صراحت کرنا ضروری ہے۔

کمیونٹی کا مفہوم (Meaning of Community):

افراد کے ہر ایسے گروہ پر کمیونٹی کی اصطلاح کا اطلاق ممکن ہے جو کسی خاص علاقہ میں رہائش پذیر ہو اور جس کے افراد مشترکہ تہذیب کی وجہ سے پہچانے جاتے ہوں۔ تاہم اس اصطلاح کا استعمال کئی معنوں میں دیکھنے میں آیا ہے۔ کبھی تو اسے معاشرہ کے ہم معنی بولا جاتا ہے جب کہ بعض اوقات کسی خاص پیشہ سے منسلک افراد کے لیے بھی کمیونٹی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹروں اور سائنس دانوں کی کمیونٹی۔ اسے برادری کے معنی میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ شہری اور دیہی آبادی کے مابین امتیاز کی خاطر دیہی کمیونٹی اور شہری کمیونٹی کا لفظ آزادانہ بولا جاتا ہے۔ عام طور پر کمیونٹی کا استعمال انسانی آبادیوں کے لیے ہوتا ہے جیسا کہ محلہ' قصبہ' گاؤں' شہر وغیرہ۔

کمیونٹی کے بارے میں مختلف مفکرین کی آراء:

لفظ ''کمیونٹی'' کی صراحت مختلف ماہرین سماجی علوم نے اپنے اپنے انداز میں کی ہے:

(i) میکا آئیور (Macc Ivor) کمیونٹی کا اطلاق تمام شعبہ ہائے زندگی میں اشتراک و تعاون سے کام کرنے والے لوگوں پر کرتا ہے۔

(ii) اوسبورن (Osborn) نے کمیونٹی کی تعریف یوں کی ہے:

''مخصوص جگہ کے رہائشی جن کی سرگرمیاں بھی مشترک ہوں اور جو تمام امور میں یکجہتی کا مظاہرہ کریں۔''

(iii) گنزبرگ (Ginsburg) کمیونٹی کی اساس میں باہمی مفادات کا حصول اور مشترک رہائش کو اہمیت دیتا ہے۔

(iv) بوگارڈس (Bogardus) کے الفاظ میں:

''کمیونٹی ان لوگوں کے ساتھ اشتراک و تعاون کا احساس ہے جو کسی مخصوص علاقے میں رہنے والے ہوں اور جن کے مفادات اور ضروریات ایک جیسی ہوں۔''

دیہی وشہری کمیونٹی میں فرق:

(Distinction Between Folk and Urban Community)

دیہی وشہری کمیونٹی کے مابین رہن سہن' طور اطوار' رسوم ورواجات اور اقدار کے سلسلہ میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ دیہی کمیونٹیز زیادہ مربوط لیکن سائز کے اعتبار سے محدود ہوتی ہیں۔ لوگوں کا رہن سہن سادگی اور باہمی سماجی بندھنوں سے عبارت ہوتا ہے۔ نیز ان کے اندر پرائمری گروہ زیادہ فعال ہوتے ہیں۔

اس کے برعکس شہری کمیونیٹیز حجم کے اعتبار سے وسیع اور مقابلتاً گنجان ہوتی ہیں اور زندگی کی وافر آسائشوں کے باعث سادگی کم نظر آتی ہے۔ ان کے اندر ثانوی قسم کے گروہ زیادہ فعال ہوتے ہیں۔ لہٰذا ضروری نہیں کہ ایک شہری کمیونٹی کسی خاص زندگی کی ترجمانی کرتی ہو۔ کیونکہ زندگی کے طور طریقوں میں یکسانیت دیہی کمیونٹیز میں نسبتاً زیادہ ہوتی ہے۔

کمیونٹی سنٹرز کی صراحت

مفہوم اور تعریفات (Meaning and Definitions):

معاشرتی ادارہ افراد کا ایسا اجتماع ہے جس کا قیام مشترکہ مقصد کے حصول کی خاطر عمل میں لایا جائے۔ جدید معاشرہ میں فرد کے مختلف النوع مقاصد ہوتے ہیں اور اس کے مفادات کے بعض متعدد پہلو ہیں۔ لہٰذا ان کی تکمیل کی خاطر وہ مختلف انجمنوں کی تشکیل کرتا ہے اور ان کی رکنیت سے بہرہ ورہ ہوتا ہے۔ کمیونٹی سنٹر اسی طرح کا معاشرتی ادارہ ہے۔ یہ دراصل وہ جگہ ہوتی ہے جہاں لوگ تفریحی' گروہی' مذہبی' سماجی اور دیگر سرگرمیوں کے لیے اکٹھے ہوتے ہیں۔ اس کی مندرجہ ذیل تعریفات بیان کی گئی ہیں:

کیمبرج ایڈوانس لرنرز ڈکشنری (Cambridge Advance Learner's Dictionary) کے مطابق کمیونٹی سنٹرز کی تعریف مندرجہ ذیل ہے:

> "A place where people who live in an area can meet each other and play sports, take courses, etc."
>
> ”ایک جگہ جہاں وہ لوگ جو ایک علاقہ میں رہائش پذیر ہوں' ایک دوسرے سے مل سکیں اور کھیل سکیں وغیرہ۔“

وکی پیڈیا انسائیکلوپیڈیا (Wikipedia Encyclopedia) کی رو سے کمیونٹی سنٹرز کی وضاحت مندرجہ ذیل ہے:

> "Community centers are public locations where memebrs of a community tend to gather for group activities, social support, public information and other purposes. They may sometimes be open for the whole

community or for a specialised group within the greater community. Examples of community centres for specific groups include Christian Community center, Islamic community centre, Jewish community centre, youth clubs etc."

''کمیونٹی مراکز عوامی مقامات ہیں جہاں ایک کمیونٹی کے ارکان گروہی سرگرمیوں' سماجی تعاون' اطلاعات عامہ اور دیگر مقاصد کی خاطر جمع ہونے کا رجحان رکھتے ہوں۔ وہ بعض اوقات پوری کمیونٹی کے لیے کھلے ہوتے ہیں یا نسبتاً بڑی کمیونٹی کے اندر مخصوص گروہ کے لیے ہوتے ہیں۔ مخصوص گروہوں کے لیے کمیونٹی مراکز کی مثالوں میں مسیحی کمیونٹی مرکز' اسلامی کمیونٹی مرکز' یہودی کمیونٹی مرکز' نوجوانوں کے کلب وغیرہ شامل ہیں۔''

کمیونٹی سنٹرز کے مقاصد (Objectives of Community Centres):

کمیونٹی سنٹرز کے شہری اجتماعی ترقی (کمیونٹی ڈویلپمنٹ) کا حصہ ہوتے ہیں۔ ان کے مندرجہ ذیل مقاصد ہوتے ہیں:

(i) مقامی لوگوں کی سماجی' معاشی اور عمومی حالت کو سنوارنا۔
(ii) لوگوں میں ''اپنی مدد آپ'' کا جذبہ بیدار کر کے انہیں خود اپنے مسائل حل کرنے کی تحریک دینا۔
(iii) مقامی قیادت (Local Leadership) کا فروغ۔
(iv) باہمی میل جول اور بھائی چارہ کی فضا کا قیام۔
(v) حکومت اور عوام کے درمیان تعاون کا فروغ۔
(vi) غلط رسوم و رواجات کا تدارک۔

کمیونٹی سنٹرز کی خصوصیات

(Characteristics of Communit centres):

کمیونٹی سنٹرز کی بعض نمایاں خصوصیات مندرجہ ذیل ہیں:

(i) کمیونٹی سنٹرز ایک جمہوری عمل کی غمازی کرتے ہیں' جس میں لوگ خود باہمی اشتراک سے اپنے مسائل کے حل کی سعی کرتے ہیں۔

(ii) کمیونٹی سنٹرز اپنی نوعیت کے لحاظ سے کثیر المقاصد ہیں' جن میں ایک طرف تو فرد کی شخصیت اور صلاحیتوں کی نشوونما میں مدد ملتی ہے۔ دوسری طرف ان سے ایک علاقہ کے تمام طبقات کو فائدہ پہنچتا ہے۔

(iii) کمیونٹی سنٹرز کا انتظام و انصرام خود مقامی قیادت کے سپرد کیا جاتا ہے جبکہ حکومت اس ضمن میں محض

معاون اور مددگار کا کردار ادا کرتی ہے اور انہیں امدادی رقوم اور فنی معلومات فراہم کرتی ہے۔

(iv) مذہبی نوعیت کے کمیونٹی سنٹرز میں متعلقہ افراد کے اکٹھ سے ان کے مابین مذہبی ہم آہنگی اور برادرانہ تعلق پیدا ہوتا ہے۔ نیز وہ اپنے مذہب (دین) کے حوالے سے علم و آگاہی حاصل کرتے ہیں۔

(v) کمیونٹی سنٹرز لوگوں کے مابین باہمی تعلق اور ارتباط کا باعث ہوتے ہیں۔

کمیونٹی سنٹرز بطور معاشرتی ادارہ:

(Community Centres As Social Institutions):

کمیونٹی سنٹرز اہمیت کے حامل سماجی ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک سماج اسی صورت میں مستحکم اور پائیدار بنیادوں پر قائم اور برقرار رہ سکتا ہے جب کہ اس سماج کے افراد میں میل ملاپ ہوتا رہے اور ان کے مابین گہرا باہمی تعلق اور رابطہ رہے ورنہ معاشرہ میں جمود اور انحطاط کی صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے معاشرہ کی جڑ کٹ جاتی ہے اور سماج کی پوری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ دیگر الفاظ میں سماج کے قیام کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے۔ لہٰذا سماج کے اندر افراد کے مابین باہمی تعلق ناگزیر ہوتا ہے تاکہ سماج کا وجود قائم رہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے کمیونٹی ڈویلپمنٹ پروگرام کے تحت کمیونٹی سنٹرز قائم کیے جاتے ہیں جہاں سماج کے لوگ مختلف معاشرتی سرگرمیوں کے جمع ہوتے ہیں اور باہم دگر عمل (Interaction) کا موجب بنتے ہیں۔ تفریحی نوعیت کے کمیونٹی سنٹرز میں افراد ذہنی سکون اور توازن حاصل کرتے ہیں اور باہم ملتے ہیں۔ مذہبی نوعیت کے کمیونٹی مراکز میں لوگوں کا باہمی مذہبی رشتہ مضبوط ہوتا ہے اور وہ اس رشتہ کے تحت باہمی میل جول بڑھاتے ہیں۔ سماجی تعاون کے لیے قائم کمیونٹی مراکز میں لوگ جمع ہو کر اپنے مسائل کے حل کے لیے کاوش کرتے ہیں اور باہمی سماجی مشکلات و مسائل سے نپٹنے کے لیے وہ ایک دوسرے سے میل جول بڑھاتے ہیں۔

اس طرح کمیونٹی سنٹرز ایک سماج کے اندر رہنے والے تمام افراد کے باہمی تعلق اور رابطے کا ذریعہ بنتے ہیں اور بلاشبہ ایک اہم معاشرتی ادارہ کی حیثیت رکھتے ہیں جن کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

عصری ذرائع ابلاغ

سوال: اسلام میں عصری ذرائع ابلاغ پر نوٹ لکھیں۔

ابلاغ کا مفہوم (Meaning of Comminication):

ابلاغ کا لفظ "بلغ" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پھیلانا' پہنچانا اور بھیجنا۔ عربی زبان کا لفظ تبلیغ اور ابلاغ ہم معنی یا مترادف الفاظ ہیں۔ انگریزی زبان میں ابلاغ کا مترادف لفظ "Communication" کیمونیکیشن) ہے۔ یہ لفظ لاطینی لفظ "Communis" (کیمونس) کی ترقی یافتہ صورت ہے جس سے مراد "Commonness" (کامن نس) یا اشتراک ہے۔ کیمونیکیشن (Communication) کے معنی "اطلاعات و معلومات کی ترسیل' خبر رسانی یا مکتوب و مراسلہ" ہیں۔ علاوہ ازیں ریڈیو' تار' ٹیلی فون کے ذریعے سے پیغام رسانی کو "Telecommunication" (ٹیلی کیمونیکیشن) کہتے ہیں۔

ابلاغ کی تعریفات (Definitions of Communication):

ابلاغ کی صراحت مختلف انداز میں کی گئی ہے۔ اس کی بعض تعریفات حسب ذیل ہیں:

(1) "ایک ایسا عمل جس کے ذریعے سے افراد کے درمیان اطلاعات و معلومات کا تبادلہ مشترکہ علامتوں' اشارات یا مشترکہ رویہ جات کے سبب ہو' ابلاغ کہلاتا ہے۔" (ویبسٹر زنیو کالجیٹ ڈکشنری)

(2) "ابلاغ کا مطلب' ایک اطلاع یا پیغام کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا ہے۔" (جارج اے ملر)

(3) "ایک معاشرہ میں رہتے ہوئے افراد آپس میں جو گفتگو یا اشارے کریں' ان کا یہ عمل ابلاغ کہلاتا ہے۔" (ایڈورڈ ایل برنک)

(4) "ابلاغ کے لفظ میں وہ تمام طریقے شامل ہیں جن کے ذریعے سے ایک ذہن دوسرے کے ذہن پر اثرات مرتب کرتا ہے۔" (وارن ویور اور کلاؤ ڈ شانن)

(5) "وہ طریقہ جس کے ذریعہ سے خیالات یا احساسات مؤثر طور پر بیان کیے جاتے ہیں' ابلاغ کہلاتا ہے۔" (چارلس ای۔ گڈ)

ابلاغ......انسانی رابطے کا ذریعہ:

(Communication.... A Source of Human Contact):

جہان رنگ و بو اس قدر وسیع ہے کہ لاکھوں نسلوں اور سینکڑوں تہذیبوں اور ان گنت رنگوں کے انسان اس کے مکین ہیں۔ ان انسانوں میں بے شمار تفاوت موجود ہے۔ ان کے مذاہب' ادیان' افکار' علاقے' معاش' معاشرتی مسائل اور ماحول مختلف ہیں۔ لیکن ابلاغ کی ایک قسم "ابلاغ عام" نے انسانوں کی اس وسیع دنیا کو یکسر بدل کر رکھ دیا ہے اور انسان باہمی رابطے کے ذریعے سے مختلف ثقافتوں اور تہذیبوں کو ختم کر کے ایک عالمگیر

معاشرے کے قیام کے سفر پر گامزن ہے۔ ابلاغ کی جدت نے انسانی فاصلے مٹا کر رکھ دیے ہیں اور دنیا ایک "گلوبل ویلج" (Global Village) بن چکی ہے۔ ابلاغ اور ترقی لازم وملزوم ہیں۔ اگر انسان ایک دوسرے سے ابلاغ نہیں کریں گے تو معاشرہ جمود پذیر ہو جائے گا اور یوں ترقی کا عمل بھی رُک جائے گا۔

ابلاغ عام کے ذرائع (Means of Mass Communication):

ابلاغ عام ابلاغ ہی کی ایک قسم ہے جس سے وسیع پیمانے پر ابلاغ کرنے کے معنی مراد لیے جاتے ہیں۔ لوگوں کی اگر محدود تعداد ہو تو بغیر کسی ذریعہ یا واسطہ کے ابلاغ ممکن ہے۔ مگر جب ایک بہت بڑے ہجوم سے یا لاکھوں کی تعداد میں افراد سے ابلاغ کرنا ہو تو اس کے لیے جو ذریعہ استعمال ہوتا ہے اسے انگریزی میں "Medium" (میڈیم) کہا جاتا ہے۔ ابلاغ عام کے چونکہ متنوع ذرائع ہیں' لہٰذا ان ذرائع کے لیے "Media" (میڈیا) کا لفظ مستعمل ہے۔ اس لیے ہم ذرائع ابلاغ عام کو دو مختلف Media میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(i) مطبوعہ ذرائع ابلاغ عام (Print Media)

(ii) برقی ذرائع ابلاغ (Electronic Meida)

ماہرین صحافت کے نزدیک اشاعتی یا مطبوعہ صحافت سے مراد ایسے صحائف ہیں جو باقاعدہ طور پر مختلف وقفوں کے بعد زیور طبع سے آراستہ ہوتے ہیں۔ مطبوعہ ذرائع ابلاغ میں مندرجہ ذیل چیزیں شامل ہیں:

(1) روزنامے (Daily Newspapers):

عصر حاضر کے ترقی یافتہ دور میں روزنامے (اخبارات) ابلاغ عام کا ایک اہم ذریعہ ہیں۔ اخبارات کے قارئین کی تعداد بہت زیادہ ہے حتیٰ کہ ان پڑھ لوگ بھی اخبارات میں خاصی دلچسپی لیتے ہیں' کیونکہ اخبارات کے ذریعے سے دنیا بھر کی اہم خبریں اور رونما ہونے والے واقعات سے متعلق تفصیلات عامۃ الناس تک برق رفتاری سے پہنچ جاتی ہیں۔ یہ اخبارات عوامی تفریح' اطلاعات ومعلومات کے ساتھ ساتھ حالات حاضرہ پر تبصروں سے بھرے ہوتے ہیں اور رائے عامہ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ اس طرح معاشرتی ترقی اور سماجی فلاح و بہبود ان روزناموں کے پیش نظر رہتی ہے۔ لہٰذا یہ کہنا بجا ہے کہ اخبارات معاشرے کا آئینہ ہوتے ہیں۔ پاکستان کے مؤقر اور معاصر اخبارات یہ ہیں۔ روزنامہ جنگ' روزنامہ نوائے وقت' روزنامہ خبریں' روزنامہ پاکستان' روزنامہ ایکسپریس' روزنامہ دنیا' روزنامہ نئی بات' روزنامہ جہان پاکستان' روزنامہ دن' روزنامہ سماء' روزنامہ آج کل' روزنامہ اوصاف' روزنامہ انصاف وغیرہ۔

(2) ہفت روزہ اخبار (Weekly Newspaper):

ہفت روزہ اخبارات اگرچہ آج کل زیادہ اہم نہیں رہے مگر تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ صحافت کا آغاز ہفت روزہ اخبارات یا پندرہ روزہ اخبارات سے ہوا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب کہ معلومات اور اطلاعات کے

ذرائع محدود تھے۔ مگر دورِ حاضر میں کوئی خبر چند ساعتوں میں منظرِ عام پر آ جاتی ہیں' اس وجہ سے ہفت روزہ اخبارات کی وقعت اور افادیت کم ہو گئی ہے۔ اب ہفت روزہ اخبارات میں مستقل نوعیت کے موضوعات شامل ہوتے ہیں اور ہفتہ بھر کے دوران میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات' سانحات اور ملکی و غیر ملکی سطح کے سیاسی' معاشی' ثقافتی اور دیگر پہلوؤں سے وابستہ امور اور اوقعات کا خلاصہ اور تجزیہ شامل کیا جاتا ہے۔ ہفت روزہ اخبارات کو حسب ذیل اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

(الف) اخبارات کے ہفتہ وار ایڈیشن: مختلف روزنامے اپنے اخبارات کے ساتھ ایک ہفتہ وار ایڈیشن شائع کرتے ہیں جسے اخبار کا میگزین بھی کہتے ہیں۔ اس میں رنگا رنگ تصاویر' ملکی سیاست اور عالمی حالات و واقعات کی رپورٹس وغیرہ شامل ہوتی ہیں۔ ان میں ملکی معیشت' سماجی مسائل' سفرنامے' کہانیاں اور آپ بیتیاں اور شاعری شامل ہوتی ہے۔ یہ رسالے مختلف النوع قابل مطالعہ مواد کے باعث خاصے مقبول ہیں۔

(ب) ہفت روزہ میگزین: ہفت روزہ میگزین اگرچہ زیادہ مقبول نہیں مگر پھر بھی پاکستان میں ایک عرصہ سے کئی ہفت روزہ میگزین کامیابی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ان میں ملکی سیاست اور عالمی حالات پر اچھے تبصرے شامل ہوتے ہیں' جو قارئین کے ذہن کو ہلکا پھلکا کرنے کے ساتھ ساتھ اطلاعات و معلومات کی فراہمی میں بھی مؤثر ثابت ہوتے ہیں۔ ان میں اخبارِ جہاں' ندائے ملت' چٹان' زندگی' حرمت' صحافت' ایشیا' لیل و نہار' کتب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(ج) فیشن میگزین: فیشن میگزین ایسے ہفت روزہ میگزین ہیں جن میں معلومات کم اور فیشن زیادہ ہو۔ اس طرح کے میگزین میں مرد و زن کو جدید ملبوسات اور نئے رجحانات سے متعارف کروایا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں کھانا پکانا' بیوٹی ٹپس اور طبی مشورے وغیرہ بھی شائع کیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں ان کی تعداد بہت محدود ہے۔

(3) مجلے:

مجلہ انگریزی زبان کے لفظ "Periodical" کے مترادف ہے۔ اس سے مراد مخصوص وقفوں سے شائع ہونے والا مواد ہے۔ یعنی مجلے ایک خاص مدت یا دورانیہ میں شائع ہوتے ہیں۔ ان مجلوں میں شامل مواد مستقل نوعیت کا ہوتا ہے۔ ان میں زیادہ تر ادبی مواد شائع ہوتا ہے اور عالمی رجحانات کو قومی ادب میں شامل کر کے قومی ادب کی ترقی کے لیے سعی کی جاتی ہے۔ یہ تین قسموں کے ہوتے ہیں ماہانہ' سہ ماہی اور ششماہی۔ ان تینوں اقسام کے مجلات میں ایک ہی قسم کا مواد دیا جاتا ہے۔ یہ مجلے قومی ادب کے مزاج کے ترجمان ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں عالمی ادبی رجحانات کو اپنے ادب میں متعارف کروایا جاتا ہے اور ان پر تحقیقی مقالے لکھے جاتے ہیں۔ اس طرح یہ مجلے ایک مخصوص طبقہ بھی پڑھتا ہے۔ اس قسم کے مجلوں میں غزلیات' منظومات' افسانے' خاکے اور تنقیدی مقالات اور تبصرے شائع ہوتے ہیں۔ نقوش' فنون اوراق' اردو زبان' نیرنگ خیال' سویرا اور سیپ وغیرہ پاکستان کے مشہور مجلے ہیں۔

(4) ڈائجسٹ (Digest):

ڈائجسٹ سے مراد ماہانہ رسالہ ہے جس میں خبری اطلاعات کے علاوہ مستقل نوعیت کا مواد پڑھنے کو ملتا ہے۔ان کی مندرجہ ذیل قسمیں ہیں:

(الف) جاسوسی ڈائجسٹ: جن میں مختلف جرائم اور سراغ رسانی پر مبنی سنسنی خیز اور پر تجسس کہانیاں شامل ہوتی ہیں۔ان میں جاسوسی ڈائجسٹ' عمران ڈائجسٹ' سب رنگ ڈائجسٹ' امر بیل ڈائجسٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(ب) خواتین ڈائجسٹ: جن میں کھانا پکانا' بیوٹی ٹپس' بچوں کی نگہداشت وغیرہ کے موضوعات شائع کیے جاتے ہیں جو کہ خواتین کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں۔اس کی مشہور مثالیں پاکیزہ ڈائجسٹ' خواتین ڈائجسٹ وغیرہ ہیں۔

(ج) سیاسی ڈائجسٹ: جن میں ملکی اور غیر ملکی سیاسی حالات پر تبصرہ شامل ہوتا ہے۔علاوہ ازیں توازن کی خاطر تفریحی مواد بھی شامل کر لیا جاتا ہے۔اس قسم کے ڈائجسٹوں میں سیارہ ڈائجسٹ' اردو ڈائجسٹ' قومی ڈائجسٹ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(د) مذہبی ڈائجسٹ: جن میں مذہبی و روحانی مسائل شامل اشاعت ہوتے ہیں نیز عظیم مذہبی شخصیات کی زندگیوں پر مقالے تحریر کیے جاتے ہیں۔مثلاً روحانی ڈائجسٹ وغیرہ۔

(5) پیشہ ورانہ یا گروہی رسائل (Professional or Group Magazines):

یہ وہ رسائل ہیں جن میں کسی مخصوص پیشہ سے متعلق یا معاشرہ کے ایک مخصوص گروہ کے متعلق مواد شامل ہو۔ان میں عام تفریحی مواد کے بجائے فنی علم زیادہ ہوتا ہے' جس سے عام آدمی کو کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ بعض ادارے اپنے کارکنوں کی تفریح کے لیے بھی رسائل جاری کرتے ہیں۔ایسے پیشہ ورانہ رسائل' میڈیکل' فلم' پولٹری Tuknuk وغیرہ کے متعلق ہوتے ہیں اور گروہی رسائل میں بچوں کی دنیا' بچوں کے لیے تعلیم و تربیت' پھول اور نونہال وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

(6) کتب Books:

کتب حصول علم کا اہم ترین ذریعہ اور سماجی علوم کی ترسیل کا موجب بنتی ہیں۔کتاب اگر چہ صحافت میں شامل نہیں لیکن ابلاغ عامہ کا ایک اہم ذریعہ ہے۔اس کے ذریعہ سے آئندہ نسلوں تک نظریات و احساسات پہنچائے جاسکتے ہیں۔ماضی کے متعلق آج زیادہ تر علم ماضی کے حاصل شدہ کتب سے حاصل ہوا ہے۔اللہ تعالیٰ نے بھی بنی نوع انسان تک رشد و ہدایت کی ترسیل کے لیے کتاب کا ذریعہ استعمال کیا اور اپنے جلیل القدر رسولوں کو کتب و صحائف کے ساتھ دنیا میں مبعوث فرمایا۔اس لیے کتاب ابلاغ عامہ کا ایک موثر ذریعہ ہے۔

(7) پمفلٹ (Pamphlet):

اسے عرف عام میں کتابچہ بھی کہتے ہیں۔اس میں چار آٹھ یا سولہ صفحات ہوتے ہیں۔اس میں کسی مسئلہ یا واقعہ کی تفصیل کے بجائے ایک ابتدائی تعارف پیش کیا جاتا ہے۔اس میں متنوع مواد نہیں ہوتا بلکہ کسی ایک ہی مسئلہ کے بارے میں تمام ضروری تفاصیل دی جاتی ہیں۔کتابچے دراصل ضروری نوعیت کی معلومات پہنچانے کے لیے شائع کروائے جاتے ہیں۔ان کے ذریعے سے بھی ابلاغ عام کیا جاتا ہے اور مخصوص اطلاعات دوسروں تک بآسانی پہنچائی جاسکتی ہیں۔

(8) پوسٹرز (Posters):

دیواروں وغیرہ پر اشتہارات پوسٹر کہلاتے ہیں۔ہنگامی اور وقتی اہمیت کے پیغامات لکھ کر انہیں مختلف جگہوں پر لگا دیا جاتا ہے۔ان پوسٹرز کا مقصد کسی چیز کے حق میں یا خلاف پروپیگنڈہ کرنا یا فوری نوعیت کی معلومات پہنچانا ہوتا ہے۔پوسٹرز مختلف طرح کے ہوتے ہیں مثلاً کاغذی پوسٹر' لکڑی کے پوسٹر اور ٹن کے پوسٹر۔

الیکٹرانک میڈیا یا برقی ذرائع ابلاغ عام (Electronic Media):

الیکٹرانک میڈیا سے مراد ریڈیو' ٹی وی' فلم اور ریڈیو وغیرہ ہیں۔الیکٹرانک میڈیا کو مندرجہ ذیل اقسام میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

(1) ریڈیو (2) ٹیلی ویژن (3) ویڈیو (4) ٹیپ ریکارڈرز (5) انٹرنیٹ (6) فلم

ریڈیو (Radio):

ریڈیو ابلاغ عام کا مؤثر ذریعہ ہے اور ٹرانزسٹر کی وجہ سے صحافت کی رسائی ان علاقوں تک بھی ہوگئی ہے جہاں دیگر ذرائع ابلاغ سے ممکن نہیں ہوتا۔ریڈیو میں موثر اور دلکش زبان کی بدولت ناخواندہ لوگ بھی دلچسپی سے سن اور سمجھ سکتے ہیں۔ریڈیو کی نشریات کا مقصد معلومات واطلاعات کے علاوہ رائے عامہ کی تشکیل کرنا بھی ہے اور سیاسی تبصرے اور جائزے پیش کرنا ہے۔اس کے لیے ریڈیو پر موسیقی' خبریں' ڈرامے وغیرہ نشر کیے جاتے ہیں جن میں سیاسی' سماجی' معاشی' تعلیمی' ثقافتی مسائل پیش کیے جاتے ہیں۔

ریڈیو 1895ء میں اٹلی کے سائنس دان مارکونی (Marconi) نے ایجاد کیا تھا۔برصغیر پاک و ہند میں ریڈیو 1928ء میں متعارف کرایا گیا۔لاہور میں YMCA کے زیر انتظام 7/8 میل کی رینج تک نشریات پہنچانے والا چھوٹا سا ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا۔جو معاشی مسائل کے سبب سے 1936ء میں بند ہوگیا۔تاہم 16 دسمبر 1936ء کو ہی لاہور میں ایک باقاعدہ ریڈیو اسٹیشن قائم کیا گیا۔1958ء تک ریڈیو پاکستان کی نشریات 30 فیصد رقبہ میں سنی جاتی تھیں۔1971ء میں مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد ریڈیو پاکستان کا نام پاکستان براڈکاسٹنگ ایکٹ (مجریہ 1972ء) کے تحت پاکستان براڈکاسٹنگ کارپوریشن رکھا گیا۔یہ ایک نیم سرکاری ادارہ ہے جو اشتہارات اور لائسنس فیس کے علاوہ حکومتی گرانٹ سے اخراجات پورے کرتا ہے۔

1998ء میں ایف ایم 101 ریڈیو بھی قائم کیا گیا جو کہ مختلف شہروں میں قائم کیے گئے ہیں۔ پاکستان براڈ کاسٹنگ کارپوریشن سے کمرشل سروس کی ابتداء 1961ء میں ہوئی جبکہ 21اپریل 1973ء کو عالمی سروس اسلام آباد ریڈیو اسٹیشن سے شروع کی گئی۔ عالمی سروس مختلف زبانوں میں سروس مہیا کرتی ہے مثلاً انگریزی' اردو' بنگالی' کشمیری' گجراتی' ہندی' فارسی' عربی' ترک وغیرہ۔

ریڈیو مندرجہ ذیل اسباب کی بناء پر مؤثر ترین ذرائعہ ابلاغ ہے۔

(i) یہ ایک سستا ذریعہ ابلاغ ہے نیز چھوٹے سے چھوٹا ریڈیو سیٹ بھی مل سکتا ہے جو با آسانی ہاتھ یا جیب میں آ سکتا ہے۔

(ii) شہر ہوں یا دیہات' ریڈیو سے ہر فرد کما حقہ' استفادہ کرسکتا ہے' اس طرح اس کا دائرہ اثر وسیع ہے۔

(iii) دنیا بھر کی تازہ ترین خبریں ریڈیو پاکستان سے فی الفور نشریات کی جاتی ہیں۔

(iv) حادثاتی صورت حال میں ریڈیو فوراً عوام کو آ گاہی دیتا ہے اور احتیاطی تدابیر بھی بتاتا ہے۔

(v) ٹیلی ویژن کا دورانیہ بہت محدود ہے۔ تاہم اس سے ہمہ جہت پروگرام نشر کیے جاتے ہیں۔

(vi) ریڈیو سے ان پڑھ افراد بھی استفادہ کرسکتے ہیں۔

(vii) ریڈیو سے معلوماتی اور تفریحی دونوں طرح کے پروگرام سنے جاسکتے ہیں۔

(viii) ریڈیو سے معاشرتی شعور میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس کے ذریعے سے ایک ایسی نسل تیار ہو رہی ہے جس کو اپنے اور عالمی معاشرے کے بارے میں نہایت عمدہ اور تازہ ترین معلومات میسر ہیں۔

(ix) ریڈیو کے ذریعے سے معاشرہ میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے افراد اور بچوں کی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

ٹیلی ویژن (Television):

ٹیلی ویژن ابلاغ کی تکمیل کے لیے مؤثر ترین ذریعہ ہے کیونکہ کہا جاتا ہے کہ "ایک تصویر ایک ہزار الفاظ سے زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔" اسی لیے اثر پذیری کے لحاظ سے ٹیلی ویژن بہت زیادہ مؤثر ذریعہ ابلاغ ہے۔ اس میں متنوع موضوعات کے پروگرام پیش کیے جاتے ہیں اور ان میں ناظرین کی دلچسپی کے عناصر کو خاص طور پر مدنظر رکھا جاتا ہے۔ اس کے ذریعے اطلاعات و معلومات' نظریات کی پیشکش کے علاوہ رائے عامہ کی تشکیل اور تعلیم و تربیت کا کام بڑے موثر انداز سے سرانجام دیا جاتا ہے۔ ان مقاصد کے حصول کے لیے ٹی وی پر تعلیمی' علمی وادبی' موسیقی' تفریحی' سماجی و تہذیبی موضوعات پر مبنی پروگرام پیش کیے جاتے ہیں جن میں ناظرین بہت دلچسپی لیتے ہیں۔

پاکستان میں ٹیلی ویژن قائم کرنے کا فیصلہ 1963ء میں ایوبی دور میں کیا گیا تھا۔ 26 نومبر 1964ء کو لاہور اور 25 دسمبر 1964ء کو ڈھاکہ میں ٹیلی ویژن اسٹیشن قائم کردیے گئے۔ ٹیلی ویژن کی مثبت کارکردگی کے پیش نظر پاکستان نے جاپان اور برطانیہ کی ٹی وی کمپنیوں کے تعاون سے 10 فروری 1965ء کو

ٹیلی ویژن پر موٹرز کمپنی کے نام سے پرائیویٹ لمیٹڈ کمپنی قائم کی۔ 29 مئی 1965ء کو ٹیلی ویژن پر موٹرز کمپنی کو پبلک لمیٹڈ کمپنی میں تبدیل کر کے اس کا نام پاکستان ٹیلی ویژن کارپوریشن رکھا گیا۔ پاکستان ٹیلی ویژن سنٹرز سے 20 دسمبر 1976ء کو رنگین نشریات کا آغاز کیا گیا جبکہ 16 جنوری 1988ء سے صبح کی نشریات بھی جاری کی گئیں۔

پاکستان ٹیلی ویژن ایک نیم سرکاری ادارہ ہے۔ اس ادارہ کو حالیہ چند برسوں میں سیٹلائٹ ٹی وی چینلز کی بدولت اب پاکستان میں پی ٹی وی کو اجارہ داری حاصل نہیں رہی۔ اس وقت پاکستان میں لاتعداد ملکی اور غیر ملکی ٹی وی چینلز سے پی ٹی وی کو مقابلہ کرنا پڑ رہا ہے۔ ان میں مندرجہ ذیل ٹی وی چینلز اہم ہیں۔

(i) اے آر وائی	(ii) انڈس وژن	(iii) جیو ٹیلی ویژن نیٹ ورک
(iv) آج ٹی وی	(v) ایکسپریس نیوز	(vi) ایکسپریس انٹرٹینمنٹ
(vii) دنیا نیوز	(viii) ہم ٹی وی	(ix) بی بی سی ورلڈ
(x) سی این این	(xi) ڈسکوری	(xii) نیشنل جیوگرافک
(xiii) سی این بی سی	(xiv) سماء نیوز	(xv) چینل ون
(xvi) ہیرو ٹی وی چینل	(xvii) میٹروون	(xviii) ایچ بی او
(xix) سٹار موویز	(xx) کیو ٹی وی	(xxi) پیس (Peace) ٹی وی
(xxii) سٹار ورلڈ	(xxiii) مصالحہ چینل	(xxiv) کوہ نور ٹی وی
(xxv) عروج ٹی وی	(xxvi) سٹار سپورٹس	(xxvii) سکائی نیوز
(xxviii) خیبر ٹی وی	(xxix) اے ٹی وی	(xxx) پنجاب ٹی وی
(xxxi) وقت نیوز	(xxxii) مدنی چینل ٹی وی	

ویڈیو (Video):

ویڈیو فلم ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے مگر ابھی تک اس ذریعہ سے مؤثر طور پر فائدہ اٹھایا نہیں جا سکا۔ کیونکہ ویڈیو فلم کے ذریعے سے عام فلمیں تو دیکھی جاتی ہیں مگر ابھی تک ویڈیو کو تعلیم و تربیت کے لیے استعمال میں نہیں لایا گیا۔ اسی طرح وی سی آر (V.C.R) تو موجود ہیں۔ مگر ان سے فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی مثبت کوشش نہیں کی گئی۔ جس کے ذریعے سے نوجوانوں کو تعلیم کی طرف رغبت دلانے یا سرمایہ کاری' تفریح' ماہرین کے انٹرویوز یا مختلف پیشوں کے متعلق معلومات فراہم کی جا سکیں۔

ٹیپ ریکارڈرز (Tape Recorders):

ٹیپ ریکارڈرز سے ہم مختلف کیسٹس (Cassettes) لگا کر آسانی سن سکتے ہیں۔ اس طرح ابلاغ کے لیے یہ اہم ذریعہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ آج کل زیادہ تر کیسٹوں میں تفریحی مواد ہوتا ہے مگر تعلیمی و تربیتی مقاصد کے لیے بھی آڈیو کیسٹیں تیار کی جاتی ہیں۔ علماء و مشائخ کی تقاریر اور خطبات بھی ان کے ذریعے سنے

انٹرنیٹ(Internet):

عصرِ حاضر میں انٹرنیٹ بھی ابلاغ کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ الیکٹرمیل (E-mail) کے ذریعے سے ایک جگہ سے دوسری جگہ بلا تاخیر اطلاعات و معلومات کی رسائی اور پیغام رسانی کی جاسکتی ہے۔ معلومات و واقعات سے متعلق سرچ (Search) کر کے مطلوبہ مواد حاصل کیا جاسکتا ہے۔ فیس بک' یوٹیوب' گوگل سرچ' ہاٹ میل' یاہو وغیرہ انٹرنیٹ کی اصطلاحات ہیں۔ انٹرنیٹ پر ویب سائٹس (Websites) کھول کر مطلوبہ معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ علاوہ ازیں اس کے ذریعے سے چیٹنگ (Chating) یعنی گفت وشنید بھی کی جاسکتی ہے۔ انٹرنیٹ نے مصنفین' ادباء اور محققین کے لیے بے حد آسانیاں پیدا کر دی ہیں اور وہ اس کے استعمال سے کسی بھی سیاسی' ادبی' معاشی' دینی' ثقافتی اور تہذیبی موضوعات پر مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح انٹرنیٹ (بذریعہ کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ) ابلاغ عام کا ایک موثر ترین ذریعہ بن چکا ہے۔ تاہم ضروری ہے کہ اس سے فحاشی وعریانیت کے خاتمے اور مقدس شخصیات کے توہین وتحقیر کے سلسلے میں کی جانے والی ناپاک کارروائیوں کے تدارک کے لیے بھی ضروری اور فنی اقدامات کیے جائیں تاکہ نوجوان نسل بے راہ روی کا شکار نہ ہو اور کسی کے مذہبی جذبات بھی مجروح نہ ہوں۔ اس کے ذریعے رشد وہدایت کے فروغ اور بین المذاہب ہم آہنگی کے لیے کوشش کی جانی چاہیے۔

فلم (Movies):

فلم ایک موثر ذریعہ ابلاغ تھا۔ مگر ویڈیو' ٹی وی' ریڈیو' انٹرنیٹ وغیرہ کے فروغ سے فلم کی ابلاغی حیثیت کم ہوگئی۔ آج کل ماہرین' فلم کو تعلیمی' مذہبی اور سیاسی مقاصد کے لیے بھی استعمال کر رہے ہیں۔ تاہم فلم کے ذریعے سے ہم اپنی ثقافت کو فروغ دینے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

عصری ذرائع ابلاغ اور ضابطہ اخلاق:

(Current Means of Communication andCode of Conduct):

عصری ذرائع ابلاغ کو مندرجہ ذیل ضابطہ اخلاق کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

(i) اخلاقی جرائم کی خبریں دیتے ہوئے کوشش کی جائے کہ مجرم کو ہیرو بنا کر پیش نہ کیا جائے اور ایسا تاثر دینے سے گریز کیا جائے جس سے لوگوں کی ہمدردیاں مجرم کے ساتھ ہو جائیں۔

(ii) جنسی جرائم کی خبروں کو نمایاں اور چٹخارے دار بنا کر پیش نہ کیا جائے۔

(iii) حیا سوز اور عریانیت سے بھری تصاویر دکھانے سے احتراز کیا جائے تاکہ معاشرہ میں بے راہ روی' بداخلاقی اور ذہنی غلاظت پیدا نہ ہو۔

(iv) نیم عریاں تصاویر اور کیٹ واکس دکھا کر فیشن کا پرچار نہ کیا جائے اور لباس اور پہناووں کے مختلف النوع اور بدلتے انداز متعارف کرانے کے لیے نسوانیت اور جسم کی نمائش کا راستہ اختیار نہ کیا جائے۔

(v) ذرائع ابلاغ کے ذریعے سے مثبت اور تعمیری فکر کو فروغ دینے کی کوشش کی جائے اور غلط اور منفی پالیسیاں اپنا کر انسانی فکر کو جلاء بخشنے کے بجائے تاریک کرنے کا سلسلہ بند کیا جائے۔

(vi) کوئی بھی خبر بغیر تحقیق کے شائع اور نشر نہ کی جائے اور اس طرح جھوٹی، من گھڑت اور بے بنیاد خبروں کا سلسلہ روکا جائے اور افواہ سازی نہ کی جائے۔ قرآن حکیم کا بھی یہی حکم ہے کہ "اے ایمان والو! اگر کوئی شریر آدمی تمہارے پاس کوئی خبر لائے تو خوب تحقیق کر لیا کرو، کہیں کسی قوم کی نادانی سے کوئی ضرر نہ پہنچا دو۔" (الحجرات:6)

(vii) ذرائع ابلاغ (میڈیا) کے افراد عوام کو بلیک میل کرنے کی کوشش نہ کریں اور ناجائز فائدے حاصل نہ کریں۔

(viii) ذرائع ابلاغ کا کام معاشرے میں ہم آہنگی اور یکجہتی پیدا کرنا ہے۔ انہیں اختلافی بیانات کو بڑھا چڑھا کر پیش کر کے ملک میں سیاسی محاذ آرائی میں اضافہ نہیں کرنا چاہیے۔

(xi) ذرائع ابلاغ کو غیر معیاری، بازاری اور لچر زبان کا استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ سطحیت کے باعث الفاظ غیر موثر ہو جاتے ہیں اور قارئین و ناظرین پر بھی اس کا برا اثر پڑتا ہے۔

(x) پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کو اشتہارات کی بھرمار سے اجتناب کرنا چاہیے۔ اس سے اگرچہ ذرائع ابلاغ کو مالی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن قاری و ناظر کے لیے یہ اشتہارات ذہنی کوفت کا سبب بنتے ہیں۔

ذرائع ابلاغ ....ایک معاشرتی ادارہ:

(Means of Communication......A Social Institution):

ذرائع ابلاغ کسی بھی معاشرے کا عکاس ہوتے ہیں۔ ان کا کام معاشرہ کی حقیقی تصویر دکھانا اور اس میں موجود مختلف النوع مسائل کو اجاگر کرنا ہے۔ ذرائع ابلاغ معاشرے میں پھیلے ہوئے مسائل کو منظر عام پر لاتے اور ارباب اقتدار کی توجہ مبذول کرا کے ان عوامی مسائل کے حل کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ذرائع ابلاغ کی بنیادی ذمہ داری ہے۔ علاوہ ازیں یہ معاشرے کو تازہ ترین بدلتے ہوئے حالات و واقعات اور سیاسی نشیب و فراز سے آگاہی دیتے اور رائے عامہ کی تشکیل میں اپنا غیر جانبدارانہ اور موثر کردار ادا کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ایک اہم معاشرتی ادارہ ہیں۔ اس معاشرتی ادارہ کی ترقی کے لیے ضروری ہے کہ یہ آزاد اور خود مختار ہو اور آمر اور طالع آزما حکمرانوں کے اثر و رسوخ اور دباؤ سے قطعی آزاد ہو مگر یہ بھی ضروری ہے کہ یہ اہم معاشرتی ادارہ بے قید اور بے لگام نہ ہو اور اپنی آزادی کا ناجائز فائدہ نہ اٹھائے۔ اس پر کچھ اخلاقی، قانونی، مذہبی بندشیں ضرور ہوں تاکہ معاشرہ کی اجتماعی نشوونما اور فلاح و بہبود کا کام ان کے ذریعے سے بہ انداز احسن کیا جا سکے کیونکہ بے قید آزادی میں بہت سی قباحتیں ہیں۔

ذرائع ابلاغ اور فروغ اسلام:

(Means of Communication and Promotion of Islam):

ذرائع ابلاغ رائے عامہ اور تبلیغ و اصلاح کے فروغ کے لیے بہت موثر ہتھیار ہیں۔ ضروری ہے کہ ان کے ذریعہ سے اسلام کی اعلیٰ اور شاندار اخلاقی تعلیمات کو فروغ دیا جائے، کرنے کا اصل کام یہی ہے۔ اللہ کے دین کی سربلندی اور اس کے احکام کی ترویج و اشاعت عصر حاضر کی اہم ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے عصری جدید ذرائع ابلاغ کے استعمال سے بہتر کوئی طور طریقہ نہیں ہے۔

غیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشرہ کا تقابل

سوال: غیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشرے کا تقابل بیان کریں۔

غیر اسلامی معاشرہ اور اسلامی معاشرہ کا تقابلی جائزہ لینے کے لیے سب سے پہلے ضروری ہے کہ دونوں طرح کی معاشرت کا مفہوم سمجھ لیا جائے۔ اس سے دونوں کا موازنہ سہل ہو جائے گا۔

اسلامی معاشرہ کا مفہوم:

(ا) اسلامی معاشرہ یہ نہیں کہ اس کے دستور میں یہ شق موجود ہو کہ ریاست کا دین و مذہب اسلام ہوگا اور پھر ریاست کا ہر معاملہ اسلام سے کوسوں دور ہو۔

(ب) وہ معاشرہ بھی اسلامی معاشرہ کہلانے کا مستحق نہیں ہے جو جمعہ کو اپنے دفاتر اور وزارتیں بند رکھتا ہو' اسلامی تہواروں (عیدین وغیرہ) کو اجتماعی طور پر مناتا ہو' ریڈیو اور ٹیلی ویژن سے اذان اور قرآن کریم کی تلاوت نشر کرتا ہو اور اس کے ساتھ نماز پڑھنے والوں کی اقامتِ نماز کے لیے ہمت افزائی کرتا ہو نہ نماز کے تارکین کو سزا دیتا ہو' شریعتِ قرآنی کو قائم کرتا ہو نہ معاشرہ کو آدابِ قرآن کی تعلیم دیتا ہو۔

(ج) وہ معاشرہ بھی اسلامی معاشرہ نہیں جو شریعت کے مطابق قوانین وضع کرتا ہو یا قوانین کو اسلامی شریعت کے مطابق ڈھالتا ہو اور پھر اجتماعی' فکری اور اخلاقی زندگی کو غیر اسلامی راستوں پر بھٹکتا چھوڑ دیتا ہو۔

اسلامی معاشرہ...... وہ معاشرہ ہے جس کی رہنمائی اسلام کے عقائد کرتے ہوں' جس پر اسلامی قوانین کی حکمرانی ہو' جس کی قیادت و سیادت اسلامی عقائد و نظریات اور اسلامی اخلاق و اقدار کے ہاتھ میں ہو' جس پر اسلام کی روایات کو بالادستی حاصل ہو اور جس کے ہر شعبہ میں اسلام کی روح رواں دواں ہو اور جس میں ہر چیز اللہ کے رنگ میں رنگی ہو۔

"صبغة الله ومن احسن من الله صبغة" (سورۃ البقرہ: 128)

"اللہ کا رنگ (اختیار کرو) اور اللہ سے بڑھ کر کس کا رنگ اچھا ہے؟"

اسلامی معاشرہ ایک عقیدہ اور نظریہ پر مبنی ہے' یہ دعوت اور نصب العین کا معاشرہ ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ زندگی کے تمام شعبوں میں...... خواہ وہ روحانی و مادی ہوں' فکری و عملی ہوں یا تعلیمی و ثقافتی...... خواہ روحانی و اجتماعی یا اقتصادی و سیاسی...... اس عقیدہ و نظریہ کو عملی جامہ پہنایا جائے۔

(اسلامی نظام کے قیام کا راستہ: علامہ ڈاکٹر یوسف القرضاوی' مترجم محمد طفیل انصاری صفحہ 10,9,8' مطبوعہ ادارہ دراسات اسلامیہ لاہور)

غیر اسلامی معاشرہ کا مفہوم:

غیر اسلامی معاشرہ اسلامی معاشرہ کی ضد ہے۔ یہ ان خصوصیات اور محاسن سے محروم معاشرہ ہے جو

اسلامی معاشرہ کا خاصہ ہیں۔ یہ اسلام کی روشنی سے محروم معاشرہ ہے۔ اس میں ظلمت اور تاریکی ہے فکری انتشار کی' عملی کجروی کی' ضعیف الاعتقادی کی' کھوکھلے نظریات کی اور بے سروپا افکار کی۔ یہ معاشرہ ان افراد کا مجموعہ ہے جو دین متین کی متعین کردہ مستقیم اور روشن راہوں سے بہت دور ہیں اور اسی سبب سے نشان منزل سے بھی محروم ہیں۔ وہ اپنے ہی وضع کردہ "ازموں" (فاشزم' کمیونزم' سیکولرازم' سوشلزم' کیپٹل ازم......) کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہے ہیں جن میں نہ تو حق کا وجود پایا جاتا ہے اور نہ ہی فلاح دائمی کی کوئی امید اور راستہ۔ ان کی تہذیب و معاشرت ماسوائے بربادی اور دائمی خسران کے کچھ نہیں۔

تمہاری تہذیب اپنی خنجر سے آپ خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا' ناپائیدار ہوگا (اقبالؒ)

اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی معاشرہ میں خطِ امتیاز:

حسب ذیل عنوانات کے تحت اسلامی معاشرہ اور غیر اسلامی معاشرہ کے درمیان خط امتیاز کھینچا جا سکتا ہے۔

1۔ عقیدہ توحید:

اسلامی معاشرے کا پہلا اہم اصول اور نمایاں خصوصیت عقیدۂ توحید ہے۔ توحید سے مراد اللہ تعالیٰ کی ہستی پر کامل ایمان لانا اور اسے واحد اور لاشریک سمجھنا ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے جس کے فروغ کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل اس دنیا میں مبعوث فرمائے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اور (لوگو) تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔ اس بڑے مہربان رحم کرنے والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔" (البقرۃ:163)

"اور خدا نے فرمایا ہے کہ دو دو معبود نہ بناؤ' معبود وہی ایک ہے تو مجھ ہی سے ڈرتے رہو۔" (النحل:51)

"کہہ دو کہ ہر چیز کا خالق صرف اللہ ہے اور وہ واحد اور سب پر غالب ہے۔" (الرعد:16)

"اگر آسمان اور زمین میں خدا کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین و آسمان درہم برہم ہو جاتے۔ جو باتیں یہ لوگ بتاتے ہیں خدائے مالک عرش ان سے پاک ہے۔" (الانبیاء:22)

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دو کہ وہ اللہ ایک ہے' معبود برحق بے نیاز ہے' نہ کسی کا باپ ہے اور نہ کسی کا بیٹا' اور کوئی اس کا ہمسر نہیں۔" (الاخلاص:1تا4)

"(وہ) معبود (برحق) ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اس کے (سب) نام اچھے ہیں۔" (طٰہٰ:8)

"جو شخص اپنے پروردگار سے ملنے کی امید رکھے اسے چاہیے کہ عمل صالح کرے اور اپنے پروردگار کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔" (الکہف:110)

اسلامی معاشرہ کے افراد عقیدۂ توحید سے سرشار ہوتے ہیں اور خدا کی وحدانیت پر ان کا پختہ اور غیر متزلزل ایمان ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں کفر و الحاد اور شرک کے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس غیر

اسلامی معاشرہ میں توحید الٰہی کا تصور معدوم ہوتا ہے۔ غیر اسلامی معاشرہ کے افراد یا تو سرے سے ہی توحید الٰہی کے قائل نہیں ہوتے اور یا پھر ان کے ہاں توحید کے بارے میں شکوک وشبہات موجود ہوتے ہیں۔ مثلاً کوئی "ابن اللہ" کا تصور لیے پھرتا ہے تو کوئی تثلیث کا قائل دکھائی دیتا ہے اور کوئی "رام رام" کرتا ہوا سینکڑوں کی طرح کے بت تراش کر ان کی پوجا پاٹ کرتا دکھائی دیتا ہے اور کیمونزم کے پیروکار تو خدا کے وجود ہی کے انکاری ہیں۔"

اک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبالؒ)

2-اقتدار اعلیٰ کا تصور:

اسلامی معاشرہ میں اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہوتا ہے اور خدا تعالیٰ کی ذات ہی قانون اور ضابطوں کا سرچشمہ ہوتی ہے۔ اس خدائے واحد کے اقتدار میں کوئی شریک نہیں ہوسکتا۔ قرآن حکیم میں ہے:

"خبردار! خلق اسی کی ہے اور امر بھی اسی کا ہے۔" (الاعراف:54)

"یقیناً حکم دینا صرف اللہ تعالیٰ کے لیے مخصوص ہے۔" (یوسف:40)

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیں کہ بے شک سب باتیں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔" (آل عمران:154)

"بات یہ ہے کہ سب باتیں خدا کے اختیار میں ہیں۔" (الرعد:31)

"پھر (قیامت کے دن تمام) لوگ اپنے مالک برحق خدائے تعالیٰ کے پاس واپس بلائے جائیں گے۔ سن لو کہ حکم اسی کا ہے اور وہ نہایت جلد حساب لینے والا ہے۔" (الانعام:62)

"پہلے بھی اور پیچھے بھی خدا ہی کا حکم ہے۔" (الروم:4)

اسلام اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی رفیع الشان اور جلیل القدر ذات کو قرار دیتا ہے اور اس کے نزدیک کوئی فرد یا جماعت اقتدار اعلیٰ کی حامل نہیں ہوسکتی۔ اس کے برعکس غیر اسلامی معاشرے میں قانونی اقتدار اعلیٰ کسی مخصوص فرد یا جماعت یا ادارہ کو حاصل ہوتا ہے اور جمہوریت میں اقتدار اعلیٰ کے اصل مالک یا طاقت کا سرچشمہ عوام ہوتے ہیں۔ غیر اسلامی معاشرہ میں تصور اقتدار اعلیٰ ابہام کا شکار ہے اور واضح اور دوٹوک لفظوں میں مقتدر اعلیٰ (فرد یا جماعت) کی نشان دہی کرنے سے یکسر قاصر ہے۔ اسلامی معاشرہ میں اقتدار اعلیٰ کا تصور واضح اور غیر مبہم ہے۔ پروفیسر رشید احمد کے بقول:

"قرآن مجید کے سیاسی نظریات میں اہم ترین اقتدار اعلیٰ کا نظریہ ہے۔ اس کی رو سے اقتدار اعلیٰ کسی انسان کے سپرد نہیں کیا گیا ہے' کیونکہ یہ ظلوم وجہول اتنی بڑی ذمہ داری کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ مقتدر اعلیٰ اسی ذات حقیقی کو قرار دیا گیا ہے' جو نہ صرف خالق کائنات ہے بلکہ کائنات کی ربوبیت بھی اسی کے لیے مسلم ہے۔ یہی ذات عقائد واعمال' تدبیر وسیاست' دستور وقانون کا سرچشمہ

ہے۔ اقتدار اعلیٰ کے لیے قرآن مجید نے نہایت جامع لفظ "ملکوت" استعمال کیا ہے۔ جس کے ذریعے واضح کیا گیا ہے کہ دنیا کی ہر چیز اللہ ہی کے زیر اقتدار ہے۔"

(مسلمانوں کے سیاسی افکار' پروفیسر رشید احمد' صفحہ 19 'ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور)

3۔ مساوات کا فقید المثال تصور:

اسلامی معاشرہ کی ایک اہم خصوصیت مساوات بین الناس ہے۔ اسلام احترام آدمیت کا داعی ہے' افراد معاشرہ خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم' سب مساوی سلوک کے حقدار ہوتے ہیں۔ قانون کا اطلاق سب پر مساوی ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے: "لوگ کنگھی کے دندانوں کی طرح برابر ہیں۔"

اسلام میں حسب ونسب' رنگ ونسل' قبیلہ اور خاندان کی بنیاد پر کسی کو کوئی فضیلت حاصل نہیں۔ فضیلت اگر ہے تو محض تقویٰ کی بنیاد پر۔ قرآن مجید میں حکم ہے:

"لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری قومیں اور قبائل بنائے تاکہ ایک دوسرے کو شناخت کرو۔ خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ متقی ہے۔" (الحجرات:13)

اس آیت مبارکہ کی تفسیر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

"پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان یکساں ہیں۔ کیونکہ ان کا پیدا کرنے والا ایک ہے' ان کا مادۂ پیدائش اور طریق پیدائش ایک ہی ہے' اور ان سب کا نسب ایک ہی ماں باپ تک پہنچتا ہے۔ علاوہ بریں کسی شخص کا کسی خاص ملک' قوم یا برادری میں پیدا ہونا ایک اتفاقی امر ہے' جس میں اس کے اپنے ارادہ وانتخاب اور اس کی اپنی سعی وکوشش کا کوئی دخل نہیں ہے۔ کوئی معقول وجہ نہیں کہ اس لحاظ سے کسی کو کسی پر فضیلت حاصل ہو۔ اصل چیز جس کی بناء پر ایک شخص کو دوسروں پر فضیلت حاصل ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ وہ دوسروں سے بڑھ کر خدا سے ڈرنے والا' برائیوں سے بچنے والا' اور نیکی وپاکیزگی کی راہ پر چلنے والا ہو۔ ایسا آدمی خواہ کسی نسل' کسی قوم اور کسی ملک سے تعلق رکھتا ہو' اپنی ذاتی خوبی کی بنا پر قابل قدر ہے۔ اور جس کا حال اس کے برعکس ہو وہ بہرحال ایک کمتر درجے کا انسان ہے چاہے وہ کالا ہو یا گورا' مشرق میں پیدا ہوا ہو یا مغرب میں۔"

(تفہیم القرآن: سید مودودیؒ' جلد پنجم' صفحہ 97' ادارہ ترجمان القرآن لاہور' مکتبہ تعمیر انسانیت لاہور)

فتح مکہ کے موقع پر طواف کعبہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تقریر فرمائی تھی اس میں فرمایا:

"شکر ہے اس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبر دور کر دیا۔ لوگو' تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے۔ دوسرا فاجر اور شقی' جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے۔ ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا تھا۔" (بیہقی فی شعب الایمان۔ ترمذی)

حجۃ الوداع کے موقع پر ایام تشریق کے وسط میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک تقریر میں فرمایا:

"لوگو! خبردار رہو تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو کسی عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔" (بیہقی)

ایک اور حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے:

"تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کیے گئے تھے۔ لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ اللہ کی نگاہ میں ایک حقیر کیڑے سے زیادہ ذلیل ہوں گے۔" (بزار)

یہ تعلیمات صرف الفاظ تک ہی محدود نہیں رہی ہیں بلکہ اسلام نے ان کے مطابق اہل ایمان کی ایک عالمگیر برادری عملاً قائم کر کے دکھا دی ہے جس میں رنگ، نسل، زبان، وطن اور قومیت کی کوئی تمیز نہیں۔ جس میں اونچ نیچ اور چھوت چھات اور تفریق و تعصب کا کوئی تصور نہیں، جس میں شریک ہونے والے تمام انسان خواہ وہ کسی نسل و قوم اور ملک و وطن سے تعلق رکھتے ہوں بالکل مساویانہ حقوق کے ساتھ شریک ہو سکتے ہیں اور ہوئے ہیں۔ اسلام کے مخالفین تک کو یہ تسلیم کرنا پڑا ہے کہ انسانی مساوات اور وحدت کے اصول کو جس کامیابی کے ساتھ مسلم معاشرے میں عملی شکل دی گئی ہے اس کی کوئی نظیر دنیا کے کسی دین اور کسی نظام میں نہیں پائی جاتی، نہ کبھی پائی گئی ہے۔ یہودیوں نے بنی اسرائیل کو خدا کی اعلیٰ مخلوق ٹھہرایا اور اپنے مذہبی احکام تک میں غیر اسرائیلیوں کے حقوق اور مرتبے کو اسرائیلیوں سے فروتر رکھا۔ ہندوؤں کے ہاں ورن آشرم کو اسی تمیز نے جنم دیا جس کی رو سے برہمنوں کی برتری قائم کی گئی اور شودروں کو انتہائی ذلت کے گڑھے میں پھینک دیا گیا۔ کالے اور گورے کی تمیز نے افریقہ اور امریکہ میں سیاہ فام لوگوں پر جو ظلم ڈھائے ان کو تاریخ کے صفحات میں تلاش کرنے کی ضرورت نہیں، یورپی لوگوں نے براعظم امریکہ میں گھس کر ریڈ انڈین نسل کے ساتھ ناروا سلوک کیا اور ایشیا و افریقہ کی کمزور قوموں پر اپنا تسلط قائم کیا۔ نازی جرمنی کا فلسفۂ نسلیت اور نارڈک نسل کی برتری کا تصور پچھلی جنگ عظیم میں اپنے کرشمے دکھا چکا ہے۔

4۔ عدل وانصاف کا شاندار اصول:

اسلامی معاشرہ عدل وانصاف کے اصولوں پر مبنی نظام کا حامل ہوتا ہے۔ اس میں لاقانونیت، ناانصافی اور قانونی، معاشرتی اور اقتصادی عدم مساوات کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی اور ہر میدان میں انصاف سب کے لیے برابر ہوتا ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

"اور جب لوگوں میں فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ خدا تمہیں بہت خوب نصیحت کرتا ہے بے شک خدا سنتا دیکھتا ہے۔" (النساء:58)

"اے ایمان والو! خدا کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جایا کرو اور لوگوں کی

دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی پرہیزگاری کی بات ہے اور خدا سے ڈرتے رہو۔" (المائدہ:8)

"اور جب کوئی بات کہو تو انصاف سے کہو اگرچہ وہ (تمہارا) رشتہ دار ہی ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو۔" (الانعام:152)

"اور اگر مومنوں میں سے کوئی دو فریق آپس میں لڑ پڑیں تو ان میں صلح کرا دو۔ اور اگر ایک فریق دوسرے پر زیادتی کرے تو زیادتی کرنے والے سے لڑو یہاں تک کہ وہ خدا کے حکم کی طرف رجوع لائے۔ پس جب وہ رجوع لائے تو دونوں فریق میں مساوات کے ساتھ صلح کرا دو اور انصاف سے کام لو کہ خدا انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔" (الحجرات:9)

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے:

"جو شخص مسلمانوں کے اجتماعی معاملات کا ذمہ دار ہو اور وہ ان کے ساتھ خیانت کرے تو اللہ اس پر جنت حرام کر دے گا۔" (بخاری، مسلم)

اسلامی معاشرہ کے برعکس غیر اسلامی معاشرہ میں عدل و انصاف کا وہ تصور موجود نہیں جو اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور جس پر اہل ایمان نے عمل بھی کر کے دکھایا ہے۔ حضور علیہ السلام اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین نے عدل و انصاف کی بالادستی قائم کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات کو قصاص کے لیے پیش کیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے پر حد جاری کی اور اپنے آپ کو بدلے کے لیے پیش کیا۔ عام شہریوں کی شکایات پر اپنے گورنروں کو سزائیں دیں اور حصول انصاف کو انتہائی سہل بنا دیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو قاضی مقرر کر کے انتظامیہ سے عدلیہ کی علیحدگی کا اہتمام کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عدل و انصاف کی شاندار مثالیں پیش کیں۔ الغرض اسلام نے ایسا معاشرہ قائم کیا جس میں عدل و انصاف کی نظر میں سب مساوی ٹھہرے۔ چنانچہ ایسا نظام انصاف اور عدل کی ایسی نظیریں غیر اسلامی معاشرہ میں کہاں؟...... اسی لیے ایک انگریز مورخ ایچ۔ جی۔ ویلز کہتا ہے:

"اسلامی معاشرہ دنیا کا سب سے اچھا سیاسی اور مثالی سماجی نظام تھا اور اسی وجہ سے اس کو غلبہ حاصل ہوا۔" (The Outline of History، صفحہ 61)

5- حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین:

اسلامی معاشرہ کے افراد ایک دوسرے کے حقوق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہتے ہیں کیونکہ معاشرہ کو راہ راست پر رکھنے کے لیے اسلام نے انہیں یہی تعلیم دی ہے اور اسی سے وہ دائمی خسران سے بچ سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

"زمانے کی قسم، انسان درحقیقت بڑے خسارے میں ہے، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، اور نیک اعمال کرتے رہے، اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت اور صبر کی تلقین کرتے رہے۔"

(العصر: 1تا3)

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں کہ:

''اس کے معنی یہ ہیں کہ اول تو ایمان لانے اور نیک عمل کرنے والوں کو فرد فرد بن کر نہیں رہنا چاہیے' بلکہ ان کے اجتماع سے ایک مومن و صالح معاشرہ وجود میں آنا چاہیے۔ دوسرے اس معاشرے کے ہر فرد کو اپنی یہ ذمہ داری محسوس کرنی چاہیے کہ وہ معاشرے کو بگڑنے نہ دے' اس لیے اس کے تمام افراد پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی تلقین کریں۔''
(تفہیم القرآن' جلد ششم' صفحہ 453)

یہ اسلامی معاشرہ ہی ہے جس کے افراد صالح اعمال کرتے اور ایک دوسرے کو حق بات کی تلقین اور صبر کی تاکید کرتے ہیں۔ غیر اسلامی معاشرہ میں جب حق ہی ناپید ہے تو حق کی تلقین کس طرح ہو سکتی ہے؟ اور صبر کی تاکید بھی تو وہی کر سکتا ہے۔ جو حق (یعنی دین اسلام) پر ایمان لایا ہو۔ نتیجتاً غیر اسلامی معاشرہ حق و صبر کی نصیحت یعنی ایک دوسرے کی اصلاح کے عمل سے یکسر محروم ہوتا ہے اور بے راہ روی اور کجروی کا شکار ہوتا ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جو معاشرہ میں فکری و عملی تطہیر کا کام کرتا ہے اور صالحیت کو فروغ دیتا ہے۔

6۔ طہارت و پاکیزگی کی صفت:

اسلامی معاشرہ میں طہارت و پاکیزگی کی صفت بنیادی اہمیت رکھتی ہے۔ اسلام اہل ایمان کو پاک و صاف زندگی گزارنے کی تلقین کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

''اور اپنے کپڑے پاک صاف رکھو۔ اور گندگی سے دور رہو۔'' (المدثر: 5,4)

اس آیت مبارکہ کی تفسیر کرتے ہوئے سید مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس معاشرے میں اسلام کی دعوت لے کر اٹھے تھے وہ صرف عقائد اور اخلاق کی خرابیوں ہی میں مبتلا نہ تھا بلکہ طہارت و نظافت کے بھی ابتدائی تصورات تک سے خالی تھا' اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا کام ان لوگوں کو ہر لحاظ سے پاکیزگی کا سبق سکھانا تھا۔ اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی گئی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ظاہری زندگی میں بھی طہارت کا ایک اعلیٰ معیار قائم فرمائیں۔ چنانچہ یہ اسی ہدایت کا ثمرہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نوع انسانی کو طہارت جسم و لباس کی وہ مفصل تعلیم دی ہے جو زمانہ جاہلیت کے اہل عرب تو درکنار' آج اس زمانے کی مہذب ترین قوموں کو بھی نصیب نہیں ہے' حتیٰ کہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ایسا کوئی لفظ تک نہیں پایا جاتا جو ''طہارت'' کا ہم معنی ہو۔ بخلاف اس کے اسلام کا حال یہ ہے کہ حدیث اور فقہ کی کتابوں میں اسلامی احکام کا آغاز ہی کتاب الطہارت سے ہوتا ہے۔ جس میں پاکی اور ناپاکی کے فرق اور پاکیزگی کے طریقوں کو انتہائی تفصیلی جزئیات کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔.......... دوسرا مفہوم ان الفاظ کا یہ ہے کہ اپنا لباس صاف ستھرا رکھو۔ راہبانہ تصورات نے

دنیا میں مذہبیت کا معیار یہ قرار دے رکھا تھا کہ آدمی جتنا زیادہ میلا کچیلا ہو اتنا ہی زیادہ وہ مقدس ہوتا ہے۔ اگر کوئی ذرا اُجلے کپڑے ہی پہن لیتا تو سمجھا جاتا تھا کہ وہ دنیا دار انسان ہے۔........
تیسرا مفہوم اس ارشاد کا یہ ہے کہ اپنے لباس کو اخلاقی عیوب سے پاک رکھو۔ تمہارا لباس ستھرا اور پاکیزہ تو ضرور ہو مگر اس میں فخر و غرور' ریاء اور نمائش' ٹھاٹھ باٹھ اور شان و شوکت کا شائبہ تک نہ ہونا چاہیے......... چوتھا مفہوم اس کا یہ ہے کہ اپنا دامن پاک رکھو۔ اردو زبان کی طرح عربی میں بھی پاک دامنی کے ہم معنی الفاظ اخلاقی برائیوں سے پاک ہونے اور عمدہ اخلاق سے آراستہ ہونے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ ابن عباس' ابراہیم نخعی' شعبی' عطاء' مجاہد' قتادہ' سعید بن جبیر' حسن بصری اور دوسرے اکابر مفسرین نے اس آیت کا یہی مطلب بیان کیا ہے کہ اپنے اخلاق پاکیزہ رکھو اور ہر قسم کی برائیوں سے بچو۔'' (تفہیم القرآن' جلد ششم صفحہ 143, 144)

سید مودودیؒ مزید لکھتے ہیں:

''گندگی سے مراد ہر قسم کی گندگی ہے خواہ وہ عقائد اور خیالات کی ہو' یا اخلاق و اعمال کی' یا جسم و لباس اور رہن سہن۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے گردو پیش سارے معاشرے میں طرح طرح کی جو گندگیاں پھیلی ہوئی ہیں ان سب سے اپنا دامن بچا کر رکھو۔ کوئی شخص کبھی تم پر یہ حرف نہ رکھ سکے کہ جن بُرائیوں سے تم لوگوں کو روک رہے ہو ان میں سے کسی کا بھی کوئی شائبہ تمہاری اپنی زندگی میں نہ پایا جاتا ہے۔'' (تفہیم القرآن' جلد ششم' صفحہ 145)

درحقیقت طہارت و پاکیزگی اسلامی معاشرہ ہی کا خاصہ ہے۔ غیر اسلامی معاشرہ اس سے یکسر محروم ہے۔ غیر اسلامی معاشرہ میں پاکی اور ناپاکی کا کوئی تصور نہیں ہے۔

7- رحیم و شفیق معاشرہ:

اہل ایمان کے معاشرے کی امتیازی شان یہی ہے کہ وہ ایک سنگدل' بے رحم اور ظالم معاشرہ نہیں ہوتا بلکہ انسانیت کے لیے رحیم و شفیق اور آپس میں ایک دوسرے کا ہمدرد و غم خوار معاشرہ ہوتا ہے۔ فرد کی حیثیت سے بھی ایک مومن اللہ کی شان رحیمی کا مظہر ہے' اور جماعت کی حیثیت سے بھی مومنوں کا گروہ خدا کے اس رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا نمائندہ ہے۔ جس کی تعریف میں فرمایا گیا ہے کہ (وما ارسلنک الا رحمة للعلمین) (الانبیاء-106)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ اس شخص پر رحم نہیں کرتا جو انسانوں پر رحم نہیں کرتا۔'' (بخاری)

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رحم کرنے والوں پر رحمان رحم کرتا ہے۔ زمین والوں پر رحم کرو' آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔'' (ابوداؤد' ترمذی)

حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ خدری حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں:

''جو رحم نہیں کرتا اس پر رحم نہیں کیا جاتا۔'' (بخاری باب فی الادب المفرد)

حضرت نعمان رضی اللہ عنہ بن بشیر کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''تم مومنوں کو آپس کے رحم اور محبت اور ہمدردی کے معاملہ میں ایک جسم کی طرح پاؤ گے کہ اگر ایک عضو میں کوئی تکلیف ہو تو سارا جسم اس کی خاطر بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو جاتا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ اشعری کہتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مومن دوسرے مومن کے لیے اس دیوار کی طرح ہے جس کا ہر حصہ دوسرے حصے کو مضبوط کرتا ہے۔'' (بخاری ومسلم)

ان ارشادات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اسلام کو کس قسم کا معاشرہ بنانا مقصود ہے۔ صلۂ رحمی کی جو تعلیم اسلام نے دی ہے اس کی کہیں اور نظیر نہیں ملتی۔ اس کے برعکس غیر اسلامی معاشرہ ظلم وسفاکی اور سنگدلی کی علامت ہے جس میں اسلام جیسی رحیمی وشفقت مفقود ہے۔

8۔ اختلاطِ مرد وزن کی ممنوعیت:

اسلام مخلوط معاشرہ کا قائل نہیں ہے۔ وہ اختلاطِ مرد وزن کی آزادی دے کر بے راہ روی اور فحاشی کی راہ ہموار نہیں کرنا چاہتا۔ قرآن حکیم میں ہے:

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' نہ مرد دوسرے مردوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں' اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا مذاق اڑائیں' ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔'' (الحجرات: 11)

اس ضمن میں ابوالاعلیٰ مودودی'' لکھتے ہیں کہ:

''مردوں اور عورتوں کا الگ الگ ذکر کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے لیے عورتوں کا مذاق اڑانا یا عورتوں کے لیے مردوں کا مذاق اڑانا جائز ہے۔ دراصل جس وجہ سے دونوں کا ذکر الگ الگ کیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام سرے سے مخلوط سوسائٹی ہی کا قائل نہیں ہے۔ ایک دوسرے کی تضحیک عموماً بے تکلف مجلسوں میں ہوا کرتی ہے' اور اسلام میں یہ گنجائش رکھی ہی نہیں گئی ہے کہ غیر محرم مرد اور عورتیں کسی مجلس میں جمع ہو کر آپس میں ہنسی مذاق کریں۔ اس لیے اس بات کو ایک مسلم معاشرے میں قابل تصور نہیں سمجھا گیا ہے کہ ایک مجلس میں مرد کسی عورت کا مذاق اڑائیں گے یا عورتیں کسی مرد کا مذاق اڑائیں گی۔'' (تفہیم القرآن' جلد پنجم' صفحہ 85)

9۔ انسانی فطری آزادیوں اور حقوق کا تحفظ:

اسلامی معاشرہ انسان کی فطری آزادیوں اور حقوق کا امین ہوتا ہے۔ اس کا مقصد عدل اجتماعی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں مسلم اور غیر مسلم دونوں کو ضمیر کی پوری پوری آزادی دی جاتی ہے۔ افراد کی نجی زندگی کو مکمل تحفظ دیا جاتا ہے اور مسلمانوں کے ساتھ غیر مسلموں کو بھی تمام بنیادی حقوق فراہم کیے جاتے ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لے کر خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم تک کا دور ایسی مثالوں سے بھرا پڑا ہے کہ ان

ادوار میں مختلف معاہدے کیے گئے' ان معاہدوں میں واضح طور پر تمام حقوق کی ضمانت دی گئی اور احکامات الٰہی کے مطابق تمام معاہدات کی پاسداری کی گئی۔ اسلامی معاشرہ میں سب کو مندرجہ ذیل حقوق حاصل ہیں:

تحفظ جان' تحفظ ملکیت' تحفظ آبرو' نجی زندگی کا تحفظ' شخصی آزادی کا تحفظ' عمل غیر سے برأت' ظلم کے خلاف احتجاج کا حق' آزادی اظہار رائے' آزادی ضمیر و اعتقاد' حق مساوات' حصول انصاف کا حق' معاشی تحفظ کا حق' معصیت سے اجتناب کا حق' آزادی تنظیم و اجتماع' سیاسی زندگی میں شرکت کا حق' آزادی نقل و حرکت و سکونت اور حق اجرت و معاوضہ۔

اس کے برعکس غیر اسلامی معاشرہ میں آزادی و حقوق کی فراہمی ایک سوالیہ نشان ہے۔ رابرٹ ڈیوی کہتا ہے کہ:

> "وہ آزادیاں اور حقوق جنہیں صنعتی معاشرے کے آغاز اور اس کے ابتدائی مراحل میں اہم عامل کی حیثیت حاصل تھی اور جنہوں نے اس معاشرے کو اعلیٰ مدارج تک پہنچانے میں مدد دی تھی۔ اب اپنی روایتی معقولیت اور مفہوم سے محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ آزادئ فکر و اظہار رائے اور ضمیر کی آزادی نے نظریات و تصورات پر نقد و جرح کے ذریعہ ان کے فروغ اور تحفظ میں بڑی مدد دی۔ مقصد یہ تھا کہ ایک فرسودہ مادی و فکری ثقافت کو ایک زیادہ تعمیری اور معقول تہذیب و ثقافت سے بدل دیا جائے۔ لیکن آزادانہ انفرادی تبادلہ خیال کے بجائے ان حقوق اور آزادیوں کا وہی حشر ہوا جو اس پورے معاشرے کا ہوا جس کا یہ ایک جزو لاینفک بن گئے تھے۔ گویا نتائج نے مقصود پر پانی پھیر دیا۔" ("Freedom" صفحہ 322)

تھامس پین لکھتا ہے کہ:

> "آزادی دنیا کے گرد بھاگتی پھر رہی ہے' اس مفرور کو پکڑو اور انسانیت کے لیے بروقت ایک پناہ گاہ تیار کرو۔ آج ہزاروں چکنی چپڑی باتوں' ہزاروں اعلانات اور منشوروں کے بعد بھی آزادی ہنوز عنقا ہے۔ امریکہ ہو یا روس' پرتگال ہو یا انگولا' انگلستان ہو یا رہوڈیشیا' بوسٹن ہو یا مسی سپی اس کا کہیں نام و نشان نہیں۔" ("Freedom" صفحہ 347)

10-احترام خواتین:

اسلامی معاشرہ میں خواتین کو حقوق اور احترام کا تحفظ حاصل ہے۔ عورت کو اللہ تعالیٰ نے عظیم مرتبے پر فائز کیا ہے۔ ظہور اسلام سے قبل عورتیں سماجی حقوق کے ساتھ ساتھ وراثت کے حق سے بھی محروم تھیں اور انہیں پیدا ہونے پر عرب معاشرہ میں زندہ گاڑ دیا جاتا تھا اور ان کی کوئی عزت و تکریم نہیں تھی۔ مگر اسلام نے عورتوں کو ماں' بہن' بیٹی اور بیوی کے روپ میں اعلیٰ و ارفع مقام عطا کیا۔ قرآن حکیم میں ہے:

> "عورتیں تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔" (البقرۃ:181)

حجۃ الوداع کے موقع پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"اے لوگو! تمہارا تمہاری عورتوں پر حق ہے اور تمہاری عورتوں کا تم پر حق ہے.........عورتوں کے ساتھ بھلائی سے پیش آتے رہو۔"

اس کے برعکس غیر اسلامی معاشرہ میں عورت کو کوئی تکریم حاصل نہیں' اسے عیاشی کی چیز بنا لیا گیا ہے' وہ محض نائٹ کلبوں اور رقص و سرور کی محفلوں کی زینت بن کر رہ گئی ہے۔ عورت کا غیر اسلامی معاشرہ میں مقام کیا ہے؟ درج ذیل اقتباسات میں ملاحظہ کیجئے:

"ہندوؤں کا قانون کہتا ہے: تقدیر' طوفان' جہنم' زہر' زہریلے سانپ' ان میں سے کوئی اس قدر خراب نہیں جتنی عورت۔" (ستیارتھ پرکاش' باب 4' صفحہ 151-152)

ایک بڑا مسیحی امام کرائی سوسٹم عورت کے بارے میں کہتا ہے:

"کہ عورت ایک ناگزیر برائی' ایک پیدائشی وسوسہ' ایک مرغوب آفت' ایک خانگی خطرہ' ایک غارت گر دلربائی اور ایک آراستہ مصیبت ہے۔"

(پردہ: سید مودودی' صفحہ 20 اسلامک پبلشرز لاہور)

اطالیوں کا قول ہے:

"گھوڑا اچھا ہو یا برا۔ اسے مہمیز کی ضرورت ہے۔ عورت اچھی ہو یا بری اسے مار کی ضرورت ہوتی ہے۔"

(اسلام کا نظام عفت و عصمت مولانا محمد ظفیر الدین پورہ نوڈیہاوی' صفحہ 42' مکتبہ نذیریہ لاہور)

کتاب مقدس میں لکھا ہے:

"عورت موت سے زیادہ تلخ ہے۔"

(تمدن عرب' صفحہ 373' بحوالہ اسلام کا نظام عفت و عصمت' صفحہ 38)

☆☆............☆☆............☆☆

عورت کا مقام (اسلامی اور مغربی تصورات کا جائزہ)

سوال: اسلام میں عورت کے مقام کی اہمیت بیان کریں نیز اسلام اور مغربی تصورات میں عورت کے مقام کا جائزہ لیں۔

ظہور اسلام سے قبل عورتوں کی حیثیت عرب جاہلیت میں:

اسلام کی آمد سے قبل عورتیں انتہائی کمتر حیثیت رکھتی تھیں۔ ہر جگہ عورتیں مردوں کے ظلم و جور کا شکار بنی ہوئی تھیں۔ مرد مرد نہیں بلکہ نازک و کمزور صنف کے مقابلہ میں جنگل کا درندہ تھا۔ کرۂ ارض کی انسانی بستیوں کا یہ عام حادثہ تھا۔ اس سلسلہ میں شائستہ و ناشائستہ متمدن و غیر متمدن اقوام و افراد میں چنداں فرق باقی نہ رہا تھا۔ چوپاؤں اور گھر کے دوسرے سامانوں کی طرح عورتیں خریدی اور بیچی جانے لگیں۔ مرد عورت پر اپنی نفسانی خواہشوں کے لیے جبر و تشدد پر اتر آیا۔ حد یہ ہے کہ عورتوں کو بدکاری کے پیشہ تک اختیار کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا یعنی اپنی ہوس مٹانے کا ذریعہ بنانے کے ساتھ مال کمانے کا ذریعہ بھی مردوں نے ان غریب عورتوں کو بنالیا تھا۔

جاہلیت میں عورتیں انسان اور حیوانات کے درمیان ایک مخلوق سمجھی جانے لگی تھی' جن کا مقصد نسل انسانی کی ترقی اور مرد کی خدمت کرنا تھا' اور یہی وجہ تھی کہ لڑکیوں کی پیدائش باعث ننگ و عار تھی' پیدا ہونے کے ساتھ ان کو زندہ درگور کر دینا' اسی کو بعضوں نے اپنی شرافت و افتخار کا اقتضاء قرار دے رکھا تھا' جاہلیت کی تاریخ کے اس خاص حصہ کے متعلق قرآن مجید ہی سے معلومات حاصل ہوتی ہیں جو عبرت کے لیے کافی ہیں۔

بچوں کی پیدائش کا باپ پر اثر:

باپ کے دل میں لڑکی کی ولادت کی خبر جس اثر کو پیدا کرتی تھی' قرآن مجید اس کی اطلاع ان الفاظ میں دیتا ہے:

> ''ان میں سے جب کسی کو بیٹی پیدا ہونے کی خبر دی جائے تو تمام دن اس کا چہرہ بے رونق رہے' اور دل ہی دل میں گھٹتا رہے۔ جس (تولد دختر) کی خبر دی گئی ہے اس کی عار سے لوگوں سے چھپا چھپا پھرے (اور سوچ میں پڑ جائے کہ) ذلت برداشت کر کے اس کو رکھے یا مٹی میں گاڑ دے (تاکہ ذلت سے نجات ملے۔'' (النحل:7)

اجمالاً اسی کا اعادہ دوسری جگہ ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

> ''ان میں سے جب کسی کو اس چیز کی خبر دی جائے جس کو وہ اللہ تعالیٰ سے مخصوص کرتا ہے تو تمام دن اس کا چہرہ بے رونق رہے اور دل ہی دل میں گھٹتا رہے۔'' (الزخرف:2)

جاہلی ذہنیت کے بوالعجیوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن حکیم ہی میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک طرف فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بھی جاہلیت والے مانتے تھے یعنی ''مقدس دیویوں'' کا عقیدہ بھی ان میں پایا جاتا تھا اور دوسری طرف ان میں ہر ایک لڑکیوں کے باپ بننے کی ذلت کو برداشت کرنے کے لیے بھی تیار نہ تھا۔ اسی ''فرضی تضاد'' کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں پوچھا گیا ہے:

"کیا تمہارے رب نے تم کو بیٹوں کے ساتھ خاص کیا ہے اور خود فرشتوں کو بیٹیاں بنایا ہے۔ بے شک تم بڑی سخت کہتے ہو۔" (بنی اسرائیل:4)

اور خبر کے رنگ میں اسی کو ان الفاظ میں بھی بیان کیا گیا ہے:

"اللہ کے لیے بیٹیاں تجویز کرتے ہیں اور اپنے لیے چاہتی چیز۔" (النحل:7)

بچیوں کا سفاکانہ قتل:

یہ احساس تھا جاہلیت میں غریب اور معصوم لڑکیوں کے متعلق؛ پھر اس میں کوئی تعجب نہیں کہ اگر اکثر لوگ اس ذلت سے بچنے کے لیے بچیوں کو قتل کر ڈالتے ہیں۔ انہی سنگ دلوں اور ظالموں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن حکیم میں ارشاد ہوا ہے۔

"اور جس وقت لڑکی سے جو زندہ درگور کر دی گئی تھی' پوچھا جائے گا کہ وہ کس قصور کے بدلے میں مار ڈالی گئی۔" (التکویر:1)

ذلت و رسوائی کے علاوہ قرآن مجید ہی سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معاشی دشواریوں کا غلط احساس بھی "قتل اولاد" کے جرم کا لوگوں کو مجرم بنائے ہوئے تھا۔ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن مجید میں حکم دیا گیا:

"اور اپنی اولاد کو ناداری کی وجہ سے قتل نہ کرو' ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں' اور انہیں بھی۔"

(الانعام:19)

"اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو کیونکہ ہم ان کو بھی رزق دیتے ہیں اور تم کو بھی۔ بے شک ان کا قتل کرنا بھی بھاری گناہ ہے۔" (بنی اسرائیل:31)

عفت و عصمت کی بردباری:

جاہلیت کے جس دور کے لوگوں پر قرآن مجید میں اس حکم کے نافذ کرنے کی ضرورت ہوئی یعنی:

"اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو' بالخصوص اس وقت جبکہ وہ پاک دامن رہنا چاہیں (سوچو تو یہ صرف اس لیے کہ) تم کو دنیوی زندگی کا کچھ فائدہ حاصل ہو جائے۔" (النور۔4)

اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ "نسوانیت" کا مقام ان کی نظروں میں کیا تھا؟

صحیح بخاری کی ایک حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت میں عورتیں رہن بھی رکھی جاتی تھیں۔ محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں جب کعب بن الاشرف کے یہاں گیا اور غلہ قرض دینے کی درخواست کی تو اس نے کہا: "تم اپنی عورتیں میرے پاس گروی کر دو۔ان (قرض طلب کرنے والوں نے کہا) کہ: آپ کے یہاں ہم اپنی عورتیں کیسے گروی کر سکتے ہیں جبکہ آپ عرب میں سب زیادہ خوبصورت ہیں۔" (بخاری' باب قتل کعب الاشرف)

اس واقعہ سے بھی پتا چلتا ہے کہ عورتیں کتنی مظلوم تھیں' اور ان کی عصمت کتنی سستی خیال کیا جاتی تھی۔ جاہلیت میں نکاح کا نام تو ضرور تھا' مگر اس کی حالت کیا تھی' کہنا چاہیے کہ اس کی اکثر صورتیں زنا کی تھیں۔ ورنہ

اتنی بات تو بہرحال ہے کہ عورت کی عفت وعصمت کی کوئی قدر نہ تھی۔

جاہلیت کے نکاح:

ام المؤمنین سیدہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ جاہلیت میں نکاح کی چار صورتیں تھیں۔

(1) ایک طریقہ تو یہی تھا جو آج کل رائج ہے۔

(2) اپنی منکوحہ بیوی سے مرد کہتا کہ حیض کا خون جب تیرا بند ہو جائے تو پاکی حاصل کرنے کے بعد تُو فلاں مرد کے پاس چلی جا' اور اس سے فائدہ حاصل کر لیعنی اس غیر مرد سے ہم بستر ہو اور اتنی مدت شوہر اپنی اس عورت سے علیحدہ رہتا' جب تک اس کی عورت کو غیر مرد کا حمل ظاہر نہ ہو جاتا' ایسا جاہلیت میں اس لیے کرتے تھے کہ لڑکا نجیب ہو' اس کو ''نکاح استبضاع'' کہا جاتا تھا۔ گویا تخم حاصل کرنے کا یہ ایک طریقہ تھا۔

(3) تیسری شکل یہ تھی کہ ایک عورت کے پاس متعدد مرد آتے اور لطف اندوز ہوتے' مگر ان کی تعداد دس سے کم ہوتی' عورت کو جب حمل ظاہر ہوتا' بچہ پیدا ہوتا اور پیدا ہوئے کچھ دن گزر جاتے' تو یہ عورت ان تمام مردوں کو قاصد کے ذریعہ بلا بھیجتی' کوئی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا تھا' چنانچہ جب سب جمع ہو جاتے۔ یہ عورت کہتی' تم اپنے معاملہ سے واقف ہو کر میرے پاس وطی کے لیے آیا کرتے تھے۔ میرے بچہ پیدا ہوا ہے! یہ تمہارا بچہ ہے' تم اپنی پسند سے اس کا کوئی نام رکھو' چنانچہ یہ لڑکا اس شخص کا ہو جاتا جس کا عورت نام لیتی۔ مرد انکار نہیں کر سکتا تھا۔

(4) کچھ عورتیں ایسی تھیں جن کے دروازوں پر جھنڈے گڑے رہتے۔ یہ بازاری پیشہ ور عورتیں (طوائفیں) تھیں۔ جس کا جی چاہتا ان کے پاس جاتا۔ جب ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا ہوتا' تو تمام لطف اندوز ہونے والے جمع ہوتے اور قیافہ شناس بلایا جاتا اور وہ اپنے علم پر جانچ کر اس بچہ کو ان مردوں میں جس کا کہہ دیتا' وہ بچہ اسی کا ہو جاتا' مرد انکار نہیں کر سکتا تھا۔

حضرت سیدہ عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ان صورتوں کو بیان کر کے فرماتی ہیں کہ تمام ناجائز صورتوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بند کیا۔

''محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حق لے کر مبعوث ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلی نکاحوں کو بند کیا۔ صرف اس نکاح کو باقی رکھا جو آج رائج ہے۔'' (بخاری مصری' کتاب النکاح' جلد 4' صفحہ 165)

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جاہلیت میں عورتوں کی عصمت وعفت اپنی قدرتی قدر و قیمت سے محروم ہو چکی تھی جیسے اپنی آمادگی سے شوہر ہی ان بیویوں کو اجنبی مردوں سے تخم حاصل کرنے کے لیے بھیجا کرتے تھے۔ اسی سے پتہ چلتا ہے کہ عورت اور اس کی عفت وعصمت کے متعلق جاہلی احساسات رذالت کے کن حدود تک پہنچ چکے تھے۔ واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ مرد یہ سمجھتا تھا کہ عورت مہر کے عوض میرے ہاتھ بک گئی اور یہی وجہ تھی کہ شوہر کے مرنے کے بعد وہ مال متروکہ بن جاتی تھی۔

عفت نسواں کا حشر غیر اقوام میں:

قدیم معاشروں میں تقریباً ساری دنیا میں یہ صورتِ حال تھی کہ عورت کو مرد کے مقابلہ میں کمتر درجہ حاصل تھا۔ عورت کی عفت و عصمت کہیں بھی محفوظ نہ تھی۔

عورت یونان میں:

قدیم یونان میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (1984ء) کے الفاظ میں عورت کا مرتبہ اتنا گرا دیا گیا تھا کہ اس کی حیثیت بچہ پالنے والی غلام کی ہو کر رہ گئی تھی۔ عورتوں کو ان کے گھروں میں بند کر دیا گیا تھا۔ وہ تعلیم سے محروم تھیں۔ ان کا کوئی حق نہ تھا' ان کے شوہر ان کو بس گھروں کے سامانوں میں سے ایک سامان سمجھتے تھے۔ ایک مشہور غیر مسلم ڈاکٹر گستاؤلی بان کہتا ہے کہ "یونانی عموماً عورتوں کو ایک کم درجہ کی مخلوق سمجھتے تھے...... اگر کسی عورت کا بچہ خلافِ فطرت پیدا ہوتا تو اس کو مار ڈالتے تھے۔" (تمدن عرب' صفحہ 372)

"اسپارٹا میں اس بدنصیب عورت کو جس سے کسی قومی سپاہی کے پیدا ہونے کی امید نہ ہوتی' مار ڈالتے تھے' جس وقت کسی عورت کے بچہ ہو چکتا تھا' تو فوائد ملکی کی غرض سے اسے (عورت کو) دوسرے شخص کی نسل لینے کے لیے اس کے خاوند سے عاریتاً لے لیتے۔"

(تمدن عرب' صفحہ 372)

"یونانی اپنے اعلیٰ سے اعلیٰ تمدن کے زمانہ میں بھی بجز طوائف کے کسی عورت کی قدر نہیں کرتے تھے۔" (تمدن عرب' صفحہ 372)

"عہد قدیم" کے باب واعظ میں لکھا ہے:

"جو کوئی خدا کا پیارا ہے وہ اپنے آپ کو عورت سے بچائے گا۔ ہزار آدمیوں میں سے میں نے ایک پیارا پایا ہے۔ لیکن تمام عالم کی عورتوں میں ایک عورت بھی ایسی نہیں پائی جو خدا کی پیاری ہوتی۔" (تمدنِ عرب' صفحہ 373)

عورت روم میں:

قدیم روم میں ایک عورت کی قانونی حیثیت کامل محکومی تھی' اولاً وہ اپنے باپ یا بھائی کی محکوم ہوتی تھی اور بعد کو اپنے شوہر کی۔ شوہر کو اپنی بیوی کے اوپر پدرانہ اختیار حاصل ہوتا تھا۔ قانون کی نظر میں عورت ضعیف العقل شمار ہوتی تھی۔ (خاتونِ اسلام: مولانا وحید الدین خان' صفحہ 46' دار التذکیر غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور)

ڈاکٹر گستاؤلی بان لکھتا ہے:

"روم میں مرد کی حکومت اپنی بیوی پر جابرانہ تھی.......... جس کا معاشرت میں کوئی حصہ نہ تھا اور شوہر کو پورا حق اس کی جان پر بھی حاصل تھا' اور یہی حال یونان کا تھا۔"

(تمدن عرب' صفحہ 373)

روم میں عورت کی عفت وعصمت کی بربادی اور کمتر حیثیت کے ایک دور کے بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''اخلاق اور معاشرت کے بند جب اتنے ڈھیلے ہو گئے تو روم میں شہوانیت' عریانی اور فواحش کا سیلاب پھوٹ پڑا۔ تھیٹروں میں بے حیائی و عریانی کے مظاہرے ہونے لگے۔ ننگی اور نہایت فحش تصویریں ہر گھر کی زینت کے لیے ضروری ہو گئی ہیں۔ قحبہ گری کے کاروبار کو وہ فروغ نصیب ہوا کہ قیصر ٹائبیریس (14ء تا 37ء) کے عہد میں معزز خاندانوں کی عورتوں کو پیشہ ور طوائف بننے سے روکنے کے لیے ایک قانون نافذ کرنے کی ضرورت پیش آ گئی۔ فلورا (Flora) نامی ایک کھیل رومیوں میں نہایت مقبول ہوا کیونکہ اس میں برہنہ عورتوں کی دوڑ ہوا کرتی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے برسر عام یکجا غسل کرنے کا رواج بھی اس دور میں عام تھا۔ رومی لٹریچر میں فحش اور عریاں مضامین بے تکلف بیان کیے جاتے تھے اور عوام وخواص میں وہی ادب مقبول ہوتا تھا جس میں استعارہ و کنایہ تک پردہ نہ رکھا گیا ہو......... شہوانی خواہشات سے اس قدر مغلوب ہو جانے کے بعد روم کا قصر عظمت ایسا پیوند خاک ہوا کہ پھر اس کی ایک اینٹ بھی اپنی جگہ پر قائم نہ رہی۔''

(پردہ: سید مودودیؒ صفحہ 20,19 ایڈیشن 2006ء اسلامک پبلی کیشنز لاہور)

عورت یہودی قانون کی نظر میں:

توریت استثناء باب 25 نمبر 5 تا 10 میں ہے:

''اگر دو بھائی یکجا رہتے ہوں اور ان میں سے ایک بے اولاد مر جائے تو اس متوفی کی بیوی کا بیاہ کسی اجنبی سے نہ کیا جائے بلکہ اس کے شوہر کا بھائی اس سے خلوت کرے اور اسے اپنی بیوی بنائے اور بھاوج کا حق اسے ادا کرے اور یوں ہو گا کہ پہلوٹھا جو اس سے پیدا ہو' تو اس کے متوفی بھائی کے نام کا شمار ہو گا' تا کہ اس کا نام اسرائیل سے نہ مٹ جائے۔ اگر یہ شوہر بننے سے انکار کرے تو اس کے بھائی کی بیوی ججوں کے سامنے اس کے نزدیک اپنے پاؤں کی جوتی نکالے اور اس کے منہ پر تھوک دے اور جواب دے اور کہے کہ اس شخص کے ساتھ جو اپنے بھائی کا گھر نہ بنائے گا' یہی کیا جائے گا' اور اسرائیل میں اس کا نام یہ رکھا جائے کہ یہ اس شخص کا گھر ہے جس کا جوتا نکالا گیا۔'' (اسلام کے سیاسی نظریے' جلد 1 صفحہ 218)

کتاب مقدس میں میں مرقوم ہے کہ ''عورت موت سے زیادہ تلخ ہے۔'' (تمدن عرب' صفحہ 373)

عورت ہندو قانون کی نظر میں:

خاندان کی یا چند بھائیوں کی مشترکہ بیوی کا رواج ہندوستان قدیم کا ایک جانا پہچانا رواج ہے۔

(تمدن عرب۔ صفحہ 368)

منوسمرتی ادھیائے نمبر 9 نمبر 59 کا خلاصہ یہ ہے کہ ''برہمنوں کے یہاں نیوگ کا رواج ہے کہ

اولاد نہ ہونے کی صورت میں خسر وغیرہ کے حکم کو پا کر عورت رشتہ دار سے' یا دیور سے اولاد حسب دلخواہ حاصل کرے۔" (بحوالہ اسلام کا نظام عفت وعصمت' مولانا محمد ظفیر الدین صفحہ 39)

"ستیارتھ پرکاش" میں ہے:

"بانجھ عورت ہو تو آٹھویں برس (بیاہ سے آٹھ برس تک عورت کو حمل نہ ٹھہرے) اور ہو کر مر جائے تو دسویں برس جب اولاد ہو' تب تب لڑکیاں ہی ہوں' لڑکے نہ ہوں تو گیارہویں برس تک اور جو بدکلام ہونے والی ہو تو جلدی ہی اس عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے نیوگ کر کے اولاد پیدا کر لے۔"

(ستیارتھ پرکاش: سوامی دیانند سرسوتی جی مہاراج' باب 4' صفحہ 152, 153)

جب خاوند اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو' تب اپنی عورت کو اجازت دے کہ:

"اے نیک بخت اولاد کی خواہش کرنے والی عورت! تو مجھ سے علاوہ دوسرے خاوند کی خواہش کر' کیونکہ اب مجھ سے اولاد نہ ہو سکے گی۔ تب عورت دوسرے کے ساتھ نیوگ کر کے اولاد پیدا کرے' لیکن اس بیاہے عالی حوصلہ خاوند کی خدمت میں کمربستہ رہے' ویسے ہی عورت بھی جب بیماری وغیرہ میں پھنس کر اولاد پیدا کرنے کے قابل نہ ہو تب اپنے خاوند کو اجازت دے..........
کسی دوسری بیوہ عورت سے نیوگ کر کے اولاد پیدا کیجئے۔"

(ستیارتھ پرکاش' باب 4' صفحہ 151, 152)

عورت کی ذات کے متعلق ہندوؤں کا قانون کہتا ہے کہ "تقدیر' طوفان' موت' جہنم' زہر' زہریلے سانپ' ان میں سے کوئی اس قدر خراب نہیں جتنی عورت۔" (ستیارتھ پرکاش باب 4 صفحہ 151,152)

منو کا قانون کہتا ہے:

"عورت صغیر سنی میں باپ کی مطیع ہے۔ جوانی میں شوہر کی اور شوہر کے بعد اپنے بیٹوں کی۔ اور اگر بیٹے نہ ہوں تو اپنے اقربا کی' کیونکہ کوئی عورت ہرگز اس لائق نہیں کہ خود مختار طور پر زندگی بسر کر سکے۔" (ستیارتھ پرکاش' باب 4 صفحہ 151, 152)

ظہور اسلام سے پہلے ہندوستانی مقنن قدیم نے اس بے اعتباری کو صاف ظاہر کیا ہے کہ کسی عورت کو زانیہ کہنے کے لیے اس قدر کافی ہے کہ وہ کسی مرد کے ساتھ اتنی علیحدہ رہی ہو' جتنی دیر میں انڈا تلا جا سکتا ہے۔"
(تمدن عرب' صفحہ 373)

عورت مسیحی قانون کی نظر میں:

عیسائیت نے بھی صورت حال کو کچھ بہتر نہیں بنایا۔ ہر معاملہ میں حتیٰ کہ مذہبی معاملہ میں بھی عورت کو کم تر درجہ دیا گیا۔ کرنتھیوں کے نام "پولیس رسول" کے پہلے خط میں درج ہے: "پس فرشتوں کے سبب سے عورت کو چاہیے کہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔" (کنتی 1۔ کرنتھیوں 11-10)

عیسائیت نے عورت کے بارے میں یہ غلط عقیدہ بنالیا کہ وہ آدم کو جنت سے نکالنے کی ذمہ دار ہے۔عیسائیت میں عورتوں کو بہکانے والی کی نظر سے دیکھا گیا جو کہ آدم کے ہبوط کی ذمہ دار تھی اور دوسرے درجہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ (خاتونِ اسلام: مولانا وحیدالدین خان' صفحہ 47 'دارالتذکیر اردو بازار لاہور)

ترتولیاں (Tertullian) عیسائیت کے ابتدائی دور کا امام تھا۔وہ مسیحی تصور کی ترجمانی ان لفظوں میں کرتا ہے"وہ شیطان کے آنے کا دروازہ ہے' وہ شجر ممنوع کی طرف لے جانے والی' خدا کے قانون کو توڑنے والی' اور خدا کی تصویر' مرد کو غارت کرنے والی ہے۔"

کرائی سوسٹم (Chrysostum) جو ایک بڑا مسیحی امام تھا' عورت کے حق میں کہتا ہے:

"کہ عورت ایک ناگزیر برائی' ایک پیدائشی وسوسہ' ایک مرغوب آفت' ایک خانگی خطرہ' ایک غارت گر دلربائی اور ایک آراستہ مصیبت ہے۔"

(پردہ: سید مودودی صفحہ 20,21 ایڈیشن 2006ء اسلامک پبلی کیشنز لاہور)

عورتوں سے متعلق مروجہ فقرے:

عورتوں کے متعلق مختلف ممالک میں جو مروجہ مثالی فقرے ہیں ان سے بھی عورتوں کی قدر و منزلت پر روشنی پڑتی ہے۔

روسی مثل ہے:"دس عورتوں میں ایک رُوح ہوتی ہے۔"

اطالیوں کا قول ہے:"گھوڑا اچھا ہو یا برا' اسے مہمیز کی ضرورت ہے۔عورت اچھی ہو یا بری اسے مار کی ضرورت ہے۔"

اسپینی زبان میں مثل ہے:

"بری عورت سے بچنا چاہیے' مگر اچھی صورت پر کبھی بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔"

(تمدن عرب صفحہ 373)

غیر مذاہب میں ازدواجی تعلقات:

اسلام سے پہلے مرد اور عورت کے ازدواجی تعلق کو اخلاقی روح اور اس کی ترقی کے لیے رکاوٹ تسلیم کیا جاتا تھا۔علامہ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

"اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب تھے' ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک اخلاق و روح کی ترقی مدراج کے لیے لائق و مانع تسلیم کیا گیا تھا' ہندوستان میں بودھ' جین' ویدانت' جوگ اور سادھو پن کے تمام پیرو اسی نظریے کے پابند تھے۔عیسائی مذہب میں تجرد اور عورت سے بے تعلقی ہی کمال روحانی کا ذریعہ تھا۔"

(سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم: سید سلیمان ندوی جلد ششم صفحہ 171)

سید مودودیؒ لکھتے ہیں کہ عیسائیت میں ایک نظریہ یہ تھا کہ:

''عورت اور مرد کا صنفی تعلق بجائے خود ایک نجاست اور قابل اعتراض چیز ہے' خواہ وہ نکاح کی صورت ہی میں کیوں نہ ہو۔ اخلاق کا یہ راہبانہ تصور پہلے سے اشراقی فلسفہ (Neo-Platonism) کے زیر اثر مغرب میں جڑ پکڑ رہا تھا۔ مسیحیت نے آ کر اسے حد کو پہنچا دیا۔ اب تجرد اور دوشیزگی معیار اخلاق قرار پائی............لوگ ازدواج سے پرہیز کرنے کو تقویٰ اور تقدس اور بلندی اخلاق کی علامت سمجھنے لگے۔'' (پردہ صفحہ 21)

اسلام میں عورت کی حیثیت

عورتوں کی حیثیت کا اعلان: پہلا ''قرآنی مشورہ'' نسوانی حقوق کے بارے میں جس کا اعلان کیا گیا' یہ تھا:

''اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو' جس نے تم سب کو ایک جاندار سے پیدا کیا اور اس جاندار سے اس کا جوڑ پیدا کیا' اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں'' (النساء: 1)

اس سے پتہ چلا کہ مرد اور عورت ایک ہی سرچشمہ کی دو موجیں ہیں۔ ''انسانیت'' کی حد تک دونوں میں کمی وبیشی کے خیالات کا تعلق واقعہ سے نہیں بلکہ صرف وسوسہ سے ہے۔ اس آیت میں یہ حقیقت واشگاف کی گئی ہے کہ عورت جس کو مرد انسانیت سے خارج سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے از سرتاپا غلط ہے۔ عورت کوئی جداگانہ' الگ مخلوق نہیں وہ بھی انسان ہی ہے جیسے مرد انسان ہیں۔ قرآن کریم میں ہے:

''اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہاری ذاتیں' برادریاں بنائیں تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو ورنہ اللہ کے نزدیک تم میں بڑا شریف وہی ہے جو تم میں بڑا پرہیزگار ہے۔'' (الحجرات: 12)

اس آیت میں اس واقعہ کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ کوئی مرد ایسا نہیں ہے جس کی پیدائش میں عورت کی شرکت نہ ہو' ایسا مرد جو صرف مرد ہی سے پیدا ہوا ہو' اس کا دعویٰ کون کر سکتا ہے؟ پھر مرد کو کیا حق ہے کہ مردوں کو تو باعزت اور عورت کو حقیر و ذلیل سمجھے۔ بہرحال یہ اور اس طرح کی دوسری آیات قرآنی میں اللہ نے انسان کو یہی بتایا ہے کہ عورت ذاتی شرف میں مرد سے کسی درجہ میں کم نہیں۔ لہٰذا عورتوں کو جانور کی طرح ناجائز استعمال کرنا اور ان کے ناموس کو زرکشی کا آلہ بنا لینا' انسانیت کی توہین و تحقیر کی بدترین شکل ہے۔

لڑکیوں سے حسن سلوک کی ترغیب: اسلام نے عورت کو اس کا صحیح مقام عطا کیا' لڑکیوں کو قتل کرتے سلسلہ بند کیا اور جہاں موقعہ ملتا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لڑکیوں کے ساتھ حسن سلوک کی ترغیب دیتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے حتیٰ کہ وہ سن بلوغ کو پہنچ جائیں تو وہ قیامت میں میرے ساتھ ہوگا اور اتنا قریب ہوگا جتنی آپس میں یہ انگلیاں نزدیک ہیں۔'' اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلیوں کو ملا کر اشارہ فرمایا''

(ریاض الصالحین للنووی عن المسلم' صفحہ 146)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لوگو! خبردار ہو جاؤ' میں تم کو دو کمزوروں کے حقوق کی تاکید کرتا ہوں' اور اس میں کوتاہی کرنے سے ڈراتا ہوں۔ ایک یتیم اور دوسرے عورت۔ (ریاض الصالحین صفحہ 147)

خود رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں نے آ کر بیان کیا تھا کہ:

'جاہلیت میں' میں نے دس لڑکیاں اپنے ہاتھوں سے زندہ دفن کی ہیں۔''

کسی نے کہا کہ:

''میں نے اپنی بچی کو بلایا۔ وہ ہنستی دوڑتی میرے ساتھ آئی اور جب ایک کنویں کے پاس پہنچی تو میں نے ہاتھ پکڑ کر کنویں میں ڈال دیا۔ وہ میرے ابا میرے ابا پکارتی رہی تھی۔''

یہ سن کر رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم اتنا روئے کہ ریش مبارک تر ہو گئی۔

(سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم: سید سلیمان ندوی' جلد ششم بعنوان: ''اولاد کا حق'')

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ' ایک دن میرے پاس ایک عورت آئی جو اپنے ساتھ دو لڑکیوں کو بھی لیے ہوئے تھی۔ غریب و بے کس تھی' اس نے مجھ سے سوال کیا۔ میرے پاس صرف ایک چھوہارا تھا۔ وہی مانگنے والی عورت کو دیدیا' اس نے چھوہارا لے کر دو حصے کیے اور آدھا آدھا دونوں بچیوں کو دے دیا۔ خود کچھ نہ کھایا' پھر وہ اٹھی اور چلی گئی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم جب اندر تشریف لائے تو میں نے یہ واقعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے بیان کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سن کر فرمایا: ''جو بھی ان لڑکیوں کے لیے تکلیف جھیلتا ہے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے ان کے لیے یہ لڑکیاں دوزخ کی آگ سے ڈھال بن جائیں گی۔'' (ریاض الصالحین عن البخاری و مسلم)

<u>میراث میں حصہ</u>: قدیم دنیا میں مختلف توہماتی خیالات کے تحت عورت کو حقیر سمجھ لیا گیا تھا۔ اس کے نتیجہ میں عورت کو جن حقوق سے محروم کیا گیا ان میں سے ایک جائیداد کا حصہ تھا۔ خاندان کی جائیداد میں عورت کا حصہ ختم کر دیا گیا۔ یہ اسلام تھا جس نے تاریخ میں پہلی بار باقاعدہ طور پر عورتوں کا وراثتی حصہ مقرر کیا۔ قرآن مجید میں ارشاد ہوا:

''اللہ تم کو حکم دیتا ہے تمہاری اولاد کے میراث کے بارے میں کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے حصہ کے برابر ہے اور اگر صرف لڑکیاں ہی ہوں گو دو سے زیادہ ہوں تو ان لڑکیوں کو دو تہائی ملے گا اس مال کا جو مورث چھوڑ کر مرا ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اس کو نصف ملے گا۔'' (النساء: 2)

اسلام کا منشا ہی یہ تھا کہ ملکیت کا اقتدار مردوں ہی کا مخصوص امتیاز نہیں ہے بلکہ اس اقتدار میں عورت بھی مرد کی شریک ہے۔ اس حقیقت کا اظہار قرآن کریم میں ان الفاظ میں بھی کیا گیا:

''اس چیز میں جس کو ماں باپ اور بہت نزدیک کے قرابت دار چھوڑ کر مر جائیں مردوں کے لیے بھی حصہ ہے اور عورتوں کے لیے بھی۔ جو حصہ قطعی طور پر مقرر ہے' خواہ وہ چیز قلیل ہو یا کثیر۔''

(النساء: 1)

عورت ماں کی حیثیت سے: عورت کسی قالب میں ہو محض عورت ہونے کی وجہ سے ملکی اقتدار سے محروم نہیں ہو سکتی۔ ماں کا ذکر کر کے فرمایا گیا:

"میت کے ترکہ میں اگر میت کی کچھ اولاد ہو تو ماں باپ میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا چھوٹا ہے۔ اور اگر اس میت کی کچھ اولاد نہ ہو اور اس کے ماں باپ ہی اس کے وارث ہوں تو اس کی ماں کا ایک تہائی ہے اور اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی یا بہن ہوں تو اس کی ماں کو چھٹا حصہ ملے گا۔" (النساء:2)

اس آیت میں جہاں باپ کو وارث قرار دیا گیا ہے وہیں ماں بھی وارث قرار دی گئی ہے۔ کہیں تہائی حصہ اور کہیں چھٹا حصہ۔ مگر ایسا نہیں کیا کہ ماں چونکہ عورت ہے اس لیے وہ محروم الارث ہے اور حصہ پانے کی حقدار نہیں۔

عورت بیوی کی حیثیت سے: عورت نے لڑکی ہونے کی حیثیت سے بھی حصہ لیا اور ماں ہونے کی حیثیت سے بھی حق دار ٹھہری۔ وہ بیوی ہو کر بھی حصہ پاتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"اس ترکہ میں سے جو تمہاری بیویاں چھوڑ جائیں اور ان کی کچھ اولاد نہ ہو تو تم کو آدھا ملے گا' اور اگر ان کی کچھ اولاد ہو تو تم کو ان کے ترکہ سے ایک چوتھائی ملے گا' بہر حال یہ میراث' وصیت کر گئی ہوں تو وصیت اور دین کی ادائیگی کے بعد ملے گی اور جس کو تم چھوڑ جاؤ اور تمہاری کوئی اولاد نہ ہو تو ان بیبیوں کو ترکہ کا چوتھائی ملے گا اور اگر تمہاری کچھ اولاد ہو تو ان کو تمہارے ترکہ میں آٹھواں حصہ ملے گا' مگر یہ میراث تمہاری وصیت پوری کرنے اور دین کی ادائیگی کے بعد ملے گی۔" (النساء:2)

ماں کے روپ میں عورت کا احترام: اللہ تعالیٰ نے ماں کی تعظیم و تکریم کا حکم دیا اور اس کی محبت جو اولاد کے ساتھ ہوتی ہے اس کو جتایا اور قرآن پاک میں ماں باپ کے ساتھ صراحتاً یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ کبھی اُف تک نہ کہو۔ ظاہر اور باطن دونوں طرح ماں کی عزت کرو۔ زبان بھی نرم ہو اور قلب میں بھی جھکاؤ ہو۔ فرمایا: "انہیں اف تک نہ کہو اور نہ انہیں جھڑکی دو اور ان کے ساتھ نرمی سے بات کرو۔" (بنی اسرائیل:3)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تمہاری ماں سب سے زیادہ تمہاری تعظیم و تکریم کی مستحق ہے۔" (بخاری' کتاب الآداب)۔ ایک حدیث میں فرمایا: "ماں کے قدموں تلے جنت ہے۔ ماں باپ کی خوشنودی کے بغیر جنت کا دروازہ تم پر نہ کھلے گا۔" (ترمذی' کتاب البر وصلہ)

عورتوں کی عفت و عصمت کا تحفظ اسلام میں: اسلام نے عورتوں کی عفت و عصمت کا تحفظ کرتے ہوئے جاہلیت کے تمام طریقہ ہائے نکاح ختم کر ڈالے جو دراصل کھلی فحاشی اور گناہ تھے۔ عورت جو مردوں کے لیے عیاشی اور لطف اندوزی کا ذریعہ بن چکی تھی اسے عزت و ناموس عطا کی اور زنا کو حرام قرار دیا۔ فرمایا: "اور زنا کے پاس بھی مت بھٹکو بلاشبہ وہ بڑی بے حیائی کی بات ہے اور برا راستہ ہے۔" (اسراء:4)

ایک اور مقام پر ارشاد ربانی ہے:

"تم ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو۔ مگر جو بات گزر گئی' بے شک یہ

بڑی بے حیائی ہے اور نہایت نفرت کی بات ہے اور بہت برا طریقہ ہے۔" (النساء:30)

حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"شرک کے بعد کوئی گناہ اس نطفہ سے بڑھ کر گناہ نہیں ہے، جس کو کوئی شخص کسی ایسے رحم میں رکھے جو شرعاً اس کے لیے حلال نہ تھا۔" (ابن کثیر جلد 3 صفحہ 38)

ایک اور حدیث میں رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"زناکار جس وقت زنا کرتا ہے اس وقت مومن نہیں ہوتا۔" (مشکوۃ شریف)

"بندہ جب زنا کرتا ہے اس وقت ایمان اس سے نکل جاتا ہے اور اس کے سر پر سایہ بن کر ہوتا ہے اور زانی جب فعل زنا سے فارغ ہوتا ہے تو ایمان اس کی طرف پلٹ آتا ہے۔"

(مشکوۃ شریف باب الکبائر)

اللہ تعالیٰ نے تمام فحش امور کو حرام قرار دیا ہے اور فرمایا ہے:

"آپ فرمائیے کہ صرف تمام فواحش باتوں کو البتہ میرے رب نے حرام کیا ہے۔ ان میں جو علانیہ ہوں ان کو بھی اور جو پوشیدہ ہوں ان کو بھی، اور ہر گناہ کی بات کو، اور ناحق کسی پر ظلم کرنے کو (بھی حرام کیا ہے)" (الاعراف:4)

حضور علیہ السلام نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ظاہر و باطن تمام فواحش کو حرام قرار دے دیا۔ یہ کھل کر ہو یا پردہ پوشی کے ساتھ۔"

(الجواب الکافی لابن القیم۔ صفحہ 219)

ایک موقعہ پر خطبۂ کسوف میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"اے امتِ محمد! صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی قسم اس بات سے اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کسی کو غیرت نہیں ہوتی کہ کوئی مرد یا عورت زنا کرے، اور بخدا جو کچھ میں جانتا ہوں تم جانتے تو بہت کم ہنستے اور بکثرت روتے۔" (بخاری)

قرآن مجید کی ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے فواحش سے روکا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

"بلاشبہ اللہ تعالیٰ عدل و احسان اور اہل قرابت کو دینے کا حکم فرماتے ہیں اور کھلی برائی اور مطلق برائی اور ظلم کرنے سے منع کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تم کو اس لیے نصیحت فرماتے ہیں کہ تم نصیحت قبول کرو۔" (النحل:13)

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ بن مسعود فرماتے ہیں:

"کسی بستی میں سود اور زنا جب پھیل جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس بستی کی ہلاکت کی اجازت مرحمت فرما دیتا ہے۔" (الجواب الکافی، صفحہ 220)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بحیثیت خلیفہ پہلا خطبہ ارشاد فرمایا:

"دیکھو جس قوم نے بھی اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا چھوڑ دیا، اللہ نے اسے ذلیل کر دیا ہے، اور جس

قوم میں بھی بدکاری پھیل جاتی ہے خدا اس میں مصیبت کو پھیلا دیتا ہے۔"
(تاریخ ملت' جلد 2 'صفحہ 40)

عورت کا درجہ اسلام میں:

مذکورہ بالا آیات و روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے عورتوں کی عفت و عصمت کے تحفظ کے لیے سخت احکام جاری کیے اور اس طرح عورتوں کے مقام و مرتبہ کو رفعت عطا کی۔ اسلام نے بلاشبہ عورتوں کو ان کے جائز حقوق عطا کیے۔ ماں' بہن' بیوی' بیٹی اور دیگر رشتوں کی شکل میں ان کے حقوق کا تعین کیا اور مردوں کو پابند کیا کہ وہ عورتوں کے حقوق کی پاسداری کریں اور ان سے ظلم و جور کا برتاؤ نہ کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی لیے ارشاد فرمایا کہ: "تم میں سب سے اچھے وہ ہیں جو اپنی عورتوں کے لیے اچھے ہیں۔" ایک موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عورتوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔"

عورتوں کو اسلام میں کتنا باعزت مقام دیا گیا ہے۔ اس کا اندازہ حسب ذیل روایات سے ہوتا ہے:

حضور علیہ السلام نے فرمایا:

(i) "دنیا کی ہر چیز سامان ہے۔ اور دنیا کا سب سے اچھا سامان نیک عورت ہے۔" (مسلم)

(ii) "سب سے افضل چیز خدا کی یاد کرنے والی زبان ہے۔ اور خدا کا شکر کرنے والا دل ہے اور مومن بیوی ہے جو اس کے ایمان پر اس کی مدد کرے۔" (احمد' ترمذی' ابن ماجہ)

(iii) "اللہ کے تقویٰ کے بعد سب سے بہتر چیز جو ایک مومن پاتا ہے وہ نیک بیوی ہے۔" (ابن ماجہ)

(iv) عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ کیونکہ عورت پسلی سے پیدا کی گئی ہے اور پسلی میں سب سے زیادہ ٹیڑھا اس کے اوپر کے حصہ میں ہوتی ہے۔ اگر تم اس کو سیدھا کرنے لگو گے تو تم اس کو توڑ دو گے اور اگر تم اس کو چھوڑ دو تو وہ ویسی ہی رہے گی۔ پس تم عورتوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کی میری نصیحت قبول کرو۔" (بخاری)

(v) "مجھے تمہاری دنیا کی چیزوں میں سے خوشبو اور عورتیں محبوب بنائی گئی ہیں اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔" (بخاری)

(vi) "دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز نیک بیوی سے بہتر نہیں۔" (ابن ماجہ)

(vii) "جس شخص کے یہاں لڑکی ہو۔ پھر وہ نہ اس کو زمین میں گاڑے اور نہ اس کی تحقیر کرے اور نہ اس پر اپنے لڑکے کو ترجیح دے تو اللہ اس کو جنت میں داخل کرے گا۔" (ابوداؤد)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ اے خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ' لوگوں میں کون ہے جو سب سے زیادہ میرے حسن سلوک کا مستحق ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری ماں' اس نے کہا پھر کون۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے کہا پھر کون' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہاری ماں۔ اس نے کہا کہ پھر کون' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تمہارا باپ۔

اسلام نے عورت کو جو باعزت مقام دیا ہے اس کی ایک علامتی مثال وہ ہے جو حضرت ہاجرہ کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

''حضرت ابراہیم جب حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کو اس خشک مقام پر چھوڑ کر چلے گئے تو ایک بار پانی کی تلاش میں وہ صفا اور مروہ پہاڑیوں کے درمیان سات بار دوڑیں۔ یہی وہ عمل ہے جس کی تقلید میں ہر حاجی آج بھی دونوں پہاڑیوں کے درمیان سات بار سعی کرتا ہے۔ یہ اللہ کے لیے سرگرم ہونے کا ایک سبق ہے جو تمام مردوں اور عورتوں کو ایک خاتون کے عمل کی پیروی کی صورت میں دیا جاتا ہے۔ عورت کی عظمت کا شاید اس سے بڑا کوئی مظاہرہ نہیں ہوسکتا کہ ہمیشہ کے لیے تمام مردوں کو ایک عورت کے نقش قدم پر چلنے کا حکم دے دیا جائے۔''

(خاتونِ اسلام' مولانا وحید الدین خان' صفحہ 196)

حقوق نسواں کے حوالے سے جدید افکار اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ

سوال: حقوق نسواں کے حوالے سے جدید افکار اسلامی تعلیمات کی روشنی میں جائزہ لیں۔

قدیم معاشروں میں حقوق نسواں کی صورت حال کا جائزہ:

مشہور عرب فاضل استاد عباس محمود العقاد نے اپنی ایک کتاب میں اسلام سے پہلے کے مذاہب اور معاشروں میں عورت کے مقام و مرتبہ اور اس کو حاصل حقوق کے حوالہ سے تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں مانو (منو) کی شریعت' باپ' شوہر یا دونوں کے وفات ہو جانے کی صورت میں بیٹے سے علیحدہ عورت کا کوئی مستقل حق نہیں مانتی تھی اور ان سب کی وفات کے بعد اس کا شوہر کے کسی قریبی رشتہ دار سے متعلق ہو جانا ضروری تھا۔ وہ کسی حال میں اپنے معاملہ میں خود مختار نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے لیے اپنے شوہر کے مرنے کے دن مر جانا اور اس کی چتا پرتی ہو جانا ضروری تھا اور یہ پرانی رسم برہمنی تمدن کے قدیم زمانہ سے سترہویں صدی عیسوی تک برقرار رہی۔

عراق کی حمورابی شریعت' جو تین ہزار سال قبل مسیح بابل میں کارفرما تھی' عورت کو پالتو جانور سمجھتی تھی۔ اس کی نظر میں عورت کی جو حیثیت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس کی رو سے اگر کسی نے کسی لڑکی کو قتل کیا ہے تو قاتل کو اپنی لڑکی مقتولہ لڑکی کے بدلے میں حوالہ کرنی ہوتی تھی تا کہ لڑکی والا اسے قتل کر دے' باندی بنائے یا معاف کر دے' مگر وہ اکثر قتل ہی کی جاتی تھی۔

یونان قدیم میں عورت ہر قسم کے حقوق آزادی سے محروم تھی۔ بیویوں اور گھریلو عورتوں کی طرف سے بے توجہی کے سبب بڑے یونانی شہروں میں ایسی محفلیں عام ہو گئی تھیں جن میں گانے والیوں اور فاحشہ عورتوں سے دل بہلایا جاتا تھا۔ اسی طرح یونان کے فلسفیوں کے حلقے بھی عورتوں کی موجودگی سے خالی نظر آتے ہیں۔ پیشہ ور عورتوں جیسی شہرت و عزت کسی شریف خاتون کو حاصل نہ تھی۔ ارسطو جیسا فلسفی حکیم اپنے ملک کے لوگوں پر اعتراض کرتا تھا کہ انہوں نے عورتوں کو کسی حد تک وراثت' طلاق اور آزادی کے حقوق دے رکھے ہیں۔ وہ اسپارٹا کے زوال کا سبب عورتوں کی آزادی کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

قدیم رومیوں کا عورتوں کے ساتھ معاملہ قدیم ہندوؤں جیسا ہی تھا۔ جس کے تحت وہ باپ' شوہر اور بیٹوں کے ماتحت رہتی تھیں۔ اپنے تہذیبی عروج کے دور میں ان کا خیال تھا کہ نہ عورت کی بیڑی کاٹی جا سکتی ہے نہ اس کی گردن سے جوا (جس سے بیل جوتے جاتے ہیں) اتارا جا سکتا ہے۔

قدیم مصری تہذیب میں اگرچہ عورتوں کو کچھ حقوق حاصل تھے مگر اسلام سے پہلے کے دور میں رومی تہذیب کے سقوط اور اس کی عیاشی ولذت پرستی کے عمل کے طور پر دنیوی زندگی سے نفرت کا رجحان پیدا ہو گیا تھا۔ بلکہ زندگی اور آل واولاد کی طرف سے سرد مہری پیدا ہو گئی تھی۔ اور راہبانہ رجحانات نے جسم اور عورت کو نجس (ناپاک) سمجھ لیا تھا۔ اور عورتوں کو گناہوں کا ذمہ دار قرار دیا جاتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے یہ اثرات پندرہویں صدی عیسوی تک عیسائی دنیا میں برقرار رہے اور مارکون (Marcon) کے اجتماع میں راہبوں نے یہ سوال اٹھایا کہ عورت کیا جسم بلا روح ہے اور روح رکھنے والا جسم ہے جس سے نجات یا ہلاکت متعلق ہوتی ہے؟ اکثریت کا خیال یہ تھا کہ عورت نجات پانے والی روح سے خالی ہے اور کنواری مریم (علیہ السلام) والدہ حضرت مسیح (علیہ السلام) کے سوا کوئی عورت نجات نہیں پا سکتی۔ مصریوں پر رومی مظالم کی شدت ان کی رہبانیت اور دنیا بیزاری کا سبب بن گئی تھی' چنانچہ بہت سے لوگ رہبانیت اور عورتوں سے دوری کو قرب الٰہی کا ذریعہ سمجھتے تھے۔

شریعت موسوی کی طرف منسوب کتابوں کی تعلیم کے مطابق لڑکی باپ کی میراث سے خارج ہو جاتی ہے۔ اگر اس کی اولاد "ذکور موجود" ہو یعنی جب تک اولاد ذکور رہے گی لڑکی باپ کی میراث سے محروم رہے گی اور جس لڑکی کو میراث ملے گی اسے کسی دوسرے قبیلہ میں شادی کی اجازت نہ ہوگی اور نہ اسے قبیلہ کی طرف سے منتقل کرنے کی اجازت ہوگی۔ یہ حکم کتب توراۃ میں متعدد جگہوں پر ہے۔

عرب کے بعض اطراف میں عورت سے بدمعاملگی دنیا کے سارے ملکوں سے زیادہ تھی۔ باپ' شوہر' بھائی اور بیٹے اپنی ملکیت یا حمایت میں داخل اشیاء گھوڑے' جانور' کنواں اور چراگاہ کی طرح اس کی حفاظت کرتے تھے۔ بحیثیت عورت کے اس کا کوئی حق واحترام نہ تھا۔ وہ مال مویشی کے ساتھ میراث میں منتقل ہوتی تھی۔ لوگ شرم کے مارے اپنی بیٹیوں کو بچپن ہی میں زندہ درگور کر دیتے تھے۔ اس پر خرچ کرنے کو بوجھ سمجھا جاتا تھا جبکہ اپنی مملوکہ باندیوں یا نفع بخش جانور پر خرچ کو بوجھ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ اور جو اسے زندہ رکھتے ان کی نظر میں اس کی قیمت میراث کی تھی جو باپ سے بیٹوں کو منتقل ہوتی تھی اور قرض یا سودی ادائیگی میں اسے بیچا اور رہن رکھا جا سکتا تھا۔

(المرأة في القرآن للاستاد عباس محمود العقاد. ملخصاص 51 تا 57)

بدھ مت میں عورت کی جو حیثیت تھی اس کا اندازہ ایک بدھ مفکر چلاویگا (Chullavagga) کے قول سے لگایا جا سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "پانی کے اندر مچھلی کی ناقابل فہم عادتوں کی طرح عورت کی فطرت بھی ہے۔ اس کے پاس چوروں کی طرح متعدد حربے ہیں اور سچ کا اس کے پاس گزر نہیں۔"

(Encyclopedia of Religion and Ethics Vol.V P271)

ہندو دھرم میں عورت کے بارے میں ہندوؤں کا جو خیال ہے وہ مذہب واخلاق کے انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار کے مطابق حسب ذیل ہے:

''عورت کبھی بھی آزاد نہیں ہو سکتی......... وہ ترکہ نہیں پا سکتی......... شوہر کے مرنے پر اپنے سب سے بڑے بیٹے کے تحت زندگی گزارنی ہوگی......... شوہر اپنی بیوی کو لاٹھی سے پیٹ سکتا ہے......... شوہر کے مرنے کے بعد عورت دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔''

(Encyclopedia of Religion and Ethics Vol.V P271)

''یونیورسل ہسٹری آف دی ورلڈ'' کا مصنف ہندوؤں کے بارے میں لکھتا ہے:

''رگ وید میں عورتوں کو پست اور حقیر مقام دیا گیا ہے' بعد میں یہ سمجھا جانے لگا کہ وہ روحانی طور پر ناقابل اعتبار بلکہ تقریباً بے روح ہے اور موت کے بعد مردوں کو نیکیوں کے بغیر اسے بقا حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسکی ساری امیدوں کو ختم کرنے والے مذہب کے ساتھ رسم ورواج کی بیڑیوں نے یہ ناممکن کر دیا کہ عورت کسی نمایاں شخصیت کو جنم دے سکے' عورتوں کو جنم دینے والے ''منو'' نے انہیں اپنے گھر' بستر' زیور کی محبت' بری خواہشیں' غصہ' بے ایمانی اور برے اطوار عطا کیے' عورتیں اتنی ہی بری ہیں جتنا کہ جھوٹ' یہ ایک مسلم حقیقت تھی' عورت کی فطرت میں یہ دخل ہے کہ وہ مردوں کو اس دنیا میں غلط راستہ پر ڈالے' اسی لیے عقل مند عورتوں کی صحبت میں بے فکر ہو کر نہیں بیٹھتے۔''

(Universal History of the World,
Ed.J.A Hamerton, P.378)

چین میں عورت کا جو مقام تھا اس کے بارے میں رے سٹریچے (Ray Strachey) لکھتا ہے کہ ''مشرق بعید یعنی چین میں حالات اس سے بہتر نہیں تھے۔ چھوٹی لڑکیوں کے پیروں کو کاٹھ مارنے کی رسم کا مقصد یہ تھا کہ انہیں بے بس اور نازک رکھا جائے۔'

(Universal History of the World P.278)

انگلستان میں عورتوں کی حالتِ زار اور حقوق سے محرومی کے بارے میں رے سٹریچے (Ray Strachey) لکھتا ہے۔

''وہاں (انگلستان) میں اسے ہر قسم کے شہری حقوق سے محروم رکھا گیا تھا۔ تعلیم کے دروازے اس پر بند تھے' صرف چھوٹے درجے کی مزدوری کے علاوہ وہ کوئی کام نہیں کر سکتی تھی اور شادی کے وقت اسے اپنی ساری املاک سے دستبردار ہونا پڑتا تھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ سے انیسویں صدی تک عورت کو جو درجہ دیا گیا تھا' اس سے کسی بہتری کی امید نہیں کی جا سکتی تھی۔''

(Universal History of the World (London) P.378)

حقوق نسواں مغربی دنیا میں:

یہ بات کھلے ذہن سے سمجھ لینی چاہیے کہ آزاد روش یورپی معاشرے کی ظاہری چکا چوند حقیقت نہیں ہے بلکہ حقیقت انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کے علاوہ امریکہ کے اندر عدالتی مقدمات میں ملے گی جہاں سب سے زیادہ مقدمات میاں بیوی کی زندگی کی بے چینی واضطراب کی چغلی کھاتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ایک سروے کے مطابق مغربی ممالک میں خاندان کا ادارہ جس تیزی سے اجڑ رہا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک سال (1990ء) میں امریکہ کے اندر 2162000 شادیاں ہوئیں اور 11,17000 طلاقیں' آسٹریلیا میں 116945 شادیاں ہوئیں اور 42635 طلاقیں' ڈنمارک میں 30894 شادیاں ہوئیں' 15152 طلاقیں' سوئٹزرلینڈ میں 46203 شادیاں ہوئیں اور 1383 طلاقیں ہوئیں۔یہی حال دوسرے یورپی ممالک کا ہے۔

(The Statesman Year Book 1992-93 P.382, 1395)

''نیوزویک'' (16 جولائی 1990ء) کی رپورٹ کے مطابق امریکہ میں ہر سال تمیں' چالیس لاکھ عورتوں پر جسمانی تشدد ہوتا ہے۔ہر اٹھارہ سیکنڈ کے بعد ایک عورت تشدد کا نشانہ بنتی ہے۔جس معاشرے میں چند لمحوں کے لیے بجلی بند ہو جائے تو ہزاروں عورتیں ناجائز طور پر حاملہ ہو جاتی ہوں' آئیڈیل (مثالی) معاشرہ نہیں کہلا سکتا اور نہ ہی یہ آزادی نسواں یا پھر تحفظ حقوق نسواں کا کوئی معیار ہے۔بلکہ یہ حقیقی پستی' حقیقی رسوائی' اور حقیقی ذلت کی منزل ہے۔

جرمن سوشل ڈیموکریٹک پارٹی کا لیڈر ببل (Bebel) نہایت بے تکلفانہ انداز میں لکھتا ہے:

> ''عورت اور مرد آخر حیوان ہی تو ہیں۔کیا حیوانات کے جوڑوں میں نکاح اور وہ بھی دائمی نکاح کا کوئی سوال پیدا ہو سکتا ہے۔''

(پردہ: سید مودودی' صفحہ 54 ایڈیشن 2006ء اسلامک پبلی کیشنز لاہور)

امریکہ کے مصلحین اخلاق کی ایک مجلس (Committee of Fourteen) کے نام سے مشہور ہے۔اس مجلس کی طرف سے بداخلاقی کے مرکزوں کی تلاش اور ملک کی اخلاقی حالت کی تحقیقات اور اصلاح اخلاق کی عملی تدابیر کا کام بڑے پیمانے پر کیا جاتا ہے۔اس کی رپورٹوں میں بیان کیا گیا ہے کہ امریکہ کے جتنے رقص خانے' نائٹ کلب' حسن گاہیں' ہاتھوں کو خوبصورت بنانے کی دکانیں' مالش کدے اور بال سنوارنے کی دکانیں ہیں۔قریب قریب سب باقاعدہ قحبہ خانے بن چکے ہیں' بلکہ ان سے بھی بدتر کیونکہ وہاں ناقابل بیان افعال کا ارتکاب کیا جاتا ہے۔(پردہ: صفحہ 92)

مغربی دنیا میں عورت محض عیاشی کا سامان بن چکی ہے۔وہاں ''حقوق نسواں'' کے نام سے دراصل عورت کو گھر سے نکال کر باہر کی دنیا میں لا کر ''اختلاط مرد وزن'' کی کھلی آزادی کی راہ ہموار کی گئی ہے۔مغربی فکر میں حقوق نسواں کی یہی حقیقت ہے۔اگر مغربی معاشرہ میں عورت کی کوئی قدر و قیمت اور احترام ہوتا تو وہاں

طلاقوں کی وجہ سے خاندان اتنی بڑی تعداد میں نہ ٹوٹتے' فواحش کا طوفان بدتمیزی دکھائی نہ دیتا' کثیر تعداد میں بن بیاہی مائیں نہ ہوتیں اور عورت محض سامان عیاشی اور کلبوں اور ہوٹلوں کی زینت بن کر نہ رہ جاتی۔ ''آزادی نسواں'' اور ''حقوق نسواں'' کے دلفریب نعرے فریب کے سوا کچھ نہیں۔ اس کے برعکس اسلام ہی وہ واحد دین ہے جس نے عورتوں کو اعلیٰ درجہ دیا اور اسے عزت وتکریم کے ساتھ وہ حقوق بھی عطا کیے جو دنیا کے کسی نظریئے' اور معاشرے نے اسے نہیں دیے تھے۔

اسلام نے عورت کو نئی زندگی عطا کی:

دنیا بھر میں مظلومیت اور بے کسی کے مذکورہ بالا حالات کے برعکس اسلام نے اس مظلوم طبقہ کو حقوق اور تحفظ کے ماہ وسال عطا کیے۔ قرآن مجید کی تعلیم کی رو سے عورت کا معاشرہ میں ایک متعین مقام ہے۔ وہ دین' علم' خدمت اسلام' خیر وتقویٰ میں تعاون اور صالح معاشرہ کی تعمیر میں پوری طرح حصہ لے سکتی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

> ''اور جو کوئی نیک اعمال کرے گا' خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ صاحب ایمان ہو تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے۔'' (النساء: 124)

دوسری جگہ ارشاد فرمایا:

> ''نیک عمل جو بھی کرے گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت' بشرطیکہ صاحب ایمان ہو' ہم اسے ضرور ایک پاکیزہ زندگی عطا کریں گے۔'' (النحل: 97)

قرآن مجید نے صرف مقامات حسنہ اور اعمال صالح میں صرف مردوں کے ساتھ عورتوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ ایک ایک اچھی صفت جو مردوں کے لیے بیان فرمائی ہے وہی عورتوں کے لیے بھی بیان فرمائی ہے اور اس کے حاصل کرنے کی ترغیب دی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

> ''بے شک اسلام لانے والے اور اسلام لانے والیاں' اور ایمان والے اور ایمان والیاں' اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور صادق مرد اور صادق عورتیں' اور صابر مرد اور صابر عورتیں' اور خشوع والے اور خشوع والیاں' اور تصدق کرنے والے اور تصدق کرنے والیاں' اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں' اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے اور حفاظت کرنے والیاں' اور اللہ کو بکثرت یاد کرنے والے اور یاد کرنے والیاں' ان سب کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجر عظیم تیار کر رکھا ہے۔'' (الاحزاب: 35)

اور صرف اطاعت وعبادت ہی کے سلسلہ میں ان کا ذکر نہیں کیا بلکہ باصلاحیت مردوں' علماء اولوالعزم افراد اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے مردوں کے ساتھ بھی عورتوں کا ذکر فرمایا ہے:

> ''اور ایمان والے اور ایمان والیاں ایک دوسرے کے رفیق ہیں' نیک باتوں کا آپس میں حکم دیتے ہیں اور بری باتوں سے روکتے ہیں' اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے رہتے ہیں'

اور اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کرتے ہیں' یہ وہ لوگ ہیں کہ اللہ ان پر ضرور رحمت کرے گا' بے شک اللہ بڑے اختیار والا اور بڑی حکمت والا ہے۔" (التوبہ: 71)

اسلام نے مسلمان عورت کو جو حقوق دیے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

ملکیت و میراث کا حق' خرید و فروخت کا حق' شوہر سے علیحدگی (خلع) کا حق (اگر ضروری ہو)' منگنی ختم کرنے کا حق (اگر عورت آمادہ نہ ہو)' بیوگی کی صورت میں دوسرے نکاح کا حق' عیدین' جمعہ اور جماعت کی نمازوں میں شرکت کا حق اور ان کے علاوہ حقوق کی تفصیل کتب احادیث وفقہ میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہندوستان میں ستی کی رسم مسلمانوں کی آمد اور ان کے اثرات کی وجہ سے تقریباً ختم ہو گئی۔

دنیا میں عورت کی چار حیثیتیں ہیں۔

1- ماں 2- بیٹی 3- بیوی 4- بہن

1- اگر وہ ماں ہے تو اولاد کے لیے اسلام کا حکم ہے کہ ماں کے قدموں کے نیچے جنت ہے۔ لہٰذا دل وجان سے اس کی خدمت کی جائے اور اس کے ہر حکم کے آگے سر تسلیم خم کیا جائے بشرطیکہ وہ حکم خدا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف نہ ہو۔

2- اگر وہ بیٹی ہے تو وہ چراغ خانہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے دو یا تین بیٹیوں کی یا دو یا تین بہنوں کی پرورش کی تا آنکہ وہ اس سے جدا ہو جائیں (بیاہ کے بعد) یا فوت ہو جائیں تو میں اور وہ شخص جنت میں اس طرح ساتھ ساتھ ہوں گے جس طرح یہ دو انگلیاں اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگشتِ شہادت اور درمیانی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا (الادب المفرد) اور فرمایا:

"جو شخص بچی کی نگرانی و پرورش کرے گا' قیامت تک خدا کی مدد اس کے شامل حال رہے گی۔" (طبرانی)

3- اگر وہ بیوی ہے تو اس کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں میں اس آدمی کا ایمان زیادہ کامل ہے جس کا اخلاقی برتاؤ بہت اچھا ہو' خاص کر بیوی کے ساتھ جس کا رویہ لطف ومحبت کا ہو۔" (جامع ترمذی)

4- اگر وہ بہن ہے تو وہ بھائیوں کی عزت ہے اور اسلام کا حکم یہ ہے کہ بہن کے صرف حقیقی بھائی نہیں بلکہ سارے اسلامی بھائی اس کی عزت وآبرو اور اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔

اندازہ کریں کہ اس سے زیادہ کسی مذہب یا کسی نظریہ یا کسی فلسفہ نے عورت کو کیا دیا ہے؟ دنیاوی فلسفے نسوانی زندگی صرف ایک پہلو پر نظر رکھتے ہیں جبکہ اسلام کی نظر زندگی کے سارے پہلوؤں پر ہوتی ہے۔ اسلام کی نظر میں یہ بھی ہے کہ وہ صنفِ نازک ہے۔ لہٰذا اس کے لیے ضروری نہیں کہ وہ گھریلو کاموں اور اولاد کی تربیت و پرورش کے علاوہ دفتروں اور فیکٹریوں میں بھی کام کرے بلکہ اسے گھر کی ملکہ کا مقام دیا گیا ہے اور اس کا نان ونفقہ مرد سے لگایا گیا ہے۔

اسی طرح عورت کی عفت وعصمت کے تحفظ اور شر وفتن سے بچنے کے لیے پردہ کو لازمی قرار دیا گیا' جس میں مرد وعورت دونوں کی حفاظت ہے' دونوں کو حیاء وایمان کی حفاظت ہے۔اس کے برعکس جن اقوام اور معاشروں نے عورت کو شتر بے مہار کی طرح کھلا چھوڑ دیا' اس کی خرابیاں اور اس کے مفاسد اب ہر آدمی کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔جن کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

اسلام میں حقوق نسواں اغیار کی نظر میں:

اسلام نے عورت کو جو حقوق دیئے ہیں اور اسے نئی زندگی عطا کی ہے' اس کا اعتراف متعدد مغربی فضلاء اور تمدن وتاریخ کے ماہرین اور انصاف پسند مؤرخین نے بھی کیا ہے۔جنوبی ہند کے ایک ثقافتی ادارے (تھیاسوفیکل سوسائٹی) کی صدر اور ایک مغربی دانشور مسز اینی بسنت (Mrs. Annie Besant) لکھتی ہے:

''آپ کو ایسے لوگ ملیں گے جو مذہب اسلام پر اس لیے تنقید کرتے ہیں کہ یہ محدود تعدد ازدواج کو جائز قرار دیتا ہے۔لیکن آپ کو میری وہ تنقید نہیں بتائی جاتی جو میں نے لندن کے ایک ہال میں تقریر کرتے ہوئے کی تھی' میں نے سامعین سے کہا تھا کہ یک زوجگی کے ساتھ وسیع پیمانہ پر زنان بازاری کی موجودگی نفاق (Hypocristy) ہے اور محدود تعداد ازدواج سے زیادہ ذلت آمیز ہے' قدرتی طور پر اس قسم کے بیانات کا لوگ برا مانتے ہیں لیکن انہیں یہ بتلانا ضروری ہے' کیونکہ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ عورتوں کے متعلق اسلام کے قوانین ابھی حالیہ زمانہ تک انگلینڈ میں اپنائے جا رہے تھے۔یہ سب سے منصفانہ قانون تھا جو دنیا میں پایا جاتا تھا۔جائیداد' وراثت کے حقوق اور طلاق کے معاملات میں یہ مغرب سے کہیں آگے تھا اور عورتوں کے حقوق کا محافظ تھا۔یک زوجگی اور تعدد ازدواج کے الفاظ نے لوگوں کو مسحور کر دیا ہے اور وہ مغرب میں عورت کی اس ذلت پر نظر نہیں ڈالنا چاہتے جسے اس کے اولین محافظ سڑکوں پر صرف اس لیے پھینک دیتے ہیں کہ اس سے ان کا دل بھر جاتا ہے اور پھر وہ ان کی کوئی مدد نہیں کرتے۔''

("The Life and Teachings of Muhammad" مسز اینی بسنت صفحہ 3)

این۔ایل۔کولزن (N.L. Coulsen) لکھتا ہے:

''بلاشبہ عورتوں کی حیثیت کے معاملہ میں خاص طور پر شادی شدہ عورتوں کے معاملہ میں قرآنی قوانین افضلیت کا مقام رکھتے ہیں۔نکاح اور طلاق کے قوانین کی کثیر تعداد میں ہیں' جن کا عمومی مقصد عورتوں کی حیثیت میں بہتری لانا ہے......اسے قانونی شخصیت عطا کی گئی جو اسے پہلے حاصل نہیں تھی۔''

("A History of Islamic Law" صفحہ 14)

مذہب واخلاق کی انسائیکلوپیڈیا کا مصنف لکھتا ہے:

"پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کا درجہ اس سے زیادہ بلند کیا جو اسے قدیم عرب میں حاصل تھا' خصوصی طور پر عورت متوفی شوہر کے ترکہ کا جانور نہیں رہی بلکہ خود ترکہ پانے کی حق دار ہو گئی اور ایک آزاد فرد کی طرح اسے دوبارہ شادی پر مجبور نہیں کیا جا سکتا' طلاق کی حالت میں شوہر پر یہ واجب ہو گیا کہ وہ اسے سب چیزیں دے دے جو اسے شادی میں ملی تھیں۔ اس کے علاوہ اعلیٰ طبقہ کی خواتین علوم اور شاعری سے دلچسپی لینے لگیں اور کچھ نے استاد کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ طبقۂ عوام کی عورتیں اپنے خاوندوں کی خوشی اور غم میں شریک ہونے لگیں' ماں کی عزت کی جانے لگی۔"

(Encyclopedia of Religion and Ethics Vol.V P.227)

عورتوں کو اظہار خیال کی آزادی:

اسلام نے عورتوں کو اظہار رائے کی مکمل آزادی دی ہے۔ بقول وحید الدین خان "حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ منبر پر کھڑے ہوئے اور لوگوں سے کہا کہ تم لوگ عورتوں کے زیادہ مہر نہ باندھو۔ اس کے بعد ایک عورت اٹھی اور اس نے بلند آواز سے کہا کہ اے عمر رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں آپ کو دخل دینے کا حق نہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ اگر تم نے عورتوں کو زیادہ مال دیا ہو تو اس میں سے کچھ نہ لو۔ یہ سن کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی بات واپس لے لی اور کہا عورت نے صحیح بات کہی اور عمر رضی اللہ عنہ نے غلطی کی۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اپنے وقت کے حکمران تھے۔ ان کو ایک عام عورت نے برسرِ عام ٹوک دیا اور حکمران کو اپنی بات واپس لینی پڑی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اسلامی معاشرہ میں عورت کو کس قدر زیادہ حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ بلاشبہ یہ حقوق کا آخری درجہ ہے کہ کسی کو اظہار رائے کا مطلق اختیار حاصل ہو اور اسلامی معاشرہ میں ایک عورت کو یہ بات پوری طرح حاصل ہوتی ہے۔"

(خاتون اسلام: مولانا وحید الدین خان' صفحہ 169, 170)

الغرض اسلام نے عورت کو صحیح مقام دے کر' اسے مکمل حقوق عطا کر کے اور اس کے احترام و شرف کو بڑھا کر انسانیت کو فسادِ عظیم سے بچا لیا ہے۔ مگر بدقسمتی سے تہذیب نو کی آموزکاریوں اور خود ساختہ اصولوں کی وجہ سے یہ حقوق پامال ہو رہے ہیں۔

مانگتے پھرتے ہیں اغیار سے مٹی کے چراغ
اپنے خورشید پہ پھیلا دیئے سائے ہم نے

جنسی تفریق کا جدید نظریہ اور اسلام

سوال: جنسی تفریق کے جدید نظریات پر روشنی ڈالیں۔

عورت جدید تہذیب میں:

جدید مغربی انسان کی اصل شکل یہ ہے کہ اس نے بے بنیاد طور پر عورت اور مرد کے درمیان صنفی مساوات کا عقیدہ بنا لیا۔ مساواتِ مرد وزن کے اس مغربی نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''مساوات کے معنی یہ سمجھ لیے گئے کہ عورت اور مرد نہ صرف اخلاقی مرتبہ اور انسانی حقوق میں مساوی ہوں' بلکہ تمدنی زندگی میں عورت بھی وہی کام کرے جو مرد کرتے ہیں' اور اخلاقی بندشیں عورت کے لیے بھی اسی طرح ڈھیلی کر دی جائیں جس طرح مرد کے لیے پہلے سے ڈھیلی ہیں۔''

(پردہ سید مودودی' صفحہ 24 اسلامک پبلی کیشنز لاہور)

مساواتِ مرد وزن کے مغربی تصور کے معنی یہ بن گئے ہیں کہ عورت کو زندگی کے تمام شعبوں میں مرد کے شانہ بشانہ کھڑا کر دیا جائے۔ چونکہ اسلام عورت اور مرد کا دائرہ کار الگ الگ قرار دیتا ہے اس لیے جدید انسان یہ فرض کر لیتا ہے کہ اسلام نے عورت کو کم تر درجہ دیا ہے۔ اس کے برعکس مغربی دنیا میں یہ آواز اٹھائی جا رہی ہے کہ عورت کو ہر شعبہ میں مرد کے برابر جگہ دی جائے۔ اس بناء پر جدید انسان نے یہ رائے قائم کر لی ہے کہ مغرب میں اس کو برتر درجہ دیا جا رہا ہے۔

مگر عملی صورتحال کیا ہے' اس کے بارے میں مولانا وحید الدین رقمطراز ہیں:

''مغرب کے انتہائی ترقی یافتہ سماج میں بھی عورت کو ایک اعتبار سے عملاً وہی درجہ ملا ہوا ہے جو قدیم معاشرہ میں اسے حاصل تھا۔ آج بھی مغرب میں مرد اور عورت کے درمیان عملی تقسیم ہے۔ عورت کے شعبے الگ ہیں اور مرد کے شعبے الگ .... جدید مغرب کے کسی بھی شعبہ میں عورت اور مرد کو عملی طور پر برابری کا وہ درجہ حاصل نہیں جس کا مغرب کے مفکرین نظری طور پر اعلان کر رہے ہیں۔'' (خاتون اسلام' وحید الدین خان صفحہ 49, 50)

مولانا وحید الدین خان آزادی نسواں کی اسلامی تحریک کا موازنہ مغرب سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''چودہ سو سال پہلے اسلام نے بھی ''آزادی نسواں'' کی ایک تحریک چلائی تھی۔ اس تحریک کا مقصد یہ تھا کہ عورت کو مصنوعی بندشوں سے نکالا جائے اور اس کو وہ مقام دیا جائے جو از روئے حقیقت اس کو ملنا چاہیے۔ (مثلاً گھر کی جائیداد میں دوسرے اہل خاندان کی طرح اس کا وراثتی حصہ مقرر کرنا)۔ اسلام کی اس تحریک نے عورت کا درجہ بلند کیا' بغیر اس کے کہ سماج میں کوئی نیا

مسئلہ پیدا ہوا ہو۔
اسلام کا تجربہ وحی کی روشنی میں کیا گیا' اس لیے وہ حدود کے اندر تھا۔ اس کے برعکس جدید مغرب کا تجربہ عقل کی روشنی میں (زیادہ صحیح الفاظ میں جذبات کے تحت) کیا گیا' اس لیے وہ حدود کا پابند نہ رہ سکا۔ اس تجربہ نے نئے نئے سماجی مسائل پیدا کر دیے۔" (خاتون اسلام' صفحہ 50)

مغربی نظریہ سے پیدا ہونے والے مسائل:

مغرب کے تصور "مساوات مرد و زن" سے مندرجہ ذیل قسم کے مسائل اور نتائج و عواقب سامنے آئے۔

(1) غیر فطری مساوات: انسانی مساوات کا مطلب اگر یہ ہو کہ ہر آدمی کو ہر شعبہ میں کام کرنا چاہیے تو یہ یقیناً ایک غیر فطری مساوات ہوگی کیونکہ ہر آدمی ہر شعبہ کے لیے موزوں نہیں ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مساوات کا مطلب عمل میں یہ مساوات نہیں بلکہ حیثیت میں مساوات ہے۔ مساوات انسانی یہ نہیں ہے کہ ہر آدمی وہی کام کرے جو کام دوسرا آدمی کر رہا ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ ہر آدمی کو یکساں عزت ملے۔ ہر ایک کو یکساں احترام کی نظر سے دیکھا جائے اور ہر ایک کے ساتھ یکساں اخلاقی سلوک کیا جائے۔
مرد اور عورت کے معاملہ میں مغرب کی غلطی یہی ہے کہ اس نے دونوں جنسوں کے درمیان مذکورہ بالا قسم کی غیر فطری مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کا نتیجہ وہی ہوا جو ہونا چاہیے تھا۔ مرد اور عورت کے درمیان تاریخ کی سب سے بڑی عدم مساوات قائم ہوگئی۔ مرد اور عورت دو الگ الگ جنسیں ہیں اور دونوں کی تخلیق الگ الگ مقاصد کے تحت ہوئی ہے۔ دونوں کو اگر ان کی تخلیق کے اعتبار سے ان کے اپنے میدان میں رکھا جائے تو دونوں اپنے اپنے میدان میں مساوی طور پر کامیاب رہیں گے اور اگر مرد اور عورت دونوں کو ایک ہی میدان میں ڈال دیا جائے تو عورت وہ کام نہ کر سکے گی جو مرد اپنی تخلیقی صلاحیت کے اعتبار سے زیادہ بہتر طور پر کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ عورت مرد کے مقابلہ میں کم تر درجہ کی جنس بن کر رہ جائے گی۔

(2) عریانیت کا مسئلہ: مساوات کے غلط تخیل نے عورتوں اور مردوں کے درمیان بد اخلاقی میں مساوات قائم کر دی ہے۔ وہ بے حیائیاں جو کبھی مردوں کے لیے بھی شرمناک تھیں' اب وہ عورتوں کے لیے شرمناک نہیں رہیں۔ عورت کو گھر سے باہر لانا' مرد اور عورت کا آزادانہ اختلاط اور عریانیت کی کثرت کا لازمی نتیجہ شہوانی جذبات کا اشتعال ہے۔ جدید مغرب میں شہوانی جذبات کا اشتعال لامحدود سطح پر پیدا ہوا۔ اس لامحدود اشتعال کی تسکین کے لیے نکاح کا طریقہ ناکافی تھا۔ چنانچہ رفتہ رفتہ آزاد جنسی تعلق کا ذہن پیدا ہونا شروع ہوا۔ ایک نیا لٹریچر بہت بڑے پیمانے پر پیدا ہوا جس میں مرد اور عورت کے درمیان آزادانہ جنسی تعلق کو اتنا ہی فطری اور بے ضرر قرار دیا گیا جتنا دو دوستوں کا آپس میں ہاتھ ملانا۔ نتیجتاً لوگ نکاح کو بوجھ سمجھ کر اس سے دور ہونے لگے۔ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں نے نکاح کے بغیر ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ مختصر یہ کہ عریانیت نے بداخلاقی اور بے راہ روی کی انتہا کر دی۔ عریانیت کوئی علیحدہ مسئلہ نہیں' یہ بے قید آزادی کا وہ لازمی نتیجہ ہے جس کو اس سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ عریانیت اب مغربی ملکوں میں انڈسٹری بن چکی ہے۔ صرف امریکہ میں اس کے تحت سالانہ آٹھ بلین ڈالر کا

کاروبار ہوتا ہے۔ ایک امریکی کمیشن (ٹائمز آف انڈیا' 11 جولائی 1986ء) نے امریکہ میں ہونے والے جنسی جرائم کا سبب عریانیت کو قرار دیا ہے اور اس پر پابندی لگانے کا مطالبہ کیا ہے۔

(3) کثرت طلاق کا مسئلہ: مغرب میں عورت کے معاشی استقلال کے بطن سے سب سے پہلے جو چیز پیدا ہوئی وہ طلاق کی کثرت ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984ء) نے بتایا ہے کہ دنیا کے صنعتی ملکوں میں طلاق کی شرح بہت بڑھ گئی ہے اور اس کی وجہ عورتوں کا معاشی استقلال ہے۔ (جلد III' صفحہ 586)

مغربی دنیا میں طلاقوں کی تعداد خطرناک حد تک زیادہ ہوگئی ہے۔ فرانس کے شہروں میں 50 فیصد شادیاں طلاق پر ختم ہوتی ہیں۔ کینیڈا میں ان کی تعداد تقریباً 40 فیصد ہے۔ اسی طرح امریکہ میں طلاق کی شرح 50 فیصد تک پائی گئی ہے۔ امریکہ کی دس خواتین میں سے چھ وہ ہیں جو طلاق کا تجربہ کر چکی ہیں۔

(Plain Truth, May 1987)

(4) کم سن مجرمین: ناجائز جنسی تعلق ابتدائی طور پر ایک سادہ سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جب ایک مرد اور ایک عورت کے تعلق سے ایک تیسرا بچہ پیدا ہوتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی سادہ فعل نہ تھا بلکہ اپنے بعد سنگین نتائج رکھتا تھا۔ مغربی ممالک کے نوجوان بالعموم منع حمل کی تدبیر پر عمل کرتے ہیں اس کے باوجود وہاں کثیر تعداد میں ناجائز بچے پیدا ہو رہے ہیں۔ برطانیہ میں پیدا ہونے والے ہر پانچ بچوں میں سے ایک بچہ وہ ہوتا ہے جو ناجائز جنسی تعلق کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر تین حمل میں سے ایک حمل غیر شادی شدہ جوڑوں کے ذریعہ قرار پا رہا ہے۔ (دی ٹائمز آف انڈیا' 17 مئی 1986ء' صفحہ 9)

انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984ء) کے مطابق بیسویں صدی عیسوی کے بوکھلا دینے والے سماجی روگوں میں سے ایک روگ وہ ہے جس کو کم سنی کا جرم کہا جاتا ہے۔ یہ ایک عالمی مظہر ہے اگرچہ کیفیت اور رفتار کے اعتبار سے ایک ملک اور دوسرے ملک میں فرق پایا جاتا ہے۔ مغربی ممالک میں کم سن مجرمین کے مسئلہ کا وسیع پیمانہ پر مطالعہ کیا گیا ہے اور بہت سے نتائج اخذ کیے گئے ہیں۔ ان میں سب سے خطرناک نتیجہ یہ ہے کہ کم سنی کا جرم اکثر وہ بچے کرتے ہوئے پائے گئے ہیں جو ماں باپ سے محرومی کی وجہ سے جھنجھلاہٹ اور منفی ذہنیت میں مبتلا تھے۔ "ٹائم" (19 اکتوبر 1987ء) کے مطابق امریکہ میں ہر سال تقریباً تین سو بچے اپنے باپ یا ماں کو قتل کر دیتے ہیں۔ (بحوالہ صفحہ 60 ٹائم 19 اکتوبر 1987ء)

(5) ناقابل علاج مرض ایڈز کا پھیلاؤ: ایڈز عصر حاضر کا ایک ناقابل علاج مرض ہے جو بے قید جنسی اختلاط کے نتیجہ میں پیدا ہوتا ہے بلکہ وہ متعدی بھی ہے۔ دوسرے لوگ ایسے شخص سے دور بھاگتے ہیں۔ مغرب میں فواحش اور عریانیت کے نتیجہ میں یہ مرض تیزی سے پھیلا ہے۔ مغربی عورتوں کا یہ انجام بے حد خطرناک اور عجیب ہے۔ وہ مساوی درجہ حاصل کرنے کی کوشش میں غیر مساوی درجہ تک پہنچ گئی ہیں اور آگے بڑھنے کی کوشش میں انسانی قافلہ سے پیچھے چلی گئیں۔

(6) میدان عمل سے محرومی: مرد ہو یا عورت ہر ایک اپنے عمل کے لحاظ سے قیمت پاتا ہے۔ عورت و مرد کے مساوی قرار دے کر جب گھر سے باہر لایا گیا تو اسکی قیمت اس میں تھی کہ وہ ان تمام شعبوں کو سنبھال لے جن کو مرد

روایتی طور پر سنبھالے ہوئے تھا۔ مگر حیاتیاتی اعتبار سے عورت کے اندر یہ صلاحیت نہیں۔ عورت جب مردانہ شعبوں کو سنبھال نہ سکی تو وہ ان شعبوں میں جمع ہونے لگی جن میں وہ اپنی نسوانیت کے اعتبار سے قیمت پا سکتی تھی نہ کہ تمدنی کارکردگی کے اعتبار سے۔ مثلاً فلم، ٹیلی ویژن، تفریحی مجلس، وہ اشتہاری صنعتیں جو عورت کی نسوانیت کو استعمال کرتی ہیں مگر یہاں عورت کی دوسری کمزوری اس کی راہ میں حائل ہوگئی۔ ان شعبوں میں جوان عورت کی قیمت تھی اور ہمیشہ جوان رہنا عورت کے لیے ممکن نہ تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عورت باہر نکل کر ایک قسم کی ادھوری شخصیت بن گئی۔ وہ صرف جوانی کے چند سالوں تک خود کو باقیمت ثابت کر سکی۔

مغربی تہذیب میں صرف ''جوان عورت'' کے لیے جگہ ہے۔ ''بوڑھی عورت'' کے لیے مغربی تہذیب میں کوئی جگہ نہیں۔ مغربی تہذیب میں ایک عورت اپنی نسوانی کشش کی بنیاد پر جگہ حاصل کرتی ہے۔ بڑھاپے میں یہ نسوانی کشش ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے مغربی عورت بوڑھی ہونے کے بعد اپنا مقام بھی کھو دیتی ہے۔

(7) مغربی شادیوں کا انجام: ایک امریکی میگزین ''نیوز ویک'' (مئی 1978ء) کے مطابق امریکہ میں تقریباً نصف نکاح طلاق پر ختم ہوتے ہیں، طلاق کے بعد دوبارہ نکاح ہوتے ہیں اور پھر دوبارہ طلاق۔ رونالڈ کیلی (Ronald D. Kelley) کے مطابق امریکہ میں اکثر عورتیں اور مرد شادی کے بعد بھی اپنے گھروں میں اجنبی کی طرح رہتے ہیں۔ ان میں بہت کم اشتراک ہوتا ہے۔ ان میں سے ہر ایک الگ الگ راستے پر چلتا ہے۔ ان میں صرف کبھی کبھی گفتگو ہوتی ہے وہ بھی زیادہ تر پیسہ، بچہ کی پرورش یا جنس کے بارے میں بحث کے طور پر۔ ان کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ آخر ابتداء میں وہ دونوں کس طرح اکٹھے ہوئے تھے۔''

(Plain Truth, June 1987)

مغربی دنیا کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہاں تہذیب جدید کے اثر سے ''شادی برائے لذت'' کا اصول رائج ہے۔ اسی لیے وہاں خاندانی زندگی منتشر ہو کر رہ گئی ہے، کہیں جنسی کشش کے زوال کی بنا پر اور کہیں گھریلو مسائل کی بنا پر۔

(8) آبادی کا مسئلہ: امریکی مصنف بن جے۔ وٹن برگ (Ben J. Vwttenberg) نے اپنی کتاب ''پیدائش کا قحط'' (The Birth Dearth) میں اعداد و شمار کی روشنی میں دکھایا ہے کہ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں شرح پیدائش میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اور تیسری دنیا کی شرح کا تو یہ حال ہے کہ اگلے پچاس سال میں اس کی آبادی مغربی دنیا سے دس گنا بڑھ جائے گی۔ اس کے نتیجہ میں اکیسویں صدی میں پہنچ کر امریکہ عالمی طاقتی حیثیت کھو دے گا۔ اسی طرح پوری مغربی دنیا عالمی سیاست میں دوسرے درجہ کی حیثیت حاصل کرلے گی۔ اس کا حل ایک ناقد کے الفاظ میں یہ ہے کہ مغربی عورتیں دوبارہ بچہ پیدا کرنے والی قدیم عورت کا انداز اختیار کر لیں۔

جدید تہذیب نے عورت کو جو مقام دیا تھا وہ زندگی کی حقیقتوں سے ٹکرا گیا۔ اب مغربی مفکرین کو نظر آ رہا ہے کہ اگر کامیاب زندگی حاصل کرنا ہے تو عورت کے قدیم تصور کو دوبارہ اختیار کرنا ہوگا۔

(9) سرپرستی سے محرومی: ترقی یافتہ ملکوں کے نوجوانوں میں خودکشی کے رجحان کی واحد وجہ ان کی اپنے سرپرستوں سے محروم ہے۔ہفت روزہ "ٹائم" (23 مارچ 1987ء) نے امریکہ کے بارے میں ایک رپورٹ شائع کی جس کا عنوان تھا "بچوں کی خودکشی"۔اس رپورٹ کے مطابق امریکہ میں 10 سال اور 20 سال کے درمیان کی عمر کے نوجوانوں میں خودکشی کے واقعات تیزی سے بڑھے ہیں۔ 1950ء کے مقابلہ میں یہ تعداد اب تین گنا زیادہ ہوگئی ہے۔ 1985ء میں ایک لاکھ آبادی پر ساٹھ نوجوانوں اور اتنے ہی بڑوں نے خودکشی کا ارتکاب کیا۔

ان ملکوں میں خاندانی انتشار کا مسئلہ بہت بڑے پیمانے پر پیدا ہوگیا ہے اور یہی چیز ہے جس نے نوجوانوں کے اندر خودکشی کا رجحان پیدا کردیا ہے۔ وہ خاندان کی شفقت سے محروم ہوکر پرورش پاتے ہیں' اور بڑے ہوکر طرح طرح کی نفسیاتی پیچیدگیوں میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ چیز بعض اوقات انہیں خودکشی تک پہنچادیتی ہے۔

ان ملکوں میں خاندانی انتشار پیدا ہونے کے بڑے اسباب دو ہی ہیں: اول یہ کہ انہوں نے ازدواجی زندگی کی بنیاد ذمہ داری کے بجائے لذت پر قائم کی۔ نتیجتاً لوگ لذت کے واسطے ایک دوسرے سے ملنے اور لذت ختم ہونے پر ایک دوسرے سے الگ ہونے لگے' اس طرح طلاق عام ہوگئی۔ اور طلاق کے بعد بچے کا کوئی سرپرست نہ رہا' عورت کسی طرف چلی گئی اور مرد کسی طرف۔ دوسری وجہ ان ملکوں میں مشترک زندگی کا خاتمہ ہے۔ انہوں نے جو طرز حیات اختیار کیا اس کے نتیجے میں بوڑھے ماں باپ دارالضعفاء میں بھیجے جانے لگے۔ مشترک خاندان میں دادا اور دادی' نانا اور نانی بچوں کو سنبھالنے کے لیے موجود ہوتے ہیں' مگر مغرب کی معاشرت میں ان لوگوں کا مقام گھر نہیں بلکہ وہ ضعیف خانے ہیں جو خاص طور پر اسی مقصد کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ یہی معاملہ ایک اور صورت میں والدین کے ساتھ ہوا ہے۔ وہاں کے نظام کے مطابق مرد اگر کام کرتا ہے تو عورت بھی کام کرتی ہے اور دونوں بیشتر اوقات گھر سے باہر رہتے ہیں۔ اپنے بچوں سے ان کی ملاقات بمشکل صرف "اتوار" کے دن ہوتی ہے۔ گویا مغرب کا بچہ اپنے دادا دادی اور نانا نانی سے بھی محروم ہے اور ماں باپ سے بھی۔

(10) فطرت سے جنگ: مساوات مرد وزن کے خوش نما مغربی تخیل کو وجود میں لانے کے لیے خاندان اور معاشرت کا سارا ڈھانچہ الٹ پلٹ کردیا گیا۔ لیکن بالآخر جو چیز حاصل ہوئی وہ یہ کہ عورت گھر سے باہر تو آگئی مگر عملی زندگی میں وہ مرد کی ہم سر نہ ہوسکی۔ اس کا واحد سبب یہ تھا کہ یہاں فطرت نے انسانی تخیل کا ساتھ نہیں دیا۔

روسی سائنس دان انٹون نسلوف (Anton Nemilor) اپنی کتاب "عورت کا حیاتیاتی المیہ" میں لکھتا ہے:

> "آج کل اگر یہ کہا جائے کہ عورت کو نظامِ تمدن میں محدود حقوق دیئے جائیں تو کم سے کم آدمی اس کی تائید کریں گے۔ ہم خود اس تجویز کے سخت مخالف ہیں مگر ہمیں اپنے نفس کو یہ دھوکہ نہ دینا چاہیے کہ مساوات مرد وزن کو عملی زندگی میں قائم کرنا کوئی سادہ اور آسان کام ہے۔ دنیا میں کہیں بھی عورت اور مرد کو برابر کردینے کی اتنی کوشش نہیں کی گئی' جتنی سوویت روس میں کی گئی ہے۔ کسی

جگہ اس باب میں اس قدر غیر متعصبانہ اور فیاضانہ قوانین نہیں بنائے گئے۔ مگر اس کے باوجود واقعہ یہ ہے کہ عورت کی پوزیشن خاندان میں بہت کم بدل سکی ہے۔“

(The Biological Tragedy of Woman, London, 1932, P.76)

عورت کو مساوات کا درجہ نہ ملنا کوئی وقتی اور عملی خرابی نہیں بلکہ اس کی وجہ حیاتیات تک جاتی ہے۔ چنانچہ انٹون نملونے لکھتا ہے:

”اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں انقلابی اصول ایک نہایت اہم صورت واقعی سے ٹکراتا ہے۔ یعنی اس حقیقت سے کہ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے دونوں صنفوں کے درمیان مساوات نہیں ہے اور دونوں پر یکساں بار نہیں ڈالا گیا ہے۔“

(The Biological Tragedy of Woman P.77)

جدید انسان نے عورت اور مرد کے قدیم تصور کو دقیانوسی قرار دیا۔ اور عورت اور مرد کے درمیان صنفی مساوات قائم کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ فطرت (Nature) سے جنگ کرنا تھا۔ یہ حقیقت واقعہ سے ٹکرانا تھا' اس کا نتیجہ الٹا ہوا۔ اس کے نتیجہ میں دونوں صنفوں کے درمیان مساوات کا مقصد تو حاصل نہیں ہوا البتہ اس مصنوعی کوشش کا یہ نقصان ہوا کہ معاشرہ کے اندر نئی نئی برائیاں پیدا ہو گئیں۔

مسلم سماج کا بگاڑ اور مغربی سماج کا بگاڑ .... حل کیا ہے؟

یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی سماج میں اگر بگاڑ ہے تو مسلمانوں کے موجودہ سماج میں بھی بگاڑ ہے۔ تاہم دونوں کے درمیان ایک فرق واضح ہے۔ مولانا وحید الدین خان لکھتے ہیں:

”مسلم سماج کا بگاڑ اسلام سے انحراف کا نتیجہ ہے جبکہ مغربی سماج کا بگاڑ عین اس کے اصولوں پر عمل کرنے کا نتیجہ ہے۔ ..... مسلمانوں کے درمیان جو بگاڑ ہے وہ اصول اور عمل کے درمیان فرق ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ جب کہ مغربی سماج کا بگاڑ اصول اور حقیقت کے واقعہ کے درمیان ٹکراؤ کا نتیجہ ہے۔ جدید مغربی تہذیب نے معاشرتی زندگی کے بارے میں مذہبی اصولوں کے بالمقابل کچھ دوسرے اصول وضع کیے۔ اور قدیم اصول کے مقابلہ میں جدید اصول کی معقولیت کا دعویٰ کیا۔ اس کے بعد ایسے حالات پیدا ہوئے کہ زمین کے قابل لحاظ حصہ پر مغربی اقوام کا سیاسی اور مادی غلبہ قائم ہو گیا۔ انہیں یہ حیثیت حاصل ہو گئی کہ وہ قدیم اصول حیات کو رد کر کے جدید اصول حیات کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کی تشکیل کریں۔ ...... مغربی اقوام کے غلبہ کے ساتھ ہی یہ عمل شروع ہو گیا۔ اب اس تجربہ پر 100 سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے۔ مگر عملی تجربہ اصول کی صداقت کو ثابت نہ کر سکا۔ اس تجربہ نے صرف یہ بتایا کہ مغرب نے انسانی زندگی کے جو نئے اصول وضع کیے تھے وہ فطرت سے مطابقت نہ رکھتے تھے۔ اصول اور حقیقت واقعہ کا یہ ٹکراؤ بہت جلد ظاہر ہو گیا۔ مغربی زندگی میں شدید قسم کی ابتری پیدا ہو گئی جس میں دن بدن اضافہ

ہوتا جارہا ہے.......... مسلم سماج میں آج جو بگاڑ پایا جاتا ہے اس کا حل یہ ہے کہ مسلم سماج کو سابقہ اسلامی اصولوں کی طرف لوٹایا جائے۔ مگر یہی بات مغرب کے بارے میں نہیں کہی جاسکتی۔ مغرب کا سماج اگر پیچھے کی طرف لوٹایا جائے تو اس کا لوٹنا عین انہیں اصولوں کی طرف لوٹنا ہوگا جن پر آج بھی وہ پوری طرح قائم ہے۔ جن لوگوں نے آزادانہ جنسی اختلاط کا نظریہ پیش کیا یا جنہوں نے عورت کو ہر مردانہ شعبہ میں داخل کرنے پر اصرار کیا یا جنہوں نے یہ کہا کہ نکاح کا ارادہ ایک غیر ضروری بندھن ہے۔ وہ آخر اپنے اصولوں کی طرف لوٹیں تو کس چیز کی طرف لوٹیں گے' وہ اسی چیز کی طرف لوٹیں گے جس پر آج بھی وہ قائم ہیں اور جس کے ہولناک نتائج سے وہ بالفعل دوچار ہورہے ہیں۔ مسلمانوں کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اسلام کے چھوڑے ہوئے اصول کو دوبارہ اختیار کریں۔ جب کہ مغربی معاشرہ کے بگاڑ کا حل یہ ہے کہ وہ اپنے اختیار کردہ اصولوں کو ترک کردے۔" (خاتون اسلام۔ مولانا وحید الدین خان' صفحہ 97,96)

جنسی تفریق کا جدید مغربی تصور اور تعلیمات اسلام:

مرد اور عورت کی باہمی حیثیت قرآن مجید کی اس آیت سے واضح ہو جاتی ہے:

"انی لا اضیع عمل عامل منکم من ذکر او انثی بعضکم من بعض "(آل عمران:195)

اس آیت میں عورت اور مرد کے لیے بعضکم من بعض کا لفظ آیا ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم آپس میں ایک دوسرے کا جزو ہو۔

یہ مرد اور عورت کی حیثیت کے بارے میں نہایت جامع بیان ہے۔ اس بات کو اگر لفظ بدل کر کہنا ہو تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ مرد اور عورت ایک دوسرے کے ساتھ شریک حیات ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کا حصہ ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے برابر کے ساتھی ہیں۔ حیاتیاتی اعتبار سے اگرچہ دونوں کی صنف ایک دوسرے سے مختلف ہے' ایک صنف مذکر ہے' اور دوسری صنف مؤنث۔ مگر انسانی مرتبہ کے لحاظ سے دونوں بالکل یکساں ہیں جو درجہ ایک کا ہے وہی درجہ دوسرے کا ہے۔ حقوق کے اعتبار سے دونوں کے درمیان کسی قسم کا کوئی امتیاز نہیں۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عورتیں مردوں کا شقیقہ ہیں۔ (انما النساء شقائق الرجال)۔ شق یشق کے اصل معنی ہیں پھاڑنا۔ ایک لکڑی کو درمیان سے پھاڑا جائے تو وہ دو برابر حصے میں تقسیم ہو جائیگی۔ اس اعتبار سے شقیق کے معنی ہوئے دو حصوں میں پھٹی ہوئی چیز کا آدھا حصہ۔ چنانچہ کسی چیز کے نصف کو شق الشئی کہتے ہیں۔ اسی سے مزید وسعت پا کر شقیق بمعنی بھائی اور شقیقہ بمعنی بہن بولا جانے لگا۔

اس تشریح کے مطابق مذکورہ حدیث کا صحیح ترجمہ یہ ہوگا کہ عورتیں مردوں کا نصف ثانی ہیں یا عورتیں مردوں کا دوسرا نصف ہیں۔ جدید تہذیب میں عورت کو نصف بہتر (Better Half) کہا گیا ہے۔ مگر یہ ایک ادبی تعبیر ہے نہ کہ سائنسی تعبیر۔ حدیث کے مطابق' عورت مرد کا نصف ثانی (Second Half) ہے' اور یہ

یقیناً زیادہ صحیح اور سائنسی تعبیر ہے۔ اسی ایک لفظ سے عورت کے بارے میں اسلام کے پورے نقطۂ نظر کو سمجھا جاسکتا ہے۔

تقسیم کار کا اصول:

اسلام نے سماجی زندگی میں دونوں صنفوں کے عمل کے درمیان ایک حد تک تقسیم کار کا اصول اختیار کیا ہے۔ مرد کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر باہر ہے اور عورت کی سرگرمیوں کا دائرہ بنیادی طور پر اندر۔ اس تقسیم کا کوئی بھی تعلق امتیاز سے نہیں ہے۔ اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ دونوں کی صنفی خصوصیات مجروح نہ ہوں۔ دونوں اپنی پیدائشی صلاحیتوں کو پوری طرح کام میں لاسکیں' بغیر اسکے کہ خاندان یا سماج کے اندر کوئی رخنہ واقع ہو۔ بالفاظ دیگر' یہ فرق انتظام کی بنیاد پر ہے' نہ کہ اعزاز کی بنیاد پر۔

اللہ تعالیٰ کے یہاں مغفرت کے لیے جو چیزیں درکار ہیں وہ عورتوں کے لیے بھی وہی ہیں جو مردوں کے لیے ہیں۔ آخرت کی نجات کا مستحق بننے کے لیے عورتوں کو بھی وہی کرنا ہے جو مردوں کو کرنا ہے۔ دنیا میں زندگی کا انتظام چلانے کے لیے عورت اور مرد کے اندر حیاتیاتی فرق رکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے بعض امور میں دونوں کے حدود کار ایک دوسرے سے مختلف ہو جاتے ہیں۔ تاہم خدا کی رضا اور آخرت کی نجات حاصل کرنے کے لیے جو بنیادی شرط درکار ہے وہ ایک صنف کے لیے بھی وہی ہے جو دوسری صنف کے لیے ہے۔ قرآن حکیم میں ہے:

> ''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں اور فرماں بردار مرد اور فرماں بردار عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں اور عاجزی کرنے والے مرد اور عاجزی کرنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں۔ اور اللہ کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں۔ ان سب کے لیے اللہ نے بخشش اور بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔'' (الاحزاب:35)

اسلام اور جدید تحقیقات:

موجودہ زمانہ میں خالص علمی طور پر یہ بات تسلیم کر لی گئی ہے کہ مرد اور عورت کے درمیان بنیادی پیدائشی فرق پائے جاتے ہیں۔

(انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا (1984ء) مقالہ بعنوان ''مرد اور عورت کے فرق کا علمی مطالعہ)

ماہرین کے مطابق عورت اور مرد کے تمام فرق ان کے جین کے اندر پائے جاتے ہیں نہ کہ سماجی حالات میں۔ عورتوں کے اندر انفعالیت کا سبب ان کے مخصوص ہارمون ہیں۔ میل ہارمون اور فیمیل ہارمون میں یہ فرق پیدائش کے بالکل آغاز [illegible] ہو رہتا ہے۔ (ٹائم میگزین نیویارک 20 مارچ 1992ء)

اسلام دین فطرت ہے اس لیے تمام احکام فطری حقیقتوں پر مبنی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ فطری تقاضوں کو

قانونی صورت دینے ہی کا دوسرا نام شریعت ہے۔ عورت کے بارے میں اسلام کی تعلیمات بھی اسی بنیادی اصول پر مبنی ہیں۔ نفسیات اور حیاتیات اور عضویات میں موجودہ زمانہ میں جو تحقیقات ہوئی ہیں وہ ثابت کرتی ہیں کہ مرد کے مقابلہ میں عورتیں فطری طور پر منفعل مزاج ہوتی ہیں۔ مخصوص معاشرتی مصالح کی بنا پر خالق نے ان کو نسبتاً نازک پیدا کیا ہے۔

یہی وہ فطری حقیقت ہے جس کی رعایت اسلامی تعلیمات میں رکھی گئی ہے۔ اس بنا پر اسلامی شریعت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرو تا کہ وہ بے حوصلہ نہ ہوں' تا کہ وہ دل شکنی سے محفوظ رہیں اور زندگی میں اپنے مخصوص فرائض کو بخوبی طور پر ادا کر سکیں۔ عورتیں لوہے کی مانند نہیں ہیں کہ ان پر ٹھونک پیٹ کا کوئی اثر نہ پڑے وہ پسلی کی مانند ہیں۔ وہ فطرتاً جیسی ہیں ویسی ہی انہیں رہنے دو اگر تم ان کے ساتھ لوہے جیسا برتاؤ کرو گے تو تم ان کی شخصیت کو توڑ دو گے۔

عورت کا درجہ اسلام میں:

عورت کا درجہ اسلام میں وہی ہے جو مرد کا ہے۔ حیثیت اور حقوق اور آخرت کے انعامات میں دونوں کے درمیان کوئی فرق نہیں۔ البتہ اسلام کے نزدیک مرد' مرد ہے اور عورت' عورت۔ زندگی کا نظام چلانے میں دونوں برابر کے شریک ہیں۔ مگر اسلام نے دونوں کے درمیان تقسیم کار کا اصول رکھا ہے نہ کہ یکسانیت کار کا اصول۔

اسلام اس کو پسند نہیں کرتا کہ دونوں میں سے کوئی صنف اپنے کو کم سمجھے اور ایک دوسرے کی نقل کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے مردوں پر لعنت کی ہے جو عورتوں کے مشابہ بنیں' اور ایسی عورتوں پر لعنت کی ہے جو مردوں کے مشابہ بنیں۔"

انسانیت کو مرد اور عورت کی صنفی تقسیم کے ساتھ پیدا کرنا براہ راست خالق کی منصوبہ بندی ہے۔ اس تقسیم کو باقی رکھنے ہی میں انسانی زندگی کی ترقی ہے۔ جو مرد یا عورت اس تقسیم کو توڑنے کی کوشش کرے وہ گویا نظامِ فطرت کو توڑتا ہے۔ نظامِ فطرت کو توڑنا صرف تخریب ہے' وہ کسی وجہ میں بھی تعمیر کا کام نہیں۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت ایک دوسرے کا مثنیٰ (Duplicates) نہیں ہیں' بلکہ وہ ایک دوسرے کا تکملہ (Complements) ہیں۔ یعنی ایسا نہیں کہ جو مرد ہے وہی عورت ہے اور جو عورت ہے وہی مرد ہے بلکہ دونوں میں ناقابل عبور قسم کے حیاتیاتی فرق پائے جاتے ہیں۔ یہ فرق تقسیم کار کی حکمت پر مبنی ہیں۔ وہ اس اعتبار سے ہیں کہ مرد کی کمی کی تلافی عورت کرے اور عورت کے اندر جو کمی ہے وہ مرد کے ذریعہ پوری ہو۔

مرد اور عورت کے بارے میں اسلام کا تصور دونوں صنفوں کی فطری ساخت میں ثابت شدہ فرق پر مبنی ہے۔ یہ ایک حیاتیاتی حقیقت ہے کہ مرد اور عورت کی ساخت میں فرق ہے۔ مرد اپنی پیدائشی ساخت کے اعتبار سے "باہر" کے کام کے لیے موزوں ہے۔ اور عورت اپنی پیدائشی ساخت کے اعتبار سے "اندر" کے کام کے لیے موزوں ہے۔ اسی فرق اور تقسیم پر اسلام کے تمام قوانین بنائے گئے ہیں۔ مرد اور عورت کے معاشرتی مقام

کے بارہ میں اسلام کی تعلیمات تقسیمِ عمل کے اصول پر مبنی ہیں نہ کہ اشتراکِ عمل کے اصول پر۔

(خاتونِ اسلام۔ مولانا وحید الدین خان' صفحہ 167-168)

حضرت نسیبہ رضی اللہ عنھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آئیں۔ انہوں نے کہا کہ اے خدا کے رسول! مرد اجر میں بڑھ گئے۔ وہ جمعہ میں اور اجتماعات میں اور جہاد میں شریک ہوتے ہیں۔ پھر ہم عورتوں کے لیے کیا باقی رہا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے نسیبہ رضی اللہ عنھا تم میں سے ایک عورت اپنے شوہر کے ساتھ بہتر طریقے سے رہے اور اس کی مرضی کو پورا کرے۔ یہ ان تمام اعمال کے برابر ہے جن کا تم نے مردوں کے سلسلہ میں ذکر کیا۔

موجودہ زمانہ کا یہ ذہنی بگاڑ ہے کہ گھر سنبھالنے کو کم تر درجہ کا کام سمجھا جاتا ہے اور باہر کے کام کو زیادہ بڑا کام سمجھ لیا گیا ہے۔ مگر اسلام گھر سنبھالنے کے کام کو بھی اتنا ہی عزت کا درجہ دیتا ہے جتنا باہر کے کام کو۔ حقیقت یہ ہے کہ دونوں یکساں اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے کسی فریق کو یہ حق نہیں کہ وہ احساس برتری میں مبتلا ہو اور نہ کسی فریق کو یہ چاہیے کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو کر اپنی اہمیت خود اپنی نظر میں گھٹا لے۔

(خاتون اسلام صفحہ 170، 171)

طلاق کا مسئلہ اور اسلام:

ایک حدیث کے مطابق میاں اور بیوی کے درمیان اختلاف ڈالنا اور طلاق تک نوبت پہنچا دینا ابلیس کا کام ہے۔ شیطانوں کا سردار اس شیطان سے خوش ہوتا ہے جو میاں بیوی میں طلاق ڈلواتا ہے۔" (مسلم)

یہ حدیث بتاتی ہے کہ انسانی معاشرہ میں بگاڑ پیدا کرنے کے لیے شیطان کا سب سے بڑا ہتھیار یہ ہے کہ وہ مرد اور عورت کے درمیان جھگڑے پیدا کرے اور دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر دے۔

قدیم زمانہ میں یہ فتنہ بہت محدود پیمانہ پر پیدا ہوتا تھا۔ یعنی ایک میاں بیوی یا ایک گھر اس فتنہ کا شکار ہوتا تھا۔ مگر موجودہ زمانے میں نئے نئے نظریات نے پوری نسل اور پوری انسانیت کو اس فتنہ کا شکار بنا دیا ہے۔ موجودہ زمانہ میں عورتوں کی مصنوعی آزادی اور غیر فطری مساوات کا ذہن اتنے بڑے پیمانے پر بنایا گیا ہے کہ قومیں کی قومیں اس سے متاثر ہو کر رہ گئی ہیں۔

اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں شادی شدہ زندگی کو برا سمجھا جاتا ہے۔ جدید ترقی یافتہ سماج میں مردوں اور عورتوں کا یہ حال ہے کہ وہ معمولی معمولی بات پر طلاق لے لیتے ہیں۔ اس کی وجہ سے گھر اجڑتے ہیں۔ بچے اپنے ماں باپ سے چھوٹ کر مجرمین کے گروہ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ جنسی بے قیدی کی بنا پر طرح طرح کی مہلک بیماریاں پیدا ہو رہی ہیں۔ خاندانی بندھن کا پابند نہ ہونے کا مزاج موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر پیدا ہوا ہے اور وہ بلاشبہ موجودہ زمانہ کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔

گھر بگڑنے سے پورا معاشرہ بگڑتا ہے اور معاشرہ بگڑنے سے پوری قوم بگڑ جاتی ہے۔ یہ موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہا ہے۔ اور اس کی واحد وجہ یہ ہے کہ موجودہ زمانہ میں ازدواجی زندگی کا احترام ختم ہو گیا۔ خاندانی بندھن کے ساتھ زندگی گزارنے کو کمتر درجہ کی چیز سمجھا جانے لگا۔

عورت کی گواہی:

اسلام کے قانون شہادت میں دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے برابر مانی گئی ہے۔ قرآن میں قرض کے معاملہ کا قاعدہ بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ "اپنے مردوں میں سے دو مرد گواہ بنالو اور اگر دو مرد گواہ نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بنائی جائیں' ایسے گواہوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو تا کہ ان دونوں عورتوں میں سے ایک اگر بھول جائے تو دوسری عورت اس کو یاد دلا دے۔" (البقرۃ:282)

حالیہ تحقیق نے ثابت کیا ہے کہ قرآن کا یہ قانون بالکل فطری ہے کیونکہ وہ حیاتیاتی حقیقت کے عین مطابق ہے۔ ٹائمز آف انڈیا (18 جنوری 1985ء) صفحہ نمبر 9 پر تحریر ہے کہ "عورتوں کے مقابلہ میں مردوں میں اس بات کی زیادہ صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ ریاضیاتی معلومات کو یاد رکھیں اور اس کو ترکیب دے سکیں۔ مگر عورتیں الفاظ میں زیادہ بہتر ہوتی ہیں۔

مذکورہ آیت قرآنی کا تعلق قرض سے ہے یعنی وہ صورت جب کہ آج معاملہ کیا جائے اور آئندہ اس کی ادائیگی ہو۔ ایسے معاملہ میں حکم دیا گیا کہ اس کے اوپر دو مرد گواہ ہو یا ایک مرد اور دو عورتیں گواہ مقرر کی جائیں۔ یہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح کے معاملہ میں انصاف پسندی کے بعد دوسری چیز یادداشت (Memory) ہے اور جب حیاتیاتی طور پر عورت کی یادداشت مرد سے کم ہو تو یہ عین مطابق حقیقت ہے کہ ایک مرد کی جگہ دو عورتیں گواہ بنائی جائیں۔ گویا عورت اور مرد میں گواہی کا فرق بر بنائے ضرورت ہے نہ کہ بر بنائے فضیلت۔

اضافی خصوصیت نہ کہ فضیلت:

قرآن حکیم میں ہے:

"مرد عورتوں کے اوپر قوام ہیں اس وجہ سے کہ اللہ نے ایک کو ایک پر فضیلت دی۔" (النساء:34)

یہاں فضیلت سے مراد خصوصیت ہے۔ گھر کے نظام کو درست طور پر چلانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک سربراہ اور نگران ہو۔ یہ سربراہی یا نگرانی اسی کو سونپی جائے گی جو نسبتاً اس کا زیادہ اہل ہو' یہ اہلیت قدرتی تخلیق کے اعتبار سے مرد کے اندر زیادہ ہے۔ اس آیت میں کلی فضیلت یا برتری کا ذکر نہیں ہے۔ صرف اس فضیلت کا ذکر ہے جو مرد کے لیے یہ استحقاق ثابت کرتی ہے کہ اس کو گھر کا قوام بنایا جائے۔

مولانا محمد تقی عثمانی لکھتے ہیں: "مرد اور عورت کے درمیان اگر تقابل کر کے دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ جسمانی قوت جتنی مرد میں ہے' اتنی عورت میں نہیں اور کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے مرد میں عورت کی نسبت جسمانی قوت زیادہ رکھی ہے اور گھر کے باہر کے کام قوت اور محنت کا تقاضا کرتے ہیں۔ لہٰذا اس فطری تخلیق کا بھی یہی تقاضا ہے کہ گھر کے باہر کا کام مرد انجام دے اور گھر کے اندر کے کام عورت کی سپرد ہوں۔

(ماہنامہ "الاحرار" فروری 2008ء مضمون "آزادئ نسواں کا فریب" صفحہ 20)

مولانا وحید الدین خان اس ضمن میں لکھتے ہیں کہ "یہ صحیح ہے کہ جسمانی اعتبار سے عورت کے اندر بعض

کمزوریاں ہیں۔ مگر جسمانی کمزوری کا مطلب غیر افضل ہونا نہیں۔ آنکھ ہمارے جسم کا نہایت کمزور حصہ ہے' اس کے مقابلہ میں ناخن زیادہ طاقت ور ہے' مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ناخن افضل ہے اور آنکھ غیر افضل''

(خاتون اسلام صفحہ 177)

عورت کے مقابلہ میں مرد کی حیثیت:

انتظامی تقسیم کے علاوہ درجہ کے اعتبار سے عورت اور مرد دونوں بالکل یکساں حیثیت رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ایک عورت اگر ایک مرد کو قتل کرے تو جرم ثابت ہونے کے بعد عورت سے قصاص لیا جائے گا۔ اسی طرح ایک مرد اگر ایک عورت کو قتل کر دے تو جرم ثابت ہونے پر مرد سے اس کا قصاص لیا جائے گا۔ شریعت کی نظر میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی قانونی تفریق نہیں۔ جو قانون مرد کے لیے ہے وہی قانون عورت کے لیے بھی ہے۔ جو چیز ایک کے لیے ہے وہی دوسرے کے لیے ہے' جو چیز ایک کے لیے نہیں وہ دوسرے کے لیے بھی نہیں۔ عورت اپنی ذات میں ایک کمزور جنس ہے مگر وہ طاقت ور جنس کی طاقت ہے۔ عورت کی اسی حیثیت میں اس کی طاقت کا راز چھپا ہوا ہے۔

عورت کے بارے میں ''گورباچوف'' کا نظریہ:

سوویت یونین کے آخری صدر میخائل گورباچوف نے اپنی کتاب ''پروسٹرائیکا'' میں عورتوں کے بارے میں "Status of Women" کے عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے۔ اس میں اس نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ:

> ''ہماری مغرب کی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا اور اس کو گھر سے باہر نکالنے کے نتیجے میں بے شک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کیے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا' اس لیے کہ مرد بھی کام کر رہے ہیں اور عورتیں بھی کام کر رہی ہیں۔ لیکن پیداوار کے زیادہ ہونے کے باوجود اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا اور اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجے میں ہمیں جو نقصان اٹھانے پڑے ہیں وہ ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پیداوار کے اضافے کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئے۔ لہٰذا میں اپنے ملک میں ''پروسٹرائیکا'' کے نام سے ایک تحریک شروع کر رہا ہوں۔ اس میں میرا ایک بڑا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جو گھر سے باہر نکل چکی ہے اس کو واپس گھر میں کیسے لایا جائے؟ اس کے طریقے سوچنے پڑیں گے ورنہ جس طرح ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو چکا ہے اسی طرح ہماری پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔'' (ماہنامہ ''الاحرار'' فروری 2008ء صفحہ 21)

☆ ☆............☆☆............☆☆

معروضی سوالات

سوال: درجات معیشت میں تفاوت سے متعلقہ دو آیات درج کریں!

جواب: 1-نحن قسمنا بینھم معیشتھم فی الحیوۃ الدنیا ورفعنا بعضھم فوق بعض درجت لیتخذ بعضھم بعضاً سخریا

2-واللّٰہ یرزق من یشاء بغیر حساب

سوال: آیت مکمل کریں: انما الخمر.........تفلحون

جواب: انما الخمر و المیسر و الانصاب و الازلام رجس من عمل الشیطن فاجتنبوہ لعلکم تفلحون

سوال: حق معیشت میں مساوات پر ایک آیت درج کریں!

جواب: وفی السماء رزقکم وما توعدون (الذّٰریٰت)

سوال: اسراف کی ممانعت میں ایک آیت درج کریں!

جواب: کلوا واشربوا ولا تسرفوا

سوال: تقویٰ پر ایک آیت درج کریں!

جواب: ومن یتق اللہ یجعل لہٗ مخرجًا o ویرزقہ من حیث لا یحتسب

سوال: عدل واحسان پر ایک آیت درج کریں!

جواب: ان اللّٰہ یامر بالعدل و الاحسان (النحل)

سوال: احسان کی ترغیب پر ایک آیت درج کریں!

جواب: و احسن کمآ احسن اللّٰہ الیک (القصص)

سوال: ایثار پر ایک آیت درج کریں!

جواب: ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ (الحشر)

سوال: اخوت پر ایک آیت درج کریں!

جواب: انما المومنون اخوۃ (الحجرات)

سوال: تعاون پر ایک آیت درج کریں!

جواب: وتعاونوا علی البروا لتقویٰ (المائدہ)

سوال: توکل پر ایک آیت درج کریں؟

جواب: وعلی اللہ فلیتوکل المومنون (المائدہ)

سوال: صبر کی فضیلت میں ایک آیت درج کریں!

جواب: انما یوفی الصٰبرون اجرھم بغیر حساب (الزمر)

سوال: قناعت پر ایک آیت درج کریں!

جواب: و لا تتمنوا ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض (النساء)

سوال: معاشیات پر مولانا مودودی کی دو کتب کے نام درج کریں!

جواب: 1-اسلام کا اقتصادی نظام 2-اسلام اور جدید معاشی نظریات

سوال: طلب کسب حلال پر ایک حدیث درج کریں!

جواب: طلب کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ

سوال: زکوٰۃ اور ٹیکس میں کیا فرق ہے؟

جواب: 1-زکوٰۃ ایک عبادت ہے، جبکہ ٹیکس حکومت نافذ کرتی ہے۔ 2-زکوٰۃ صرف مسلمانوں پر فرض ہے، جبکہ ٹیکس مسلم و غیر مسلم دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ 3-زکوٰۃ ہر صاحب نصاب پر فرض ہے جو ساقط نہیں ہوتا جبکہ ٹیکس کو حکومت معاف بھی کر سکتی ہے۔ 4-زکوٰۃ کی شرح متعین ہے جبکہ ٹیکس کی شرح بدلتی رہتی ہے۔

سوال: "اُجرت" سے کیا مراد ہے؟

جواب: اجرت زر کی ایک وہ مقدار ہے جو معاہدہ کے تحت آجر، مزدور کو اس کی خدمات کے عوض عطا کرتا ہے۔

سوال: گردش دولت کے بارے میں ایک آیت درج کریں!

جواب: کی لا یکون دولۃ بین الاغنیاء منکم (الحشر)

سوال: نقدی پر زکوٰۃ کی شرح کیا ہے؟

جواب: اڑھائی فیصد

سوال: نقد دولت کا نصاب کیا ہے؟

جواب: نقد دولت کا نصاب ساڑھے سات تولہ سونے یا ساڑھے باون تولہ چاندی کی مالیت کے برابر ہے۔

سوال: محنت کی عظمت پر ایک حدیث درج کریں!

جواب: الکاسب حبیب اللہ

سوال: محنت کی اہمیت پر ایک آیت درج کریں!

جواب: وان لیس اللانسان الا ما سعیٰ

سوال: "سوشلزم اور معاشی ترقی" کس کی تصنیف ہے؟

جواب: حسین خاں

سوال: "اسلام اور سُود" کس کی تالیف ہے؟

جواب: انور اقبال

سوال: "اسلامی معیشت" کس کی تالیف ہے؟

جواب: مناظر احسن گیلانی

سوال: قناعت کی فضیلت پر دو احادیث درج کریں!

جواب: نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

1- "فلاح پا گیا وہ شخص جو اسلام لایا اور اس کو بقدر کفایت روزی دی گئی اور اللہ تعالیٰ نے اس کو قناعت عطا کی۔"

2- "دولتمندی مال و اسباب کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل دولتمندی دل کی بے نیازی ہے۔"

سوال: شرف انسانیت کے بارے میں دو آیات مع ترجمہ لکھیں؟

جواب: (1) لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم۔

ہم نے انسان کو بہتر صورت میں پیدا فرمایا۔

(2) ولقد کرمنا بنی آدم۔

ہم نے بنی آدم کو فضیلت دی

سوال: حاکمیت الٰہیہ کے بارے میں دو قرآنی آیات مع ترجمہ لکھیں؟

جواب: (1) ان الحکم الا للہ۔

حکم صرف اللہ ہی کیلئے ہے۔"

(2) تبٰرک الذی بیدہ الملک، وھو علی کل شیء قدیر۔

برکت والی ہے وہ ذات کہ جس کے ہاتھ میں بادشاہی ہے۔ اور وہ ہر چیز پر قادر ہے

سوال انسانی معاشرہ کے بنیادی ادارے کون کون سے ہیں؟

جواب: اسلام میں بنیادی ادارے یہ ہیں (1) خاندان (2) مسجد (3) مدرسہ

سوال: مسجد نبویؐ نہ صرف دینی بلکہ معاشرتی ادارہ بھی تھی مثال سے واضح کیجئے؟

جواب: مسجد ایک معاشرتی ادارہ: رسول اللہ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ مسجد نہ صرف دینی ادارہ بلکہ ایک معاشرتی اور سیاسی ادارہ (مرکز) کی بھی حیثیت رکھتی تھی۔ تمام اہم اور ضروری قومی مسائل کا تصفیہ مسجد نبوی میں ہی کیا جاتا تھا۔ جب باہر سے وفود آتے تھے تو انہیں مسجد میں اتارا جاتا تھا۔

سوال: جہاد اور جنگ میں کیا فرق ہے؟

جواب: (1) جہاد صرف احکام الٰہی کے نفاذ کیلئے ہوتا ہے جبکہ جنگ دنیاوی اغراض و مقاصد پورا کرنے کے لئے لڑی جاتی ہے۔

(2) جہاد میں احکام الٰہی کو پیش نظر رکھا جاتا ہے۔ جبکہ جنگ میں اخلاقی قوانین کی پابندی نہیں کی جاتی۔

سوال: مصنف کا نام تحریر کریں؟ احیاء العلوم الدین' حجۃ اللہ البالغہ

جواب: احیاء العلوم الدین: امام غزالی

حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہؒ

سوال: جہاد کے لغوی اور اصطلاحی معنی کیا ہیں؟

جواب: جہاد جہد سے نکلا ہے اور اس کے لغوی معنی سعی اور کوشش کرنے کے ہیں اصطلاحی اعتبار سے جہاد سے مراد اللہ کے راستے میں جان' مال اولاد اور وقت کی قربانی دینا اور اعلاء کلمۃ اللہ کی سربلندی کیلئے اللہ کی راہ میں لڑنا جہاد کہلاتا ہے اور جس کا مقصد صرف رضائے الٰہی کا حصول ہے۔

سوال: اسلامی ریاست کی چار بنیادی خصوصیات لکھیں؟

جواب: (1) شریعت اسلام کا نفاذ (2) نظام شوریٰ کا قیام (3) انسانی حقوق کا تحفظ (4) اقلیتوں کی تحفظ (5) سرحدوں کی حفاظت

سوال: شورائیت سے متعلق دو قرآنی آیات مع ترجمہ لکھیں؟

جواب: (1) وشاورھم فی الامر (اور معاملات میں ان سے مشورہ لے)

(2) وامرھم شوریٰ بینھم (اور وہ آپس میں ہر معاملہ میں باہم مشورہ کرتے ہیں)

سوال: پاک و ہند کے چند مشہور دینی مکاتب و مدارس کے نام لکھیں؟

جواب: (1) مدرسہ دارالعلوم دیوبند (2) مدرسہ بریلی (یہ دونوں دہلی میں ہیں) (3) ندوۃ العلماء (یہ لکھنو میں ہے)

سوال: اہم اعضائے ریاست کون کون سے ہیں؟

جواب: ریاست کے تین اہم شعبے ہوتے ہیں (1) مقننہ (2) عدلیہ (3) انتظامیہ

سوال: ریاست اور حکومت میں کیا فرق ہے؟

جواب: ریاست کسی ملک کی چاروں حدود میں گھری ہوئی جگہ کا نام ہے۔ جبکہ حکومت وہ ڈھانچہ ہے جو اسی خطہ اراضی میں رہنے والے انسانوں کا نظام چلاتا ہے۔

سوال: اسلام کا تصور فلاح کیا ہے؟

جواب: پوری کی پوری زندگی اسلامی سانچے کے مطابق ڈھالنا' حلال رزق کمانا اور دنیا و آخرت میں بھلائی کی خواہش رکھنا۔

ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حَسَنَۃً وقنا عذاب النار

سوال: اسلام کے معاشرتی نظام پر چار کتب مع مصنف لکھیں؟

جواب: (1) اسلام کا معاشرتی نظام: ڈاکٹر خالد علوی حقوق زوجین

(2) پردہ: سید مودودیؒ

(3) اسلام کا نظام عفت و عصمت: مولانا ظفر الدین

(4) حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہؒ

سوال: اسلامی تعلیمات میں بنیادی انسانی حقوق کا چارٹر کسے کہتے ہیں؟

جواب: خطبہ حجۃ الوداع کو

سوال: اسلامی قانون کے ماخذ لکھیں؟

جواب: (1) قرآن مجید (2) سنت نبویؐ (3) آثار صحابہ (4) اجماع (5) قیاس (6) استحسان (7) استصلاح یا مصالح مرسلہ (8) اجتہاد

عموماً یہ پانچ ماخذ ہی لئے جاتے ہیں۔

(1) قرآن مجید (2) سنت نبویؐ (3) اجماع (4) قیاس (5) اجتہاد

سوال: الاحکام السلطانیہ کے مصنف کا نام کیا ہے؟ نیز اس کا موضوع کیا ہے؟

جواب: مصنف کا نام ابوالحسن علی الماوردی ہے۔ موضوع الاحکام السلطانیہ کا موضوع "سیاست" ہے۔ اس کتاب کے کچھ حصہ کو سیاسی نظریات کو جگہ دی گئی ہے باقی کتاب میں نظم و نسق عامہ اور حکومت کے قواعد سے بحث کی گئی ہے۔

سوال: اسلام کے سیاسی نظام پر چار کتب مع مصنف لکھیں؟

جواب: (1) سیاست المدینہ: ابونصر فارابی

(2) الاحکام السلطانیہ: ابوالحسن علی محمد بن حبیب الماوردی (ابوالحسن علی الماوردی)

(3) سیاست نامہ: نظام الملک طوسی

(4) حجۃ اللہ البالغہ: شاہ ولی اللہ دہلویؒ

(5) خلافت و ملوکیت: سید مودودیؒ

(6) اسلامی ریاست: مولانا گوہر الرحمٰن

سوال: اسلام کے شورائی نظام کے بارے میں دو آیات ترجمہ کے ساتھ تحریر کیجئے؟
جواب: و امرهم شوری بینهم (اور وہ آپس میں ہر معاملہ میں باہم مشورہ کرتے ہیں)
وشاورهم فی الامر (اور معاملات میں ان سے مشورہ کرو)
سوال: خلافت کے لغوی اور اصطلاحی معنی تحریر کیجئے؟
جواب: "خلافت" خلف-تخلف سے ہے جس کے لغوی معنی پچھلی جانب یا بعد میں آنے والی نسل کے ہیں اصطلاحی معنی میں خلافت سے مراد جانشین ہے یعنی حکومت کا وہ منصب ہے جو دین کی نگہبانی اور دنیا کے سیاسی امور (فرائض ادا کر سکتا ہو)
سوال: اسلامی ریاست کے فرائض کے بارے میں آیت مع ترجمہ تحریر کیجئے؟
جواب: ولتكن منكم امة يدعون الى الخير و يامرون بالمعروف وينهون عن المنكر واولئك هم المفلحون.
اور تم میں سے ایک جماعت ہونی چاہئے جو لوگوں کو نیکی کی طرف بلائے اور وہ نیکی کا حکم دیں اور برائی سے منع کریں اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔
سوال: عظمت انسانی کے بارے میں ایک آیت قرآنی ترجمے کے ساتھ تحریر کیجئے؟
جواب: لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم.
تحقیق ہم نے انسان کو اچھے ڈھانچے (بہتر صورت) میں پیدا کیا۔
سوال: مندرجہ ذیل کتب کے مصنفین کے نام لکھئے؟ (1) احکام السلطانیہ (2) عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی
جواب: (1) احکام السلطانیہ۔ از ابوالحسن علی محمد بن حبیب الماوردی
(2) عہد نبویؐ میں نظام حکمرانی۔ از ڈاکٹر حمید اللہ
سوال: دو مغربی اور دو مسلمان علمائے سیاست کے نام لکھئے؟
جواب: دو مغربی سیاست دان: پروفیسر گارنر' پروفیسر لاسکی' موسیو سیڈیو۔
دو مسلمان سیاست دان: محمد حامد الانصاری' ابوالحسن علی الماوردی' عبدالرحمان' ابو الاعلی مودودیؒ' شاہ ولی اللہ

ہماری دیگر مطبوعات

ایورنیو بک پیلس
اردو بازار لاہور